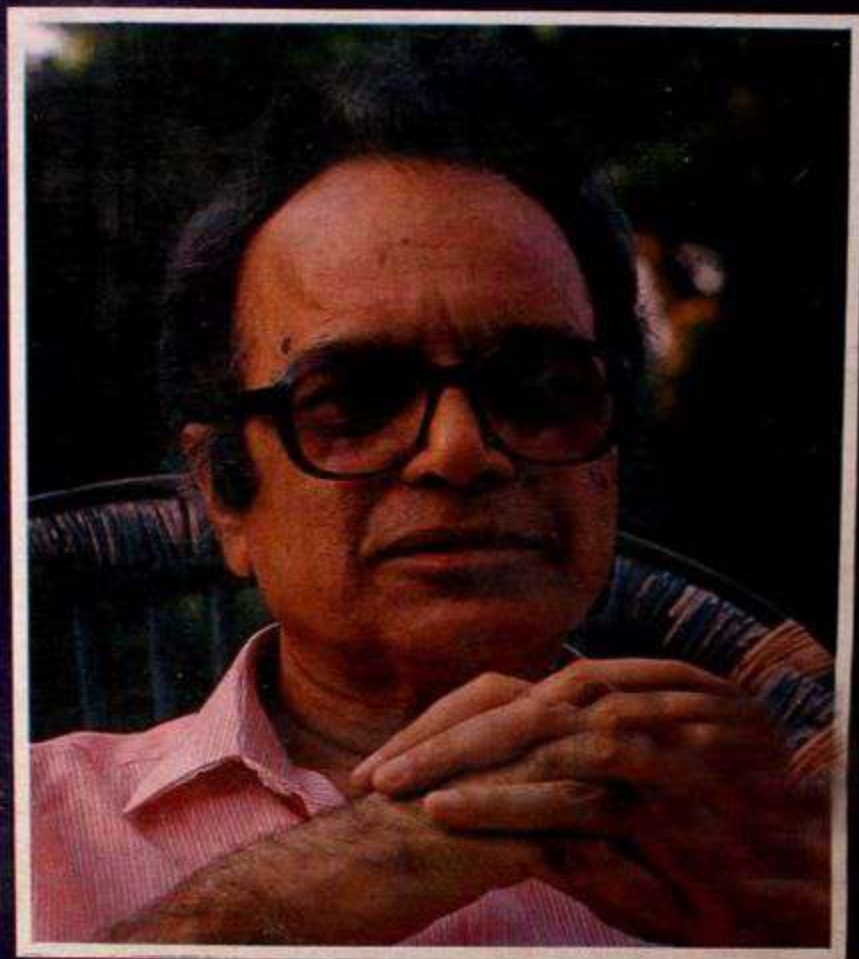


برفیلے شعلے اور وادی کشمیر

(Translation of "My Frozen Turbulence In Kashmir")



جگ موہن

برفیلے شعلے اور وادی کشمیر

ایک متزلزل، حساس اور محرک ذہن کا لاوا.... شخصیات اور واقعات کے بارے میں اس کے مشاہدات سے بہت سارے پر پلنے لگیں گے.... اسے کشمیر کے بارے میں حوالاتی کتاب سمجھا جانا چاہیے۔ (ہندوستان ٹائمز میں ایس سہاتے)

کسی اور ملک میں جگ موہن کی حالیہ پیش کش طرز میں کتاب کی اشاعت سے سیاسی طوفان اور زبردست تضاد رائے پیدا ہو جاتا۔ (ٹائمز آف انڈیا میں سوہن داس گپتا)

یہ واقعی سائن بجانے کا کام ہے جو ختری جگ موہن نے کیا ہے۔ عوام کو یہ بات ذہن نشین کرنا چاہیے کہ سوال ملک کے حقے بخرے ہونے یا اس کی بقا کا ہے۔

(ایکسپریس میں وینا مراد)

آئین کی دفعہ ۳۷۰ پر تضاد رائے سے جگ موہن نے ایک نئے تبصرے کو آشکار کیا۔ کسی بھی سابقہ گورنر نے اس قدر تلخ نہیں لکھا کسی نے بھی اس قدر باریکی سے کشمیر کے مرض کا جائزہ ہی نہیں لیا بلکہ بہت سارے اعلیٰ لوگوں کی نالاشی کی ہے۔ ایک ہی کتاب میں اس قدر دھماکہ خیز مواد جمع کر دیا ہے۔

(دکن ہیرالڈ میں پنیہ پر یہ داس گپتا)

..... اس کتاب کی تا در قیمت ہندوستانی سیاسی نظام میں اور سماج میں وہ بنیادی سوال اٹھاتے ہیں ملک کو بجا طور پر جن کا مقابلہ کرنا پڑا۔

(سٹڈے ٹائمز میں نیسنی جیتلی)

..... ایک شخص جس نے گزشتہ برس وادی کو بچایا جگ موہن اس کی کتاب ہندوستان میں شائع ہوتی اہم ترین کتاب (ہے) ... (اکنامک ٹائمز میں ارون شعری)

برفیلے شعلے اور واحدی کشمیر

جگموہن



سیمانت پرنکاشن

اگتہ نہر پلا

(جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ)

اس کتاب کے کسی حصے کو بغیر تحریری اجازت کے شائع کرنا یا کسی طرح کے استعمال پر کاپی رائٹ قانون کے تحت پابندی ہے۔

ISBN : 81-85786-69-0

قیمت : تین سو روپے / ۳۰۰
اشاعت : جنوری ۱۹۹۳ء
نقش اول : تین ہزار
خوشنویس : عبدالقادر ربانی بستوی
طباعت : پرنس آفسیٹ پرنٹرز، دہلی

ناشر : سیمانت پرنکاشن

۹۲۲- کوچہ روہیلا، تریا باہرام
دریا گنج - نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ترجمہ : سیمانت پرنکاشن

Barfeelay Sholay Aur Vadi-e-Kashmir 1993 Rs. 300/-
Jagmohan

(Translation of 'My Frozen Turbulence In Kashmir' Published by
Allied Publishers Ltd. in English)



Seemant Prakashan
922, Kucha Rohella Khan
Daryaganj, New Delhi-110002

رادھیکا ، سونالیکا اور دیویکا
ان تین چھوٹے بچوں
کے نام
جنہیں مستقبل کا سامنا کرنا ہے

یہ واقعی سائنس بن جانے کا کام ہے جو شری جگموہن نے کیا ہے۔ عوام کو یہ بات ذہن نشین کرنا چاہیے کہ سوال ملک کے حصے بخرے ہونے یا اس کی بقاء کا ہے۔

..... اس کتاب کی نادر قیمت ہندوستانی سیاسی نظام میں اور سماج میں وہ بنیادی سوال اٹھانے میں ملک کو سچا طور پر چین کا مقابلہ کرنا پڑا۔

..... ایک شخص جس نے گزشتہ برس وادی کو کیا یا جگمگوں..... اکی کتاب ہندوستان میں شائع ہوئی امیرین کتاب

... (۷)

ایڈیٹر ان چیف ٹریڈیون وی بی این مارٹن
یہ بلاشبہ ایک عظیم کتاب ہے اور فیے شیر کے بارے میں اتنا کچھ بتا چکا ہے۔ جو مجھے کہیں اور معلوم نہ ہو ہوتا۔
مائیکل فٹ جرنل انویئر پارلیمنٹ ڈاکٹر ملک راج آئند کے نام ایک خط اور اس کتاب کی طاقت اس کے
حقائق میں ہے۔ صرف اسی وجہ سے ہر اس شخص کے لئے اسے پڑھنا لازمی ہے جیسے امر ہندوستان سے لگا رہے۔
(انڈین ریویو آف بکس میں ایس ایس بگن ناٹھن شیر بول کے لئے مضبوط طور پر اس کے انتہائی نثر کو ان
بواہوسوں پر انٹوس ہوگا جو دہلی میں از باب اختیار رہے ہیں۔ اور کثرت میں کشش و خون کی روایتوں کے وقت
جان بوجھ کر میرے گھر سے چلے گئے

سندھ سے میل میں بی جی وریگز
جدید اور قیمتی کمشنرز دنوں کی تاریخ اس کی بخش قیمت روئیداد بہت سارے پہلوؤں سے یہ پہلی
دیانتدار اور براہ راست حصہ جہاں مسلسل غلطیوں اور خدایوں کے صورت حال کو موجودہ نقطہ تک پہنچایا
ہے ریاستی ایڈمنسٹریشن میں اعلیٰ ترین سطح پر رشوت کے بارے میں انکشافات اور باضابطہ
فریب کاری سیاست کی روئیداد سانس روک کر رکھ دیتی ہے۔

..... ایک متحسن تحریر شدہ کتاب ہمارے سیاسی لیڈروں کے ذہنی کیفیت ایک مایوس کن تصویر پیش کرتی ہے۔

..... یہ ایک شاندار کارنامہ ہے جس کو (محقق کی) حقیقت بیان کے عادی ہونے سے قوت حاصل ہوئی ہے۔
 بزنس اور پولیٹیکل ممبروں میں ملک رائج تہذیب

”کوئی صرف جگہ پر ہی کی ہیبت ناک ٹونگ سے دستاویز شدہ کتاب کو پڑھ لے اور محسوس کرے.... اس نے سبھی قسم کے ہندوستانی سیاسی لیڈروں کی بدترین نااہلیت اور بے اہلیانہی کے بارے میں بے باکی سے کہا ہے....“

ہندوستان ٹائمز بھپانی سین گیتا کا حالیہ ۲۶ فروری ۱۹۹۲ء کو شائع ہوا

- ۴۲۵ پندرہ — غلط اطلاعات اور غلط بیانیوں کا سیلاب
 ۴۵۷ سولہ — درد کو طویل تر کرنا
 ۴۷۲ سترہ — مستقبل تاریخ کا دھارا موڑنے کا آلہ کار
 ۴۹۶ اٹھارہ — قدیم مسائل، نئی پیچیدگیاں
 ستمبر ۱۹۹۱ء سے اپریل ۱۹۹۲ء تک کے واقعات

فہرست ابواب

باب	صفحہ نمبر
پیش لفظ	۱۱
دوسرے ایڈیشن کا پیش لفظ	۱۵
ایک — میرا منجھد غبار	۱۷
دو — تاریخ کے جھروکے سے	۵۰
تین — منڈراتے ہوئے خطرات	۱۱۳
چار — دہشت گردی کی جڑیں	۱۲۴
پانچ — دہشت گردی کی جڑیں : پوشیدہ ریشے	۱۶۳
چھ — دہشت گردی کی جڑیں : دفعہ ۳۷۰	۲۱۷
سات — ۲ جولائی ۱۹۸۴ء : ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی برطرفی	۲۳۷
آٹھ — میرے آنے سے قبل کے حالات	۲۶۶
نو — انداز فکر، حملہ اور جوابی حملہ	۲۸۵
دس — تخریب اور دہشت گردی کی نوعیت اور طرز عمل :	۳۰۵
ملی بھگت، گنگھ جوڑ اور سازشیں	
گیارہ — اسمبلی کی تحلیل	۳۳۴
بارہ — انتشار اور تضادات کا گرداب	۳۴۱
تیرہ — خوفزدہ کبوتر اور محروم طبقہ : کشمیری پنڈت	۳۷۳
چودھ —	۳۸۵

پیش لفظ

میں نے یہ کتاب کیوں لکھی؟ اور میں نے اس کتاب کا عنوان — ”برقیہ شعلے اور وادی کشمیر“ کیوں رکھا؟ دو مہینوں — اپریل ۱۹۸۴ء سے جون ۱۹۸۹ء اور جنوری سے مئی ۱۹۹۰ء کے دوران ریاستی گورنر کے طور پر دورِ حاضری کے چند نازک ترمیمی واقعات کے ساتھ میں وابستہ تھا۔ چنانچہ یہ قوم اور تاریخ کے تیش میرا فرض ہے کہ ان واقعات کو بیان کر کے پس منظر میں ان کا جائزہ لوں اور اس بات کو بھی ظاہر کروں کہ ان کے بارے میں میری کیا محسوسات ہیں۔

میری گورنری کے عرصے کے دوران ہندوستانی روح کی اندرونی پرتیں پڑمردگی کی شکار ہو گئیں اور یہ اس قدر مدد قوت ہو گئیں کہ ہندوستانی سیاسیات کا کھوکھلا پن اور تصنع شدہ بد صورت میں نمایاں ہو گیا۔ اس منظر نے مجھے بہت پریشان کیا۔ میری دلچسپی جذبات کی لہر میں جمع ہوئی رہی اور بعد ازاں انہوں نے خبردار کی صورت اختیار کر لی۔ جس عہدے پر میں بیٹھا تھا اس کے سبب فساد اندر ہی اندر نمودار ہوا اور اب میں محسوس کرتا ہوں کہ اس کو باعہر لے جانے کا موقع آچکا ہے۔

مخاد عام اور خاص طور پر قومی مفاد کا یہ تقاضہ ہے کہ اس کتاب کی اشاعت ہو۔ دانتیانا اور انتہائی غلط تصویر کشی کی گئی ہے۔ اپنی عہد گورنری کے دوسرے دور کے پہلے دن سے ہی دہشت گردی کے خلاف مجھے ایک سنگین لڑائی کا آفاذ کرنا پڑا اور اسی قدر خطر اور گراں جنگ مجھے غلط بیانیوں کے خلاف لڑنا پڑی۔ غلط بیانیوں اور بے ٹکی باتوں کا طوفان اس قدر زیادہ تھا کہ میں اپنے طور پر ڈٹے ہوئے پہلی لڑائی میں تو کامراں ہو سکتا تھا۔ دوسری میں نہیں۔

میں نے کوئی ایسا دعویٰ نہیں کیا جس کے ثبوت میں محسوس شہادت پیش نہ کی گئی ہو۔ یہ ان غلط بیانی کے مرکب افراد کے طریقہ کار سے بالکل برعکس ہے جن کی رو میں وادی کا سیاسی سنی سنائی، مسخ شدہ یا بعض اوقات بالکل

ہوئے مجھ پر بددیانتی کا الزام عائد کر سکتے ہیں کیونکہ میں نے خطوطِ محسوس شہادت کے ساتھ ان کا پردہ فاش کیا ہے۔ ترقی یافتہ ترقی اور ترقی عوامی رواداری اس رو کی اجازت دیتے ہیں کہ ایک فرقہ ایک موضوع پر بولے اور غلط طور پر متاثر شخص اسے ناقابلِ تردید ثبوتوں کی بنا پر اپنی پوزیشن کے دفاع کا موقع نہ دے یا اس بات کی اجازت نہ دے کہ حقیقت کا انکشاف کر کے عوامی مفادات اور شہرت کا تحفظ کر سکے۔ مثال کے طور پر چند اعلیٰ ارباب اقتدار نے کمر ڈالا کہ میں نے ریاستی اسمبلی کی تحلیل کے بارے میں انہیں اندھیرے میں رکھا مگر اس موضوع پر جو تحریری شہادت موجود ہے وہ اس دعوے کی بنیاد کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ کیا مجھے حق نہیں کہ اس حقیقت کی طرف عوام کی توجہ مبذول کروں؟ اسی طرح اس بابت بھی میری غلط نکتہ چینی کی جارہی ہے کہ میں ”خطرات کی علامتوں“ کی طرف اشارہ کرنے اور یہ بتانے میں حق بجانب نہیں کہ آخر ذمہ داری کہاں اور کس کی ہے؟ کسی کو بھی یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے مقصد کے لئے غلط بیانی سے کام لے اور دوسروں کو خاموش رہنے کے لئے مجھے۔

ذاتی طور پر میں نے غلیل کے کنکر وں اور ناکوں کا مقابلہ خاموشی سے کیا ہوتا مگر حقیقت کا تقاضہ ہے کہ مستقبل میں غلیلوں سے احتراز کیا جائے چنانچہ حقائق سے فوری طور آشکارا کیا جائے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ کوئی کنکر نہ سنگی نہ اپنی کتابوں اور ولی (HAIR APPARENT) اور صدر ریاست اور ایس۔ ایس۔ ملک نے اپنی کتاب ”نہرو کے ساتھ میرے دن“ MY DAYS WITH NEHRU میں بھی چند خطوط کو پیش کیا ہے۔ اس کتاب کو ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

باب اول میں ۱۹ جنوری سے ۲۸ جنوری ۱۹۹۰ء تک کے دس نازک ترین دنوں کی روٹا دورِ ج ہے۔ اس میں واقعات کے پس منظر اور میری پیچھے میں چھرا گھونپنے کے پہلے واقعات کا ذکر بھی ہے۔

باب دوم میں تاریخ کے اوائل سے ۲۶ مئی ۱۹۹۰ء تک تاریخ کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ **باب سوم** ”خطریہ علامات“ - جمع ہو رہے طوفان کی طرف توجہ دلانا ہے اور اس بات پر زور دیتا ہے کہ ان اشاروں کو نظر انداز کر دینا تاریخی ہیئت کی غلطی کے مترادف تھا۔

ابواب چہارم سے ششم میں مسئلے کی ان جڑوں کو نمایاں کیا گیا ہے جو مرکزی لیڈر شپ کے نرم اور قدامت پسند رویئے، قریب کاری کی سیاست، مصنوعی جمہوریت، خام خیالیاں پالنے کی عام روش، مافیہ کی ناپاک روایتیں، مذہب کو بنیاد پرستی کا روپ دینے، عام رشوت ستانی، مائوتیاتی تحریک کاری، علاقائی تفرقات، یکجہتی مخالف آئینی رشتے اور منظمی طاقتوں کے جمعی خیرکات کے سبب ہے۔

باب ہفتم میں ۲ جولائی ۱۹۸۴ء کو کوئی کٹر فاروق عہد الٹ کی برطرفی کے ذمہ دار حقائق کو بیان کیا گیا ہے۔ یہاں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ میری آئینی سفارشات کو کس طرح غلطی سے سمجھا دیا گیا تھا اور دوسری آئینی اختیارات کے رول پر بحث کی گئی ہے۔

کیا گیا ہے۔ اس میں اس سوال پر غور کیا گیا ہے کہ آیا بحوث عرب سے لے کر خطہ تک کے افغان اسلامی قوس ابھر سکے گی اور ان نئے واقعات کا ہندوستان پر اور خاص طور پر کشمیر میں اس کی پوزیشن پر کیا اثر ہوگا۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کی ایکٹیا ترا اور کشمیری مہاجرین کی یہم زبوں حالی کے علاوہ قومی یکجہتی کو نسل کے نام میرے کھلے مکتوب کا ذکر بھی اس میں شامل ہے۔ آخری حصے میں مستقبل کے بارے میں میرا نے اپنے اعتقادات و مسوول اور شکوک کا اظہار لازمی سمجھا ہے۔

جگموہن

نئی دہلی
۲۵ اپریل ۱۹۹۲ء

دوسرے ایڈیشن کا پیش لفظ

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ستمبر ۱۹۹۱ء میں شائع ہوا اس کا عوامی رد و مل نہایت توجہ افزا تھا اور وسیع تر تبصرے اس کتاب پر شائع ہوئے۔ چند اہم شخصیتوں کی آراء بھی ملی ہیں۔ اس کتاب کی پہلے ہی چار مرتبہ دوبارہ طباعت ہو چکی ہے اور یہ ہندی اور مراٹھی میں ترجمہ ہو کر شائع ہو چکی ہے اور یہ اب اردو، کنڑ، گجراتی، تیلگو، تامل، ملیالم اور بنگالی میں زیر ترجمہ اشاعت ہے۔ پانچویں بار طباعت تو کی گذارش کا جواب دیتے ہوئے میرے ناشرین نے مجھے تجویز پیش کی کہ میں اس کتاب کو تازہ ترین صورت دوں اور اس کتاب کی اشاعت کے بعد کے واقعات پر مبنی ایک اور باب کا اضافہ کروں۔ میں نے بخوشی اس تجویز کو قبول کر لیا۔

اس ایڈیشن میں ایک نیا باب "قدیم مسائل نئی پیچیدگیاں" ستمبر ۱۹۹۱ء سے اپریل ۱۹۹۲ء تک واقعات شامل ہے جسے چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ حصہ اول میں وادی کشمیر میں دہشت گردی کے مختلف پہلوؤں کو عیاں کیا گیا ہے۔ اس میں ہندوستانی نظام کے اس رجحان کو نمایاں کیا گیا ہے جس کے تحت حق اقلی کا مقابلہ نہیں کیا جاتا بلکہ قوتیں فہمی کا سہارا لیا جاتا ہے۔ یہ عدالتی کارروائی، خفیہ بیانی کے جمال کے مختلف پہلوؤں کو عیاں کرتا ہے جو کشمیری مسلمانوں میں میرے عکس کو نقصان پہونچا کر ادنیٰ اور ذاتی مفادات پورا کرنے کیلئے بھجایا گیا تھا۔ حصہ دوم میں چند بنیادی سوال اٹھائے گئے جن کی کیا ہندوستانی ذہن میں اصلاح کے بغیر اقتصادی اصلاحات ملک کو مزید مرکز ورنہ بنائیں گی اور کیا اقتصادی غصہ مغربی ممالک کے دباؤ برداشت کر سکے گا اگر بعد کے مرحلے میں موخرالذکر کے مفادات ان دباؤں کا تقاضہ کریں گے تو کیا ہوگا؟

جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ کے خواجوں اور میرے تیسرا حصے کی پیچیدگیاں خطہ سوم میں زیر بحث لائی گئی ہیں۔ حصہ چہارم میں وائس ایس آر کا شہزادہ کچھ ترانوہ و سلطنت اور مایہ ناز احمد کے مملکت احمد کو

میرا محمد غبار

یہ ہوا ہے
یہ ہوتا چلا جا رہا ہے
اور یہ دربارہ ہوگا

ہوائی جہاز اچانک نیچے پوہوا۔ ریہو کے دباؤ کا ایک حلقہ تھا اور بی ایس ایف کا
 چھوٹا سا جہاز تھا جو ہوائ کے اس دباؤ کو آسانی سے برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ تیس قدمے لڑ گیا اور
 اس طرح میرے خیالات بھی منتشر ہو گئے۔ شاید مجھے ریات یاد دہی کہ میں ایک ایسی ریاست کی طرف
 محو سفر ہوں جو دہشت گردی کے طوفان میں پھنسی ہے۔ یہ جنوری ۱۹۹۰ء کی دوپہر کا وقت تھا اور میں
 ایک مرتبہ پھر تھیں وکٹوریہ کی طرف پرواز کر رہا تھا۔

چھ برس قبل اپریل ۱۹۸۲ء کو میں نے اسی ریاست کی جانب پرواز کی تھی اس وقت بھی مجھے دشواریوں کا سامنا تھا مگر ان دن ایئر لائنز کے بوئنگ طیارے کی خوبصورت درجوں سے باہر کی دھوپ کافی جگہ دار تھی اور مجھے اس وقت مکمل اعتماد تھا۔ ہوائی اڈے پر میرے ہی خواہوں کی ایک کثیر تعداد مجھے خیر باد کہنے کے لیے آئی تھی۔ اب کی بار حالات مختلف تھے۔ نصف شب کو مجھے وزیر خارجہ آئی کے، گجرا ل کی طرف سے سیلی نوٹ کال نے جگایا تھا۔ انھوں نے مجھے وزیر داخلہ مفتی محمد سعید کی ہائٹ گاڑی ایک ہنگامی میننگ کے لیے بلایا تھا۔ وہاں پر مجھے شدید نینگیں بھران کی بابت بتایا گیا اور کہا گیا کہ میں جتنی جلد ممکن ہو ریاست جتوں و کشر میں پہنچ جاؤں۔ اس مقصد کے لیے ایک خاص ہوائی جہاز تیار کر لیا تھا۔ میری روانگی کے لیے شدید سرعت اور سفر میں قرب تنہائی کے احساس نے مجھے قدرے ڈرا بھی دیا۔ بی ایس، ایف جہاز کے تنگ درجوں میں سے آسمان کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک بھلا ادا اس دھند کے اسے شادی کو دیکھ سکتا تھا۔

مجھے یاد آیا کہ ۱۹۸۹ء کے فائل میں بھی ریاست میں انفرسیسی زلزلے آئے تھے مہ فروری کو جسے ،
انڈیکے لبریشن فرنٹ کے بازو بول کشیر لبریشن آرمی کے کارکنوں نے برمنگھم میں تعینات ہندوستانی سفارت
کار ویندر ناتھ رائے کو اغوا کیا اور ۲۴ فروری کو ان کا سفاکانہ قتل کر دیا گیا۔ اس سے چھ دن بعد جمپول و کشمیر
لبریشن فرنٹ کے بانی صدر مقتول ہوئے کہ وہاں جیل دہلی میں پچاسویں دے دی گئی۔ بیٹھ کو ایک قتل کے
سلسلے میں سترہ برس قبل موت کی نرسانائی گئی تھی۔ اب دونوں واقعات کا نئی دہلی اور سری نگر میں کبرا
اثر تھا۔

اس کے چند دن بعد مین مرکزی وزارت نے صدر جمہوریہ کے ساتھ ملاقات کی تھی اور ان سے شکایت کی تھی کہ وزیر اعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی سکلاری لپسٹ پناہی میں علیحدگی پسند فوجی کھل کھیل رہی تھیں اور وادی کشمیر میں قوم دشمن عناصر کا غلبہ تھا۔ دوسری طرف فاروق عبداللہ دھمکی دے رہے تھے کہ اگر کانگریسوں نے اپنا رویہ درست نہیں کیا تو ان کی نمایاں بہہ جائیں گی۔

اس سے قبل ۵ جون ۱۹۸۳ء کو میوے اسمبلی انتخابات کے دوران ریاست میں فضا اس
تدریکتہ زبردستی تھی کہ مسز اندرا کا نڈھی کی تقریر سننے کے لیے اقبال پارک سری نگر میں جو مجمع ہوا
تھان میں سے اوگون تک بھیجا گیا تھا۔ انتخابات کے بعد مہنے والے ایجنیشن میں امن عام
پیہم درہم برہم ہوا گیا۔ ۱۵ جنوری ۱۹۸۴ء کو کانگریس پارٹی کے چار حمایتی آئٹ ناگ بلوئیس
فائرنگ میں ہلاک ہو گئے۔ واوی میں کم و حکاموں کی تلافی نشوونما حد تک پہنچ گئی۔ یوم آزادی
کی بریک کے موقع پر اٹلیا کافی باؤس میں جوں کشمیر و ہائی کورٹ کے جج ملے۔ اٹلیا کشمیر
رہائش گاہ ہر دھاک لال چوک سے پلڈیم سینما، یونیورسٹی لائبریری ہلاک اور ٹی آر ڈسٹیشن
جج این کے جھوکی رہائش گاہ پر دھماکا ہوئے۔ اس سے قبل مغربی ویسٹ انڈیز اور ہند کے درمیان سری نگر
میں ۱۹ اکتوبر ۱۹۸۳ء کو چوک علی ہوا اس میں ہندوستان کی عزت کی تہی پلڈی کی گئی۔ اس کو لاکھوں کی تعداد میں
ٹیلیوژن دیکھنے والوں نے دیکھا۔ یہ تمام واقعات ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی موجودگی میں ہوئے اور وہاں
پر پاکستان کے حق میں غلبہ دکھائے گئے۔

ان دنوں بہت بھاری تعداد میں جلوس نکلا کرتے تھے۔ عوام جن لوگوں کو ملند کرتے ان میں پاکستان زندہ باد، خالصتان زندہ باد، نور چشم نور حق ضیا الحق ضیا الحق کے لوگوں شامل تھے۔ ایک نیا نعرہ مسلم، بسکھ، بھائی بھائی، ہندو قوم کہاں سے آئی، خاص طور پر بھاری چیمپ گولیوں کا حامل تھا۔ پنجاب پہلی ہی بنیاد پرستی اور فرستے پرستی کے شعلوں کی لپٹ میں تھا۔ دہشت گردی کے شعلے جیٹوں و کشمیر کی طرف نکل کر نئے خطرات کی نشان دہی کر رہے تھے دادی میں اس مقصد کے لیے پہلی ہی بھاری تعداد میں خشک زندہ باد

استی کام کا خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔

جہاڑ کی نشست پر آگے کو بڑھی ہوئی ایک چھوٹی سی میز پر چائے کی ایک پیالی رکھی گئی۔ اس سے آپ تازہ دم ہو جائیں گے جناب“ اس چیت انڈنٹ نے عاجزی کے ساتھ مسکراتے ہوئے کہا اور واقعی ایسا ہوا۔

میں نے اپنے بریف کیس سے ایک فائیل نکالی جو ہوائی اڈے پر جے اینڈ کے ریڈیٹ کمنٹر کے ایک اہلکار نے مجھے دی تھی۔ اس میں ۱۲ جولائی ۱۹۸۹ء کے بعد کے تجربے کے اخباری تراشے تھے۔ میں اس تاریخ کو اپنی گورنری کے چارج سے کھلی بارسکد ویش ہوا تھا۔ میں نے ان تراشوں پر نگاہ دوڑانا شروع کیا۔ پاکستان کا یوم آزادی ۱۱ اگست کو ترک و احتشام کے ساتھ منایا گیا۔ اور ہندوستان یوم آزادی ۱۵ اگست کو ہڑتال اور بلیک آؤٹ رہا۔ عوامی جھنڈا اچلا یا گیا اور بھاری تعداد میں موجود عوام نے اس موقع پر تالیاں بجا دیں۔ ”یہ ایک خبر تھی۔ ۶ نومبر ۱۹۸۹ء کو اسٹیٹس میں لکھا تھا۔ ”قوم کشمیر کو لگ بھگ چھوٹکی ہے۔“ پریٹریٹ کی خبر تھی۔ ”سری نگر میں روزیم دھماکے۔“ پرائمر آف انڈیا نے ۲۳ نومبر کے شمارے میں لکھا تھا۔ ”واڈی کشمیر میں دہشت کے دور پر ہر خاموشی، ایک سازش کی علامت ہے۔“ بی جے پی کے نائب صدر کو سری نگر میں ان کی رہائش گاہ کے سامنے گولیوں سے ہلاک کر دیا گیا۔ جسٹس جنمو کو بری سنگھ اسٹریٹ میں بے رحمانہ طریقے سے ہلاک کیا گیا۔ ”ایک نامور صحافی بی این بھٹ کی انٹرنٹ ناگ میں ہلاکت۔“ ریاست میں دہشت گردی کا راج۔ کشمیر پولیس اسٹیشن کا باؤس انسر بازار میں قتل۔ ایڈمنسٹریشن قطعی طور پر منفلوج۔ مرکزی وزیر داخلہ کی بیٹی کا اغوا۔“ اس کے علاوہ دوسری بیبیت ناگ سرخیاں تھیں۔ میں نے مایوس ہو کر پڑھنا بند کر دیا۔ میں نے پہلے بھی کچھ اطلاعات اخبارات میں پڑھی تھیں۔ مگر آج ان تراشوں کو ایک ڈھیر میں دیکھ کر واقعی ڈر لگ رہا تھا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ منتشر خیالوں نے ایک مرتبہ پھر میرے ذہن کو بکھرا لیا۔

اس ریاست میں بس اوقات چھپ چکیاں کیوں پیدا کی جاتی ہیں؟ بار بار آوازیں کیوں بلند ہوتی ہیں۔ پہلے کے تنازعوں کی طرح اس بار کے طوفان کی وجوہات میں یکسانیت کیوں تھی۔ ایک نظم جو میموری آف میوزک فلیٹ کی طرح میرے تحت الشعور کا ایک حصہ بن چکی ہے، دفعتاً میرے لبوں پر آگئی:

یہ ہو چکا ہے

اور یہ ہوتا چلا جا رہا ہے

اور یہ دوبارہ ہوگا

معصوم لوگوں کو کچھ پست نہیں
کیوں کہ ان کا تصور بیبیت زد ہے
غریب لوگ اس طرف نگاہ نہیں کرتے
کیوں کہ وہ بہت غریب ہیں
امیر لوگ اس کی پروا نہیں کرتے
کیوں کہ وہ بہت زیادہ امیر ہیں
احمق لوگ اپنے کندھے جھک لیتے ہیں
کیوں کہ وہ بہت زیادہ چالاک ہوتے ہیں
نوجوان پروا نہیں کرتے
کیوں کہ وہ بہت چھوٹے ہیں
بوڑھے پروا نہیں کرتے
کیوں کہ وہ بہت ضعیف العمر ہیں
اسی لیے اس عمل کو رد کرنے کے لیے کچھ نہیں ہوتا
اور آخر یہ کیوں ہوا ہے

اور یہ پھر ہوگا

میں سوچ رہا تھا کہ ہمارے ملک میں اندوہ ناک واقعات نہایت شدت کے ساتھ پیش آتے ہیں اور قومی زندگی اور ثقافتی کا بڑا حصہ بنیادی سوالات سے کسی کو واسطہ نہیں تھا جو نئے اخلاقی نظام کی استوار بنیاد فراہم کر سکتے تھے اور ہماری ضروریات کے مطابق جو ریاست اور انتظامیہ کا نیا دھارا فروغ پیا سکتا تھا۔ کافی عرصہ پہلے میں نے اپنی کتاب

REBUILDING SHAHJAHANABAD

کے اختتام میں ایک چھوٹی سی نظم درج کی تھی
جب تک ہم نیا نکتہ نظر پیدا نہیں کرتے
زہنی انقلاب کو جنم نہیں دیتے

تب تک تعمیر یا تخریب

تعمیر ہو یا احیائے نو

نہیں ہوگی

نہیں ہو سکتی

میں نے اس نظریے کی وضاحت کی تھی کہ نئے ناوید نگاہ کے نئے خیالات کے بغیر ہندوستان

اپنی گم شدہ روح کی تلاش نہیں کر سکتا۔ اس کی احمیائے نوکمی نہیں۔

مگر ان آوازوں کو کبھی مٹنا نہیں گیا۔ نئی عمارت کی تعمیر کمزور اور دیک زردہ بنیادوں پر عمل میں لائی گئی۔ تاریخ کے نازک ترین موڑ پر ہمارے رہبر صحیح راہ کے تعین میں ناکام رہے۔ خیالات یکساں اور سانچے میں ڈھالنے کی بجائے انہیں ادھار میں لیا گیا۔ ہم نے اپنے ذہن کے دروازے کھلے رکھے مگر کھول دیا کہ ہمیں تازہ ہوا مل رہی ہے۔ مگر ہم اس گندگی کی بدبو کو صاف کرنا بھول گئے۔ جو ہمارے گھروں کے اندر جمع ہو چکی تھی کیوں کہ ہمیں ان زریں خیالات کو کھوکھلا کرنے کا فن نہیں آتا تھا جو کچھ ڈھیر کے تلے دب چکے تھے۔ اور نہ ہی ہم انھیں تراشنا جانتے تھے۔ تاکہ ہم انھیں نوی تعمیر نو کا اہم آلہ بناسکتے۔ ہم ادھار کی میاں کھیلوں پر چلتے رہے اور ہم نے سمجھ لیا کہ ہمارے اعصاب مضبوط ہیں ہم نے ادھار کی خوراک کھائی اور محسوس کر لیا کہ ہمیں کافی طاقت حاصل ہو چکی ہے۔ جن کی بدولت ہم ان فزیب ناک حقیقتوں کو پاٹ سکتے ہیں۔ جو تاریخ نے ہماری راہ میں پیدا کی ہیں۔

جلدی ہی ہم راستے میں اوندھے پڑ گئے۔ جلد ہی ہم نے اپنے آپ کو نیم حکیموں کی گود میں پایا۔ ہمارے سامنے تاریک اور ناہموار ٹرک تھی۔ طلوع آزادی پر ہم نے ایک طاقتور قوم کی تعمیر کی تھنا کی تھی۔ جو خیالات میں طاقت درہو، ثقافت میں طاقت درہو، اور بنی نوع انسان کی فرائض خدمت کے لیے اچھی خاصی طاقت رکھتی ہو۔ مگر ہم کھوکھلے پن کے گورکھ دھندلوں میں الجھ کر رہ گئے۔ ہمارا جواب ادھار تھا اور ہم اگے بڑھتے رہے۔

دھند کی طور پر ۱۰۰ اوندھے پن سے کبھی بڑھتے ہیں

ہم ادھارے جواب کی طرف گامزن رہے

تب امیر کا چراغ بجھ گیا

فرار یا جنگ کی طاقت

اور بندھے ہوئے پروں کے جھار

رات کے لیے تکلیف دہ تکیہ بن کر رہ گئے

کشمیر کے معاملے میں اندر ہی اندر ہم نے اپنی ناکامیوں کی کمزوریوں کو بجا طور پر محسوس کیا۔ ہمیں خدمتہ تھا کہ رائے شماری کی صورت میں جہالت، تنگ نظری اور فرقہ وارانہ جذبات کا استحصال ہوگا۔ اور اس کے باوجود بھی ہم نے ان قوتوں کا قطعاً مع کرنے کی کوشش نہیں کی جنہوں نے اس تنگ نظری اور تعصب کو نشوونما دی اس کے برعکس کشمیر کی سیاست ایسے طریقے سے چلائی گئی کہ کمزوریاں روز بروز بڑھتی گئیں۔ سالہا سال سے لیڈر شپ نے نہایت تنفیذ ن اور قابل معافی کم نظری اور تاریخی واقعات

اب ہم کیسے توقع رکھ سکتے ہیں کہ ایک کشمیری معقول رویہ اختیار کرے گا؟ ہم نے کشمیر کی خوشی کے لیے آخر کیا کیا ہے۔ کیا ہم نے ایک غیر مزاحم حکومت کو جنم نہیں دیا۔ کیا ہم نے فزیب کا دی اور دوشی سیاست سے کام نہیں لیا؟ کیا ہم نے نئے شیخ اور سلطانیوں کو نہیں ابھرنے دیا؟ کیا ہم نے محروم عوام کی شناخت، ان کی جہالت، بھوک اور بیماری کو کم تر نہیں سمجھا۔ اس کے برعکس ہم نے علاقائی پرستی شناسیتوں کو اچھا لایا۔ کیا ہم اس بات کو فراموش نہیں کرتے تھے کہ ہندوستان کی منزل رنگارنگی میں یک رنگی ہے۔ برکشتوں کے سامنے جھک جانے میں نہیں بلکہ تن کرنا کرنا ہے۔ جمہوریت کے استحصال کے لیے ووٹ بنک پیدا کرنے میں نہیں بلکہ حقیقی جمہوریت، حقیقی انصاف اور حقیقی آزادی فراہم کرنے میں ہے؟ کیا ہم نے قرون وسطیٰ رنگ اور رہبانیت کو دوام نہیں بخشا؟ ہم نے ان مضر اثرات کو روکنے کے لیے کون سے اقدامات کیے جو اسلامی بنیاد پرستی کی وجہ سے ہونا یقینی تھے؟

ہم نے کھلے سبکوں اور جھوٹے خداؤں پر تکیہ کیا۔ ہم نے تمام تر چڑھا والے پینڈی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ ہم نے ان جڑوں اور شاخوں کو نظر انداز کر دیا جو زمین نشوونما یا رہے تھے ہم نے اپنے ڈھانچے کی دھاروں اور شاخوں کی طرف نہیں دیکھا۔ ہم نے ان میں کیرٹوں، مکھڑوں کو کھسنے دیا جن کی وجہ سے یہ درادیں اور شاخیں مزید گہرے ہو گئے۔ یہاں تک کہ جب یہ تمام تر ڈھانچہ اینٹ پیٹوں میں تبدیل ہونے لگا رہا تھا تو نئی دہلی نے کوئی کارروائی نہیں کی۔ میں نے اپنے ذہن میں ۸ اپریل ۱۹۸۹ء کو راجیو کا ندھی کو کچھ اس خط کو دہرایا جس میں میں نے کہا تھا۔ "آج کارروائی بروقت ہو سکتی ہے اور کل کو اس معاملے میں کافی دیر ہو چکی ہوگی۔" مگر کل کو برسوں اور برسوں کو ترسوں میں کھوجانے دیا گیا۔ مگر اب جب کہ یہ ڈھانچہ پورے طور پر تہہ زمین ہو چکا تھا تو مجھے ایک مرتبہ پھر ایسی ریاست میں پرواز کرنا پڑا جہاں حالات خراب تھے اور جہاں کے لوگ شدید تکلیف میں مبتلا تھے۔ اپنی بھولی سی نشست پر بیٹھا ہوں گلے کے گرد مردہ ارتعاش کا بوجھ محسوس کر رہا تھا۔ میرے سامنے بڑی بونی بیالی تھر تھرا رہی تھی۔ صرف آغوا ہی کیا کافی نہیں تھا جو بی بی نے اپنا پیر دشوار سفر کرنا شروع کیا کہ میرے چھوٹے سے طیارے کی جانب ہلک سی میزائل داغے جانے لگے۔

جو بی بی طیارے نے ٹھکان کوٹ کے اوپر سے پرواز کی اور بی بی کی طرف رخ کیا تو وہ بچوں سے دھوپ کی گرمی میں جھانکنے لگیں اور میری ادا اسی دور ہو گئی۔ میرے اندر ایک نئے ارادے کے جنم لیا۔ جو سکتا ہے کہ عجیب ایک دہنا اس حکمت میں لکیر بریل چلانا پڑے۔ بہر کیف اس طوفان کا مقابلہ کرنا جانا چاہیے۔ اور اپنے حلقے کے گرد چپکے کے اس پاٹ کے باوجود مجھے نہ کہ جا کھڑا ہونا چاہیے۔ خاموشی کے ساتھ میں نے اپنی حکمت عملی طے کر لی اور اپنے بالیسی بیان کے لیے میں نے چند نئے خطبہ تحریریں

اس جھوٹے سے جہاز کی اپنی کشش اور شان تھی۔ بوئنگ جہاز کے شور کے برعکس نہایت آہنگی کے ساتھ رگ گیا۔ میں نے اپنے پاؤں لپا کر خود کو سیدھا کیا اور جھوٹے ہوائی اڈے کی صاف اور شفاف دھوپ میں چلا آیا۔ یہاں ہوا کی خشکی میں ایک تازگی تھی۔ میں نے اپنے بکھرے ہوئے بالوں میں انگلیاں گھما کر اندر ہی اندر اپنے اعصاب کو اعتدال پر لانے کی کوشش کی۔ معمول کی رسمی کارروائی کے بعد میں گاڑی میں سوار ہو کر ان راستوں سے راج بھون کی طرف چل دیا جہاں کی سڑکیں اور گلیاں دوستانہ زبان میں لینک کہتے ہوئے ان خدمات کے لیے میری شکریاں ادا کرتی تھیں جو میں نے ان کے لیے اس سے قبل سرانجام دی تھیں۔

راستے میں بھاری تعداد میں لوگ جمع تھے اور مسکراتے ہوئے چہروں سے میرا استقبال کر رہے تھے۔ وہ ہاتھ ہلا کر تالیاں بجا رہے تھے۔ مقامی اخبارات کے ذریعے مجھے معلوم ہوا کہ میری تقریر پر عوام نے بھاری مسرت کا اظہار کیا۔ لوگوں نے خوشی منائی، ٹپانے جھوڑے، چراغاں کیا گیا اور بھانگڑا ناچنا چا گیا۔ بازاروں میں رقص کرتے ہوئے لوگوں کی تصویریں اخبارات میں شائع ہوئی تھیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ جیوں کے لوگ آخراں قدر خوش اور ہنساں ہنساں کیوں ہیں اپنے گھروں کی چھتوں سے وہ گزریں تھکا کر میری ایک جھلک حاصل کرنے کی کوشش کیوں کر رہے تھے۔ آخر انھیں کون سے فائدے کی توقع ہے؟ قضا میں امید کے عنصر کی موجودگی کیوں ہے؟ میں نے سوچا کہ ہندوستانی عوام میں بنیادی طور پر حق اور انصاف حاصل کرنے کی خواہش موجود ہے اور میرے پہلے کے ہمدرد گورنری میں جیوں کے عوام کو ان اوصاف کا عملی طور پر احساس ہوا ہے اور آج ان کی خوشی ان کے دلوں میں پوشیدہ انگوں کی آئینہ دار تھی۔ کیا اس سے اس بات کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا کہ محض ایک بے جان سیاسی نظام اور استحصالی جمہوریت کے اثرات میں ہندوستانی عوام نے بعض اوقات ایسے رجحانات کا مظاہرہ کیا ہے جو قابل مذمت ہیں۔

میں نے ان خیالات کو بعض پرسکون لمحوں کے لیے چھوڑ دیا کیونکہ فی الحال مجھے اپنا غم بہ سنبھالنے، حلف و فاداری لینے، تباہی اور آفریقہ کا اندازہ کرنے اور بھائی اور نیمیرہ کو حکمت عملی طے کرنے پر توجہ دینا تھی۔ کام واقعی محال تھا۔ مجھے سیاسی اور انتظامی راستوں کو نظر کرنے کے لیے اپنی تمام تر چابکدستی کو بروئے کار لانا ہو گا کیونکہ اس کو بے رحم مگر مچھوں نے ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔

نظام کو میں نے حلف و فاداری اٹھایا۔ یہ رسم جلدی جلدی سرانجام دی گئی تھیں لوگوں کے لیے انتظام تھا اس سے کہیں زیادہ لوگ اس موقع پر آئے ہوئے تھے۔ نیشنل کانفرنس اور کانگریس کے کارکنان اس موقع پر تھے۔ اس موقع پر اس وقت دہلی، کولکاتا

تھانیا کہ سیاسی فائدے کیلئے میرے راستے میں رکاوٹیں کرنے کا تھا۔

حلف و فاداری لینے کے بعد میں نے ایک مختصر سی تقریر کی۔ خلاف معمول میں نے یہ تقریر پہلے سے تحریر کی ہوئی تھی۔ میں نے ایسا اس لیے کیا کہ میں اپنا انداز فکر بالکل واضح کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا:

”یہ ۱۹۸۶ء کی بات ہے کہ جب مجھے آپ لوگوں کی براہ راست خدمت کا موقع ملا۔

لوگ میرے انداز فکر سے واقف ہیں اور میں بھی آپ کے مختلف النوع مسائل سے شناسا ہوں۔

میں نے اقتدار کو خدمت خلق کا ایک ذریعہ تصور کیا ہے۔ یہ مجھے سعادت حاصل ہوئی ہے کہ

ایک مرتبہ بھی میں اتنی ہی اذیتیں ادا کر کے اس کے ساتھ آپ کی خدمت کر دوں۔“

موجودہ مرحلے کو گورنری راج کی بجائے گورنری خدمت کا مرحلہ تصور کیا جانا چاہیے۔ اگرچہ آئینی طور پر میں گورنریوں کا مگر تمام عملی مقاصد کے لیے میں ایک اذلی کے طور پر کام کروں گا۔ بلکہ ایک نرسنگ اردلی کے طور پر۔ تاکہ میں مریض کی ہمدردی اور خدمت کے ساتھ مادر و سرسوں، اس کی صحت یابی ہو اور امن اور خوشحالی کی زندگی بسر کرنے کے لیے وہ چاق و چوبند ہو جائے۔

اچارنا اور وزیر خزانہ کے مسائل کو حل کرنے کے لیے پیسے کی ہمت کی جائے گی۔ موجودہ حالات کے پیش نظر مجھے جموں و کشمیر کے آئین کی رو سے ۱۱ روپے ماہانہ تنخواہ واجب الادا ہے مگر میں اپنے اور کنبے کے کھانے پینے کے لیے صرف ایک ہزار روپے ماہانہ تنخواہ وصول کروں گا۔ سکاڑی طور پر کسی پارٹی کا اتہام نہیں ہو گا۔ سرکاری ٹرانسپورٹ، ٹیلی فون اور دیگر اداروں پر ہونے والے اخراجات میں تخفیف کی جائے گی۔ بھاری بجٹ انتظامیہ کو کم کیا جائے گا۔ ترقیاتی طرز عمل کو ایک نئی صورت دے کر عام آدمی کی ضروریات و لوازمات کے مطابق بنایا جائے گا۔

ریاست میں صحیح سوچ رکھنے والے تمام لوگ ان دنوں بھاری تکلیف اور اذیت محسوس کر رہے ہیں۔ جان الف کی جاتی ہے یاب کی، یہ ہم سبھی کا خون ہے جو بہتا ہے۔ یہ ہمارے بھائی بہنوں کا خون ہے۔ ہمارے بیٹے بیٹیوں کا خون ہے۔ ہمارے لیے لازمی ہے کہ اس خون نرالیے کو روکا جائے۔ میں سبھی کو مکمل انصاف کا یقین دلاتا ہوں۔ اور کسی کو کوئی شکایت یا گلہ ہو تو وہ مجھ سے ملاقات کر سکتا ہے۔“

دوستو! ہم اسرا کھو چکے ہیں مگر میں آپ کو ایک شعر یاد دلاتا ہوں۔

جہاں کا رواں بھول جاتے ہیں رستے

آٹھ تیس آدمی تھیں مکملی مرتبہ واداد اور میں کہہ رہی تھیں۔۔۔ "آج کی رات ہماری آخری رات ہے۔۔۔ ایک آواز آئی۔۔۔ صبح تک ہم تمام شہری بڑی قوت کا قتل عام کر دیا جائے گا۔۔۔" ایک اور آواز آئی۔۔۔ ہمارے لیے ہوائی جہاز بھیجے۔ اگر آپ ہمت لائیں نہیں دیکھنا چاہتے تو ہمیں وہاں سے نکال دیں۔ ایک اور دلیل تھی۔۔۔ "ہماری حکومتوں، ہمارے وائس کنسل کو انھوں کو لایا جائے گا اور مردوں کا قتل عام ہو گا۔" ایک اور صبح والا آواز آئی۔۔۔ یہ سب کچھ کرتے والے چند افراد نے مجھے پیلیفون پکڑے رہتے کو کہا تاکہ کسی دہل میں نصب سیکورٹی والا ڈسپیکچر وال سے جو لوگ ادا پیلین (شہر کی طاقتور شخصیت) انھیں کہیں سکیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ خود دانا اور انھوں نے بھلا دینے والی تھیں کہ یہ لاکھ لاکھ اسپیکروں کی بوی آواز جھوٹی تھی کتنی۔ میں پر لپکا روٹو شدہ ٹیپ چلائے جیسے تھے جن سے توڑنا کٹا کر پیریا جودا تھا اور ماحول میں خوف و ہراس مچا کر رکھا تھا اور موت یقینی دکھائی دے رہی تھی۔

یہ سب کچھ کہہ کر میرے پاس خود بھاری خود آدھیں لاکھ لاکھ اسپیکروں کے گھونٹے گئے اور آواز کی سے کچھ کچھ ادا پیلین (شہر کی طاقتور شخصیت) عوامی پیش قدمیوں پیدا کرنے کی یہ تکنیک کہاں سے حاصل کی گئی؟ اس مربوط غلطی کے پس پردہ کس کا دھارچہ تھا؟ یہ سب نیاریاں کس طرح ٹوٹیں ہیں نہیں آتی۔۔۔ کیا یہ غلط تھی۔۔۔ سازش تھی۔۔۔ یا دونوں چیزیں اس میں شامل تھیں۔

کوئی وقت کے بعد مجھے ڈیوٹر نیل کشن سری لنگر جیل خان اور ڈیوٹی انسپکٹر جیل آف پولیس، ایس ایس سی کے ساتھ پیلیفون پر رابطہ حاصل ہوا۔ میں نے انھیں خودی کا وعدہ دیا کہ وہ ان کے لیے آمادہ کیا۔ میں نے انھیں گورنر ڈیوڈ علاقہ میں انٹر جینٹ اور خود پولیس کنٹرول روم میں موجود رہنے کا مشورہ دیا۔ اور خودی کو تیار رہنا رکھنے کے لیے کہا۔ میں نے ذاتی طور پر ایس ایس سی ایڈیشنل جج کے ساتھ بات چیت کی۔ مجھے بتا دیا کہ موجودہ صورت حال میں وہی ایک شخص ہے جس نے جرنل جی ایس کے ساتھ بھی رابطہ قائم کیا۔

اسی آٹھ تیس افراد رات و قتل سے بھی قبل قتل ہو گئے۔۔۔ میں جنرل ایڈیشنل جج کے پاس پہنچا۔۔۔ آواز میں تشویش تھی۔۔۔ میں سری لنگر کے منہ پر سے لہجہ کی آواز داری بھرے قلمی قلم سے موصول ہو رہے ہیں۔۔۔ ہلال پر جیسے قیامت آچکی ہے شہری چھٹات بہت گھبرائے ہوئے ہیں۔ میں سری لنگر میں کوئی انٹر جیل قتل پر نہیں مل سکا۔ خودی سے اور بھی تشویش تک قلمی قلم آئے تھے۔۔۔ میں نے سمجھی کہ قلمی قلم کا انداز قلمی قلم کا ہوا۔

مجھے اس بات نے ہر افراتفری کی لگ بھگ اسی موقع پر ٹیلی ویژن پر اذربائیجان میں نسلی بغاوت اور دہشت گردی کی خبریں دیکھیں کہ جہاں یہ تھے جن میں بڑے بڑے مجرموں کو، نوعی بلند کرتے دکھایا گیا تھا۔۔۔ "ہم آواز دی چاہتے ہیں، ہم شون بہانے سے گریز نہیں کریں گے۔ جابر مردہ باد۔ جنھوں نے ہمیں زنجیروں میں جکڑ کر حکومت کی غلط اندیشی اور بے مقصد کارکردگی کا انگریز کوئی ثبوت و کار ہو تو یہ کافی تھا۔ کشمیر، آذربائیجان اور دہشت گردانہ کے حالات میں کوئی مطابقت یا موازنہ نہیں تھا مگر اس بات کو ذہن نشین کر لینا چاہیے تھا کہ وادی کشمیر میں موجودہ حالات کے پیش نظر ان سے غلط اندازہ لگایا جاسکتا ہے اس کیلئے اس وقت کے وقت نے میرے اس تاثر کو بچھڑا کر دیا کہ دہشت گردی میں بی بی اور نوکر شاہی کے ارباب کو کشمیر کے حالات کے زیرِ سطح لہروں اور سرزمین پر حقائق کا بالکل اندازہ نہیں ہے۔

رات بھر میں سری لنگر میں افسروں کو قلمی قلم کر کے وہاں کے حالات کا اندازہ کرتا رہا۔ میں اس بات کو بھی یقینی بنا رہا تھا کہ بروقت اور مربوط کارروائی کی جائے مجھے ریاستی انتظامیہ کی بروقت کارروائی اور اس کے اثر پہنچنے کا بھی یقین نہیں تھا۔ اس بات کا احساس تھا کہ گورنر کو گورنر کے یوم ولادت سے قبل ۱۲ جنوری کو ہجرت میں ایک گھنٹے کے اندر اندر وہ افراد ہلاک کر دیے گئے کہ واقعہ یہ تھا کہ یہ مقام ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے دفتر سے پھوٹے فاصلے پر ہی تھا اور۔۔۔ گورنر ہونے سے قبل وقت اندازہ ہو سکتا تھا اور ابتدائی افساد کی کارروائی کی جاسکتی تھی۔ صبح ۸ بجے تک جہاں میں کمرے ہوئی اور سری لنگر تک جانے والی صبح کی پرواز سے قبل مجھے منہ کا ایک جھونکا ہوا۔

میرا جہاز سری لنگر ایرپورٹ پر اترا مگر اب یہ قدرے مختلف دکھائی دے رہا تھا۔ ہوا میں تازگی کا فقدان تھا۔ ایک افسر وہی ٹھنڈک کا طبع معلوم ہو رہا تھا افسروں کی جس گرم جوشی سے میں واقف تھا اب کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ غیر معمولی واقعات کے پیش نظر انھیں خود پر بھروسہ نہیں تھا یہاں تک کہ ان کے اشاروں پر بھی سکوت طاری ہو چکا تھا۔ دہشت گردی اور منہ زور اور انتظامیہ نے اپنا مشرثر ڈھکھا دیا تھا۔ ہر جنرل پولیس اور ادا اس دکھائی دے رہی تھی کشمیر پر جو المیہ غالب آچکا تھا اس کا اندازہ بھان ڈھنوں کی کھجنا تک خاموشی سے کیا جاسکتا ہے۔ جو خون و ہراس کے سبب مجھے دہشت اور دہشت سے مرچکے تھے۔

ایک لمحے کے بعد کاروں کا کارواں شہر کے اندر سے ہوتا ہوا راج بھون کی طرف روانہ ہوا۔ رولک کے ساتھ ساتھ لوگوں کے چھوٹے چھوٹے مکانات تھے اور ایرپورٹ روڈ پر چند کھانے کی کھلی ہوئی تھیں۔ ایرپورٹ پر چند افسروں نے مجھے کہا تھا کہ راستے پر مجھے ایک دو مقامات پر رکنا ہو گا جہاں لگ بھگ۔۔۔

دیہاتوں اور غریب علاقوں میں رہنے والے لوگوں نے اپنے مطالبات پیش کرنے۔ رعایتیں حاصل کرنے کا ایک نیا طریقہ ایجاد کر لیا تھا۔ وہ ان مطالبات کو اس یقین کے ساتھ پیش کرتے کہ انھیں منظور کر لیا جائے گا اور ان فیصلوں کو فوری طور پر ردیور عمل لانے کے لیے کارروائی کی جائے گی۔

مجھے بھی مجھے بازار کے ایک سیکے سے دو سیکے تک چلنے سے رغبت حاصل تھی۔ اسی بار میں میرے مزاج کو جانتے ہوئے اور فیصلہ میں میرے کام کرنے کے طریقے کو جانتے ہوئے مقامی پولیس کے چند افسروں نے ایس ایم ایچ ایس ہسپتال کے نزدیک میرے لیے سیدل چلنے کے عبوری انتظامات کیے تھے۔ انھوں نے سوچا تھا کہ ابتدا دوسرا نمبر گورنری شروع کرنے کا میرا یہی طریقہ ہوگا کہ میں شہر کے اندرون سے سفر کروں گا اور لوگوں کے دلوں میں راہ بنالوں گا مگر میرے اندر کی آواز نے مجھے کہا کہ اب حالات بدل چکے ہیں اور اس قسم کا اقدام انتہائی غیر اندیشہ اور قریباً خودکشی کے مترادف ہوگا۔ کئی شہر سنگ دلانہ دہشت گردی کا غلبہ ہے اور یہ حالات مجھے اس قسم کی پہل کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اس کے باقی اس بات کو جانتے تھے کہ شہر میں باری اور دہشت گردی کے جو قطع انہوں نے تیار کئے ہیں۔ اس قسم کے سیدل سفران میں شکات کر سکتے ہیں۔ چنانچہ میرا پہلا پیدل سفر میرا آخری سفر ہوگا۔ یہ نہ دیکھا کہ عوام کے ہجوم میرا انتظار کر رہے ہیں۔ پھر ہر ٹرک کی دوسری طرف ایک نصف کھلی دوکان سے گولیاں برسائی جانی تھیں۔

فروری پرست، بنیاد پرست، اور پاکستان نواز عناصر کے علاوہ سیاست اور افسر شاہی میں موجود منافذات خصوصی رکھنے والے عناصر کو ان کے اعمال کی قطعی کھل جانے کا خدشہ تھا اور انھوں نے اپنے طریقے سے مجھے ناکارہ اور بے عمل بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر مجھے اپنے کام میں جم جانے کے لیے چند دن مل گئے تو میں وہی شعور لوگوں کو اپنے گرد لے آؤں گا اور منصفانہ اور غیر جانبدار طریقوں سے ہی انڈینیشن کا دھماچہ کھڑا کروں گا۔ رشوت ستانی کے خلاف ایک مہم شروع کرنے کے علاوہ قریبی عمل کا ایک نیا طریقہ عمل شروع کروں گا جو اس خراب کاری اور اقتصادی بنیاد کو طامیت کر دے گا۔

میرا خیال ہے کہ داوی میں ناوابستہ ذہن کے لوگ میری تقریری پر خوش تھے انھوں نے سوچا کہ ۱۹۸۶ء کے خوشگوار دن واپس آسکتے ہیں۔ یہ وہی دن تھے جب انصاف تھا اور آدمی کی بہبود کے لیے بہتر ترقی کا عمل تھا اور ہندوستان کا خوب صورت چہرہ دکھائی دیتا تھا۔ جب عوام نے اس قابل دید ترقی کو دیکھا جس میں صاف اور کھلی سڑکیں، جمیلوں میں صاف و شفاف پانی، سرسبز شہر، جینٹلٹ اور دور افتادہ علاقوں اور شہروں کے نزدیک متعدد اسکول شامل تھے انھوں نے دیکھا کہ مرکزی امداد کے مناسب استعمال سے کیا ہو سکتا ہے۔ حقیقت میں عوام نے یہ سوال اٹھانا شروع کر دیا تھا کہ شیخ عبداللہ نے ان کے لیے کیا کیا ہے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ ان سماجی اور اقتصادی

مسائل کے پس پردہ مرکزی حکومت کی طرف سے مالی امداد کا فقدان نہیں بلکہ رشوت ستانی اور بھرتی

مگر پاکستان نواز عناصر اور دہشت گردی کی حامی طاقتوں کا اپنا ہی ایک منصوبہ تھا وہ لوگ انصاف اور ترقی ہندوستان کے صحت مند چہرے میں دل چسپی نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ اس کے برعکس وہ چاہتے تھے کہ جو شخص اپنی قصوری علامت تھا اور ۱۹۸۶ء تک کا رجحان واپس لا جایا تھا۔ اس کے پاؤں نہ چنے دیے جائیں۔ اس کی سادھ کو ختم کرنے کے لیے تمام تر ذرائع بروکے کار لائے جانے چاہئیں درحقیقت ان عناصر نے اس بات کو یقینی بنانے کی کوشش کی تھی کہ صدر راج یا گورنری راج نافذ ہو وہ چاہتے تھے کہ ریاست اپنے راستے سے ہٹ کر جائے، کوئی فیصلہ نہ لینے اور لا تعلقی کا دور جاری رہے۔ درحقیقت اس معاملے میں کوپک پلان میں لاکھ عمل کر لیا گیا تھا، اس میں کہا گیا تھا... "ایڈمنسٹریشن میں دراندازی کر کے اس کا حوصلہ سیت کر دو اور اقتدار کے تمام آلات میں تخریب پیدا کرو مگر اس حد تک نہ جاؤ کہ مرکزی مداخلت مطلوب ہو جائے۔" یہ قسمتی سے مرکزی حکومت نے فوری ایک بلان کی لاشوری طور پر ہو دی۔ اس نے مداخلت نہیں کی اور اقتدار کے تمام تر ڈھانچے میں تخریب کا رکی کو گھر کرنے دیا۔

اس صورت حال کا اس سے بھی بد قسمتی پہلو یہ تھا کہ کئی حالات کی سنگینی نوعیت کے قطع نظر ہر سیاسی جماعت اس سے اپنا الٹو سیدھا کرنا چاہتی تھی اور اس سلسلے کی کچھ نہ بھی کوشش نہ کی۔ میری تقریری کو تضاد کا مسئلہ بنایا گیا۔ بائیں بازو کی جماعتوں نے اس کی مخالفت کی۔ کانگریس (آئی) اور نیشنل کانفرنس (ایف) نے اس کی مخالفت کی اور مختار دل میں چند عناصر نے اس کی مخالفت کی۔ میں ان لوگوں کی ذمہ داری ملک کی بہبود کے لیے ان کی صدق دلی اور کئی میرے معاملے کو سلجھانے کے لیے اتفاق رائے کے معاملے میں ان کے نام نہاد امدادوں کو دیا دیا ہوں۔ میں دیوار کے ساتھ پیٹ لٹکے لڑا رہا تھا اور دوسری طرف سے یہ لوگ مجھ پر داد کر رہے تھے۔

میرے آنے سے قبل ایک اور واقعے نے صورت حال کو پیچیدہ بنا دیا۔ ۱۶ جنوری کو ڈاکٹر فاروق عبداللہ سری نگر پہنچے پولیس ہیڈ کوارٹر میں ایک ٹینٹنگ فکری اس ٹینٹنگ میں انھوں نے کہا کہ نیشنل فرنٹ حکومت اس بے عملی کا شدید نوٹس لے رہی ہے اور ان پر دباؤ ہے کہ مثبت نتائج دیکھ جائیں۔ جب چند افسروں نے بتایا کہ انھیں چند اقدامات کرنے کی اجازت نہیں دی جا رہی ہے تو ڈاکٹر فاروق عبداللہ غصے میں آ گئے۔ انھوں نے مقامی پولیس کو بالکل کورٹ قرار دیا۔ انھوں نے نئے ڈائریکٹر جنرل پولیس جے این سکینہ اور سی آر پی کے انسپکٹر جنرل جو گندرا سنگھ کو پہل کرنے کے لیے کہا۔ انھوں نے کہا کہ وہ ان علاقوں میں تلاشیوں عمل میں لائیں۔ جہاں سے دہشت گرد

نیم فوجی دستوں پر گولی چلاتے ہیں تو انہوں نے پول کے طمطراق میں کہا . . . ”جو آپ چاہتے ہیں کیجیے . . .“ ظاہراً انھوں نے یہ بات بلاسوچے سمجھے کہی اور مذہبی انھوں نے اس کاروائی کی تفصیلات معلوم کیں اور نہ اس سے پیدا ہونے والی بے چارہ گولیوں کو ملحوظ خاطر رکھا۔
اس گرامر کمیت میں ہونے والے بحث مباحثے کی بنا پر ڈاکٹر جنرل پولیس، انسپکٹر جنرل سی آر پی اور ایس ایس پی سرپرنگ نے ۲۰-۱۹ جنوری کی درمیانی شب کو چھوٹا بازار اور گورنر بازار علاقوں میں سی آر پی تعینات کی۔ میں نے ۱۹ جنوری کو قبول میں حلف رازداری اٹھایا، مجھے مذکورہ بالا معاملے کی کوئی اطلاع نہیں دی گئی۔

جب تلاشیوں عمل میں لائی گئیں تو ان کا رد عمل ہوا۔ ڈاکٹر فاروق عبدالرحیم جنھوں نے تذکرہ بالا فیصلہ لیا تھا، خفیہ طور پر اپنی جماعت کے لوگوں سے کہا کہ وہ عوام کو ان تلاشیوں کے خلاف اکٹھا کریں اس کا واحد مقصد تھا کہ نئے انتظامیہ کے لیے مسئلہ پیدا کیے جائیں جس نے گوشت شام ہی چارج سنبھالا تھا اس کے بچے درجہ کے حمایتوں کو مسجدوں میں دیکھا گیا جو تخریب کاروں کے دوست بنے ہوئے تھے اور اشتعال انگیز کردار نبھا رہے تھے۔

آپریشن سرج ۲۰۰۱ جنوری کی نوعیت سے یہ بات بالکل عیاں تھی کہ گورنر جنرل گھنٹوں کے قلیل عرصے کے دوران اس قسم کی کاروائی کا حکم نہیں دے سکتا تھا۔ جب اخبار نویسوں نے یہ حقائق ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے سامنے رکھے تو انھوں نے تکنیکی امور کا سہارا لے کر اپنے تحفظ کی کوشش کی۔ انھوں نے اخبار نویسوں سے کہا کہ وہ انھیں ان کے تحریری احکامات دکھائیں، اس طرح انھوں نے بے چارے ڈاکٹر جنرل پولیس انسپکٹر جنرل پولیس سی آر پی ایف اور ایس ایس پی کی پولیشن خراب کی۔

دل کے اندر سی اندر میں چاہتا تھا کہ کاش ڈاکٹر جنرل پولیس مڑ سکیں کھلے عام حقیقت کا اعلان کرتے اور ان تلاشیوں کی ذمہ داری قبول کرتے جو ان کے احکامات کے تحت عمل میں لائی گئی تھیں۔ اور مجھے اس بارے میں اطلاع ملے کہ نہیں دی گئی تھی یہ بات نہ صرف عوامی خدمات کے اعلیٰ قدروں کے عین مطابق ہوتی بلکہ میرے مخالفین کو میرے خلاف جھوٹا پروپیگنڈہ کرنے کا موقع ملتا۔ میں ان کا ہم نشا نہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اگر وہ ایک مرتبہ مجھے اپنے راستے سے ہٹا دیتے ہیں تو وہ اپنے منصوبوں میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اگر وہ اس فیصلے کی ذمہ داری لے لیتے جو کہ فاروق کے غصہ و احساسات متبادلوں کا نتیجہ تھا، تو بھی ہم ان کی پولیشن خراب نہ ہونے دیتے۔ افسوس کا مقام ہے کہ وہ خود میں اتنی اخلاقی جرات پیدا نہ کر سکے۔ اٹلی مندرلین کے میرے اپنے اصول مجھے اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ میں یہ بات کھلے عام کہوں کہ فیصلہ انھوں نے کیا ہے۔ یا یہ فاروق کے ناچیز ذہن کا نتیجہ ہے۔

بعد ازاں ان تلاشیوں کے بارے میں تحقیقات کرنے کے لیے میں نے مسٹر ویدواہ کو کہا۔ مسٹر ویدواہ

نے اپنی رپورٹ میں کہا:

”... ڈاکٹر جنرل آف پولیس مجھے زبانی طور پر بتایا کہ ان تلاشیوں کا منصوبہ اس سے قبل اس وقت کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے احکامات کے تحت تیار کیا گیا تھا۔ ڈی جی پی کی اطلاعات کے مطابق یہ تلاشیوں ان دہشت گردوں کو گرفتار کرنے کے لیے عمل میں لائی گئیں جو ان علاقوں میں روپوش تھے۔ تمام اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ دہشت گرد ابھی ٹرینیشن کے لیے تیار تھے اور وہ ریاستی حکومت کو حکم دے کر بند یونین سے اجاگہ آزادی کا اعلان کرنا چاہتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس تحریک کے لیڈروں نے تحقیقات کے مطالبے پر زور نہیں دیا ورنہ اس سے اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے . . .“

ملک کے سیاسی حالات پر میرے ذہن میں ایک برہمی کی کیفیت پیدا ہو چکی تھی اور اس بوجھل ذہن کے ساتھ میں راج بھون داخل ہوا۔ یہ بالکل خاموش اور تنہا دکھائی دے رہا تھا۔ بہر کیف ڈل جھیل کلاس ساکن نمونہ کی طرح یہ بھی تنہا تنہا محنت کا احساس لیے ایک پاسبان کی طرح کھڑا تھا اور میرے ذہن کے اندر موجزن طوفان کا آئینہ دار تھا۔

دفتر کا کہہ کر خستہ حالت میں تھا۔ بے عملی کے سبب میں مجھ پر معلوم ہو رہا تھا۔ ایک کونسل سے گویا ایک پھٹا پرانا صوفہ میری طرف دیکھ رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ تاریخ کا بھی ایک اپنا جواز ہے۔ یہ ایک اپنا موقع فراہم کرتا ہے۔ جو تو میں اس جواز سے بے بہرہ اس موقع کا فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھیں اس کا نتیجہ بھگتنا پڑتا ہے۔ اور لازماً مصیبت اٹھانا پڑتی ہے۔ میں نے اسکول کی تاریخ میں پڑھا تھا کہ کوئی اندھی دیوی دوسرے کے افسوس کو موافق نہیں کرتی ہے۔ میں آج تنہا — راج بھون میں کھڑا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا یہ مشاہدہ تئنا درست ہے۔ مگر افسوس اس بات کا ہے کہ دوسرے کے اندھ بننے کی وجہ سے مجھے بھی اندھیرے میں بھگتنا پڑ رہا ہے۔ ارد گرد دھوکے میں کھانا پڑ رہی ہیں اور راہ نجات دھونڈنا پڑ رہی ہے

دفتر کا مین نہایت بھدا معلوم ہو رہا تھا اس کی غیر تناسیب لمبی سطح نے مجھے کوفت پہنچائی۔ میری چھوٹی سی نوٹ بک کا اس پر کوئی تاثر نہیں ہو گا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں اس کرسی کی طرف چل دیا۔ جس پر پیٹل بھی بیٹھ چکا ہوں۔ میں ہمیشہ سیدھا صاف اور سخت ارادے والا دکھائی دیتا تھا مگر اس روز اس قدر مدنی تھی، اس قدر ادا سی کتنی کہ بھلی کے تقوّل کی مدد روشنی سے میری ادا سی ملاضمانہ ہو گیا۔ اور ریاست میں سیاسی اقتدار کی خلائی آئینہ دار معلوم ہو رہی تھی۔

... اوقات اس قدر تیز رفتاری سے گزر رہے تھے کہ صبح اگر دہشت نشہ ہوا تھا۔ خوف و

ہراس سے بھری آوازیں آرہی تھیں۔ ان میں جوش جنوں تھا، اہل کانفیڈنٹ اور اسلامی بنیاد پرست اصطلاحات سے پُر پابلیں تھیں۔ اجتماعات سے ملحقین کی جاری تھی کہ وہ مسجدوں میں جمع ہوں، دیہات شہر کے باہر اور شہر کے اندرونی حصوں کے عوام کو منظم کیا جا رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ شہر کی اتھارٹی کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ یہ سمجھتے ہوئے ناقابل یقین تھی۔ ڈاکٹر کیکر جنرل پولیس نے مجھے بتایا تھا کہ۔۔۔ ٹوپی الٹ پکڑ جنرل پولیس کو گھر سے اپنی ڈیوٹی تک پہنچانے میں چھ گھنٹے کا وقت لگا۔

میں اس تنہا مگر مالوس دھرتی پر خود کو نا اُمید محسوس کر رہا تھا۔ ایریپورٹ، وزٹ، پہاڑ، جھیلیں، بازار، دفتر، انفر اور لاج بھون سمجھی کی یکساں حالت تھی مگر کچھ بھی وہ مختلف معلوم ہو رہے تھے۔ گویا انھوں نے کچھ گھوڑا دیا ہے۔ وہ سب جس سے زندگی، رنگ اور مقصد حاصل ہوتا ہے۔ مزاج بدل چکا تھا۔ سبھی کو گویا ایک صدمہ سا ہوا ہے سبھی لوگ ہر سال کیفیت میں سرگوشیوں اور اشاروں سے باتیں کر رہے تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ کچھ اب پلٹ کر نہیں آئے گا مگر زندگی کا سفر جاری رہتا ہے اور موسم خزاں کے درختوں پر پہرہ کیفیت نئے جیسے نمودار ہوتے ہیں۔

اچانک اس شاعرانہ مزاج کی جگہ میرے اندر کے عملی ایل منسٹر بڑھ کر حقیقت پسندی جاگ اٹھی۔ کمرے کی خندہ بھٹک میرے مزاج میں اداسی نہیں لاسکتی۔ میں اپنی نشست سے اچھل پڑا۔ کیونکہ یہ گرم جوشی کا وقت تھا۔ میں نے خود سے کہا۔۔۔ مجھے حرکت میں لانا چاہیے۔ کشمیر نا جنگ کیے کھویا نہیں جاسکتا۔ جنگوں کی مرمت کی جانی ہوگی۔ یہیں کھینچنے غلوں سے کارروائی کرنی ہوگی اس ٹھنڈی دلواری کے ساتھ نشیت لگا کر جنگ شروع کرنا ہوگی۔ حکومت کی اتھارٹی کو قائم کرنا ہوگا۔ کشمیر کو دہشت گردوں، بنیاد پرستوں اور ان کے حامیوں کی دلدل میں پھینچنے نہیں دیا جائے گا۔ اعلیت کو قتل عام کے لیے نہیں بھجوا جاسکتا۔ میں نے سوچا کہ نشوونما کی مدد عملی دلی پر چھوڑ دینا چاہیے کیونکہ دہال پر برسرِ اقتدار لوگوں کی شاہد پر گہرائی اور سبائ کے حقیقی حالات کا علم ہوتا ہو۔ ان کو ملاقات جلد بازی میں موصول ہوتی ہیں۔ جو مفادات خصوصی رکھنے والوں کی طرف سے لوٹ موٹ کر بیان کی جاتی ہیں۔ اس بحران کی گفٹی میں یہاں لمحوں کی سرعت کے ساتھ فیصلہ لے کر ان پر عمل کرنا پڑتا ہے۔

میں نے اپنے مشیر وید مراد کے ساتھ بات کی اور کوہکما، شمالی کمان لیفٹیننٹ جنرل ایم اے زکی کو بلا دیا۔ ہم دونوں دفتر میں بیٹھے۔ میں نے کہا۔۔۔ ہمارے پاس ہنر مباح ہے کے لیے شاید ہی کوئی وقت بچا ہے۔ یہیں چند گھنٹوں کے اندر حرکت میں آنا ہے یا اس هجوم کے نزعے میں کٹنے کی اذیت اٹھانا ہے۔ وہاں گئے اور کارروائی جلدی شروع ہوگئی۔ اب تک کئی شخص برائے نام تھا مگر اب

اس کی پابندیوں پر سختی سے عمل ہونے لگا جو بھرا ہوا هجوم نئی پورہ میں ایس آئی ڈی سی آئی کے لکڑیوں کے زناہ پانی ملک نیک کاٹھ سیرنگل ۱۶۔ بھوہر کل جیسی علاقوں کو نذر آتش کر رہا تھا، منتشر کیا جاتا تھا۔۔۔ سیکیورٹی فورسز کو پول تلسی باٹھکا وکڈل، لال بازار اور صفحہ کل میں گولی چلائی گئی۔ بارہ فسادوں کو جان سے ہاتھ دھونا پڑے اور ہر سارے زخمی ہو گئے۔ دہشت گردوں اور ان کے پروفیکٹر اداروں نے پورے زور شور کے ساتھ افواہیں پھیلا کر شروع کر دیا۔ جبر و تشدد اور زیادتیوں کی من گھڑت داستانیں پھیلائی جانے لگیں کہ سینکڑوں افراد کو مارا جا رہا ہے۔ کسی بھی انسانی جان کی لمفی سے مجھے رنج ہوتا ہے۔ اور میں نے اپنی پہلی تقریر میں یہ بات واضح کر دی تھی کہ۔۔۔ ”جان اگر الکف کی جاتی ہے یا ب کی، یہ ہم سبھی کا خون ہے جو بہتا ہے۔۔۔“

بدقسمتی سے امور عام میں آپ کو کم فلت کا سہارا لینا پڑتا ہے اور حالات ہمیشہ اسی سمت نہیں جلتے جیسا کہ آپ کی خواہش ہوتی ہے۔ دفتر میں بیٹھے ہوئے آپ توقع کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے کہ جس قدر طاقت کا استعمال کیا گیا، آیا کہ وہ حقیقتاً زیادہ تھی۔ ان معاملات میں انصاف حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ آپ کے سامنے حالات کی دوزخ و دین ہوں گی اور جس قسم کے حالات کشمیر میں رونما تھے، ان میں عوام میں سے کوئی بھی شخص اس بات کے سوائے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ جو دہشت گرد اس سے کہلوانا چاہتے تھے۔ یہاں تک کہ دوسرے جگہ کر رہے تھے کہ اس کا مطالبہ یقینی موت تھا۔

یہاں تک کہ سب سے زیادہ انسانیت پسند اور ذی شعور ایل منسٹر کشمیر کو بھی بعض اوقات کڑی دوا کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اور کسی خاص صورت حال سے کس طریقے سے نمٹنا جانا ہے اس بات کا فیصلہ صرف موقع پر موجود افسر ہی کر سکتا ہے اور جب تک وہ جائز طریقے سے عمل کرتا ہے اس کی پرکھنے کی صلاحیت پر عام حالات میں آنکلی نہیں اٹھائی جاسکتی۔

شام تک شہر میں سکون بحال ہو چکا تھا۔ نظم و نسق بحال ہو چکا تھا۔ کرفیو پابندیوں کا پاس کیا جانے لگا تھا۔ آگ زنی کی کارروائی بلا روک ٹوک نہیں کی جاسکتی تھی۔ آزادی اور پاکستان کے حمایتی لوگوں کے گھر کے کشمیر کو نکالنے کے لیے پستی موٹر کارروائی ہونا تھی۔ اور اس دوران کا ایک اہم ایکٹ جو ۲۶ جنوری کو مرتکب ہوا تھا اسے روک لیا گیا تھا۔ رات کے وقت بستر پر لیٹے ہوئے میں دن بھر کے واقعات کو ان کے پس منظر میں دہرا رہا تھا۔ انسانوں کو لگنے والے زخم سے مجھے ہمیشہ تکلیف پہنچتی ہے۔ انسانی درد، انسانی کرب مجھے ہمیشہ جھنجھوڑتا رہا ہے۔

مجھے ان لوگوں پر ریس آتا ہے جن کا ذہن بہرہ ہوتا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں پہلا کام کنوڑیک ایک ریٹ باؤس میں بیٹھا ہوا۔۔۔ لارڈ کی لہروں کا اچھلتا گرتا تھاگ

پیدا کرنا اور پھر بہت زیادہ اچھلنے کا منظر دیکھ رہا تھا اور ساتھ ہی گرجا سفر کے آئینہ مرسلے کے انتظار میں تھا۔ اسی وقت رٹائرڈ فوجی افسروں کا ایک گروپ میرے پاس آیا۔ اول انھوں نے اس ندی سے ٹراوٹ مچھلی کا شکار کرنے کے لیے میری روزمرہ کی امداد طلب کی۔ میں نے اپنے ملازموں سے کہا کہ وہ ان کی مدد کریں۔ افسر خوش ہو کر چلے گئے کیونکہ انھیں شکار میں شائد مچھلیاں حاصل ہونے کی توقع تھی۔ میں سوچ میں گم لہر نہ توکتا رہا مگر میرے اندر کا دل ولولہ ختم ہو چکا تھا۔ اب میری توجہ ہٹ چکی تھی۔ میں اس مچھلی کے نصیب کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ خزانہ فیروں کو مچھلی پکڑنے کے اس کھیل سے کون سی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ کیا ان لوگوں کو پتہ نہیں کہ جب ماہی گیسہ کا کاٹا نرم گوشت میں چھتا ہے تو اسے کتنی اذیت ہوتی ہے کیا وہ اس گرم اور گھلاؤن کو نہیں دیکھتے ان کے جسم سے بہہ کر اس صاف شفاف ندی میں تحلیل ہو جاتا ہے اور اس کا نشان ملک نہیں رہتا؟ کیا انھیں وہ اذیت محسوس نہیں ہوتی جو ایک ٹراوٹ مچھلی کو اس وقت ہوتی ہے جب اسے پانی سے باہر نکالا جاتا ہے اور یہ دم توڑ دینے ہے کیا تب اس کی زندگی کی آخری کروٹ سے ان کا دل نہیں ہلکا؟ مگر اس وقت میری ذہنی کیفیت مختلف تھی۔ یہ ندی، ٹراوٹ اور اس کا نرم گوشت، ندی میں بہتا ہوا اس کا گرم سیاہ خون، اس کا مجھ درد اور اس کی آخری کروٹ، سانس لینے کے لیے اس کی تنگ و دود اور پھر سالت ہو جانا، اس وقت کوئی وقعت نہیں رکھتا تھا۔ آج جس چیز کی وقعت تھی وہ تھا نظم و نسق، اتھارٹی، کھالی اور ملک کی سالمیت، اس معاملے میں مجھے جو تنگ و شبہات تھے وہ جلد ہی دور ہو گئے۔ کسی نہ کسی کو اس عظیم نقصانات کو روکنا ٹارگے کا۔ کسی نہ کسی کو لہ کا وجود بچانا ٹارگے کا۔ اور جن لوگوں کے پاس کلائفونڈ بن دقین تھیں وہ قدرتی طور پر مچھلیاں نہیں تھے جنھیں ماہی گیر پھنسا نا چاہتے ہیں وہ خوبی بے رحم لوگ تھے جو انسانی خون کے پیاسے تھے اور وہ حقیقی طور پر خطا دار وہ لوگ تھے جنھوں نے سخت انتہات کے باوجود اس قسم کے حالات کو نشوونما دینے دی۔

اب کافی دیر ہو رہی تھی۔۔۔۔۔ مجھے ٹھوڑے وقت کیلئے بند کر لینی چاہیے۔۔۔ میں نے خود سے کہا۔ ان تکلیف دہ خیالات سے اپنے ذہن کو بوجھل بنانے سے کیا حاصل، اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ میں نے سوچا کہ تازہ ہوا کے جھونکوں سے بینڈ آجائے گی۔ میں اپنے بستر سے اٹھا اور اس کھڑکی کو کھول دیا تو میرے اُس ڈی سی نے سیکورٹی کے نکتہ نظر سے بند کر دی تھی۔ اس رات ہوا ساکن تھی پھر بھی میں نے محسوس کیا کہ ایک پرسکون ہوا کا جھونکا میرے چہرے کو چھو رہا تھا۔ اس میں انا ایک بیٹھا تھا۔

گرج رہا تھا جمیل سے یا ایک فاصلے پر شکر چارہ کی پہاڑی تھی جو ہماری اندرونی قوت کی

علا مت ہے۔ ایک آتش فشاں قوت جو چٹان کے اندر سیر ہو چکی ہے جس اس فرد کا نام ثبت ہے۔ جس جو ہمارے تمدنی اتحاد کا محرک ہے۔ ایک دیوبیکہ شخصیت کی طرح پر جود سوں صدی میں کنہا اکرادی سے ملتی مادر خدا کی کے کنول کے پاؤں کشمیر تک پہنچے جو ہندوستان کا تاج ہے وہ اس ہما فزی کے ایک پھول سے مندر پر رستش کے لیے جڑ پکڑے جو ۱۶۲۹ اور ۱۶۵۶ قبل مسیح کے دور آئن وجود میں آیا اور تب عبادت کے لیے اڑنا تھ کی مقدس گھیا کی جانب چلے گئے۔ ہماری اندرونی قوت کے ہماری لیڈر شپ کے لیے کیا کوئی معنی تھے ہا کیا انھیں اس بات کا احساس تھا کہ ہندوستان کو آج ایک جوڑنے والی طاقت کی ضرورت ہے۔ ایک اور تمدنی احیاء کو کی ضرورت ہے، ایک سماجی اور اخلاقی نظریے کی ضرورت ہے جو روال اور انتشار کی طاقتوں کے خلاف شکر چاریہ چٹان کی طرح کھڑی ہے۔

میں نے اپنے باپ جان بھل جاتی روشنی کی طرف دیکھنے کے لیے سود کو شیش کی جوہری محل کے کھنڈروں کی تیز روشنیوں کے راج بھوں کی طرف اڑی تھی۔ پری محل کو ایک دارالعلوم کے طور پر وارد شکوہ نے ایک کتب خانے کی صورت میں تعمیر کیا تھا۔ دارالعلومہ مغلیہ تاریخ کا نہایت عالم، نہایت باشعور اور بے حد اہم شخصیت تھی۔ یہاں اپنے استاد ملا شاہ کی پری میں انھوں نے کشمیری سنتوں اور صوفیوں کے ساتھ مذہبی امور پر تبادلہ خیالات کیا۔ اس نے ایک نیا فلسفہ دھونڈ نکالا جو کتابوں، محمد بکر اور سراسر اہل کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔ ان کتابوں میں یہ لکھا ہے کہ ۱۰۰ HIDDEN BOOK قرآن پاک یا پینشد ہوں بھی کی یہی تعلیم ہے کہ "اتحاد کی برکت" ہے مگر اب وہ لوگ ایک حقیقت کے کھنڈرات پر روشنی کی اجوت نہیں دیتے تھے۔ جنہیں واوی ایک طنز پر ڈال کر میں کی گئی ہے۔

یہاں ٹول کے ارد گرد وشتوں کا بیڑہ اپنی سنگلاخ اور المناک فطرتوں سے گھورتا معلوم ہوتا۔ رشوت ستانی ننگا گویا ان کی زندگی کو لوٹ لیا تھا۔ تباہ کاروں نے اپنی حریفانہ حرکتوں کے سلب ان کے موٹے اور لمبے بالوں کو نوچ لیا۔ دوسرے کونے میں دل بھیل کے کنارے ایک ہوٹل کی عمارت تعمیر ہو رہی تھی جو اپنا غلغلہ اور گندہ مواد بھیل کی ابھرتی ہوئی سطح پر خالی کر رہی تھی۔

+ ماہرین ارضیات کے مطابق یہ پہاڑی ایک بے حس آتش فشاں ہے جو ۴۰ لاکھ برس قبل سردکسے ٹھنڈا ہوا۔

++ یہ اصطلاح مشہور تامل شاعر سہاسنم ہارتی نے استعمال کی ہے۔ ++ ۱۳۶۰ قبل مسیح میں گوبادیتھ نے اس مندر کی ممرت کی۔ بدوا زمان سلطان ترین العابدین نے (۱۳۲۱ء) ۱۳۷۲ عیسوی سکدریان نے اس کی مرمت کی۔ ++ شہزادہ دلاشکوہ نے ۵۱۹۳ اور ۱۶۵۴ میں کتبیں یہ کیا۔

میری روح میں خلش محسوس ہو رہی تھی۔ ہماری وراثت میں جو چیز بھی تھی اسے ذبح کیا جا رہا ہے۔ میں نے سوچا کہ اس کھر کی نے بے دھوکہ دیا ہے، میرے اعصاب کو آرام پہنچانے کے بجائے اس نے میرے اندر کو جھنجھوڑ دیا ہے۔ اپنے اضطراب کی وجہ سے ایک مرتبہ پھر میرے اندر انقلاب چل چکا تھی۔ میں نے جھیل پر نظر دوڑائی یہ سائن بے جان اور خاموش تھی۔

کیا اس ناقابل تلافی صورت حال سے نکلنے کا کوئی راستہ ہے۔ قدرتی ہے کہ میں جھوٹوں سے بھری اس وادی میں تنگے پاؤں نہیں چل سکتا تھا جہاں دہشت گردی کی بیرونی طاقتوں نے اقتدار نصیب کرنے کے لیے یونین کی تخریب کی سازش کی تھی۔ مجھے سبھی ہنگامی حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے پورے طور پر تیار ہونا ہو گا۔ میں کسی بھی چیز کو اتفاق کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ ایک ذرا سی غرضش کا مطالبہ تناسل ہو گا یا بلیو اسٹار کا ساخہ ہو گا یا اسکی نتیجہ مذہب پر مبنی ریاست کا یا ضابطہ اعلان کی صورت میں ہو گا جس میں بین الاقوامی سطح پر ہماری پوزیشن خراب ہو گی۔ گوشتہ شام میں نے جھوٹا باندار علاقے سے ایک وفد کو دعوت دے کر بلایا تھا۔ بیس افراد کے ساتھ ملاقات کے لیے آئے۔ ان میں سے نصف قدامتوں کی تھی۔ انھوں نے اسلمان شدہ نئے لاکھ کر دار کے مطابق "چودار" نہیں رکھتے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر بات حیرت اوسط عمر کی ایک عورت نے کی جو قابل استانی تھی وہ بہت ہوشیار تھی۔ اور نیپالی زبان میں بات کرتی رہی وہ گفتگو دوران انگریزی اور اردو دونوں زبانوں کے الفاظ کا استعمال کر رہی تھی۔ اس نے مجھے یاد دلایا کہ ۱۹۸۶ء میں گورنری راج کے دوران اس گجنان آباد اور گندے علاقے میں وفود سے مل چکا تھا اور اب بھی وہاں مجھے پرمکمل اعتماد حاصل ہے۔ اس نے شکایت کی کہ پولیس نے ان کے ساتھ نا انصافی اور زیادتی کی ہے۔

وہ میں شامل افراد نے میری اس بات پر تعین کر لیا کہ جو کچھ بھی ہوا مجھے اس کا قطعی علم نہیں تھا اور ان ملاشیوں کے بارے میں فیصلہ پہلے ہی لیا جا چکا تھا۔ ان سے ملاقات سے قبل میں نے ڈاکٹر جنرل پولیس اور انسپکٹر جنرل پولیس سے آدنی سے حقائق کا پتہ لگایا تھا۔ اور چھ نوجوانوں کے سوائے جن کے بارے میں کافی شہادت ہونے کا دعویٰ تھا، کو رہا کرنے کا حکم صادر کر دیا تھا۔ میں نے اراکین وفد کو تعین دلا دیا کہ باقی چھ افراد کے معاملوں پر آئندہ ایک دو گھنٹوں کے دوران فیصلہ کر لیا جائے گا۔ اراکین وفد چلے گئے۔ وہ کافی حد تک مطمئن تھے مگر ایس پی اور بی آدنی کے مقامی عمل کے خلاف وہ تنازعہ الفاظ استعمال کرتے رہے۔ میں نے سوچا کہ عوام کے ساتھ منصفی رابطہ اب بھی قائم کیا جا سکتا ہے۔

جنگلی اور انھیں غلط راہ ترک کرنے کی تلقین کی۔ ان میں سے دو چھوٹے چھوٹے کرورٹسے انھوں نے بتایا کہ پولیس اور دہشت گرد دونوں طرف سے انھیں ہراساں اور ریلٹ ان کیا جا رہا ہے۔ وہ غریب لوگ ہیں اور ان کی آمدن پوری طرح متاثر ہوئی ہے۔ میں نے ان کی فوری طور پر رہائی کا حکم دیا اور سبھی بچے نوجوانوں کو میں نے کچھ گرم کپڑے بتایا کیے۔

میں نے سوچا کہ بہرہ رزی کے جس جذبے کا اظہار میں نے ان نوجوانوں کا ساتھ کیا ہے اس سخت اور دوستی کا میرا پیغام عوام تک پہنچ جائے گا اور اس سے چھوٹا باندار اور اس کے نواحی علاقوں میں اشارات مل جائیں گے بالکل ویسا ہی ہوا، مگر یہ صورت حال صرف ایک مختصر عرصے تک رہی۔ میں جس بات کا مقابلہ نہیں کر سکا۔ وہ دہشت گردوں اور ان کے حواریوں کی طرف سے اپنی مجموعی حکمت عملی کے طور پر شروع کی گئی اور جھوٹے پتے چاکر کی ہم تھی۔ انھوں نے ہر اس شخص کو جان سے مار ڈالنے کی دھمکی دی جو ترقی اور صفائی کے معاملے میں پہلے گئے میرے کاموں کا تذکرہ تک کرے گا۔ فاروق عہد میں جن لوگوں کو فائدہ پہنچا تھا انھوں نے بھی اپنے مکر وہ انداز میں فلاحی پھیلانے۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرے سامنے بچہ قتل کی ایک بلند قامت دیوار ہے، جس کی بنیادوں میں دہشت گردی اور جھوٹے پروپیگنڈہ کا عنصر موجود ہے۔

اس بات کا احساس کر کے کہ ہم تہذیبی اور اس کے آس پاس کیا ہونے جا رہا ہے میں نے اپنے کام کی رفتار کو تیز کر دیا۔ جہاں تک ممکن ہو سکا میں نے زیادہ سے زیادہ لوگوں کے ساتھ ملاقات کی اور حالات پر جس قدر ممکن ہو سکا میں نے مقامی افسروں کے ساتھ تہاد لہ خیالات کیا میں نے صدق دلی کے ساتھ اپنا دل کھول دیا اور غیر سنجیدہ لوگوں کو ڈر دکھا۔

مجھے اس بات کا قطعی شک نہیں رہا کہ تخریب کاری کی ایک مکر وہ سازش تیار کر لی گئی ہے اور اس کا آخری بلکہ ۲۰ جنوری کو بولول جائے گا جو کہ اتفاقاً جمعہ تھا۔ عید گاہ میں دس لاکھ لوگوں کا اجتماع منصوبہ تیار کیا گیا تھا۔ شہر کے اندر مسجدوں میں نصب لاؤڈ اسپیکروں سے ان لوگوں سے تلقین کی جائے گی کہ وہ جھوٹے چھوٹے گروہوں کی صورت میں عید گاہ روانہ ہوں۔ اس کے ساتھ ہی لوگوں کے جھنڈے جھنڈے بیرونی علاقوں سے بھی وہاں پہنچیں گے۔ نواحی علاقوں سے نقل و حرکت، لیسوں اور نچی گاڑیوں کو عمل میں لا جائے گا اور پورے ترک و احتشام کے ساتھ نماز ادا کی جائے گی۔ آنا دی کے نعرے بلند کیے جائیں گے۔ دہشت گرد ہوا میں گویاں داغیں گے۔ پھر چانک اندین یونین کے قومی جھنڈے کھلاستی طور پر نذر کش کیا جائے گا۔ اور اسلامی جمہوریہ کا پرچم بلند کیا جائے گا۔ ان واقعات کی اطلاعات فراہم کرنے اور تصویریں آنانے کے لیے بیرونی ملک کے فوٹو گرافر اور نامہ نگار بھی موجود ہوں گے۔

نقل و حرکت کی اجازت دے دے گی۔ اور بے عملی کے گزشتہ رجحان کے پیش نظر مفتیلین نے اس بات کا بھی اعلازہ کیا تھا کہ حکومت اس میں دخل نہیں دے گی۔ سول افراد اور لیڈر جموں میں سلامی لینے میں مصروف ہوا گئے۔ اور مقامی افسر کارروائی نہیں کریں گے۔ اور جیسے ہی نیا پرچم بلند ہوگا انھیں بھی ساتھ کھڑا کرنے کے لیے مجبور کیا جاسکتا ہے۔ اگر ضروری ہو، تو مدد کرنے کے لیے چند پولیس افسر بھی موجود ہوں گے۔

جن لوگوں نے یہ اکتیو تیار کی تھی انھوں نے تمام تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ انھوں نے اس منصوبے کو نہایت مینڈا راز میں رکھا تھا اور آخری لمحوں میں وہ اچانک کارروائی کرنا چاہتے تھے صرف انھوں نے اس بات کا اعلازہ نہیں کیا تھا کہ اب فاروق حکومت موجود نہیں تھی۔ ۱۴ اگست ۱۹۸۹ء کو حکومت نے دہشت گردوں کو سلامی لینے کی اجازت لگ بھگ دے دی تھی۔ مگر اب میری تقریر کی صورت میں ایک نیا پہلو جنم لے چکا تھا۔ مفتیلین نے اس پہلو پر غور تو کیا تھا مگر بعد ازاں معلوم ہوا کہ انھیں اس میں تکمیل حاصل نہیں ہوئی تھی۔ اول تو انھوں نے سوچا تھا کہ مجھے اس ساری سازش کا پتہ نہیں چلے گا۔ اور اگر مجھے اس کی پتہ بھی جاتی ہے تو مجھے اس حکمت عملی کو ناکام بنانے اور اسے کامیابی سے روک کر عمل لانے کا موقعہ تک نہیں ملے گا۔ بہر کیف میں نے سوچا کہ میں کیا کر سکتا ہوں؟ دس لاکھ لوگوں کے ہجوم کو منتشر کرنے کے لیے فوج یا فوجی دستے طلب کروں۔ تنہا من چوک یا بلیواٹار جیسی کارروائی کروں اور اس طرح اس مقصد کو پورا کروں جو دہشت گرد پر چارے سے ان کے توی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اگر دس لاکھ لوگ عید گاہ میں بیٹھ جاتے ہیں اور جانے سے انکار کر دیتے ہیں تو فوج کو بھی کیا سکتی تھی۔ دریں اثنا میں اپنے ٹوٹے پھوٹے آلات سے کام لیتا گیا اور اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے چند نئے لوگ بھی لائے گئے ہیں۔ ایک وسیع حرکت عملی پر غور کر لیا تھا۔ یہ پالیسی تھی کہ عرصے میں کم از کم جانوں کی غمی سے زیادہ سے زیادہ نتائج حاصل کیے جائیں۔

۲۶ جنوری سے قبل سنگین ترین صورت حال پیدا کرنے کے مقصد سے طے شدہ افواہ پھیلا دی گئیں کہ نیم فوجی دستوں نے جموں کشمیر پولیس کے چار نو جوانوں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا ہے۔ جموں کشمیر پولیس اور اشتعال و ہنگام اور ان کے ایجنٹ ایک جٹ پوکریہ کام کر رہے تھے ان کی سازش تھی کہ ۲۶ جنوری کے قبل یا ۲۶ جنوری کے روز ہی ایک مکمل غدر کی حالت پیدا کی جائے۔ ہم نے بہت نہیں باری۔ میں نے فوری طور پر اپنے خیر فکری کو دائر میکرو جنرل پولیس کے ہاں مامور کیا تاکہ کوئی کارروائی نہ ہو۔ اور اسی اثنا میں پولیس والوں کے ساتھ کوئی گفت و شنید شروع کی جائے۔ یہ بھی تجویز تھی کہ جن لوگوں کو شکایت ہے وہ گورنر کے ساتھ ملاقات بھی کر سکتے ہیں۔ دریں اثنا فوج کا

فوری کارروائی کر کے جے اینڈ کے آرڈر پولیس کے ہتھیار چھین لے گی۔ اس کے ساتھ ہی پولیس اسٹیشن تک سنٹرل ریزرو پولیس کے دستے روانہ کیے گئے تھے۔ ان اقدامات کا فوری اثر ہوا اور خیر سب کاروں اور سازشیوں کے منصوبے ناکام ہو گئے۔

۲۴ جنوری کی شام کو مجھے ڈویژنل کمشنر جلیل خان کی طرف سے اطلاع موصول ہوئی کہ کالی لیڈر سمرن جیت سنگھ مان اسٹیٹ گیٹ ہاؤس میں آیا ہے اور اسے خود کے لیے اور اپنے مسلح باڈی گارڈوں کے لیے جائے رہائش درکار ہے۔ بہر کیف جائے رہائش فراہم کرنا لازمی تھا کیونکہ یہ شناخت کی کا تقاضا تھا۔ منظر جلیل نے مجھے اطلاع دی کہ مان میرے ساتھ ملنا چاہتے ہیں۔ مسٹر مان نے کسی کو بھی پیشگی اطلاع نہیں دی اور نہ ہی ان کی مجتوزہ آمد کی کسی سرغرضانہ غیبی نے اطلاع دی تھی ریاستی سرغرضانہ مشینری کی یہ حالت ہو چکی تھی۔ مسٹر مان کی آمد نے مجھے بالکل سکتے میں ڈال دیا۔

مسٹر مان بلا کسی اطلاع کے سری نگر کیوں آئے ہیں؟ جب میں ان تمام باتوں کا جائزہ اپنے ذہن میں لے رہا تھا اور اپنے افسروں کے ساتھ اس بارے میں تبادلہ خیال کر رہا تھا کہ انسپکٹر جنرل آف پولیس (سی آئی ڈی) امرکپور نے مجھے ٹیلی فون پر یہ اطلاع دی کہ مان نے براؤڈ دے ہوٹل میں غیر ملکی نامہ نگاروں کے ساتھ بات چیت کی انھوں نے ریاستی حکومت کو انتباہ کیا ہے کہ دوسرے "بلیو اشار" کا کوئی کھیل نہ کھیلا جائے۔ اس بیان نے مسٹر مان کے دورے کا راز اور بھی گہرا کر دیا۔

اس غم سے کے دوران اطلاع موصول ہوئی کہ ڈاکٹر فاروق عبداللہ جموں سے سری نگر آ رہے ہیں اور وہ ایریو پلٹ اور اپنی رہائش گاہ پر چند سہولتیں چاہتے ہیں۔ یہ سہولتیں تو بہر کیف دی جانی تھیں مگر ظاہر یہاں کے موجودہ حالات میں ان کے یہاں آنے کی کوئی مجبوری نہیں تھی۔ انھیں اس بات کا احساس نہیں تھا کہ ان کی موجودگی سے حفاظتی مشینری پر مزید بوجھ پڑے گا، یا ان کی آمد کا مقصد خود سے مختلف تھا۔ انھوں نے اس موقع کا انتخاب کیوں کیا؟ پہلے ہیوں نہیں آئے؟ دراصل ان پر یہ الزام لگایا جاسکتا تھا کہ اپنے عہد اقتدار میں وہ آرام کے ساتھ جموں میں بیٹھے رہے۔

اگلی صبح سمرن جیت سنگھ مان میرے ساتھ ملاقات کے لیے آئے۔ میرے ساتھ ان کی بات چیت بے ربط اور بے مقصد تھی۔ ابھی مسٹر مان میرے ساتھ باتیں کر رہے تھے کہ مجھے ایک ضروری دائر لیس پیغام موصول ہوا۔ سکواڈرن لیڈر روکنہ سمیت ائی اے ایف کے چار افسروں کو دہشت گردوں نے اس وقت گولی مار کر ہلاک کر دیا جب وہ راوی پور میں اڈے پر گاڑی کا انتظار کر رہے تھے۔ اس سفاکانہ جرم سے مجھے صدمہ ہوا۔ میں نے فون لٹا دیا اور اس علاقے کی زبردست تلاشی کا حکم دیا۔ مسٹر مان کا فوری مشورہ تھا کہ مجھے بلاشبہ جموں کا حکم نہیں دینا چاہیے۔ انھوں نے کہا "اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا"۔

آئندہ پانچ منٹ سے اب مسٹر مان وہاں سے چل دیے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ لابی قیام گاہ۔ لیریٹ

تھا کہ یوم جمہوریہ کے موقع پر کر فیو لگا یا نہیں جاسکتا۔ اور اگر لگا یا بھی جاتا ہے تو گنڈنڈا لگانا بھی
مگر کام کے کرنے اور ہر اس نکتے پر جہاں سے مذکور نالے نکل کر پڑوں کی صورت اختیار کرتے ہیں پر پولیس اور فوجی
دستے قیغات کرنے سے تحریک کاروں اور ان فوجی دستے قیغات کرنے سے تحریک کاروں اور ان کے حامیوں
کے منصوبے چو پٹ ہو گئے۔

ایڈمنسٹریشن اپنے کام سے کام رکھتی تھی۔ عوام کو یہ بات سمجھ میں آگئی۔ البتہ لاڈ
اسپیکروں پر شور مچا۔ اور عوام کو اپنے گھر وں سے باہر نکلنے کی تلقین کی گئی مگر اس کا بہت
کم اثر ہوا۔ نئی طور پر صورت حال بدل چکی تھی۔ اب دہشت گردوں کو اپنے حامیوں کا پیغام
مل چکا تھا۔ کہ وہ کچھ نہیں کر سکتے مجبور ہیں۔ دہشت گردی کو اب کھیل نہیں سمجھا جاسکتا تھا۔
تخریب کاری کی کوشش کے لیے اب انہیں قیمت اور گناہ دے دی گئی۔

نفسیاتی اور عملی محاذ پر یہ جاری پہلی کامرا فی تھی۔ تیز لہروں کو پیدا ہی نہیں ہونے
دیا گیا تھی چھوٹی چھوٹی ندیوں کو ان کے مسجدوں ہی کے نزدیک بند کر دیا گیا تھا۔
رات کے وقت تمام سرکاری عمارتوں پر چراغوں اور بازاروں کی روشنیوں جلانے رکھنے کے
لیے خاص انتظامات کیے گئے تھے۔ دہشت گردوں نے عوام کو ہدایات جاری کی تھیں کہ شہر میں
بلنک آؤٹ رکھا جائے۔ سرکاری عمارتوں پر چراغوں نہ ہونے دیا جائے۔ اور بازاروں کی روشنی
کو جلنے نہ دیا جائے۔ انہوں نے بجلی گھروں اور برقی سب سیشنوں کو آڑا دینے کی دھمکی دی تھی
مگر وہ اپنی جالوں میں کامیاب نہ ہو سکے۔

شام کے وقت میں اپنے دفتر سے باہر آیا تھا کہ شہر کی ایک جھلک دیکھ سکوں۔ بہت ساری
روشنیاں جل رہی تھیں اور کئی بازاروں کی روشنیاں تیزی سے جھلک رہی تھیں۔ سرکاری
عمارتوں پر چراغوں تھا۔ درحقیقت سری نگر میں اس رات کو جو روشنی کی کمی پہلے بھی نہیں ہوئی
ریکارڈ کی خاطر میں نے چند اہم علاقوں کے فوٹو اتروا لیے تھے میں نے محسوس کیا کہ میرے اندر امید
کی ایک نئی شمع روشن ہوئی ہے۔ حکمہ بجلی تعینات عامہ، سری نگر میونسپلٹی اور دیگر عوامی اداروں
کو جاری کی گئی میری ہدایات کی پابندی ہوئی تھی۔ آپ اسے خوف بھیجے مگر اتھارٹی کے لیے احترام
نے اپنا تاثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔

اس سے پہلے نہاد مقبول حکومتوں کے دور میں یوم جمہوریہ اور آزادی کے دنوں بلنک آؤٹ رکھنے کا طریقہ عام تھا مگر
سے کیا۔ اس معاملے میں جس بات سے مجھے اچھا لگا تھا وہ یہ تھی کہ شہر میں عمارتوں بلنک
آؤٹ کھیل تلفوں کے لیے کیا کرتے تھے اس سے انہیں مزہ آتا تھا۔ اور اس عہد کی حکومتیں اس کو
سنجیدگی سے نہیں لیتی تھیں یہاں تک کہ چند سرکاری اہلکار بھی ان واقعات سے اندر ہی اندر خوش

ہوتے اس کے نتیجے میں ان برسوں کے دوران نوجوانوں کا طریقہ بن چکا تھا کہ وہ ہندو لڑا طاقوں
کو پریشان کریں اور اس عمل سے وسیع پیمانے پر حاصل کریں۔ قوت برواشت کو بڑی سمجھا جانے لگا تھا۔
اس لیے عملی طور پر منظر اور ایڈمنسٹریشن کی ان دیکھی کو حوصلہ افزائی کا اشارہ سمجھا جانے لگا تھا اور
اسی طرح عادی بن جاتی ہیں۔ حکام کی پرہیز کرنے کا رجحان اپنی جڑیں گہری کر چکا تھا۔

۱۶ جنوری ۱۹۹۰ء کے بعد مجھے پہلی مرتبہ اس رات گہری نیند حاصل ہوئی تھی۔ میں نے اپنے بستر
میں گرمی محسوس کی جو اس سے قبل نیند سنا لگتا تھا مگر یہ ابتداء کی امید دیر پا ثابت نہیں ہوئی۔
ایک ہفتے کے تناؤ اور خدشات کے بعد ۲۲ جنوری کو جب میں خود کو قدرے بے فکر اور مضبوط محسوس کر
رہا تھا کہ میری بیٹی پر چارواک کیا گیا۔ مقامی اخبارات سے مجھے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر فاروق عبد اللہ کو گرفت و
شدید کے لیے دلی لے جایا گیا ہے اور ظاہر ہے بات اعلیٰ حکام کی ہدایت کے تحت ہوئی۔ انٹلی جنس
بورو کے فارسیج مشر جو شہر واقعات اور حالات کا جائزہ لینے کے لیے خاص موانی جہاز میں سری نگر
آئے اور اگلی صبح جیل کے لیے پرواز کر گئے۔ انہوں نے مجھے سری نگر یا جیلوں آنے کے لیے مقصد کے بارے
میں نہیں بتایا اور فاقی اور شیعہ کو دلی لے جانے کے بارے میں مجھے نہیں بتایا۔ یہ سب اخبارات سے معلوم
ہوا کہ وہ بات حقیقت کے نیچے گئے ہیں۔

مجھے اس بارے میں بتایا کہ میں نہیں گیا ۹۔۰۰۔ میرے ساتھ اس بارے میں مشورہ کیوں
نہیں کیا گیا کہ اعلیٰ سیاسی لوگوں کو مجبور پھر ورنہ نہیں تھا یا وہ میرے اس صورت حال کا سامنا
کرنے سے کچھ اتارے تھے یا وہ اس معاملے میں کسی احساس کمتری کے شکار تھے یا کیا وہ ایک شخص پر
ایک ہی وقت میں اعتبار اور بے اعتباری کر سکتے تھے؟ مجھے سخت پریشانی کا احساس ہوا۔ ان
۱۵ اداؤں کے بارے میں کیا وہ صرف چاہتے تھے کہ میں اختتامی بحران کو دور کروں اور اس کے بعد اپنی
ادنیٰ سیاسی مشغلتوں کے پیش نظر مجھے ترک کر دیا جائے۔ لمحہ جھک لیے مجھے معلوم ہوا کہ میں سستی پن کے
احساس میں مبتلا ہوں۔ ایسا نہیں ہو سکتا مگر واقعات نے یہ ظاہر کر دیا کہ آئینہ میں بیٹھے ہوئے
چند لوگوں کے قدم بے مروت ہو سکتے ہیں۔ ایک طرف تو میں قومی سطح کے عظیم بحران کو دور کرنے کے
لیے اپنا، سب تعاون دینا چاہتا تھا بلا کوئی خواہ لے اور اپنی عہد و وقتوں کی بے انتہا کوشش میں
ڈالے ہوئے تھا اور دوسری طرف وہ سیاسی شرط پر فیکری کا اپنا کھیل کھانے کے لیے تیار تھے۔ یہ
نمایاں بہت قریب تھے جو کمزور اور مضبوطی دور کی پیداوار تھے۔ وہ ننگ نیالی کے اس قدر
خدا م تھے کہ وہ تو سنانے کے لیے اس احساس کر سکتے تھے اور نہ ہی انہیں معلوم تھا کہ وہ کیا کر رہے
ہیں۔

میرے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ان لوگوں کی وفاداری، حمایت اور ان کا گرم جوشی

تعاون حاصل کروں۔ اگر ان کو یہ تاثر مل جائے کہ میں ایک اڑنا ہوا سچا ہوں اور صرف چند انعام کے لیے اپنے پرتوں رہا ہوں تو میری حمایت کون کرے گا اور کون مجھے تعاون دے گا۔ کسی اور بات سے زیادہ مجھے اس امر کا یقین ہو گیا تھا کہ اگر حکومت کی آفت زار اعلیٰ پر بیٹھے ہوئے ان لوگوں کا خاصہ ہے جو فیصلے کرتے ہیں تو انھیں ان مسائل کا اور قوتوں کا پتہ تھا جن کی بروقت مہذبوں کے کشمیری کی ریفیسیات ہی ہے۔ ان حالات میں میں نے سوچا کہ بہت زیادہ بہادر و زہنا بھی حماقت کے مترادف ہو گا۔ وطن پرستی کی حالت اس کے لئے کی طرح ہے جس کا کوئی وارث نہ ہو۔ جس کی موت پر بہت کم لوگ آنسو بہاتے ہیں اور خاموشی کے ساتھ اسے میو سچائی کے مردہ خانے میں بھیج دیا جاتا ہے۔ ہماری تاریخ کے چند ایک الم ناک مرحلوں میں یہ حقیقت کھل کر سامنے آئی ہے اور میرے خیال میں عہدِ عصر کے چلن کے سبب ہم تاریخ میں ایک اور باب کا اضافہ کرنے جا رہے ہیں۔

۳۰ جنوری کو کوئی دہائی سے واپسی پر ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے ایک پریس بیان جاری کیا انھوں نے الزام لگایا کہ گورنری انتظامیہ قتل عام کر رہے ہیں پورے ریڈ ایک غیر اعلان شدہ مارشل لاء نافذ کیا گیا ہے جس پر وقت و کدے دور دورے کے لیے انھوں نے مجبوراً فوجی حکم کیا۔ انھوں نے یہ بھی الزام لگایا کہ عوام کو بہتر صورت حال سے اندھیرے میں رکھنے کے مقصد سے اخبارات پر پابندی لگا دی گئی ہے۔

یہاں ایک ایسا لیڈر تھا جس نے اس ایڈمنسٹریشن پر غیر ذمہ دار الزامات لگائے تھے جو شدید قومی بحران سے نمٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ ایک ایسا لیڈر تھا جس نے لوگوں کو حکام کے ساتھ نفرت کرنے کے لیے بھڑکایا تھا۔ اس لیڈر نے جان بوجھ کر یہ پرچا کر دیا تھا کہ کشمیری مسلمانوں کی نسل کشی کی جارہی ہے۔ حالانکہ اسے معلوم تھا کہ یہ سب حقیقت نہیں ہے اس کے باوجود وہی مرکزی سرکار کے تحفے نظر انداز کر کے اسے بات چیت کیلئے دعوت دی تھی اور اسے اقتدار سونپنا چاہتی تھی۔ ایک قومی بحران کے ساتھ نمٹنے کا کیا اس سے زیادہ گرفت، جدوجہد اور غیر منفعتانہ طریقہ کار ہو سکتا تھا؟ ہندوستانی ذہن کے بند و رازوں کا اس سے زیادہ کون سا ثبوت ہو سکتا تھا؟ یہ چند زوال پذیر خیالات اور شخصیات سے پرے کچھ نہیں سوچ سکا اب کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اب اس زنجیر کا سارا الجھ چکا تھا۔

انجیلا اور کرشن کی اس حملے میں مایوس ہو چکا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ انا اس وقت بھی بے بیج دوں مگر میرے سامنے ایک پاکستان جیسی دینی ریاست کی تصویر میں خلیجِ آئینہ بھارت کھڑا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنا ارادہ بدل لیا۔ میں نے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ ایسا کرنا تو موقوفہ صاف پہنچانے کے مترادف ہو گا۔ میں نے اپنی ذات کو دلیل دی کہ میری مانند اپنی ذات کے اندر غصے نہیں جلتا ہو کوئی بھی ایڈمنسٹریشن کشمیر کے بارے میں مقدر لگاؤ نہ کرے کہ جس قدر

میں نے کر لیا تھا مجھے یقین تھا کہ قوم کو وادی میں تخریب کاری کے پچھلے ہونے کی نکتہ نگاہ سے بارے میں اندازہ نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے آپ کو ٹھنڈا کیا اور صدر جمہوریہ کو خط لکھنے کا فیصلہ کیا جس کی نقول وزیراعظم، وزیر داخلہ اور نائب صدر جمہوریہ کو ارسال کی گئیں۔ ۳۰ جنوری کے اس خط میں لکھا:

عزت مآب راشٹر پتی جی!

عین ۱۰ روز قبل میں نے یہ عہدہ سنبھالا تھا۔ میں ایک متحرک سی رپورٹ لکھنے کے لیے ایک منٹ کا وقت تک نہیں نکال سکا۔ حالات اس قدر سنگین اور تشویش ناک تھے۔

مکمل بے عملی، ناقابل یقین نا اہلیت، وسیع تر پھیلی ہوئی شرارت اور ہنگامی بجھکت کی وجہ سے انتظامی مشینری اور نظام اقتدار کے بھی پرزوں پر تخریب کا رول اور ان کے جاریوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ انھوں نے انگریزیت ان عناصر کی سرد گرم پالچے کو برقرار رکھا اور باقی اپنی جان کی امان مانگتے ہیں۔

برہنہ کی بات ہے کہ ہمارے ملک میں لوگ فتح یاب ہونے والی طرف کا ساتھ دیتے ہیں اور گزشتہ چھ ماہ یا اس کے قریب عرصے سے چونکہ تخریب کا رول کو ایک کے بعد دوسرے کا مرکزی حاصل ہوئی ہے، چنانچہ عوام ان کے ساتھ ہو گئے ہیں۔ مہرست شدہ دہشت گردوں کو کھلے عام پناہ دی جا رہی ہے۔ انھیں روپیہ خوراک اور گاڑیاں فراہم کی جا رہی ہیں۔ انھوں کی ایک اچھی خاصی تعداد انھیں سلام تک کرتی ہے۔ سنیڈ انٹرمنس، دوسری طرف موڑ لیتے ہیں۔ جیلر اور ڈاکٹر فطرتوں کے فرار میں مدد دیتے ہیں۔ سیاسی و کروں کو دی گئی چند پستیوں کا استعمال جراثیم کے ارتکاب میں کیا جا رہا ہے۔ جب میں نے عہدہ سنبھالا، کشمیر قریباً ناقابل واپسی کے دہانے پر تھا۔

بلاشبہ یہ ایک معجزہ ہے کہ اسے خدائی کرامات کہیں کہ ۲۶ جنوری کو کشمیر چھ لیا گیا۔ اور پوری قوم اندرون ملک اور بین الاقوامی بے عزتی سے سج گئی۔ اس دن کی داستان نہایت طویل ہے اور کسی دیگر مرحلے پر تفصیل کے ساتھ بیان کیے جانے کی ضرورت ہے۔

انھوں اور عوام کے ساتھ اپنے اپنے بطور کو بروئے کار لانے میں سرکاری اقتدار کی کاوش و کوشش کے سبب کمال کی کوشش کر رہا ہوں۔ اور نظام اقتدار کی کچھ

شاخوں نے ابیری طرف جھکنے شروع کر دیے مگر میرے مشن کی اہمیت اور فدا و قربانی کی طرف سے پیدا کیے گئے اس تاثر سے کم ہر رہی ہے کہ وہ اقتدار پر واپس آ رہے ہیں اس صورت حال میں نہ تو امن رہی اور نہ ہی دوسرے ادارے ملامت دیں گے۔

میرا خیال ہے کہ کشمیر کی صورت حال کی سنگین نوعیت ہماری قوم کو سمجھ نہیں آئی ہے آج بنیادی سوال یہ ہے کہ آیا کشمیر کو اپنے پاس رکھنا چاہتی ہے یا پاکستان سے حوالے کرنا چاہتی ہے یا ایک آزاد ریاست کے طور پر تسلیم کرنا چاہتی ہے، میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ ہمارے نکتہ چینیوں کو کشمیر بھٹیجے یا نہ حقیقت ان کے لئے بڑھ جائے اور وہ محسوس کر لیں کہ وہ لا شعوری طور پر جب الوطنی کے برعکس رول ادا کر رہے ہیں۔ موجودہ مرحلے پر اقتدار ان لوگوں کے حوالے کر دینا ایک المیہ ہو گا جنہوں نے ریاست کو تباہی کے دہانے پر لاکھڑا کیا ہے۔

میں نے ملک کے تمام اخبار نویسوں کو دعوت دی ہے کہ وہ خود اگر حالات کا جائزہ لیں ان میں کھل چکرورتی، اعلیٰ شوریٰ اور دہترہ، آس کے مشرا، کلڈین پیر، پران چوڑہ اور اہل کے ڈا شامل ہیں۔

یہ نکتہ فریضہ محض اس جذبہ سے قبول کیا کہ اس قومی بحران پر قابو پانے میں اپنا دست تعاون دے سکیں۔ یہ اپنی ذات اور اپنے اہل و عیال کو شدید ذاتی خطرے میں ڈال دیا ہے۔ یہاں تک کہ میں تنخواہ تک نہیں وصول کر رہا ہوں۔ میرا انداز فکر میرے اس پالیسی بیان میں واضح کیا گیا ہے جو میں نے عہدہ سنبھالنے کے فوراً بعد دیا تھا۔

۲۶ جنوری کے واقعات کے معاملے میں میں نے اپنا ذاتی سارول نبھایا ہے اور مجھے اس پر فخر ہے۔ مگر میرے لیے اس عہدے پر رہنے و رہنا ناممکن ہو جائے گا، اگر موجودہ تاثر جاری رہتا ہے کہ عوامی طور پر مجھے پوری حمایت نہیں دی جاتی میرے پاس پہلے ہی ایک شکست اور بکھری ہوئی ایڈمنسٹریشن ہے اور اگر گمانڈر پر ہر روز گویا داعی جائیں تو کامیابی کے آثار کا تصور خود ہی کیا جاسکتا ہے۔

میری رائے میں کشمیر کے ان کو حل کرنے کا راستہ یوں ہے :

۱۔ ریاست کی اتھارٹی کو نوے فی صد سے زیادہ قائم کیا جائے اور عوام پر یہ تاثر قائم کیا جائے کہ خواہ کتنی بھی قیمت ادا کرنی پڑے تحریک کا رد

اور ان کے حوالیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے گا اور ان کا خاتمہ کیا جائے گا۔
۲۔ ایک مضبوط مستحکم اور مضبوط صحت مند اور قانونی ڈھانچہ تیار کیا جائے

۳۔ روزمرہ کی ایڈمنسٹریشن اور عوام کے دیرینہ مطالبات کو حل کرنے کے لیے ایک نہایت مددگار طریقہ عمل اپنا دیا جائے۔
۴۔ ریاست میں ترقیاتی طریقہ کار کو نئی سمت دی جائے اور وسائل کو وسیع پیمانے پر ضائع ہونے سے بچایا جائے۔

۵۔ اقتصادی پیکج پر تشدد سے عمل کیا جائے جن میں ۲۰۰۰، فی ایس ایف افراد اور ۳۰۰۰ اساتذہ کی بھرتی شامل ہے۔

۶۔ قانون ساز اسمبلی کو نوے فی صد ماہ یا اس کے آس پاس نئے انتخابات کر لے جائیں، تہہ تک تحریک کار عناصر میں سے چند ایک کو مسترد کر دیا گیا ہو گا۔ اور چند ایک انتخابات میں حصہ لے کر لیں گے۔ مختلف گروپ ایک دوسرے کو متوازن کر لیں گے۔ مرکزی سرکار کو عوام کی خصوصاً نوجوانوں کی حقیقی حمایت حاصل ہو جائے گی اور مئی سرکار نہ تو سابقہ سرکار کی طرح کو ریلوے ہوگی اور نہ ہی بے پروا ہوگی۔

چھوٹے راستے اور عارضی حل تلاش کرنا خود کشی کے مترادف ہو گا۔ تمام عنصر اس آلودگی گہرائی سے پھیل چکی ہے اور جب تک اس آلودگی کو نکال نہیں لیا جائے گا تب تک ہم ایک حل سے دوسرے حل تک کھٹو کریں کھاتے پھریں گے۔

آپ کا صادق
(جگموج)

کیا میں اپنے موقف کو اس سے زیادہ بے باک اور سب سے طریقے سے ظاہر کر سکتا تھا؟ مگر نئی دہلی کے فیصلے کرنے والے بالکل واضح نہیں تھے وہ پالیسی کا ایک بنیادی ڈھانچہ تیار کر کے اس بنیاد پر قیامی کے ساتھ عمل کر سکتے تھے۔ وہ اپنے قیامی طریقے سے عارضی حل ڈھونڈ نکالنے کی لڑائی کے غلام رہے اور انہوں نے اس بات کو محسوس نہیں کیا کہ کشمیر میں دہشت گردی کا خاتمہ — تحریک کاری کی بد صورت قوتوں کو شمارتے ہوئے نہیں ہے۔ انہوں نے انکار کا یہ لہجہ

شب کو اقامت دار میں واپس لانے، لنگڑے، کمزور اور بے جان اداروں کے ذریعے کام کرنے کی بجائے ایک نئی سوچ پیدا کرنے، الفاظ کو اعمال میں بدلنے کے لئے ارادے، اداروں میں اصلاح اور نیا نظریہ پیدا کرنے کے لئے نئے نئے اصول وضع کئے جائیں، اور اس کام میں نیا انداز نہ کر پیداکرنا ہوگا۔

دہشت گردی حادثے یا محض یہرونی ایماء پر رونما نہیں ہوتی بلکہ اس کی نشوونما کے لئے ایک طویل عرصہ درکار ہے۔ اگر ابتدائی مرحلے پر اس کا انداز دیکھا جائے تو یہ شروعات کے مرحلے پر پہنچ جاتی ہے، اس میں تیزی آتی ہے، مختلف سمتوں میں پھیلی ہے، اپنے شکاروں کو دیوبچ لیتی ہے اور نہایت بے رحمی کے ساتھ انہیں نیست و نابود کر دیتی ہے، بخوفی اٹ فائے شکاری کتے کی طرح یہ تند اور مجنونانہ صورت اختیار کر لیتی ہے، اور زیادہ سے زیادہ معصوم افراد کو اپنے نیٹے میں لے لیتی ہے، بخیر میں بھی ٹھیک یہی کچھ ہوا ہے موجودہ مرض کی جڑیں گہری ہیں، اس کے مضر اثرات بلا انداز پھیلتے رہے ہیں۔ اور اب اس نے جسم کے اہم اعضاء کو بھی لپیٹا ہے اور یہ مرحلہ قریب ناقابل واپسی ہے۔

اپنے عہد گورنری کے اولین دنوں میں اس گھناؤنی صورت حال کو غیر سنجیدہ بے رابطہ اور مستقبل خرابی کے بغیر علاج میرے لئے ایک افسوس ناک مشاہدہ تھا۔

دہشت گرد مجھ پر اپنی ہمدردیوں تلے ہوئے تھے، دوسری طرف سے بے نظیر بھٹو اور امان اللہ خاں میری جانب پر دوپاگنڈہ کے میزائل داغ رہے تھے اور کشمیری مسلمانوں کو میرے خلاف بھڑکانے کے لئے ڈاکٹر فاروق بلدا اللہ مجھے بدترین گالیاں دے رہا تھا اور نئی دہلی سے میرے خلاف اشارات موصول ہو رہے تھے۔ کئی سیاسی جماعتوں کی اکثریت میرے خلاف صریحاً جھوٹا پرچار کر رہی تھیں تاکہ مجھے مسلم مخالف گردان کر مسلم افسر شاہی اور فوجیوں کے ساتھ میرے ای رابطے کے عمل کو سبوتاژ کیا جائے جیسا میں نے ۱۹۸۶ء میں قائم کیا تھا۔

اب مجھ پر یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ موجودہ سیاسی قدریں جہاں اقتدار کے سرچشمے کھولے ہیں اور تصنع بناؤٹ کے شکار میں کسی بحران کا حل ممکن نہیں اور کشمیر جیسے وسیع مسئلے کی تویات ہی نہیں، میں نے خود کو اس بات کا قائل کر لیا تھا کہ مجھے ایک قومی فریضہ ادا کرنا ہے میرے ذہن کے تمام تر ترنیمیں غبار اور اپنی گردن کے ارد گرد جھکڑوں اور لپٹ پٹت وارے اپنی پیٹھ بڑی طرح گھائل پیٹھ میں آگے بڑھتا رہا۔

باب دو

تاریخ کے تھرو کے سے

”ماضی اور حال کی نسلوں کے مابین

ایک خفیہ سمجھوتہ ہے“

والٹر بنجامن

تاریخ کیوں؟

کافی عرصے سے کشمیر اخبارات کا موضوع رہا ہے پھر بھی اس خطے کے ماضی اور حال کی بابت عوام کی ناواقفیت ایک حیران کن امر ہے۔ تاہم جب چند لوگ جموں و کشمیر کے بارے میں بات کرتے ہیں تو ان کے ذہن میں وادی کشمیر اور اس کی چند ایسی شخصیتیں ہوتی ہیں جن کا لحاظ ان کے دل میں ہوتا ہے اور ریاست کے دوسرے خطوں اور ان خطوں کے ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات اور تاریخ و تمدن اور ان کی مجموعی خصوصیات کو یا تو وہ یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں یا پس پشت ڈال دیتے ہیں چنانچہ اس سلسلے پر مزید بحث کو آگے بڑھانے سے قبل یہ لازمی ہو گا کہ اس کی تاریخ کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا جائے۔

واقعات، اعتقادات اور رجحانات نامعلوم منابع سے جنم نہیں لیتے بلکہ ان کی جڑیں گہری ہوتی ہیں اور ان جڑوں کی تم ریزی ماضی میں کی گئی ہوتی ہے اور عمر کے ساتھ چند پودے جھک جاتے ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ختم ہو جاتے ہیں چند اپنے پتوں کا لباس عارضی طور پر تنزک کر دیتے ہیں مگر حالات موافق اور سازگار ہونے کے ساتھ یہ پتے دوبارہ نکل آتے ہیں اور چند درختوں کے پتے تاریخی طوفان و تلاطم کے باعث مکمل طور پر اکٹھ جاتے ہیں مگر چند ایسے بھی پودے ہوتے ہیں جو ناموافق سماجی تمدنی اور سیاسی حالات کے باوجود قائم و دائم رہتے ہیں، ہم بھی لوگ سماجی اور تمدنی قفس میں رہتے ہیں جو ماضی میں تیار کیا گیا ہے مگر اس قفس کے جھروکوں میں سے حال کی تازہ اور شہدائی ہوا چھن کر آتی رہتی ہے۔

یہ کہنا کہ عصر نو کا نظارہ محض ہمارے اور ماضی کے ساتھ بھی کوئی واسطہ نہیں تو ہم حقیقت کو نہایت بڑی نقطہ نظر سے پرکھ رہے ہیں کیونکہ ماضی سے شناسائی کے بغیر حال کا جائزہ حالات سے دھوکہ کھانے کے مترادف ہے۔ سرفرنے بجا طور پر ہوتے ہیں۔ اگر آپ یہ نہیں جانتے کہ آپ کی پیدائش سے قبل کیا ہوا ہے تو آپ ہمیشہ طفل مکتب ہی رہیں گے۔ اپنے پہلے مہم گورنری کے دوران اپریل ۱۹۸۳ء میں جب میں وادی کشمیر میں پہنچا تو اس سرزمین کے نظاروں پر واضح طور پر عیاں زخموں کے نشانات کے باوجود میں اس کی ندیوں اور آبشاروں کی خوبصورتی سے از حد متاثر ہوا مگر جب میں اس کی بد نصیب تاریخ پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اس کی مٹی میں کتنی سنگدل پنہاں ہے یہاں کی چراگاہوں میں کس قدر قریب پیچھے ہوئے ہیں اور اس کی ندیوں کے پانی کے ساتھ کتنے مصائب اور مشکلات رواں دواں رہے ہونگے۔

اس وادی کے بادشاہوں اور ان کے درباریوں کے اعمال پر اگر نظر دوڑائی جائے تو چند ایک مثالوں کے سوا یہاں کی تاریخ سازشوں اور جوڑ توڑ مسلسل نشیب و فراز چالوں اور مخالف چالوں کی کینگی، اختیاری اور عیاشی اور مکروہ جرائم اور وحشیانہ بدعتوں کی ایک طویل داستان ہے عموماً کہا گیا ہے کہ تاریخ خود کو دہراتی ہے اور جہاں تک کشمیر کا سوال ہے تاریخ نے کئی مرتبہ خود کو المیات اور داستانوں دونوں صورتوں میں دہرایا ہے۔ وینسینٹ اے سمٹھ نے بجا طور پر کہا ہے۔ حکومت کے معاملے میں دنیا کے بہت کم خطے ایسے ہونگے جن کا نصیب کشمیر سے زیادہ غراب ہو۔

تاریخ کا سفر محض بادشاہوں اور سلاطین کا سفر نہیں بلکہ اس کے بہت سارے بھونے چھوٹے راستے ہوتے ہیں جو کئی کوئلوں سے ہو کر گذرتے ہیں جہاں سے ہم مختلف معاملات اور ذہن کے بند دروازوں میں جھانک کر دیکھ سکتے ہیں۔ تاریخ نہ صرف حکمرانوں بلکہ حکومتوں کی بھی داستان حیات ہے یہ جہاں سے بھی ہو کر گذرتی ہے اس کی سمت پر اس خطے کے روحانی کارخانے تمدن اور روایات کی صورت میں چھنے والی ہوا بھی اثر انداز ہوتی ہے۔

اگر خیالات کے لحاظ سے دیکھا جائے تو کشمیر کی تاریخ سے ظاہر ہوگا کہ یہ قدیم تمدن کا پالنا ہی ہے۔ قدیم ہندوستان کے ابتدائی تمدن میں کشمیر کے شاندار کھنڈروں کے علاوہ اور کچھ بھی زیادہ بیش قیمت نہیں۔ سینکڑوں کھنڈروں میں مندر، ستوپ و بارو اور مختلف مکاتیب خیال اس بات کے آئینہ دار ہیں کہ قدیم ہندوستان میں ہندومت اور بودھ دو مذاہب کو کس طرح نشوونما حاصل ہوئی ہے اور کس طرح کوام کے ذہن میں ان دو مذاہب کا امتزاج ہوا۔ ہندو فلسفے میں کشمیر کا اپنا تخلیقی حصہ شیوازم کا ارتقا ہے جسے "تاریخ شاستر" کہا جاتا ہے۔ یہ فلسفہ حقیقی طور پر تاریخی حیثیت رکھتا ہے اور جب چودھویں صدی کے وسط میں اسلام کا ظہور ہوا تو وادی میں اسے اپنے طور پر نمایاں پذیرائی حاصل ہوئی۔

چنانچہ موجودہ مسائل کا مناسب پس منظر یہ جانے اور ان کی نئی اور پرانی دونوں قسم کی جڑوں کو سمجھنے کے لئے لازمی ہے کہ حکمرانوں اور رعایا کے تاریخی پہلوؤں اور ان کے سماجی اور روحانی خدوخال کے بارے میں مکمل

تفصیلات کا مطالعہ کیا جائے۔

قرن سابقہ

ارضیاتی اور دیومالائی لحاظ سے کشمیر وادی کی حیثیت ایک وسیع آبی احاطے کی تھی جو ایک بڑے باندھ کی حیثیت رکھتا تھا اور جس کے ارد گرد بلند قامت پہاڑوں کی دیواریں تھیں۔ بلندی پر واقع تہ علاقوں میں پانی نہیں تھا وہ قدرے آباد تھے۔ ماہ و سال گزرنے کے ساتھ زلزلوں اور جزا قیامتیں اٹھنے پھلنے کے باعث چن چن مقامات پر پہاڑوں کی دیواریں پر رشکاف پیدا ہوئے اور پانی باہر نکل گیا۔ چنانچہ وادی موجودہ صورت میں نمودار ہوئی یہی وقت اس وادی کا نیل مت پورا سن میں بیان ایک حکایت کے مطابق ایک وقت میں وادی کا نام سنی دیس تھا۔ عرصہ گزرنے کے ساتھ ایک شخص جلودھو۔ یعنی آبی دیو پیدا ہوا اور وہ یہاں رہنے لگا جب جلودھو ابھی بچہ ہی تھا تو برہانے اُسے "پانی کے اندر غیر فائیت" کا وردن دیا۔ جوں ہی وہ بڑا ہوا وہ ظالم گستاخ اور محکم مزاج بن گیا۔ اس نے موت اور سبائی کا بھاری طوفان کھڑا کیا۔ نیل جس نے جلودھو کی پرورش کی تھی وہ بھی ناراض ہو گیا۔ اس نے اپنے والد کشپ سے مدد مانگی جو ایک بہت بڑا سادھو تھا۔ اور کشپ نے امداد کے لئے برہما و شونا اور شونک رسائی کی۔ وشنو نے پہل کی وہ جلودھو کو مارنے کے لئے نکل پڑے مگر انہیں اس بات کا بخوبی علم تھا کہ جب جلودھو پانی کے اندر رہتا ہے تو اسے مار نہیں جاسکتا چنانچہ جلودھو نے سنی سر جھیل میں پناہ لے لی مگر وشنو اور ان کے ساتھ دوسٹر دیوتاؤں نے کوکئی کا فیصلہ کیا چنانچہ اس کے نتیجے میں پہاڑوں کے اندر سے پانی پوری طاقت سے بہہ نکلا اس کے شور سے اس قدر دہشت پیدا ہوئی کہ پہاڑی چوٹیاں ہمالیہ پر بت کی طرح آسمان کو چھو رہی ہوں۔ اس طرح پانی کے لہکے کے بعد جلودھو اب زیر آب نہیں رہ سکتا تھا چنانچہ اپنے تحفظ کے لئے اس نے جادو کا سہارا لیا اس نگر و شمشاد میں اس کا پانی اندھیرا پیدا کر لیا۔ مگر وشنو نمودار ہوئے اور انہوں نے اپنے ہاتھوں میں سورج اور چاند لے کر تمام تر فوہر کر دی۔ اس کے بعد جلودھو کو ڈھونڈ لگا لا اور وشنو نے اپنے حکمران سے اس کا سر تقلم کر دیا۔ اس طرح تو زمین نمودار ہوئی اس پر حقیقی باشندوں کے علاوہ دوسرے لوگ بھی آکر بس گئے شوا اور کشپ نے اپنی عبادت گاہیں نمودار کیں یہی وجہ ہے کہ امرنا تھ کی مقدس گہیا کی طرح متعدد مقامات کو ہندو مت پر کچھتے ہیں۔ حکمتیں آفرجہ نکٹیں ہوتی ہیں اور ان سے شوس شہادت حاصل نہیں ہوتی مگر یہ حکایت ایسی نہیں کہ جس کے لئے ارضیاتی اصولوں کے مطابق شہادت و ثبوت حاصل نہ ہوں نیل مت پوران کی پانی کے نکاس سے متعلق تفصیل علم ارضیات سے مطابقت رکھتی ہے جن کے تحت شدید زلزلے پیدا ہوئے جس کے ساتھ بادل پھٹنے اور تاریکی کا منظر پیدا ہوا۔ بصورت دیگر بھی زندگی مسلسل اور قدرتی آفات کے بعد پیدا ہوئی ہے۔

ہم میں سے بہت کم لوگ اس بات کا احساس رکھتے ہیں کہ موجودہ صورت میں زمین پانچ ارب برس قبل وجود میں آئی جزا قیامت کے مشہور عالم خدیک ڈریو کا کہنا ہے بعض اوقات چند انسانی نسلوں نے تاریخ کے

جز ارضیائی ریکارڈ صحیح طور پر اس طرح سے پیش کیا ہے کہ جس سے یہ بات ظاہر ہو کہ عہد قرون کی روایات بیش قیمت ہیں۔

اتفاق سے کیے گئے بات ممکن نہیں ہو سکتی کہ کشمیر وادی جس باندھ کی صورت میں تھی اس کے پھٹ جانے کے باعث جو شمال مغربی ہندوستان کے میدانیوں میں آبادی سے قبل ہجرت اور موہن جڑو کی تہذیب یہاں موجود ہو اور وہ تمام زیر آب ہو کر تباہ ہو گئی ہو اور انسانی وجود نیست و نابود ہو گیا ہو۔

سرینگر کے نزدیک بڑے باہر میں عالیہ کعدائی سے معلوم ہوتا ہے کہ... قبل مسیح میں بھی وادی میں آبادی موجود تھی مگر ابتدائی آبادی چونکہ گڑھوں میں رہائش پذیر تھی اور اپنے مردوں کو پالتو جانوروں کے ساتھ دفنانے کی سہولت کی شناخت ابھی تک ممکن نہیں ہو سکی تھی۔

ہماری دانست میں ناگ وادی میں سب سے پرانے آباد لوگوں میں سے تھے بعد ازاں چند اور بھی فرقتے سامنے آئے وہ تھے کھاسا، ڈارہ، پٹنہ، ڈامرتا، نرنگ اور شاہ وغیرہ جب پانی بہہ نکلا تو آریہ لوگ ہماری تعداد میں یہاں آگئے کیونکہ یہاں پر آباد کاری کے لئے کافی علاقے میسر تھے۔ جلو بھو کے ارد گرد جو حکایت گھومتی ہے عین ممکن ہے کہ وہ آبائی باشندوں اور آریوں کے درمیان کشمکش کی داستان ہو جو ۸۰۰ قبل مسیح میں ان علاقوں سے یہاں آئے جن کا نام اب آترپردیش ہے۔ اور اس وقت ان لوگوں نے لوہے کے اوزار بنانے کا فن اور چٹاؤں میں چھوٹے چھوٹے شگاف پیدا کر کے پانی کے بہاؤ کی راہ میں روکاؤں کو دور کرنے کی مہارت حاصل کر لی ہو۔ پانی کے دھک سے بند آریاؤں نے آبائی فرقوں کی صورت میں موجود اپنے دشمنوں کے لئے روپوشی کو مشکل بنا دیا۔

وقت گزرنے کے ساتھ آریاؤں کو تمام وادی میں غلبہ حاصل ہو گیا اور انہوں نے حکومتی ادارے و باطن قائم کر لئے، بادشاہت کو مضبوطی کے ساتھ قائم کیا گیا۔ بادشاہ کو ایک خدائی شخص سمجھا جاتا تھا یہ اس بات سے ظاہر ہے جو جھگوان کرشن نے بشویتی کو تخت نشین کرتے وقت کہی تھی: کشمیر کی سرزمین باروٹی کی طرح ہے اور آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ بادشاہ شکر کا ایک حصہ ہے۔

ماخذ

قدیم کشمیر کی تاریخ کا ایک اہم ماخذ کہن کی تاریخی نظم راج ترنگی (یعنی شاہوں کا دریا ہے) قدیم ہندوستان کے ہندوؤں میں تاریخ لکھنے کی روایت موجود نہیں تھی مگر کہن کی کتاب اس روایت کا خوشگوار اعراف ہے۔ زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں جو شہادت درج ہیں ان سے کہن کے ذہن کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے اور اس سے اس کے خیال کا احاطہ ہوتا ہے اس کتاب میں اس قدر خوبیاں ہیں کہ یہ نہ صرف کہن کا تاریخی ماکدہ اور سماج کا بستر ہے بلکہ سماج کے تمام شعبوں کی فضا اور رنگ و بوی کا موز

کی تخلیق و سیاق و سباق کے ساتھ اس کا موازنہ بحاطر پر ہو سکتا ہے۔ یہ کتاب ۵۰-۱۱۳۸ عیسوی کے درمیان لکھی گئی اور اس کے کشمیر کے تمام تر زمانہ قدیم کے بارے میں کافی اندرونی تفصیلات حاصل ہوئی ہیں اور انہیں صدی عیسوی سے آگے سماجی اور اقتصادی حالات کے علاوہ واقعات کی مکمل تفصیل اس کتاب میں درج ہے۔ کہن کے بعد جون راج، سرور، پر جیہ بھٹ، شیکا اور کھنیرا در دوسرے مورخ ہوئے مگر وہ بالآخر آمیزنی اور زیت ایری کے شکار معلوم ہوتے ہیں۔ بعد کے عرصے کے لئے چند دوسرے ماخذ ہیں جن کا خلاصہ ضمیمہ میں درج ہے۔

ٹی ایس ایلیٹ نے اپنی نظم جرونش (GERONSHION) میں لکھا ہے۔

”تاریخ میں بہت سارے پُر فریب راستے میٹرھے میٹرھے برآمدے اور موضوعات ہیں جو گم گم خواہشوں اور فربہ کاری سے بھرے ہیں اور ان سے نکل کر ہم فضولیات تک جاتے ہیں۔“

قدیم کشمیری مورخوں کی تفصیلات میں ایلیٹ کے مشاہدات کی حقیقت عیاں ہوتی ہے مگر تکرار کرنے کے لئے ہمارے پاس دوسری موادیت کم مقدار میں دستیاب ہے۔ ہم صرف اضافوں سے حقیقت کی تلاش کر سکتے ہیں اندرونی ثبوت اور قابل یقین اسکانات سے بھی ہمیں اس بارے میں رہبری حاصل ہو سکتی ہے۔

ہندو اور بودھ بادشاہوں کا زمانہ

کشمیر کا اولین معروف راجہ گوند مگدھ کے راجہ جراسندھک دوست اور ششے دار تھا۔ آخر الذکر مگدھ کے راجہ کنس کا سر تھا، گوند جراسندھ کی مدد کو گیا تو کرشن نے اس کو شکست دے کر اسے مار دیا۔ اس کے بعد جراسندھ کا بیٹا دامودر کشمیر کا راجہ بنا اپنے والد کی موت کا بدلہ لینے کے لئے دامودر کرشن کے ساتھ لڑنے کے لئے نکلا مگر وہ بھی مارا گیا۔ دامودر کی بیوہ لیشوتی اپنے خاوند کی موت کے وقت حاملہ تھی کہ کرشن کی حمایت کے ساتھ تخت نشین ہوئی۔ جب اس کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تو گوند دھم کے نام سے اسے راجہ بنا دیا گیا۔ پرتھو ہونے کی وجہ سے اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی اور مہا بھارت کی جنگ کے وقت نہ تو پانڈوؤں اور نہ ہی کورؤوں نے اسے اپنی حمایت کے لئے دعوت دی۔

ان واقعات سے ظاہر ہے کہ کشمیر اور شمالی ہندوستان کے دوسرے حصوں کے راجے نہ صرف ایک دوسرے کے ساتھ منسلک تھے بلکہ موروثی حکمرانی کا دور بیاں قائم ہو چکا تھا اور قبائل کا رواج ختم ہو چکا تھا۔

گوند دھم کے بعد کشمیر پر کم از کم ۳۲ راجے حکمران ہوئے وہ بالکل کمزور تھے اور اسلحہ لگائی نہیں تھی اس کے بعد اشوک (۲۳۲-۲۳۲ قبل مسیح) نے کشمیر پر اپنا تسلط جایا۔ اس نے وادی میں بودھ مت کی ترویج کرنی کی۔ اس کے بعد حکومت میں وقتاً فوقتاً ایسے ایسے راجے آئے اور ان کے بعد مارتھنڈیک اور کالاشاک اس شخص نہیں

تھا۔ جو ہندومت کو برداشت نہ کر سکا۔ اس نے ویشنور کے پرانے شومندر کی حرمت کروائی تو کیشنور کے نام سے دو شومندر بھی اسے تعمیر کروائے۔ اشوک نے قدیم سرنگاپلیکے بنیاد بھی رکھی جو موجودہ شہر سے قریب پانچ کلومیٹر دور حلی بکھن کے مطابق یہاں پرتہ دولت کی نذر پاشی تھی۔

اشوک کے انتقال کے بعد موریہ سلطنت کا شیرازہ کھنسا شروع ہو گیا اس کا پایہ حکومت کے ایک خود مختار حاکم کی صورت میں تخت نشین ہوا۔ دریں اثنا شمالی ہندوستان میں ہندو مت کی ایمانے نو پو بھی تھی اور یہ لہر کثیر تک بھی پہنچی ان اثرات کے تحت اس نے چند بودھ و بارہا ل کونیست و نابود کر دیا اور سر ہنگری اور نندی کثیر میں شو کے دو مندر تعمیر کئے۔

تین صدیوں بعد کثیر کشنوں کے غلبے میں چلا گیا۔ معروف کشن راجاؤں میں کنشک ہنسک اور جسک کے نام شامل ہیں۔ کنشک سب سے زیادہ طاقتور تھا جس کی سلطنت شمال مغربی ہندوستان سے لیکر وسطی ایشیا تک پھیلی ہوئی تھی۔ ہندو ازم کی تبلیغ کے لئے کثیر اس کی سرگرمیوں میں مرکوز تھا۔ اس سے قبل اس نے بودھ مت کو قبول کر لیا تھا۔ اور بودھ ازم کو سرکاری مذہب کا درجہ حاصل ہو چکا تھا اور کثیر ہی مبلغین نے بودھ مت کا بیڑا مغربی وسطی ایشیا اور چین تک پہنچایا۔ کنشک نے چوتھی بودھ کونسل کا انعقاد کثیر میں کندو اوڑھ کے مقام پر کیا۔

کنشک کے بعد متعدد مقامی حکمران آئے جن میں دھیمیشن اول اندر جیت راون اور دھیمیشن دوم شامل ہیں۔ ان کے نام چونکہ رامائن کے قارئین کے لئے مألوف ہیں چنانچہ یہ اس بات کا بھی ثبوت پیش کرتے ہیں کہ کشمیر اور شمالی ہند کے درمیان ثقافتی یکسانیت موجود تھی۔ ان راجاؤں کے عہد حکومت میں شیوانم کو فروغ حاصل ہوا اور بودھ مت کو دھکے لگا۔ ان میں سے ایک راجا نے نانائے ہزاروں کی تعداد میں وبار جلا دیئے اور بودھوں کے گھوٹے برہمنوں کو دے دیئے۔ چھٹی صدی عیسوی کے پہلے نصف میں ایک بن جزیل کشمیر کے تخت پر قبضہ کرنے کے لئے بکراہیاں وارد ہوا۔ گپت سلطنت کے زوال کے بعد وہ اقتدار میں آیا مگر ہندوستانی حکمرانوں کے اتحاد کے سامنے اسے شکست حاصل ہوئی۔ وہ بھاگ کر وادی میں آگیا اور اس نے اقتدار چھین لیا۔ اس نے ۵۱۵ء سے ۵۵۰ء عیسوی تک حکومت کی وہ ایک ظالم بلاوٹھا تھا۔ کہن کے مطابق لوگ اس کے آگے پرواز کرنے والے گدھوں وغیرہ کی موجودگی سے اس کی آمد کی پیش گوئی کر سکتے تھے۔ اس کا ذہن پسند مزاج کشمیری کہاؤں کا عہد بن چکا ہے۔ جب وہ کجوتھی کے نزدیک ایک در سے کوٹھور کر رہا تھا تو ایک باغی سپاہی سے نیچے گر پڑا۔ بکراہی اس کو اس گرنے والے باغی کی چیزوں سے اس قدر لطف حاصل ہوا کہ اس نے مزید باغی اس سپاہی سے گروا دیئے تاکہ اس قسم کی آواز سے وہ بار بار رگھو انند ہو سکے۔

مہر کل کے بعد کچھ عرصے تک کشمیر میں حکومت ربی مگر مقامی حکمرانوں نے دوبارہ اقتدار حاصل کر لیا اور دوسرا گزند خانمان وجود میں آیا اس خاندان سے راجہ گھوڑوں خاص طور پر مقابل ذکر ہے اس نے جلازروں کا قتلہ کر دیا اور پھر ان کے حکمرانوں کو قتل کر دیا اور ان کے گھرانے کو برباد کر دیا۔

۶۳۱ عیسوی میں مشہور روم معروف صینی سیاح ہیون سانگ کشمیر میں وارد ہوا۔ اس وقت کشمیر پر کارکوٹ خاندان کی حکومت تھی اور اس کے پائی در لاجپوتن راجہ نے ہیون سانگ کا گر خوشی سے استقبال کیا۔ ہیون سانگ نے وادی میں دو برس تک قیام کیا اور پودھ مت کے ساتھ وابستہ قریباً تمام اہم مقامات تک گیا۔

ہیون سانگ کے مطابق کشمیر کے راجہ کا اثر ٹیکسلا، ہزارہ، بلوچ اور راجپوت جیسے دور دراز مقامات تک پھیلا ہوا تھا۔ وہ ایک طاقتور حکمران تھا اور اس کی سلطنت کافی وسیع تھی۔ کابل سے کشمیر تک کے راستے پر اس کا غلبہ تھا مگر وہ فوجی طور پر خود مختار نہیں تھا۔ اس وقت راجہ ہرش وردھن جس کا دارالخلافہ قنوج تھا، کا کشمیر پر ہلکا سا غلبہ تھا۔ کشمیر کا اقتصادی حالات اب بھی پانی وادی جیلوں اور پھولوں سے بھری پٹری تھی۔ بودھ مت دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ایک سو سے زائد بودھ مشعوذوں میں ۵۰۰ بودھ بیکھڑتے۔ چار انوکھ جیتیا بھی تھے جن میں بدھ کے جسم کا چھوٹا سا حصہ تھا۔ بدھ کے دانت کا منبرک حصہ بھی کشمیر کے راجہ کے پاس تھا مگر اسے ہرش وردھن لگیا۔ اس وقت کے کشمیریوں کی بابت ہیون سانگ کی رائے قدر خراب تھی اس نے لکھا: "وہ متلون سیماب

صنعت، بزدل اور غریبوں میں۔ انہیں علم و دانش سے رغبت ہے۔ اور وہ ہندو مت اور بودھ مت دونوں کے پیروکار ہیں۔

کارکوت خاندان کا اہم ترین راجہ لٹا دیتہ جو ابے جس نے ۶۳ء عیسوی سے ۶۱ء عیسوی تک ۳۷ سال حکومت کی سکندر اعظم کی فتوحاتی ہوس ملک گیر فتوحات کا اس پر گہرا اثر تھا یہ امر ان الفاظ سے ظاہر ہو جاتا ہے جو اس نے اپنے وزیروں سے کہے تھے دریاؤں کے لئے صدمہ نہ رہے مگر جو فغان بخشنے کے مستحق ہیں ان کے لئے کوئی حد ضرر نہیں۔

شمالی ہند میں عدم استحکام، اپنی سلطنت کا زوال اور باہمی تنازعات کے نتیجے میں دکن کی بادشاہتوں کا خاتمہ اور کشمیر کے مغربی علاقے میں اقتدار کے فقدان نے لٹا دیتہ کو زیادہ سے زیادہ علاقے فتح کرنے کے خواب کی تعمیر کے مواقع پیش کئے، وہ جزوی ہندوستان میں کاویری تک اور مغرب میں کوئکن اور کاٹھیا واڑ تک گیا مشرق میں اس کی سلطنت کو بنگال تک وسعت حاصل ہوئی، لداخ اور مغربی تبت کے ایک حصے پر بھی اس کا تسلط تھا۔ ایک قابل چینی جرنیل کنکو نیا اس کی ملازمت میں تھا۔ لٹا دیتہ کے چینی راجا کے ساتھ بھی کچھ تعلقات تھے اور تبت کے اقتدار کو قباو میں رکھنے کے لئے چینی حکمران نے اس کے ساتھ تعاون کیا۔

انگریزوں کی فوجوں کے ہاتھوں میں چند ایک تعصبات نادرست معلوم ہوتی ہیں۔ مگر یہ حقیقت بھی اپنی جگہ اٹھ کھڑی ہے کہ دھرتی سے پیدا ہوا ایک عظیم ترین جنگجو اور فاتح تھاںات ایک عظیم ناظم اور تہذیب کشندہ بھی تھا اس نے انتظامی شہنشاہ کی تشکیل دی اور جس نے بعد کے قائم کئے جن میں وزیر اعلیٰ، سیکرٹری، سب سیکرٹری، کلاںٹر اور خزانہ کا منظم شامل تھے۔ خوبصورت مندروں، ستوپوں اور درباروں سے آراستہ اس نے نئے قصبے بھی تعمیر کئے ان میں اس نے سونے کی مورتیاں نصب کیں اس نے نئی تعمیر شدہ عبادت گاہوں کے ساتھ چند دیہات بھی منسلک کئے۔ اور ان کے مالکوں کو دینے کا سب سے ناقابل فراموش کارنامہ سورج دیوتا کے اعزاز میں مار تھیل کے شاندار مندر کی تعمیر ہے۔ جو مین سے تھوڑی ہی دور واقع ہے۔ اس شہور تعمیر کی بابت سسین نے کہا: "اس شاندار مندر کے گنبدوں کی ڈھلوان

میں ہندو فن تعمیر کے نادر ترین نمونے ہیں اسی طرح تنگ سبند قطران سبب یہ مندر ایک نہایت ہی خوبصورت مقام پر تعمیر کیا گیا ہے جو کہ دنیا کی کسی بھی عمارت کے لئے متنب جگہ سے بہتر سمجھا جاسکتا ہے اور یابیت پیلرز کے نظاروں سے بہتر ہے۔ وسعت میں یہ مصیروں کے مقابلے کم تر ہے۔ مضبوطی شان اور ثروت میں یونانی نمونے بہتر ہو سکتے ہیں۔ کوئی بھی ایسا شخص جس کے پاس خوبصورتی کی ہر لکھ کے لئے آنکھ نہ ہو اس مندر کی تعمیر کے لئے اس قسم کا مخصوص مقام نہیں منتخب کر سکتا تھا کوئی بھی شخص جو تعمیر و تبدیل اور پرستش کرتا تھا۔ وہ ایسی وسیع عمارت تعمیر نہیں کر سکتا۔

للتا دیتہ کے بعد آنے والے راجاؤں کی تعلیمی پادانتھا کی وجہ سے نویں صدی کے وسط میں یہ خاندان ختم ہو گیا۔ اس کے بعد کی ڈیڑھ صدی کے دوران کشمیر کی تاریخ دو غورؤں کی خوبصورتی اور مزاج سے متین ہوئی معلوم ہوتی ہے وہ ان میں سے ایک ہے جیادیلوی جس نے ایک نئے اپنا اہل خاندان کی بنیاد ڈالی اور اس خاندان میں کشمیر کا بہترین بادشاہ اونتی درمن ہوا ہے اور دوسری دتتا۔ جو ۵۰ برسوں تک تمام منظر پر چھائی رہی جو نے ایسی طاقتوں کو متحرک کیا جو آخر کار کشمیر میں ہندو سلطنت کے زوال اور تباہی کا موجب ثابت ہوئیں۔ مگر یہ دونوں غور تیں نہ تو بصورت متین اور ان کے خدو خال نہایت جاذب نظر تھے۔

للتا دیتہ ایک ہندو مت کا پکا پیروکار تھا وہ بھگوان وشنو کی دل کی گہرا بول سے پرستش کرتا تھا مگر وہ بودھ مت کے تیل بھی اتنا ہی وسینا القلب تھا۔ درحقیقت اس کا دور کشمیر میں بودھ مت کا سنہرمی دور تھا۔ اس نے صرف ایک ہی وہاں پر ۸۰۰ سالوں کا دور صرف کیا تھا۔ خطے اور مذہب کی وفاداریوں سے بالاتر ہو کر وہ عالمین کی سرپرستی کرتا تھا۔ اس نے قنوج سے دو عظیم شاعر بھو بھوئی اور واک پتی اپنے دربار میں لائے۔

جیادیلوی کی ولادت ایک غریب گھرانے میں ہوئی جو شراب کشید کر کے اپنی معاش حاصل کرتا تھا شراب کشید کرنا جو کہ ذریعہ معاش تھا وہ مگر ہی بودھ ہو گئی۔ اتفاق سے راجہ جیادیلو نے اسے دیکھ لیا۔ وہ اس کی خوبصورتی سے بہت متاثر ہوا اور اسے اپنے محل میں لے آیا۔ اس کے فوراً بعد راجہ انتقال کر گیا۔ مگر اس کا پس بھی جیادیلوی کے شمس سے کافی مسحور تھا۔ راجہ پر اثر کی وجہ سے اس کے بھائی مکمل طور پر طاقتور ہو گئے۔ آخر کار اس کے ایک بھائی کا پوتا اونتی درمن راجہ بن گیا اور اس نے ایک نئے خاندان اپنال کی داغ بیل ڈالی۔

اونتی درمن کے ۲۸ سالہ ۸۵۵ عیسوی سے ۸۸۳ عیسوی تک دور حکومت میں عوام جس قدر خوشحال اور آسودہ حال تھے اتنے پہلے کسی نہیں ہوئے۔ اس کے عہد حکومت میں یہ سرزمین تقدیس کنکرت اور امن کا گہوارہ بن گئی۔ اونتی درمن نے کوئی جنگ نہیں لڑی۔ اور اپنی تمام ترقوت اور وسائل ارتقا اور فلاح و بہبود کی

کاروائیوں پر صرف کئے۔ مقامی روح پھر سیتا کی مدد سے وہ نالیوں کی تعمیر آجپاشی اور زرعی بہتری کی کچھ متعدد سکیموں کو رو بہ عمل لانے کے قابل ہوا۔ غذائی اجناس کی پیداوار میں اضافہ ہو گیا اور قیمتوں میں کمی واقع ہوئی۔ مثال کے طور پر چاول کے ایک خروان کی قیمت ۲۰۰ دینار سے گر کر ۳۶ دینار رہ گئی۔ سیتا اپنے وقت سے ہزاروں برس آگے تھا۔ دریائے جہلم کا رخ موڑنے کی سکیم آج کی ہم پہلو دریائی واد سکیموں کی پیش رو تھی۔ اس نے کسی بھی زندہ مخلوق کو مارنے پر ممانعت کر دی تھی۔ کھن کے لفظوں میں ۱۶ سو دور میں شاڈھیلیا بے خوف ٹھٹھے پانی سے۔ دریا کے کناروں سے باہر آ کر موسم خزاں کی دھوپ میں اپنی پشتوں کو دھوپ میں گرم کیا کرتیں۔ راجہ کے آجپاشی سر سیتا نے جہلم و لرمیں چرند پرند کو ہلاک کرنے پر مستقل پابندی عائد کر دی تھی۔

اونتی درمن کے عہد میں تعمیر سرگرمیاں وسیع پیمانے پر عمل میں آئیں۔ اس کی سلطنت میں استحکام اور خوشحالی کی وجہ سے وہ اور اسکے رشتے دار نے مندر اور شہر بنوانے کے قابل ہو سکے۔ راجہ نے خود بھی اونتی پور کی بنیاد ڈالی جہاں اُس نے دو خوبصورت مندر اونتی سوامن اور اونتی سرتمبر کر لئے۔ یہاں تک کر ان مندروں کے کھنڈرات بھی سیتاؤں کے لئے نہایت جاذب نظر ہیں۔ خاص طور پر پیدگام تک اپنے سفر میں ہر ایک سیتاج یہاں رکتا ہے۔ ہر کسی براؤن کے تاثرات کے مطابق۔ جہاں مارتھنڈ نے اپنی قوت کے بارے میں بیداری کی ایسے ٹوکی وہاں اونتی سوامن مندر وقت کے ساتھ حاصل کئے۔ پختہ تجربات کے بعد تعمیر تخلیق کیا گیا مزید شاندار اور نشیں شاہکار ہے۔

راجہ کے ایک وزیر سترانے سنا پور کی داغ بیل ڈالی جو عصر حاضر کا ہار پور ہے اور راجہ کے مشیر سترانے تینا پور بسایا جو موجودہ سو پور ہے۔ شوا اور سترانے کے اعزاز میں پٹنوں میں ریشیوں اور قدس شغیبات کو آسرا دینے کے لئے سترانے جہلم ڈل کے کنارے پر اشبارہ گاؤں میں سریشور مندر تعمیر کروایا۔

ان تمام قیمرات سے ظاہر ہے کہ کشمیر میں ہندو مت نے نمایاں مقام حاصل کر لیا تھا اور بودھ مت میں پشت چلا گیا تھا۔ بہت سی عمارتوں میں کثیر البازو اور کثیر السربستے تعمیر کئے گئے تھے۔ جہرے بڑی عبادت کا رجن تھا ہر جہرے تانبے راجہ نہایت عظیم اور فیاض تھا اور مزیروں کی ضروریات پوری کی جاتی تھیں۔

اونتی درمن علما، اورادہا کی سرپرستی کیا کرتا تھا۔ راجہ کی بھامی ان کی نامزدگی کی جاتی تھی انہیں بہت سی دیگر مراعات سے بھی نوازا جاتا تھا۔ ان میں سے ممتاز تھا جو صرف و نحو میں پنا خاص مقام رکھتا تھا، بھاؤ گفت و سونگیت کا پیروکار اور ایک عظیم فلسفی تھا اس نے ادویتہ شومت کی داغ بیل ڈالی اور اپنے استاد کے نظریات کے پرچار کے لئے کافی کام کیا۔

تمام نکتے ہائے نظر سے اونتی درمن کا عہد کشمیر کی تاریخ کا ایک شاندار دور رہا ہے۔ اس دور میں وادی میں امن تھا، ترقی تھی، انصاف تھا، راجہ اور وزیروں کے درمیان مناسبت تھی، تحفظ کے لئے تقدس اور

اور بیداری تھی، مذہب، ثقافت اور فن کی اعلیٰ قدروں کے لئے رغبت اور لگاؤ تھا۔ راجہ کی پاکیزگی کا مزاج اس امر سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے بیترعلالت سے سبکدوش گیتا کا پاٹھ سنا کرتا تھا اور اس مقدس کتاب سے شلوک سنتے ہوئے ہی وہ — ملک عدم ہو گیا۔

اونٹ ورن کے بعد شکر ورن جانشین ہوا، غیر ضروری فوجی مہمات کی وجہ سے اس نے وادی کے امن اور خوشحالی کے ماحول میں خلل ڈال دیا۔ اس نے بھاری ٹینکس اور محمولہ عائد کئے اور بیگار لینا شروع کر دیا کہا جاتا تھا کہ ”راجہ نے سانس لینے کے سوا کچھ کبھی ٹینکوں کی عائدگی سے نہیں بخشا تھا“

شکر ورن کے جانشین نااہل حکمران تھے۔ ۹۳۹ عیسوی میں اپنا خاندان کا خاتمہ ہو گیا جب ایک برہمن سسکر دیوتا جدار بنا دیا گیا ۹۳۹ عیسوی میں اس برہمن راجہ کے وزیرانظر پروگپت نے اس کا تختہ پلٹ دیا اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ وہ خود تخت پر بیٹھ گیا۔ گیتا خاندان کے عہد میں ہی لوہن کے راجہ کی بیٹی دوتا ظہور پذیر ہوئی اس وقت لوہر محلے پونچھ میں واقع ہے۔ دوتا کی شادی دوسرے گیتا راجہ حکیم گیت (۵۸-۹۵ عیسوی) کے ساتھ ہوئی تھی۔ وہ ۵۰ برس تک کشمیر کی سیاست پر غالب رہی پہلے وہ ملکہ تھی پھر اپنے بیٹے اور پوتوں کی نگہبان اور اس کے بعد وہ براہ راست حکمران ہوئی۔

اپنے شوہر پر دوتا کا اقتدار اثر تھا کہ راجہ حکیم گیت کو دوتا کیما کہا جاتا تھا۔ حکیم گیت کے انتقال کے وقت دوتا کی بیوی ناچا جاتی تھی مگر اس نے اپنے ان درباریوں کے حضور پر یہ فیصلہ ترک کر دیا جو وزیر اعلیٰ کے حامد تھے۔ وہ نابالغ راجہ ابھیموندو کو سرپرست اور نگہبان بن گئی ایک کے بعد ایک اس نے اپنے تمام مشیروں کا کام تمام کر دیا۔ کہیں رقیط از ہے۔ وہ لنگڑی مہارانی جس کے متعلق خیال تھا کہ وہ گائے کے نقش پا کو بھی نہیں کھل سکتی تھی، متعدد دشمنوں پر غالب آگئی جیسا کہ ہنومان نے سمندر کو عبور کر لیا تھا۔

دوتا نہایت خوبصورت از حد ذہین اور غیر معمولی طور پر بے راہ روتھی۔ اس کی شخصیت میں بائرن کا رجحان تھا۔ بائرن کی طرح وہ بھی ایک ٹانگ سے لنگڑاتی تھی مگر یہ بات اس کے حق میں گئی اسی ادب اس سے بہت سارے عاشق قربان جاتے تھے۔ وہ لنگڑاتے ہوئے اس انداز سے چلتی تھی گویا کعدالت میں کوئی چراغ قعس کر رہا ہو، بعض اوقات وہ اس قدر عیناش ہو جاتی کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ مگر چند دوسرے موقعوں پر جذبات سے بالکل غاری ہو کر چٹان کی طرح اٹھ ہو جاتی اور اپنے اقتدار کے ہر پہلو کا مقابلہ کرتی۔ وہ اعلیٰ درباریوں پر مہربان ہو جاتی اور کبھی کبھی جسمانی آسودگی بھی انہیں عطا کرتی اور پھر خفیہ طور پر انہیں قتل کروا کر ان سے نجات حاصل کر لیتی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس نے اپنے تین پوتوں کو بھی اسی طرح ہلاک کروا دیا تھا۔ دریں اثنا اس نے بہت سارے مقدس کام بھی کئے، مندروں اور مٹھوں کی تعمیر عمل میں لائی۔ اس کا آخری عاشق تنگ ایک کھاسچر واپا تھا جسے بعد ازاں وزیر اعلیٰ اور سپہ سالار بنا دیا گیا۔ ۵۰۵ اس کے بعد بھی قائم رہا۔ ۱۰۰۳ عیسوی میں وہ انتقال کر گئی کینگری تاریخ

عیاری و عیاشی اور سازشوں کے ماحول میں زندہ رہی اپنی اہلیت اور جرأت کی بنا پر ہی اس نے ان گروہ بڑ زدہ سلطنت کو یکجا رکھا مگر مکروہ اور گزگڑا رہونے کی وجہ سے اس نے ناقابل تلافی نقصان بھی کیا اور ہر طرف اخلاقی پراگندگی پھیلادی۔

اپنی موت سے قبل دوتا نے ایک چال چلی کہ کشمیر کا تخت لوہار خاندان کے ایک رکن سنگرام راج کے قبضے میں چلا جائے کیونکہ اس کے مائیکے وہیں تھے چنانچہ ایک نیا خاندان لوہار خاندان (۱۱۰۱-۱۰۰۳ عیسوی) کے نام سے وجود میں آیا۔ اس کے ساتھ ہی کشمیر میں وارد ہوئے۔

سنگرام راج کے عہد حکومت (۲۸-۱۰۰۳ عیسوی) میں محمود غزنوی شاہی سلطنت کے راجہ ترلوچوپال کو شکست دے کر کشمیر کے حدود کے قریب وارد ہوا۔ سنگرام راج کا جانشین انت (۶۳-۱۰۲۸ عیسوی) ایک کمزور راجہ تھا۔ وہ پنجاب کے شاہی شہزادوں کے زیر اثر آ گیا جنہوں نے محمود غزنوی کے حملے کے بعد کشمیر میں پناہ لی۔ انہوں نے راجہ کی شادی سوریتھی سے کرانی جو جالندھر کے حکمران کی بیٹی تھی۔ شاہی شہزادوں اور سوریتھی کے بڑھتے ہوئے اثر کے سبب کشمیر میں کافی رنجش پیدا ہو گئی اور سلطنت میں کافی طوفان برپا ہوئے۔ اگرچہ انت کافی سنجیدہ حکمران تھا مگر وہ اپنا حکم نہیں چلا سکا۔ اپنی بیوی کے طعنے برداشت نہیں کر سکا اور مایوسی کے عالم میں اس نے خودکشی کر لی۔ اس تہمت کے زیر اثر وہ سنی ہو گئی اور اسے اپنے شوہر کی جتانیں خود کو جلا لیا۔ انت کے بعد یکن ۸۹۔

۱۰۶۳ عیسوی) اور برش (۱۱۰۱-۱۰۸۹ عیسوی) حکمران ہوئے موخر الذکر نے مندروں کی جاداد لوٹ کر اور مورتیوں کی بے حرمتی کر کے خود کو بدنام کر لیا تھا اس بارے میں کہیں لکھا ہے ”دیوتاؤں کے وقار کو گندہ کرنے کے لئے برش نے ان کے چہروں پر ننگے خاکروبول کے ذریعے اس نے ان پریشناپ اور فحش گروایا۔“

راجہ کے اس قابل اعتراض رویے کے لئے کوئی ٹھوس وجہ بیان نہیں کی گئی ہے۔ علما کا خیال ہے کہ یہ اسلام کے اثرات کی وجہ سے ہوا جہاں بت پرستی کی ممانعت ہے دوسرے علما کا خیال ہے کہ گندہ رویوں کے زیر اثر وہ یہ کام کیا کرتا تھا۔ بہر کیف برش کے رویے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دور میں کشمیر کی سلطنت کے قدر پرست اور زوال پذیر ہو چکی تھی کہیں کے الفاظ میں برش کے لباس میں وہ شیطان اس زمین پر نازل ہوا کہ دیوتاؤں، دیوتیوں اور برہمنوں کی اس سرزمین کو اس نے تباہ کر دیا۔ یوں بھی بدلتی ہی نہیں آتی اس کے بعد وادی میں وہاں میں پھیلیں سبیلاب آئے اور قحط سالی ہو گئی۔

لوہارو خاندان کے راجاؤں میں سے صرف دو آکالے (۱۱۰۱-۱۱۰۱ عیسوی) اور جیاسم (۵۵-۱۱۲۸ عیسوی) قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر نے راجہ برش کے لئے نقصان کی تلافی کرنے کی کوشش کی۔ اس نے انتظامیہ میں اصلاح کی راشی افرو کو نکال دیا۔ جرموں کو سزا دینے کے لئے انہیں تخریاتی ضابطے میں تسلیم کی جس کے تحت انہیں جیل نہیں بھیجا گیا۔ بلکہ انہیں سماجی کاموں کی طرف راغب کیا گیا۔ جدید تحریک کا پیش رو تھا کہ جرموں کا سدھار اور ان کی آباد کاری کی جانی چاہیے۔ اس میں انصاف کے لئے افضل سلیم موجود تھی۔ اس بات کو یقینی بنانے کے لئے کہ اس کی رعایا

کو چھوٹے اہلکار تنگ دکریں تو کرم طور پر خوش تھے وہ خود بھی بس بدل کر قبضوں اور دیہات میں گھومنا تھا۔ ہرش نے متعدد مندروں اور مٹھوں کی تعمیر عمل میں لائی اور ان میں مورتیوں کی دوبارہ مندرجہ کی نگہداشت کا دوسرا پہلو بھی عقد غصے میں آکر وہ کئی مرتبہ پاگل کتنے کی طرح سلوک کرتا تھا اس سے اس کا ہمداندا رہا ہو گیا۔ جو کہ بصورت دیگر شاندار تھا۔

جیسا کہ نے قریباً ۲۸ برس تک حکومت کی۔ وہ لاتا دیتا اور انٹی ورسن کی روایات میں واقعی ایک عظیم راجہ تھا۔ اس کے دور کو کشمیر میں آریاؤں کی اسیائے نو کا دور قرار دیا جاتا ہے اگرچہ اس کی زیادہ تر قوت حریص لوگوں کی جھلش سازشیں اور بغاوتیں دبانے میں ہی صرف ہو گئی مگر اس نے سماج کی اخلاقی قدربیں اُجاگر کرنے کے لیے بھی متعدد اقدامات کئے۔ اس نے خود بھی کردار کے کئی معیارات متعین کئے۔ سفر بیوں کی شادی بیاہ اور مذہبی رسومات کے موقع پر امداد کی حوائج، علماء حاجت مندوں اور برہمنوں کو نیا مٹی کے ساتھ عطیات دیے جاتے۔ بڑے فروشی پر پابندی عائد کر دی گئی اس مقصد کے لئے خاص طور پر دارالخلافہ کو مکمل اور راست دھاریا کے تحت رکھا گیا۔ جیسا کہ نے متعدد مندروں اور مٹھوں تعمیر کئے جن میں سمجھا مٹھ بھی شامل ہے۔ نئی عمارتوں کی دیکھ بھال کو یقینی بنانے کے لئے اس نے ان کے تحت میں مستقل عطیات دیئے۔

۱۱۵۵ عیسوی میں جیسا کہ کے انتقال کے بعد پستی اور زوال کا دور دورہ اور ہرش کے دور میں شروع ہوا وہ تیز ہو گیا حالانکہ اگلے اور جیسا کہ کے دور میں اس رجحان میں کمی واقع ہوئی۔ آئندہ دو سو برسوں میں زور اور خور و خور راجہ رہے جن میں حالات کو درست کرنے کی قوت ارادی با سکل منقود تھی۔ یو یو دیو (۱۲۸۶-۱۱۷۱ عیسوی) کا ناتواں اور غیر اہم خاندان اس کے بعد آیا۔ بعد ازاں اڈام (۱۳۲۰-۱۲۸۶ عیسوی) خاندان بھی عیاش اور نامردم کے راجاؤں پر مشتمل تھا۔

اس اخلاقی پستی اقتصادی زوال اور سماجی و اقتصادی انحطاط کے ماحول میں بیرونی حملہ آوروں نے کشمیر میں پہونچنا شروع کیا۔ ان دو غیر ملکی افراد میں شاہ میر اور رنجن شامل تھے۔ اول الذکر بارہمولہ اور اشراؤند کر لار میں بس گئے۔ ان دونوں کی امداد اڈام راجہ سہیلو نے کی ان دونوں کو جاگیریں عطا کیں۔ ان دونوں کو کشمیر کی تاریخ کی سمت متعین کرنے میں اہم رول ادا کرنا تھا۔

۱۳۲۰ عیسوی میں مرکزستان کے باشندے اور منگول جنگجوؤں کے حملے میں کشمیر کی بند و سلطنت کو ایک ہنگامہ دھچکا پہونچا۔ چونکہ پہاڑی دتروں پر کوئی پوکسی نہیں تھی دلا چنے اپنے سامنے آنے والی ہر شے کو نیست و نابود کر دیا۔ راجہ سہیلو نے نہایت قابل مذمت بزدلی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے حملہ آوروں کو خریدنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ دلا چہ اس طرح وادی میں داخل ہوا جیسے شیر کسی بہرنی کی غار میں آتا ہے اور کشمیری عوام کو کسی آگ میں پھینکے گئے کیردوں کو مڑوں کی طرح موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ مردوں کو تہ تیغ کر دیا گیا۔ بچوں اور خود توں کو غلام بنا کر لے گیا۔ حملہ آوروں نے شہروں اور دیہاتوں کو ٹوٹا اور اپنا راستہ لیا۔ جو خراج کے الفاظ میں

کشمیر تخلیق سے پہلے کا علاقہ بن کر رہ گیا۔ رنجن لداخ کا باشندہ تھا اور بلتیلوں کے ساتھ اقتدار کی جنگ میں اپنے والد کی موت کے سبب وہ کشمیر میں آ گیا۔ اس نے اس اتھل پھل سے فائدہ اٹھایا اور راجہ سہیلو کی طرف سے اپنے ساتھ نیکی کے برتاؤ کے قطع نظر لار وادی کے گرد و نواح کے علاقے میں لوٹ بھاڑی۔ جون راجے نے ان حالات کو نہایت رنگین انداز میں یوں بیان کیا ہے: دلا چہ پانی اور پہاڑ پر چلنے والی ہوا کی طرح تھا، رنجن ایک طوفان کی مانند جبکہ شہر سرینگر کے فردا علی اور امیر لوگ خوف سے دل گئے جس طرح جھیل پر ندوں کے ان بچوں پر چھٹ بڑتی ہے جنہیں گھوسلوں سے باہر پھینک دیا گیا ہوا سی قدرتی کے ساتھ رنجن کی فوج نے کشمیر کے عوام کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ رنجن کے راستے میں صرف ایک رنجن وزیر علی رام چندر تھا جس نے دلا چہ کے حملے کے بعد سہیلو کے فرار ہو جانے پر خود راجہ ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔ رنجن نے دھوکے اور قریب کاری سے رام چندر کا قتل کروا دیا اور تخت پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح کشمیر کی سلطنت پر ایک لارنجی بودھ کی حکومت قائم ہو گئی۔

عوام کے ساتھ مفاہمت کے مقصد سے رنجن نے رام چندر کی بیٹی کو نارانی کے ساتھ شادی رچائی۔ اس نے امن و انتظام کو بحال کیا اور شاہ میر کے تحت ایک قابل انتظامیہ قائم کیا۔ عوام کے ساتھ مزید آرام بڑھانے کے لئے وہ ہندو بن جانا چاہتا تھا مگر اس کی تجویز کو کشمیری برہمنوں نے مسترد کر دیا چنانچہ اس نے اسلام قبول کر لیا۔ کیونکہ اس مذہب کو عوام کا ایک طبقہ پہلے ہی اختیار کر چکا تھا اس نے سلطان صدر الدین کا لقب اختیار کیا چنانچہ کشمیر میں پہلا مسلم حکمران ہوا۔

بہر حال اولین مسلم حکومت مختصر عرصے تک ہی جاری رہی۔ ۱۳۲۳ عیسوی میں رنجن چل بسا تو اپنے لواحقین میں ایک نابالغ بیٹا چھوڑ گیا جس کا نام حیدر تھا۔ درباریوں نے بادشاہ کے بھائی اڈیان دیو کو شہر کا تخت قبول کرنے کی دعوت دی جسے اس نے قبول کر لیا۔ اپنی پوزیشن کو مضبوط بنانے کے لئے اس نے کوٹارانی سے شادی کر لی۔ راجہ اڈیان دیو ایک سست اور کمزور حکمران تھا سلطنت کی حقیقی باگ ڈور کوٹارانی کے ہاتھ میں تھی۔ اسی دوران ایک اور حملہ آور مرکز منگول چلا وادی میں وارد ہوا۔ اڈیان دیو لداخ بھاگ گیا مگر کوٹارانی اور شاہ میر نے وادی کا تحفظ کیا۔ اور چلا واپس چلا گیا۔ عوام نے خوشیاں منا لیں۔ شاہ میر بہرو بن گیا۔ راجہ اڈیان دیو واپس آچکا تھا اور شاہ میر پس پردہ حکمران بن گیا۔

اڈیان دیو ۱۳۲۸ عیسوی میں انتقال کر گیا اور شاہ میر کو حکمران بننے سے روکنے کے مقصد سے کوٹارانی نے راجہ کی موت کی خبر چار دن تک راز رکھی اور اندر کوٹ کے مضبوط قلعے میں چلے جانے کے بعد اس نے خود کو آئٹ سرہ حکمران ہونے کا اعلان کر دیا۔ بعد ازاں ہونے والی اقتدار کی جنگ میں شاہ میر کو فوج و کارمانی حاصل ہوئی اور اس نے سلطان شمس الدین کے لقب سے حکومت سنبھالی۔ ایک فارسی مورخ کے مطابق شاہ میر نے کوٹارانی سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ شادی کرے اس نے قبول کرنے کا بہانہ بنایا مگر وہی کرے میں اس نے خود کو خنجر ٹھپ لیا اور اپنی آنکھوں کی طرف اشارہ کر کے بولی میری رضامندی یہ ہے۔ جلد ہی وہ خون بہتے ہوئے موت کی تیز سوئی کشمیر میں مسلم حکومت نہایت

سازگار حالات میں شروع ہوئی حالانکہ شاہ میر کی حکومت (۳۲-۱۳۲۹ عیسوی) مختصر عرصے تک رہی مگر اس نے کشمیر کے دروسے کراہتے ہوئے جسم پر مرہم کا کام کیا۔ سلطان نے انسانی ہمدردی اور انصاف پر مبنی انداز فکر اپنایا۔ اس نے فیکسوں میں کمی کی اور ہندو اور مسلم دونوں سے یکساں سلوک کیا۔

اکلاہم سلطان شہاب الدین (۳-۱۳۵۴ عیسوی) ہوا جو شاہ میر کا پوتا تھا۔ اس کے دور حکومت کو فوجی اور سیاسی نقطہ نظر سے کشمیر میں مسلم سلطنت کا سب سے شاندار عرصہ کہا جاسکتا ہے۔ اس نے نہ صرف پگمراہوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کی پیش بندی کی بلکہ شمال مغرب اور کشمیر کے جنوب میں فوجی مہمات کا اہتمام کیا جو ان راج کے الفاظ میں ہرن بھی آٹھوں والی طور میں اس کے ذہن کو راغب نہ کر پائی تھیں نہ ہی اسے ملے جیسی سے آسودگی حاصل ہوئی تھی اور نہ ہی چاند کی روشنی میں اسے کیف حاصل ہوتا۔ اسے صرف فوج کی پیش قدمی سے رغبت تھی۔

شہاب الدین کے عہد حکومت میں وادی خصوصاً سرینگر شہر میں تباہ کن سیلابوں کی وجہ سے بھاری نقصان ہوا۔ نہ ہی دھرتی انہی فیصل کا نشانہ نہ بنی اور نہ ہی کوئی گھرانہ سیلابوں کی زد سے بچ پایا۔ اس مصیبت آفت کا مقابلہ کرنے کے لئے سلطان نے نہایت سستائش کن طور پر اقدامات کئے۔ اور متاثرہ قوام کو فوری رامت فراہم کی۔ اس نے باری پرست کے نزدیک بلند زمین پر ایک نیا شہر تعمیر کروایا۔ اور اس کا نام اپنی رانی کشمی سے منسوب کر کے کشمی نگر رکھا۔ وہ بڑا عدل پسند حکمران تھا اور ہندوؤں کے لئے ہمدردی کی قوت رکھتا تھا۔ سلطان شہاب الدین کے بعد اس کا بھائی بھٹلا آیا اس نے قطب الدین (۸۹-۱۳۹۲ عیسوی) اپنا سیاسی حکمران کے عہد میں سید علی ہمدانی کشمیر میں وارد ہوئے اور اسلامی اعمال کی سختی سے عمل ہونے لگا۔

آئندہ حکمران کے عہد میں اسلامی جذبہ کثرت پن کی صورت اختیار کر گیا۔ سلطان سکندر (۱۳۱۳-۱۳۹۱ عیسوی) بہت شک کے ناک سے جانا جانے لگا۔ کوئی بھی گاؤں جنگل یا قصبہ نہیں تھا جہاں لڑو تاؤں کے مندر نہ توڑے گئے ہوں۔ یہاں تک کہ سلطان نے ضہور مارتنڈ مندر کو بھی مسمار کرانا چاہا مگر عید میں اس نے اپنی کوشش ترک کر دی۔ باقی ستیدوں کے زیر اثر سلطان نے مشرا بنو شری، بھڑا، رقص و سرور اور موسیقی کے آلات کے استعمال جیسے غیر اسلامی افعال پر پابندی عائد کر دی۔ ہندوؤں پر جزیہ عائد کیا گیا اور ان کے ماتھے پر تلک لگانے پر ممانعت عائد کر دی۔ سکندر نے شیخ الاسلام کا ادارہ بھی قائم کیا تاکہ فتوؤں پر عمل کی طور پر عمل کیا جاسکے۔

سلطان کے وزیر اعظمی ملک سیف الدین کے تحت اسلام قبول کروانے کی ایک انتھک مہم شروع کی گئی اس وزیر اعظمی کا حقیقی نام شہا بیٹ تھا۔ اس نے اسلام قبول کرنے کے لئے ہندو مذہب ترک کر دیا۔ اس کو مسلم کے جوش کی کوئی حد نہ رہی اور جو لوگ مذہب تبدیل کرانے کی راہ میں حائل ہوئے ان پر انہوں نے بھاری منظم کئے۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان اور اس کے وزیر اعظمی نے ان تمام کتابوں کو جھیل ڈال میں پھینک دیا جو ان کے ہاتھ لگیں۔ برہمنوں کے سات من زار نظر کش کر دیئے گئے۔ اسی دور سے ہی مسلمانوں کا غلبہ اس وادی میں شروع ہوا۔

سلطان سکندر کے عہد میں بھاری تعداد میں صوفی اولیاء اور اسلامی علماء و مشائخ اور فاضل کے شہر میں

وارد ہوئے۔ محمد ہمدانی ولد علی ہمدانی کے ہمراہ ۷۰۰ ستید کشمیر آئے اور ان کی وساطت سے اسلام کشمیر میں پھیلا۔ اس دور میں بہت سی مسجدوں کی تعمیر عمل میں آئی جن میں بیچ باڑہ اور سرینگر کی جامع مسجد شامل ہیں۔ سکندر کی پالیسی پر اس کا بیٹا سلطان علی شاہ بھی کاربند رہا اور وہ بھی وزیر اعظمی سیف الدین کے زیر اثر رہا۔

اکلا سلطان زین العابدین (۴۰-۱۴۲۰ عیسوی) نہایت شریف اور قوت برداشت والا شخص تھا جانتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تاریخ میں بہت کم ایسی مثالیں ملتی ہیں جہاں باپ کی پالیسی کو بیٹے نے الٹ ڈالا۔ جہاں سکندر نے تباہی پھائی۔ زین العابدین نے اسے بحال کر دیا۔ جہاں اول الذکر نے لوگوں کو دلش بد کر دیا آخر الذکر نے انہیں واپس بلا لیا۔ سردار کے الفاظ میں سکندر اور علی شاہ کے بعد زین العابدین کا دور ایک سندل کے لیپ کی ٹھنڈک کی مانند تھا۔ جہاں گویا ایک ریگستان کی گرمی دور ہو گئی۔

ہندوؤں پر لگائی گئی تمام پابندیاں دور کر دی گئیں۔ گھوٹ کشی پر پابندی عائد کر دی گئی۔ جن جہنموں کو ہندو و مقدس تسلیم کرتے تھے وہاں پھیلیاں مارنے پر ممانعت عائد کر دی گئی اس نے سمارتہ مندروں کی تعمیر نو کی اجازت بھی دے دی جن مندروں کو اس نے خود بھی تعمیر کروایا۔ ظلم و تشدد کی وجہ سے جو ہندو وادی سے بھاگ گئے تھے اس نے انہیں واپس بلایا اور ان کی اہلیت کی بنا پر انہیں ذمے دار عہدوں پر تعینات کیا۔ اس نے ہندو شاہسروں اور بھاجارت کا فارسی میں ترجمہ بھی کروایا۔

سلطان زین العابدین میں ہمہ پہلو صلاحیتیں موجود تھیں مذہب کے معاملے میں وہ اکبر کا پیش رو تھا۔ تعمیرات کے معاملے میں وہ کشمیر کا شاہ جہاں ثابت ہوا۔ اس نے علم و دانش فن اور تمدن کے میدان میں بھی اپنا ممتاز مقام پیدا کیا۔ وہ ایجاداتی ذہن کا مالک تھا جس نے صنعت و حرفت کے معاملے میں نئی نئی ترقی دی۔ فلاح و ترقی کے معاملے میں اس کے چھان کے شکر کے طور پر متعدد نہریں وجود میں آئیں جن سے نہ صرف نچلے اور دلدل بھرے علاقوں سے پانی کا کھاس ممکن ہوا۔ اور وہ قابل کاشت ہو گئے۔ بلکہ بیج بھلاؤں کو آبپاشی کی سہولیات بھی پیش ہوئیں۔

ان تمام اقدامات کے شکر کے طور پر زرعی پیداوار میں کمی گئی۔ اضافہ ہوا۔ بوڑھو کرافٹ نے کھنکے بے کر ۲۳-۱۸۲۲ عیسوی میں چاول کی سالانہ پیداوار ۲۰ لاکھ خرد اڑھی جبکہ زین العابدین کے عہد میں یہ پیداوار ۷۰ لاکھ خرد اڑھی تھی۔

سلطان نے انتظامی شہنشاہ کی بھی تشکیل نو کی۔ راجی اہلکاروں اور جموں کے خلاف اس نے سخت کاروائی کی۔ وکسی گاؤں میں ہوئے جرائم کے لئے اس گاؤں کے سربراہ کو ذمہ دار قرار دیتا۔ اطلاع جمع کرنے کے معاملے میں اس نے ایک مضبوط نظام قائم کیا۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان کو عوام کے بارے میں خواہشوں کے سوانے بہت کام علم ہو جاتا تھا۔ قیمتوں کو سختی سے قابو میں رکھا گیا۔ ذخیرہ اندوزی کو ختم کر دیا گیا۔ اور یک طرفہ محصولات کو ختم کر دیا گیا۔ جعل سازی دھوکہ دہی کی پھیلی ہوئی بدعت کو دور کرنے کے لئے اس نے دستاویزات

کا اندراج لازمی قرار دیا۔

زین العابدین نے نہ صرف پرانے فنون اور دستکاریوں کو بحال کیا بلکہ چمنی مدامت کو بھی ترویج دی۔ کشمیر صنعت و حرفت کا ایک مسکراتا ہوا باغ بن گیا اور لکڑی پر کشیدہ کاری پیرپاشی ریشی شال بنانے اور غلچہ سازی میں نمایاں ترقی کی۔ یہ مشاہدات ۱۵۴۳ عیسوی میں مرزا حیدر نے تاریخ رشیدی میں رقم کئے۔ اس نے لکھا: کشمیر میں چند ایسے فنون ملیں گے جو بہت سارے دوسرے ممالک میں غیر معمولی ہیں ان میں پتھروں کو پالش کرنا پتھروں کو تراشنا، بوتلیں بنانا اور سونے کی راکھ نیتا کرنا شامل ہے۔ یہ تمام باتیں زین العابدین کی وجہ ممکن ہو سکی ہیں۔

ایک معمار کے طور پر زین العابدین نے متعدد نئے قصبے تعمیر کروا کر اپنا نمایاں مقام حاصل کیا ان میں نوشہرہ، زین پورہ اور زین کوت اور زین گیری شامل ہیں۔ اس نے تحصیل ولہ میں ایک خوبصورت جزیرہ بھی تعمیر کیا۔ اس کا شاہی محل مشرق میں اپنے وقت کی عمر ترین عمارت تھا۔ یہ ایک بارہ منزل عمارت تھی۔ ہر ایک عمارت میں ۵۰ کمرے تھے اور ہر آمدے سے چہنیں کھدائی اور نقش و نگاری کے کام سے سجایا گیا تھا۔

سلطان فتوحات اور فن سپہ گری میں بھی کسی طور کم نہیں تھا۔ اس نے اپنی فوج کی تنظیم نو کی۔ اس نے باؤد کے استعمال کو ترویج دی اور چمنی کو بھی تیار کیا۔ اس نے لداخ اور بلتستان پر غلبہ حاصل کیا اور نوشہرہ، راجوری اور لوہار کی پہاڑی سلطنتوں کو اپنی عطا میں لیا۔

زین العابدین کو کشمیر کا عظیم ترین سلطان ہونے کا فخر حاصل ہوا جس نے نصف صدی تک حکومت کی سرور سے بجا طور پر کہا ہے۔ "کالی ٹیک" میں سلطان کا طرز حکومت "سینہ ٹیک" کے وسط کی طرح اپنی شاندار صورت اختیار کر گیا۔ اس کی موت کے وقت یوں محسوس ہوا کہ گویا "تاج" بے ثروت ہو کر رہ گیا ہو اور صف سماء منوم ہو گئے ہوں عدل و انصاف، فیاضی، علم و دانش، اقتدار، شان و شوکت امن و رواداری گویا نصبت ہو گئے ہوں۔

سلطان زین العابدین کے بیٹے اپنے باپ کے مقابلے نا اہل ثابت ہوئے۔ اس کی موت کے بعد سازشیں، مخالف سازشیں ہوئیں، دربار میں سیدوں کا مرتبہ بلند ہو گیا اور سلطان ان کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن کر رہ گیا۔ وادی میں وارد ہونے کے ابتدائی مرحلوں میں سیدوں کی کافی قدر منزلت تھی مگر جلد ہی انہوں نے اقتدار اور رتبہ حاصل کر لیا جس کی وجہ سے دوسرے درباریوں میں حسد پیدا ہو گیا۔ ان کی بد مزاجی کی وجہ سے عوام کٹ کر رہ گئے، سرور کے لفظوں میں وہ ان کے ساتھ گھاس کے تنکوں کی مانند سلوک کرتے تھے۔ انتظامیہ بے راہ رہا ہو گیا۔ انہوں نے رشوت لینے کو وصف تصور کیا جاتا تھا، شراب نوشی اور منی مباشرت کو آسودگی سمجھا جاتا تھا۔

صرف کرنے لگا۔ یہ عورتیں اس کے گرد و پاس میں ہی رہتیں اور سلطان کی اس کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس سے ناجائز فائدے حاصل کرتی رہیں اور وہ عوام سے رشوت جمع کرتی رہیں۔

سلطنت کشمیر کے سرمائے میں بھی کمی واقع ہونے لگی۔ اس کے بعد کے ۱۲۰ برسوں نے سازشیں ہی سازشیں دیکھیں۔ ایک کے بعد دوسرا کمزور سلطان آیا۔ درباریوں کے دھڑے بڑا دھڑا چلک اور ڈار اقتدار کے لئے سازشوں میں نہایت بے اصول طور پر مصروف رہے۔ مذہبی تفرقات نے تنازعات کی شدت میں اضافہ کیا۔ چک کٹر طور پر شیعہ عقیدے سے وابستہ تھے اور سید اور ماگرے بھی اسی قدر شیعہ عقیدے کے پابند تھے اور اس کے نتیجے کے طور پر عوام کو مصائب اٹھانا پڑے۔ ۱۵۱۶-۱۵۱۵ عیسوی میں پھیلی وبا کے نتیجے میں عوام کی مشکلات میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اس بارے میں مؤرخ شکار قمر ازبے دیہات یا دارالاملاہ میں لقمہ اجل بننے والوں کی تعداد کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ مردوں کو اپنی آخری رسوم کے لئے کپڑے کا ایک ٹکڑا تک بھی میسر نہ ہو پاتا۔ یار لوگ یاروں کا ماتم نہیں کرتے تھے۔ اور غریبوں کا ماتم منانے کا تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ان غیر مستحکم حالات میں ایک برٹش ریل مرزا حیدر وادی میں وارد ہوا۔ وہ ہمایوں کی ملازمت میں تھاجب آفرالڈ گمشدہ شاہ سوری نے ۱۵۴۰ میں قنوج میں شکست دی اور اس کی فوج پسپا ہو رہی تھی تو مرزا وادلت نومبر ۱۶۳۱ میں اپنے ۳۰ سپاہیوں سمیت وادی میں چلا آیا۔ عملی طور پر اسے کسی مزاحمت یا مداخلت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس کی سیدوں، ماگرٹیوں نے حمایت کی۔ اس نے جلد ہی وادی پر پورا تسلط جمایا اور آئندہ گیارہ برس (۱۵۴۱-۱۵۴۲) تک ہمایوں کے نام پر حکومت کی۔

مرزا حیدر کے دور حکومت میں کشمیر یوں نے راحت کی سانس لی۔ مرزا نے صنعت و حرفت کو بحال کیا جو زین العابدین کے بعد لڑکھڑاہی تھی۔ تجارت میں بھی اضافہ ہوا عام اقتصادیات میں بھی تیزی واقع ہوئی۔ مرزا حیدر نے جرنیلوں کو بے جا فائدے پہنچائے، انہیں اہم عہدوں پر فائز کیا اور ان میں جاگیریں تقسیم کیں اور مقامی روساء کو ان سے محروم رکھا۔ اس کے ثمرے میں اس کے خلاف بغاوت ہو گئی اور اس کشمکش میں وہ مارا گیا۔

مرزا حیدر کی موت کے بعد مقامی دھڑے بندی پھر اُبھر کر سامنے آ گئی اور اقتدار کی اس پستقی میں چک فقیاب ہوئے۔ ۱۵۶۱ میں حالات اس قدر دگرگوں ہو گئے کہ کھلے دربار میں علی شاہ نے تاج سلطان سے چھین لیا اور اسے اپنے بھائی غازی چک کے سر پر پہناتا دیا۔ اس طرح چک خاندان کی بنیاد پڑی مگر اس سے صورتحال میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ تنازعے اور سازشیں جاری رہیں کشمیری روساء کے ایک طبقے نے اکبر تک رسائی حاصل کی اور اسے درخواست کی کہ وہ کشمیر پر قبضہ کرے۔

قرباب الخدوش حالات میں متغیروں نے کشمیر کو چھاپا لیا اور ۱۵۸۹ میں اس پر مکمل غلبہ حاصل کر لیا جب بادشاہ اکبر خود وہاں آیا۔ آخر سلطان یعقوب شاہ نے نہایت بہادری سے مزاحمت کرنے کے بعد ایک مقامی نام

لکھا جس میں اس نے کہا: اس (یعقوب شاہ) کی درخواست یہ ہے کہ فضل الہی اب اپنا ایک خاص پاپوش ارسال کریں تاکہ وہ اسے اپنے تاج پر رکھ سکے اور خلیج بھائی کے در پر سجدہ کر سکے۔

آخری دوپچ حکمران (یوسف شاہ اور یعقوب شاہ) خاص طور پر قابل ذکر ہیں اول الذکر کا جبہ سفید اور جو زونی یعنی چاند کے نام سے بھی مشہور تھی کارومان کشمیر کی ادنیٰ تاریخ کا ایک ناقابل فراموش حصہ بن چکا ہے۔ وہ ایک معمولی گھرانے سے وابستہ تھی اس کا شوہر اس کے ساتھ بدسلوکی کرتا تھا یوسف شاہ اس کی خوبصورتی اور اس کے شیریں لغزوں سے کافی متاثر ہوا۔ اس نے اس کے خلاق کا انتظام کیا اور خود اس کے ساتھ شادی کر لی۔

جبہ خاتون ایک خدا داد شانہ تھی اس کے دلاواز لغزوں میں یوسف شاہ سے فرقت کے جذبات کا اظہار ملتا ہے جسے شہنشاہ اکبر نے نظر بند کر لیا تھا۔ ان نازک جذبات نعمات میں اگرچہ نہایت ذاتی کیفیت، بیان کی گئی ہے تاہم انہیں ابدی مقام حاصل ہے اپنے ایک گیت میں اس نے کہا ہے۔

دورافتادہ مگر گڑھوں میں بہا رہے
رنگ برنگے پھول دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں

آؤ ہم پہاڑی مگر غرور پر چلیں

پیاری رسم مدھر ہوا کرتی ہے

میرے محبوب میں تمہیں زیورات دھونگی

اور تمہارے ہاتھ ہندی سے رنگ دوں گی

میں خوشبو دار بوسوں سے تمہارے جسم پر پیاری مرہم لگاؤں گی

طلائی ساغز میں تمہیں شہر آب پیش کروں گی۔

تمہارے لئے میں غزالیوں میں پھول بچھا دوں گی

میرے پھولوں کے متوالے محبوب

جبہ خاتون کی زبان ایک عام دیہاتی کی زبان ہے۔ کشمیری پاکیزگی کا ایک کنواں ہے۔ اس کا اسلوب بیان نہایت صمد قدلانہ فن سے عاری اور خود نوشت سوانح حیات کے عکاس کا حامل ہے۔ وہ اپنے اندر نہایت جذبات کو نہایت صاف گوئی اور روانی کے ساتھ بیان کرتی ہے۔ اس کے گیت آؤ اور میرے شگوفوں کا کطف اٹھاؤ غزلوں سے مندرجہ ذیل گیت میں یوں لکھا ہے۔

اپنے گھر میں نظاروں سے چھپی میں ٹھہری رہی

ایک مرتبہ باہر نکلی تو میرا نام ہر زبان پر تھا

جن فقیروں کو مجھے دیکھنے کا تجسس تھا۔

میری دوکان پر مال کچھا کچھ بھر اٹھا

تمام دنیا اُسے دیکھنے کی منتھی تھی

میرے بیش قیمت عضو برہنہ ہوئے تو قیمتوں میں گراوٹ آئی

موت ہی دن مغرب میں ڈوب گیا۔

اس کی آواز ایک انسان دوست شخص کی آواز ہے جس میں گوشت بے خون ہے جسے فرقت کے غم کا شدید احساس ہے اور اپنے عشق کی تکمیل کی خواہش ہے۔

تمہارے بدن کا نور اندھیرے میں جگمگا تا ہے۔

میرے محبوب ایک مرتبہ آجاؤ

پانی لانے کے بہانے سے میں

اپنے گھر سے نکل کر اندھیرے میں نکل جاؤں گی

پانی کا گھڑاندی میں ہی چھوڑ کر میں تمہارے

آشیانے پر صدا دوں گی

دیر نہ کرو، میرے محبوب میرے پاس آؤ

حتیٰ کہ شمال سے طوفان آجائے اور جسم خاکی کو ریزہ ریزہ کر دے۔

جبہ خاتون کے نعمات شیلے کے ان لافانی مصرعوں کی علامت پیش کرتے ہیں: ہمارے سب سے شیریں وطنے ہیں جن میں ہمارے سب سے ادا جذبات کا بیان ہوتا ہے۔

یوسف شاہ نے مغلوں کی طاقت کی مزاحمت کرنے کی قطعی قوت ارادی نہیں دکھائی مگر اس کا بیٹا یعقوب

شاہ سخت مٹی کا بنا ہوا تھا وہ اکبر کا مقابلہ کرنا چاہتا تھا مگر کشمیر کی سلطنت اندرونی انتشار اور سازشوں کی وجہ سے غلج

ہو چکی تھی سنیوں پر یعقوب کے عتاب کے سبب کشمیریوں کا ایک بڑا طبقہ اس کے خلاف ہو چکا تھا اس طرح مذکورہ ۱۵۳۱ء کو

۱۸۸۶ء کے دن سرسنگ میں داخل ہونے میں بہت کم وقت پیش آئی۔

مغل

ابوالفضل آئین اکبری میں رقمطراز ہے: "ہر طرف بلند قامت پہاڑ سر اٹھائے ہوئے جنت سے فوگفتگو

ہیں۔ یہ ہر بت اس کے عجیبان ہیں۔ حالانکہ یہاں چھ یا سات عسکر ہیں تاہم ان سڑکوں پر ایسے ہی مقامات ہیں کہ اگر

وہاں کوئی غمزدہ خاتون لڑھک جلتے تو سب سے بیدار شخص بھی وہاں سے گزر نہیں سکتے۔ اسی باعث سابقہ

شہزادوں نے اس پر فخر پانے کی بابت نہیں سوچا۔ مغل سلیم نے انہیں اس خواہش سے باز رکھا، مگر یہ قدرتی قلعہ اکبر

کے ہاتھوں آسانی سے پر گریہ بات اس لئے نہیں ہوئی کہ اس کی طاقت زیادہ تھی بلکہ کشمیری عوام سلطانوں کی

ہد انتظامی اور بد عنوانی سے تنگ آچکے تھے۔ پہاڑی دروؤں کے تحفظ کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ محافظ خود بھی حملہ آوروں کے ساتھ شامل ہو گئے۔

اکبر سے پہلے بھی مغل کشمیر کو اپنی سلطنت کا ہی ایک حصہ تصور کرتے تھے۔ پہلے کامران نے ۱۵۳۱ء میں اسے اپنے قبضے میں رکھا بعد ازاں ۱۵۳۱ء سے ۱۵۵۱ء تک مرزا حیدر دغلت نے ہمایوں کے نام پر حکومت کی۔ اگرچہ مرزا کا تختہ پلٹ دیا گیا تاہم مغلوں نے کشمیر کے تحت پرچہ کو یکسر ترک نہیں کیا۔ کشمیر دربار کا ایک نیا ایک طاقتور دھڑا ہمیشہ مغلوں کے ساتھ منسلک رہا۔

۱۵۸۹ء میں کشمیر مغل سلطنت کا ایک صوبہ بن گیا۔ گورنر یا صوبیدار اس کا حکمران تھا۔ اگرچہ مغل کشمیر کو سیلابوں اور قحط سالی سے چھڑانہ سکے۔ تاہم انہوں نے یہاں پر عدل پسند انتظامیہ فراہم کیا۔ یہاں پر امن و امان رہا۔ کشمیر وسطی ایشیا کے ساتھ تجارت کا ایک اہم مرکز بن گیا۔ اکبر ذاتی طور پر تین مرتبہ کشمیر آیا پہلی مرتبہ ۱۵۸۹ء میں دوسری مرتبہ ۱۵۹۸ء میں تیسری مرتبہ ۱۶۰۱ء میں مل طرز انتظام اور اداروں کو ترمیم دی گئی کشمیر کی علیحدگی ختم ہو گئی۔ اس سے قبل جب کبھی وادی میں سیلاب یا قحط سالی ہوتی تو بھاری تعداد میں عوام لقمہ اجل بن گئے۔ مگر اب کلیدی سرزمین کے ساتھ رابطہ قائم تھا۔ دور استوں سے خوراک فوری طور پر درآمد کی جاسکتی تھی یہ دونوں راستے مغلوں نے سیدھیچال اور وادی جہلم میں تعمیر کئے تھے۔ مثال کے طور پر ۱۶۳۸ء کے بے پناہ سیلابوں کے دوران شہنشاہ شاہجہاں کے احکامات پر بھاری تعداد میں غلہ پنجاب سے لایا گیا اس کے عین برس ۸-۷-۱۵۶۹ء میں علی شاہ کے دور حکومت کے دوران وادی کے نصف آبادی لقمہ اجل بن گئی یا وادی ترک کر کے باہر چلی گئی۔ اس قبل دہمیش قحط سالی اور سیلابوں کے دوران بھی وادی اسی قسم کی بد نصیبی کی شکار رہی۔

مغلوں نے چند قابل ذکر سماجی اصلاحات بھی رائج کیں مثال کے طور پر جہاںگیر نے سنی اور دھرم کی بدعت کو ختم کر دیا۔ اس سلطنت کے چند علاقوں میں مسلمان ہی اس بدعت کے شکار تھے کہ وہ اپنی خواہش کو مردہ شوہروں کے ہمراہ زندہ درگور کر دیا کرتے تھے۔ ناپائیدہ دختران کو بھی بونعری میں ہی ہلاک کر دیا جاتا تھا۔

اکبر کا جانشین جہاںگیر کشمیر سے بے پناہ محبت کرنے لگا تھا۔ وہ چھ مرتبہ وادی کی سیر کو آیا۔ اپنے یادگار مضمین میں اس نے اس سرزمین کی خوبصورتی کو دل کھول کر خراج تحسین پیش کیا ہے اس نے لکھا کہ کشمیر بادی پیار کی ایک خوبصورت سرزمین ہے جہاں شگفتہ چھوٹوں کے شیرازے ہیں اور درویشوں کے لئے خدا داد وراثت بھی موجود ہے۔ حسین مرغوزوں اور رقص کرنے جھڑوں اور ندی نالوں کی خوبصورتی ناقابل بیان ہے موجودہ دور کے گھر گھر کے نظاروں کے بارے میں شہنشاہ قحط ازبے صفحہ قرطاس پر نہ نظر مالک قدرت نے خود تخلیق کے قلم سے پیدا کیا ہے۔

جہاںگیر کا بیٹا شاہجہاں (۱۶۲۷-۵۸ء) کی کشمیر کی خوبصورتی سے اسی قدر مسحور تھا۔ وہ بھی کئی مرتبہ وادی میں آیا جہاںگیر اور شاہجہاں کے عہد میں ہی معروف زمانہ مغل باغات کی تعمیر یہاں مغل میں لائی گئی ان میں شایارہ نشاط، اجھیل جیشہ، شہ ۱۶۱۵ء، رومی شاہ ۱۶۱۸ء، ان تمام باغات زرخیز و خوبصورتی اور دل آویزی کو حارحانہ رنگ دے۔

امن و امان اور استحکام کے علاوہ جہاںگیر اور شاہجہاں نے وادی میں روٹنی اور خوشیوں کے عنام بحال کئے جو مقامی سلطنت کے آخری دنوں میں معقود ہو چکے تھے۔ لالہ ورخ میں شمس مورق طراز ہے۔

تمام ترجمت اور روشنی

دن کے نظارے اور رات کی خوراک

یہ بات نور جہاں اور جہاںگیر کی روسا اور گلابوں کے جشن پر صدارتی ہے اور وادی میں اس وقت سماجی ماحول اس سے عیاں ہوتا ہے۔

اورنگ زیب نے کشمیر پر نہایت خوش اسلوبی سے حکومت کی مگر اس کا دینی سخت گیر مزاج کشمیریوں کو راس نہ آیا۔ وہ صرف ایک مرتبہ ۱۶۶۵ء کے دوران وادی میں آیا۔ ایک فرانسیسی طبیب فرنیٹز فرینچ جو اورنگ زیب کے شاہی قافلے میں شامل تھا قحط ازبے کشمیری عقل و دانش میں کافی ممتاز ہیں اور ہندوستانیوں سے زیادہ ذہین ہیں۔ شاعر اور طبیعات میں وہ اہل فارس سے کم نہیں۔ وہ نہایت سرگرم اور عنایتی ہیں مگر ان کے بارے میں ایک خاص بات یہ ہے جو تجارت کے فروغ کا سبب ہے کہ وہ نہایت بیش قیمت شال تیار کرتے ہیں۔ اورنگ زیب کے ۴۹ سالہ طویل عہد حکومت کے دوران کشمیر میں ۳۴ گورنر ہونے عام طور پر انہوں نے کاروبار حکومت اچھی طرح چلایا مگر ان میں سے ایک گورنر افتخار خان (۱۷۰۵-۱۶۷۱ء) نے برہمنوں کو مستوب کیا اور انہوں نے زمین گورتنہاں کے پاس جا کر شکایت کی۔ ہمیں بھاری جبر و استبداد کا شکار ہونا پڑا ہے۔ ہمارے مفدک دھاگے (زنتار یا جھو) زبردستی اُنارے جاتے ہیں، گائیں ہلاک کی جاتی ہیں ایک دن میں سو امن جھو اُنارے دیئے جاتے ہیں۔ گورنر نے انہیں تسلی دی اور کہا، "جاؤ اور اپنے حاکم سے جا کر کہو کہ اگر وہ گورو نیخ بہادر کا مذہب تبدیل کر سکیں تو وہ تمام لوگ اسلام قبول کر لیں گے۔ اس سے شاہی دربار کو فضا آگیا اور نتیجے کے طور پر گورو نیخ بہادر شہید ہو گئے۔ اس سے سکھ اعتقاد اور تاریخ کو ایک نئی سمت عطا ہوئی۔

اورنگ زیب کی موت کے بعد مغل سلطنت لڑکھڑانے لگی۔ کشمیر پر مرکزی غلبہ ختم ہو گیا۔ وادی ایک مرتبہ پھر کشت و خون، تشدد اور سازشوں کی آماجگاہ بن گئی شاہی دربار کی طرف سے مامور کئے گئے گورنر شتا و نادر بن کشمیر آئے۔ دہلی میں اقتدار کی جنگ کے باعث وہ دارالحکومت میں ٹھہرنا ہی پسند کرتے۔ وہ ڈپٹی گورنروں کے ذریعے حکومت کرتے جو حقیقی طور پر کسی کے تئیں ذمے دار نہیں تھے۔

۱۷۴۷-۴۸ء کے تباہ کن سیلابوں اور خوفناک قحط سے تو جیسے شیرازہ ہی کھیر گیا کشمیر کی تین چوتھائی آبادی نیست و نابود ہو گئی۔ بھاری تعداد میں لوگوں نے ہندوستان کی راہ لی۔ ان میں سے کافی لوگ راستے میں تھکاوٹ کی وجہ سے لقمہ اجل ہو گئے مغل سلطنت کے بھی وہ دن نہیں رہے تھے جب وادی میں بھاری مقدار میں غلہ پیدا کیا جاسکتا مغل سلطنت کی ہر شے تباہ ہو چکی تھی۔ محض خطاب اور روایتی مراعات ہی باقی رہ گئی تھیں۔ مثال کے طور پر شاہ عالم کی طاقت اور مرتبے کے بارے میں اس وقت مقبول کہاوت تھی۔

بادشاہ شاہ مسلم از دہلی تا پالم

ان محدود و ش حالات میں دو موثر لیڈروں نے احمد شاہ ابدالی کو دعوت دی کہ وہ کثیر ہر حملہ کرے اور اپنی حکومت قائم کرے۔ اس نے موقع قیمت جاکر ۱۷۵۳ء میں عبدالنخان ایک عسکری کے تحت ایک مضبوط فوج روانہ کی۔ دریں اثنا آخری نعل گورنر عبدالقائم خان کو مقامی بناوت کے زیر اثر بٹایا جا چکا تھا۔ افغان قبیلوں نے قاسم کو شکست دے دی اور کشمیر میں افغان حکومت کا قیام کیا۔

افغان

جن روسا نے اکبر کو کشمیر پر قبضہ کرنے کی دعوت دی تھی ان کا اندازہ کافی اچھا تھا۔ ۱۲ برس تک کشمیر میں امن و امان رہا۔ اور اب منحل سلطنت کا شیرازہ بکھرنے کے بعد ہی کشمیر دوبارہ بدلتوالی کے نزع میں آیا۔ مگر جن لوگوں نے احمد شاہ ابدالی کو بلایا تھا انہیں اس کا قطعی احساس نہیں تھا کہ وہ ایک درندہ صفت طبقے کو بارگاہ میں دعوت دے رہے ہیں۔ بدقسمت عوام کی حالت آسمان سے گرا کچھور پرانے کے مصداق تھی۔ افغان حکومت کے ۶ برسوں کے دوران انہیں ناقابل بیان مصائب کا شکار ہونا پڑا۔ اس بارے میں خوامی جذبات کا اظہار اس شعر میں کیا گیا ہے: "میں نے باجناں سے ہر مچا کہ باغ کی تباہی کا کیا سبب ہے۔ ایک گہری سانس لے کر میں نے جواب دیا کہ یہ سب افغانوں کا کیا دھرا ہے۔"

ابدالی کی طرف سے سامور سٹیل ہی سربراہ عبداللہ خان ملک کا کھنے مقامی تاجروں سے ایک کروڑ روپے انصاف لے کر اس نے ان تمام کشمیریوں کو قتل کر دیا جنہیں کہ وہ امیر سمجھتا تھا۔ انہیں دھکی دی اور کہا کہ یا تو اپنی ساری دولت میرے حوالے کر دو یا موت کا سامن کرو۔ جبر و استبداد اس قدر شدید تھا کہ چند تاجروں نے جھیل ڈل میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی۔ افغان فوجوں نے عام آدمیوں کے گھر وں کو تہس نہس کر دیا۔ اور جو بھی ان کے ہاتھ لگا اُسے ٹوٹا لیا کشمیریوں کے لئے اس قدر رُسرے دن کبھی نہیں آئے تھے۔

پانچ ماہ تک ٹوٹ مار قتل و غارت اور جبر و استبداد کرنے کے بعد حکم کشمیر کو عبداللہ خان کابلی کے حوالے کر کے واپس کابل چلا گیا۔ عکاس نے ایک ہندو کھتری جہم باز شکہ جیون مل کو کابلی کا مشیر علی حقہ رکھا۔ ایک مقامی رئیس عبدالحسن بانڈے نے کشمیر کو افغانوں کی جاہر حکومت سے نجات دلانا چاہا۔ اس نے سکھ جیون مل سے ظلیق کی کوہ کا بی کو ختم کر دے اور آندلا اور خردختا رہنے کا اعلان کر دے۔ بانڈے اور سکھ جیون مل کے مشترکہ منصوبے کے مطابق کابلی کو قتل کر دیا گیا اور سکھ جیون مل آخر خودکشی کر گیا۔ اس نے بانڈے کو اپنا وزیر مقرر کر دیا۔ سامور کبیرہ دونوں صحیح طور پر کام کرتے رہے۔ مختصر مدت کے لئے کشمیریوں کو ہمدرد اور عادل انتظام حاصل

ان دونوں کو شکست ہوئی۔ دوسری مرتبہ متعدد افغانوں کو اسیر بنا کر سرنگر کے بازاروں میں گھمایا گیا اور کشمیری عوام کے غم غیظ نے آواز سے کہے اور ان پر ہتھوڑا۔

سکھ جیون مل کو کشمیر پر بارودک ٹوک تسلط حاصل ہو گیا۔ اس نے نعل شہنشاہ کے تئیں اپنی وفاداری کا اظہار کیا جس نے اُسے راجہ کا خطاب دیا۔ عوام خوشحال تھے۔ عکاسی خوشحالی میں قدرتی آفات نے خلل ڈال دیا۔ ۱۷۵۵ء کے دوران وادی میں زبردست قحط سالی ہوئی اور دو برس بعد وادی پر بڑی دلی نے حملہ کر دیا۔ عوام کو قحط سالی کے ایسے سنگین حالات کا سامنا کرنا پڑا کہ انہوں نے مزدہ نڈیوں کو پاتی میں اُبال کر کھانا شروع کر دیا۔

جب بڑو کشمیر کوئی نتیجہ حاصل نہ ہوا تو اس نے راجہ سکھ جیون مل اور اس کے وزیر علی عبدالحسن بانڈے کے درمیان خوشگوار تعلقات کو تباہ کر دیا اور ان حالات کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے ابدالی نے نوازالدین خاں ہارائی کی قیادت میں کشمیر کو فتح کیا۔ ۱۷۶۲ء میں روانہ کی۔ راجہ سکھ جیون مل کی فوج کے ایک بہت بھاری حصہ نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اُسے گرفتار کر لیا گیا اور لاہور میں عبداللی کے پاس بھیج دیا گیا جہاں اُسے ہاتھی کے پاؤں کے تلے کچل کر بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا۔

کشمیر میں افغان حکومت کے قیام کے بعد عوام کی مشکلات دو گنا ہو گئیں۔ کشمیریوں کی بد نفسی یہ تھی کہ ان پر دو چھپھورے افراد لال خال شکاک اور فقیر اللہ نے حکومت کی۔ یہ دونوں شخص از حد ظالم تھے۔ اول الذکر کو پاگل پن اور عفتے کے دورے پڑتے تھے اور فقط شبہ کی بنا پر وہ پورے کنبے کا قتل کروا دیتا تھا۔ طر پر وہ ہندوؤں کے ساتھ سختی سے پیش آتا۔ فقیر اللہ بھی اسی قدر غیر انسانی تھا۔ اس نے سینکڑوں کی تعداد میں کشمیری بچوں کو قحط اس لئے موت کے گھاٹ اترا دیا کیونکہ اُسے شک تھا کہ اس کے والد کو ایک کشمیری بچہ تھوڑے کیسلاش دھر کر ایما پر ہلاک کیا گیا تھا۔ وہ اپنے وقت کا ایک رئیس تھا۔

ان کا قابل ذکر گورنر امیر خاں جواں شیر تھا۔ اس نے کاروبار حکومت اپنے وزیر اعلیٰ کے حوالے کر دی اور خود کیف و مستی میں ڈوب گیا۔ ایک خوبصورت باغی لڑکی کے ساتھ اُسے عشق ہو گیا اور اس نے اس لڑکی سے شادی کر لی۔ وہ زیادہ تر وقت اسی لڑکی کے ساتھ اُس آرام دہ گھر میں گزارا کرتا جو اس نے جھیل ڈل کے وسط میں ایک مصنوعی جزیرہ میں تعمیر کیا تھا۔ اس لڑکی کے رشتے داروں نے گورنر کے ساتھ اس کے تعلقات کا خوب انتہا کیا۔ وہ ناقابل معافی بے راہ روی کے مرتکب ہوئے اور اپنے ملاؤں کے لئے نفیراتی سامان حاصل کرنے کے لئے انہوں نے ۷۰۰ کے قریب منسل باغات تباہ کر دیے۔ بہر حال ایک بات امیر خاں کے حق میں جانی ہے کہ اس نے سرنگر میں اولین پل میر اکدل تعمیر کروایا۔ اس نے موجودہ ریلوے سیکرٹریٹ شہر سرنگر کی تعمیر بھی عمل میں لائی۔ جھیل ڈل اور آنچار جھیل کے درمیان رابطہ قائم کرنے کے لئے ایک نہر بھی اس نے تعمیر کروائی۔

کابل کے حکمران تیمورشاہ کی مصروفیات اور انھوں نے فائدہ اُٹھاتے ہوئے امیر خاں نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ ایک بنیاد پرست خلیفہ ہونے کی وجہ سے اس نے سنیوں کو مستوجب کرنا شروع کر دیا۔ مولوی پڑوہ

کی بنیاد پر بہت سارے متنی روساء کو گرفتار کر کے پھانسی دے دی گئی۔ جب اس امر کی شکایات تیمور شاہ تک پہنچیں تو اس نے حاجی کریم دادخان کی کمان میں ایک مضبوط سپاہ ارسال کی اور دوسری کوشش سے بعد اسے خان کی فوجوں کو شکست حاصل ہوئی اس کی اہم وجہ یہ تھی کہ اس کی فوجوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

آئندہ دو گورنروں۔ حاجی کریم دادخان اور اسدخان کے عہد حکومت میں کشمیر میں بدعنوانیوں کا دور زوال کی مزید بڑی پستیوں تک پہنچ گیا۔ ۱۷۸۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایک افسر جارج فارٹر کشمیر آیا۔ کریم دادخان کی طرف سے روارکھ مظالم کا ذکر کرتے ہوئے اس نے بیان کیا ہے کہ کس طرح چھوٹے چھوٹے جرائم کی پاداش میں مینہ جرموں کو یکجا باندھ کر دریا میں پھینک دیا جاتا۔ غور توں کی کس طرح جنسی بے حرمتی کی جاتی۔ فارٹر نے اسدخان کے وقت مروجہ ایک داستان کا ذکر کیا ہے۔ اُس کی آنکھوں پر ایک جلد کو بٹانے میں بہت سارے جراح دھوکے کھا گئے اس معاملے میں گورنر نے صریح سے مثبت نتائج دیکھنا چاہتا تھا۔ اُس نے آخری مرتبہ ایک جراح کو طلب کیا اور کہا کہ اگر ایک محدود عرصے کے دوران اس کی آنکھوں کا نقص دور نہ ہوا تو سب عام اس کے ٹکڑے کر دیئے جائیں گے۔ اس نے اس قصہ کے لئے بہت ہی کم دن دیے یہ شخص گورنر کا علاج کرنے میں ناکام رہا اور اللہ تعالیٰ نے اپنی دھمکی کو عملی صورت دے دی۔

یہ بھی اتفاق کی بات ہے کہ فارٹر کی رائے کشمیریوں کے بابت اچھی نہ تھی۔ ابتدا میں تو اُسے ان کی زبوں حالی کے ساتھ ہمدردی تھی مگر بعد میں اس نے ان کی بابت لکھا: تجربات نے مجھے اس نتیجے پر پہنچایا ہے کہ افراد کی کسی بھی تنظیم کو میں نے بدعت کے اصولوں استدر مرتع نہیں دیکھا جتنے کشمیری لوگ تھے۔ البتہ افضل نے بھی کشمیریوں کی بابت اسی انداز میں بات کی تھی۔ اس ملک کی تباہی کا سبب یہاں کے غلام ہیں۔

اقتدار سے شرا اور اسدخان نے ۱۷۸۷ء میں خود مختاری کا اعلان کر دیا اور نادر شاہ دوم کا لقب اپنایا کشمیر پر اپنا تسلط بحال کرنے کے لئے تیمور شاہ نے دو فوجی مہمات روانہ کیں۔ جب گورنر مرادخان نے عہدہ سنبھالا تو کشمیر ایک ویران اور خراب معلوم ہوا تھا۔ قحط سالی کے شکار اور معیوم صورت گئے پینے افراد ہی اس وادی کے اُن دیہات اور قصبوں میں باقی بچے تھے جو کسی وقت مالدار اور خوشحال تھے کشمیری روساء اور حاکموں کی سازشوں کی وجہ سے وہ ان کے خلاف ہو گیا۔ اس نے سنگد لاندہ روش اختیار کی جبر و استبداد اور ظلم و ستم کا پورا اٹا افغان طرز عمل واپس آ گیا۔ اور عوام کو صوبہ میں برداشت کرنا پڑا۔

ایک اور گورنر عطا اللہ خان غور بھورت کشمیری غور توں کے لئے اپنی بے پناہ ہوس کے لئے بدنام ہو چکا تھا۔ اس بارے میں ہندو والدین استدر پریشان ہوئے کہ انہوں نے اپنی بیٹیوں کی خوبصورتی کو مسخ کر دیا تاکہ وہ گورنر کے خوار یوں کی لنگاہ بد سے بچ سکیں۔

جبار خان آخری افغان گورنر تھا اس نے بھی ہندوؤں کو بے رحمی کے ساتھ اذیتیں پہنچا دیں ایک کشمیری پنڈت رئیس بیرمل دھر سے جب کشمیریوں کو دی جانے والی اذیتیں اور صوبہ میں برداشت نہ ہو سکیں تو اس نے ہمارا رنجیت سنگھ تک امداد کے لئے رسائی کی اور اُسے جبار خان کی فوجی طاقت اور اس کی تعیناتی کے بارے میں بیش قیمت اطلاعات فراہم کیں۔ اس سے قبل رنجیت سنگھ نے کشمیر کے لئے ۱۸۱۲ء اور ۱۸۱۳ء کے دوران دو بار ناکام کوشش کی تھی لیکن اس مرتبہ کامیابی نے رنجیت سنگھ کے قدم چھوئے مہر دیوان چند کی کمان میں سکھ سپاہ نے ۱۵ جولائی ۱۸۱۹ء کو شوپیاں کے مقام پر جبار خان کو شکست دی اور اگلے روز فاتحانہ انداز میں دارالحکومت تک پیش قدمی کی

اس طرح کشمیر میں ۶۷ سالہ شب ظلمت ختم ہو گئی کشمیر میں افغان حکومت کے ایسے کاراز عمارت گرانہ فطرت میں مضمر ہے۔ وادی کے ساتھ ایک صوبے کی صورت میں نہیں بلکہ وسیع و عریض سلطنت کے ایک حصے کے طور پر سوچ کر لیا گیا۔ اسے ایسا علاقہ تصور کیا گیا جہاں سے دوسرے علاقوں میں فوجی مہمات کے لئے مالی ذرائع جٹانے کے لئے بھاری رقوم جمع کی گئیں۔ جابرانہ ڈھنگ سے روپیوں کی دھولی اور جبر و استبداد اور تشدد افغان طرز سلوک کا ایک حصہ رہا ہے۔ اور وہ مسلسل اس کوشش میں رہے کہ عوام کی قوت مزاحمت کو ختم کر دیا جائے۔ کشمیری اس قدر دبے کچلے تھے کہ اپنے دور حکومت کے آخری دور میں افغان صرف ۳۰۰۰ سپاہیوں کی مدد سے تمام وادی پر تسلط جمائے بیٹھے تھے جبکہ ابتدائی دور میں انہیں کم از کم ۲۰۰۰ سپاہی درکار تھے۔ مگر بہت زیادہ لوٹ کھسوٹ کی وجہ سے کشمیر کی اقتصادی حالت تباہ ہو گئی انہوں نے اس مرنے کو ہی مار ڈالا تھا جو سونے کا انڈہ دیتی تھی۔

سکھ

ہمارا راجہ رنجیت سنگھ تسخیر کشمیر پر اس قدر خوش تھا کہ تین راتوں تک اس نے لاہور اور امرتسر میں چڑھائی کرنے کا حکم جاری کیا۔ اُسے کشمیر کا دورہ کرنے کی بھاری خواہش تھی ایک خط میں وہ رقمطراز ہے: ہاشم میں اپنی زندگی میں صرف ایک مرتبہ کشمیر کی سرسبز سکوں اور یہاں کے باغوں میں گھوم کر بادام کے شگوفوں کی مہک کے درمیان سر پہنچاں پر بیٹھ سکوں۔ مگر اس کے تعصیب میں یہ نہیں تھا۔ اگر وہ کشمیر پر فتح حاصل کرنے کے بعد اس نے ۱۷ برس تک حکومت کی مگر رنجیت سنگھ ایک مرتبہ بھی کشمیر کا دورہ نہیں کر سکا کشمیر میں سکھوں کی حکومت صرف ۲۷ برس (۱۸۱۹-۱۸۴۶ء) تک جاری رہی مگر اس دوران وہاں دس گورنر آئے مہر دیوان چند پہلا گورنر تھا۔ وہ مختصر عرصے تک یہاں فائز رہا۔ موتی رام دوسرا گورنر تھا۔ وہ دوسرے گورنر باہو شریف اور مہاراجا انسان تھا۔ اس نے کسی حد تک عوام کے اعتماد کو بحال کیا۔ گلوکشی کی ممانعت اور جرمیوں کو سزا موت دینے کے لئے وہ کافی مشہور رہا ہے مگر وہ آرام طلب تھا۔ اس کے دور میں لوٹ کھسوٹ اور رشوت ستانی کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ اس کے ایک ماتحت نے ۳۰ لاکھ روپے جمع کئے اور وہ اس رقم کو خرد برد کر گیا۔

تیسرا گورنر دیوان کرپارام کافی مقبول تھا۔ اس نے بہتری کے بہت سے کام کئے جن میں رام باغ باغات کو

سنوارنے کا کام شامل ہے۔ وہ شہنشاہ جہانگیر کے انداز میں ایک رنگارنگ شخصیت کا مالک تھا۔ قصص موسیقی اور قدرتی مناظر کا دلدادہ تھا۔ وہ کثیر تعداد میں لاشعری تھا۔ وہ اپنا زیادہ تر وقت جمیل ڈول میں ایک کشتی میں گزارا کرتا تھا۔ اس کی کشتی کو موسیقار خود تھیں اور قاصد رواں دواں رکھتے۔ اُسے لوگ کپاٹھور میں اور کشتی کے چیلوں کی آواز انہوں سے بکرتے تھے۔ مسگر وہ اپنے فرائض سے بے بہرہ نہیں تھا۔ وہ لاہور و زربار کے لئے مالانہ ۳۲ لاکھ روپے کا مالیہ جمع کر لیتا۔ لاہور دربار میں رواں دواں شول کے طفیل وزیراعلیٰ راجہ دھیان سنگھ نے جہانگیر رنجیت سنگھ سے حکم حاصل کر کے اُسے واپس بلانے کا انتظام کر لیا۔

اس کے بعد شہزادہ شیر سنگھ کثیر کا گورنر مامور ہوا۔ وہ اپنا وقت شراب نوشی میں صرف کیا کرتا تھا اور یہاں تک کہ ۱۸۳۲ء کی شدید قحط سالی کے دوران بھی وہ اپنے فرائض سے بے بہرہ رہا۔ ۱۸۳۳ء میں کرنل مہان سنگھ جو کرنل صاحب کے نام سے مشہور تھا گورنر بنکر کثیر آیا اس نے دیکھا کہ لوگ بھاری مصیبت میں مبتلا ہیں۔ اس نے فوری طور پر پنجاب سے غذائی اجناس درآمد کئے اور ٹیکسوں میں راحت دی۔ اس نے وادی پر خوش اسلوبی اور انصاف پسندی سے حکومت کی تو سکھ فوجی غیر قانونی طور پر جبری وصولیوں کے مرتکب تھے وہ گورنر کے ان اعمال سے کافی نالاں تھے۔ ۱۸۳۹ء میں جہانگیر رنجیت سنگھ کے انتقال کے بعد اس کی تمام سلطنت میں عدم استحکام اور بے راہ روی پھیل گئی۔ ۱۲ اپریل ۱۸۴۱ء کو سکھ فوجوں نے بغاوت کر کے گورنر کا قتل کر دیا اس کے بعد جو گورنر آئے وہ برائے نام تھے۔ آخری گورنر امام الدین کو بعد نامہ امر سرکار سے کثیر کی ملکیت راجہ گلاب سنگھ کو سپرد کرنے کے لئے مجبور کیا گیا۔

کرپارام کے مختصر عہد گورنری کے علاوہ کثیر میں سکھ حکومت انصاف پسند نہیں تھی۔ اگرچہ ہندوؤں کو قدرے بہتر سلوک حاصل ہوا مسلمانوں کو بدسلوکی کا شکار ہونا پڑا ان کی مسجدوں پر قتل چڑھا دیا گیا۔ یہاں تک کہ جامع مسجد میں منار عام پر باندی لگا دی گئی سکھ عہد کی ابتدا میں ایک سکھ کمانڈر پھول سنگھ نے شہر شہزادہ ہمدان مسر کو اڑانے کے لئے قہر ڈالی تھی۔ اس کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ اس کی تیسرا ایک ہندو مندر پر لگی تھی ہے مگر یہ بل دھوکہ دہی مسجد کو چالیا گیا۔ ملاؤں کو اذان دینے کی ممانعت تھی مگر ایک طبقے کے طور پر کثیر یوں سے نفرت روا رکھی جاتی۔ اگر کوئی سکھ ہندو کو ہلاک کر دیتا تو ماما و منہ چار روپے تھا۔ اور اگر کوئی مسلمان مارا جاتا تو یہی مواضد دو روپے تھا۔

ہنگامہ بندی نے بجا کہا ہے "سکھ نہ تو خوش تھے اور نہ ہی ظالم مگر وہ کرخت آقا ضرور تھے" ان کا ہمیشہ زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنا تھا اور انہیں اس بات کی قطعی پروا نہیں تھی کہ اس کے طویل المدتی کیا اثرات ہو سکتے ہیں۔ جب سکھ حکومت کا آغاز ہوا تو وادی سے وصول کی جانے والی مال کی سالانہ رقم ۲۶ لاکھ روپے تھی جو کہ ان کی حکومت کے آخری برس میں کم ہو کر ۱۰ لاکھ روپے رہ گئی۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ سکھ حکمرانوں کی تنگ نظر طریقہ عمل کی وجہ سے کثیر کی اقتصادیات میں کس قدر کمزوری آچکی تھی۔

مور کرائفٹ نے لکھا "سکھ حکومت نے کثیر یوں پر کم تر ٹیکس عائد کئے اور اس کے اندرونی کی طرف سے کثیر جبری وصولیوں غلام و تنم سے شکار رہے۔ ان بے تنخواہ اندرونی جنہیں سکھ فوجیوں نے گرفتار کر لیا تھا کی حالت بیان کرتے ہوئے مور کرائفٹ نے کہا "ان کے بازوؤں کو باندھ کر انہیں سڑکوں پر بار کا گیا اور رات کے وقت ان کے خزانہ کو روکنے کے لئے ان کی ٹانگوں پر بھی رسیاں باندھ دی جاتیں دگنے نے وادی کے مشرقی حصے میں متعدد تباہ شدہ گاؤں دیکھے۔ بہت سارے گھروں کے باسی جا چکے تھے اور بے گھر ویران پڑے تھے۔ پھل پک کر درختوں سے گر رہے تھے اور انہیں اٹھانے والا کوئی نہیں تھا۔ پھلوں کے باغات میں خزاواں تھی ان میں ریشتے اور جنگلی نیل کی کثرت بھی تھی۔"

جہوں کی تاریخ اور ڈوگروں کا عروج

ڈوگرہ خاندان کے باقی گلاب سنگھ میں غیر معمولی طور پر خدا داد صلاحیتیں موجود تھیں ۱۷۹۳ء میں وہ اس خاندان میں پیدا ہوا جس کی شاخ جہوں کے حکمران راجہ رنجیت دیو سے منسلک تھی۔ رنجیت دیو نے ۱۷۴۲ء ۱۸۰۰ء تک حکومت کی۔

روایت ہے کہ جہوں کی بنیاد باہو لوچن کے بھائی جہا میو لوچن نے ۳۰۰ برس قبل ڈالی باہو لوچن نے دریائے توی کے کنارے ایک قلعے کی تعمیر عمل میں لائی تھی۔ اکنھور کے نزدیک حالہ لھدائی سے بہت چلتا ہے۔ جہوں اس علاقے کا مقدر رہا ہے جو ہڑپا کی تہذیب سے وابستہ تھا۔ مور یہ کشان اور گپتا زمانے کے کھنڈرات بھی ملے ہیں۔ اس کا زمانہ قدیم اور پرانی قدریں رفتہ رفتہ سامنے آرہی ہیں۔ بہر حال فقیر ایک کہ جہوں کے بارے میں ہیں ۹۰۰ عیسوی کے دوران علم ہوتا ہے۔ تیمور کے سفر ناموں میں ہیں ۹۹-۱۳۹۸ عیسوی کے دوران جہوں پر حملہ کیا۔ بابت معلوم ہوتا ہے منسل سلطنت کے خاتمے کے بعد رنجیت دیو نے جلد ہی بائیس ڈوگرہ سرداروں کو اپنے تسلط میں لے لیا اس کے عہد حکومت میں ڈوگرہ کا علاقہ خوشحال تھا اور جہوں اپنی شان و شوکت کے باوجود ۶۰۰۰ روپے پر تھا۔ یہ قصبہ تجارت کا ایک اہم مرکز بن گیا۔ جو گلی جس نے اس دور میں جہوں کا سفر کیا تھا لکھتا ہے "جہوں ہندوستان کا اہم ترین قصبوں میں سے ایک ہے۔"

ڈوگرہ خاندان کے آخری مرحلے میں ڈوگرہ بڑھتے ہوئے سکھ اقتدار کے دائرے میں آ گیا جہوں پر سکھ سپاہ نے حملہ کیا اور جہوں کے دفاع کے لئے بیگٹ کی لڑائی لڑی جہاں ۱۶ سالہ گلاب سنگھ نے امتیازی مقام حاصل کیا۔

مکریگ ہسبند کثیر میں برطانوی پولیٹیکل ایجنٹ تھا۔ اس نے کثیر اور ہمالیہ کے دوسرے علاقوں کے علاوہ وسطی ایشیا اور چین کے وسیع علاقوں کا دورہ کیا۔

I مور کرائفٹ برطانوی لٹٹ انڈیا کمپنی میں جرنات کا ڈاکٹر تھا اس نے اُس سے مندرجہ ذیل تاریخ کثیر اور دیگر علاقوں کا دورہ کیا۔

II رئیس کثیر کی دگتے جس کی طبیعت جو لوچ اور بائیں میں تھی ۱۸۳۵ء میں کثیر میں پڑھنے کے لئے آیا۔

کیا۔ جب گلاب سنگھ کی بہادری کے کارنامے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے علم میں آئے تو اس نے گلاب سنگھ کو اپنی ملازمت میں لے لیا۔ گلاب سنگھ کے دو بھائی دھیان سنگھ اور سچیت سنگھ کو بھی مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ملازم رکھا۔ رنجیت سنگھ کی مختلف فوجی نہات کے دوران گلاب سنگھ نے بے مثال ہنر، جرات، غرور اور تنظیمی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ خاص طور پر ملتان اور جان پور کے محاصرے اور ۱۸۱۹ء میں یوسف زئی قبیلوں کو مطیع کر کے رنجیت سنگھ نے پشاور پر قبضہ کر لیا۔ گلاب سنگھ کی خدمات اور سکھ اور افغان سلطنتوں کے درمیان ایک طاقت فوجی طاقت قائم کرنے کی فوجی حکمت عملی کے تحت رنجیت سنگھ نے جموں سمیت متعدد جگہ پر گلاب سنگھ کو عطا کیا۔ اور اسے اپنی فوج منظم کرنے کی اجازت بھی دے دی۔

رنجیت سنگھ نے مالیات کی وصولی کے لئے منصوبے بنانے کا پرانا انداز فکر اپنایا اس طرز عمل اور مہاراجہ کے خطاب نے گلاب سنگھ کو اس قابل بنادیا کہ وہ ریاستی، کشتواڑ راجپوری اور چینی جیسے چھوٹے راجوں کو اپنے سرکرم تسلط میں لے لے ۱۸۳۱ء میں جس نے جیکوٹ گلاب سنگھ کے علاقوں کا دورہ کیا لکھتا ہے: "گلاب سنگھ دور میں رنجیت سنگھ کی نسبت اپنے گھر کا زیادہ مالک ہے۔"

لاہور دربار میں دھیان سنگھ اور سچیت سنگھ دو بھائیوں نے استیازی پوزیشن حاصل کر لی۔ اول الذکر وزیر اعلیٰ بن گیا اس طرح جموں خطے اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں دو گروہوں نے غالباً مذمتیہ حاصل کر لیا۔ جیم ڈوگرہ برادران کے اقتدار کے بارے میں دھیان میں برطانوی پولیٹیکل ایجنٹ نے لکھا: "میدلوں میں ان کے پاس زمین کے وسیع ٹکڑوں پر مشتمل علاقہ تھا۔ نمک کالوں پر اجارہ داری کے علاوہ کاشتکاری سے ذرائع اور تنج سے پشاور تک محصولیوں کی کے علاوہ تمام اہم قصبوں میں انہوں نے اپنے اہم آدمی تیناٹ کے تحت آدم و بیش حکومت کے ہر ایک شعبہ میں انہیں دخل حاصل تھا۔"

لداخ کی تاریخ اور ڈوگرہ راج میں ادغام

راج گلاب سنگھ کی اہم ترین فوجی کامیابی یہ تھی کہ لداخ اسکے راج میں شامل ہو گیا۔ ۱۸۳۳ء میں رنجیت سنگھ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی اشارتاً منظوری حاصل ہو جانے کے بعد گلاب سنگھ نے اپنے بہترین جرنیل زور اور سنگھ کو لداخ کے لئے روانہ کیا جو چین اور تبت کی سرحد پر فوجی لحاظ سے نہایت اہم علاقہ ہونے کے سبب وسطی ایشیا کے ساتھ اون کی تجارت پر مشرک کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس زمانے میں تبت کے عظیم لداؤں کی زیر سرکردگی لداخ ایک خود مختار سلطنت تھا۔

"ہندوستان کا چھوٹا تبت اور دنیا کی چھت" لداخ کا علاقہ ایک سرد ریگستان ہے۔ یہ دوڑ کے مشرق میں واقع ہے اور اس کی بلندی سطح سمندر سے ۲۴۴۰ سے ۵۴۰۰ میٹر ہے۔ آبادی بہت کم ہے لیکن مریخ کھومین میں آبادی کی گنجائش ۲۰ افراد سے گھر محل وقوع کے لحاظ سے اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

۱۸۵۴ء میں شاہجی اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ لداخ کے بارے میں یوں بیان کیا: "لداخ کا عام پہلو اس کا از حد بخر ہونا ہے۔ آنکھوں کو آدم زاد یا آبادی کا کوئی بھی نشان نہیں ملے گا۔ حتیٰ کہ کاشت رقبے کے بڑے بڑے قطعات بھی ویران علاقے میں چھوٹے چھوٹے دھبوں کی صورت میں موجود ہیں مگر نزدیک سے دیکھنے پر معلوم ہوگا کہ یہاں پر گھنٹی فصل والے بہت سارے ذرخیز قطعات ارضی موجود ہیں۔ اس کے علاوہ خوبصورت مٹھوں سے روزانہ عبادت اور حمد و ثنا کی انسانی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔"

تاریخ کے اولین مراحل میں لداخ مغربی تبت، یلکستان اور کنگاگت کے سمیت وسیع علاقے کا ایک حصہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے راجوں کی صورت میں یہ علاقہ ڈھیلے طور پر منقسم تھا ان میں سے چند راجا تو اڑے کنشک کے زیر اثر آئے تھے۔ یہ تفصیلات ایک چینی زائر ہوئی چاؤ نے فراہم کی ہیں جس نے ۷۲۷ء عیسوی کے دوران اس علاقے کا دورہ کیا اس کا دعویٰ ہے کہ بودھ مت ہندوستان سے لداخ پہنچا جہاں اس نے اپنا اثر قائم کر لیا۔ یہ ایسے وقت میں ہوا جب تبت نے بودھ مت اختیار نہیں کیا تھا۔ پہر کیف بعد از ان لا مالوگ تبت میں آئے اور عوام نے بودھ مت اختیار کر لیا اور جبکہ ہندوستان میں ہندو مت کی شدید اچھائے نو کی لہروں کے زیر اثر بودھ مت قریباً ختم ہو گیا مگر لداخ "تبت کی اس روحانی اور تمدنی سلطنت کے قبضے کے طور پر قائم رہا۔"

ایک علاقے کی حیثیت سے لداخ کا جنوب مغربی حصہ للٹا دیر (۹۱-۲۴ عیسوی) کے تسلط میں آ گیا۔ اور سمران۔ سان گام پونے مشرقی حصے پر قبضہ کر لیا۔ اول الذکر کشمیر کا عظیم حکمران تھا اور آخر الذکر تبت کا قیادہ حاکم۔ کشمیر کے حکمرانوں نے جلد ہی اس علاقے سے اپنا تسلط کھودیا جو بہ صورت کمزور ہی تھا اور مقامی لاپچن خاندان ۸۳۲ عیسوی میں ظہور پذیر ہوا۔ اکی خاندان کے ایک رکن رنجن مقامی تنازعات سے نجات حاصل کرنے کے لئے وادی کو بھاگ گیا اور وہاں حکمران بن گیا۔ اس نے اسلام قبول کر کے مسلم سلطنت کی بنیاد ڈالی۔

زین العابدین (۷۰-۱۲۲۰ عیسوی) اور مرزا حیدر دہلوی (۱۵۰-۱۵۳۱ عیسوی) اور بعد ازاں محل علیہ حکومت کے دوران لداخ راجاؤں نے خود پرکڑ و در صورت اقتدار اعلیٰ کو قبول کر لیا۔ مگر لداخ اوقات یہ محض نمائشی عمل تھا۔ مثال کے طور پر راجہ لداخ نے جب اورنگ زیب کو سالانہ خراج دینا تجربی طور پر تسلیم کر لیا تو برٹیز نے لکھا: "بہسی بھی شخص کو اس بات کا ذرا بھی شک نہیں تھا کہ جو بھی اورنگ زیب وادی کشمیر سے واپس لوٹے گا تو اس عہد نامے کو بالائے طاق رکھ دیا جائے گا اور لداخ اس عہد نامے کی شرائط کو پورا نہیں کرے گا۔" کیونکہ اس سے قبل لداخ راجہ اور شاہجہاں کے درمیان عہد نامے کا بھی یہی حشر ہوا تھا۔ مزید برآں عطا سنت کے یہ عرصے نہایت قلیل اور مختصر تھے اور عام طور پر لداخ خود مختار اور نیم خود مختار علاقوں کے زیر حکومت رہا۔

سنگے دشر (۱۶۱۷-۱۶۴۲) نہایت ممتاز حکمران تھا۔ اس نے نہنگار سمیت بہت سارے علاقوں کو اپنے تسلط میں لایا۔ اس نے متعدد دگرمیاؤں بشمول ہمیں گومیا تعمیر کرنے میں معاونت کی اس کے علاوہ اس نے اسی قدر شہر وادی کے نو منزلہ عمل کی تعمیر میں لائی۔

تاریخ میں بے مثال مسلسل پیش قدمی کر کے زور آور سنگھ نے زکند اور یلستان سمیت لداخ کو زیر کر لیا
۱۸۴۱ء میں نہایت دشوار اور جرات مندانہ ہم میں زور آور سنگھ نے تبت پر تسلط حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ ایم
پائیکر کے مطابق "زور آور سنگھ سے پشتر ہندوستان کی کسی بھی فوج نے تبت پر حملہ نہیں کیا تھا۔ کسی بھی ہندوستانی
حاکم نے اس کی تسخیر کی بابت نہیں سوچا تھا اور کسی بھی ایسے جرنیل جو گرم علاقوں میں رہنے کا عادی تھا نے تبت کی اس
جارجانہ آب و ہوا کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہیں کیا تو زور آور سنگھ نے روڈک، گارو اور نکلا کوٹ پر قبضہ کر لیا جس
سے وہ تبت سے گھر گیا اور ایک برفانی طوفان نے اُسے آدھ بچا اس نے بہادری کے ساتھ ۵۰۰۰ فٹ کی بلندی پر
جنگ کی مگر شکست اس کے نصیب میں لکھی تھی جہاں وہ مارا گیا۔ ایم پائیکر کے الفاظ میں "اس طرح ہندوستان
میں نمایاں کامیابیاں اور کامرانیوں حاصل کرنے والا سپاہی زور آور سنگھ مارا گیا۔ اس پر ہندوستان بے جا طور پر فخر کر سکتا ہے۔
یہ ایک معرکہ کہ لداخ اور یلستان کے پہاڑی سلسلوں میں سطح سمندر سے ۱۵۰۰۰ فٹ کی بلندی ہوا کا استعد و فغان ہے کہ
میدانوں میں رہنے والے لوگ مشکل زندہ رہ سکتے ہیں یہ شخص ایک یاد مر تبہ نہیں بلکہ چوتھے مرتبہ ان علاقوں سے گذر رہے تھے مہمات کے بعد اس
علاقے کو فتح کرنا تاریخ کا ایک بے مثال کا زمانہ ہے اس کی عظمت تاریخ کے صفحات میں ایک نیک جنگجو کی حیثیت میں زندہ و جاوید رہے گی۔
زور آور سنگھ کی میدراں جنگ میں موت کے بعد دیوان ہری چند کے تخت ایک اور سپاہی ارسال کی گئی۔
ڈوگروں، لداخیوں اور قبیلوں کے درمیان رسمی طور پر ایک مگر فوجی منہاجت نامہ قرار پایا۔ لداخ اور تبت کے درمیان
سرحد کا تعین کیا گیا اور لداخ گلاب سنگھ کے ساتھ شامل ہو گیا۔ چنانچہ گلاب سنگھ کی معز و فوجی مہمات کے
شعرے میں لداخ ڈوگرہ راج کا حصہ بن گیا اور بعد ازاں یہ جمہوریہ ہند کا ایک حصہ بن گیا۔ اگر یہ نہ ہوا ہوتا تو تبت
پر چین کا اقتدار اصلی لداخ تک وسعت اختیار کر گیا ہوتا۔ جز لداخ اور سنگھ ولادت سے ہی ایک فوجی ہمزاد تھا
وہ ایک ایسا نفیس سپاہی تھا جو ہندوستان کے انیسویں صدی کے دوران پیدا کیا۔ ۱۸۵۵-۱۸۶۱ء کے دوران جب
کشتواڑ، لہور، کرگل اور داس پور گونگ جھیل جوشیوں اور دوسرے دورافتادہ علاقوں کا دورہ کیا تو مجھے اس بات
پر حیرت ہوئی کہ اس دور میں سکھانہ زور آور سنگھ اور اس کے فوجی سپاہیوں نے کتنے دشوار موسم اور جزا فبائی حالات
کا مقابلہ کیا ہوگا اور استعد و فوجی انداز سے اور نیز رفتاری کے ساتھ نقل و حرکت کی ہوگی۔ بد قسمتی کی بات ہے
کہ اس فوجی مہم کی مکمل طور پر سائنس نہیں کی گئی ہے مجھے اس کی یادگار کے بارے میں کوئی مناسب میموئیل نہیں ملا۔
اس سے مجھے ماماڈیشو دیو شرامین بورڈ کی وساطت سے پہل کی تحریک حاصل ہوئی۔ اتفاق سے میں بورڈ کا چیرمین تھا۔
بورڈ کو دوستیاب رفوع سے میں نے ریاست کی کنڈرات میں تبدیل قلعے کی تحدید کا کام شروع کیا کیونکہ زور آور سنگھ
اس قلعے کے ساتھ وابستہ تھا میں نے اس قلعے کے ارد گرد ایک بڑا پارک تعمیر کرنے کا کام شروع کر دیا اس میموئیل
کپلکس کا نام زور آور سنگھ سے وابستہ ہے۔ میں نے یہ کام اس لئے کیا کہ جرنیل جی دیوی کا عقیدت مند تھا اور میں

نے ماما کے تمام عقیدت مندوں کی عزت افزائی کا فیصلہ کیا۔

۱۸۳۹ء میں بہار اچہ رنجیت سنگھ کے انتقال اور بعد ازاں انگریزوں اور سکھوں کے درمیان جنگوں میں
سکھوں کو آخر کار ۱۸۴۵ء میں سوہراؤں کے مقام پر ہوئی شکست کے سبب سکھ سلطنت کا عملی طور پر خاتمہ و نشان
مٹ گیا۔ اس سے قبل ۱۸۴۳ء کو درباری سازشوں اور اقتدار کے مختلف دھڑوں کے درمیان جھگڑا کے
نتیجے میں طاقتور ڈوگرہ وزیر دھیان سنگھ کا سفاکانہ قتل کیا گیا اس سے لاہور دربار میں ڈوگرہ اثر پوری طرح
زوال پذیر ہوا۔ یہی کوششیں کی گئیں کہ گلاب سنگھ کو اس کے علاقے سے محروم کر دیا جائے مگر اس سنگین بحران کے
پیش نظر ہی گلاب سنگھ ٹھنڈے دل سے حکمت عملی طے کرتا رہا اور اس نے اس مخالف صورتحال کو بھی موقع غنیمت
میں تبدیل کر دیا۔

جب انگریزوں اور سکھوں کے درمیان تنازعہ اپنے باہم مزاج پر پہنچا تو گلاب سنگھ نے چابکدستی کے
ساتھ اس صورت حال کو اپنے موافق بنالیا۔ سکھ اس کی امداد اس لئے چاہتے تھے کہ گلاب سنگھ ان کا اہم ترین راہنما
تھا اور انگریز نہیں چاہتے تھے کہ ڈوگرہ اور سکھ طاقت کا باہمی میلان ہو سکے۔ چنانچہ جنگ میں مصروف ان
دونوں دھڑوں کے درمیان گلاب سنگھ چابکدستی سے ڈٹا رہا۔ ایک طرف اس نے لاہور دربار کے ساتھ بھی
وفاداری جتاتے ہوئے رفاقت اور دوستی کی پیکیں بڑھائیں اور دوسری طرف خفیہ طور پر وہ برطانوی حکام کے
ساتھ رابطہ قائم کئے رہا۔ اور وہ تپ کا پتہ اسی وقت کھیلنا چاہتا تھا جب سکھ سپاہ کی طاقت ٹوٹ جائے۔

۱۸۳۹ء میں رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد شمال مغربی ہند کی آئین پر انگریز۔ ڈوگرہ اور سکھ کردار تھے جہاں
آئینہ چہ برس تک اقتدار کی کشمکش کا تناؤ بھرا کھیل کھلا گیا۔ برطانوی لوگ جدید سائنس و فطرت اور اپنے ذہنیاتی
مقاصد میں واضح اور دور اندیش تھے۔ ڈوگرہ لوگ سخت جہاں بواہوں، جاگیر دارانہ سوچ کے مالک تھے جو فوجی
طور پر پوری طرح سے لیس نہیں تھے۔ مگر ان کی خوش قسمتی یہ تھی کہ ان کا رہبر ایک پختہ ذہن تجربہ کار اور شہسوار
سکھ جنگجو اور بہادر تھے ان کے پاس ایک مضبوط فوج تھی مگر یہ فوج نظم و ضبط سے محروم تھی راہ روی کی شکار اور
دھڑوں میں منقسم تھی اس حاسد فوج کا کوئی رہبر بھی نہیں تھا۔ ان حالات میں برطانوی سپاہ کی طرف سے مکمل کامیابی
حاصل کر لینا حیرت کا باعث نہیں تھا گلاب سنگھ نے برطانیوں کے ساتھ سماعت اتحادی کے مرتبے کو تصفیعی طور پر تسلیم
کر لیا اور اسی عمل میں اس نے لاہور دربار کی مخالفت سے آزاد ایک شاہی ریاست حاصل کر لی سکھوں کو اپنے اقتدار
اور مرتبے سے ہاتھ دھونا پڑے جو کہ انہوں نے گذشتہ پچاس برسوں کے دوران قائم کیا تھا۔

ریاست ججوں و کشمیر کی شاہی ریاست

سکھوں کی شکست کے بعد دو علیحدہ عہد نامے کئے گئے۔ عہد نامہ لاہور پر ۹ مارچ ۱۸۴۶ء کو سکھوں
اور برطانوی حکومت کے درمیان دستخط ہوئے اس کی رو سے ان دونوں فریقوں کے درمیان معاملہ ہوا ایک

بہتے بعد راجہ گلاب سنگھ اور برطانوی حکومت کے درمیان ایک علیحدہ سمجھوتہ ہوا۔ یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ پہلے عہد نامے کی رو سے سکھوں نے چند علاقے برطانوی حکومت ہند کو دے دیئے۔ جو کہ بھوتے کی رو سے ڈیڑھ کروڑ روپیہ بطور تاوان جنگ ادا کرنے کے اصل نہ ہونے کی پاداش میں تھا۔ دوسرے عہد نامے کی رو سے برطانوی حکومت نے بمبئی، چنڈی گڑھ، کراکھاب سنگھ کی خود مختار اور دائمی ملکیت میں دے دیئے۔ کیونکہ اس نے برطانوی حکام کی طرف سے طلب تاوان جنگ کی کل رقم میں سے ۵ لاکھ روپے ادا کرنے کا وعدہ کیا تھا اس طرح ان عہد ناموں کی شرائط کی رو سے بینا ملک کی صورت میں کشمیر ڈوگریوں کے ہاتھ آ گیا۔

پہلی ہی نظر میں یہ بات عجیب اور حیران کن معلوم ہوتی ہے کہ انگریزوں نے وادی کشمیر پر قبضہ نہیں کیا۔ بلکہ ہسپندر قطراز سے اس بات پر لبہ اوقات حیرت کا اظہار کیا گیا ہے کہ یہ فیصلہ صورت زمین ہمارے ساتھ شامل ہوئی اور شخص ۱۰ لاکھ سٹرلنگ کے تین چوتھائی حصے کے عوض اسے ترک کر دیا گیا مگر انگریزوں کا ایک طویل المدتی اور خاص مقصد تھا یہ بات ایسٹ انڈیا کمپنی کی سیکرٹری کوئی گورنر جنرل لارڈ ڈلہاؤس نے ۱۸۴۶ء مارچ ۱۸ء کے مراسلے سے واضح ہو جاتی ہے۔

”میں عزت مآب کمپنی کی توجہ ہمارا راجہ گلاب سنگھ کے ساتھ کئے گئے خفیہ عہد نامے کی طرف مبذول کرنے کی گزارش کر رہا ہوں اس کے تحت پہاڑی اضلاع کا ایک راجا راوی سے سندھ تک بشمول کشمیر تشکیل دیا گیا ہے۔ ہمارا راجہ کو عہد نامہ لاہور کے تحت ریاست لاہور سے آزاد قرار دیا گیا ہے۔ یہ بات اس لئے بھی لازمی تھی کہ سکھ حکومت کے بحال ہونے سے قبل ہی اس حکومت کو کمزور بنا دیا جائے۔ میں نے اس منسلک شدہ علاقے کی تقسیم کی بابت غور کیا تو اس مقصد کو حاصل کرنے کیلئے اذہم ضروری ہے کہ انجمنیاتی رنجیت سنگھ کے فرزند اور سکھ شہزادے اور ڈوگریوں کے درمیان طاقت کو متوازن بنایا جائے۔ اور ان دونوں کا ایک ہی مفاد ہو کہ اسلم طاقت کی طرف سے دریائے سندھ کے اس طرف ایک آزاد ریاست کے قیام کی کوششوں کی مزاحمت کی جائے اور یہاں تک کہ پشاور پر قبضہ کرنے دیا جائے۔“

ڈوگر خاندان کی حکومت ایک سو برس سے قدرے زیادہ عرصے تک جاری رہی اس عرصے کے دوران چار ہمارا رہے ہوئے گلاب سنگھ (۵۰-۱۸۴۶ء) زبیر سنگھ (۸۵-۱۸۵۷ء) پرتاپ سنگھ (۱۹۲۵-۱۸۸۵ء) اور ہری سنگھ (۵۲-۱۹۲۵ء) مگر یہ خاندان ہمیشہ انگریز حکومت کے رحم و کرم پر تھا۔ اور گلاب سنگھ کو اس بابت کوئی شک و شبہ نہیں تھا اس نے گورنر جنرل کو لکھا: ”آپ کی عزت مآب حکومت کے تیس فرما برداری کے ثبوت کے لئے میں اپنی جان و مال کی قربانی دینے کو تیار ہوں۔ ہر وہ شخص جسے کمپنی کا وفادار رہنا ہے اُسے دل و جان سے رہنا ہوگا۔“

ڈوگرہ حکومت کی ابتدا کے وقت کشمیر میں ہالی کا شمار تھا۔ بیرن سکاٹ نے ان دنوں وادی کے

دورے کے بعد لکھا: میں نے بہت سارے ملک دیکھے ہیں مگر کسی بھی جگہ انسان اس قدر مایوس کن حالت میں نہیں جی رہے جتنے کشمیر میں رہے ہیں اس سے مصریوں کی حکومت کے دوران اسرائیلیوں کی حالت زار کی یاد واضح طور پر یاد آتی ہے جبکہ انہیں روزانہ شفقت کے دوران ان کے آقا انہیں بے رحمی کے ساتھ کوڑے مارتے تھے۔ آر۔ جی ٹیلر نے ۱۸۳۶ء دوران کشمیر کا دورہ کیا اس نے بھی اسی قدر مایوس کن تصویر پیش کی ہے۔ سرینگر شہر کی شکل و صورت نہایت زبوں حالی کی شکار ہے۔ گھر خستہ حال ہیں، بکلیوں میں نالیوں کی عدم موجودگی میں گندگی ہے۔ کسی بھی بازار میں مال کی کثرت نہیں۔ بیگانہ غریب پرستی اور بہت کم اجرت مل پاتی تھی۔ بہت سارے عوام کا گذارہ تھوڑے سے چاولوں پر ہوتا تھا۔ اکثر بیمار اور کھانسی طبیقوں کے لوگ در اندازہ ہو جاتے تھے اور گلوں کا کوٹھڑی کا کمرہاں کرتے تھے۔ چنانچہ گلاب سنگھ نے امن بحال کرنے کے لئے اکثر غیر انسانی اور سخت اقدامات کا سہارا لیا۔ رشوت ستانی زندگی کا ایک جزو لاینفک بن چکی تھی اور معمولی بالوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے بھاری جاکر بننے کی صورت میں دی جا چکی تھیں۔ وادی کی حکومت سنبھالنے پر گلاب سنگھ نے دیکھا کہ ۳۱۰۰ جاگیریں عطا کی گئی ہیں۔ اس نے کف افسوس ملتے ہوئے کہا کہ مجھے ۵ لاکھ روپے اس علاقے کے لئے ادا کرنا پڑے جس کا تین چوتھائی حصہ دریائوں اور پہاڑوں پر مشتمل تھا اور باقی تھانہ علاقے کا تین چوتھائی حصہ جاگیروں کے طور پر عطا کیا جا چکا ہے جو کمزور و گریہ مکاروں کا طرز عمل ذاتی اور جاگیردارانہ تھا چنانچہ کاروبار حکومت چلانے کی عملی قدروں سے ناواقف تھے۔ امن اور استحکام بذات خود ہی رحمت ثابت ہوئے۔ چند نفاذی اقدامات بھی کئے گئے اس مقصد کے لئے برطانوی حکومت ہند گلاب سنگھ پر کافی حد تک اثر انداز ہوئی۔

اس وقت برطانوی حکومت ہند کے پیش نظر جموں و کشمیر میں دو اہم نصب العین تھے۔ اول یہ کہ ہمارا راجہ پر سخت تسلط جمایا جائے خاص طور پر لداخ اور گلگت جیسے اہم نوعیت کے علاقوں پر اپنی گرفت مضبوط کی جاسکے اور دوم کہ ایک مستحکم اور کافی حد تک انصاف پسند انتظامیہ قائم کیا جائے جو امن و انتظام بحال کر سکے۔ ترقیاتی کام شروع کر سکے۔ ان میں سڑکوں کی تعمیر کا کام بھی شامل تھا تاکہ ان کے فوجی اور کاروباری مفادات پورے ہو سکیں۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کے دوران ڈوگریوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ اگرچہ وہ ہمارا راجہ کے ساتھ خوش تھے اور انہوں نے ہمیشہ جگہ جگہ ہمتیوتانے کی تجویز کو فوری طور پر منظور کر لیا مگر ان کے جارحانہ رویے میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ اس سے قبل ۱۸۵۲ء میں ہمارا راجہ پر ایک انفرن شیل ڈیویٹ مسلط کر دیا گیا تھا۔ اور ۱۸۶۰ء میں برطانوی ٹریڈ ایجنسی لیمیٹڈ نے وادی اور وسطی ایشیا کے کاروباری راستے کا قبضہ برطانوی حکومت ہند کو دے

دیا گیا۔ ۱۸۸۴ء میں ایک مستقل پولیٹیکل ریذیڈنٹ دارالحکومت میں مامور کیا گیا۔

ریذیڈنٹ کی تقرری کے ساتھ ہی ریاستی معاملات میں برطانوی دخل اندازی میں اضافہ ہو گیا یہاں تک کہ معمولی انتظامی معاملات یعنی جاگیر میں عطا کرنے کے معاملے میں بھی ریذیڈنٹ اپنی مرضی منوالین اکثر انتظامیہ کی نام نہاد اصلاح اور چند امور بہاراجہ کی کونسل کو منتقل کرنے کے بارے میں ولیم ڈیجی نے کہا۔

اس ملک میں ریاستی امور کے تمام اختیارات عملی طور پر صرف ریذیڈنٹ کو ہی تفویض میں حقیقت اس کی تحریری اجازت کے بغیر کوئی بھی شخص اس سرزمین پر پاؤں تک نہیں رکھ سکتا۔ اس کی رضامندی قانون ہے۔ وہ ایک شہنشاہ ہے اور اپنے دوستوں اور حواریوں سے گھرا ہے اس نے حکومت کے بہت سے پرانے ملازمین کو نکال پھینکا ہے جو کہ ریاست کے وفادار تھے۔ اس ملک میں کوئی بھی شخص زبان کھولنے کی جرأت تک نہیں کرتا۔ جو شخص نہایت غیظ بھی احتجاج کرتا ہے اُسے شدید خطرناک انجام کی دھمکی دی جاتی ہے۔

برطانوی حکومت نے بہاراجہ کی بدانتظامی کی بنا پر دخل اندازی کو حق بجانب قرار دیا مگر ان کی حقیقی منشأ شمال میں فرنگی علاقے پر مکمل تسلط حاصل کرنا تھا۔ ولیم ڈیجی نے کہا: "حکومت ہند صرف کھٹک چاہتی ہے بسا اوقات یہ دخل اندازی اس حد تک پہنچ جاتی کہ بہاراجہ بے چارگی کی حالت میں ایک معمولی سا مسئلہ بن کر رہ جاتا مثال کے طور پر بہاراجہ سے عملی طور پر حکومت کے تمام اختیارات چھین لئے گئے اور ایڈمنسٹریشن کا کنٹرول اس کثیر کونسل کو تفویض کیا گیا جس کے اراکین برطانوی حکومت ہند کی طرف سے اپنی مرضی کے مطابق مامور کئے گئے اس کے بارے میں ۱۳ مئی ۱۸۸۹ء کو بہاراجہ نے ایک خط گورنر جنرل کو تحریر کیا جس کا متن کسی وقت کا طلب گار نہیں۔ اس نے کہا۔

اگر مجھے غیر جانبدار سماعت کا موقع دیا جائے اور یہ پایا جائے کہ میں حکومت اعلیٰ اور عوام کے اطمینان پر پورا نہیں اترتا تو آپ کی حکومت اس بارے میں جیسا بھی مناسب ہو اقدام کر سکتی ہے۔ اگر پریم گورنمنٹ مجھے اس بات کی اجازت نہیں دیتی اور میں موجودہ دیگر گروہ حالات کا شکار رہتا ہوں تو آپ کی عزت مآب ذات گرامی سے یہ درخواست کروں گا کہ آپ مجھے طلب کریں اور میں ایسا طلبی کی فرماں برداری کے لئے جو جوشی تیار ہوں اور آپ میرے سینے میں گولی داغ سکتے ہیں۔ آپ کی ذات گرامی کے ہاتھوں ایسی موت مجھے موجودہ بے عزتی، توہین اور دکھوں سے دائمی نجات بخشنے گی۔"

جوں و کشمیر میں برطانوی حکومت کی فیصلہ کن دخل اندازی کے پیش نظر ۱۸۴۶ء سے ۱۹۴۷ء کے عرصے کو صرف ڈوگرہ حکومت کی بجائے برطانوی ڈوگرہ حکومت دور قرار دینا زیادہ موزوں ہوگا۔

ولیم ڈیجی برطانوی پارلیمنٹ میں برل پارٹی کا ایک رکن تھا۔ اپنے نوٹ منڈیڈان سرڈ میں اس نے برطانوی ہند حکومت کی بہاراجہ پر تپ کھربہ انتظامی کا الزام لگایا اور ریاست کے معاملات میں اسے دخل اندازی کا ہاتھ بٹانے کی شدید مذمت کی۔

ریاست کے معاملات میں دخل اندازی کے پس پردہ برطانوی حکومت ہند کا منشأ سامراجی مفادات کے تحفظ کے لئے تشویش تھا مگر اس دخل اندازی کو بجا قرار دینے کے لئے دیگر دلائل بھی دی گئے۔ مثال کے طور پر ۸۹-۸۸ء کی قحط سالی کے دوران بہاراجہ کا انتظامیہ راحت فراہم کرنے میں ناکام رہا۔

برطانوی دخل اندازی صحت مند انجام سے عاری بھی نہیں تھی۔ بہاراجہ کو ایک کثیر تعداد برطانوی مصلحت ملازمین کی خدمات کے لئے مجبور کرنے کے لئے مقامی انتظامیہ کو کسی حد تک جدید انداز فکر حاصل ہوا۔ ان میں سب سے متاثرینٹ افسر سرائلارنس تھا۔ ۱۸۸۹ء سے ۱۸۹۳ء تک اس نے تدریجی اہمیت کا کام سر انجام دیا اس الجھاؤ دار اور بدعنوانیوں سے بھرے بندوبست نظام کی جگہ پر ایک منصفانہ اور ممنوعی طرز عمل اپنے طے کیا ہے گاراجہ جری مزدوری کو ختم کر دیا گیا۔ حالیہ اراضی کا مطالبہ چودہ برس کے لئے مقرر کیا گیا۔ نقد مالہ ادا کرنے کا نظام مقرر کیا گیا یعنی متنازع زمینوں پر کاشت کر رہے مزدوروں کے نام حقوق ملکیت کئے گئے۔

برطانوی حکومت کے دباؤ اور اپنی پہل کی بنا پر بہاراجہ نے ادنیٰ سطح پر آئینی اصلاحات کا آغاز کیا۔ یہ عمل ۱۹۲۳ء اور ۱۹۲۷ء کے آئینی ایکٹوں کے ذریعے شروع ہوا۔ ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کے بعد سرینگرھیل کے باہر شدید فسادات ہوئے جن میں ۲۱ افراد ہلاک ہوئے۔ ان فسادات کو مسلمانوں میں بے چینی اور اضطراب کے مترادف قرار دیا گیا۔ برطانوی ریذیڈنٹ کی ایما پر ایک برطانوی افسر ٹرانڈے جے کلاسی - کی صدارت میں ایک تحقیقاتی کمیٹی کا تقرر کیا گیا۔ کلاسی کمیٹی کی سفارشات کے پیش نظر بہاراجہ پر اصلاحات کے لئے مزید دباؤ پیدا کیا جانے لگا۔ ۱۹۳۴ء میں اس نے ایک اور آئینی ایکٹ نافذ کیا جس کے مطابق دوپرتی حکومت کی ترویج کی گئی موضوعات کو دو زمروں میں تقسیم کیا گیا۔ زمرہ اول میں محفوظ موضوعات تھے جو بہاراجہ کے مخصوص تحویل میں رہے اور زمرہ دوم میں منتقل شدہ موضوعات تھے۔ انتظامیہ کا نام وزرا کے سپرد کیا گیا۔ اس ایکٹ کے تحت ۵، ۵۰ رکنی قانون ساز اسمبلی (پر جاسما) کا قیام بھی کیا جانا مقصود تھا۔ ان میں ۳۷ معتبر وزراء تھے۔

سیاسی بیداری

جبکہ بہاراجہ محدود آئینی اصلاحات پر عمل پیرا تھا تب ہندوستان میں انڈین نیشنل کانگریس کی پنجابی میں تحریک آزادی زور پکڑ رہی تھی۔ ان واقعات کا ریاست جموں و کشمیر پر اثر انداز ہونا بھی ایک لازمی امر تھا۔ ایک کثیر تعداد میں فوجیوں لاپور اور علی گڑھ سے تعلیم حاصل کر کے آئے اور ان کے ذہن میں سماجی اور اقتصادی لحاظ سے ایک نئی بیداری تھی۔ ان میں سے ایک شخص شیخ محمد عبداللہ بھی تھا۔

۱۹۳۲ء میں جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کے نام سے ایک سیاسی جماعت کی بنیاد ڈالی گئی مسلم کانفرنس کے ابتدائی

نہایت معمولی مطالبات تھے اس کا اہم نصب العین مسلمانوں کی سماجی، ثقافتی اور اقتصادی بہبود کے لئے کام کرنا اور رسول سرسبز اور فوج کی آسائشوں میں مسلمانوں کے لئے زیادہ حصہ حاصل کرنا تھا۔

۱۹۲۳ء تک مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ میں رائے دی گئی تھی اپنانے جانے والے رویے کی بابت اختلاف رائے پیدا ہو چکا تھا۔ یہ رائے دی گئی تھی مہاراجہ نے شروع کی گئی محدود آئینی اصلاحات کے ایک حصے کے طور پر مقرر کی تھی۔ یہ اختلاف رائے ریاست میں سیاسی تحریک میں تقسیم کی شروعات تھا۔ اس اختلاف رائے کے پیش نظر مجلس عامہ کو توڑ دیا گیا اور چودھری عباس کو مسلم کانفرنس کا وائس چیرمین مقرر کیا گیا۔ ریاست کے وزیر اعظم کے ساتھ عباس کی گفت و شنید ناکام ہو گئی۔ اس نے سول نافرمائی تحریک کی کال دی جس کا بہت کم اثر ہوا۔ عباس کو گرفتار کر لیا گیا اور اسے چھ ماہ قید کی سزا ہوئی۔

دوسری راجا راجہ شاہی ریاستوں میں تحریک آزادی اثر انداز ہو رہی تھی اس کے پس پردہ انڈین نیشنل کانفرنس کی قوت کا فرما تھی۔ کانگریس اس ریاست کے اندر درونما ہونے والے واقعات میں بھی گہری دلچسپی لے رہی تھی۔ مقامی لیڈروں کو جلد ہی یہ بات محسوس ہو گئی کہ قومی لیڈروں سے حمایت حاصل کرنے اور راجہ راجہ کے خلاف اپنی تحریک کی بنیاد کو وسیع بنانے سے فائدہ ہو سکتا ہے۔ ۱۹۲۰-۲۹ء مسلم کانفرنس کا نام بدل کر آل جوں و کشیر نیشنل کانفرنس کر دیا گیا اور اس کی رکنیت کے دروازے بلحاظ مذہب تمام طبقوں کے لئے کھول دیے گئے۔ اس معاملے میں پہلے مولانا محمد سعید موسوی اور شیخ محمد عبداللہ کی طرف سے کی گئی۔ آخر الذکر نے اپنے صدارتی خطبے میں دلیل دے کر ایک ذمہ دار حکومت حاصل کرنے کے لئے لازمی ہے کہ ہم ہندو، سکھوں اور بدھوں کو اپنے ساتھ شمولیت کے لئے دعوت دیں۔ وہ لوگ بھی جہالت کے گردھوں میں دھنسنے ہیں۔ وہ بھی ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ وہ لوگ بھی بھوک کا مقابلہ کرتے ہیں۔ ایک ذمہ دار حکومت کا قیام ان کے لئے بھی اس قدر ہی لازمی ہے جتنے ہمارے لئے ہے۔

۱۹۲۴ء میں نیشنل کانفرنس نے ایک مینی فیسٹو اپنایا۔ اس پروگرام کا نام نیا کشمیر تھا اس کی رو سے ریاست میں پارلیمانی جمہوریت کا قیام مقصود تھا اور عوامی اقتصادی اور تعلیمی اصلاحات کا ایک پروگرام تھا اس دستاویز کا خلاصہ حصہ سوئم میں درج ہے۔

۱۹۲۴ء کے موسم گرما کے دوران جوں و کشیر پر اپنی گرفت قائم کرنے کی کوشش میں ایم اے جناح نے کشمیر کا دورہ کیا۔ وہ آرام کرنے کے بہانے بہال آیا مگر اپنے اعزاز میں عصرانے قبول کر لئے نیشنل کانفرنس کی طرف سے دیئے گئے عصرانے کے دوران شیخ محمد عبداللہ اور محمد علی جناح جس کیفیت میں اُلجھ پڑے اُسے ٹکراؤ کہتے ہیں۔ مسلم کانفرنس کی طرف سے دیئے گئے عصرانے میں جناح اس کے حق میں آگیا اس نے کہا۔ "مسلمانوں کا ایک پلیٹ فارم ہے، ایک کلمہ اور ایک خدا ہے میں مسلمانوں سے گزارش کروں گا کہ وہ مسلم کانفرنس کے پرچم تلے آجائیں اور اپنے حقوق کیلئے کام کریں۔"

جناح نے مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس کی صدارت بھی کی۔ اپنے خطبے میں اس نے نیشنل کانفرنس کو "قزاقوں کا ایک گروہ" قرار دیا۔ بعد ازاں جب نیشنل کانفرنس نے کشمیر جھوڑو تحریک شروع کی تو جناح نے چند ہرگز نہ حاضر ہونے شروع کی گئی۔ جہد قرار دیا جس کا مقصد ریاست میں افراتفری کے حالات پیدا کرنا ہے۔ واضح ہے کہ جناح اور مسلم لیگ نے شیخ عبداللہ کو زیادہ اہمیت نہیں دی اس نے مسلم کانفرنس اور چودھری غلام عباس کو ترجیح دی۔ کیونکہ شیخ عبداللہ اس بات کا قائل تھا کہ اگر ریاست پاکستان کے ساتھ شامل ہو گئی تو اس کا مستقبل نہایت تاریک ہوگا۔ اپنی خود نوشت سوانح حیات آتش جہان میں شیخ عبداللہ خود اپنے تئیں جناح کی جارحیت کے اظہار کو تسلیم کرتا ہے۔ وہ قسطنطنیہ ہے۔ اس وقت جناح اقتدار کے نشے میں پور تھا۔ وہ ایک غریب اور بلا وسائل قوم کے ساتھ بات کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتا تھا۔ جب طاقت کی یہ مساوات اس کے خلاف گئی تو وہ ہر بڑا کر خواب سے جاگ پڑا مگر اس وقت سانپ گزر چکا تھا اور لکیری باقی رہی تھی۔ جناح کے دورے کے دوران مولوی یوسف شاہ بھی جناح کی زبان درازوں کا شکار ہوا۔ اس نے مولوی کو ایک گلاسٹرا انڈہ "قرار دیا۔ اس نے مولوی سے کہا میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ آپ سیاست سے دور رہیں۔ کشمیر میں ہیں ایک لیڈر درکار ہے مولوی نہیں۔"

اس وقت تک نیشنل کانفرنس دو پرقی نظام سے مایوس ہو چکی تھی۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ یہ نظام ایک منظم کٹھ پتلی کے کھیل سے زیادہ نہیں ہے۔ شیخ عبداللہ نے جواہر لال نہرو مولانا آزاد اور عبد الغفار خان اور دوسرے قومی رہنماؤں کے ساتھ چورابطن بنایا تھا اس سے نیشنل کانفرنس میں اس کے رفقاء میں اعتماد پیدا ہو چکا تھا۔ ایسے وقت میں کہ کشمیر کی ہندوستان میں آمد سے کئی توقعات پیدا ہو گئیں۔ کشمیر کے نام ایک مراسلے میں نیشنل کانفرنس نے کہا۔

"چونکہ ان مقامات میں کشمیر والیان ریاست اور عظیم طاقت کے درمیان حقوق عہد نامہ کی رو سے تعلقات پر نظر ثانی کر رہا ہے ہم گزارش کرتے ہیں کہ اس معاملے میں کشمیر کے اہم تعلقات پر کبھی نظر ثانی کی جائے جو ایک صد برس قبل ۱۸۴۶ء میں زمین اور عوام کو اہل برطانیہ ڈوگرہ گھرانے کی خدمت میں بیچتے لاکھ لاکھ روپوں کے عوض فروخت کر دیے جو کہ برطانوی روپوں کی صورت میں بیچا لاکھ بنتے ہیں۔ چنانچہ کشمیر کا معاملہ عجیب و غریب اساس پر کھڑا ہے لہذا کشمیر کے عوام اپنے آزادی کے ناقابل جیلنج حق پر زور دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ برطانوی طاقت ہندوستان سے واپس چلی جائے۔"

اسی کو نیشنل کانفرنس نے شیخ عبداللہ کی قیادت میں کشمیر جھوڑو تحریک کا آغاز کیا۔ ۱۹۲۶ء مئی ۱۹۲۶ء کے روز اپنی تقریر میں شیخ محمد عبداللہ نے کہا: "ڈوگرہوں کے جبر و استبداد نے ہماری روٹوں کو پیر ڈالا ہے۔ یہ عمل پیہم کا وقت ہے آپ کو غلامی کے ساتھ۔" لازمی طور پر جنگ کرنی چاہیے۔ اور سپاہیوں کی طرح جہاد کے میدان میں اُتر جانا چاہیے۔ ہر مرد و زن اور بچہ "کشمیر جھوڑو" کا لفرہ لگائے گا۔ کشمیری قوم نے اپنی قوت

ارادی کا اظہار کیا ہے۔ میں اس معاملے پر رائے شماری کا مطالبہ کروں گا۔ ۲۰ مئی کو اُسے گرفتار کر لیا گیا۔ نیشنل کانفرنس کے دوسرے ممتاز رہنماؤں کو نظر بند کر دیا گیا۔ نہرو نے شیخ محمد عبداللہ کی فوری رہائی کا مطالبہ کیا اور خود شیخ عبداللہ کے دفاع کے لئے انتظام کرنے کا شیردازہ ہو گئے۔ مہاراجہ نے شاید وزیر اعظم رام چندر کا کے مشورے پر پنڈت نہرو کے ریاست کے اندر داخلے پر پابندی لگا دی۔ نہرو نے اس پابندی کو توڑنے کی کوشش کی اور انہیں گرفتار کر لیا گیا اس سے نہ صرف غلام میں زبردست ہل چل پیدا ہوئی بلکہ اس نے پنڈت نہرو اور مہاراجہ ہری سنگھ کے درمیان تعلقات کو مستقل طور پر خراب کر دیا۔ یہ بات بعد کے واقعات سے ظاہر ہے۔ نہرو مہاراجہ کے تین لاپنی جارحیت پر کبھی قابو نہ پاسکا اور شیخ محمد عبداللہ نے اس بات کا اپنے مقصد کے لئے استعمال کیا۔ بہر حال کانگریس کی کمی نہرو کو دہلی واپس جانے کے لئے آمادہ کر لیا۔ جسے بعد ازاں شیخ محمد عبداللہ کو بھی رہا کر دیا گیا۔ بعض حلقوں نے کہا ہے کہ یہ رہائی حاصل کرنے کے لئے شیخ محمد عبداللہ نے مہاراجہ سے بلا شرط معافی طلب کی تھی۔ شیخ عبداللہ نے لکھا: میں سرکار والا کو یقین دلاتا ہوں کہ میرے یامیری جماعت کے دل میں سرکار والا کی ذات کے تحت یا خاندان کے تین کدورت یا نا وفاداری نہیں ہے۔ میں سرکار والا کو یقین دلاتا ہوں کہ میری ذات اور میری پارٹی آپ کی بھرپور حمایت کرے گی۔ میں سرکار والا کو یہ بھی یقین دلاتا ہوں کہ ریاست کے اندرون یا بیرون میں کوئی بھی جماعت جو ہماری منزل کے حصول کے راستے میں روکاؤ میں کھڑی کرے گی کو دشمن تصور کیا جائے گا اور اس کے ساتھ دشمنوں جیسا سلوک ہوگا۔

نیشنل کانفرنس کے چند ممتاز لیڈر جن میں چودھری غلام عباس علی شامل ہیں مسلم کانفرنس میں شمولیت اختیار کر گئے۔ اکتوبر ۱۹۴۶ء میں مسلم کانفرنس نے ڈائریکٹ ایکشن ہم شروع کی جس کی قیادت مولوی یوسف شاہ کر رہا تھا چودھری غلام عباس اور مسلم کانفرنس کے چند دیگر رہنما گرفتار کر لئے گئے۔ اس سے جوں و کشمیر میں مسلم لیگ کا بڑھتا ہوا اثر عیاں تھا۔

میر واعظ مولوی یوسف شاہ نے انڈین نیشنل کانگریس اور نیشنل کانفرنس کے تین شدید جارحیت کا مظاہرہ کیا۔ نیشنل کانفرنس کی مینڈ دخل اندازی کی مذمت کرتے ہوئے اس نے ۲۵ ستمبر ۱۹۴۶ء کو کہا۔

”ہندو سرماہ دار ریاست کو اپنی گرفت میں لینا چاہتے ہیں اور میں انتباہ کرتا ہوں کہ اگر حکومت جوں و کشمیر کانگریس کی طاقت سے خوفزدہ ہو گئی اور اس نے نیشنل کانفرنس فسطائیوں کے ساتھ ناپاک گٹھ جوڑ کر لیا تو اُسے مسلمانوں کی بیہیت ناک مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا اور یہ ناپاک گٹھ جوڑ پاش پاش کر دیا جائیگا۔ کشمیر کے مسلمانوں نے ۱۹۴۵ء اور ۱۹۴۶ء میں پنڈت نہرو کے حملوں کو پسپا کر دیا۔ اب وہ پھر اس امر کی کوشش کر رہا ہے چنانچہ کشمیری مسلمانوں اور ملک کے بھی خواہاں ہوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اس یلغار کو پاش پاش کر دے گا۔“

۱۰ مئی ۱۹۴۷ء کو ایک اور دلچسپ بیان چودھری حمید اللہ خان صدر مسلم کانفرنس نے جاری کیا۔ جس میں مہاراجہ پر زور دیا گیا تھا کہ وہ اپنے خود مختار ہونے کا اعلان کر دے۔ اگر کشمیر کو کشت و خون اور قتل عام سے بچنا ہے تو اسے سخت پالیسی اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ یہاں پر چاہیے کہ ہر پائین مہاراجہ بہادر کو چاہیے کہ فوری طور پر کشمیر کے خود مختار ہونے کا اعلان کر دیں جو اپنی خواہشات کا احترام کرتے ہوئے ریاست کے لئے آئین مرتب کرنے کے لئے ایک الگ دستور ساز اسمبلی فوری طور پر قائم کی جانی چاہیے۔ اس پالیسی پر عمل پیرا ہونے میں مہاراجہ بہادر کو مسلمانوں کی مکمل حمایت حاصل ہوگی۔ مسلمان ریاست کی آبادی کا ۸۰ فیصد حصہ میرا اور مسلم کانفرنس ان کی ترجمان ہے۔ آزاد اور جمہوری کشمیر کے ایک حکمران کی صورت میں مسلمان مہاراجہ بہادر کا غیر مقدم کریں گے۔

آزادی ہند کے موقع پر قوتیں اور کردار

چنانچہ ملک کی آزادی کے موقع پر متعدد طاقتیں اپنے اپنے جوہر کشمیر میں دکھا رہی تھیں شیخ محمد عبداللہ کی صدارت میں نیشنل کانفرنس تھی۔ وادی کشمیر میں اس کا غلبہ تھا مگر جموں اور لداخ میں اس کا محدود اثر و رسوخ تھا۔ انڈین نیشنل کانگریس اور خاص طور پر جواہر لال نہرو کے ساتھ اس کے گہرے مراسم تھے مگر مسلم کانفرنس کے ساتھ اس کی مساوی میں زبردست جارحیت کا عنصر موجود تھا۔ سرینگر شہر کے باہری علاقوں میں میر واعظ مولوی یوسف شاہ کو کٹر حمایت حاصل تھی مگر نیشنل کانفرنس اور کانگریس کے ساتھ اس کی زبردست مخالفت تھی۔ اس کے بعد مسلم کانفرنس تھی جس کا وادی میں بہت کم اثر تھا مگر جموں خطہ کے مسلمانوں میں اس نے اپنی خامی طاقت بنائی تھی اور مسلم لیگ کے ساتھ نظریاتی یکجہتی کے سبب اس نے گذشتہ دو برسوں کے دوران اس نے مرحلہ وار طاقت حاصل کر لی تھی اور وادی کشمیر میں اپنا اثر قائم کرنے کی صلاحیت بھی اس میں موجود تھی۔ کشمیر کی آزادی کے لئے یہاں وہاں سے بھی آوازیں اٹھ رہی تھیں۔ ایک اور طاقت مہاراجہ بھی تھا۔ جموں کے ڈوگرہ راجپوت اُسے اپنا ہی بھائی بند سمجھتے تھے۔ ایک طرف اس کے اور شیخ عبداللہ کا درو سری طرف پنڈت نہرو کے ساتھ اس کے تعلقات میں بے اعتمادی کا عنصر تھا۔ ان تینوں میں سے کوئی بھی رہنما ریاست کے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرتے وقت اپنے زور اور منصب سے بالا ترجیحیں ہو سکتی۔

جلد ہی کشمیر کے المناک کھیل میں ان تمام کرداروں کو اپنا اپنا رول نبھانا تھا۔ مہاراجہ کوئی فیصلہ نہیں لے پا رہا تھا۔ پنڈت نہرو کا ذہن اصول پر سکھ اور حالات کی تلخ تحقیقوں کے گرداب میں پھنس کر رہ گیا تھا جناح کی طرف سے اپنے لئے دروازے بند ہو جانے پر شیخ عبداللہ اپنے دو غلیظین کے باعث اپنے اور اپنے حواریوں کے لئے شیخ شاہی قائم کرنے کی پنہاں خواہشات کو نشوونما دے رہا تھا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ہر ایک اپنے اپنے زعم کے تحت شیخ پر اپنا اپنا کھیل کھیل رہا تھا اور ہر ایک کے ذہن میں ڈرامے کے پلاٹ کا اپنا ہی خاکہ تھا۔

اور برکوٹی یہ امید رکھتا تھا کہ انجام آخر اس کے ہی حق میں ہو گا۔ انجام کو شیخ پر کیغوتزن اور بے بطنی نمایاں ہو چکی تھی غلطیوں کے بعد غلطیاں سرزد کی گئیں۔ ایک کے بعد دوسری کمرخت کی غیبت پیدا کی گئی اندازے کی ایک غلطی سے دوسری غلطی کا ارتکاب ہوا اور شیر قوی امین الاقوامی تنازعوں اور اختلافات کے جنور میں پھنس کر رہ گیا۔

پہلی غلطی: آزادی کے خیال کے ساتھ محبت جتنا

پہلی سنگین غلطی کا ارتکاب اس وقت ہوا جب ہمارا جرنل نے اپنے ذہن میں آزادی کے خیال کو مجگہ دینا شروع کر دیا۔ انڈین انڈینڈ نیو ایکٹ (۱۹۴۷ء) اور اس کے نتیجے میں بادشاہت کے خاتمے کی صورت میں تکنیکی طور پر ریاستیں آزاد تھیں۔ مگر عملی طور پر ان کے سامنے فقط دو ہی راستے ہندو یا پاکستان کے ساتھ الحاق کی صورت میں موجود تھے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے وادی کا چار روزہ دورہ کیا اس نے ہمارا جرنل کو مشورہ دیا کہ وہ اس بارے میں اپنا ذہن بنالے مگر ہمارا جرنل نے اُسے ٹھل دے دیا۔ ماؤنٹ بیٹن کی رخصتی کے روز ہونے والی میٹنگ میں اس معاملے پر حتمی گفتگو ہونا تھی۔ ہمارا جرنل نے در شکم کا بہانہ تراش لیا اور میٹنگ منسوخ کر دی گئی بعد ازاں اس سلسلے میں ماؤنٹ بیٹن نے یاد دلایا کہ ان چار دنوں کے دوران میں نے اسی مشورے پر تردد کیا کہ کسی بھی طریقے سے اپنے عوام کی رائے معلوم کر کے ۱۴ اگست تک جس مملکت کے ساتھ بھی ممکن ہو شمولیت کر لیجئے۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا اور جو کچھ ہوا بالکل واضح ہے اگر اس نے ۱۴ اگست تک پاکستان کے ساتھ الحاق کیا ہوتا تو اس صورت میں مستقبل میں قائم ہونے والی حکومت ہند نے جسے یقین دلایا تھا کہ وہ اس بارے میں ہر بات سے کوئی عذر نہیں کریں گے۔ اگر ہر باتیں نے ۱۴ اگست تک ہند کے ساتھ الحاق کیا ہوتا تو اس صورت میں پاکستان کا سرے سے ہی وجود نہیں تھا۔ گڑ بڑ صرف اس صورت میں ہوتی اگر ہمارا جرنل کسی ایک کے ساتھ الحاق نہ کرتا اور ہمارا جرنل کی طرف سے اس راہ پر گامزن رہنا ایک بد قسمتی کی بات تھی۔ +

جولائی اگست ۱۹۴۷ء میں ہمارا ناکام نندھی سرنگر وار دھوئے۔ وہ یکم اگست کو ہمارا جرنل کے ساتھ ملاقاتی ہوئے۔ ماسوائے اس کے کہ ہمارا ناکام نندھی نے ہمارا جرنل کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اپنے عوام کے ساتھ تنازع جاری نہ رکھے، دونوں کے درمیان ہوئی گفت و شنید کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں۔ البتہ اگر ہمارا ناکام نندھی کی آمد کا یہ مقصد تھا کہ ہمارا جرنل کی دوسری طرف اپنا ذہن بنالے تو وہ اپنا مقصد حاصل کرنے میں بالکل

+ جون ۱۹۴۷ء میں انڈین نیشنل کانفرنس نے اپنی قرارداد میں بادشاہت کے خاتمے کو ترجیح دی اس نے کہا کہ: ہندوستان سے

ناکام رہے تھے۔ اس دورے کے بعد صرف ایک ہی واضح جھٹکا محسوس ہوا کہ وزیراعظم آری کاک کی جگہ ۱۰ اگست کو پھر جنرل جنگ سنگھ کو مامور کیا گیا۔

جولائی اگست ۱۹۴۷ء میں ہمارا ناکام نندھی کا دورہ کشمیر اور ہمارا جرنل کے ساتھ یکم اگست کو ان کی ملاقات وزیراعظم کے عہدے سے ۱۰ اگست کو آری کاک کی برطرفی اور ۲۶ ستمبر کو اپنے خط میں "بلا شرط ممانی" مانگنے کے بعد ۲۹ ستمبر کو شیخ عبداللہ کی رہائی۔ جنوں اور پٹھانکوٹ کے درمیان سڑک رابطے کو مضبوط بنانا وادی کشمیر کے پل کی تعمیر ان بھی اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ ریاست کے ہند کے ساتھ الحاق کے لئے زمین ہمارا جرنل کی جارہی تھی۔ بہر حال پاکستان کے اس الزام کو ثابت کرنے کے لئے کوئی ٹھوس ثبوت دستیاب نہیں ہوتا کہ ہندوستان کی طرف سے کشمیری الحاق حاصل کرنے کے لئے ایک ناپاک منصوبہ تیار کیا گیا تھا۔ درحقیقت اس الزام کی لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے واضح طور پر تردید کی ہے بلکہ ہندوستان کی تیوں فوجوں کے سربراہوں جنرل آری کاک ہارٹ ائڈین آرمی کے سربراہ ایئر مارشل فیڈیلیو المار ہسٹ کمانڈر رائل انڈین ایئر فورس اور ایڈمرل جے ایس بال چیف آف رائل انڈین نیوی نے اپنے مشترکہ بیان میں بھی اس الزام کو مسترد کیا ہے۔ + انہوں نے کہا: "۳۴ اکتوبر کو ہندوستانی فوجوں کے کمانڈر ان - چیف کو اطلاع موصول ہوئی کہ قبائلیوں نے منظر آبا واد پر قبضہ کر لیا ہے یہ حملے کا پہلا اشارہ تھا۔ اس تاریخ سے قبل ہندوستانی فوجوں کو کشمیر روانہ کرنے کے مدد کسی منصوبے کو تشکیل دی گئی تھی اور نہ ہی اس بارے میں غور کیا گیا تھا"

بہر کیف کشمیر کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کے راستے کو کھلا رکھا جا رہا تھا اور کوئی غلط بات نہیں تھی۔ ہندوستان نے دو قومی نظریے کو کبھی تسلیم نہیں کیا تھا۔ اس بات پر یقین کیا جانا بھی حق بجانب ہے کہ ہمارا جرنل نے خود بخود دونوں کو کشمیری عوام کی حمایت حاصل تھی اور ان دونوں کے انڈین یونین کے ساتھ شمولیت کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اس سے دو قومی نظریے کا کھوکھلا پن عیاں ہو جاتا ہے۔ اور ہندوستانی نکتہ نظر سے یہ مسئلہ نظریاتی کیفیت کا تھا اور اس میں علاقائی توسیع پسندی کا سوال ہی نہیں تھا۔ ہندوستان کا المیہ تصوراتی ڈھانچے میں نہیں بلکہ اس پر عمل پیرا ہونے میں الجھاؤ اور عملی انداز فکر کے فقدان میں مضمر تھا۔

۱۵-۱۴ اگست کو ہندوستان اپنی منزل سے ہمکنار ہوا۔ ہمارا ہر لالہ ہرو کے الفاظ کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔ نصف شب کے آغاز کے ساتھ ہی جب دنیا سو رہی تھی تو ہندوستان آزادی کی روشنی کے ساتھ بیدار ہو گیا مگر کشمیر میں ہمارا جرنل آزادی کا خواب دیکھ رہا تھا اس کے ذہن میں یہ ہوا کہ ہوسے اسے مشیروں اور

شناختوں نے پیدا کی تھی۔ اس روز صرف یہی ہوا کہ جموں، سرنگر اور لہہ میں دونوں مملکتوں ہندوستان اور پاکستان کے جنم اور یہاں سے بادشاہیت کے ختم ہونے پر جہاں کیا گیا۔

یہ بات واضح ہے کہ مہاراجہ بری سنگھ کو ایک غلط مشورہ دیا گیا تھا۔ وزیراعظم رام چندر کاک اور راج گورو سوامی سنت دیلے اس کے ذہن میں آزادی کا تصور پیدا کیا تھا۔ یہ سوامی موجودہ دور کے بہاؤوں کی طرح مغل تھا۔ جو اپنے ظاہری فریبانہ وعدوں کے قطع نظر ملک کی بد نظمی کی صورت میں یہاں کے سیاستدانوں پر گہرا اثر و رسوخ رکھتے ہیں۔ اس سوامی کے بارے میں غصے بہت ساری باتیں مسمی ہوئیں وہ اس مکان میں رہتا تھا جو موجودہ راج بھون ہے اس سے قبل یہ عمارت ایک محل تھی جو راجہ نے اپنی چوتھی رانی اور ڈاکٹر کرن سنگھ کی مال کے لئے تعمیر کروایا تھا۔ بعد ازاں متعدد شخصیتیں یہاں پر آکر رہیں جن میں تیج بہادر سہر و اور گوپالا سوامی آئیٹنگر شامل تھے اس کے بعد یہ عمارت سرکاری مہمان گاہ بن گئی۔ جو اہر لعل تہر کے لئے اپنے کشمیر کے دوسرے کے دوران یہ خاص کشش کا باعث تھا کیونکہ یہاں سے تحصیل ڈل پر مزدب آفتاب کا دلغریب منظر اپنے خوبصورت انداز میں دستیاب ہوتا تھا۔ باری پرست اور شکر آجاریہ کے پیڑوں سے چھن کر آتی سورج کی آفری کر نہیں نہایت دلغریب معلوم ہوتیں۔ ایسے محل کے علاوہ ایک کارا و رہبیت ساری دیگر مراعات بھی سوامی سنت دیو کو فراہم کی گئی تھیں۔ وہ مہاراجہ پر اپنے اثر و رسوخ کی ایک علامت تھا۔ یہ سوامی ہی تھا جس نے پیش گوئی کی تھی کہ شہنشاہت کے خاتمے کے ساتھ مہاراجہ آزاد اور فرخندہ رہے گا اور اس کا مستقبل نہایت درخشندہ ہے میکیتھ میں "نقیب والی بہنوں" کی طرح معلوم ہوتا ہے کہ سوامی نے بھی ایمانداری کے اپنے چھوٹے چھوٹے کاموں کے ذریعے مہاراجہ کا دل جیت لیا تھا تاکہ بڑے موقعوں پر اسے دھوکہ دیا جائے بے چارے مہاراجہ کا وہ سب بھی کھو گیا جو اس کے پاس اگست ۱۹۴۷ء سے قبل تھا۔ اس میں دلپٹی کا پہلو یہ ہے کہ وہی سوامی جس نے مہاراجہ کو پہلے سرنگر میں ہی ڈٹے رہنے کا مشورہ دیا تھا، ۲۷ اکتوبر صبح دو بجے شہر چھوڑنے والے شاہی کارواں میں سب سے آگے تھا۔

وزیراعظم جموں و کشمیر کے ۱۲ اگست کے برقیے کے جواب میں پاکستان ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے جموں و کشمیر کے ساتھ جموں کے توں معاہدے کو منظور کر لیا۔ اسی قسم کے معاہدے کی پیشکش ہندوستان کو بھی کی گئی مگر ہند نے چند وضاحتیں طلب کیں اور اس معاملے میں مزید مہلت مانگی۔ مگر پاکستان کی طرف سے ریاست جموں و کشمیر کو غصب کرنے کا منصوبہ پہلے ہی تیار کیا جا رہا تھا۔ جموں کے توں معاہدے کی خلاف ورزی کی گئی۔ ریاست پر موثر اقتصادی ناکہ بندی عائد کی گئی جس سے اشیائے ضروریہ کی قلت پیدا ہو گئی۔ اکتوبر کے آخر میں وادی کشمیر کی صورت حال کا اندازہ روزنامہ "ہون" میں شائع ۲۴ اکتوبر کی رپورٹ سے جو مسکا ہے جس میں

اطلاعات موصول نہ ہوتی ہیں تو پاکستانی ارادوں کو ظاہر کرتی ہوں اور اس جانب اشارہ نہ کرتی ہوں کیا پاکستان کے منصوبے جارحانہ ہیں۔ مغربی پنجاب اور فریٹر پاکستانی حملہ آور فرحت حاصل کرنے والے سیا توں کے بھیجس میں وادی میں آگئے۔ نہ ہر بلا پر وینگز مڑہ کرنے کے علاوہ وہ پھرے بازی اور آگ زنی کرنے والے دستے منظم کر رہے تھے ہر جگہ خطرناک جناح ٹوپیاں نظر آتی تھیں اس کے ساتھ ہی ریاستی افواج کو یکسر کرنے کے مقصد سے گلگت سے لے کر میر پور تک چھوٹی چھوٹی جھڑپیں کرنا شروع کر دیں۔ ریاستی افواج کی پوری تعداد نو سو اڑھائی سو اور دو پہاڑی ٹوپ خاتون پر مشتمل تھی ۲۲ اکتوبر کو باقاعدہ پاکستانی فوج کی حمایت سے ایک مکمل قبائلی حملے کا آغاز کر دیا گیا ان قبائلیوں میں افریز مود اور پاکستان کے باقاعدہ فوجی شامل تھے۔ رضا کا ز اور مہاراجہ کی اکرخان کی کمان میں سرگرم عمل تھے۔ یہ شیعہ پاکستانی فوج کا بیجر جنرل تھاجے جنرل طارق کا کوڈ نام دیا گیا تھا۔ اس معاملے میں ریاستی حکومت بالکل تیار نہ تھی اور حالات اس قدر روگردان تھے کہ کش لنگا پل کو اڑانے کے لئے ڈاٹنا مائٹ دستیاب نہیں تھا۔ ۲۳ اکتوبر کو منظر آباد ہاتھ سے نکل گیا۔ اس وقت مہاراجہ کی صورت حال کی سنگینی کا احساس ہوا۔ ۲۴ اکتوبر کو مہاراجہ نے حکومت ہند کو امداد کے لئے دسائی کی۔ اسی روز حملہ آوروں نے مبارہ بجلی گھر پر قبضہ کر لیا۔ اور سرنگر شہر تاریکی کے عالم میں ڈوب گیا۔ اس سے اگلے روز منسٹری آف ہیشس کے سیکریٹری وی پی این نے سرنگر تک پرواز کی تاکہ وہ صورت حال کا جائزہ لے سکے لیکن نہ طرست میں صورت حال کے سکوت کو محسوس کیا۔

الحاق

وی۔ پی این کے ساتھ تبادلہ خیالات کے بعد مہاراجہ حکومت ہند سے فوری امداد طلب کی اور ان کے ساتھ الحاق کی پیشکش کی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ۲۶ اکتوبر کے خط میں مہاراجہ نے کہا:- "میری ریاست میں روزنامات کے پیش نظر ہنگامی صورت موجود ہے۔ میرے سامنے کوئی چارہ نہیں کہ مملکت ہند سے امداد طلب کروں۔ یہ ایک قدرتی امر ہے کہ یہ امداد میری ریاست کے مملکت ہند کے ساتھ الحاق کے بغیر پیش نہیں ہو سکتی چنانچہ میں نے ایسا کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور میں آپ کی حکومت کی منظوری کے لئے دستاویز الحاق منسلک کرتا ہوں۔"

الحاق کو منظور کرتے ہوئے، ۲۷ اکتوبر کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مہاراجہ کو لکھا۔ "آپ کی ذات عزت مآب کی طرف سے مذکورہ خصوصی حالات میں میری حکومت نے کشمیر کے مملکت ہند کے ساتھ الحاق کو منظور کر دیا ہے۔"

یہ قبائلی دنیا بھر میں سخت ترین اور عالم ترین مہاراجہ تصور کئے جاتے تھے۔

یہ مہاراجہ کا ایک خاصہ تھا جس نے اسلام کے لازمی خطا میں سے ساداری کے ساتھ لڑائی کی۔

کیا ہے میری حکومت کی یہ تہا ہے کہ جس قدر جلدی امن و انتظام کے حالات کشمیر میں بحال ہو جائیں اور سرزمین حملہ آوروں سے پاک ہو جائے کشمیر کے الحاق کا سوال تمام کو پیش کر کے حل کیا جھلے۔ دیں اثناء آپ کی ذات عزت مآب کی فوجی امداد کی اپیل کے بارے میں آج کاروائی کی جا چکی ہے تاکہ انڈین آرمی کے دستے روانہ کئے جاسکیں جو آپ کے علاقے کے تحفظ کے لئے آپ کی فوج کی مدد کریں اور آپ کی رعایا کے جان و مال کے حفاظت کر سکیں۔

ریاست کو بچانے کا کام

۲۲ اکتوبر سے رونما ہونے والے واقعات کے پیش نظر سب سے اہم وقت کا تقاضہ تھا۔ ایک ایک منٹ کی قدر تھی۔ ریاستی فوجیں اگرچہ مسلم فوجیوں کے بھاری تعداد میں ترک کر جانے کی وجہ سے مغلوب تھیں پھر بھی انہوں نے اوٹری کے محاذ پر برگڈیر راجندر سنگھ کی کمان میں آخری شخص اور آخری گولی تک مقابلہ کیا۔ اس سے دو دو دلوں کے لئے حملہ آور کی پیش قدمی ٹک گئی۔ پسپا ہوتی ہوئی فوجوں نے اوٹری کے پل کو بھی اڑا دیا۔ پتہ ناچہ مرد ایک دن کی مہلت حاصل ہو گئی۔ برگڈیر راجندر سنگھ ایک جانب از بہادر کی مانند جان بحق ہوا اور ریاست کو بچانے میں اس نے اپنا نمایاں حصہ ادا کیا۔ دوران مہاراجہ کو ہندوستان سے امداد طلب اور حاصل کرنے کا موقع مل گیا۔ ۲۶-۲۷ اکتوبر کو بارہمولہ حملہ آوروں کے ہاتھ چلا گیا۔ اپنی وحشیانہ عادتوں سے مغلوب و بیخبر ہونے پر وہ لوٹ قتل آگ زنی اور عصمت دری میں بٹ گئے۔ فادرشیکس کے مطابق سیاہ فام قومی بھڑیلوں کی مانند قبائلی گولیاں دافٹے ہوئے قصبے کی طرف پہاڑیوں کی دونوں سمتوں سے نیچے کی طرف بڑھتے رہے۔ ایک ۲۰ سالہ ہندوستانی نرس بھلی مینا نے ایک ایک ایسی مسلم لڑکھ کو بچانے کی کوشش کی جو حال ہی میں چنگو سفارہ صغر ہوئی تھی پہلے اس کا قتل کیا گیا، اس کے بعد لڑکھ کو موت کی نیند سلا دیا گیا۔ یہاں تک کہ سینٹ جوزف کالونٹ کو بھی تباہ کر دیا گیا۔ اسٹیٹ مدربر اور تین ننس کو بے رحمی کے ساتھ قتل کیا گیا۔ بارہمولہ کا دورہ کرنے کے بعد نیویارک ٹائمز کے نمائندہ نے لکھا: بچے کھپے باشندوں کے بتائے ہوئے اندازے کے مطابق ۳۰۰۰ کے قریب ان کے شہری رقبے بشمول چار ٹوہری اور اپنی حاملہ بیوی سمیت ایک رہنما ٹوہری طاؤزی افسر قتل کر دیے گئے۔ حملہ آوروں کو شاید ہی اس بات کا احساس تھا کہ وحشیانہ جرم کرنے میں جو وقت انہوں نے صرف کیا ہے وہ ان کو سزا کے مترادف ہو جائے گا۔ اس سے ہندوستانی فوجیں سرنگر ہوائی اڈہ پر ۲ اکتوبر کو اترنے اور دشمنوں کو بھاری جانی نقصان پہنچانے کے بعد واپس دھکیلنے کے قابل ہو گئیں۔

۲۷ اکتوبر کے روز ہندوستانی ہوائی فوج کے چند جہازوں نے سرنگر پر طواف کیا جو ہندوستانی بڑی

فوج کے لفٹینٹ کرنل رنجیت رائے کی کمان میں وہاں لائے تھے کیونکہ یہ بات بھی یقینی نہیں تھی کہ سرنگر ہوائی اڈہ ابھی تک ریاستی فوجوں کے قبضے میں تھا۔ ہوائی جہاز کے اترنے پر لفٹینٹ کرنل رائے نے اپنے چھوٹے سے دستے کی بارہمولہ تک رہبری کی اس نے پٹن کے نزدیک دفاعی خدقیں کھودیں اور بارہمولہ کے نزدیک دشمنوں کو مقابلے میں مصروف کر دیا۔ اس شجاعت کے کارنامے میں اسے اپنی جہان سے ہاتھ دھونا پڑے مگر اس سے دشمنوں میں اخراجی پھیل گئی۔ انہوں نے سمجھ لیا کہ ہندوستانی فوج بھاری تعداد میں پہنچ چکی ہے۔ ایک اور دلہراہ کاروائی میں میجر سوم ناتھ شرمہ نے حملہ آوروں کو بڑا کام میں لے لیا کیونکہ وہ سرنگر ہوائی اڈے کے بالکل نزدیک پہنچ چکے تھے۔ (۳ نومبر) اسے، کی نسبت اکامفت ابلہ تھا مگر اس نے بے مثال حرأت کے ساتھ مقابلہ کیا اور دشمنوں کا بھاری جانی نقصان کیا۔ وہ ہلاک ہو گیا۔ اسے بعد از مرگ پریم ویر جگر عطا کیا گیا۔ پہلا ہندوستانی تھا جسے اس سرزمین کا بہادری کا سب سے بڑا اعزاز ملا۔ اسی دوران ملک پہنچ گئی اور سرنگر ہوائی اڈے کو محفوظ کر لیا گیا۔ تین بہادری سپاہیوں۔ لفٹینٹ کرنل رنجیت رائے، میجر سوم ناتھ شرمہ اور برگڈیر راجندر سنگھ کی قربانی نے کشمیر کے بچاؤ میں اہم حصہ ادا کیا ہے۔

اچھو طرح سے مرتب ایک عملی منصوبے کے مطابق برگڈیر مین نے حملہ آوروں کو شانانگ کے نزدیک اپنے حال میں کھینچی اور ۵ نومبر کو ان پر تین جانب سے حملہ کر دیا اس میں ہندوستانی ہوائی فوج نے ان کی مدد کی۔ حملہ آوروں کو پسپائی ہوئی ان میں سے تین تھوڑے مھے۔ اخراجی کے عالم میں وہ بجاک کھڑے ہوئے۔ شانانگ کی لڑائی ۱۲ نومبر کو فیصلہ کن ثابت ہوئی اس کے بعد سرنگر پر منڈلاتے ہوئے تمام خطرات مٹ گئے تین دن بعد پیش قدمی کرتی ہوئی ہندوستانی افواج نے بارہمولہ پر دوبارہ قبضہ کر لیا مگر ٹوہریوں کی قلت کی وجہ سے اس نازک لمحے پر ان کی مزید پیش قدمی ٹک گئی ورنہ انہوں نے میرپور اور مظفر آباد کو بھی حاصل کر لیا ہوتا۔ دشمن کی پسپائی کا عمل قریباً شروع ہو چکا تھا۔

وادی کے شمال میں بھالیہ اور قراقرم کے دامن میں فوجی لحاظ سے اہم علاقہ گلگت پاکستانیوں نے نصب کر لیا تھا برطانوی حکومت بعد نے ۱۹۳۵ میں مہاراجہ کو عملی طور پر اس بات کے لئے مجبور کر دیا تھا کہ وہ فوجی لحاظ سے اہم یہ علاقہ ساٹھ برسوں کے لئے انہیں پتے پر دے دے ہندوستان سے بادشاہت کے خاتمے کا حلیہ رکھتا ہے کہ وہ انہوں نے یہ علاقہ مہاراجہ کو واپس دے دینے کا فیصلہ کر لیا۔ مہاراجہ نے برگڈیر مینر گھنسا رائے کو لداخ کا گورنر مقرر کیا۔ پاکستان کی ایماء پر ۱۷ اکتوبر کو مسلم فوجی افسروں نے بناموت کردی اور گورنر کو قید کر لیا۔ ایک برطانوی افسر اور گورنر کا نائب مقرر ہونے لگا۔ ۲۷ نومبر کو پاکستانی پرچم لہرایا۔

بہت سے ڈوگرہ افسروں کو حالات کی حقیقت کی کچھ نہیں تھی، انہیں اس بات کا قطعی علم نہیں تھا کہ مسلم لیگ کا پروپیگنڈہ مسلم فوجیوں کے نظم و ضبط اور ان کی وفاداری پر غالب آچکا ہے مثال کے طور پر کرنل ہری

سنگہ کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے مسلم سپاہیوں کو غیر مسلح کر دے مگر وہ اس خیال سے نالاں ہو گیا۔ وہ اس بات کو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جو فوجی جنگ عظیم کے زمانے میں اس کے ساتھ شانہ بشانہ لڑ چکے ہیں اُسے دھوکہ نہیں دے سکتے۔ مگر انہوں نے دھوکہ دے دیا حالات کو صحیح طور پر سمجھنے میں ناکام رہے ہر کرنل ہری سنگھ کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اُسے نیند میں ہی قتل کر دیا گیا۔

پاکستانی حملہ آوروں نے لڈاخ پر قبضہ کرنے کی بھی کوشش کی مگر ہندوستانی ملٹری کی بہتر حکمت عملی اور بہت کی وجہ سے اسے بچا لیا گیا۔ اس باسے میں دو جہازات مندانہ کاروائیاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے ایک ایئر کومڈر ہر سنگھ ۲۴ مئی ۱۹۴۸ء کو دہلیت گن کارنامہ ہے جس میں اس نے بلا آکسیجن ۲۳۰۰ فٹ کی بلندی پر اپنے جہاز کی پرواز کی تو کہ اب تک انجانہ راستہ تھا۔ اور ۱۱۵۵۵ فٹ کی بلندی پر واقع ہماچل لیمہ ہوائی پٹی پر اپنا جہاز اتارنا اس کارنامے کی بدولت ہوائی جہاز کے ذریعے لیہ تک ہندوستانی فوجوں کو پہنچانے کا کام اور لڈاخ کا دفاع ممکن ہو سکا جو ابھی تک پاکستان کے رحم و کرم پر تھا۔ دوسرا جہاز گن کارنامہ یہ تھا کہ میجر جنرل تھیانے ۱۱۵۴۸ فٹ بلندی پر واقع ہرفوش درہ زویا پر یکم نومبر ۱۹۴۸ء کے روز سینک پہنچائے اس کے افسروں نے حملہ آوروں پر اپنا ٹانگ پلٹا کر دی۔ اور ان کے ۲۵ مورچے تباہ کر دیئے۔ جنرل تھیانے اس کارنامے کا موازنہ جی بل کے اس کارنامے سے کیا گیا جس میں اُس نے اپنے ہاتھ پیریں سمیت اپس پہاڑ عبور کیا تھا اب تک کسی بھی شخص نے اتنی بلندی اور دشوار حالات میں میٹنگ نہیں پہنچائے تھے۔

اقوام متحدہ تک: دوسری غلطی

یکم جنوری ۱۹۴۸ء کو ہندوستان نے معاملہ اقوام متحدہ تک لے گیا۔ ۱۲ جنوری کو پاکستانی حملے پر پردہ پوشی کے لئے آزاد کشمیر کے صدر ابراہیم خان نے اعلان کر دیا کہ کشمیر کو آزاد کرانے کے مقصد سے ۹۹۰۰۰ رضا کاروں کو تربیت دی جا رہی ہے۔

اقوام متحدہ تک معاملہ لے جانے دوسری غلطی تھی۔ یہ معاملہ بین الاقوامی اقتدار کے سیاسی جال میں اُلجھ کر رہ گیا۔ ہر مرحلے پر ہندوستان کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور کشمیر کا معاملہ اقوام متحدہ کی فہرست کا قریباً مستقل ندامت بن کر رہ گیا۔ اپنی شکایت میں ہندوستان نے کہا۔

”چونکہ حملہ آور پاکستان سے حمایت حاصل کر رہے ہیں چنانچہ یہ فعل ہندوستان پر حملے کے مترادف ہے چنانچہ بین الاقوامی قانون کے تحت ہندوستان اس باسے میں حق بجانب ہے کہ وہ اپنی فوجیں پاکستانی علاقہ میں بھیجے تاکہ حملہ آوروں کے ساتھ موثر طور پر نمٹا جاسکے“

پاکستان نے ان الزامات کی تردید کی۔ اس کے وزیر خارجہ سید ظفر اللہ نے سلامتی کونسل کے سامنے اپنی تقریر میں کہا کہ پاکستان اس بات سے انکار کرتا ہے کہ اس نے نام نہاد حملہ آوروں کو امداد، ماحول فراہم کیا۔ ہندوستان

کے خلاف کسی قسم کی جارحانہ کارروائی کی ہے۔“

اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی ۱۴ اپریل ۱۹۴۸ء کی قرارداد کی رو سے قائم ہندوستان اور پاکستان میں اقوام متحدہ کمیشن قائم کیا گیا۔ مگر جب یہ کمیشن کراچی پہنچا تو پاکستان نے اپنے دفاع کے لئے ماہ مئی سے اپنی فوجوں کی موجودگی کو تسلیم کر لیا۔ سراوون ڈکسن جو بعد ازاں ہند پاک کمیشن کی جگہ اقوام متحدہ میں نمائندہ بن گیا کامشاہدہ ہے۔ جب جموں و کشمیر کی سرحد جارح عناصر کی طرف سے عبور کی گئی تو یہ بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی تھی۔ جب مئی ۱۹۴۸ء میں پاکستانی فوجوں کی پونیشیں ریاستی علاقے میں داخل ہو گئیں تو یہ بات بھی بین الاقوامی قانون کے منافی تھی۔“

اقوام متحدہ سلامتی کونسل نے کشمیر پر قراردادیں منظور کیں پہلی قرارداد جنوری ۱۹۴۸ء میں منظور کی گئی جس کے مطابق دونوں حکومتوں سے تعلیق کی گئی کہ وہ حالات کو بہتر بنائیں۔ ۱۴ اپریل ۱۹۴۸ء کو منظور کی گئی۔ قرارداد دوم میں ایک ۵ رکنی کمیشن قائم کرنے کی سفارش کی گئی تھی۔ اس پر ضمیر کا دورہ کرے گا۔ اور ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کے مابین ثالثی کرنے میں غیر سگالی کرے گا۔ تیسری قرارداد ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء کو پاس کی گئی۔ جو نہایت اہم نوعیت کی ہے۔ اس قرارداد کے تین حصے ہیں۔ حصہ اول کا تعلق جنگ بندی کے ساتھ ہے۔ حصہ دوم پاکستان پر یہ لازم قرار دیتا ہے کہ وہ اپنی باضابطہ اور بے ضابطہ دونوں قسم کی فوجیں واپس بلا لے اور حصہ سوم میں درج ہے کہ ہند اور پاکستان کی حکومتیں اپنی اس خواہش کا اعادہ کرتی ہیں کہ ریاست جموں و کشمیر کے مستقبل کے متعلق اس سے عوام کی مرضی کے مطابق کریں گی۔ اور جنگ بندی کے معاہدے کو منظور کرنے کے بعد دونوں ملکوں کی حکومتیں کمیشن کے ساتھ اس امر پر مشورہ کرنے پر آمادہ ہوں گی کہ اس مرضی کے آزادانہ اظہار کو یقینی بنانے کے لئے غیر جانبدار اور سازگار ماحول پیدا کریں گی۔ چوتھی قرارداد تیسری کا محض حصہ تھی۔

بعد ازاں حکومت ہند کا موقف یہ تھا کہ حصہ سوم پر عمل کا سوال اُسی صورت میں پیدا ہوتا ہے جب حصہ اول اور حصہ دوم پر عمل کیا جائے۔ اس سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہندوستان نے جب یکم جنوری ۱۹۴۹ء سے جنگ بندی کرنا منظور کر لیا تو ہند اور پاکستان کے لئے اقوام متحدہ کے ساتھ گفت و شنید اور خطوط کتابت کے دوران اُسے چند یقین دہانیاں کی گئی تھیں۔ ان یقین دہانیوں کی فہرست حصہ ششم میں درج ہے۔ ان یقین دہانیوں میں ایک کے مطابق اگر ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء کی قرارداد کے حصہ ایک اور دو پر پاکستان کی طرف سے عمل نہیں کیا گیا تو ہند پر مجبورہ رائے شماری کی پابندی نہیں ہوگی۔“

۲۱ مئی ۱۹۴۹ء کو ۱ پٹ مرل نمٹنے کو رائے شماری ایڈمنسٹریٹر مامور کیا گیا جنگ بندی لائن کے متعین اور اس کی نگہداشت میں معاونت کے مقصد سے اقوام متحدہ فوجی مشاہدین کا ایک گروپ بھی بھیجا گیا۔ ۲۴ جولائی ۱۹۴۹ء کو کراچی معاہدے کو تشکیل دی گئی جس کے مطابق سلامتی کونسل کے صدر جنرل میکناٹھ نے اس تمام علاقے

سے وسیع پیمانے پر فوجیں بٹانے کی تجویز علیحدہ طور پر پیش کی۔ چونکہ اس تجویز میں ہند اور پاکستان اپنی حملہ آور اور معتبوب کو ایک ہی سطح پر رکھا گیا تھا اس نے عملی طور پر اس امر کو نظر انداز کر دیا کہ ہندوستان کے ساتھ کثیر الحاق قانونی طور پر جائز اور مکمل ہے۔ مگر اسی حقیقت کو اقامتِ متحدہ کشین کے قانونی مشیر نے جائز قرار دیا تھا۔ ہندوستان نے اس کو مسترد کر دیا کیونکہ اس کی تجویز ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء کے سلامتی کونسل قرارداد کے مطابق تھی۔

۱۴ مارچ ۱۹۵۰ء کو سلامتی کونسل نے کشین کے ایک نمائندے کو اپنا کام کرنے کے لئے مامور کیا۔ اس کام کو اپنے ذمہ لینے والا پہلا شخص سراوون ڈکسن تھا۔ ڈکسن کے ساتھ گفت و شنید کے بعد اس نے جو تجاویز مرتب کیں وہ ڈکسن پلان سے موسوم ہیں۔ اس کی ریاست کو فوجی تقسیم کیا جانا مقصود تھا۔ تمام علاقے کو تین حصوں میں تقسیم کیا جانا تھا۔ (i) وہ علاقہ جس کی بابت بالکل کوئی شک و شبہ نہیں کہ وہ ہندوستان کے ساتھ الحاق چاہتا ہے۔ (ii) وہ علاقہ جو پاکستان کے ساتھ الحاق چاہتا ہے (iii) وہ علاقہ جہاں کے عوام کی خواہشات اور آئینوں کے بارے میں شک ہے۔ اس کی سفارش تھی کہ صفر ذمہ بزمین کے تحت آنے والے علاقوں میں ہی رائے شماری کرائی جائے۔

ہندوستان اور پاکستان دونوں نے ڈکسن منصوبے کو مسترد کر دیا۔ اپریل ۱۹۵۱ء میں سلامتی کونسل نے ایک اور نمائندے ڈاکٹر گرامن کو مقرر کیا۔ اس نے دو برس تک محنت کی مگر اس کی تجاویز کو بھی دونوں ملکوں نے مسترد کر دیا۔ اور تھل کی حالت جاری رہی۔

۱۹۵۳ء کے بعد ہندوستان نے بار بار عالمی برادری کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرائی کہ پاکستان کو امریکہ کی طرف سے فوجی امداد کی منظوری اور اس کے مغربی ہلاک کے ممکن بن جانے کے باعث حالات میں نمایاں تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ اقوام متحدہ میں سخت مباحثوں کے ابتدائی دور میں سوویت یونین نے سردہری دکھائی مگر جب دنیا اقتدار کے دو اہم ہلاکوں میں منقسم ہو گئی اور پاکستان مغربی ہلاک میں شامل ہو گیا۔ تو ہندوستان کو سوویت یونین کی طرف سے زبردست حمایت حاصل ہو گئی جنوری ۱۹۵۲ء میں سلامتی کونسل میں سوویت ڈیلیگٹ نے امریکا اور برطانیہ پر الزام لگایا کہ وہ کثیر کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کر رہا ہے اور واضح کیا کہ اس مسئلے کو ریاست کی دستور ساز اسمبلی حل کرے گی۔ دسمبر ۱۹۵۵ء کے دوران کثیر میں بلٹھن اور خروخوٹ کے دورے کے بعد یہ حمایت مکمل طور پر پختہ ہو گئی۔ موخر الذکر نے اعلان کیا کہ کثیر کا سوال ہندوستان کی ایک ریاست کا سوال ہے اور اس کا فیصلہ پہلے ہی کثیر کے عوام کر چکے ہیں۔

سیاسی واقعات

ہونے لگے اور یہاں پر بھاری تبدیلیاں عمل میں آئیں۔ ریاست کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کے بعد ہمارا جسے شیخ عبداللہ کو ایم جی ایڈمنسٹریشن سے موسوم ادارے کا سربراہ مقرر کیا۔ ۳۰ مارچ ۱۹۴۸ء کو اسے وزیر اعظم مقرر کیا گیا اور اس کے ساتھ وزراء کی کونسل بھی قائم کی گئی اس سے اسے عملی طور پر حکومت کے تمام اختیارات حاصل ہو گئے۔ ایک سیاسی تجربہ کار کے مطابق "جہاں کہیں ہمارا جب کے ساتھ مشورے کی ضرورت ہوتی اس پر رعب جمایا جاتا اور جہاں اسے مطلع رکھنے کی ضرورت ہوتی اسے نظر انداز کر دیا جاتا۔" جو بھی جائز یا ناجائز حرکت شیخ عبداللہ کرتا اسے جواہر لال نہرو کی مکمل حمایت حاصل ہوتی اور سردار پٹیل نمل کر رہ جاتے ہمارا جہ نہ صرف اقوام متحدہ میں بھٹنے والی کاروائی بلکہ شیخ عبداللہ کے جارحانہ رویے سے بھی کافی برہم تھا۔ ۳۱ جنوری ۱۹۴۸ء کو اس نے مرکزی وزیر داخلہ کو ایک خط ارسال کیا جس میں اس نے اپنی مایوسی کو ان الفاظ میں بیان کیا "میرے سامنے صرف ایک ہی ممکنہ متبادل ہے کہ الحاق کو واپس لے لوں" اور یون آؤ کی مداخلت کو ختم کر دوں کیونکہ جب الحاق ہی واپس لے لیا جائے تو حکومت ہند کو کونسل کی کاروائی جاری رکھنے کا کوئی جواز نہیں رہے گا اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ الحاق سے قبل کی صورت حال واپس آ جائے گی۔" شیخ کے توہین آمیز سلوک کی شکایت کرتے ہوئے ہمارا جہ نے وزیر داخلہ کو اپنے ۲۰ اپریل کے خط میں لکھا۔

"میں ان سنگین اور بے بنیاد الزامات کی بات کرتا ہوں جو پھر لگائے جا رہے ہیں کہ میں رات کے اندھیرے میں دارالحکومت سے چلا آیا اور ملکوں میں بھر کر فریخ اور دوسرا ساز و سامان بھی ساتھ لے آیا ہوں" طور پر میں نے ان الزامات کو مسترد کر دیا ہوتا مگر مجھے اس بات کا نہایت رنج اور انوس ہو رہا ہے کہ اپنے موجودہ وزیر اعظم کی زیادتی ان الزامات کا اظہار ہوا ہے۔

۱۹۴۹ء کو سردار پٹیل کے نام تحریر کردہ اپنے خط میں ہمارا جہ نے کہا۔ میرے لئے آپ سے اپنے اس پوشیدہ احساس کو دہانے رکھنا واجب نہیں ہو گا۔ شیخ عبداللہ کو اپنے تحریر سے وعدوں سے جب بھی اس کا ارادہ ہو مگر جانے کی اس وفاداری کے خلاف عمل پیرا ہونے کا پتہ جیل سے رہائی سے قبل جس کا وعدہ اس نے کیا اور اس حلف وفاداری کی جس نے عہدہ سنبھالا اور اپنے رفقاء کے ساتھ ریاست کے اندر اور باہر بھر بھر کچرا پھیلانے اور فتنے بدنام کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ مجھے اس مرتبے سے بھی بار بار شایا جاہر ہا ہے جو میرے خیال میں مجھے ریاست کی وزارت کے مشورے کی رو سے حاصل ہے۔

ہمارا جہ کو عملی طور پر ذلیل کیا گیا اور اسے ریاست ترک کر جانے پر مجبور کیا گیا۔ خبر یہ کہ بعض پردہ پوشی مٹی مگر یہ تو جبریہ دخل کا ایک معاملہ تھا۔ ۹ جون ۱۹۴۹ء کو ہمارا جہ نے ایک اعلان جاری کیا جس کی رُو سے تمام اختیارات ڈاکٹر کرن سنگھ کو دے دیے گئے۔ شیخ عبداللہ نے کرن سنگھ کی منظوری کو معروض بھیجا اور تمام قسم کے فیصلے کرتا رہا حالانکہ کوئی متغیر قانون ساز یہ بھی نہیں تھی جس کو وہ جواب دہ ہوتا۔

آئینی توقعات

۴ دفعہ ۲۰ کی رُو سے ریاست جموں و کشمیر کو خصوصی اختیارات دیے گئے۔ یہ دفعہ اُسی وقت سے متنازعہ رہی ہے ریاست کا اپنا آئین ہے حالانکہ یہ آئین ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ کو اپنایا گیا تاہم اس کے اغراض و مقاصد نیشنل کانفرنس کی ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۰ کی قرارداد میں واضح کئے گئے۔ اس قرارداد میں کہا گیا ہے کہ ہم اقوام متحدہ کی اس ناکامی پر تشویش کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ جارحیت سے ہونے والی نقصانات کا دوا کرنے میں ناکام رہی ہے جس کے ریاستی عوام بہم شکار ہیں۔ اس کے خیال میں یہ ناکامی پاکستان کو دی گئی۔ رعایات کے موجب میں جو اس کی انتہا پسندی کے انعام کے طور پر دی گئی ہیں۔ اب وہ وقت آچکا ہے جب عوام کی طرف سے پہل کی جانی چاہیے۔ تاکہ — غیر یقینی اور فیصلے کے فقدان سے بیدار شدہ صورتحال کو ختم کیا جاسکے۔

یکم مئی ۱۹۵۱ کو یو راج نے ایک اعلان جاری کیا جس کے تحت دستور ساز اسمبلی کی تشکیل کی گئی جو کہ انتخابی اضلاع سے منتخب ہوگی۔ ہر ایک انتخابی ضلع آبادی کے ہر ۱۰۰۰۰ قطعے سے وضع کیا جائے گا۔ وسط اکتوبر ۱۹۵۱ میں انتخابات عمل میں لائے گئے۔ تمام ۵ نشستوں پر نیشنل کانفرنس فتحیاب ہوئی۔ سوشلسٹوں پر بلا مقابلہ اور ۲ پر مقابلے کے بعد اسے کامیابی ملی جنوں میں پیرچریشد نے ان انتخابات کا بائیکاٹ کیا۔ ۳۱ اکتوبر کو دستور ساز اسمبلی کا اجلاس مولانا مونسوی کی صدارت میں منعقد ہوا اور اس نے بحث و تمحیص شروع کی۔

تین واقعات

۲۴ اکتوبر ۱۹۵۰ کو دستاویز الحاق پر غلدرگند ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ کو آئین ہند کے پاس ہونے پر ریاست جموں و کشمیر کو ناقابل تیسخ طور پر ہندوستان کی آئینی اور علاقائی حدود کے تحت لایا گیا مہاراجہ کی طرف سے استعمال کئے جانے والے اختیارات بھی ختم ہو گئے۔ وقت کے اس مرحلے پر تین واقعات ایک ساتھ رونما ہو رہے تھے۔ ان میں سے ایک کا تعلق سیاسی اور آئینی معاملات کا حل اور دوسرا پیرچریشد کی ایجنڈیشن اور تیسرا آنا کشمیر حاصل کرنے کیلئے شیخ عبداللہ کے اندرونی جھکاؤ کا سامنے آ جانا۔

دہلی معاہدہ

جہاں تک سیاسی اور آئینی معاملات کا تعلق ہے بنیادی سوال یہ تھا کہ ریاست کا آئینی مرتبہ کیا ہوگا اور آئین ہند کی رویتیں سیاسی، قانونی اور مالی ڈھانچے میں اس کا کیا مرتبہ ہوگا۔ شیخ عبداللہ کی اپنے اور اپنے قواریوں کے لئے شیخ سلطنت قائم کرنے کی پہنچاں خواہش اور استواب رائے کے اہتمام کے باوجود ہندوستان کی مشکلات کے استحصال کے لئے اپنی پراسرار ٹیکہ بازی کے باعث اس کے اور مرکزی رہنماؤں کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے۔ یہ اختلافات خاص طور پر بنیادی حقوق سپریم کورٹ، انتخابی کمیٹی، پکچر اور آڈیو جرنل کے اختیارات اور جنگی صورت حال سے متعلق دفعات وغیرہ کے بارے میں تھے۔ اس بارے میں حالانکہ بہت ساری تجویزیں مسوس ٹوکی گئیں مگر ان کا اظہار نہیں کیا گیا اس کے ساتھ ہی ایک وسیع تر معاہدہ ہے جسے دہلی معاہدہ سے موسوم کیا گیا طے پایا۔ اس کا اعلان نپرو نے پارلیمنٹ میں ۲۴ جولائی ۱۹۵۲ کو کیا۔ ۱۹ اگست کو ریاست کی دستور ساز اسمبلی نے بھی اسے منظور کر لیا۔

دہلی معاہدے میں جو باتیں شامل تھیں ان میں موروثی حکمرانی کا خاتمہ ریاست کو اجازت دے دینا، حقوق عطا کرنا، مستقل باشندگان ریاست کے لئے خصوصی حقوق کا جاری رکھنا، قومی پرچم کے ساتھ ریاست کے پرچم کا لہرایا جانا، نمایاں طور پر امتیازی رتبہ حاصل کرنا، بنیادی حقوق، صدر جمہوریہ کے جنگی اختیارات کی ریاست پر توسیع اور سپریم کورٹ کا دائرہ اختیار تھا۔

دہلی معاہدے کے اعلان کے بعد ریاستی دستور ساز اسمبلی نے موروثی حکمرانی کے ادارے کے خاتمے کا کام شروع کیا۔ اس بارے میں رسمی قرارداد ۲۱ اگست ۱۹۵۲ کو منظور کی گئی۔ ریاست کے سربراہ کو صدر ریاست کا عہدہ دیا گیا۔ اس کا انتخاب ریاستی قانون ساز اسمبلی کی طرف سے پانچ برس کے لئے ان افراد میں سے کیا جانا مقصود ہے جو مستقل باشندہ ریاست درجہ اول ہوں اس کی منظوری صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے حاصل ہونا تھی اور وہ اس عہدہ پر اسمبلی کی سرپرستی پر کام کر سکتا ہے۔

پیرچریشد تحریک

ہندوستانی رائے عامہ کا ایک کثیر حصہ ایسا ہی تھا جو یہ بات محسوس کرتا تھا کہ شیخ عبداللہ کو نامناسب طور پر خوش کیا جا رہا ہے اور قومی مفادات کو قربان کیا جا رہا ہے۔ جموں کے عوام خاص طور پر نالاں تھے۔ انہیں ڈوگرہ خاندان کے خلاف تو بن آئین تو بہا مت برہمچاری خاص کی کوفت ہوئی۔ مثال کے طور پر ۱۹ جون ۱۹۵۲ کو دستور ساز اسمبلی میں بنیادی اصولوں سے متعلق کئی کی رپورٹ پر بولتے ہوئے شیخ عبداللہ نے کہا: "نیشنل کانفرنس کی قیادت میں عوام نے

اپنی جائیں قربان کیں، چیل گئے اور ان تنگ کوٹھڑیوں میں رہے جہاں سانپ اور بچھو رہتے تھے سینکڑوں کی تعداد میں خواتین کی بے ترحمی کی کئی ہزاروں لوگوں کو سیٹ کے بل ریگنا پڑا۔ اور ہزاروں لوگوں کا خون بہا اور وہ شہید ہو گئے۔ بدلے ہوئے حالات میں تو ہمت ناگوار تھیں چنانچہ ان توہمات کے سبب جموں میں تلخیاں بڑھیں۔ جموں کی انجی ٹیشن کی قیادت پر جہا پریشد سنگی۔ اس انجی ٹیشن کا ہم مدد تھا۔ ایک دیش میں دو دو چان (آئین) ایک دیش میں دولشان (پرچم) ایک دیش میں دو پر دھان (وزیر اعظم) نہیں چلیں گے۔

قوی سطح پر اس تحریک کو جن سنگھ کی زبردست حمایت حاصل ہوئی کیونکہ وہ جماعت دہلی معاہدے کی زبردست نکتہ چین تھی۔ اس کا رد عمل ان الفاظ میں تھا: شیخ عبداللہ نے اپنے نہایت ہی نا واجب مطالبات منوالے میں اور اپنی طرف سے کوئی خاص بات نہیں مانی ہے۔ نہرو کی طرف سے حاصل کی گئی ہر ایک رعایت ایک خود دود فہرے سے مگر وہ اسے بالکل کالعدم کر دیتی ہے۔ اس سے کشمیر ہندوستان کو حاصل نہیں ہو سکا۔ بلکہ جموں و کشمیر کی ترقی اور تحفظ کو خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ بھارتی جن سنگھ کے صدر رشیما پراساد مگر جو خود جموں و روادہ ہوئے جہاں انہیں ار می ۱۹۵۲ کو گرفتار کر لیا گیا۔ وہ اسیری کے دوران ہی ۲۳ جون کو انتقال کر گئے۔ اس سے شیخ عبداللہ کے خلاف قوی مسلح پرنٹ و پرنس کی لہر دوڑ گئی۔ نہرو اور شیخ عبداللہ کے درمیان مفاہمت کو کھلے عام نقصان پہونچا۔ مگر جی کا جسم خاکی کلکتہ لے جایا گیا جہاں اس شہر کی تاریخ کے سب سے بڑے جرم نے اپنے مافی جوس میں شمولیت کی۔ نہرو کی طرف سے کئے گئے دہلی معاہدے پر بھی پر جہا پریشد نے شدید نکتہ چینی کی۔ شیخ عبداللہ کے موقف میں بھی صداقت کا فقدان تھا۔ درحقیقت اسے موروثی حکمرانی کو ختم کرنے اور دہلی معاہدے کی دوسری مدت پر عملدرآمد کی اجازت دے دینا ایک اور غلطی تھی اگر اس بات پر زور دیا گیا ہوتا کہ اس معاہدے کے تمام حصوں پر ایک مشت عمل کیا جائے تو اس سے بعد از ان پیدا ہونے والی بہت ساری دشواریوں کو ٹالا جاسکتا تھا۔ جو کچھ اسے موافق آتا تھا اس پر عمل کروا کر شیخ عبداللہ نے اس معاہدے کی باقی ماندہ مدت کو دستور ساز اسمبلی کی ایک سب کمیٹی کے سپرد کر کے ہرنیٹال مٹول سے کام لیا یہاں تک کہ اس کے پرفریب طرز عمل سے نہرو کو بھی مایوسی ہوئی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کی غلطی بڑی گئی ہے۔ شیخ عبداللہ کے نام اپنے ۱۶ اور ۲۸ اگست ۱۹۵۲ کے خطوط میں اس نے اس امر افسوس کا اظہار کیا کہ اگر دہلی معاہدے میں کشمیری لیڈروں نے تبدیلیاں کیں تو پارلیمنٹ میں ان کی حالت دیگر نحو سے ہو جائے گی۔ ایک مرتبہ پھر ۲۸ جون ۱۹۵۳ کو اس نے شیخ عبداللہ کو لکھا: مجھے اس بات کی بھاری حیرت ہوئی ہے کہ ہمارے درمیان ہونے والے معاہدے کو بالائے طاق رکھا جائے یا اس سے منکر ہوا جائے۔ اس سے اعتماد کی تمام بڑیں کھو گئی ہو کر رہ جاتی ہیں میری عزت میرا وقار میرے وعدوں کے ساتھ بندھا ہے۔ مگر شیخ عبداللہ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ جس سے جس نہیں ہوا یہاں تک کہ اس نے تباہ کن فیالات کے لئے دہلی جانے سے بھی گریز کیا حالانکہ پینڈٹ نہرو نے ذاتی طور پر اسے دعوت دی تھی۔ اقتدار کا نشہ اور ایک خود مختار شیخ سلطنت کا خواب اسے مکمل طور پر جکڑ چکا تھا۔

خود مختار شیخ سلطنت

اسی دوران شیخ عبداللہ نے اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا تھا جسے نہرو کے سوائے ہر اس مرکزی رہنما نے محسوس کیا جو اس کے رابطے میں آیا، انہیں اس کے ہندوستان حامی اور یہاں تک کہ نہرو حامی چہرے پر بھی شک ہونے لگا۔ ۱۰ اپریل ۱۹۵۲ کو وزیر سنگھ پورہ میں اس نے ایک چار چاند تقریر کی جس میں اس نے ہندوستانی پریس اور یہاں تک کہ ہندوستانی حکومت پر دشنام طرازی کی۔ اس نے ان پر فقرہ پرست ہونے کا الزام بھی لگایا۔ ۲۲ جون کو اس نے کہا کہ کشمیر تعلقات ایک نازک مقام پر ہیں۔ ایک مرتبہ پھر ۱۳ جولائی ۱۹۵۲ کو یوم شہیدان کے موقع پر اپنی تقریر کے دوران اس نے اعلان کیا کہ ریاستی معاملات میں مرکزی حکومت کی مداخلت کو زبردستی نہیں کیا جائے گا۔ ۳۰ مئی ۱۹۵۳ کو امریکی سفیر ڈالائی سٹیونن شہادت دار دہونے اور شیخ عبداللہ کے ساتھ طویل ملاقات کی۔ اس سے شیخ کے ارادوں کے بارے میں شدید شبہات اور سو سے پیدا ہوئے۔ نیویا کے ٹائمز نے اپنے ۵ جولائی کے شمارے میں ایک نقشہ شائع کیا جس میں وادی کے لئے ایک خود مختار ریاست کا اشارہ دیا گیا تھا۔ ۱۰ جولائی کو جی ہد منزل میں تقریر کرتے ہوئے شیخ عبداللہ نے کہا: ایک وقت آئے گا۔ جب میں انڈین شیر بادشاہ دوں گا۔ ۱۳ جولائی کو یوم شہیدان پر تقریر کرتے ہوئے۔ اس نے ایک مرتبہ پھر کہا: یہ امر لازمی نہیں کہ ہماری ریاست ہندوستان یا پاکستان کی ڈم چھدن کر رہ جائے۔

اگر ان تمام باتوں پر کوئی طور پر زور کیا جائے۔ تو کسی کو بھی اس بات میں شبہ نہیں رہے گا کہ وقت کے اس مرحلے پر شیخ عبداللہ کشمیر کا خود مختار حکمران بننے کا خواب دیکھ رہا تھا اور اینگلو۔ امریکی ہلاک اس خواب کے بارے میں اس کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔ اس امر کی تصدیق کلینٹ ایٹلی کے ۱۱ نومبر ۱۹۵۳ کے بیان سے ہو جاتی ہے: کشمیر ہندوستان اور پاکستان کی ملکیت ہونا چاہیے بلکہ اسے آزاد اور خود مختار ہونا چاہیے: شیخ عبداللہ کے اس رویے سے مرکزی رہنماؤں کو بھاری تشویش ہوئی۔ اس سے ریاستی کابینہ میں بھی شدید مناقشات پیدا ہوئے۔ ۲۰ اگست ۱۹۵۳ کو کابینہ وزیر اعلیٰ اکثریت بشمول نائب وزیر اعظم بخشی غلام محمد نے اس پر غلام کے ذہن میں غیر تقبیت اور غلط پیدا کرنے کا الزام لگایا۔ صدر ریاست ڈاکٹر کرن سنگھ نے مشورہ دیا کہ کابینہ کی ایک قوی میٹنگ طلب کی جائے مگر شیخ نے اس مشورے کو نظر انداز کر دیا اور گھر گ چلا گیا۔ اس بات کا احساس ہو جانے پر کہ شیخ عبداللہ کے ارادے ناپاک ہیں صدر ریاست نے قوی طور پر اسے برطرف کر دیا اور اسے گھر گ میں گرفتار کر لیا گیا۔

۹ اگست کی علی الصبح بخشی غلام قہ کو وزیر اعظم کا حلف دلایا گیا۔ عہدہ نبھانے کے بعد ریڈیو سے اپنے نشری پیغام میں بخشی نے شیخ عبداللہ کے خلاف کاروائی کو حق بجانب قرار دیا اس نے کہا: ملکی مفادات سے فریب کاری کا عمل شروع ہو گیا تھا آزاد اور خود مختار کشمیر کا نعرہ نہایت گمراہ کن ہے ایک سامراجی طاقت کے زیر

اثر ایک آزاد اور خود مختار کشمیر ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کی آزادی اور خود مختاری کے لئے ایک سنگین خطرہ پیدا کر دے گا۔ یہاں پر ایک اور کوریہ بنایا جاسکتا ہے!

بخشی غلام محمد ایک موثر ایڈمنسٹریٹر تھے۔ شیخ عبداللہ کی نظر بندی کے دوران پیدا ہونے والی گڑبڑ کے ساتھ اس نے قحطی کے ساتھ منشا۔ گڑبڑ کے ان واقعات میں ۸۰ افراد کی جانیں تلف ہوئیں۔ اپنی سوانحیت اتھن چنار میں شیخ عبداللہ نے اموات کی تعداد ۲۰۰۰ سے ۳۰۰۰ کے درمیان بیان کی ہے وہ کہتا ہے: میری گرفتاری کی خبر سن کر بخشی غلام محمد کے خلاف مظاہروں کا لاوا سا پھوٹ پڑا۔ پولیس کی گولیوں سے ۲۰۰۰ سے ۳۰۰۰ کے درمیان کشمیری مارے گئے۔ مگر یہ دعویٰ نادرست ہے اور قحطی سنی سنائی باتوں پر مبنی ہے۔

بخشی غلام محمد اس بات کو سمجھ چکا تھا کہ یونین اور ریاست کے درمیان قابل عمل تعلقات قائم کرنے کے لیے دونوں کے مابین اتنی تعلقات کو نزدیک کرنا لازمی ہے۔ اس نے دہلی معاہدے پر عملدرآمد کے سلسلے میں ریاستی حکومت کے رخنامہ اندازی کے رویے کو ختم کر دیا۔ ۱۹۵۳ء کو پہلا حکم آئین قبول کر کے ریاست صدر جمہوریہ کی طرف سے جاری کیا گیا اس کی رو سے ریاست پر آئین ہند کی مختلف دفعات کو توسیع دے کر نافذ کیا گیا تھا۔ دوسرے اقدامات کا ذکر باب ششم میں کیا گیا ہے جو دفعہ ۳۰ پر پے یکم اپریل ۱۹۵۹ء کو ریاست میں داخلے پر عائد ریوٹ سسٹم ختم کر دیا گیا۔

بخشی کا سیاسی نظم و نسق کے ساتھ نمٹنے کا نہایت عملی طرز عمل تھا۔ جب ۱۹ اگست ۱۹۵۵ء کو مرزا محمد افضل بیگ تیسرے شیخ محمد عبداللہ کی نیک خواہشات کے ساتھ محاذ لڑنے کے لئے شمار کی بنیاد ڈالی تو اس نے منتظمین کو جیسے کرنے کی اجازت دے دی تاکہ ان کا فہرہ رنکل جائے۔

۸ جنوری ۱۹۵۸ء کو شیخ عبداللہ کو رہا کر دیا گیا۔ بہر حال ۲۱ فروری کو جب شیخ کی تقریر کے بعد اس کے حامیوں نے فسادات کروائے جن میں ایک شخص جان بحق ہو گیا اور ۲۱ مجروح ہوئے۔ تو بخشی نے سخت روش اختیار کی۔ اس نے فسادوں کو گرفتار کیا اور ان پر مقدمہ چلایا۔ ۲۰ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو ۸۰ میں سے ۶۸ ملزموں کو سیشن سپر کورٹ لایا گیا جن میں تین سابقہ میران پارلیمنٹ اور سابق نائب وزراء شامل تھے۔ ان پر حضرت بل میں فسادات اور قتل کے الزامات تھے۔

+ سرکاری ریکارڈ

۱۔ یہ سوانح حیات ہے اینڈر کے لچرل اادی کے سکریٹری محمد یوسف میٹنگ نے لکھی ہے۔ یہ ایک سرکاری ادارہ ہے جس کا صدر وزیراعلیٰ ہے۔ اس میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ جو کچھ بھی اس کتاب میں تحریر ہے شیخ عبداللہ نے بیان کیا ہے یا لکھا ہے۔ لیکن اس معاملے میں چند شبہات کا اظہار کیا گیا ہے بہر کیف بہت سے معاملات میں آتش چنار میں غلط بیانی کی ہے۔ اس میں مواد کا وہ ذریعہ بیان نہیں کیا گیا جس کی بنا پر مختلف دعوے کیے گئے ہیں۔

اس سے قبل ۲۹ اپریل ۱۹۵۸ء کو شیخ عبداللہ کو دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔ اس پر مرزا محمد افضل بیگ اور ۲۲ دیگر افراد پر کشمیر سٹارش کیس کا الزام لگایا گیا۔ انہوں نے ہتھیاروں پر پاکستان کی طرف سے ریاست کو یہ زور کشمیر غصب کرانے کی سازش کی تھی۔

بخشی غلام محمد کا نظریہ مثبت اور تعمیری تھا۔ اس کی وزارت اعلیٰ کے دوران ریاست کے تمام شعبوں خطوں میں اچھا خاصہ ترقیاتی کام ہوا۔

بہر حال بخشی غلام محمد میں تین معذوریات تھیں۔ اول اُسے کشمیر کا زکا فربہ کار سمجھا جاتا تھا۔ محاذ لڑنے شماری نے اس کے خلاف جاری ہاتھ پر ویگنڈہ کیا۔ دوئم نیشنل کانفرنس کے اندر اس کے مخالفین بار بار اس پر وار کرتے رہے اور اس کے خلاف نئی دہلی میں شکایتیں کرتے رہے۔ سوم بخشی غلام محمد کے گروہ بندی نے ذاتی اور سیاسی سرپرستی کا ایک نظام قائم کر لیا تھا اور وہ شدید کف پروری اور رشوت ستانی میں ملوث رہنے ان تمام معذوریوں کا مجموعی اثر یہ ہوا کہ بخشی غلام محمد کے خلاف شدید جارحیت اور تعینات کا ایک ماحول تیار کیا گیا اپنی بہادری دکھانے کے ایک دورے میں بخشی غلام محمد نے کامراج پلان کے تحت استعفیٰ دینے کی پیش کش کی حالانکہ وہ کانگریس تنظیم کارکن نہیں تھا۔ بھو ہلال نہرو نے اس کی پیش کش کو منظور کر لیا۔ اس نے ۱۹ اکتوبر ۱۹۶۳ء کو استعفیٰ دے دیا مگر جماعت پر بخشی کی گرفت مضبوط تھی مرکزی رہنماؤں کی خواہشات کے احترام کے طور پر اس نے اپنے ایک بھرتے شمس الدین کو قانون سازی پر پارٹی کا لیڈر منتخب کر لیا۔ شمس الدین وزیراعظم بن گیا اور بخشی پس پشت کام چلاتا رہا۔

بخشی کے مخالفین اور عام لوگوں کو اب اس بات کا اشارہ مل چکا تھا کہ چوٹی کی مرکزی لیڈر شپ اب اس پر فریفتہ نہیں تھی چنانچہ اس کے اور اس کے حامیوں کے خلاف جارحیت کا ماحول بڑھتا گیا۔ اور اس کا اظہار اس واقعہ میں ہوا جسے موئے مقدس یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس بال کا معاملہ کہا جاتا ہے۔ ۲۷ دسمبر ۱۹۶۳ء کو درگاہ حضرت بل سے موئے مقدس مناسبت پایا گیا۔ دریکچے کو توڑ کر موئے مقدس لے جایا گیا تھا۔ یہ خبر جنگل کی آگ کی مانند پھیل گئی اور ہجوم جمع ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قبر پر ہوجا تھا۔ دوکانیں بند ہو گئیں۔ بخشی غلام محمد کے بھائی کی ملکیت ایک ہوٹل ایک سینما گھر اور کوئٹہ باغ پولیس تھانے کو نذر آتش کر دیا گیا۔ انتظامی مشینری مغلوب ہو کر رہ گئی۔ حکومت ہند کے بھاری امداد میں افسر بشمول ڈائریکٹر انٹیلی جنس بیورو بی این ملک سرنگریہ پہنچ گئے اور امن بحال کرنے کی کوشش کی۔

بی۔ این ملک نے اعلان کیا کہ تفتیش سے معلوم ہوا کہ یہ چوری اندر کے کسی شخص کا کام ہے۔ اس نے اعلان

+ تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو باب ششم۔ شاخیں دفعہ ۳۷

+ ملاحظہ ہو باب پنجم۔ پوشیدہ بائیاں (عوامی رشوت ستانی)

کیا کہ درگاہ سے کچھ عرصے کے لئے پہرہ ہٹایا گیا ہے تاکہ وہ شخص جس نے یہ موئے مقدس اٹھایا ہے اُسے واپس اپنی جگہ رکھ سکے۔ ۲۸ جنوری ۱۹۶۳ء کو بالکل ایسا ہی ہوا مگر اس سے عوام کو اطمینان نہیں ہوا بہر حال ۳۰ فروری ۱۹۶۳ء کو سید میرک شاہ کی قیادت میں ۱۵ مسلم رہبانوں نے اعلان کیا کہ بال حقیقی ہے۔ چنانچہ راجی میٹیشن ختم ہو گئی۔ بہر حال اس بارے میں تمام بنیادی سوالات ابھی تک نشئی طلب ہیں۔ آیا یہ چوری کس نے کی؟ کیا یہ کام کسی پاکستانی ایجنٹ یا محاذ رائے شماری کے چند عناصر کا تھا یا موئے مقدس بخشی غلام محمد کی ایما پر جموں میں لیسٹر گر پر پڑی اس کی ماں کو دکھانے کے لئے لے جایا گیا تھا؟

بہر کیف اس واقعہ کے کشمیر کے سیاسی اور انتظامی ڈھانچے میں مہلک خامیاں سامنے آئیں مگر یہ قسمی کی بات ہے کہ کوئی ایسی حقیقی سبق نہیں حاصل کیا گیا اور اداراتی ڈھانچے کی اصلاح کے لئے کوئی عمل نہیں کیا گیا۔ صرف بیوند لگائے گئے۔ شمس الدین کو استعفیٰ دینا پڑا۔

۲۹ فروری ۱۹۶۳ء کو غلام محمد صادق وزیراعظم بن گیا۔ وزیراعظم اور صدر ریاست کے عہدوں کے نام بدل کر بالترتیب وزیراعلیٰ اور گورنر کر دیا گیا اس مقصد کے لئے ۳۰ مئی ۱۹۶۵ء کو آئین جموں و کشمیر میں ترمیم کی گئی۔ اس کے بعد صادق ۱۲ دسمبر ۱۹۶۱ء یعنی اپنے انتقال تک وزیراعلیٰ رہا۔

صادق نے شیخ عبداللہ کے تین نرم رویہ اپنایا۔ جواہر لال نہرو ہمیشہ ہی شیخ عبداللہ کی کشمیر سازش کیس کے تحت سماعت سے پریشان تھا۔ جواہر ۲۱ مئی ۱۹۵۸ء سے جاری تھی حالانکہ اس سماعت کی طوالت ملزمان کی طرف سے ٹال مٹول کے حربے تھے اور ملزموں کے خلاف جسطرح نے بادی النظر معاملہ ۲۵ جنوری ۱۹۶۲ء کو پیش کر دیا تھا تاہم نہرو اور صادق نے ملکر اس معاملے کو واپس لینے کا فیصلہ کر دیا۔ کیس کو واپس لینے کا حتمی حکم ۸ اپریل ۱۹۶۳ء کو جاری کیا گیا اور شیخ عبداللہ کو رہا کر دیا گیا۔

اپنی ربانی کے بعد شیخ عبداللہ جہاں بھی گیا اُس کا والہانہ استقبال کیا گیا۔ دہلی میں جواہر لال نہرو کے ساتھ اس کی ایک پرہیزگار ملاقات ہوئی وہ وہاں پر ایک کے بہانے کے طور پر ٹھہرا۔

۱۹۶۳ء میں شیخ عبداللہ پاکستان گیا۔ ۲۵ مئی کو اس نے ایوب خان کے ساتھ ملاقات کی اس سے اگلے روز وہ آزاد کشمیر کے دارالحکومت مظفر آباد گیا وہاں پر اُسے ۲۶ مئی کو جواہر لال نہرو کے انتقال کی خبر ملی اور وہ فوری طور پر نئی دہلی واپس آگیا۔ ایوب خان کے ساتھ اپنی گفت و شنید کے دوران اس نے ہند اور پاکستان کے درمیان مملکتوں کے اتحاد کی کنفیڈریشن کی تجویز پیش کی۔ اپنی کتاب فریڈزنٹ ماسٹرز میں ایوب خان نے یاد دلایا۔ جب شیخ عبداللہ اور مرزا افضل بیگ ۱۹۶۳ء میں پاکستان آئے انہوں نے بھی ہند اور پاکستان کے مابین مملکتوں کے اتحاد کی بہتر پیشکش کی تھی جس نے انہیں بتا دیا تھا کہ اسے کچھ لین دین نہیں ہے۔ یہ ایک تعجب کا امر ہے کہ جہاں ہم کشمیر لوں کی نجات کا راستہ تلاش کر رہے تھے۔ وہاں انہیں اس خیال کا ذکر کرنے کے لئے مجبور کیا گیا جس پر اگر عمل کیا جاتا تو اس کا انجام شماری غلامی کی صورت

میں ہوتا۔

اس کے بعد شیخ وادی میں آگیا۔ اس نے پھر اپنا موقف بدل لیا اور زوردار ہند مخالف تقریریں کرنا شروع کر دیا۔

فروری ۱۹۶۵ء میں شیخ عبداللہ اپنی بیگم کے ہمراہ غیر ملکی دورے پر گیا تھا پڑا اس کا مقصد حج بیت اللہ تھا مگر اپنے اس دورے کے دوران وہ سیاسی پروپیگنڈہ کرنے لگا۔ جو کہ حکومت ہند کے لئے بھاری الجھنوں کا موجب تھا۔ ۲۸ مارچ ۱۹۶۵ء کو اس نے چین کے وزیراعظم چیاو این لائی کے ساتھ بھی ملاقات کی چنانچہ اس کا پاسپورٹ مسترد کر دیا گیا۔ واپسی پر ۹ مئی ۱۹۶۵ء کو اُسے دہلی ہوائی اڈے پر گرفتار کر لیا گیا۔

اسی دوران پاکستان نے اندرونی تحریک کاری اور تیزی کے ساتھ اچانک حملہ کر کے اگست ۱۹۶۵ء میں کشمیر کو غصب کر کے ایک اور منصوبہ تیار کر لیا تھا۔ مجاہدوں اور رضا کاروں اور باضابطہ فوجیوں کی ۳۰۰۰ نفری تہہ ذیل ملک کی کان میں وسیع پیمانے پر تحریک کاری کی ایک ہم شروع کی۔ جو نہی برف پگھلی کشمیر لوں کے بھیس میں ہزاروں کی تعداد میں در انداز وادی میں داخل ہو گئے (۵ اگست ۱۹۶۵ء) ہندوستانی حکام کو یہ اطلاع اُسی وقت موصول ہوئی جب در انداز سرینگر کے بیرونی علاقوں میں پہنچ چکے تھے۔ اسی دوران پاکستان نے سرحد پر چھوٹی چھوٹی فوجیں بھیجیں شروع کر دیں۔ یکم ستمبر ۱۹۶۵ء کو پاکستانی فوج نے ۹۰ جنگیوں کی مدد سے چھب جوڑیاں سیٹر پر حملہ کر دیا۔ ان کا مقصد اچانک کاروائی کر کے کشمیر پر قبضہ کر لینا تھا۔ امریکہ سے حاصل ہوئی فوجی امداد نے پاکستانی حکمرانوں میں ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی بھری تھی۔ ایوب خان یہاں تک نشئی بگھار کرتا تھا کہ اگر میں ایک صبح حملہ کروں تو دوسری صبح کا ناشتہ میں نئی دہلی میں کروں گا مگر ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کے شکار رہنے والوں کو جلد ہی اپنی کوتاہیوں کا احساس ہو گیا۔

در اندازوں کو کوئی خاص کامیابی نہیں ملی۔ ان کی زبان اور ناقص تربیت نے انہیں دھوکہ دے دیا۔ پاکستانی حکام کی توقعات کے برعکس مقامی آبادی نے بغاوت نہیں کی۔ دوسری طرف ۵ ستمبر ۱۹۶۵ء کے روز ہندوستان نے لاہور سرحد پر جوابی حملہ کر دیا۔ اس کی فوجوں نے سیالکوٹ کی جانب پیش قدمی کی اور نتیجے کے طور پر چھب جوڑیاں سیکڑ میں دباؤ کم ہو گیا۔ پاکستان کا کشمیر کو بزدل و غیر غصب کرنے کا منصوبہ ایک مرتبہ پھر ناکام ہو گیا۔ ابتدائی ناکامی کے بعد سلامتی کونسل فریقین کو ۲۲ ستمبر ۱۹۶۵ء کو جنگ بندی کے لئے آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

سوویت یونین نے ایماں دار اور درمیانہ دار کا کردار ادا کیا۔ ہند اور پاکستان کے درمیان امن

• ملاحظہ ہو باب ششم۔ شاخیں۔ علاقائی شہنشاہ

• مائیکل کمور۔ وار ۹ ۱۹۶۵ء صفحہ ۲۲۵

رشتہ بن کر رہ گئی۔ جہاں ایک طرف شیخ عبداللہ نے جواہر لال کی دورانہ نشی اور سیاسی تدبیر اور اندرا گاندھی کی جرأت اور قوت فیصلہ کی ستائش کی۔ مگر اس نے کانگریس پارٹی میں شمولیت کی تجویز کو مسترد کر دیا۔ اس کی بجائے اس نے ۱۲ اپریل ۱۹۷۵ء کو نیشنل کانفرنس کی اجائے نو کی اور اس کا صدر بن گیا۔ اس سے ایک عجیب صورت حال پیدا ہو گئی کہ وہ ایک سیاسی پارٹی کی حمایت سے وزیر اعلیٰ کا عہدہ سنبھالے ہوئے ست اور ہی وقت ایک دیگر سیاسی جماعت کا صدر بھی تھا۔

۵ جولائی ۱۹۷۵ء کو شیخ عبداللہ نے محاذ رائے شماری کو ختم کر دیا اور اسے نیشنل کانفرنس میں شامل کر لیا۔ ۱۵ اگست کو اس نے کانگریس اراکین کا کھلے عام نیشنل کانفرنس میں خیر مقدم کیا۔ ان میں عبدالغنی کون بھی شامل تھا جو دل بدلی کر کے نیشنل کانفرنس میں شامل ہو گیا تھا۔ اس سے کانگریس پارٹی میں طوفان پیدا ہو گیا۔ بہر حال ان اختلافات کو حل کر لیا گیا اور سہراکتوبر کو دونوں پارٹیوں سے دو دو ممبرانہ پر مشتمل ایک رابطہ کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ۲۱ اکتوبر کو شیخ عبداللہ نے کانپور میں تو سین کا اعلان کیا۔ ان میں وہ چار کانگریسی افراد بھی شامل تھے جنہیں ان سے شوشے کے بعد منتخب کیا گیا تھا۔ خیر سہ اندرا گاندھی نے اس کے جواب میں چار کانگریسی اراکین کو ہدایت کی کہ وہ وزارت میں شامل نہ ہوں۔ حلف رانداری کی تقریب کو منسوخ کرنا پڑا۔

اس طرح آٹھ ماہ سے بھی کم عرصے میں اس عمارت میں شگاف پڑ گئے جس کی اساس فروری ۱۹۷۵ء کے اندرا شیخ اکا رڈ پر تھی۔ اس عرصے کے دورانہ ریاست کی تعمیر و ترقی کے معاملے میں دونوں جماعتوں کی رائے اور اطلاعات میں بھاری تضاد تھا شیخ عبداللہ خود ہی کہا کرتا۔ تعمیر و ترقی کی ایک مصنوعی اور نقلی نمائش پیش کی گئی ہے۔ اگست ۱۹۷۳ء کے بعد کئے جانے والے جبر و استبداد کے بعد ریاست کے عوام نے لالچ اور جھوٹے میں آنے سے انکار کر دیا ہے۔ ++ اس قسم کی باتوں سے کانگریسیوں میں غصہ آنا ایک قدرتی امر تھا۔

آخر کار یہ کھوکھلا اور نازک ڈھانچہ مارچ ۱۹۷۷ء کے پارلیمانی انتخابات کے بعد چرم لگا جب شمالی ہندوستان میں کانگریس جماعت کو شکست فاش حاصل ہوئی۔ اس بات کا پیشگی انداز کرتے ہوئے شیخ عبداللہ کانگریس کے ساتھ قطع تعلیق کر کے جنتا پارٹی کے ساتھ کوئی معاہدہ کرنے کا کانگریس پارٹی نے ۲۲ مارچ ۱۹۷۷ء کو ہاتھ حمایت واپس لے لی اور وزارت بنانے کا دعویٰ پیش کر دیا۔ اس وقت کانگریس قانون ساز ممبران کی تعداد ۲۵ تھی مگر شیخ عبداللہ نے گورنر لال کے حواسے اس کی کورخواست کر دیا۔ اس سے کانگریسی بھر کم تھے۔ انہوں نے شیخ عبداللہ کی کاروائی کو ایک مکروہ سیاسی فریب کاری ایک ایسے وزیر اعلیٰ کی بہت دھری قرار دیا جسے صرف

تین ممبران کی حمایت حاصل ہے۔ گورنر کے فیصلے کو بھی "غیر جمہوری اخلاقی طور پر ناقابل دفاع اور انتہائی طور پر قابل چیلنج قرار دیا گیا مگر منصوبہ تیار کیا جا چکا تھا۔ شیخ عبداللہ نے کامیابی کے ساتھ کانگریسیوں کو بھل دیا تھا۔ یہ جنتا پارٹی کا زمانہ تھا۔ ریاست میں جنتا پارٹی یونٹ کا قیام کیا گیا اور مولانا موسوی کو اس کا کنونینز مقرر کیا گیا۔ مولوی فاروق کی عوامی جلسے میں متعدد جماعتیں اور گروپ اس کے سامنے تلے آ گئے جس سے نیشنل کانفرنس کو بھاری تشویش ہو گئی مگر شیخ عبداللہ نے تنگ نظری کے جذبات بھر کانے اور دفعہ ۷۰ کو ختم کرنے کے بارے میں کشمیر پول کے دل میں وسوسے پیدا کرنے کا اپنا پراثرانہ یہ اختیار کر لیا۔ اس نے یہاں تک کہا۔ اگر آئین کی دفعہ ۷۰ کے تحت کشمیر پول کے لئے عزت اور وقار کے مقام کو یقینی نہیں بنایا گیا تب ہم ہندوستان سے الگ ہونے سے بھی گریز نہیں کریں گے ہم غیرت اور وقار کے ساتھ ہندوستان کا ایک حقدار ہیں۔ ۱۹۷۳ء سے لے کر دفعہ ۷۰ کو کافی ٹمزور کیا گیا ہے ہیں اپنی پوری قوت کے ساتھ آٹے مضبوط بنانا ہو گا۔ انتخابی ہم کے دوران شیخ عبداللہ طویل ہو گیا۔ اس کے تریفوں کے مطابق اس نے عوام کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے بیماری کا محض بہانہ کیا تھا۔

شیخ عبداللہ کے نیم فلفانی پروپیگنڈہ نے اپنا رنگ دکھا دیا۔ ۳۰ جون ۱۹۷۷ء کو پورے انتخابات میں نیشنل کانفرنس کو وادی میں ۴۲ میں سے ۲۹ نشستوں پر کامیابی حاصل ہوئی۔ اور جموں خطے کی ۳۲ نشستوں میں سے سات نشستیں لے حاصل ہوئیں جن میں سے بیشتر مسلم اکثریتی علاقے سے تھیں اور تاریخ کی دونوں نشستیں بھی شامل تھیں۔ جنتا پارٹی کو وادی میں صرف ۱۲ اور جموں میں ۱۱ نشستیں حاصل ہوئیں۔ کانگریس علی طور پر وادی سے ختم ہو گئی اور جموں خطے میں اسے ۱۱ نشستیں حاصل ہوئیں۔ یہ بات بھی بنیادی طور پر جنتا پارٹی اور اس کے باقی امیدواروں کے سبب ممکن ہوئی۔

جنتا پارٹی کو ناکامی کا مزہ اس لئے دیکھنا پڑا کہ اس کی نہ تو کوئی واضح پالیسی تھی اور نہ ہی پروگرام تھا۔ اس کے لیڈر مسخدا و آوازوں میں بولتے تھے۔ مثال کے طور پر سہرا مینھ سوامی نے جموں میں کہا کہ دفعہ ۷۰ کو ختم کر دیا جائے گا مگر عبدالغنی کون نے عین برعکس موقف اٹھایا کہ دفعہ ۷۰ کو مضبوط بنایا جائے گا۔ اشوک مہتہ جواہر لال نہرو کی مشیر پالیسی میں تبدیلی کی بابت مبہم انداز میں بات کرتا تھا۔

۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو شیخ عبداللہ کو وزیر اعلیٰ کے عہدے کا حلف دلایا گیا۔ اس نمایاں کامیابی کے سبب اس کی شخصیت میں مطلق العنانہ کیفیت پیدا ہو گئی اس کے گرد اقتدار کا حلقہ مزید تنگ ہو گیا۔ سیاسی اور انتظامی میدانوں میں چھوٹی چھوٹی باتوں کو فوقیت دی جانے لگی۔ مکمل اقتدار نے اپنے کھوکھلے پن اور کورپٹ اثرات دکھانا شروع کر دیے۔ رشوت ستانی اور علاقائی امتیاز کی شکایتوں کا ازالہ کرنے میں ایڈمنسٹریشن بہت کم جھکاؤ دکھائی۔

بحال کرنے میں اسے خاص دلچسپی تھی کیونکہ اسے اس خطے میں چین کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کا خدشہ تھا۔ اسی لڑائی جاری تھی کہ چین نے ہندوستان کے خلاف چار جہاز رُخ اختیار کر لیا۔ ۱۶ ستمبر کو چین نے تین دن کا ایٹمی بم دے دیا کہ ہندوستان سترم چین سرحد پر اپنے تمام فوجی کام سمار کر دے۔ ایک مرتبہ پھر ۱۹ ستمبر کو چین نے خود ارادیت کے حق کے لئے کشمیر کے عوام کی تمام تر حمایت کرنے کا اعلان کر دیا۔ اسی دوران چین نے یہ بھی اعلان کر دیا کہ وہ خاموش نہیں بیٹھے گا۔

۱۹۶۲ء کی جنگ کے بعد چین نے کشمیر کے بارے میں اپنا موقف تبدیل کر لیا تھا۔ اس سے قبل اس کا موقف یہ تھا کہ ہندوستان حمایتی یا غیر جانبدارانہ تھا۔ مثال کے طور پر ۱۶ مارچ ۱۹۵۶ء کو چائو این لائی نے ہندوستانی سفیر کو بتایا کہ کشمیر کے عوام ہندوستان کے ساتھ اتحاد کے بارے میں پہلے ہی اپنی رضامندی کا اظہار کر چکے ہیں۔ ایک مرتبہ پھر ۲۳ مارچ ۱۹۶۲ء کو چین نے کہا کہ اس کا رویہ کشمیر کے تنازعہ میں بھی ملوث ہونے کا نہیں یہ بات پورے عالم کو بخوبی معلوم ہے۔

آخر سوویت یونین کی کوششیں بار آور ثابت ہوئیں۔ ۱۹ جنوری ۱۹۶۶ء کو کسی جن اور بلگاٹن کی موجودگی میں ہندوستان کی جانب سے وزیر اعظم لال بہادر شاستری اور صدر پاکستان ایوب خان کے درمیان تاشقند اعلانیہ پر دستخط ہوئے۔ فریقین نے اپنی فوجیں ۵ اگست ۱۹۶۵ء کی پوزیشن پر واپس بلانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

۱۹۶۵ء کی ہند پاک جنگ کو متعدد مشاہدین نے ایک فضول اور بے اثر جنگ سے موسوم کیا ہے جس میں بہت سارا جانی مالی اور مادی نقصان دونوں ملکوں کو اٹھانا پڑا۔ مگر یہ بات کا طور پر درست نہیں ہے۔ ہندوستان کو واقعی اس سے فائدہ ہوا۔ تاشقند اعلانیہ کے بعد کشمیر کے مسئلے میں بین الاقوامی برادری کی دلچسپی میں کمی کا برعکس پیش آیا اور پاکستان کو بھی یہ بات معلوم ہو گئی کہ مستقبل میں کشمیر میں کوئی بھی مداخلت محض کشمیر اور اس کے دفاعی علاقے تک محدود نہیں رہے گی بلکہ اس کا نتیجہ ہند اور پاکستان کے درمیان مکمل جنگ کی صورت میں ہوگا۔ تاشقند اعلانیہ کے بعد ریاست میں سیاسی فضا میں کشمیر کا پیدا ہو گئی۔ ۸ دسمبر ۱۹۶۶ء کو شیخ محمد عبداللہ کو رہا کر دیا گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ اسے عوام کی طرف سے ملنے والی توجہ میں کمی آئے لگی حالانکہ محاذ رائے شمار کی سرگرمیاں شد و مد کے ساتھ جاری رہیں۔ ۸ جنوری ۱۹۶۷ء کو شیخ عبداللہ مرزا افضل بیگ اور جی ایم شاہ کو ریاست بدر کر دیا گیا۔ ۱۲ جنوری کو محاذ رائے شمار پر پابندی عائد کر دی گئی۔

۱۹۶۱ء کے اواخر میں بنگلہ دیش کی تحریک آزادی نے زور پکڑ لیا۔ شیخ نجیب الرحمان کی درخواست پر ہندوستانی فوج بنگلہ دیش میں داخل ہو گئی۔ دسمبر ۱۹۶۱ء میں ایک باضابطہ جنگ شروع ہو گئی۔ ۳ دسمبر کو شمال میں پاکستان نے جموں و کشمیر پر حملہ کر دیا اس کے بعد چند روز کے لئے شدید بری اور پہاڑی لڑائیاں ہوئیں۔ ۱۶ دسمبر کو بنگلہ دیش میں پاکستانی فوجوں نے بھارتی ہتھیار ڈال دے۔ ہندوستان نے مکمل طور پر جنگ بندی کا

اعلان کر دیا۔ اس طرح جنگ ہندوستان کے لئے شاندار فتح و کامرانی کے ساتھ ختم ہوئی اور اس کے ساتھ ہی بنگلہ دیش کی خود مختار مملکت وجود میں آئی۔

اس جنگ کے بعد ہندوستان کی وزیر اعظم اندر گاندھی اور صدر پاکستان ذوالفقار علی بھٹو کے درمیان دو طرفہ گفت و شنید ہوئی جس کے نتیجے میں دونوں ملکوں کی طرف سے شملہ معاہدے کو تشکیل دی گئی اور ۳ جولائی ۱۹۶۲ء کو اس پر دستخط ہوئے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس معاہدے میں دیگر باتوں کے علاوہ مندرجہ ذیل امور درج تھے۔

۱۔ دونوں ملکوں نے اس بات کا عہد کیا ہے کہ باہمی تفرقات کو پر امن طور پر دو فریقی گفت و شنید یا کسی ایسے ذریعے سے حل کیا جائے گا جس پر دونوں ملکوں کی باہمی رضامندی ہو۔

۲۔ دائمی امن کے قیام کے عمل کو شروع کرنے کے مقصد سے دونوں حکومتیں تسلیم کرتی ہیں کہ (۱) ہندوستانی اور پاکستانی فوجیں بین الاقوامی سرحد کی اپنی طرف واپس بلانی جائیں گی۔ (۲) جموں و کشمیر میں ۱۴ دسمبر ۱۹۶۱ء کے بعد کی کنٹرول لائن کا دونوں فریق اپنی اپنی پوزیشن کے قطع نظر پاس رکھیں گے۔

جولائی ۱۹۶۲ء سے لے کر اس کے بعد شملہ معاہدہ ہند پاک تعلقات کی علامت بن چکا ہے۔ حالانکہ فریقین کی طرف سے بسا اوقات اس کی مختلف انداز میں تشریح کی گئی ہے مگر یہ سمجھوتہ اپنی جگہ پر قائم رہا ہے۔

بنگلہ دیش جنگ اور پاکستان کی ذلت آمیز شکست کے بعد جبکہ ۹۰۰۰۰ فوجیوں کو ہندوستانی فوج کے سامنے ہتھیار ڈالنا پڑے اور شملہ سمجھوتے پر عمل درآمد کے بعد کشمیر حقیقی معنوں میں دو فریقی معاملہ بن کر رہ گیا اس کے نتیجے میں شیخ عبداللہ اور مرزا محمد افضل بیگ کے رویے میں بھی نمایاں تبدیلی واقع ہوئی۔ پاکستان یا آزاد اور خود مختار کشمیر کی مہم میں اب کمی واقع ہونے لگی۔ انہوں نے محمد اندر گاندھی کے تین مصلحانہ تقریریں کرنا شروع کر دیں وزیر اعظم نے بھی لازمی سمجھا کہ شیخ عبداللہ کے ساتھ کسی قسم کی مفاہمت کر ہی لی جائے۔ دونوں فریقوں کے درمیان ۱۹۶۲ء سے گفت و شنید کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور جی پارٹیاں ساری اور مرزا افضل بیگ کے درمیان تین برس طویل تک جھگڑا لی گفت و شنید کے بعد ایک سمجھوتے جسے عرف عام میں کشمیر کارڈ کہا گیا یہ ۲۴ فروری ۱۹۶۵ء کو دستخط ہوئے۔ اس سمجھوتے کا متن ضمیمہ نمبر ۱ درج ہے۔

اس سمجھوتے کے جذبے کے تحت وزیر اعظم علی سید میر قاسم جو کہ ۱۳ دسمبر ۱۹۶۱ء کے بعد جی ایم صادق کی وفات کے بعد عہدہ سنبھالے تھے اس کا رڈ کوپا یہ تکمیل تک لانے میں اہم رول ادا کیا اور استغنی دے دیا۔ کانگریس پارٹی نے شیخ عبداللہ کو اپنا قائد منتخب کیا۔ ۲۵ فروری ۱۹۶۵ء کو اسے وزیر اعظم کے عہدہ کا حلف دلایا گیا۔ تین دیگر غیر کانگریسی وزراء اس کی کابینہ میں شامل ہوئے۔

کانگریس اور شیخ عبداللہ کے درمیان مفاہمت زیادہ دیر تک نہیں چل سکی۔ یہ ایک عشق و نفرت کا

اٹھانا شروع کر دیئے جن میں نوآباد کاری مسودہ قانون اور الفتح کے ۳۰ کٹر طور پر سرگرم کارکنوں کے خلاف معاملات واپس لینا بھی شامل تھا۔ ایک ہوشیار اور متکبرانہ طریقہ کار کے تحت اس نے وزارت اعلیٰ پر ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی جانشینی کے لئے راہ ہموار کر دی۔ ممکنہ امیدواروں کو پوزیشنل کانفرنس سے ہٹا دیا گیا یا ان کی اہمیت کو کم کر دیا گیا۔ مثال کے طور پر ۲۵ ستمبر ۱۹۸۶ء کو مرزا افضل بیگ کو استعفیٰ دینے کے لئے کہا گیا اس کے چار روز بعد اسے جماعت سے خارج کر دیا گیا۔ ریاست میں اقتدار کے ڈھانچے پر شیخ عبداللہ کی جنتی کی حرکت کو مضبوط کرنے کے لئے ایک مقامی دل بدلی قانون بھی مرتب کیا گیا۔

ایک پُر طوفان اور واقعات سے بھری زندگی کے بعد ۸ ستمبر ۱۹۸۲ء کو شیخ محمد عبداللہ کی وفات ہو گئی اُسکے جنازے میں بھاری تعداد میں عوام کی شمولیت نے اسے تاریخی حیثیت عطا کر دی۔ توقعات کے مطابق ڈاکٹر فاروق عبداللہ اس کا جانشین بنا۔ محترمہ اندرا گاندھی اور گورنر بی۔ کے ہنر کی پس پردہ حمایت کے سبب اقتدار کی منتقلی نہایت پر امن طریقے سے ہو گئی۔ مگر محترمہ اندرا گاندھی اور ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے درمیان تعلقات نے جلد ہی تلخی اختیار کر لی۔ جون ۱۹۸۳ء کے اسمبلی انتخابات کے دوران کانگریس (آئی) اور نیشنل کانفرنس کے درمیان شدید جھگڑے ہوئے اس کے ساتھ ہی قوم دشمن سرگرمیوں میں اضافہ ہو گیا۔ مرکز اور ریاستی حکومت کے مابین تعلقات میں بھی تناؤ پیدا ہو گیا۔ پنجاب کے واقعات بھی جوں و کشیر پر اپنا سیاہ سایہ ڈالنا شروع کر دیا۔ تشدد اور رسوائی کے واقعات میں اضافہ ہو گیا۔

میں نے باب ہفتم ۲ جولائی ۱۹۸۳ء میں بیان کیا ہے کہ ۲۶ اپریل ۱۹۸۳ء کو جب میں نے گورنر کا سنبھالا تو ریاست شورش میں مبتلا تھی۔ اس باب میں درج حالات کے پیش نظر میں نے ۲ جولائی ۱۹۸۳ء کے روز فاروق عبداللہ کی وزارت کو برطرف کر دیا۔ اوجی۔ ایم شاہ وزیر اعلیٰ بن گیا۔ اس کی وزارت کو بھی میں نے، ۸ مارچ ۱۹۸۶ء کو برطرف کر دیا اور آئین جوں و کشیر کی دفعہ ۹۲ کے تحت گورنر راج نافذ کر دیا گیا۔ یہ گورنر راج چھ ماہ تک جاری رہا اس کے بعد آئینی مہندی دفعہ ۳۵۹ کے تحت صدر راج نافذ ہوا۔ میں صدر جمہوریہ کی طرف سے مزید دو ماہ تک حکومت کا کام چلاتا رہا۔

۸ نومبر ۱۹۸۶ء کو راجہ جیو۔ فاروق اکاڑ کے تحت نیشنل کانفرنس اور کانگریس کی ایک مخلوط وزارت بنی۔ مارچ ۱۹۸۷ء میں نئے انتخابات کا اعلان ہوا۔ اتحادی جماعتوں نے ان انتخابات میں زبردست کامیابی حاصل کی۔ مگر عوام کی ایک بھاری تعداد نے ان انتخابات کی غیر جانبداری پر شہادت کا اظہار کیا۔ اس کے بعد دوسری بنیادی وجوہات کے باعث وادی میں ابھرتا ہوا طوفان ۱۹۸۹ء کے دوسرے نصف حصے میں اپنی پوری شدت اختیار کر گیا، اس کا تجزیہ میں نے باب چہر میں کیا ہے۔

میں اپنے عہدے سے ۱۲ جولائی ۱۹۸۹ء کو یکدم ویش ہوا۔ باب اول۔ میرا بنیاد غبارت میں بیان کئے گئے حالات سر پیش نظر ۱۰ مئی ۱۹۸۹ء کو گورنر راج نافذ ہوا۔ ۱۰ مئی ۱۹۸۹ء کو گورنر راج نافذ ہوا۔

میں نے محاذ رائے شماری الفتح، جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ اور دوسری تخریب کارانہ جماعتوں کی سرگرمیاں، کشمیر اکاڑ (فروری ۱۹۸۵ء، جون ۱۹۸۶ء، جون ۱۹۸۷ء اور مارچ ۱۹۸۸ء میں ریاستی اسمبلی ۹ دسمبر ۱۹۸۴ء اور نومبر ۱۹۸۴ء) کے پارلیمانی انتخابات جسے واقعات نوآباد کاری ایکٹ ۱۱م آئینی اور سیاسی نوعیت کے فیصلے جن میں میری طرف سے ۲ جولائی ۱۹۸۳ء کو ڈاکٹر فاروق عبداللہ اور ۸ مارچ ۱۹۸۶ء کو جی۔ ایم شاہ وزارتوں کی برطرفی اور ۱۸ جنوری ۱۹۹۰ء کو ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے استعفیٰ جیسے معاملات کے بارے میں میں نے بعد کے ابواب میں تجزیہ کیا ہے۔ اسی طرح ان رجحانات شکمی رجحانات کی وضاحت بھی یہاں نہیں کی گئی اور انہیں باب۔ "خطے کے اشارات" میں مناسب پس منظر میں زیر بحث لایا گیا ہے۔

جن واقعات کی تہہ تک میں پہنچا ہوں غلطیوں اور کوتاہیوں کی توفیر سست میں نے پیش کی ہے۔ قریب کاری سازشوں اور سینڈل لوں کے جس ملے کو میں نے کھودا ہے، جن ڈراموں کا میا ہوں اور المیات کو میں نے طشت از بام کیا ہے یہ دو ہزار برس کے اس سفر کی داستان ہے جس نے کشمیر کو اس صورت میں لا کھڑا کیا ہے جو وہ آج ہے۔ تاریخ نے جو متعدد زخم لگائے ہیں ان میں سے بہت کم مرہم ہو سکے ہیں اور باقی زخم شدید درنا چھوڑ چکے ہیں۔

۱۹۸۷ء کے وسط میں تاریخ کے نازک ترین مرحلے پر ایک ایسے ذہن کی ضرورت تھی جو زخموں کو سینے اور انہی مرہم کرنے کے علاوہ پرلنے دانوں کو دھو سکتا یا قسمتی سے ایسا نہیں ہوا۔ محض معمولی لیپا بوقی پر انحصار رکھا گیا۔ نئے کرداروں نے صرف بیرونی بناؤں سے کار کیا تھا۔ ابواب چہارم، پنجم اور ششم سے ظاہر ہے کہ اس کی جڑوں تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی گئی اصلاحات کے نئے بیج نہیں بوائے گئے اور یکجہتی کی نئی بنیادیں نہیں ڈالی گئیں۔

منڈراتے ہوئے خطرات

تاریخ ایک اندھی دیوی کی مانند ہے
اور یہ دوسروں کی چشم پوشی کو معاف نہیں کرتی

۱۹۸۸ء کی ابتدا سے ہی میں نے مرکزی حکومت کو منڈراتے ہوئے خطرات اور ابھرتے ہوئے طوفان سے روشناس کن شروع کر دیا تھا۔ مگر اباب اقتدار کے پاس نہ تو اس کے لئے وقت، نہ رجحان، اور نہ ہی نظر تھی کہ وہ ان خطرات کو دیکھ سکے۔ قوم کو حقیقت سے روشناس کرنے، غلط بیانیوں کو درست کرنے، دروغ گوئی، نیم دروغ گوئی، من گھڑت قصوں، غلطیوں اور کوناہیں سے سبق حاصل کرنے کے مقصد سے آئیے میں ان چند اشارات کی بابت آپ کو بتاؤں جو میں نے پیچہ ارسال کئے۔ یہ اشارات مقصد واضح تھے، اس قدر صاف تھے کہ انہیں نظر انداز کرنا ایک تاریخی بیہوشی کے گناہ کے مترادف ہے۔

میں اپنی ڈائری میں درج چند تفاسیل کو دہراتا ہوں۔ یہ تفاسیل میں نے ان رپورٹوں میں درج کی ہیں جو میں مقصد جمہوریہ کو ارسال کیں اور ان کی نقول وزیر اعظم اور مرکزی وزیر داخلہ کو بھی روانہ کی گئیں۔

اگست ۱۹۸۸ء کے دوران میری ڈائری میں مندرجہ ذیل عبارت ہے۔

”کم از کم ایک درجن موقعوں پر پولیس فائرنگ وسیع پیمانے پر تشدد اور گڑبڑ کے واقعات کے سبب ۹ جاہز ملت ہوئیں۔ سرحد پار سے ہونے والے واقعات کا جاری رہنا، مختلف تجربہ گروہوں سے وابستہ کشمیری نوجوانوں کا پنجاب جیسی دہشت گردانہ تحریک شروع کرنے کے مقصد سے تربیت حاصل کرنے کے لئے پاکستان جانا، اس ماہ کے دوران کچھ ایسے واقعات ہیں جن رجحانات اور نسلی رجحانات کا پتہ چلتا ہے، ایک مرتبہ پھر ریاست کے سماجی اور سیاسی نظام اور انتظامی ڈھلچکے کی کڑواہٹ کھل کر سامنے آگئی ہے۔ ان واقعات سے کتنی ہی اور خباہتیں برپا کی گئیں۔ ان واقعات کا مکمل غلبہ بھی واضح طور پر عیاں ہوتا ہے۔

ریاستی سب ڈویژن کے لئے منسلک کامرتبہ حاصل کرنے کے لئے بیاستھ ایجنسیوں کی ریاست کے منظر کا ایک اور غیر صحت مند

تصویر پیش کرتی ہے، ملاقاتی حد تک

ماہ جولائی کے لئے اپنی ڈائری کے اندراجات میں میں نے ہم دھماکے، پٹرول پمپ پر بم دھماکے، پولیو کے گڑبڑ، مولوی فاروق اور اس کے رفقاء کا جائزہ ملزعل پاکستان نواز سرگرمیوں کا بڑھتا ہوا زور، جماعت اسلامی کی چالیں، انتقامی کے ایک حصے کی پہچان، ہمدردیاں اور تنگ نظر وفاداریاں، نام نہاد سیکولر قوتوں کی بے انتہائی، مکران، حقداران میں اپنے جماعتی کارکنوں میں جوش و خروش بھرنے میں ناکامی، یہ تمام نقطہ طوفان کی پیش گوئی کرتے تھے جس کی آمد آتی تھی۔ اور لازماً یہ طوفان آیا اور پورے ماہ کے دوران یہ وادی میں مختلف درجوں کی شدت کے ساتھ تباہی لایا۔ صدر ضیاء الحق کی غیر متوقع وفات، جیسے واقعات نے بھی ان کی شدت میں اضافہ کیا۔

ان واقعات کے متوازی کشمیری نوجوانوں کی پاکستان تک وہ نقل و حرکت جاری تھی جس کا مقصد دہشت گردی کی کاروائیوں کے لئے اسلحہ اور تربیت حاصل کرنا تھا۔ اہم واقعات کی یاد دہانی یوں ہے: ۱۳ جولائی اور یکم اگست کی درمیانی شب کو دو بم دھماکے اور ڈاکے کی ایک واردات ہوئی۔ ہم اگست کو کھنپور میں ایک ایکٹرا تک گھڑی میں ناٹم بم ملاحظے کسی نقصان ہونے کے بغیر ناکادہ بنادیا گیا۔ ۱۳ اگست کو جوں کے کھیدی بازار میں، آٹو کشا میں ہم دھماکہ ۱۴ اگست، پاکستان کا یوم آزادی سرحد کے شہر کے اندرون اور وادی کے دیگر قصبات میں ہر جہز پر ہم لہرائے گئے۔ ۱۵ اگست کو ہندوستان کے یوم آزادی پر مختلف مقامات پر سیاہ پرچم نصب کئے گئے۔ ۱۶ اگست کو پولیس اور پاکستان نواز اہل جلوس کے مابین جھڑپیں ہوئیں۔ اہل جلوس ہندو مخالفت فورسز کے گارڈ تھے اور راولپنڈی میں شریک کھولنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ یہی مطالبہ چند روز قبل مولوی فاروق نے کیا تھا۔ اس جھڑپ میں پولیس فائرنگ سے ایک شخص جاں بحق ہوا اور ۵۰ افراد مجروح ہوئے۔ ایک پولیس جیپ جلادی گئی اور چند دکانوں کو نقصان پہنچایا گیا ۱۶ اگست کی شب کو سرحد میں واقع رشی پیر منڈ کو نذر آتش کرنے کی ایک سعی کی گئی۔

۱۷ اگست کی شام کو جب جنرل ضیاء کی موت کی خبر موصول ہوئی تو بھاری تعداد میں، ہجوم سرحد کے پائینی علاقے میں جمع ہو گیا۔ اور ہند مخالفت اور روس مخالفت فورسز بلند کئے۔ اگرچہ کرنیو ناکہ کر دیا گیا پھر بھی سرحد، بادہ مول، پولوامہ اور ہمدرد واہ میں فسادات ہوئے۔ چار دن تک تشدد جاری رہا۔ پولیس کو گولی چلانا پڑی جس میں ۱۸ اگست کو چار افراد جاں بحق ہو گئے اور ایک شخص ۳۱ اگست کو انتقال پا گیا۔

۲۳ اگست کو شدید اکثریتی علاقوں میں مستند جھڑپیں ہوئیں اور کرنیو ناکہ کر دیا گیا۔ ۲۴ اگست کو محرم اکرام کے جلوس میں شرکت کے لئے جانے والے ۵۰ شیعوں پر حملہ کیا گیا اور سنگ باری کی گئی۔ سرحد شہر میں دوبارہ کرنیو ناکہ کر دیا گیا۔ مشیہ اور سنہوں کے درمیان تناؤ کے باعث جلوس ترک کر دیا گیا۔ اگرچہ جلوس ترک کرنے کے سبب متوقع جھڑپوں کا تدارک کر دیا گیا تاہم اس سے انتقامیہ کے قہار کو دھک لگا۔ ۲۶ اگست کو جامع مسجد میں جس کی نماز کے بعد جنرل ضیاء الحق کی فاتحہ خوانی ہوئی، وہاں سے پلٹتا ہوا ہجوم مستند ہو گیا۔ پولیس نے گولہ باری کا سہارا لیا جس میں تین افراد ہلاک ہو گئے اور دوسرے پانچ افراد کو گولیوں سے زخم آئے۔

۳۱ اگست کو انٹرنیٹ ناگ میں ایک گھڑی ہوئی خالی بس میں ہم دھماکہ ہوا جس کے نتیجے میں نزدیک کھرا ایک شخص قتل ہو گیا۔ ۳۱ جولائی اور یکم اگست کی درمیانی شب کو ہونے والے ہم دھماکے کی ذمہ داری جے اینڈ کے لیبریشن فرنٹ نے قبول کی۔

اس سلسلے میں چند پوسٹر اور پریس نوٹ جاری کئے گئے۔

اگرچہ سلی طور پر ان واقعات کا ایک سے دوسرے کے ساتھ تعلق بحال ہے مگر کشمیر کی سیاسی زندگی اور اس کے انتظامیہ اقتصادی اور سماجی ڈھانچے اور تمدنی قدروں کے پیش نظر ان واقعات کا بنیادی سبب جاننا بھی لازمی ہے۔

گزارے کے ان واقعات کے بارے میں متعدد بنیادی سوال پیدا ہوتے ہیں۔ پاکستان کے یوم آزادی پر ہندو پرچم کیوں لہرائے گئے اور ہندوستان کے یوم آزادی پر سیاہ جھنڈے کیوں نصب ہوئے۔ جنرل ضیار کی موت نے سرینگر، بارہ مولہ اور دوسرے قصبوں میں ویسٹ پیانے پر فسادات کا موقع کیوں فراہم کیا؟ حالانکہ پاکستان میں کسی بھی جگہ اس قسم کے فسادات رونما نہیں ہوئے تھے۔ فسادوں کے موجودہ رویے کو کیونکر بیان کیا جاسکتا ہے جبکہ اپریل ۱۹۷۹ء کے ان واقعات کو یاد کیا جائے جب ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دیئے جانے کے بعد ضیاء الرحمن مخالف ہوسے اور جماعت اسلامی کارکنوں کی جائیدادیں لوٹ لی گئیں کیونکہ یہ شک تھا کہ جنرل ضیار کو اس تنظیم کی حمایت حاصل ہے۔

ان تمام تر سوالوں کا وسیع تر معنوں میں جواب یہ ہے کہ کشمیری رہنماؤں کے خزانے میں یہ سوال گہرائی سے گھر کچے ہیں کہ مذہب کا استحصال کیا جائے، پاکستان نواز جذبات کو ابھارا جائے، جو شخص بھی اقتدار سے باہر ہو وہ اس بات کو ضروری سمجھتا ہے کہ راولپنڈی میں شریک کو کھولا جائے، تمام کشمیری دنیا پاکستان کی طرف رواں دواں ہیں، جو کشمیری سرحد کی دوسری طرف چلے گئے ہیں ان کی نوآباد کاری۔ اقتدار کو دوبارہ حاصل کرنے یا عوامی توجہ کا مرکز بننے یا اخبارات کی سرخیوں میں مقام حاصل کرنے کے لئے یہ بہترین نعرے تصور کئے جاتے ہیں۔ بہر حال کسی نے بھی اس مزاج کی موثر طور پر حوصلہ شکنی نہیں کی ہے، اس پر سزا دینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جو نوجوان عنقریب دشمن میں شریک ہو تبسے یا تو وہ ان پڑھ ہے یا فرقہ پرست اور بنیاد پرست رہنما اس کا آسانی سے استحصال کر لیتے ہیں مگر وہ تعلیم یافتہ ہے تو غیر منصفانہ نظام سے مایوس ہے جہاں اسے ملازمت کے محدود مواقع حاصل ہیں یا بھرتی یا انتخاب کے غیر منصفانہ طور طریقوں سے اس کی قابلیت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ مایوسی، کمزور پستی، قرون وسطیٰ اور راہبانہ قدریں ساتھ ساتھ چل رہی ہیں۔ اس سے مایوس گرم رہتا ہے۔ اور جب کبھی اسے کوئی وجہ حاصل ہوتی ہے یا مقامی طور پر حرارت پہنچائی جاتی ہے تو یہ ایسا مادہ جیسے کناروں کو پھلانگتے لگتا ہے۔ نہ تو روایتی میثاقات، نہ ہی قرون وسطیٰ کا حکم، نہ غیر جانبداری کی اور نہ انصاف کی حالیہ قدریں دستیاب ہیں۔ کشمیری نوجوان کو ہر طرف سے مایاں کیا جا رہا ہے۔

تمام مقامی گروہوں اور علاقائی جماعتوں کا دار و مدار کشمیری عوام کے دلوں کو جیتنے کے لئے سخت محنت اور ایمان داری پر نہیں بلکہ اپنی سیاسی سادگی کو بنانے کے لئے جذباتی اور قرون وسطیٰ کے معاملات کا سہارا لیا جاتا رہا ہے۔ کشمیر کا سیاسی ڈھانچہ اور یہاں کا انتظامیہ اس درجہ کی بدعت کا شکار رہا ہے۔ حقیقت کا سامنا کرنے اور مسئلے کو اپنی جڑوں سے حل کرنے کے لئے کھلے مختصر راستے پٹانے جاتے ہیں اور شخصیات پر مبنی سیاست کو برہادی جاتی ہے۔ اس کے عوض اس سے انفرادی مفادات اور خواہشات کو تعزیت حاصل ہوتی ہے اور اقتدار خود میں ہی ایک منزل بن کر رہ جاتا ہے۔ اس کے بعد جو سازشیں ہوتی ہیں ان سے عام گڑ بڑ واقع ہوتی ہے۔ ان واقعات میں انتظامی قوت اور ذرائع فائق ہو کر رہ جاتے ہیں اور ذرائع کا جو حصہ کشمیر بانی پچھتا ہے وہ ان سماجی اور اقتصادی اہمیت کی شخصیات پر ملے ماحول کو دھاماتا ہے جن کے کندھوں پر موجود ڈھانچے کا انحصار ہے۔

ان حقیقتوں کے پیش نظر موجودہ نامادری اور غیر متوازن تعمیر و ترقی کا عمل حیران کن ہیں۔ تقریباً ۹۰ فیصد شہری یا شہری ترقی کے قابل زمینوں کی ملکیت گئے چنے لوگوں کے نام ہے و بیع پیمانے پر شے بازی، منافع خوری اور چال بازی کا عمل جاری ہے اس سے ان لوگوں کے گھر بھرتے ہیں جو پہلے ہی امیر اور بارہ مولہ ہیں۔ ۸۰-۱۹۷۹ء کی ترمیم کے بعد ان دیہی زبانی اصلاحات کے تحت زمین کی تقسیم نو کے عمل کو بھی الٹ دیا گیا جس کی بابت ہمارا دعویٰ یہ تھا کہ ہم ان اصلاحات کے پیشوا ہیں۔ اس ترمیم کے تحت پھلوں کے باغات زمین کی زیادہ سے زیادہ حد مستثنیٰ قرار دیئے گئے۔ اس سے سیاست میں نیم جاگیر داری کے دروازے دھڑا دھڑکھل گئے۔ اب ۱۰ فیصد آبادی کے پاس ۵۰ فیصد دیہی اثاثہ جات ہیں اور سب سے اوپر ۳۰ فیصد افراد ۸۲ فیصد اثاثہ جات کے مالک ہیں۔ یہ ایک قدرتی امر ہے کہ یہاں اس قسم کے ۸۰ فیصد اثاثہ جات کی ملکیت ۱۵ سے ۲۰ فیصد افراد کے پاس ہے۔ وہاں نہ تو سماجی اور نہ ہی اقتصادی انصاف فراہم ہو سکتا ہے۔ مزید برآں ترقیاتی عمل کی ترجیحات اور طرز عمل کے باعث حقیقی ترقی کے لئے بہت کم ذرائع باقی بچتے ہیں۔ اس کے انجام کی صورت میں تعلیم کا نقصان ہوتا ہے، شہری خدمات نظر انداز ہوتی ہیں، صحت، مائیکرو کم توجہ ملتی اور ماحولیات اور قدرتی اثاثوں پر بھاری دباؤ پڑتا ہے۔

ان حالات میں سماجی نا انصافیاں برقرار رہتی ہیں نا ولیدی قائم رہتی ہے، جہاں اور نا خواندگی بنی رہتی ہے اور انکسار اور جوڑ توڑ کے مواقع بھی حاصل رہتے ہیں۔ آج ۱ ہو سکتا ہے کل ۱۰ ہو سکتا ہے اور پوسٹوں ج ہو سکتا ہے اور اسی طرح سبھی نے ایک ہی روش اختیار کی ہے۔ تمام پاکستانی راگ الاپتے ہیں، اوفو ۲۰۷۰ اور کشمیری شناخت کے گیت گاتے ہیں مگر غریب اور بے کچے افراد کی بہبود کا — قلعی کوئی مطلب نہیں۔

جذباتی اور استحصالی محاذوں پر جنگ میں اپنی شکست کے خدشات کے پیش نظر نیشنل کانفرنس کے ایک حصے نے "نوآباد کاری" کے غرے ہوئے مرنے کو اکھاڑنا شروع کر دیا ہے۔ ۲۰ اگست ۱۹۸۸ء کو نیشنل کانفرنس کے پانچ دنوں کے ایک میمورنڈم پیش کیا جس میں مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں "نوآباد کاری" بل جے لاکھ عوام کی نمائندہ ریاستی قانون سازی نے پاس کر دیا ہے، جو منظوری کے لئے صدر جمہوریہ سے گزارا کر دیں۔ اس میمورنڈم میں کہا گیا ہے "ہم جنوں و کشمیر کے عوام محسوس کرتے ہیں کہ نوآباد کاری ایکٹ پر عمل کے فقدان میں امکان کی جڑیں کھوکھلی ہو رہی ہیں۔ ہم توقع رکھتے ہیں اگر مستقبل قریب میں نوآباد کاری ایکٹ کو منظوری نہیں دی گئی تو جنوں و کشمیر کے عوام کسی ایسے دوسرے راستے کی بات سوچنے پر مجبور ہوں گے۔ جو حکومت ہند کو پسند نہیں ہوگا۔" ان الفاظ میں دھمکی چھپی ہوئی تھی۔ ان الفاظ میں وہ ارادے اور تسکینیں بھی پنہاں تھیں جن کا مقصد "استحصالی جمہوریت" کا سہارا لینا تھا اور اس مدے نے ماضی میں بھی نیشنل کانفرنس کو انتخابی مقاصد حاصل کرنے میں کامیابی دی تھی۔ کشمیری نسیات کو جو طویل مدت تک پہنچائی گئی ہے اور اس کے باعث اس گڑ بڑ اور ریاستی حکومت کی طرف سے ان سے نمٹنے کے بارے میں مختلف جماعتوں کا رد عمل بھی مختلف تھا۔ بھارتیہ جنتا پارٹی نے گورنر راج نافذ کرنے کا مطالبہ کیا کیونکہ مخلوط وزارت اس صورت حال کے ساتھ مؤثر طور پر نمٹنے میں ناکام رہی تھی عوامی نیشنل کانفرنس اور جی ایم شاہ نے اس دھماکے خیز صورت حال کے ساتھ نمٹنے میں ریاستی حکومت کی مداخلت اور لاپرواہ "طرز عمل کی مذمت کی تھی اور مرکزی حکومت سے اور گورنر سے کہا تھا کہ وہ مداخلت کریں اور نااہل اتحادی حکومت کو برطرف کریں۔ اس نے پولیس افواہ سے اپیل کی کہ وہ حکام کی طرف سے گولی چلانے کے احکامات نہ مانیں۔

جدا لفظی لہجہ کی پیشہ کار فرانس نے عوام سے تعین کی کہ وہ وزیر اعلیٰ کو نکالنے کے لئے ایک مہم کا آغاز کریں جو مرکز کے ساتھ مل کر جبر و استبداد کر رہا ہے۔ مسلم یونائیٹڈ فرنٹ (جماعت اسلامی گروپ) نے بھی ریاستی حکومت کی طرف سے بار بار کیونیا نافذ کرنے اور فائرنگ کا سہارا لینے کی مذمت کی۔ مسلم یونائیٹڈ فرنٹ (جماعت اسلامی گروپ) نے ریاستی حکومت کی عدم احترام کے جلوس کو تحفظ فراہم کرنے میں ناکام رہنے پر حکومت کے استعفیٰ کا مطالبہ کیا تھا۔ عوامی جلسہ عام نے معصوم عوام کی بے تحاشہ اور جلا امتیاز جلاکت کی شدید مذمت کی تھی۔ اس جماعت کے صدر مولوی فاروق نے ان افراد کی فہرست جاری کی جو گزشتہ تین ماہ کے دوران پولیس فائرنگ میں ہلاک ہوئے تھے۔ اس نے وزیر اعلیٰ کے استعفیٰ کا مطالبہ کیا تھا جن مورچے کے مفتی محمد سعید نے وزیر اعلیٰ پولیس نامہ فوجی دستوں اور دہلی میں ان کے نام نہاد سرچشموں کی ریاست میں خطرناک صورت حال پیدا کرنے کے لئے شدید کٹھن چینی کی تھی۔

جماعتی سطح پر بھی کانگرس (آئی) اور نیشنل کانفرنس (ایف) نے سست روی سے کام لیا۔ کانگرس (آئی) اور نیشنل کانفرنس کی طرف سے قوم دشمن اور فرقہ واریت کی طاقتوں کے خلاف مشترکہ سیاسی لڑائی کی باتیں تو بڑھ چڑھ کر کی جاتی تھیں مگر عملی طور پر ایسا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ جب سب بنگلہ شہزاد وادی کے مختلف حصوں میں پاکستان فوار اور بنیاد پرست عناصر کھل کر کھیل رہے تھے تو ان جماعتوں کے رہنما اور کارکن اپنی عدم موجودگی سے نمایاں تھے۔ انتظامی مشینری کو اپنے سہاسے پر چھوڑ دیا گیا اور اس سیاسی غلام میں اس کا اثر محدود ہونا ایک لازمی امر تھا۔ ان تمام باتوں سے بے اعتنائی کا رجحان ظاہر ہوتا ہے۔

اب یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ۵۰ کثیر فیوجان پاکستان گئے تھے اور وہاں انہوں نے دہشت گردی کی کارروائیوں کی تربیت حاصل کی ان میں سے چند چینی اساتذہ راہنوں جیسے ہنگامہ پیشوار، لے کر واپس آچکے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ تیوں و کثیر لبریشن فرنٹ۔ کامرہ راہ امان انڈیا خاں پاکستانی حکام کی مدد سے تجویز مرگزیوں کے منصوبہ بنا رہا ہے۔ امان انڈیا خاں ان کثیر فیوجانوں کی حمایت حاصل کر رہا ہے جن کا تعلق پاکستان فوار کیمبرے گروپوں کے ساتھ ہے۔ ان میں ہیمپلر لیگ، اسلامی سٹوڈنٹس لیگ، املہ آزادادی اور تیوں و کثیر لبریشن فرنٹ شامل ہیں۔ امان انڈیا کا مقصد ہے کہ ان فوجوں کو تربیت دی جائے اور انہیں پنجاب طرز پر کلہاڑیاں کرنے کے لئے تیار کیا جائے۔

۳۱ جولائی اور یکم اگست کی درمیانی شب اور ۳۱ اگست کو انت نامگ میں ہونے والے حملے خیرپور کی تربیت یافتہ فوجوں کی کارستانی معلوم ہوتے ہیں۔

بد قسمتی کی بات ہے کہ سربراہ رسالہ ایجنسیاں پاکستان اور کثیر فیوجانوں کی فعل و حرکت کا بروقت پتہ لگانے میں ناکام رہیں۔ ان ایجنسیوں کو اس فعل و حرکت کا اسی وقت پتہ چلا جب ان میں سے چند فوجان پاکستان سے تربیت اور ہتھیار لے کر واپس آچکے تھے۔

اس امر کی اطلاعات بھی تعین کثیر فیوجان پنجاب گئے ہیں تاکہ مشترکہ محاذ کے لئے وہ پنجاب کے دہشت گردوں کے ساتھ رابطہ قائم کر سکیں۔ بہر حال وہاں انہیں سرحدی کا سامنا کرنا پڑا۔

تفصیل سطح پر سرحد پار کے واقعات، ریاست پر اپنے اثرات چھوڑ سکتے ہیں۔ جنل نیلانی کی موت کے سبب تحریک کاری کے واقعات، سرحد پار کے واقعات، ریاست پر اپنے اثرات چھوڑ سکتے ہیں۔ جنل نیلانی کی موت کے سبب تحریک کاری

مسئلہ کشمیر کے بارے میں بات کرنے کے لئے مجبور ہو جائیں اور یہاں پر پھیل پیدا کریں پہلے ہی اس مسئلے کا تعلق ناوابستہ ملکوں کے گروپ کی شٹنگ میں اٹھایا گیا ہے اور چونکہ جماعت اسے بار بار اٹھا رہی ہے۔

جب کہ سرحد پار سے تحریکی کارروائیوں کے نتیجے کو روکنے کے لئے ہوشیاری کی ضرورت ہے مگر ریاست میں دہشت گردی کے موثر دفاع اسی صورت میں ممکن ہے جب ریاستی حکومت کی تشکیل نو اور اصلاح کی جائے، مضبوط اور متوازن ترقی حاصل کی جائے۔ اور اس کے ساتھ ہی تقریروں اور انتخاب کے سلسلے میں جانبداری کو ختم کیا جائے۔

اس ماہ کے دوران ہونے والی گڑبڑ نے ایک مرتبہ پھر جموں و کشمیر کے انتظامی ڈھانچے خاص طور پر پولیس میں کمزوریوں اور کوتاہیوں کو طشت از باہم کیا ہے۔ کمزور سربراہ رسانی پیشگی منصوبہ بندی کے عمل میں سید راہنشاہت ہوئی یہاں تک کہ جب گڑبڑ کا پیشگی اندازہ ہو چکا تھا ایک ٹھوس حکمت عملی طے نہیں ہو رہی تھی۔

ریاستی انتظامیہ کی عام انتظامی قدریں ابھی تک تشہد تکمیل ہیں۔ بہت زیادہ تعطیلات ہوتی ہیں اور بہت کم پیداواری کام کیا جاتا ہے۔ سول اور فوجی سرنگوں پر وقت اور توانائی ضائع کی جاتی ہے۔ بجری ٹیکس کے واجبات ۵ کروڑ روپے ہیں اور ۲۰ کروڑ روپے کے بنک قرضوں کی وصولی بھی ایک دشوار امر ثابت ہو رہی ہے۔ فاضل اخراجات بہت زیادہ ہیں۔ سکرپٹ میں عملہ ضرورت سے زیادہ ہے۔ یومیہ اجرت پر تقریروں کا عمل جاری ہے جس سے خزانہ عامرہ پر غیر ضروری بوجھ بڑھ رہا ہے تحریک کار عناصر کی طرف سے چیلنج کا موثر طور پر سامنا کرنے کے لئے معاملے میں ہماری ریاست سود مند انتظامیہ فراہم کرنے میں معیارات پر پوری نہیں اتری جب کہ دوسری ریاستوں میں ڈپٹی کمشنر اور سپرنٹنڈنٹ آف پولیس، آئی اے ایس اور آئی پی ایس، پڑوسے والے ہیں۔ مگر ہماری ریاست میں ۵ فیصد اساتذہ بر غیر کاؤڈر افسران تیناٹ ہیں۔ اس معاملے میں اصلاح کی اشد ضرورت ہے۔ اسے ایک نئی صورت اور نئی سوچ دینے کی ضرورت ہے۔ بروقت سربراہ رسانی حاصل کرنے کی فوری طور پر ضرورت ہے۔ گھبراہٹ کے عالم میں رد عمل سے کنفیوژن پیدا ہوتا ہے اور بہت سارے گھٹاؤ اور تخطیاں رہ جاتی ہیں۔

عوامی زندگی کی تقدیس میں اعتقاد بہت کم رہ گیا ہے۔ چند معاملے خواہ وہ از حد کم ہوں اخلاقی قدروں کے لئے تباہ کن ہیں۔ اب سامنے آ رہے ہیں اور رشوت مستانی کی شکی لہر رواں دواں ہے۔

مختصر یہ کہ ان رجحانات اور شکی رجحانات سے ظاہر ہے کہ ریاست میں سیاسی نظام اور انتظامیہ مدوق ہیں۔ مگر گہری انتشار کی شکا ہے۔ نیشنل کانفرنس میں کوئی دلولہ نہیں رہا، جوش نہیں رہا، تنگ نظری اور بنیاد پرستی کا ڈھنڈو رہ پٹنے والے اپنا کام بڑھ چڑھ کر رہے ہیں اور سیکولزم فوار قوتوں نے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ سرحد پار سے ہونے والی کارروائیوں کے سامنے مہیب ہو رہے ہیں۔ ہنگامہ پیشوار ریاست کے اندر آچکے ہیں یا ہو سکتا ہے کہ آئے ہوں۔ سربراہ رسالہ ایجنسیاں معیارات پر پوری نہیں اتری ہیں۔ سرحد پار سے نقل و حرکت کا پتہ نہ چلنے پر ان کے ترکش کے تیر لپٹی گلی کھول چکے ہیں۔ ابھی یہ مسائل بھی کم نہ تھے کہ مصائب کا پیمانہ بڑھ کر آنے لے۔ علاقائی ایجنسیاں ابھر کر سامنے آچکی ہیں، جمہوریت کے بے تحاشہ استعمال سے اس کے چہرے پر چھڑیاں نمودار ہونے لگی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ریاست کے مجموعی ڈھانچے کے تار نکلنے لگے اور اب سامنے کمزور نکالنے نمایاں ہو چکے ہیں۔

حالانکہ اپریل اور جون ۱۹۸۸ء کے مہینوں میں بھی میں نے اسی قسم کی عبارتوں کا اندراج کیا ہے مگر میں نے یہ لازمی سمجھا کہ ماہ اگست ۱۹۸۸ء کی عبارتوں سے زیادہ انتہا سادہ دوں۔ ان عبارتوں کے علاوہ سے نہ صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مجھے کچھ آپسکی قہمی بلکہ ان لوگوں کی فیروزے داری کی مد بھی سامنے آتی ہے جن پر مرکزی سطح پر کارروائی کرنے کا فرض مائد ہوتا تھا۔

ماہ ستمبر کے دوران میری دائری میں مندرجہ ذیل عبارت درج ہے :-

”ماہ ستمبر میں بھی تحریری کارروائیوں میں کمی کا کوئی رجحان سامنے نہیں آیا۔ اگر کچھ ہوا تو یہ کہ ان مگر میں میں اضافہ ہو چکا ہے۔ ۱۰ ستمبر کو شام دیر گئے والی باغ مندر سری محرم میں چند غیر شناخت شدہ افراد نے اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ ۱۸ ستمبر کی درمیانی رات کو کوئی آئی جی کثیر رتی جی محمد والی اور اس کے کنبے کے افراد کو ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس کارروائی میں اعلیٰ ساخت کے ہتھیاروں سے لیس چار افراد ملوث تھے۔ ان میں سے ایک دہشت گرد مسٹر ٹکراؤ میں مارا گیا اور اس سے رومی ساخت کی ایک ہندو ق برآمد ہوئی۔ یقین کیا جاتا ہے کہ حملہ آور جوں و کشیر لبریشن فرنٹ کے ممبران تھے اور انہیں پاکستان میں ہتھیار چلانے کی تربیت دی گئی تھی۔ ۲۲ ستمبر کو ریشا نرڈ سیشن جی کے گن جو، جس نے مقبول بٹ کو پھانسی کا حکم سنایا تھا، کے گھر پر فائرنگ کی گئی۔ ۲۳ ستمبر کو ۸ بجے رات، ڈی آئی جی۔ اور آئی جی۔ سی آئی ڈی کے دفتروں کے درمیان لگی میں بے تحاشہ فائرنگ کی گئی۔ ۲۴ اور ۲۵ ستمبر کو موٹر سائیکل پر سوار دہشت گردوں نے سرنگریو میوزیم کے باہر ڈیوٹی پر تعینات سنتری پر فائرنگ کی۔

مندرجہ ذیل کے گئے چند افراد کی تعینات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک اچھی فامی مقدار میں فوجان سرحد پار کر کے ہتھیار لے کر پاکستان چلنے کی تربیت حاصل کرنے کے لئے گئے تاکہ وہ یہاں تحریری کارروائیاں کر سکیں۔ اس صورت حال کا سب سے بد نصیب پہلو یہ ہے کہ پاکستان جاتے یا وہاں سے واپس آتے ایک بھی شخص کو پکڑا نہ گیا اور نہ ہی کوئی ہتھیار برآمد کیا گیا اور نہ ہی انہیں درغلانے والے کسی شخص کو ڈھونڈ نکالا گیا۔ یہ معاملہ اس وقت سامنے آیا جب گولیاں ہوا میں لہرائے گئیں اور ہم پھٹنے لگے۔ مذہبی پلیٹ فلوموں سے مولوی مسلسل سیاسی مشورے دیتے رہے ان کا واسطہ ظہیب سے کم اور سیاست سے زیادہ ہے۔ مختلف علاقوں کے اجتماعات جمعہ میں وطن خوانی کے بعد مولویوں اور ذہنی زاروں نے اپنے علاقے میں دینی محکم پیر وکاری قائم کر لی تھی۔ یہاں تک کہ سیاسی شخصیتیں بھی حضرت بل اور دوسری درگا ہوں سے اہم تقریریں کیا کرتے تھے۔

جماعت اسلامی، علماء اسلام، اسلامی شوقش لیگ اور اہل حدیث مقامی رواجوں پر تاثر ڈال کر دھمکے اور وہ پاکستان اور بنگلہ دیش کی اسلامیت سے تحریک حاصل کرتے۔ ایسے قلمی اداروں کو بند کیا جانا مقصود تھا جو ناہنجرت ہمنوں میں تنگ نظری کا پرچار کرتے مگر حفاظت کو عملی صورت نہیں دی گئی۔ قدیم اور دیرینہ قدروں کے قلعے کی جڑوں کو ہی کھوکھلا کیا جا رہا تھا۔“

۱۰ اور ۱۱ اکتوبر ۱۹۸۸ء کو صدر جمہوریہ کی صدارت میں ہوئی گورنروں کی کانفرنس میں اپنی دائری میں مندرجہ عبارتوں کی بنا پر میں نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ اس کانفرنس میں وزیر اعظم اور نائب صدر جمہوریہ، مرکزی وزیر داخلہ اور مرکزی کابینہ کے دیگر ممبران بھی شامل تھے، معلوم ہوتا تھا کہ میرے جیسے کے ساتھ سیم کو اتفاق سے مگھ اس کے

بعد کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔

جنوری ۱۹۸۹ء کے درمیان درج عبارت میں میں نے ایک مرتبہ پھر اس بات کو ظاہر کیا کہ تحریر کارروائیاں کے حوصلے کس طرح بڑھتے جا رہے ہیں اور ان کے امکانات کس طرح جارحانہ اور جنگجوانہ لب و لہجہ اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ وزیر اعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی طرف سے افسوس ناک حد تک سنجیدگی کے فقدان کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے۔

ماہ فروری ۱۹۸۹ء کے دوران اپنی عبارتوں میں میں نے ان سختوں کا احاطہ کیا جو اس طوفان کی پیش گوئی کرتے ہیں۔ میں نے لکھا۔

”دہشت اور تحریک کاری کے واقعات جلاتاں جاری ہیں۔ اس ماہ کے دوران ۱۱ ہڑتالوں کا اہتمام ہوا اور جنوں بم دھماکے ہوئے اور سیٹھ کوٹ کی تعداد میں افراد مجروح ہوئے۔ دو افراد لقمۂ اجل بھی بن گئے۔

”یوم شہید مقبول بٹ“ اور ”ٹینک ورسز“ کی اشاعت نے تحریک کاروں کو بند اور ایچیٹین کرنے اور جذبات کو بھڑکانے کا موقع فراہم کر دیا۔

۱۱ فروری کو ”یوم شہید مقبول بٹ“ کے روز وادی میں وسیع پیمانے پر گڑ بڑ ہوئی اور اس کی ریہرسل کے طور پر دو دن پہلے ہی دھماکوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس روز وادی میں عملی طور پر سری نگر اور اہم قصبوں میں تمام دکانیں بند رہیں۔ وسیع پیمانے پر تشدد کی کارروائیاں بھی ہوئیں۔

۱۱ فروری کے روز ہونے والی گڑ بڑ نے حکومت کی سیاسی اور انتظامی کمزوری کو عیاں کر دیا۔“

سیاسی سطح پر نیشنل کانفرنس (ایٹ)، اور کانگریس (آئی) کارکنوں کی کوئی بھی سرگرمی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ حیرت کی بات ہے کہ سرنگری شہر کی نمائندگی نیشنل کانفرنس (ایٹ) کے ممبران اہلی کرتے ہیں اس کے باوجود چند دکانیں بھی نہیں کھل سکیں۔ حکمران اتحاد کے سیاسی لیڈروں کی سست روی اور بے عملی یا تو صبر کھائے یا اذیت خیز ذمہ داری کے علامات ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لیڈر اپنے ذاتی تحفظ کی روش اختیار کرتے ہوئے جموں و کشیر لبریشن فرنٹ، پیپلز لیگ، جماعت طلباء، مسلم شوقش فیڈریشن، الیگ اور ضیا ٹائیگر جیسے عناصر کے لئے میدان ہموار اور کھلا چھوڑ رہے تھے۔ بد قسمتی سے وزیر اعلیٰ نے اسٹریٹیا اور سنگاپور جانا مناسب سمجھا۔ اس سے نہ صرف سیاسی کارکنوں کو رہبری کا فقدان رہا۔ بلکہ عام لوگوں میں بھی بھاری ناراضگی پھیلی۔

یوم مقبول بٹ کی گڑ بڑ ابھی کم نہیں ہوئی تھی کہ اسلام آباد میں امریکی کچول سنٹر کے باہر ٹینک ورسز کے خلاف احتجاج کر رہے ہجوم پر فائرنگ ہو گئی۔ ۱۳ فروری کو ’فوری بند‘ اور اس میں ہونے والی گڑ بڑ کے سبب پولیس فائرنگ میں ایک شخص مارا گیا اس کے بعد ۱۳، ۱۴، ۱۵ اور ۲۶ فروری کو بھی بند منقذ ہوئے اور گڑ بڑ ہوئی۔ ان کا عام طرز عمل یہ تھا کہ عوامی گاڑیوں پر پتھر اڑا دیا جاتے اور نماز جمعہ کے بعد پولیس پر حملہ کیا جاتے۔ ان تقریروں کا لب و لہجہ ”اسلام کے خلاف سازشیں“ تھا۔

سیاسی ماحول میں گرمی پیدا کرنے کے اپنے منصوبے میں کامیابی کے بعد پوٹریاڑی کی ہم جاری رہی۔ ”الینگ“ اور ”ضیا ٹائیگرز“ جیسی نئی تنظیمیں ابھر رہی ہیں۔ عسکریت بڑھ رہی ہے۔ ضرب کرنے بھاگ جانے کی حکمت عملی کے استعمال

میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ بشیر شاہ جیسے شریک پسند رہنما پولیس کو قتل دے کر گرفتاری سے بچ رہے ہیں۔

عوام کی مشکلات کا ازالہ کرنے میں ریاستی حکومت کی مسلسل ناکامی، ترقیاتی میدان میں کامیابی نہ رکھنے کا فقدان نہ صرف متاؤ میں اضافہ کرتے ہیں بلکہ سینیٹک اور سزکی اشاعت جیسے واقعات کے پیش نظر بنیاد پرست عناصر کو عوام کے مذہبی جذبات بھڑکانے میں معاون و مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ درحقیقت ریاست میں موجودہ گڑبڑ کی وجہ عوام کے دل میں تین وہ ظلم و غصہ ہے جو حکومت کی غلط کارکردگی کے باعث ہے۔

ان خطیوں کے علاوہ جو براہ راست دہشت گردی کی مرکب میں چند ایسے بھی گروپ موجود ہیں جو تحریک کی قوتوں کو ہوا دیتے اور ان کی تشو و تہمت کے لئے موافق فضا پیدا کرتے ہیں۔ ان گروپوں کی سرگرمیاں بالواسطہ ہوتی ہیں مگر یہ گروپ بھی اسی قدر مہلک ہوتے ہیں کیونکہ یہ اس نفسیاتی اساس کو قائم رکھتے ہیں۔

۲۶ جنوری ۱۹۸۳ء کو یوم سیاہ منانے کے لئے تحریک کار عناصر کی طرف سے دی گئی کال کے جواب میں محکمہ برہنہ رہی۔ فرقہ پرست، آئنگ نظریہ تحریک کار عناصر زیادہ سرگرم ہو رہے ہیں اور ایڈمنسٹریشن الگ تھلگ پڑتی جا رہی ہے۔ سیاسی سطح پر اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے نہ تو نیشنل ڈیفنس اور نہ ہی کانگریس آئی میں رجحان موجود ہے۔ سرحد پار سے آئے ہوئے بھاری تعداد میں ہتھیاروں اور اسلحہ بارود کی برآمدگی ابھی کیا جانا باقی ہے۔ مقامی سرانفرسانی نظام وقت کے تقاضوں پر پورا نہیں اتر رہا ہے۔ مزید بڑا تحریک کار عناصر کو سیاست دانوں کے ایک ایسے گھونٹے سے براہ راست اور بالواسطہ حمایت بھی حاصل ہے۔ ان میں خاص طور پر جماعت اسلامی، جیلز لیگ اور عازاد اذادی شامل ہیں۔ جماعت اسلامی کارکنوں کی طرف سے سید علی شاہ گیلانی اور کشمیر لبریشن فرنٹ کے مقبول بٹ کی تقریروں والے کیشتوں کی جماعت اسلامی کا کنول کیونٹے تقسیم اس طرز کو فہم کرتی ہے۔ الطاف خاں عورت اعظم انقلابی جو حقیقی قبضے کا زور جو کر کے پاکستان چلا گیا تھا اب بھی وہاں سے تحریک کار روایوں میں مصروف ہے۔ اسے اداروں کے حمایتیوں کو کشمیر لبریشن فرنٹ کے امان انٹرفائن کی طرف سے تمام تر امداد حاصل ہو رہی ہے۔ اب یہ منظر "ہم جو کہ نام پر سرگرم عمل ہے۔"

کشمیر کی سیاسی سوئی پاکستان میں ہونے والے واقعات کے مطابق حرکت کرتی ہے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کا حالیہ بیان کہ مسئلہ کشمیر کے حل اور سیاہ چن کی تجاویز، شانے کی بابت ملحقین جنرل ضیاء کے موقف سے مطابقت رکھتے ہیں، ضروری کو محترمہ بے نظیر بھٹو نے مطالبہ کیا کہ ہندوستان کو سیاہ چن گلشیر سے نہیں ہٹا لینا چاہئے۔ مسئلہ کشمیر کی بابت اس نے کہا: "ہماری پولیٹیشن کی اساس اقوام متحدہ قرار داد ہے جس کے مطابق ریاست جوں و کشمیر کا اٹکان یا تو پاکستان یا ہندوستان کے ساتھ جمہوری طور پر غریب جانبدار رائے شماری کے ذریعے ہونا چاہئے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ مسئلہ ملحد کے مطابق دو فریقی گفت و شنید ہونی چاہئے تو یہ بھی اقوام متحدہ قرار داد کی بنا پر ہے۔" اگرچہ کشمیر میں بنیاد پرست اور سخت گیر عناصر اب بھی محترمہ بھٹو کو حمایتی نہیں سمجھتے مگر اب وہ اس کے ساتھ اتنی نفرت بھی نہیں کرتے کیونکہ اس نے اسلامی جمہوری اتحاد پر سبقت حاصل کی ہے۔ اور وزیر اعظم منتخب ہوتے ہی انھیں یہ یقینی ہے کہ پاکستان کی اندرونی سیاسی مجبوریوں کی باعث جلد یا بدیر اسے سخت

ان عناصر کے لئے خدا داد موقع تھا یہاں تک دیگر سیاسی قوتیں جو مرکز کی زیادہ مخالف نہیں ہیں، بھی رشدی معاملے میں شرکت کر گئیں۔ اس بات کو کوئی نہیں سوچتا کہ ہند اور پاکستان میں جو بھی لوگ سینیٹک اور سز کے خلاف ایجنٹیشن کر رہے ہیں، خواندہ بھی نہیں، وہ محض ملاؤں کے ہاتھ میں آکر استعمال بن رہے ہیں اور ایسے لیڈروں کے ہاتھ کھیل رہے ہیں جو مذہبی جنون کو ہوا دینے میں ماہر ہیں۔ کشمیر میں یہ بات پوری طرح عیاں ہے کہ سیاست مذہب کی باندی رہی ہے۔ شیخ عبدالنور سے لے کر موجودہ رہنماؤں تک نیشنل کانگریس کے لیڈروں کے سوائے سبھی نے عملی طور پر اپنے سیاسی مقصد کے لئے مذہب کا استعمال کیا ہے۔ وادی میں یہ بات عملی طور پر ایک حقیقت ہے جہاں ہر جرحہ کو سیاسی تقریروں اور مذہبی وعظ کا میلان ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ بات حیران کن نہیں کہ اس ماہ کے دوران ہونے والے گڑبڑ کے کئی واقعات نماز جمعہ کے بعد رونما ہوئے ہیں جب کہ لوگ مسجد سے واپس آ رہے تھے۔

مئی ۱۹۸۹ء کے دوران میں نے تحریر کیا :-

"نوجوان طبقہ اب خفا اور غصیل ہے۔ یہ اب مذہب کی آڑ لے رہا ہے جس سے اسے عام لوگوں کی ہمدردی اور حمایت حاصل ہوتی ہے۔ ملحدانہ پسند کیڈری تنظیم۔ جے اینڈ کے لبریشن فرنٹ نے پہلے ہی دس ضرب کاری دیتے قائم کرنے کا اعلان کیا ہے۔ اس نے جمہوری اتحاد پاکستان کی حمایت کا دعویٰ کیا ہے۔ ایک اخباری بیان میں اس نے اعلان کیا ہے کہ ضرب کاری "الجباد" دستے کی سربراہی جاوید احمد میر کرے گا۔ ہمزہ دستے کا سربراہ عبدالغفار ہوگا، وکٹوری کمانڈر زکی مظفر شاہ، آزاد جانا باز کمانڈر زفر خوس، غلام حسن لون، متبذ ضیاء ٹائیگرز کی ممد اشرف الفتح کی جاوید احمد، صدائے جانا باز کمانڈر فورس کی عبدالحمید المہبتول کی مشتاق احمد اور مسلمین کمانڈر فورس کی سفید رسول عقداں اور پاک کمانڈر فورس کی قیادت رومی اسلام کریں گے۔"

اپریل اور مئی ۱۹۸۹ء کے دوران میں نے دو ذاتی خط راجیو گاندھی کو تحریر کر کے تاکہ اس کی توجہ نازک صورت حال کی طرف مبذول کرائی جاسکے۔

میرا ۸ اپریل کا خط مندرجہ ذیل ہے۔

پیارے وزیر اعظم!

صورت حال تیزی کے ساتھ خراب ہو رہی ہے۔ قریباً یہ ناقابل واپسی نقطہ پہنچ چکا ہے۔ گزشتہ پانچ دنوں کے دوران تشدد، لوٹ مار، آتش فشاں، گولہ باری، ہڑتال اور ہلاکتیں کیا کچھ نہیں ہو چکا؟ آخر لینڈ کے ممبران کی بات کرتے ہوئے برطانوی وزیر اعظم ڈورائیل نے کہا تھا۔ "ایک روز یہ آلو ہوتے ہیں تو دوسرے روز پلوپ ہوتے ہیں۔ اس طرح کشمیر کی موجودہ صورت حال ہے۔ اگر کل مقبول بٹ تھا تو آج سینیٹک و سز، کل یہ یوم جہاد اور پرسوں کچھ اور ہوگا۔ ذیہ علی الگ تھلک بڑھ چکا ہے۔ وہ سیاسی اور انتظامی طور پر گر چکا ہے۔ شاید آئینی رسومات ادا کرنا ہی باقی ہے۔ اس کی گرفت گمراہ آلودہ ہے اور کمزور بنیادیں اسے کھڑا نہیں رکھ سکتیں۔ ذاتی انحرافات نے اس کی عوامی ساکھ کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ حالات کا تقاضا ہے کہ موثر مداخلت کی جائے۔ آج یہ بروقت ہو سکتی ہے اور عمل کو کافی دیر ہو چکی ہوگی۔"

آپ کا صادق
(دستخط) جگموہن

میرا ۱۲ مئی کا خط مندرجہ ذیل تھا۔
پیارے وزیر اعظم!

۸ سے ۱۳ مئی تک ۱۴ بجے دھماکے، فائرنگ اور کراس فائرنگ کے چھ واقعات رونما ہو چکے ہیں چار افراد جان بحق اور ۲۰ مجروح ہوئے۔ گھر گھر سے سرنگ آ رہی ایک ٹورسٹ بس پر گولیاں چلائی گئیں جس سے چار سیاح زخمی ہوئے۔ موجودہ انتظامی اور سیاسی ڈھانچہ اپنے فریضہ کی ادائیگی کے میاں پر پورا نہیں اتر رہا ہے۔ ہر سال کے عرصے کے دوران تحریک کاروں کے حربوں کو ناکام بنانے کے لئے کوئی قابل قدر سرگرمی دکھائی نہیں دی۔ یہ امر اور بھی باعث تشویش ہے کہ تحریک کاروں کی ہر ایک "ختم" سے ان کی صفوں میں اضافہ ہو رہا ہے اور منافرت اور مناقشات کا دھارا مرکزی حکام کی طرف موڑا جا رہا ہے۔ میں نے وزیر اعلیٰ سے اپنی تشویش کا اظہار اشارتاً کر دیا ہے۔

آپ کا صادق
(دستخط) جگموہن

بدقسمتی کی بات ہے ان خطرات کی تمام تر واضح آگاہیوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہر شے کے لئے ایک موقع و محل ہوتا ہے۔ بدن میں سوزش کو اس وقت سے قبل روک کر نا ضروری ہے اس سے پہلے کہ یہ ناقابل علاج ہو جائے۔ اگر اسے نظر انداز کر دیا جائے تو اس کا نیا زہ بگھٹنا بڑے گا۔ اور ماضی کی غلطیوں کی قیمت قوم آج ادا کر رہی ہے۔

باب چار

دہشت گردی کی جڑیں

”وہا کون سی جڑیں ہیں جو
ان شاخوں پر گرفت رکھتی ہیں
جو سنگھلاخ مہلے سے پیدا ہوتی ہیں۔“
ٹی۔ ایس۔ ایلینٹ

گذشتہ باب میں میں نے مندرجاتے ہوئے خطرات کی ایک وسیع تر تصویر پیش کی ہے۔ یہ وہ اشارات ہیں جو ایک ایسی مجاز شخصیت کی طرف سے پیش کئے گئے جو گورنر کی حیثیت رکھتی تھی۔ مگر ان آگاہیوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ طوفان کی گرج تو کیا یہاں تک کہ گھر کے آس پاس ہونے والی چیخوں اور شور و شش کی آواز بھی نہیں سنی گئی۔ اس گھر کے نگہبان خود فریبی اور وہم کے نشے میں اس قدر چور تھے کہ چہرے مارتے ہوئے دروازوں کی آواز بھی انہیں بلا نہ سکی۔

آئینہ دو ابواب میں میں ان جڑوں اور ان کے ثبوت کو مہربند کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے علیحدگی پسندی اور تحریک کاری کی موجودہ فصل کو نشوونما دی ہے۔ تحریک نفسیات میں بار بار زہریلے بیج بوئے گئے۔ اور ان پر کھلی کھاد ڈالی گئی۔ اور جن پر ان فصلوں کی بوائی کو بند کرنے کا ذمہ تھا۔ وہ تاریخ کے بنیادی اسباق سے بھی واقف نہ تھے۔ ایک بدعت کے ساتھ سمجھوتہ مزید بڑی بدعت کو فروغ دینے کے مترادف تھا۔ ایک غیر آسائش کن حقیقت کو نظر انداز کرنا اسے مزید پیچیدہ بنانا تھا۔ ایک بزدل ظالم کے سامنے

جھگٹنا اعلیٰ روز متصا ب کو ملانے کے مت را و ف تھا۔

نرم روی اور غیر فرائم رویے کا انجم

۲ اکتوبر ۱۹۸۸ء کو بھارتی گاندھی کے یوم ولادت پر سرنگر کے بانی گورنر کپیلکس میں اُن کا بت نصب کیا جانا تھا۔ اس تقریب کا اعلان ہو چکا تھا۔ ہندوستان کے چیف جسٹس آرائس پائٹک نے رسمی طور پر یہ بت نصب کرنا تمام رجنہ مسلم و کلائے اس پر غدر اٹھایا۔ انہوں نے تقریب کے موقع پر گڑ بڑ کرنے کی دھمکی دی۔ چنانچہ یہ تقریب منسوخ کر دی گئی۔ جو کچھ ہوا اس کی کیا پیسہ دگیاں تھیں؟ کشمیر ایک سیکولر ہندوستان کا جزو، جہاں انصاف کے اعلیٰ ترین مقام پر بھی بابائے قوم جس نے مذہبی رواداری برقرار رکھنے کے لئے اپنی جان تک قربان کر دی، کا مجسمہ نصب نہیں ہو سکتا جس کے بارے میں آئین شامی نے کہا تھا۔ "آئینہ نسلیں مشکل سے اس بات پر یقین کریں گی کہ ایسا شخص واقعی اس دنیا میں رہتا تھا" مجسمہ نصب کرنے کے خلاف واہلا کرنے والوں کا لیڈر کون تھا؟ یہ کوئی اور شخص نہیں بلکہ جے اینڈ کے بایکورٹ کا ایک ایڈوکیٹ اور نیشنل کانفرنس کا سرگرم رکن محمد شفیع بٹ تھا جسے بعد ازاں نومبر ۱۹۸۹ء کے لوک بھا انتخابات کے دوران پارٹی کانٹکٹ حاصل ہوا۔ ان دنوں نیشنل کانفرنس (ایف) اور کانگریس (آئی) کی حکومت تھی اور اقتدار پر چھٹے بنے رہنے کے لئے اصولوں کی پاس داری نہ کرنا ان کا مزاج تھا۔ اُن کانگریسیوں کا کردار بھی ویسا ہی تھا۔ جو اس وزارت کا حصہ تھے کہ جب یہ تقریب منسوخ کر دی گئی تو ایک معمولی انگلی تک نہیں اٹھائی گئی۔ ایک دھمکانے والے شخص کی ہوس کو تیز کرنے کا اور کوئی بہتر طریقہ نہیں تھا۔ دھمکانے کی کاروائیوں سے بہتر نتائج حاصل نہیں ہو سکتے تھے شرارت انگیزوں کو معلوم تھا کہ اس سے زیادہ بے اعتنا اور غیر پابند حریت نہیں مل سکتا۔ کیا ان کے لئے یہ سوچنا ایک قدرتی امر نہیں تھا کہ اس قسم کے دھمکانے والے حربے استعمال کرنے سے وہ زیادہ بہتر نتائج حاصل کر سکتے ہیں اور ان کی ہوس مزید بڑھ سکتی ہے۔ صرف وہی لوگ جو سادہ لوح ہوں۔ اس امر پر یقین کر سکتے ہیں کہ کشمیر کے حالات کے پیش نظر بنیادی اصولوں کے ساتھ سمجھوتہ اور جھجک جانے کا مطلب دہشت گردی اور عسکریت کو دعوت دینا نہیں۔ جو لوگ اہم عہدوں پر فائز تھے اُن کا ذہن کس انداز سے کام کرتا تھا۔ یہ لوگ اعلیٰ

پنشن اور دوسرے فائدے حاصل کرتے رہے۔ ایسا ہی ایک شخص جو جے اینڈ کے بایکورٹ کا سابقہ چیف جسٹس مفتی بہاؤ الدین ہے جس کی آواز وہ رٹ پیشین ہے جو اس نے دائر کی ہے۔

"کہ قریباً بیالیس برس قبل ہندوستان نے دھوکے فراڈ اور طاقت کے ذریعے ریاستی عوام کی اسلامانہ خواہشات کے برعکس، جموں و کشمیر ریاست کو غصب کر لیا، کیا یہ سازش نہیں؟ کیا یہ علیحدگی پسندی نہیں؟ کیا یہ قابل مذمت نہیں؟۔ میں اس بات کا فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں۔ مگر ایک بات واضح ہے کہ یہ غیر فرائم حکمت ہند کی مایوس کن تصویر پیش کرتی ہے۔"

"ریاستی عوام کو شرارت کی بو آگئی اور انہوں نے مصمم ارادے کے ساتھ تحریک حریت کو جاری رکھا۔..... جلد ہی ہندوستانی فوج کشمیر میں آگئی اس نے تحریک حریت کے مجاہدوں پر بھڑک پڑا اور ریاست میں جبر و استبداد کا راج شروع کیا۔ ایک سابق فوج اور نیشنل کانفرنس کا سابقہ رکن یہ سوچتا ہے کہ حملہ آور تحریک حریت کے سپاہی تھے۔ اور ہندوستانی فوج وہاں کشمیر کے دفاع کے لئے نہیں بلکہ جبر و استبداد کا دور لانے کیلئے گئی۔ حقیقت سے اس سے زیادہ انحراف نہیں ہو سکتا۔"

"ہندوستانی حکومت نے پاکستان کو کمزور کرنے اور اُس کے حصے کرنے کا اور اپنی طاقت کے بل بوتے پر کشمیر پر اپنی سرداری قائم رکھنے کا ایک منصوبہ تیار کیا۔"

کیا یہ کسی ہندو مخالف، پاکستانی ایجنٹ یا کسی تحریک کار تنظیم کے سربراہ کی تند آواز نہیں مگر یہ ایک سابقہ چیف جسٹس کی آواز ہے جو حلف نامے پر اس قسم کے بیانات دے رہا ہے۔ مگر اس قسم کے حالات کے لئے کس کو مؤثر الزام ٹھہرایا جائے۔ کیا یہ چند شاطر لوگ تھے یا وہ لوگ جو اس قسم کے لوگوں کے ہاتھوں بے وقوف بنتے رہے۔ کیا یہ مملکت ہند کی نرم کوکھ نہیں جس نے فریب کاری اور ناوفاواری کو مجب دیا۔ اعلیٰ ہند سرور سز کے چند اراکین (آئی، اے، ایس۔ آئی پی، ایس آئی ایف ایس وغیرہ) نے اپنے لئے کانیت کی جاکڑ ضروریات کو پورا کرنے کے مقصد سے ایک ہاؤسنگ کو آپریٹو سوسائٹی قائم کی۔ جون ۱۹۸۵ء میں یہ سوسائٹی راج ترنگنی کے نام سے رجسٹر کی گئی۔ اس معاملے کو ایک شدید بحث کا موضوع بنایا گیا جس کی بنیاد یہ تھی کہ جو افراد

مستقل باشند مگر ریاست نہیں وہ باؤسنگ کو اپرٹو سوسائٹی کے اراکین کی حیثیت سے رہائشی پلاٹ حاصل نہیں کر سکتے۔ نیشنل کانفرنس کے چند ممتاز ممبران جیسے عبدالرشید اور شریف الدین شارق نے مارچ ۱۹۸۸ء میں یہ معاملہ ریاستی اسمبلی میں اٹھایا اور اس سوسائٹی کی رجسٹریشن کی شدید نکتہ چینی کی یہ بحث اس کے باوجود چھیڑی گئی کہ ان افسران نے زندگی بھر ریاست میں ملازمت کٹی اور ان کی تعداد صرف ۳۲ تھی۔ ان آئی اے ایس اور آئی پی ایس افسروں کو ایک نوآبادیاتی طاقت کے ایجنٹ قرار دیا گیا۔ ان کا موازنہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ کیا گیا اور اس میں دفعہ ۲۰ کا کوکھ لانا دکھایا گیا۔ یہ بھی الزام لگایا گیا کہ آبادی کے توازن کو اٹھانے کی ایک سازش کی گئی ہے۔ اس سازش میں شریک افراد پر مقدمہ چلانے کا مطالبہ کیا گیا۔ انتہائی مایوسی کے عالم میں ان افسروں نے سوسائٹی کو ختم کر دیا۔ کسی کو بھی زمین حاصل نہیں ہوئی۔

اس معاملے کا غیر متعلقہ پہلو یہ ہے کہ سوسائٹی کی رجسٹریشن کی بابت کوئی سماجی نہیں ڈھونڈی گئی بلکہ ظاہر کیا گیا روایتی مرکز اور اس کے نمائندوں کے خلاف توہین آئین الفاظ کا استعمال اور کشمیریوں کے دلوں میں دوسوے پیدا کئے گئے۔ کشمیری سیاست دانوں کا یہ خاص رجحان رہا ہے کہ وہ خود کو ایسے ہیرو کے طور پر ظاہر کریں جو سامراجی قوتوں کے خلاف برسرِ پیکار ہیں اور یہ سامراجی افراد عزت مند باشندوں کے مفادات کو قربان کر کے خیمہ زن ہونا چاہتے ہیں۔ کیا کسی کو یہ چھوٹے چھوٹے ہیرو دکھائی نہیں دیتے جو مرکز کی علامات کی توہین کر رہا ہو اور سامراجیوں کو تحس تحس کرنے کی بنا پر اپنی سیاسی ساکھ قائم کر رہا ہے؟ اس قسم کے چھوٹے ہیرو کو کل کے بڑے ہیرو دکھائے جیتکیں گے جس کے پاس زیادہ وحشی لاشیں، کلاشنکوف ہوگی وہ اس کھیل سے زیادہ لطف حاصل کرے گا۔ اور اس کے عتاب ہونے والے افراد سے زیادہ بلند آواز میں ستائش حاصل کرے گا۔ نفرت اور مناقشات کے اس نفسیاتی ماحول کا انجام تشدد اور خونریزی کے سوا کچھ نہیں۔

اس معاملے میں نیشنل کانفرنسی رہنماؤں نے اس قدر گرد اٹھائی کہ پاکستانی ذرائع ابلاغ کو یہ بہانہ آسانی سے مل گیا۔ ایک ممتاز اخبار نویس رقمطراز ہے۔

”کشمیر میں ہندوستانی افسروں کی طرف سے اپنے مکان تعمیر کرنے کے مقصد سے راج کرنگنی کو اپرٹو باؤسنگ سوسائٹی کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ اس طرح وہ کشمیری

”اکھڑے ہوئے پناہ گزینوں“ کی حیثیت سے وہ فلسطین میں بس گئے تھے۔ اور آخر انہوں نے عربوں کو اپنی ہی سر زمین سے نکال پھینکا۔ ایک سازش کے تحت کشمیر میں ہندوستانی افسروں نے ایک سوسائٹی کی تشکیل دی۔ اسے رجسٹر کروایا۔ حکومت کی طرف سے مالی امداد حاصل کر لی اور زمین خرید لی۔ اور وہ اپنے اراکین کے لئے مکان تعمیر کرنے کے لئے پوری طرح تیار تھے۔ مگر یہ بات باہر آ گئی۔ اخبارات، مسجدوں اور یہاں تک کشمیر کی قانون ساز اسمبلی میں بھی کافی شور اور ہنگامہ ہوا۔ کشمیر نیشنل کانفرنس کے اراکین نے بھی طوفان کھڑا کیا۔ کشمیر میں ماحول خطرناک صورت اختیار کر گیا۔

اس کے نتیجے کے طور پر ہندوستان کے ہندوؤں نے خود بخود رضا کارانہ طور پر اس سوسائٹی کو توڑ دیا۔ اور کہا کہ یہ ناکام ہوئی ہے یا کشمیر کے عوام کی طرف سے اس کی مذمت کی گئی ہے۔“

یہ ہندوستانی افسروں کی کو اپرٹو سوسائٹی کی داستان ہے اور آخر کار کشمیر میں ہندوستانی سامراجی منصوبوں کا بھی ہی حشر ہوگا۔ ہندوستانی حکمرانوں کو اس واقعہ سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ اس نوآبادیاتی سوسائٹی کے خلاف تمام حزب مخالف اور حکمران ممبران صف آرا ہو چکے ہیں اور کشمیر کی ہندوستان کے ساتھ زبردستی شادی کے باسے میں بھی یہی رائے ہے۔ ہندوستان کو اس سارے معاملے پر سوچنا چاہیئے۔

ذرا سوچئے۔ محض ۳۲ اراکین کی باؤسنگ سوسائٹی نے اس کشمیر میں نوآبادیات کا نظریہ پیش کر دیا جس کی آبادی ۶۰ لاکھ ہے۔ دیکھیے تو چند افسروں کی مکمل طور پر بے حشر خواہش جس کے مطابق وہ اپنے ہی ملک میں زمین حاصل کرنا چاہتے تھے اور اس معاملے کا مقابلہ فلسطین میں یہودی بستیوں سے کیا گیا۔ مگر اس قسم کے زہریلے پروپیگنڈے کے لئے ذمہ دار کون ہے؟ نیشنل کانفرنس کے سوا دوسرا کوئی نہیں جو ریاستی سطح پر حکومت کی سینئر شریک کار ہے اور مرکزی سطح پر حکومتی جماعت کی اتحادی ہے۔ اس بیمار کوکھ سے اور کس بات کی توقع ہے۔ اس قسم کی مضحکہ خیز پالیسیوں کے لئے کیا قیمت نہیں چکانی پڑتی۔ نفرت کا یہ نفسیاتی ماحول ایک دن کیا تشدد کی طرف نہیں لے جائے گا۔

مرکزی حکومت نے مذہبی اداروں (اشاد) استعمال بے جا ایکٹ ۱۹۸۸ء نافذ کیا۔ یہ قانون جموں و کشمیر کے سوائے سبھی ریاستوں میں قابل نفاذ تھا۔ دفعہ ۳۰ کے پیش نظر ریاست میں اس ایکٹ کی توسیع کے لئے ریاستی سرکار کی منظوری لازمی تھی۔ مگر یہ منظور سے نہ گئی۔ کیونکہ جموں و کشمیر مختلف ہے اس کی شخصیت مختلف ہے۔

مسئلہ دھماکے ہوئے جن میں جان و مال کا نقصان ہوا۔ اس سے اگلے روز سرینگرانت ناگ اور دوسرے قصبوں میں زبردست گڑبڑ ہوئی۔

امام کے دورے کے دوران اس کی سرگرمیوں سے ماحول میں متناؤ بھر گیا۔ اسلحہ گودام میں بم دھماکوں نے چنگاری کا کام کیا اور وسیع پیمانے پر گڑبڑ شروع ہو گئی۔ ان واقعات میں ایک شخص ہلاک ہوا اور تنگو کے قریب افراد زخمی ہوئے۔ ایک فوجی جیب سمیت مبین گاڑیوں کو آگ لگا دی گئی۔ اور سات دوکانوں کو لوٹا گیا۔ گڑبڑ کی یہ وارداتیں اس وقت ہوئیں جب سری لنکا کے وزیر اعظم مسٹر پیریم داسا اتفاق سے سرینگر شہر کے دورے پر تھے۔ ایسی ٹیشن کرنے والوں نے ہندوستان اور سری لنکا میں سنبھالی مسلمانوں کے قتل کے خلاف نعرے لگائے۔

امام نے اس انداز میں اپنا فضل کیوں سرانجام دیا؟ وہ ایسے فعل کا مرتکب کیوں ہوا جسے ایک ذی شعور ذہن کے مطابق سفید اشتعال انگیزی اور صاف فرقہ واریت سے موسوم کیا جاسکتا ہے؟ بھوپال گیس المیہ میں جو کچھ مسلمانوں کے ساتھ ہوا اس کی بجائے پاکستان میں اسلحہ گودام کے المیہ کے شکار لوگوں کے ساتھ ہمدردی کیوں جتانی گئی۔ یہ گڑبڑ پیریم داسا کے دورے کے وقت ہی کیوں کی گئی؟ یہ مظاہرین وطن دشمن و فاداریوں کا مظاہرہ کرنے سے کیوں کر خوفزدہ نہ تھے۔

ان تمام اور متعلقہ سوالات کا جواب اس عام رجحان میں مضمر ہے جس کے تحت بدعت کا علاج قلیل مدتی اقدامات کے تحت یہاں وہاں پیوند لگا کر کیا گیا اور اس بات کی توقع کی گئی کہ جو زہریلی ندی ہمارے سیاسی ڈھانچے کے درمیان — بہہ رہی ہے۔ وہ آکھیں موند لینے پر غائب ہو جائے گی۔ زندگی کا اصول یہ نہیں ہے۔ قدرت اس بات کی اجازت نہیں دیتی۔ زہریلی ندیاں اتنی آسانی سے نہیں منتیں وہ اکثر رواں دواں رہتی ہیں کناروں کی گہرائی کو کمریدتی ہوئی، بعض اوقات کناروں سے اچھال کھا جاتی ہیں اور اپنی زہریلی مٹی اپنے پاٹ سے بھی پردے جمع کرتی ہیں۔

وادی کے کشمیری عوام میں اپنی لیڈر شپ کو مضبوط بنانے اور کچھ ڈرامائی کام کرنے کے مقصد سے ۱۳ جولائی ۱۹۷۹ء کو شیخ عبداللہ نے یوراج کرن سنگھ کو ایک قانون کا مسودہ ارسال کیا جس کے مطابق ۸۲ کنال سے زائد ۱۰۰۰۰ اجاگیر داروں کی زمینوں کو بلا کسی معاوضے کے چھین لینے کا حق طلب کیا تھا۔ چونکہ اس مسودے سے بھاری تعداد میں عوام متاثر ہوتے تھے۔ یہ مسودہ قانون یوراج نے وشنو سہائے سیکرٹری معاملات ہرائے

اس کی شناخت مختلف ہے۔ ایسے قانون کے نفاذ ریاست میں کمیوں نہ لگو کیا جائے۔ جس کا مقصد مذہبی مقامات کا سیاسی مقاصد کے استعمال کا انسداد کرنا تھا۔

ایسے قانون کی ریاست جموں و کشمیر سے کہیں اور زیادہ ضرورت نہیں کہیں اور مذہبی مقامات سیاسی مقاصد کے لئے یہاں سے زیادہ استعمال نہیں ہوتے۔ مذہبی جنون اور بنیاد پرستی کے بیج کہیں اور زیادہ اشتعال انگیز طور پر نہیں بوئے گئے جتنے کہ یہاں پر مسجدوں کی تلمیذیں ہر جمعہ کو بوئے گئے ہیں۔ کہیں بھی اس بات کا متواتر پرچار نہیں کیا گیا کہ ہندوستانی جمہوریت غیر اسلامی ہے، ہندوستانی سکولرزم غیر اسلامی ہے اور ہندوستانی سوشلزم غیر اسلامی ہے۔ اس کے باوجود ریاست میں اس بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا گیا۔ جہاں دو ایسی جماعتیں حکومت کرتی ہیں جو سیکولر ہونے کا دم بھرتی ہیں۔ مرکزی حکومت نے بھی ملک کے دوسرے حصوں کے ساتھ اس معاملے میں شامل ہونے کے لئے ریاستی حکومت کو قائل کرنے یا اس پر دباؤ ڈالنے کا اپنا فرض ادا نہیں کیا۔ مجھے اس بات میں سائش کی بو آئی کہ جو بات ہندوستان کے ۱۰ کروڑ مسلمانوں کے لئے اچھی سمجھی گئی وہ کشمیر کے ۴۰ لاکھ مسلمانوں کے لئے اچھی نہیں سمجھی گئی۔

ملک پر قوم پرست طاقتوں کے حکومت کرنے کا کیا فائدہ جب وہ قومی مفادات میں کام نہیں کر سکتے۔ جب وہ فرقہ پرستی کی سیاست کے غلام رہیں! جب وہ کردار کی بجائے گفتار پر انحصار رکھیں۔ جب انہوں نے رہبری نہیں کی بلکہ ٹوٹ گئے، جھٹک گئے۔ جب انہوں نے فرقہ پرست عناصر کو ختم نہیں کیا بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کی۔ جب انہوں نے مضبوط انسانی اور رومانی قدروں کی اساس پر نئے سماج کی تعمیر نہیں کی بلکہ شعوری اور غیر شعوری طور پر انہوں نے ظلمت کا تباہ ہوتے ہوئے بدبودار قلعے کی حرمت و تجدید کے لئے ہر ممکن اقدام کیا۔ اور جب انہوں نے ہمارے آئین کے بنیادی اصولوں کی بجائے مصاصمتوں کو ترجیح دی۔؟ ان تمام باتوں کا کیا انجمن ہو سکتا تھا؟ کیا اس بات کو سمجھنے کیلئے کسی خاص نظر کی ضرورت تھی کہ یہ مصنوعی قومیں ہیں کہاں لے جائیں گی۔

۸ اپریل ۱۹۸۸ء کو اننت ناگ میں نماز جمعہ کے موقع پر جہاں مسجد دہلی کے امام نے ایک زہریلی تقریر کی۔ اس نے پاکستان کو ازجذبات کو ابھارا اور رنگ نظرری اور بنیاد پرستی کی آگ کو ہوا دی۔ اس کی طرف کشمیر کی بابت اقوام متحدہ کی قراردادوں سے اس کے اندرونی منشا کا اندازہ ہو جاتا تھا اس نے ان قراردادوں کی مکمل عمل آوری پر زور دیا۔ اس کی اس تقریر کے دو دن بعد راولپنڈی کے نزدیک پاکستانی اسلحہ گودام میں

کشمیر کو سونپ دیا تاکہ اس معاملے پر حکومت کا مشورہ حاصل کیا جائے۔ شیخ عبداللہ کو اس بات کا پتہ چل گیا۔ وہ طیش میں آ گیا۔ اس نے یو راج سے کہا کہ اُسے مرکزی حکومت کی رائے حاصل کرنے سے کوئی سروکار نہیں اُسے آئینی سربراہ کی حیثیت سے محض اس قانون پر دستخط کرنا ہے۔ یو راج نے اس صورت حال سے دشمنو سہائے کو آگاہ کیا اور بتایا کہ شیخ عبداللہ نے اس سے کیا کہا ہے۔ بہر کیف حکومت ہند نے اسے اس تجویز کو اس عبارت کے ساتھ واپس ارسال کرنے کا مشورہ دیا کہ اس قانون کے چونکہ دور رس اثرات ہیں اور ابھی تک دستور ساز اسمبلی بھی موجود نہیں ہے۔ چنانچہ مرکزی حکومت کے ساتھ مشورے کے ساتھ اس کا جائزہ لیا جانا چاہیے۔

مرکزی حکومت کے واضح موقف کے باوجود شیخ عبداللہ نے اس قانون کو لال چوک سرنگر میں منعقدہ یوم شہداء کے جلسے میں اعلان کر دیا۔ گو پالا سوامی آئینگر چاہتا تھا کہ رد عمل کے طور پر حکومت ہند کو اس قانون کے کالعدم ہونے کا اعلان کر دینا چاہیے۔ مگر جو اہر لال نہرو نے اس بات کی اجازت نہ دی اور شیخ عبداللہ من مانی کر گیا۔

یہاں پر قابل غور پہلو یہ بات نہیں کہ آیا یہ قانون ترقی پسند نوعیت کا تھا۔ یا اس سے فرقہ واریت کی بو آتی تھی یا قانونی نکتہ نظر سے واجب تھا بلکہ یہاں یہ بات قابل ذکر ہوگی کہ حکومت ہند کو قوت ارادی کے مغلوب ہونے کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا۔ جس سے شیخ میاں سلطان کی طرح عمل کرتے ہوئے حکم عدولی کرتا رہے۔ حکومت ہند اُس وقت اس بات کو محسوس کرنے میں ناکام رہی کہ شیخ عبداللہ کو خوش رکھنے کی مسلسل پالیسی آخر ایک بار ایسے مقام پر پہنچا دے گی۔ جہاں سے اُسے نیچے کھینچنا پڑے گا، اسے ہر طرف کرنے اور گرفتار کرنے کا انتہائی اقدام اٹھانا پڑے گا۔ اور تمام متعلقہ افراد کے لئے اس کا انجام ناخوشگوار ہوگا۔ گذشتہ ۴۳ برس سے ہندوستان میں فیصلہ کر نیوالے افراد کے مابین میونخ اور روم سے ہوتا رہا ہے۔ ایک بہم کسی امید پلٹی رہی کہ کل سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر یہ بھی درست نہیں ہو گا۔ تاریخ کی منطق اس کے برعکس ہے۔ بُرائی کے سامنے نہ جھکنے کا انجام بھی اس کے برعکس ہے۔

محبت اور ہمدردی کا جذبہ ایک بات ہے۔ بزدلی اور اباحت اور بات۔ کھوکھلی اور غیار اندہ قدروں اور نرم اور مصنوعی رویوں سے کبھی فائدہ نہیں ہوتا۔ ان سے جارحانہ مزاج کی حوصلہ شکنی نہیں بلکہ حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ بنیادی قدروں کے عوض لمحاتی امن کی سودے بازی کا مطلب مستقبل کے لئے گڑبڑ اور طوفان کے بیج بونا ہے۔ وہ

دوسری طرف انتشار کے عمل کو تیز تر کرتا ہے اور اس حد سے زیادہ خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ ایک دھمکانے والے شخص پر بروقت اشارہ اس کی گرمی کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ آخری تجربے کے مطابق اباحت دونوں طرف تباہ کن ہوتی ہے۔ درحقیقت تمام متعلقہ افراد پر یہ بات صادر آتی ہے۔ ان کے لئے بھی جو ایک طرف کھڑے رہ کر اسے دیکھتے ہیں۔ کشمیر میں جو کچھ ہو رہا ہے کیا یا اس امر کی اپنے آپ شہادت نہیں دیتا ہے۔

قریب کاری اور دوغلے پن کی سیاست

نرم اور لچیلے — رویے کے اندرونی ڈھانچے میں جو خامیاں تھیں ان میں قریب کاری اور دوغلے پن کی سیاست بھی شامل ہو گئی اور یہ بات جموں و کشمیر کی سیاست کی ایک خصوصیت بن کر رہ گئی۔ ہر ایک بنیادی اصول کے ارد گرد وفاق داری اور تسلسل کے فقدان کا حلقہ قائم ہوا۔ آیا یہ سیکولرزم خود مختاری یا جمہوریت تھی ایک ہی لیڈر نے مختلف موقعوں پر مختلف رنگ بدلے اور مختلف موقف اختیار کئے۔ مثال کے طور پر شیخ عبداللہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کشمیر میں وہ ایک فرقہ پرست ہے۔ جموں میں کمیونسٹ ہے اور فی دہلی میں قوم پرست ہے۔

بہت سے کشمیری سیاستدان مختلف دوغلی آوازوں میں بات کرنے کے ماہر ہیں۔ وہ بیک وقت سیکولر اور فرقہ پرست جمہوریت پسند اور املا حاق کے حامی اور پاکستان نواز ہو سکتے ہیں۔ اس امر سے پس پردہ کا آخری امر اصول پرستی نہیں بلکہ اقتدار ہے۔ ایک شخص اور اس کے گرد حواریوں کے لئے اقتدار۔ اگر مرکزی لیڈر کشمیری لیڈروں کو اپنے من مانے انداز میں حکومت کرنے دیں خواہ یہ انداز قومی بلکہ ریاستی مفادات کے حق میں بھی نہ ہو تو وہ جمہوریت، سوشلزم اور سیکولرزم کے اصولوں کے دلدادہ ہوتے ہیں اور اس صورت میں ہند کے ساتھ الحاق حتمی ہوتا ہے۔ دوسری طرف اگر ان کے اختیارات کے استعمال پر انگلی اٹھائی جائے یا کسی ذاتی ہوس پرستی کا افساد ہو جائے۔ تو یہ الحاق عارضی ہو جاتا ہے تو اس صورت میں خود مختاری کشمیر کے تشخص اور شناخت کے مسئلے اٹھائے گئے۔ اور فرقہ دارانہ جذبات کو ابھار گیا۔

اگست ۱۹۵۳ء میں اقتدار سے ہاتھ دھونے کے قبل شیخ عبداللہ سیکولرزم کی گیت گاتا تھا۔ مگر جب جموں و کشمیر میں ایک الگ شناخت کے طور پر کانگریس پارٹی کا قیام ہوا تو شیخ عبداللہ نے کانگریس کے خلاف فتویٰ جاری کر کے اسے "کافر جماعت" قرار دے دیا۔

دے دیا۔ ایک مذہبی مطلق العنان کے عین مطابق اس نے اعلان کر دیا کہ ایسے مسلمانوں کے لئے "منازعت زدہ" ادارہ ایک گناہ ہوگا جو اس جماعت کے رکن ہوں۔

کیا ایک حقیقی سیکولر شخص فتویٰ جاری کرے گا۔ کیا وہ اس زبان میں بات کرے گا۔ جس میں شیخ عبد اللہ نے کی۔ کیا یہ کسی رجعت پسند اور بنیاد پرست شخص کی زبان سے کسی قدر مختلف ہے۔ کیا یہ کسی تحریک کا مذہبی اخراج قرون وسطیٰ کی سیاست کو واپس نہیں لائے گا۔ اور عوام کو ناروا دار اور تنگ نظر نہیں بنائے گا۔ کیا یہ سیاسی وفاداریوں کی اساس سیکولرزم کی بجائے اسلام نہیں بن جائے گا اور کیا یہ پاکستان کے تین اندرونی کشش پیدا نہیں کرے گا۔ زیادہ اے بھٹو نے اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا تھا۔ اس لئے اس نے ۱۹۷۴ء میں ڈاکٹر فاروق عبد اللہ کے ساتھ شیخی بگھاری تھی: "خواہ تین برس یا اتنے ہی عرصے کے لئے ہندوستان کشمیر کو دی جائے والی امداد کو دو گنا کر دے اور اس عرصے کے لئے پاکستان آزاد کشمیر کو دی جانے والی امداد بند کر دے گا۔ اس کے بعد رائے شماری ہوئی چاہیئے" اس کا نتیجہ پھر بھی پاکستان کے حق میں ہو گا۔

شیخ عبد اللہ نے مذہب کو سیاسی رنگ دیا۔ اس نے ہندوستان کے خلاف بنیاد پرستی اور جذباتی اساس کو فروغ دیا۔ اس کا سیکولرزم محض ایک واویلا تھا۔ جو صرف اس کی اقتدار کی ہوس سے مطابقت رکھتا تھا۔ وہ بعد ازاں اپنے بیٹے اور دوسرے نیشنل کانفرنسیوں کی طرح نہ تو سیکولر تھا اور نہ ہی بنیاد پرست اُسے محض اختیار کی ہوس تھی۔ اس کے موقف کا تعین حصول اقتدار کے لئے اس کی حکمت عملی سے ہوتا تھا۔ کسی دوسری جگہ ناخواندہ عوام کے اعتقاد کا اس قدر بے شرمی سے استعمال نہیں کیا گیا اور کہیں بھی عوام کی آنکھوں میں اس قدر دھول نہیں جھونکی گئی جیسا کہ کشمیر میں ہوا ہے۔

کشمیر اکارڈ (۱۹۷۵ء) کے بعد دوبارہ اقتدار حاصل کرنے کے بعد شیخ عبد اللہ ایک مرتبہ پھر سیکولرزم کا سب سے بڑا بجا و بن گیا۔ مگر ۱۹۷۷ء کے اسمبلی انتخابات کے دوران جو کچھ شیخ عبد اللہ نے کیا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر یہ دکھا دیا کہ اس نے اسلام کا استحصال اپنے مفادات کے لئے کیا ہے۔ ۱۹۷۷ء کے لوک سبھا انتخابات میں محمد مندر را کاندھی کی شکست کے بعد جب جنتا پارٹی نے اقتدار سنبھالا تو پہلے اس نے جنتا پارٹی کو خوش کرنے کی کوشش کی اور اپنی جماعت کے دو ممبران پارلیمنٹ بیگم اکبر جہاں

جنتا پارٹی نے اپنے بل بوتے پر اسمبلی انتخابات لڑنے کا فیصلہ کیا، اس نے فتوہ دارانہ بنیادوں پر نیا دکھانے کی کوشش کی۔ اپریل ۱۹۷۷ء میں اس نے کہا — "کشمیر کانگریس ایک گندی نالی ہے۔ جنتا پارٹی کی زیر قیادت جمہوریت کو یقینی طور پر تقویت حاصل ہوگی" ہم اس کے اتحادی بننے کے متمنی ہیں۔ جن سنگھی ہمارے بھائی ہیں، مگر اس کے ایک ماہ بعد جون ۱۹۷۷ء میں انہی نے کہا: "جنتا پارٹی مسلم مخالف ہے اور یہ پارٹی جن سنگھ کا دوسرا لبادہ ہے۔ جن سنگھیوں کے ہاتھ اب بھی مسلم خون سے رنگے ہوئے ہیں" اس نے اپنے کارکنوں کو ہاتھ میں قرآن شریف دے کر بھیجا اور کشمیری مسلمانوں سے تلقین کی کہ وہ کافروں کی اس جماعت کو ووٹ نہ دیں۔

شیخ عبد اللہ جیسے لیڈروں کو چونکہ مذہب کو سیاسی مقاصد کے لئے استحصال سے فائدہ پہونچا ہے مگر یہ بات ناقابل مہم ہے کہ موجودہ دور کے نوجوان بھی لازمی طور پر اس حکمت عملی کا استعمال کیوں کر رہے ہیں؟ مسجدوں پر سینکڑوں کی تعدادیں لاؤڈ اسپیکر نصب کئے گئے ہیں اور شیخ عبد اللہ اور اس کی نیشنل کانفرنس کی طرف سے شروع کئے گئے عمل کو جاری رکھنے اور اسے تیز تر کرنے کے لئے مذہبی مقامات سے تقریریں کی جاتی ہیں۔ جب اُمت اسلامی کے سربراہ ڈاکٹر قاضی نثار کی مارچ ۱۹۸۷ء کے دوران مذہبی جذبات کے استحصال کے لئے نیشنل کانفرنس نے نکتہ چینی کی تو اس نے واپس جواب دیا تھا: "ہمیں یہ سب کس نے سکھایا؟ شیخ عبد اللہ اپنی تمام زندگی یہی کرتا رہا ہے۔ کیا وہ درگاہ حضرت بل سے اپنی تقریریں نہیں کرتا تھا؟ کیا نیشنل کانفرنس کے رکن ۱۹۷۷ء اور ۱۹۸۳ء کے انتخابات کو جھوٹ گئے ہیں جب وہ ووٹ حاصل کرنے کے لئے اپنے ہاتھوں میں قرآن شریف اٹھائے پھرتے تھے؟"

الحاق کے بارے میں بھی فریب کاری اور دو غلے پن کا وہی عمل دیکھا گیا۔ بنیادی طور پر شیخ عبد اللہ نہ تو ہندوستان چاہتا تھا اور نہ ہی پاکستان کسی مخصوص لمحے پر یہاں تیار کا کھیل تھا جو اپنی وقت رکھتا تھا۔ ۱۹۷۷ء سے ۱۹۵۲ء تک وہ بار بار اعلان کرتا رہا کہ ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کی اساس بنیادی اصولوں پر ہے اور یہ ناقابل منسوخ ہے۔ ۱۹۷۸ء میں اس نے جواہر لال نہرو سے کہا: "ہم نے اپنا انتخاب کر لیا ہے اور اپنا نصیب ہندوستان کے ساتھ والیتہ کر دیا ہے ہمیں اب کوئی انگ نہیں کر سکتا۔" مارچ ۱۹۷۹ء کو اس نے اعلان

کیا۔ ہم نے ہندوستان کے ساتھ کام کرنے اور اس کے ساتھ جینے مرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔
ایک طرف جیپ وہ اس قسم کے عہد و پیمان کر رہا تھا تو دوسری طرف ہی وہ اس کے ساتھ ایک آزاد خود مختار
کشمیر کے لئے حمایت حاصل کرنے کی خاطر مختلف اداروں کو اشارے کر رہا تھا۔ یہاں تک
کہ ۲۸ جنوری ۱۹۴۸ء کو ہی شیخ عبداللہ نے آزادی کے موضوع پر امریکی اہلکاروں سے
تبادلہ خیالات کیا۔ یہ بات وارن آسٹن کی طرف سے شیخ عبداللہ کی ۲۸ جنوری ۱۹۴۸ء
کو ملاقات کے بعد سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کو ارسال ایک نوٹ میں درج ہے۔ ۳۱ اپریل
۱۹۴۸ء کو شیخ عبداللہ نے سکائش میں ما کے مائیکل وڈسن کو ایک انٹرویو دیا جس میں
اس نے کہا: اقوام متحدہ کی طرف سے ضمانت شدہ آزاد کشمیری واحد حل ہو سکتا ہے۔
۱۹۵۰ء میں سر اوون ڈکسن کو شیخ عبداللہ نے مشورہ دیا کہ کشمیر کا ایک ممکنہ حل آزاد کشمیر ہو گا۔
اس وقت شیخ عبداللہ نے آزاد کشمیر کے لیڈروں کے ساتھ دو فریقی بات چیت کرنا شروع
کیا تھا۔

یہ اس شخص کی ذہنی کیفیت ہے جس کے بارے میں ۱۳ نومبر ۱۹۵۲ء کو پنڈت نہرو نے
مباراجہ کے نام ایک خط میں لکھا تھا۔ یہی شخص کشمیر میں کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔
دہلی معاہدے پر عملدرآمد کے سلسلے میں بھی فریب کاری اور دوغلی پن کا یہی طرز
عمل دیکھا گیا جیسا کہ باب دوم میں اشارہ دیا گیا ہے۔ اس معاہدے کے تحت جو عقدہ شیخ
عبد اللہ کے لئے سازگار تھا اُسے رو بہ عمل لایا گیا اور شیخ عبد اللہ نے رنگ بدل لیا۔
اس مرحلے پر نہرو کی پوزیشن قریباً قابل رحم تھی۔ اپنے تمام انڈے ایک ہی ٹوکری
میں رکھنے کے بعد نہرو کو یہ معلوم نہیں تھا کہ جب ٹوکری سرکنے لگی ہے تو انڈوں کو کیسے
بچایا جائے۔ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۳ء کے عرصے کے دوران کشمیر کی بابت تمام خطوط میں اس نے
ایک ہی اصطلاح کا استعمال بار بار کیا۔ ”مجھے معلوم نہیں“ مثال کے طور پر ۲۵ اپریل ۱۹۵۲ء
کے شیخ عبد اللہ کے نام اپنے خط میں نہرو نے کہا۔ ”مجھے پتہ نہیں کہ میں کیا کر رہا ہوں“ اسی
طرح ۲۷ اپریل ۱۹۵۲ء کو نائب وزیراعظم بخشی غلام محمد کو تحریر کردہ ایک خط میں نہرو

۲۸۔ ۲۸ جنوری ۱۹۳۸ کو شیخ عبداللہ کے ساتھ انٹرویو کے بعد شیٹ ڈیپارٹمنٹ کو وارن بیٹین کا لٹ۔ فارن ریلیشنز

آئی یونائیٹڈ سٹیس جلد ۵ حصہ اول صفحہ ۲۹۲

۱۔ مکمل متن کے لئے ملاحظہ ہو۔ ایڈیٹر ٹیٹیف مفسر ۱۹۶۳ء۔ ۱۹۴۰ء (پارٹ سار جمعی حکومت ہند ۱۹۸۵ء)

نے کہا۔ مجھے اس معاملے کے ساتھ نمٹنے میں کوئی عار نہیں مگر میں کشمیر کے اس معاملے کی بابت خود کو نہایت لاچار محسوس کرتا ہوں کیونکہ مجھے پتہ نہیں کہ میں کہاں کھڑا ہوں سہراگست ۱۹۵۲ء کو شیخ عبداللہ کو ایک اور خط میں پنڈت نہرو نے لکھا، "اقوام متحدہ کے ساتھ ملاقات یا پاکستان میں رونما ہونے والے واقعات مجھے ذرا بھی تشویش نہیں مگر بعض اوقات مجھے ان واقعات سے تشویش ہو جاتی ہے جو کشمیر میں رونما ہوتے ہیں میں نے وہاں شبہات اور الجھیچاہٹ محسوس کی ہے اور واضح نظریات اور انداز فکر کی پہنچنگی کا وہاں فقدان ہے۔" مارچ ۱۹۵۳ء کو مولانا آزاد کے نام ایک خط... میں نہرو رقمطراز ہے؛ "مجھے خدشہ ہے کہ شیخ اپنی موجودہ ذہنی کیفیت میں کچھ ایسا نہ کرے جو مناسب نہ ہو یا وہ اقدام نہ لے جس سے حالات مزید بدتر ہو جائیں۔ اس سے قبل بھی نہرو نے شیخ عبداللہ کے دو غلطے پن سے مات کھائی تھی۔ سہ جولائی ۱۹۵۰ء کو شیخ عبداللہ کے نام ایک خط میں نہرو نے کہا۔ "میں نے نہ تو کشمیر اور نہ ہی آپ کے بارے میں ایسا سوچا تھا۔ اور جب میرے نظریات اور افعال کی بنیادیں ہی ہل جائیں تو میں نہیں سمجھتا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے"

شیخ عبد اللہ کے نظریات میں دو غلطے پن اور فریب کاری کی علامات کو دیکھ کر اور اس سے قبل شیخ عبد اللہ کی ضرورت سے زیادہ مدح سرائی کر کے اگست ۱۹۵۳ء میں نہرو اپنی غلط روش پر پکڑے گئے تھے جب انہوں نے غصہ کیا کہ شیخ عبد اللہ کو ہر طرف کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ اس غیر متوازن انداز فکر کی وجہ سے اُسے خود متضاد فیصلے کرنا پڑے۔ اس کی وجہ سے نہ صرف اس کے بین الاقوامی وقار کو نقصان پہونچا بلکہ ملک کی شبیہ بھی مسخ ہوئی۔ ہندوستان کو برٹریڈرسل کے ان مشاہدات میں باتیں سننا پڑیں۔ "جب کسی کو بین الاقوامی معاملات میں ہندوستان کی اعلیٰ اصول پرستی دکھائی دیتی ہے۔ اور کشمیر کے سوال پر یہ اصول پرستی بالکل الٹ جاتی ہے تو مایوسی کے احساس سے احتراز کرنا مشکل امر ہے۔ نہرو کے نکتہ چینیوں کو اُسے 'ہرولٹس کافرڈ' قرار دینے کا موقع مل گیا۔

چند حلقوں میں یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ نہرو کو شیخ عبداللہ کی ہر طرفی اور گرفتاری کی بابت معلوم نہیں تھا۔ مثال کے طور پر گنڈیو یا اس قسم کا دعویٰ کرتا ہے مگر اس سے زیادہ ناقابل یقین بات کوئی اور نہیں ہے۔ کشمیر پالیسی کی بابت نہرو اس قدر اجارہ دار تھا کہ

+++۔ حمل متین کے لئے ملاحظہ ہو کہ اس کو پال کی کتاب: جواہر الالہیہ دے یا شوگرانی جلد دوم، افسوس! بدینوری پریس میں

اس کی معمولی سے معمولی باتیں بھی نہرو کی منظوری کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتی تھیں اور شیخ عبداللہ کی گرفتاری جتنا اہم واقعہ نہرو کی ————— دخل اندازی کے بنا کیونکر ممکن ہو سکتا تھا؟

یہاں تک کہ شیخ عبداللہ جیسے نہرو نے فروغ دینے میں حدود کو پہلا لنگا اس کی بابت سخت الفاظ کا استعمال کرتا ہے۔ اس نے آتش چنار میں نہرو کی بابت کہا۔

”نہرو خود کو ملحد کہا کرتا تھا۔ مگر وہ سابقہ وراثت اور ہندوستان کی ہندو روح کا بھی زبردست مداح تھا۔ اگرچہ تاریخ ہندوستان کی بابت اس کی تشریح صحیح واقعات پر مبنی نہیں تھی مگر وہ کے۔ ایم منفی اور دیانند سوسوتی جیسے اجیہا پرستوں کے بالکل قریب تھا۔ وہ خود کو ہندوستان کی تعمیر کا ایک آلہ کار سمجھتا تھا جس کی روح قدیم تھی۔

چنانچہ نہرو کے نظریات میں سیکولی کے سیاسی فلسفے اور جہاد و گری کے اثرات موجود ہیں یہی وجہ ہے کہ با اصول فلسفی اور سادھو بھارتی گاندھی کا ایک پیروکار نہرو بیک وقت چانکیہ کا مداح بھی تھا۔ جو اہل لال نہرو نے کشمیر میں ہماری جانب کھلائی کا انداز فکر اپنایا۔ پاکستان کے ساتھ بھی اس نے اسی انداز میں نمٹا۔ بین الاقوامی سطح پر بھی ہنگری اور دوسرے معاملات پر اس نے میکولن انداز فکر کا مظاہرہ کیا۔

نہرو اپنے دوستوں کے تئیں اپنے فرائض کی ادائیگی میں کسی بھی حد تک جاسکتا تھا۔ مگر وہ یہ سب اسی صورت میں کر سکتا تھا کہ اس کے ذاتی اقتدار اور وقار پر کوئی بُرا اثر نہ ہو۔ مگر جب اس کا اپنا وقار متزلزل ہوتا تھا وہ اپنا موقف بدل لیتا تھا۔ جب میں اس کے لئے فائدہ مند نہ رہا تو اس نے مجھے جیل بھیج دیا۔ اس کی ایماء پر ہی بخشی غلام محمد نے اپنے رہنما، اور اپنی قوم کے ساتھ دھوکا کیا تھا۔ مگر جب نہرو کو اس کی بھی ضرورت نہ رہی تو اسے گھٹے سٹریٹ چل کی طرح نہرو نے کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ عین اسی طرح جب اس کی اپنی پوزیشن کو خطرہ محسوس ہوا تو کرشنا منین جو نہرو کی پالیسی پر ہی عمل پیرا تھا، کو قربانی کا بکرا بنایا گیا۔ اس کو بے عزت کر کے کاہنہ سے نکال دیا گیا۔ میں بھی کرشنا

+ صفحات ۵۵-۵۶ مصنف کی طرف سے اردو ترجمہ آتش چنار کے بارے میں مصنف کا حق نوٹ ملاحظہ ہو۔

جب اس کتاب کو ساہیہ کادی کو انجام حاصل ہوا تو ہندوستانی رائٹس گارڈ نے اس بنا پر اس کی مخالفت

کو پسند نہیں کرتا تھا۔

انجام کار نہرو کے اندر کے چانکیہ نے اُسے تباہ کر دیا۔ چین کی پالیسی کی وجہ سے نہ صرف اُسے سیاسی حُر ب چپی۔ بلکہ دینی نقصان بھی ہوا۔ گاندھیائی قدروں کے وارث کی طرح اس نے اخلاقی قدروں کا پاسدار بننا چاہا۔ مگر اس کے وقار پر شبہات کا اظہار کیا جانے لگا اور اس طریقے سے کشمیر کے معاملات کے ساتھ نمٹنے کی وجہ سے بھی اس کے دعووں کی قلمی کھل گئی۔

بے چارے نہرو کے ساتھ دشمن اور دوستوں کی طرف سے ایک جیسا سلوک ہوا۔ مگر حقیقی خطا شیخ عبداللہ کی طرف سے شروع کی گئی۔ فریب کاری اور دوغلی پن کی سیاست تھی۔ اگر شیخ عبداللہ نے الحاق کے معاملے میں ذرا بھی صدق دلی دکھائی ہوتی تو بد میں آنے والی سب مشکلات اور طوفانوں کو ٹالا جاسکتا تھا۔

اگست ۱۹۵۳ء کے بعد شیخ عبداللہ نے جو کچھ کیا وہ اتنا ہی بے ربط تھا۔ اس کی بہت ساری تقریریں اس کے پہلے کے موقف سے ناقابل فہم تھیں اس نے لگ بھگ پاکستانی لائین اختیار کر لی۔ دار کونسل اور محاذ رائے شماری کے کارکنوں کی وساطت سے اس نے پاکستان کے ساتھ رابطہ بنائے رکھا اور اس وساطت سے اس نے سلامتی کونسل کو اپنا خطرہ سال کرنے کا انتظام کر لیا۔ یہاں تک کہ اس نے پاکستان کی طرف سے فراہم افراد قابل اعتراض مواد اور پیسے سے حکومت کا تختہ پلٹنے کی مجرمانہ سازش بھی کی۔ جب ۸ جنوری ۱۹۵۸ء کو اسے رہا کیا گیا تو وہ نہایت طعنائی کے ساتھ وادی میں داخل ہوا اور مختلف مقامات پر اس نے ہندو مخالفت تقریریں کیں۔ اگرچہ ۱۹ جنوری ۱۹۵۸ء کو وہ نیشنل کانفرنس جماعت کے صدر دفتر مجاہد منزل پر اپنا کنفرول جمائے اور ۲۶ جنوری ۱۹۵۸ء کو بائیکاٹ کی کال میں ناکام رہا۔ کیونکہ اس کیس میں اُسے کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ پھر بھی وہ مغرب عوام کے مذہبی جذبات کو بھڑکا تا رہا اور انہیں شہدائے اسلام کی طرح عمل کرنے کی تلقین کرتا رہا۔ جب آگے ۲۹ اپریل ۱۹۵۸ء کو دوبارہ گرفتار کیا گیا تو اس کی رہائش گاہ سے ایک

+ ملاحظہ ہو باب دوم، تاریخ کا حق یہ کہ اس باب کے بعد میں آنے والے کشمیر کارڈ اور محاذ رائے شماری کی بابت صفحے

+ اس روز شیخ عبداللہ نے پتھر مسجد میں جماعت کی کال دی تھی۔ بظاہر یہ کال منہ راجھو کے لئے تھی مگر نثار کے

بعد مجاہد منزل کا نشانہ تھا جو پتھر مسجد کے سامنے واقع تھی۔ ہماری جھوم جھوم ہو گیا مگر شیخ خود ظاہر نہیں ہوگا

آخری لمحہ اس کی بہت جواب دے گئی تھی۔

ایسی قرارداد کا مسودہ تیار کیا گیا جس میں پاکستان کے موقف کی قریباً حمایت کی گئی ہے۔ کشمیر سازش کیس کے دوران شیخ عبداللہ نے عدالت کے فورم کو ہند مخالف پروپیگنڈہ کے لئے استعمال کیا۔ درحقیقت ۱۹۷۲ء تک زیادہ تر عرصہ اس کا جھکاؤ پاکستان کی طرف رہا۔ یہ شیخ عبداللہ کا ہی پاکستان نواز رویہ تھا۔ جس نے ۱۹۶۵ء برادر کشمیر کشمیر کو غصب کرنے میں پاکستان کی حوصلہ افزائی کی۔ مگر جب اسے مافیہ موسوس ہوا تو اس کے ۱۹۷۵ء میں کشمیر معاہدے پر دستخط کئے اور اپنا موقف بدل لیا۔ اس کے منی الفین کی یہ نکتہ چینی حق بجانب تھی۔ کہ جس "وقار اور عزت کی بات شیخ عبداللہ ۲۲ برس تک کرتا رہا ہے اس کا مطلب" اپنی ذات اور بعد ازاں اپنے فرزند ارجمند ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے لئے وزیر اعلیٰ کا عہدہ، اپنی بیوی اکبر جہان کے لئے پارلیمنٹ کی رکنیت اور اپنے داماد جی ایم شاہ کے لئے وزارت اور دیگر رشتہ داروں اور دوستوں کے لئے جلیل القدر عہدے سب۔

جو شیخ عبداللہ کے بارے میں حقیقت ہے وہی بات کچھ حد تک جی۔ ایم شاہ اور ڈاکٹر فاروق عبداللہ پر بھی صادق آتی ہے۔ جب جی۔ ایم شاہ وزیر اعلیٰ تھا وہ ہندوستان کا زبردست حامی تھا اور اس کے لئے الحاق — ناقابل تخیل تھا۔ اور جب وہ اقتدار سے باہر ہو گیا اس نے کہنا شروع کر دیا۔ "ہر ایک کشمیری مسلم پاکستانی ہے۔ میں بھی پاکستانی ہوں۔ ہندوستان کے ساتھ الحاق کر کے ایک بھاری غلطی کی گئی تھی۔ ۱۹۷۵ء تک جب نیشنل کانفرنس اقتدار سے باہر تھی تو ڈاکٹر فاروق عبداللہ، امان اللہ خان کا بھوکہ رہا۔ ۱۹۷۴ء میں تو اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ کشمیر کی آزادی کے لئے ہر بچہ بچہ اپنا خون بہا دے گا۔" اس کی صدا بندگانِ سرکش کشمیر ریڈیو سے ۲۲ جنوری سے ۲۶ جنوری ۱۹۹۰ء تک نشر کی گئی تاکہ کشمیریوں کو ہندوستان کے خلاف بغاوت کرنے کے لئے اگسایا جاسکے۔ ایک مرحلے پر اسے جی لون ایک کانگریسی وزیر تھا۔ اس وقت اس کی نظموں میں ہندوستان سیکولرزم اور جمہوریت کی ایک جنت کے مترادف تھا اور الحاق کے معاملے کو وہ ایک ٹھوس اور حق بجانب فیصلہ تسلیم کرتا تھا مگر جو بھی وہ اقتدار سے محروم ہوا اس نے عینک بدل لی۔ اس کے لئے ہندوستان فرقہ پرست اور نوا آبادیاتی بن گیا۔ اور اس وقت اس نے الحاق کے فیصلے کو ایک المناک غلطی قرار دیا۔ جب اُسے محسوس ہوا کہ تشدد پر اگسانے سے اُسے مزید فائدہ حاصل ہوگا تو وہ اس حد تک گیا کہ اس نے جنرل دبیہا کے ساتھ قاتلوں کی ستمائش کرنا شروع کر دی اور مسلم نوجوانوں کو شے دی کہ وہ اس

۱۹۸۶ء میں ایک پاکستانی اخبار نویس جو حقیقت میں ہارمبولہ کا باشندہ تھا میسر ساتھ ملاقات کے لئے آیا۔ ہماری گفتگو کے دوران میں نے اس سے پوچھا کہ اس نے اپنے دورہ میں یہاں کے کیا تاثرات لئے ہیں۔ اس نے کہا۔ "میں یہاں کے سیاست دانوں کے بارے میں وٹوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں، کیونکہ میں ان میں سے بیشتر کے ساتھ مل چکا ہوں۔ وہ لوگ جو اس لحاظ سے دار میں ہیں ہندوستان کے حامی ہیں اور جو لوگ اقتدار میں نہیں ہیں پاکستان کے ساتھ ہیں۔"

خیالی پیکر

فریب کاری اور دو غلطیوں کی سیاست نے اس ڈرامے کے مختلف کرداروں کے لئے مختلف خیالی پیکروں کو جنم دیا۔ مرکزی حکومت خاص طور پر جواہر لال نہرو نے ایک قسم کے خیالی پیکر کو پروان چڑھایا۔ جبکہ شیخ عبداللہ اور اس کی نیشنل کانفرنس نے ایک دوسری طرز کے خیالی پیکروں کو مقام دیا۔ اور اس فریب کاری میں کشمیر کا المیہ ہے۔ مرکزی لیڈروں کو توقع تھی کہ وقت گزرنے کے ساتھ کشمیر "قومی نظریے کو ترک کر کے یونین کے ساتھ پوری طرح یکجہتی اختیار کرے گا۔ جبکہ شیخ کی ایک اندرونی مجبوری تھی کہ وہ نیم آزاد شاہنشاہ کی طرح عمل کرنا چاہتا تھا جہاں اس کو روکنے والا کوئی نہ ہو۔

یہاں تک کہ سردار پٹیل بھی ہندوستانی خیالی پیکروں کے چکر میں آگیا۔ جب کشمیر کے لئے خصوصی درجے کے بارے میں گوالا سوامی آئیننگر کے مسودے سے سردار پٹیل نے اتفاق کر لیا تو وہی شکر نے سردار پٹیل کی دانشمندی پر شبہات کا اظہار کیا۔ سردار نے کہا۔ "نہ تو شیخ عبداللہ اور نہ آئیننگر کی کوئی مستقل حیثیت ہے۔ مستقبل کا انحصار حکومت ہند کی طاقت اور اس کی قوت ارادی پر ہے اور اگر ہمیں اپنی طاقت پر اعتماد نہیں تو ہم ایک قوم کی حیثیت سے اپنے وجود کا کوئی حق نہیں رکھتے۔

اس کمپل کے مختلف کرداروں نے جو مختلف خیالی پیکر پروان چڑھائے وہ حقیقت کا روپ نہ لے سکے۔ وہ ہو بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ پیکر آفر پیکر ہوتے ہیں۔ اور وہ زیادہ عرصے تک پیکروں کی صورت میں بھی قائم نہیں رہ سکتے۔ سیاسی، سماجی اور مذہبی حقیقتوں نے آخر انہیں پاش پاش کر دیا۔

چونکہ خام توقعات پیدا کی گئی تھیں اور جذبات کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ چنانچہ بعد ازاں ان امیدوں اور تخیلوں کی صورت اختیار کر لی۔ اور یہ تاغیاں نا امید یوں اور

تنازعوں میں بدل گئیں اور اس کے بعد نئے خیالی پیکروں نے جنم لیا، نئی امیدیں پیدا ہوئیں، نئی تبلیغیال نئی ناامیدیاں اور نئے تنازعات پیدا ہوتے رہے۔ اور یہ چکر چلتا رہا۔ اور اب بھی چل رہا ہے۔ شاید یہ چکر مستقبل میں بھی چلتا رہے۔

ہندوستانی رہبروں نے اس بات کو محسوس نہیں کیا اور نہ ہی وہ اب محسوس کرتے ہیں کہ خیالی پیکروں اور فریب کو ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ ہوائی حلقوں کی جگہ بھوسے عمارتوں کی ضرورت ہے جو مضبوط اساسوں پر قائم کی گئی ہوں۔ اصلی حقیقتوں کی قدر کرنا ہوگی۔ قدیم سوچ کے محدود دائرے کی جگہ نئے خیالات کو لینا ہوگا۔ اجارت کے غنیر صحت مند نتائج کو تسلیم کرنا ہوگا۔ فریب کاری اور غیر صدق دلی کے اندرونی ڈھانچے اور اس مزاج کو ختم کرنا ہوگا۔ جس کے تحت دو قومی نظریہ قائم ہے۔

۱۹۴۵ء کا کشمیر اکارڈ خیالی پیکر پروان چڑھانے کی عادت کا ایک اور نمونہ تھا۔ بنگلہ دیش جنگ کے بعد نئے بدلے ہوئے حالات کی روشنی میں شیخ عبداللہ اور محترمہ اندرا گاندھی کے نمائندوں کے دوران گفت و شنید کا سلسلہ شروع ہوا۔ طویل اور تکلیف دہ بات چیت کے بعد فروری ۱۹۴۵ء میں کشمیر اکارڈ پر دستخط ہوئے۔

کشمیر اکارڈ کی اہم دفعات کے تحت جائداد سے متعلق اختیارات ریاستی حکومت کے پاس قائم رہیں گے۔ اس میں یہ بھی درج تھا۔ ”جہاں آئین ہند کی کوئی ایسی دفعہ جموں و کشمیر کی ریاست میں نافذ، ترمیم یا کسی دیگر طریقے سے رائج ہے اس کو دفعہ ۳۰ کے تحت صدر جمہوریہ کے حکم سے واپس لیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں ہر انفرادی تجویز پر اس کے مثبت اور منفی پہلوؤں کی روشنی میں غور کیا جائے گا۔ مگر آئین ہند کی جو دفعات ریاست جموں و کشمیر پر پہلے ہی بلا کسی ترمیم کے نافذ العمل ہیں ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔

کشمیر اکارڈ کی روح مرکز اور ریاست کے درمیان رشتے پر کسی طور اثر انداز نہیں ہوئی۔ بنیادی طور پر یہ اکارڈ شیخ محمد عبداللہ کو دوبارہ اقتدار میں لانے کا ایک آلہ تھا اور اس کا مقصد یہ تاثر دینا بھی تھا کہ ریاستی خود مختاری کے چند پہلوؤں پر نظر ثانی کی جائے گی۔ محترمہ اندرا گاندھی نے اس اکارڈ کی روح سے اس وقت روشناس کیا جب ۲۴ فروری ۱۹۴۵ء کو انہوں نے پارلیمنٹ میں ایک بیان دیا۔ کسی نے بھی شیخ

عبداللہ کو گزشتہ رول ادا کرنے سے منع نہیں کیا تھا۔ اس عرصے کے دوران معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنا ارادہ بدل لیا جس کے نتیجے میں نا اتفاقی اور ناراضی ہو گئی چونکہ اب وہ پھر بچپتی اور سیکولرزم کے لئے کام کرنا چاہتا ہے تو ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ کشمیر اکارڈ چند پہلوؤں سے سودمند تھا۔ جیسا کہ سورن سنگھ نے اکارڈ کی جوازیت بتاتے ہوئے پارلیمنٹ میں بیان دیا۔ لازمی طور پر تبدیلی کی ایک ضرورت تھی۔ کیونکہ آبادی کا ایک بار سوخ طبقہ ہندوستانی قوم پرستی کے کلیدی دھارے میں نہیں تھا۔ بین الاقوامی ممبران میں بھی ہندوستان کے کیس کو شاید بہتر طریقے سے سمجھا جاسکے گا اور یہ بات اس اکارڈ پر دستخط ہونے سے پاکستان کی ناراضی سے مظہر ہے۔ ریڈیو اے بھٹونے اس اکارڈ کی مخالفت کے لئے ہڑتال کرنے کی ایک کال دی ہے۔

مگر اس اکارڈ میں بنیادی مسائل سے نہیں نمٹا گیا۔ دفعہ ۳۰ کے جذباتی عنصر موجود رہے جن قوتوں نے ابتدائی دور میں ایسے حالات پیدا کئے تھے جن سے اگست ۱۹۵۳ء کے واقعات تک صورت حال پہنچی، کو حقیقت میں شکست نہیں دی گئی۔ اس امر کی پیش بندی کے لئے کچھ نہیں کیا گیا کہ شیخ عبداللہ اور اس کے کہنے کو ذاتی اقتدار رتبے کو تقویت پہنچانے کے لئے فرقہ واریت اور کشمیر کی شناخت کا پتہ نہیں پھینکا جائے گا۔ فریب کاری اور دو غلے پن کی سیاست کے غیر صحت منداثرات کو ختم کرنے کے لئے اصلاحی اقدامات بھی نہیں کئے گئے تھے۔ جو باتیں وقت کی رفتار کو پیچھے دھکیل سکتی تھیں۔ ان کے انداد کے لئے بھی کچھ نہیں کیا گیا تھا اور شیخ عبداللہ نے چند ایک متلات کو مخالف سمت میں دھکیل دیا۔ اور وہ ایک مرتبہ پھر ”چھوٹا سلطان“ بن بیٹھا۔ ناخوشگوار ماضی کو دفن کرنا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ مگر بدبو دار گرد کو غلے کے نیچے دبا دینے سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ یہ بدبو باہر رہنے لگی اور جلد ہی ایک گھٹن بھرا ماحول پیدا کیا گیا۔

سورن سنگھ نے کشمیر اکارڈ کی تائید کرتے ہوئے کہا: یہ دل و ذہن کا لطاف ہے اور اعتقاد کا معاملہ ہے۔ شیخ عبداللہ نے باہمی اور تعاون کا دوبارہ قیام قرار دیا اس نے کہا: ہم نے باہمی تعاون کی ایک نئی بنیاد قائم کر لی ہے۔ مگر جلد ہی یہ بات کھل گئی کہ یہ بنیاد نفی اور گھٹیا مواد سے ڈالی گئی تھی۔ اس میں شکاف پڑنے لگے۔ ۱۹۴۴ء تک یہ ڈھانچہ گر گیا۔ ایک اور خیالی پیکر بکھر کر رہ گیا۔

میر قاسم نے اپنی کتاب ”داستان حیات“ میں کشمیر اکارڈ کی ناکامی کے لئے بنیادی طور پر شتر مگاندھی کو ذمہ دار قرار دیا ہے۔ اور مسز مگاندھی کو ہمیشہ شیخ عبداللہ اور میر قاسم پر شک و شبہ رہا ہے۔ آخر ۲۹ مارچ ۱۹۴۷ء کو حمایت واپس لینا اور کانگریس رآئی اپارٹیمینٹ پارٹی کے نئے لیڈر کا انتخاب کشمیر اکارڈ کے تختے پر آخری کیل شامل ہوا۔ مگر میر قاسم جزوی طور پر راستہ پر ہے۔ اس نے یہ نہیں بتایا کہ اُسے محاذ رائے شماری کو نیشنل کانفرنس میں جمیدیل کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی، اس کی جماعت کے کسی فرد کو ریاستی کا بیڑہ میں شامل کرنے سے قبل مسز مگاندھی کے ساتھ واضح طور پر مشورہ کیوں نہیں کیا گیا۔ شیخ عبداللہ اے جی لون کو وزارت میں شامل کرنے کیلئے بے قرار کیوں تھا، جس نے پہلے کانگریس جماعت کو ترک کر دیا تھا۔ اور اس نے یکطرفہ طور پر عمل کرنے کے لئے محاذ رائے شماری کے کارکنوں پر نوازشوں کی بارش کیوں کی ان میں بجا بدین آزادی کی پیشن بھی شامل ہے۔ یہ اکارڈ اس لئے ناکام نہیں ہوا کہ جے اینڈ کے کانگریس وائی، جماعت کا ایک حصہ اسے پسند نہیں کرتا تھا بلکہ یہ اس لئے ناکام ہوا کہ بنیادی تنازعات اور مخالف انداز فکر کو سنبھالنا نہیں گیا تھا اور خود مختاری کی اجازت دے دی گئی تھی اور ماضی کی طرح یہ باتیں شیخ عبداللہ کی جمہوری آمریت کی آڑ میں کھلی چھوٹ ثابت ہوئیں۔

مخالف سمت کا سفر

نواب اکاری ایکٹ۔ ۱۹۴۵ء کے کشمیر اکارڈ کے بعد اور خاص طور پر ۱۹۴۷ء میں ریاستی اسمبلی کے انتخابات کے بعد ریاست کی یونین کے ساتھ یکجہتی کے عمل کو مخالف سمت میں سفر شروع ہوا۔ آئین ہند اور مرکزی قوانین کا ریاست میں مزید نفاذ بند کر دیا گیا۔ سالانہ یہ قوانین مفاد عامہ میں تھے اور ان سے عام آدمیوں کو بھاری فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ وقتاً فوقتاً خود مختاری کا ہوا کھڑا کیا گیا۔ کل ہند ملازمتوں کے ڈھانچے کو الٹ دیا گیا۔ دفعہ ۳۷۰ کی حفاظتی دیوار کو بلند کر دیا گیا۔ مگر اس مخالف سفر کا نمایاں ترین پہلو نواب اکاری ایکٹ ۱۹۴۷ء کے لئے جموں و کشمیر میں اجازت نامہ جاری کرنا تھا۔

جس انداز سے نواب اکاری ایکٹ لایا گیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مقامی سلطان کس طرح سے اپنی پوزیشن مضبوط بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ جب بھی انہوں نے ہوا کرنے کی ضرورت محسوس کی تنگ نظری اور فرقہ پرستی کی چنگاری سلگا کر انہوں نے ایسا کرنے کی کوشش کی۔ انہیں باقی ملک کے ساتھ جذباتی یکجہتی کی ذرا بھی پرواہ نہیں تھی۔

نواب اکاری ایکٹ ۱۹۴۷ء کا ظاہری مقصد ان کشمیریوں کی آباد کاری ہے جو ترک وطن کر کے مقبوضہ کشمیر یا پاکستان چلے گئے تھے اور وہ اپنے حقیقی رشتے داروں کے ساتھ ایک ہو سکیں۔ نواب اکاری بل کیوں؟ عنوان سے ایک کتابچے میں دیگر باتوں سمیت یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ اس قانون سے ایک آئینی لوازم کو پورا کیا گیا ہے اور مستقل باشندگان ریاست کی واپسی کو آسان کن بنائے گا۔ مگر یہ دعوے محض دلیل بازی تھی اور کھوکھلے معلوم ہوتے تھے۔

نواب اکاری ایکٹ کا اصل مقصد شیخ عبداللہ اور نیشنل کانفرنس کو کشمیری یکجہتی اور کشمیری شناخت کا علمبردار قرار دینا تھا اور شیخ کو مزید بہادر بنا کر اس کے رُتبے کو مزید بلند کرنا تھا تاکہ فاروق عبداللہ کی تاجپوشی کو آسان کن بنانے کے لئے ماقول پیدا کیا جائے۔ خود مختاری اور آزادی کا مظاہرہ کر کے مرکزی حکومت کے تئیں گستاخی دکھائی جائے۔ کشمیر اکارڈ کی اہمیت کو کم کیا جائے اور پونچھ اور راجپوتری جیسے مسلم اکثریتی اضلاع کو ”ملا کر“ عظیم تر کشمیر کا منصوبہ تیار کیا جائے۔ اور ایک ایسی عام حالت پیدا کی جائے جس سے سرتی اور جمہور کے بنیادی مسائل کو عوام بھول جائیں اور کوئی بھی شخص ان لیڈروں کی دیانتداری پر انگلی نہ اٹھائے پائے۔

توقعات کے مطابق نواب اکاری بل سے شدید اختلاف رائے پیدا ہو گیا۔ گورنر بنی کے ہنر و اور مرکزی سرکار کو ہزاروں کی تعداد میں عرصہ اشتیاق موصول ہوئیں۔ ان عرصہ اشتیاق پر غور کرنے اور اپنا ذہن تیار کرنے میں گورنر کو وقت لگا۔ یہاں تک کہ اس پر شیخ عبداللہ وزارت کے ایک رکن جی ایم شاہ نے اعتراض کیا۔ اس نے مطالبہ کیا تھا کہ یا تو گورنر اس پر دستخط کر دے یا استعفیٰ دے دے۔

بی۔ کے نہرو نے فیصلہ کیا کہ وہ قانون سازی کو پینام ارسال کر کے اس مسودہ قانون پر خامیوں کی نشاندہی کی جائے جس میں آئینی اور قانونی خامیاں بھی شامل ہیں۔ مگر ۸ ستمبر ۱۹۴۷ء کو شیخ عبداللہ کی وفات کے بعد جب ڈاکٹر فاروق عبداللہ وزیر اعلیٰ بنا تو اس نے ضد کی اور ۸ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو ریاستی اسمبلی سے اس مسودہ قانون کو دوسری مرتبہ پاس کر لیا اس صورت میں گورنر کے پاس رضامندی دینے کے سوائے کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ نئے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے ساتھ تبادلات خیالات کے بعد مرکزی حکومت نے اس بل پر سپریم کورٹ کی رائے طلب کی اور یہ معاملہ اب وہیں پڑا ہوا ہے۔

جس طریقے سے نوآباد کاری بل کے بارے میں تنازعہ کھڑا ہوا اور جس طرح سے اسے اس کی عارضی تدفین کی گئی اس سے متعدد سوال پیدا ہوتے ہیں۔ اس کا جواز کہاں تھا؟ کیا ۱۹۴۷ء اور ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں کو نظر انداز کیا جاسکتا تھا۔ کیا ان نام نہاد کشمیری کنبوں کی واپسی سے سماجی اور اقتصادی تخریب کے حالات پیدا نہیں ہوں گے اور ملک کی سلامتی اور تحفظ کے لئے خطرات پیدا نہیں ہوں گے۔ اس امر کی ضمانت کون دے گا کہ جاسوس اور تخریب کار نہیں گھس آئیں گے۔ یہ بل حقوق شہریت عطا کرنے سے بنیادی طور پر کس طرح وابستہ ہو گا جو ریاستی قانون سازی کی طرف سے ناقذاً عمل ہوں گے۔ اولاً تارکین وطن کے بچوں کو ہندوستانی شہریت کے حاصل ہوگی جن کی پیدائش پاکستان میں ہوئی ہے۔

یہ سوال اپنے وجود میں ہی بھاری اہمیت کے حامل تھے اور ان سے شیخ عبداللہ و نیشنل کانفرنس کے جد اگاہانہ تنگ نظر اور علیحدگی پسند انداز فکر کی جھلک ملتی تھی۔ مگر اس کے ساتھ ہی دوسرے سوال بھی وابستہ تھے اور مستقبل کے لئے وہ بھاری اہمیت کے حامل تھے۔ کیا یہ نوآباد کاری بل ایسی تحریک کو جنم دینے کے لئے مائل تیار کرنے کے مترادف نہیں تھا جس کا مقصد آزاد کشمیر تھا۔ کیا اس امر کے بیج نہیں بوئے جارہے تھے حالات پیدا نہیں کئے جارہے تھے۔ سوئے ہوئے جذبات کو جگایا نہیں جارہا تھا اور آزادی نواز جذبات کو تقویت نہیں دی جارہی تھی کیا اس بات کا مطلب یہ نہیں کیا جارہا تھا۔ جو جوں و کشمیر لبریشن فرنٹ اس وقت مانگ رہا ہے۔ درحقیقت نوآباد کاری ایکٹ کے حامیوں کا اور آزادی کی موجودہ تحریک کا ایک ہی منبع ہے۔ اور وہ ہے علیحدگی پسند نفسیات۔

مصنوعی جمہوریت

ایک اور بنیادی معاملے۔ جمہوریت۔ وہی تذبذب؛ وہی فریب کاری اور ذاتی آشیانہ بنانے کا وہی مزاج۔ یہ سبھی عناصر موجود رہے۔ جس قسم کی جمہوریت کو شیخ عبداللہ اور اس کے حواریوں نے کشمیر میں پروان چڑھایا اس کی بنیاد زیادہ تر منفی امور اور طاقتوں پر تھی۔ اسے قرون وسطیٰ کی قدروں اور دھڑے بند رجحانات کے گرد تعمیر کیا گیا تھا۔ اس سے ذات پرستی کو فروغ حاصل ہوا اور فوری فوائد کے حربوں کو بروئے کار لانے میں بھی انہوں نے گریز نہ کیا۔ یہ زیادہ تر جوڑ توڑ فسطائی نوعیت کا تھا اس نے تنگ اور متعصب ذہنوں کو جنم دیا اور اسے دوٹ کی مشد و قہجوں تک لے گیا۔ واضح طور پر یہ کھوٹا سگ زیادہ سے بلکہ ہندو عمل اسکتا تھا۔

جو کچھ میں نے کہا وہ اس بات سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ شیخ عبداللہ نے خاندانی جانیشین کو فروغ دینے کی راہ ہموار کی اور اپنے انداز سے نیشنل کانفرنس نے کشمیر اکارڈ (۱۹۷۵ء) کی ابتدا سے لے کر راجیو فاروقی اکارڈ (۱۹۸۶ء) تک انتخابات لڑے۔

۲۱ اگست ۱۹۸۱ء کو شیخ عبداللہ نے اقبال پارک سری نگر میں تقریر کی۔ اس تقریر کا اقتباس یوں ہے۔

”۱۹۳۰ء میں پنڈت مونی لال نہرو نے انڈین نیشنل کانگریس کی قیادت جو اہر لال نہرو کی رہنمائی میں نئی نسل کو سونپی اور ہمیں معلوم ہے کہ اس کس کس خوش اسلوبی سے کام کیا۔ آج میں خود کا سی نازک چور رہا ہے پر کھڑا محسوس کرتا ہوں۔ میں نیشنل کانفرنس کی صدارت ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی قیادت میں نئی نسل کو سونپ رہا ہوں۔ یہ ایک بہت بڑی عزت اور بہت بڑی آزمائش ہے یہ تاج جو میں ان کے سر پر رکھنے جا رہا ہوں کانٹوں سے بھرا ہے میں توقع رکھتا ہوں کہ ڈاکٹر فاروق عبداللہ اس کے قابل ہوں گے۔ میں خداوند کریم سے دعا گو ہوں کہ وہ اس آزمائش میں پورا اتریں۔“

میں نے اس قوم کو کشمیری عوام کو نہایت احتیاط کے ساتھ پروان چڑھایا ہے اور اس قوم کو اپنے اندروں سے نہ دیا ہے میں نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ قوم کی خدمت کو وقف کر دیا ہے۔ مجھے یہ بات اچھی لگی کہ نئی نسل اس اعتماد کے قابل ثابت ہو۔

دوستو۔ اس موقع کی عظمت کے پیش نظر میرا دل بھر آیا ہے۔ میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے یہ اعتماد پورا کرنے کے لئے منتخب کیا ہے۔ میں اس کے لئے بھی شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے ۱۹۳۱ء سے ہی یہ قوت عطا کی۔ میں ان تمام دوستوں اور رفقاء کے کار کا ممنون ہوں جو میرے ہمسفر رہے اور جنہوں نے تمام دشوار مرحلوں میں میری مدد کی۔ اگر مجھے ان کا اعتماد و اعتقاد حاصل نہیں ہوتا تو میں اس اعتماد کو نبھا نہیں سکتا تھا جو مجھے حاصل ہوا ہے۔ میں ان تمام رفعتوں اور دوستوں کو سلام کرتا ہوں جنہوں نے تحریک حریت کے دوران اپنی زندگیاں خطرے میں ڈالیں۔ میں ان شہیدوں کو بھی سلام کرتا ہوں جنہوں نے قوم کی خدمت کرتے ہوئے اپنی جائیں قربان کر دیں۔ اور ان بہنوں نے جنہوں نے ملک کی خاطر اپنے سہاگ کی قربانی دی۔“

ویسے تو یہ تقریر نیشنل کانفرنس کے سالانہ کنونشن کے موقع پر کی گئی مگر اس کا اصل مقصد فاروق عبداللہ کی تاجپوشی تھا۔

یہ تقریر نہایت اہم ہے۔ اس تقریر میں شیخ عبداللہ کی شخصیت کے چند اہم پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ ذمہ داری نوجوان نسل کے سپرد کی جائے۔ مگر اس کا انتخاب کون تھا؟۔ اس کا فرزند ارجمند ڈاکٹر فاروق عبداللہ۔ خود دیکھئے وہ خود کو کس انداز میں پیش کرتا ہے۔ وہ قریباً بیوں کے بارے میں کس طرح بات کرتا ہے۔ اس نے قوم کو اپنے آئندوں میں نہلایا ہے۔ دیکھئے وہ کس انداز سے اپنے اولادوں پر پردہ پوشی کرتا ہے اور حاضرین کو یاد دلاتا ہے کہ موتی لال نے بھی کانگریس کی قیادت تو اہل لال کے سپرد کی تھی۔ یہ کوئی بات نہیں کہ اس وقت حالات مختلف تھے یا فیصلہ کرنے کا عمل بھی مختلف تھا۔ اس بات پر بھی غور کیجئے کہ وہ کشمیریوں کو ایک قوم قرار دیتا ہے اور شناخت کا جذبہ ابھارتا ہے دیکھئے کہ وہ کس طرح ان دوستوں کی باتیں کرتا ہے جنہوں نے اس کے لئے متعدد قربانیاں دیں مگر وہ اس شخص کو بھول جاتا ہے جو ان میں مضبوط ترین تھا۔ مرزا افضل بیگ۔ اس کے علاوہ جی۔ ایم شاہ جیسے جماعت کے سینئر لیڈر بھی تو ہیں۔ مگر وہ تاج اپنے بیٹے کے سر پر رکھ دیتا ہے اور اس طرح بہت سارے جائز وارٹین کو نظر انداز کر کے بالائے طاق رکھ دیا گیا۔ جب شیخ عبداللہ نے ذاتی وفاداری کا حلف نامہ دستخط کرنے کے لئے کہا تو مرزا افضل بیگ نے اس کی مزاحمت کی اور مطالبہ کیا کہ اس معاملے کو جماعتی سطح پر زیر بحث لایا جائے۔ شیخ عبداللہ نے اسے منظور کر لیا مگر چند ہی گھنٹوں کے اندر بیگ سے استعفیٰ طلب کیا۔ بیگ نے کہا: اگر کوئی شخص ۴۴ سال کی وفاداری اور رفاقت پر یقین نہیں کر سکتا تو وہ دو سطروں کی حلف وفاداری پر کیونکر یقین کر سکتا ہے۔ افضل بیگ زرعی اصلاحات کا اہم شمار تھا۔ محاذ رائے شماری کا روح رواں تھا اور کشمیر اکارڈ کی بات چیت کرنے والا تھا۔ کسی بھی شخص نے شیخ محمد عبداللہ کا ہر مصیبت میں ساتھ نہیں دیا تھا اور ذاتی پرستی اور خاندان پرستی کی دہلیز پر کسی اور کو بلی کا بکرہ نہیں بنایا گیا۔

اس تقریر میں شیخ عبداللہ نے ہمارا جہ کے عہد میں اقتصادی اور سماجی عدم مساوات کا ذکر کیا مگر اس نے تفاوت کا ذکر نہیں کیا جو اس نے خود پیدا کیں۔ اس نے فرقہ واریت کا ذکر بھی کیا۔ ہندوستان میں ۳۳ برس کے بعد بھی مسلمان خوف کی نفسیات کے شکار رہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ اس بات کو بھی جاننا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو اپنا جانشین بنائے جانے کے لئے جوڑ توڑ کر رہا تھا اور اندرا گاندھی جیسے مرکزی لیڈروں کی ایک حد سے زیادہ نکتہ چینی نہ کر سکتا

تھا۔ بہر حال اس نے وہ الفاظ دہرائے تو انہوں نے رام گڑھ کا ٹکڑا اجلاس میں کہے تھے۔ ”میں مسلمان بھول اور اس میں مجھے خیر ہے۔ اسلامی تمدن سے ہی صحت اور اس کا تحفظ میرا فرض ہے مگر ان تمام باتوں کے ساتھ مجھے اس بات میں فخر ہے کہ میں ایک ہندوستانی ہوں اور یہ ہمارا فرض ہے کہ ہندوستانی قومی کا ذکر ہم آگے بڑھائیں۔“

انتخابی تکنیک

مندرجہ بالا عرصے (فروری ۱۹۷۵ء سے نومبر ۱۹۸۶ء) کے دوران نیشنل کانفرنس نے انتخابات میں فسطائی طریقے اختیار کئے۔ رائے دہندگان کو کسی منطقی انداز میں سوچنے کا موقعہ نہیں دیا گیا۔ اس بات کا مستقل طور پر پرچار کیا گیا کہ اگر کشمیری، غلامی سے نجات چاہتے ہیں تو انہیں نیشنل کانفرنس کو ووٹ دینا چاہیے۔ شیخ عبداللہ کے گرد ذات پرستی کے دائرے کا پوری طرح استعمال کیا گیا۔ شیخ کو حریت کشمیر کا علمبردار اور مرکزی لیڈروں کو تباہ کرنے والا قرار دیا گیا۔ مرکزی حکومت کی کمزوری اس کا متزلزل موقف میں بار بار تبدیلی واضح نقب العین کے حصول کے تئیں واضح پابندی گورنروں کا ششمر مرعہ جیسا رویہ شیخ عبداللہ اور اس کے افراد کنبہ کی غیر متناسب مدح سرائی، ان تمام باتوں نے نیشنل کانفرنس کو یہی راستہ اختیار کرنے میں توجہ بڑھا دیے۔ مرکزی قیادت کا ایک اچھا خاصہ حصہ اخبارات اور حزب مخالف ان دو غلطی باتوں میں آگئے یا تنگ نظر سیاسی باتوں سے اثر انداز ہو گئے۔ کسی کو بھی سچ بات مند پر کہنے کی جرأت نہیں ہوئی اور گہری لہروں کو سمجھنے کے لئے کسی نے ہمت نہیں کی۔

ان تمام امور کا مجموعی اثر یہ ہوا کہ اس تمام عرصے میں انتخابات کے جہوریت اور قومی محاذ کے لئے کوئی معنی نہیں رہے۔ وہ محض غیر محب الوطن عناصر کو زندہ رکھنے کا ایک عمل ثابت ہوئے۔ ان انتخابات نے بے اصول لیڈروں کو فرقہ وارانہ اور مقامی تعصبات کو ہوا دینے اور معصوم اور بے قصور عوام کا استحصال ہوا تاکہ وہ قریباً سازشی سرگرمیوں کے ذریعے ان پر اپنا غلبہ قائم رکھ سکیں۔ میری اس منطق کے بارے میں مزید تقویت کے لئے میں شہادت پیش کر رہا ہوں۔ یہاں میں صرف دسمبر ۱۹۸۶ء کے لوک سبھا انتخابات کے دوران نیشنل کانفرنس ریف ایک ہی ہم پر ہی اتھا کروں گا اور مندرجہ ذیل چند ایسے پوسٹروں پر توجہ مبذول کروں گا جو اس دوران بھاری تعداد میں تقسیم کئے گئے۔ یہ تمام اشتہارات نیشنل کانفرنس کی طرف سے شائع کر کے تقسیم کئے گئے۔

توڑ اس دست جفاکش کو یا رب جس نے
روح آزادی کشمیر کو پامال کیا



اس جفاکش ہاتھ کو کاٹ لے، ہاتھوں کے خون رکھ دے
اس ہاتھ کو بیکھڑے تو دیکھو، پانی مٹی کی آڑوں کی بکریں بھونک رہی ہیں

صل پر مہر لگائیے

آپ کی جدوجہد آزادی اور کسمپرسی حقوق کے تقاضا کے

(1)



(11)



پوسٹر نمبر (۱) میں موثر انداز میں ظاہر کیا گیا ہے کہ کشمیری زنجیروں میں جکڑے ہیں۔ یہ زنجیریں
کس نے پہنائی ہیں؟ ظاہر ایہ بھارت ہے۔ تمام کشمیری قوم کی شناخت نیشنل کانفرنس (ایف) کے
ساتھ کی گئی ہے۔ آخری سطر واضح طور پر کہتی ہے کہ میں آپ کی جدوجہد آپ کی آزادی
وغیرہ کی علامت ہے۔ یہ جدوجہد کس کے خلاف؟ آزادی کس سے؟ کیا کشمیری پہلے ہی
آزاد نہیں ہیں؟ کیا وہ خود کو غلام سمجھتے ہیں؟
اس پوسٹر میں ایک شعر ہے

توڑ اس دست جفاکش کو یا رب جس نے
روح آزادی کشمیر کو پامال کیا

اس پوسٹر میں یہ بھی کہا گیا ہے! اس جفاکش ہاتھ کو کاٹ ڈالو، ہاتھوں کے خون سے رنگا ہوا ہے
اس ہاتھ کو ہمیشہ کے لئے توڑ دیجیے! جو ریاستی لوگوں کی آزادی کا گھونٹ رہا ہے کیا اس کا مطلب
ہندوستانی ہاتھ نہیں ہے۔

پوسٹر کا اپنے پس منظر میں کیا مطلب ہے؟ اس کا مجموعی اثر کیا ہے؟ یہ کشمیریوں کے لئے
کیا پیغام دیتا ہے؟ نیشنل کانفرنس (ایف) کے ارادے کیا ہیں؟ اس پوسٹر کا پیغام فی الحال
فاروق عید اللہ کی ان تقریروں کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے جو اس نے ملک کے دوسرے
شہروں میں کی ہیں۔

پوسٹر (۱۱) میں کشمیر کا نقشہ دکھایا گیا ہے جس میں ایک خوفزدہ کشمیری چھوٹے سے
گھر کے کونے میں گھس گیا ہے۔ نقشے کے سرحدی خطوط کے اندر نصب کیا گیا ہے۔ وہ پیچھے
کے بل لیٹا ہوا ہے اور ایک مضبوط اور ظالم ہاتھ اس کے سینے میں خنجر گھونپ رہا ہے۔ کشمیر کے
باہرینی ہندوستان سے ابھر رہا ہے۔ اس کے منہ پر لکھا ہے کہ ظالم اور خون کے
پیاسے ہندوستانی معصوم کشمیریوں کا قتل عام کر رہے ہیں۔ خون ہاتھ کا مضبوط کلائی اور لڑکے
کے سینے کے گرد خون اپنے معنی کشمیریوں پر واضح طور پر ظاہر کرتے ہیں۔

پوسٹر (۱۱) میں رائیونگ اور کرپس کشمیریوں پر نشانہ باندھے دکھائی گئی ہیں۔ یہ کس کی
رائیونگ اور کرپس ہیں؟ کشمیری انہیں یقینی طور پر ہندوستان کی کھلیں گے۔ الفاظ "ڈر اسے جیسے
تو کشمیریوں پر ظاہر کرتے ہیں کہ انہیں دشمن سمجھے ہوئے ہیں۔

اس کتابچے کے ساتھ اور بھی پوسٹر تھا جس کا عنوان "اسٹریٹ نیوسٹار" تھا اس پوسٹر میں ایک لڑکی کو قوم کی بیٹی کے طور پر دکھایا گیا تھا۔ وہ ووٹروں سے تلقین کر رہی تھی کہ نیشنل کانفرنس (ایف) کو ووٹ دے کر اس کے خون کا بدلہ لیں اس پوسٹر میں کہا گیا ہے کہ یہ منصوبہ لڑکی ہندوستانی سیکورٹی فورسز کی گولیوں کی شکار ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ فورسز غیر ملکی ہیں جو منصوبہ لڑکیوں کا قتل کر رہی ہیں۔ اس پروپیگنڈہ کی نقصان دہ نوعیت اس امر سے اور بھی پچھیدہ ہو جاتی ہے کہ یہ لڑکی کشمیر پولیس کے ایک اہلکار کی اتھاقیہ فائرنگ سے اس وقت ہلاک ہوئی جب شیعہ طبقے کی طرف سے جلوس نکالا جا رہا تھا۔

جمہوریت کے جس طرز کو شیخ عبداللہ فاروق عبداللہ اور نیشنل کانفرنس فروغ دیا۔ وہ استحصالی جمہوریت کے مترادف تھا۔ اس کی بنیاد ان تکنیکوں پر تھی جو اہل اقتدار کے لئے انفعالی عارضی طور پر فائدہ مند ثابت ہوتی ہیں۔ منافرت اور مناقشات پر مبنی ان کی سیاست نے ایک طرف تو ہندوستان کے لئے ناپسندیدگی پیدا کی اور دوسری طرف عزیزوں اور رشتہوں پر پردہ پوشی کی۔ اور اس سے حکومت کی کارکردگی پر اثر پڑا۔

اگر کشمیری نوجوان نے آج ہندوستان کے ساتھ دشمنی شروع کر دی ہے تو کیا یہ اسے نوجوانوں کی خطا ہے یا ان لوگوں کی جنہوں نے اس قسم کا پروپیگنڈہ کیا یا اس کی اجازت دی۔ یہ بھی ایک المناک بد نصیبی ہے کہ جب یہ بات یاد آتی ہے کہ یہ سب وہ جماعت کر رہی ہے جس کے اعلیٰ ترین لیڈر کے بارے میں صدر جمہوریہ سنجواریڈی نے اکتوبر ۱۹۷۷ء میں سربراہ میں کہا تھا۔

"ان کی کامیابیوں اور کامیابیوں کے لئے شیخ عبداللہ نہ صرف کشمیر بلکہ شہر بھارت کھلانے کے مستحق ہیں۔"

کشمیری جمہوریت کا ایک اور تاریک پہلو یہ ہے کہ یہ چند سری اجارہ دار ہے اور اس میں برداشت کا مادہ نہیں۔ جموں کے ایک اردو شاہی عہدہ دار این جنتانی نے اس کردار کو چھٹی دہائی کے دوران ہی محسوس کر لیا تھا۔ اس نے شیخ عبداللہ کے تعمیل نیا کشمیر کو یوں منظوم کیا ہے

تمنا شیخ جی کی ہے نیا کشمیر بن جائے
نیا کشمیر بن کر آپ کی جاگیر بن جائے

اگر کوئی مخالف بات اُن کے سامنے کرے
تو بخشی کی چھتری ایک آن میں شمشیر بن جائے

سوزش کا پھیلاؤ

یہ امر ناگزیر تھا صدق دلی کے فقدان نے جلد ہی اقتدار کے اُس ڈھانچے میں بھوسے و سوت اختیار کر لی خواہ اس کا گھیرا کتنا ہی تنگ تھا۔ مگر پرانے اور قریبی رفقاء کار کو فریب دینے کا ایک رجحان ساجیس پیدا ہو گیا ہو۔ بخشی نے شیخ عبداللہ کو دھوکہ دیا۔ اور شیخ نے بھی کوئی بہتر فعل کا ثبوت نہیں دیا۔ جب اس نے اپنی جماعت میں عمر بھر کے اور برگزیدہ رفیق مرزا افضل بیگ کو بڑی طرح سے بے عزت کیا۔ بخشی غلام محمد نے میر واعظ بننے میں مدد کی مگر مولوی فاروق اپنے ہی محسن کے خلاف ہو گیا اور اس نے موئے مقدس ایچی نیشن کے دوران بخشی کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہونچایا۔ باہمی ٹکڑوں و شبہات اس قدر سنگین ہو گئے کہ فاروق عبداللہ اپنے تمام وزراء کو اس پرستمبر ۱۹۸۲ء کے روز ران بھون میں حلف رازداری کے فوراً بعد شیخ عبداللہ کے مزار پر لے گیا۔ اور یہاں کی کٹوری سی خاک پاک کو ہاتھ میں پکڑ کر نئے وزیر اعلیٰ کے عین و فادار رہنے کا حلف دلایا مگر یہ چال بھاتو لیا تی حقیقت کے سامنے ٹھہر نہ سکی۔ اس مرتبہ دیگر شخص نہیں بلکہ فاروق عبداللہ کی اپنی ہمشیر بیگم خالدہ شاہ تھی جس نے اُسے وزیر اعلیٰ کی کرسی سے نیچے اُتار دیا۔ اس کی ماں بیگم شیخ عبداللہ نے اپنے بیٹے کا ساتھ دیا۔ اور اپنی بیٹی کے لئے غائبانہ نماز جتازہ ادا کر دی اس طرح اس نے اعلان کر دیا کہ جہاں تک اس کا تعلق ہے وہ اس کے لئے مریجی ہے۔ جس آسانی کے ساتھ رفاقتوں اور وفاداریوں کو تبدیل کیا گیا اور پہلو بدلے گئے وہ واقعی حیرت کن ہے۔ اس سے سماج کے اخلاقی لب و لہجے کی افادیت کم ہو گئی اور بار بار تشدد اور عدم استحکام کا فطرہ بڑھ گیا۔ میں صرف ایک حالیہ مثال پیش کر دوں گا۔ اس عمل کو ڈبل فاروق کہتے ہیں برس ۱۹۸۸ء کے پہلے نصف کے دوران دونوں فاروق — ڈاکٹر فاروق عبداللہ اور مولوی فاروق — سیاسی اتحادی تھے مگر مسلسل طور پر ان دونوں میں سے یہ ایک دوسرے کو پلٹہ دینے کی کوشش کرتا رہا۔ ان کے موقف نے کشمیر کی سیاست کی سازشاندہیت کو سامنے لایا۔ اور اس بات کو ہی طشت اندام کیا کہ کشمیری سیاست والا بیک وقت مذہب ہو جاتے ہیں۔ اس

سلسلے میں ایک مقامی تبصرہ نگار اپریل ۱۹۸۸ء میں رقمطراز ہے۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ فردا میں کشمیر کی تاریخ دو فاروقوں کی سرگرمیوں کے گرد گھومے گی۔ ایک جامع مسجد اور دوسرا درگاہ حضرت بل سے مذہب آوازیں نکالے گا۔ ان دونوں میں ماسوائے قریب کاری اور تذبذب کے کوئی بھی بات مشترک نہیں۔

۹ جون ۱۹۸۸ء کو سرینگر شہر میں گڑبڑ ہوئی۔ ۱۵ جون تک گڑبڑ کا یہ سلسلہ رک رک کر جاری رہا۔ ان وارداتوں میں پانچ افراد جان بحق اور ایک سو مجروح ہو گئے اگرچہ اس گڑبڑ کا ظاہری سبب حکومت کی طرف سے بجلی کے کرائے میں اضافے کے خلاف عوامی احتجاج تھا مگر اس کا حقیقی سبب دونوں فاروقوں کے درمیان انتہائی تلخ تعلقات اور مولوی فاروق کی یہ ہوس تھی کہ ریاستی سیاسیات میں وہ اپنے لئے زیادہ وسیع بنیاد وضع کر سکے۔

بجلی کے کرایوں میں اضافے سے صارفین کے ۹۳ فیصد حصے پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ صنعتوں پر جو بھی اثر ہوتا تھا وہ زیادہ تر جموں خطے میں تھا مگر پھر بھی ایجنسی کونسل کا اجماع وادی میں خاص طور پر سرینگر اور اس کے وسطی علاقے میں کیا گیا جہاں مولوی فاروق کے پیروکار موجود تھے۔ اس شرارت کا زیادہ تر موجد مولوی ہی تھا۔ جامعہ مسجد کو زیادہ تر سیاسی پلیٹ فارم کے طور پر اپنی آسائش کے لئے استعمال کیا۔ مثال کے طور پر، ۱۸ جون کو اس نے فاروق عبداللہ کو "نہایت ناقابل انحصار" قرار دیا۔ اور اس پر عوام دشمن پالیسیوں پر عمل پیرا ہونے کا الزام لگایا اس کے ساتھ ہی اپنی ساکھ بڑھانے کے لئے اس نے "میر واعظ" خاندان کی قربانیوں کا ذکر کیا اور عوام کو ۱۹۶۳ء کی موئے مقدس ایجنسی کونسل کے دوران اپنے رول کی بابت یاد دلایا۔ ایک اور موقع پر اس نے فاروق عبداللہ کو "ناپختہ ذہن اور نامستقل مزاج" اقتدار کے لئے باہر ایک دوست "اور" اقتدار کی کرسی پر ایک دشمن" قرار دیا۔ ڈاکٹر فاروق کے لب و لہجے میں بھی ٹرشی لگتی۔ ۱۸ جون کو اس نے مولوی فاروق کو "محض ایک مرقی" قرار دیا اور کہا کہ آج کے مولویوں کا کوئی کردار نہیں ہے۔ دن کے وقت وہ مذہب کی باتیں کرتے ہیں اور رات کے وقت عریاں فلمیں دیکھتے ہیں۔

اس سے قبل بیگم شیخ عبداللہ جسے ان دنوں "مادر مہربان" کے نام سے پکارا جاتا تھا، کہتی رہی کہ مولوی فاروق اور ڈاکٹر فاروق اس کے دو بیٹے ہیں۔ دو آنکھیں ہیں۔ جو سلوک وہ ایک دوسرے کے ساتھ وسط ۱۹۸۸ء میں کر رہے تھے اس کے پیش نظر بیگم عبداللہ کے یہ مشاہدات نہایت ظریفانہ معلوم ہوتے تھے اور ان سے کشمیری سیاسیات کے کھوکھلے پن کا احساس ہوتا تھا۔ اس کا خیال وہ عوام کو بنگلہ بھر رہا تھا۔ ۱۹۸۸ء کی ایجنسی کونسل میں دونوں لیڈروں

ڈاکٹر فاروق اور مولوی فاروق کے جھگڑے اور حریفانہ رویے کی وجہ سے پانچ جانی تلف ہو چکی جسے اتحادی تصور کیا جاتا تھا۔ اور ریاست کئی دنوں تک مصائب کی شکار رہی۔

اس سے بھی زیادہ بڑی بات یہ تھی کہ ذاتی اور سیاسی مفادات کو پورا کرنے کے لئے صریحاً بے جا طور طریقے استعمال کرنے سے بھی گریز نہیں کیا گیا۔ مثال کے طور پر دسمبر ۱۹۸۳ء میں لوک سبھا انتخابات کے دوران جی ایم شاہ اور اس کی کابینہ کے رفقاء نے نیشنل کانفرنس کے خالدہ دھڑے کو وادی کے تین امیدواروں کی فتح کو یقینی بنانے کے لئے ایک شرانگیز منصوبہ تیار کیا تھا مگر میرے پاس بروقت اطلاع پہنچی اور میرے نرم مگر موثر دخل کے بغیر یہ سکیم روبہ عمل لائی گئی ہوئی اور ریاست کو تشدد اور خونریزی کے بھنور میں دھکیب لگایا ہوتا۔

لیڈروں کی طرف سے بلا جھجک اور بے دریغی کے ساتھ متفاد موقف پیدا کرنے سے خشک مزاجی اور تناؤ کا ماحول پیدا کیا اور سیاسی ڈھانچے اور انتظامیہ کی جڑوں کو ضرب کاری پہنچائی۔ ایک طویل عرصے تک شیخ عبداللہ کانگریسیوں کے خلاف فتویٰ جاری کرتا رہا ہے اور انہیں "گندری نالی کے کیڑے" قرار دیتا رہا ہے جو کشمیر میں تدفین کے قابل بھی نہیں۔ اس کے باوجود بھی ۱۹۸۵ء میں اُسے اس جماعت کی قانون ساز یہ پارٹی کا لیڈر بننے اور اس کی حمایت سے وزیر اعلیٰ بننے میں کوئی جھجک نہیں تھی۔ مئی ۱۹۸۳ء سے فروری ۱۹۸۶ء تک کانگریس کوئی عوام سے کہتی رہی ہے کہ ڈاکٹر فاروق سلامتی کے لئے ایک خطرہ تھا۔ راجیو گاندھی نے خود بھی اس پر الزامات عائد کئے کہ اس کا تحریک کار اور پاکستان نواز عناصر کے ساتھ رابطہ ہے۔ اس کے باوجود بھی عوام کو اچانک تبدیلی کے لئے کوئی وجہ بتائے بغیر کانگریس کو آئی اے اسکے ساتھ اکڑ کر لیا۔ اور مارچ ۱۹۸۷ء کے انتخابات ایک ساتھ لڑے اور وزارت میں ایک اتحادی شریک کی حیثیت سے شرکت کی اور جہاں تک فاروق عبداللہ کا تعلق ہے اس کے بے تسلسل بیانات اور پہلوؤں کا حساب رکھنا بھی مشکل ہے۔

ناپاک روایتیں۔

ریاست میں تشدد اور دہشت گردی کی موجودہ فعل کی جڑیں ماضی کی چند روایتیں ہیں جن میں سے ایک فی اذرائے شماری اور دوسری الفتح خاص طور پر متعلق ہیں۔

محاذ رائے شماری:

محاذ رائے شماری کا قیام مرزا افضل بیگ نے ۱۹ اگست ۱۹۵۵ء کو کیا۔ اس سے قبل شیخ عبد اللہ کی گرفتاری کے فوراً بعد ایک "وار کونسل" کا قیام عمل میں لایا گیا تاکہ اس کے کارڈ کے لئے حمایت حاصل کی جاسکے۔ اس کونسل کو بعد ازاں مرزا افضل بیگ کی طرف سے محاذ رائے شماری میں تبدیل کیا گیا۔ جسے نومبر ۱۹۵۸ء میں صحت کی شرابی کی بنا پر رہا کیا گیا تھا۔

محاذ رائے شماری کے پس پردہ کلیدی تحریک شیخ عبد اللہ تھا۔ وہ اس کا سرپرست اور رہبر رہا۔ مگر حکمت عملی کے نکتہ نظر سے وہ کبھی اس میں رسمی طور پر شریک نہیں ہوا۔ اور اس نے مختلف راہیں اپنے لئے کھلی رکھیں۔

محاذ رائے شماری کا بنیادی نصب العین ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لئے اقوام متحدہ کے زیر اہتمام التواہ رائے کرنا تھا۔ محاذ کی طرف سے منفقہ ہر جلسے میں اس مطالبے کو اٹھایا جاتا تھا۔ محاذ نے ہندوستانی فوج کو قابض فوج بھی قرار دیا۔ ۱۹۶۵ء کے ہند پاک تنازعے میں اس نے وادی میں دراندازی کی حمایت تک کی۔ محاذ نے پاکستان کیساتھ خفیہ رابطہ قائم رکھا جہاں سے اسے مالی امداد اور پروپیگنڈا مواد حاصل ہوتا۔ پاکستان میں ۱۹۶۶ء میں شائع شدہ ایک رپورٹ کے مطابق ۱۹۶۴ء تک محاذ کو ۵۰ کروڑ روپے حاصل ہوئے۔

محاذ رائے شماری کے عروج کے دنوں میں شیخ عبد اللہ جسے پہلے ہندوستانی ایجنٹ قرار دیا جاتا تھا اب پاکستان میں ہیرو سمجھا جانے لگا۔ اُسے پاکستانی پاسپورٹ کی پیشکش کی گئی۔ اپریل ۱۹۸۴ء میں کشمیر سازش کیس واپس لینے کے بعد محاذ رائے شماری کی سرگرمیوں میں اضافہ ہو گیا۔ مزم روی کے ایک مختصر سے عرصے کے بعد ہندوستان کے خلاف زہر پلا پروپیگنڈا شروع کیا۔ کشمیریوں کو بار بار یہ تلقین کی گئی کہ وہ ہندوستانی طوق کو اتار پھینکیں۔ یہاں تک کہ غیر ملکی اخبارات میں بھی شیخ عبد اللہ کی طرف سے ہندوستان مخالف پروپیگنڈا اسی وقت کیا گیا جب وہ مرزا افضل بیگ کے ہمراہ ۱۹۶۵ء کے اوائل میں حج پر گیا تھا۔ ایک سہ ماہی رسالے فارن افیئرز اپریل ۱۹۶۵ء میں شائع ایک مضمون میں اس نے حکومت ہند

کے رویے کی زبردست نکتہ چینی کی اور رائے شماری کے مطالبے کو حق بجانب قرار دیا۔ اس نے قاہرہ میں ایک اخباری انٹرویو میں یہ تجویز پیش کر کے ہندوستان کو ٹمیسے میں ڈال دیا کہ کشمیر کے دو حصوں کو یکجا کرنے کے لئے صدر ناصر مداخلت کریں۔ اس نے اس امر کا مطالبہ بھی کیا کہ انجمن انٹرنیشنل انفریٹیو۔ ایشیائی کانفرنس (۱۹۶۵ء) کشمیر کو ایک منقسم آبادی مسئلے کے طور پر زیر بحث لائے۔ یہاں تک کہ عبد اللہ چاؤ این لائی سے بھی ملتا تاکہ کشمیر کی جانب اپنے نظریات پر اس کی حمایت حاصل کر سکے۔ چاؤ نے اُسے پیکنگ کا دورہ کرنے کی دعوت دی۔ حکومت ہند نے شیخ عبد اللہ اور مرزا افضل بیگ کی جارحانہ سرگرمیوں پر سر زبردست اعتراض کیا۔ اور جب وہ حج بیت اللہ سے ۸ مئی ۱۹۶۵ء واپس پہنچے تو ان دونوں گرفت کر لیا گیا۔

تاشقند معاہدے (۱۹۶۶ء) نے کشمیر کے مسئلے پر پانی پھیرنے میں کافی مدد کی بین الاقوامی برادری نے اس معاملے میں بگ بگ اچی دلچسپی ختم کر دی۔ جنوری ۱۹۶۸ء میں شیخ عبد اللہ کو رہا کر دیا گیا۔ محاذ رائے شماری کے لئے پروپیگنڈا نے پھر گہرائی اختیار کرنا شروع کر دیا۔ اوقاف رقوم پریس کے اختیار اور ہند مخالف پروپیگنڈا کے لئے دو بی پلیٹ فارم کے بے دریغی سے استعمال نے ایک مرحلے پر محاذ رائے شماری کے لئے پانچ لاکھ تک رکنیت دلادی۔

محاذ رائے شماری نے ریاست میں ہونے والے پہلے دو اسمبلی انتخابات میں حصہ نہیں لیا۔ اس کی وجہ اس نے یہ بیان کی کہ یہ انتخابات اُس ریاستی آئین کی بنا پر کئے جا رہے ہیں جسے محاذ تسلیم نہیں کرتا۔ بہر حال محاذ کے مقامی اداروں نے انتخابات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنی موجودگی کا نمایاں طور پر احساس دلادیا۔

بینگلہ دیش جنگ کے بعد محاذ رائے شماری کو ایک بھاری نفیاتی دھڑ لگا۔ اس کے کارکنوں کی صفوں میں تھکان کا احساس عیاں ہونے لگا۔ اس مرحلے پر شیخ عبد اللہ نے اس قسم کے بیانات جاری کرنا شروع کر دیا کہ وہ مرکزی سرکار کے ساتھ گفت و شنید کریں گے بات چیت کا یہ سلسلہ مرزا افضل نے چلایا جس کے نتیجے میں کشمیر کا رڈ پر دستخط ہوئے اور محاذ رائے شماری کو ٹوڑ دیا گیا۔ یعنی اسے عملی طور پر نیشنل کانفرنس میں تبدیل کر دیا گیا۔

اس میں شک نہیں کہ محاذ رائے شماری کو ٹوڑ دیا گیا مگر اس کی تلخ روایات قائم رہیں۔ اقتدار کے نئے ڈھانچے میں تمام اراکین کو جگہ نہ مل سکی۔ حالانکہ ان میں سے چند ایک انفراد کو بھاری فائدہ پہونچا جس کے وہ مستحق نہیں تھے۔ ان میں سے چند اراکین شیخ عبد اللہ کے خیالات

کے مخالف تھے۔ اور چاہتے تھے کہ رائے شماری کے لئے جدوجہد جاری رہنی چاہیئے۔ اس راہبانہ ماحول کے پس منظر میں چند غیر ملین عناصر آخر کار ان تنظیموں میں شرکت کر گئے جن کا مقصد تخریبی کاروائیوں کا سہارا لینا تھا۔ یہ امر اس سے بھی زیادہ نقصان دہ تھا کہ بنگلہ دیش جنگ کے بعد ایک طاقت کے طور پر محاذ رائے شماری کمزور ہو کر رہ گیا تھا۔ اور مشیر اکارڈ (۱۹۷۵ء) کے تحت ہونے والے تصفیے کے بعد اس کی قربتاً اجیلے نو ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو کشتیوں پر سوار ہونے کے رویے کو ایک مرتبہ پھر امتیاز کیا گیا۔ جس کا انجام آخر کار ان دونوں کے درمیان کرنے کی صورت میں ناگزیر رہا۔

الفتح

الفتح اور دوسری دہشت گرد تنظیموں کی وراثت بھی کسی قدر کم تشویش ناک نہیں تھی۔ جاسوسی، بم دھماکوں اور سیال ٹنک کر ہوائی جہاز اغوا کرنے کے گذشتہ معاملوں نے کشمیری نوجوانوں کے ذہن پر اپنا مخصوص تاثر چھوڑا تھا۔ جنوری ۱۹۶۵ء سے جنوری ۱۹۶۱ء تک کے پانچ برس کے عرصے کے دوران کشمیر میں گونہ گونہ زمین شیعے اور جاسوسی میں ملوث تنظیمیں سرگرم عمل تھیں ان کی تعداد ۸۰ سے کم نہیں تھی۔ ان میں الفتح، ابرو، الکشمیر شامل ہیں۔ اس عرصے کے دوران ۲۸-۳۰ مارچ ۱۹۶۵ء میں ۸۰ عسکری گن ۱۴ ہلکی مشین گن ۴۴ ریواور ۳۳۱ دستی بم، ۱۱۶ ڈیٹونیتز، ۲۰ بم، ۲۰ راکٹ لانچر، ۳ وائٹ لیس سیٹ اور ۱۰۰ پونڈ آئٹمی گنیر مادہ پولیس نے برآمد کیا۔ بڑی بڑی اس فہرست سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ ۱۹۶۵ء کی ہند پاک جنگ اور ۱۹۶۶ء کے تاشقند معاہدے کے بعد بھی تحریب کاری جاری رہی۔

تا شقند مبادے کے بعد کے عرصے میں انفع تنظیم کشمیر کی تخریب کاری پر چھائی رہی۔ اس تنظیم نے اپنی سرگرمیاں ۱۹۶۶ء میں شروع کیں اور اس کی صفوں میں بتدریج اضافہ ہوا ۱۹۶۹ء تک یہ ایک مکمل تنظیم کی صورت اختیار کر چکی تھی اور اقتصادی اور عسکری شعبے کی طے شدہ حکمت عملی کے علاوہ اس کا سیاسی شعبہ بھی قائم کیا گیا تھا۔ ۱۹۷۱ء میں اس تنظیم کی سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں۔ ایک بیک ڈاکہ کیس کے بعد اس تنظیم کے افراد کا سراغ لگایا گیا اور عملی طور پر اس گروہ کو ختم کر دیا گیا۔

الفتح نے اپنا نام خوب گوریلہ تنظیم سے حاصل کیا جس کا مقصد نصب العین فلسطین کی آزادی تھا۔ یہ نام قرآنی آیت سے لیا گیا ہے جس کا مطلب خدائی امداد اور موقع کامیابی ہے۔ اس تنظیم کے ناظمہ کو سنگری کی تحریک حریت، انقلاب، انقواب اور جمہور کا گونا گونا گوسے

حکمت عملی سے تحریک حاصل ہوئی۔

الفتح کا کلیدی ناظم اور لیڈر غلام رسول راغبیہ تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس نے چند ایسے نوجوانوں کی حمایت بھی حاصل کر لی جنہیں اس نے کامیابی کے ساتھ اس طرف مائل کر لیا۔ ان میں سید سرور جس نے اپنے بل بوتے پر ایک تنظیم اسٹوڈنٹس ریلیوشنری کونسل قائم کی تھی، فضل الحق اور نوید احمد وانی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ۱۹۷۱ء میں پولیس نے جب اسے ختم کیا اس تنظیم میں بھرتی ہونے والوں کی فہرست میں ۲۰ افراد شامل تھے۔ ان میں سے ۱۴ انتہائی سرگرم اور آلودہ ذہن تھے۔

اس تنظیم کا بنیادی نصب العین جماعتی، ایم و دھما کول، ڈاکول اور دوسری تحریری سرگرمیوں کا ارتکاب تھا۔ ان کی حکمت عملی میں مقدس مقامات، جن میں مخدوم صاحب کی زیارت شامل ہے کو تہما گہرا کے فرقہ وارانہ جذبات کو ابھارنا تھا۔ اس تنظیم نے "سرخ کشمیر" کے نام سے پورے ہی شائع کئے اور آزاد کشمیر کی کال دی۔

الفتح کے چوٹی کے لیڈروں کی ترقیب و تربیت و رہنمائی کرنے والوں میں پاکستان سرائی کے افراد۔ میجر حبیب اللہ میجر قہر شیشی میجر طفیل بیچرا اصغر اور ظفر اقبال راتھر مل تھے۔ انہوں نے کئی مرتبہ سرحد کو عبور کیا۔ امداد اور رہبری حاصل کرنے کے لئے انہوں نے پاکستانی سفارت خانے کے ساتھ بھی رابطہ قائم رکھا۔ انہوں نے سرکاری دفاتروں میں بھی دراندازی کی مثال کے طور پر ریاستی سیکرٹریٹ میں بیڈ اسٹ محمد اسحاق منہاس اس تنظیم کا سرگرم رکن تھا۔ اس سے الگ پاکستانی اہلکاروں نے ہتھیاروں کی بھاری مقدار کا انتظام بھی کیا جنہیں سلیم جہانگیر نے سنبھل لیا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ جب بھی ضرورت محسوس ہو۔ الفتح کے سرگرم کارکنوں کو یہ ہتھیار دستیاب رہیں۔

الفتح کو محاذ رائے شماری مخصوصاً مرزا افضل بیگ سے اچھی خاصی حمایت حاصل ہوئی۔
محاذ کے نوجوان شعبے نے الفتح کی مخصوص تنظیم - بیگ مین لیگ اور سنوڈنٹ فیڈریشن کے
ساتھ نزدیکی رابطہ رکھائیں مرزا افضل بیگ نے غلام رسول راہیگر کے ساتھ خفیہ رابطہ قائم رکھا تھا۔
الفتح کثیر میں دہشت گردی کی تین اہم وارداتوں کے لئے ذمہ دار تھی۔ ۳۰ فروری ۱۹۶۷ء
کو ٹوکلہ پل پر بی ایس ایف کانسٹیبل چرن داس کا قتل ایکم اپریل ۱۹۶۷ء کو تحصیل ایجوکیشن
آفس پلواہہ پر ڈاکر جہاں سے ۳۰۰۰ روپے کی رقم لوٹ لی گئی (iii) ۳ جنوری ۱۹۶۸ء کو محضرت
بل بیگ ڈیکی کے دوران ۹۰۰۰ روپے لوٹے گئے۔

حضرت بنی کے اس بنگ ڈاکے کے بعد ہی پولیس کو ایسا سراغ ملا جس کی وجہ سے آخر کار

وہ اس واردات میں ملوث افراد کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہوئی اور اس تنظیم کے اراکین کو حراست میں لیا گیا۔ تفتیش کے بعد معلوم ہوا کہ سلیم جہانگیر نے بھاری مقدار میں اسلحہ چار شریف میں رکھا ہے۔ جب جہانگیر کی رہائش گاہ پر چھاپہ مارا گیا تو ۱۲ سٹین گن ۱۳ (۳۸ بور) ریلو اور اسلحہ سے بھری ہوئی متعدد بوریاں برآمد ہوئیں۔

اس معاملے میں تفتیش سے یہ بھی پتہ چلا کہ وزیر اعلیٰ سمیت اہم شخصیتوں کو اغوا کرنے کا مکر وہ منصوبہ بھی تیار کیا گیا تھا۔ جو ۱۹۷۱ء کے انتخابات کے دوران آسانی سے نشانہ بن سکتے تھے۔ چنانچہ اس بات کی شہادت موجود ہے کہ دہشت کی موجودہ لہر اپنی قدیم روایت کے بغیر نہیں ہے۔ الفتح اور دوسری دہشت گرد تنظیمیں نسبتاً کم پیمانے پر سرگرم رہیں مگر اس میں کارفرما جذبہ تکنیک، سرکاری ملازمین کی وفاداریوں کو اٹھنے اندرونی اور بیرونی تحریک کاری کے لئے استعمال کئے گئے، حربے مختلف نہیں۔ مثال کے طور پر الفتح کا ایک اہم رکن فضل الحق قریشی کو گمراہ فوجیوں کی آباد کاری کی سکیم کے تحت سرکاری ملازمت دی گئی۔ وہ بعد ازاں حزب المجاہدین کا سرگرم ترین کارکن بن گیا۔ ایسے دہشت گرد کی گرفتاری اور تفتیش کے بعد جس کی صورت میں رہائش گاہ سے ۱۲ بم برآمد ہوئے، قریشی کے ساتھ سازشادہ تعلق تھے چنانچہ قریشی کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس وقت وہ سیکریٹریٹ میں بطور اکاؤنٹس آفیسر کام کر رہا تھا۔

منفی قوتوں کی حرکات

جن منفی قوتوں کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے۔ نرم روی اور متزلزل رویہ، فریب کاری اور دوغلی پن کی سیاست، معنوی جمہوریت اور غلطی کے تلے گرد آلودہ روایات، اڑنا۔ یہ سب کسی نہ کسی طریقے سے سرگرم رہے۔ فریب کاری اور دوغلی پن کی سیاست محض نیشنل کانفرنس اور دیگر مقامی گروپوں تک ہی محدود نہیں رہی۔ کانگریس جماعت بھی اس بدعت سے پاک نہیں تھی ۸۴۔ ۱۹۸۳ء میں ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو اس نے قوم دشمن اور اسلامی کے لئے خطرہ قرار دیا۔

حکومت میں تبدیلی کی بابت لوگ سمجھا میں بحث میں حصہ لیتے ہوئے کانگریس (آئی ایم این) نے فاروق عبداللہ کو فریب از سازش قرار دیا۔ راجندر کمار جی باجپائی نے کہا: ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے ان لوگوں کے ساتھ تعلقات رہے ہیں جو کشمیر کو ہندوستان سے الگ کرنے کی بابت سوچتے رہے ہیں۔ کشمیر لبریشن فرنٹ کے لیڈروں کے ساتھ اس کے ذاتی تعلقات ہیں

ہیں۔ اقتدار حاصل کرنے کے بعد اس نے ان لوگوں کے ساتھ تعلقات قائم رکھے اور اسی وجہ سے اس نے جماعت اسلامی اور جماعت طلباء کی حوصلہ افزائی شروع کر دی جو ان کے عسکری شعبے تھے۔ ان لوگوں نے ایسے نعرے بلند کرنا شروع کر دیے، جن کی آواز اس سے قبل نہیں سنی گئی تھی۔ زمین البشیر نے کہا کہ پنجاب کے دہشت گردوں اور جموں و کشمیر کے وزیر اعلیٰ کے درمیان مسلسل تعلقات رہے ہیں۔ بی آر بھگت نے الزام لگایا: ”حقائق اس بات کو واضح طور پر ثابت کرتے ہیں کہ فاروق عبداللہ قوم دشمن سرگرمیوں میں ملوث رہا تھا، ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے پاکستانی مقبوضہ کشمیر میں رہائش پذیر دہشت گردوں میں خود کو غوریز بنالیا اور انہوں نے اس بات کا پورا استحصال کیا چنانچہ انہوں نے سال ۱۹۷۲ء کے دوران میرپور (پاکستانی مقبوضہ کشمیر) میں محاذ رائے شماری کی کنولنشن ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو مدعو کیا۔ اس دورے کے دوران ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے تعلقات امان اللہ خان اور مقبول بٹ کے ساتھ قائم ہوئے۔ اپنی تقریروں کے دوران ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے عوام سے اپیل کی کہ وہ محاذ رائے شماری کے گرد جمع ہو جائیں جو کہ جنگ بندی لائن کے دونوں طرف سرگرم عمل ہے۔ اس نے واضح طور پر کہا کہ وہ کشمیر کے عوام کے اپنے مستقبل کا تعین کرنے کے حق لائیفٹک کی پوری حمایت کرتا ہے کمال الدین احمد نے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی حب الوطنی کی بابت شدید شہنشاہیت کا اظہار کیا اس نے کہا: پنجاب اور کشمیر کے واقعات سے ظاہر ہے کہ ہمارے ملک کے حصے کرنے اور انتشار کے لئے ایک سنگین سازش تیار کی گئی ہے۔ ڈاکٹر عبداللہ کے تعلقات اکالی دل، محاذ رائے شماری جماعت اسلامی، جماعت طلباء اور بے کے ایل ایف کے ساتھ ہیں یہ ایک سنگین معاملہ ہے جس کا ملک بھر میں شدید لوش لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر عبداللہ نے اپنے ساتھ مولوی فاروق کو بھی جوڑ گا منٹ لیا ہے جو کشمیر کے ہندو کے ساتھ الحاق میں بھی یقین نہیں رکھتا۔ ان کا کہنا ہے کہ جموں و کشمیر میں جس طریقے سے انتخابات کا اہتمام ہوا ان حالات نے ممبران اسمبلی کو اس بات کے لئے مجبور کر دیا کہ وہ اس کا ساتھ چھوڑ دیں۔

اور پھر یہ وہی فاروق عبداللہ تھا جس کے ساتھ کانگریس نے دلی اتحاد کیا اور جس کے تحفظ میں راجیو گاندھی سمیت رہنماؤں نے پورے زور سے میری مخالفت کی جب جنوری۔ فروری ۱۹۹۰ء میں میں اقتدار کے ڈھانچے کو تحریک کاروں کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہی کانگریس

۱۔ اس کا تعلق تاہم ۱۹۷۳ء کے تحت جموں و کشمیر میں حالیہ واقعات، لوک سبھا میں مباحثات، ۳۰ جولائی ۱۹۸۳ء (۲۳ جولائی، ۲۷ اگست ۱۹۸۳ء)

۲۔ اس کا تعلق تاہم ۱۹۷۳ء کے تحت جموں و کشمیر میں حالیہ واقعات، لوک سبھا میں مباحثات، ۳۰ جولائی ۱۹۸۳ء (۲۳ جولائی، ۲۷ اگست ۱۹۸۳ء)

آئی اور نہ ہی کسی دوسری جماعت نے اس امر کو واضح کرنے کی ضرورت محسوس کی کہ آیا پہلے بین الاقوامی سطح پر دروغ گوئی کی گئی تھی۔ انہوں نے ہندوستانی عوام کے ساتھ نہایت توہین آمیز سلوک کیا اور سوچا کہ جو جاہل کر کے بچ کر جاسکتے ہیں۔

(نومبر ۱۹۸۶ء) راجیو فاروقی اکارڈ مصنفی جمہوریت کی ایک اور آئینہ دار ہے نیز اس معاہدے سے خیالی پیکروں کے بھی پروان چڑھانے جانے کی جھلک عیاں ہوتی ہے یہ ایک غیر تحریر شدہ معاہدہ تھا جس کی محض ملکہ کام کرنے کا اعلان تھا جس کے تحت نیشنل کانفرنس اور کانگریس (آئی) کی مخلوط حکومت کا قیام مقصود تھا۔ ایک غیر رسمی سمجھوتہ تھا کہ اقتدار کی تحفے داری ۱۶۰، ۴۰۰ کے تناسب سے ہوگی۔

اگر اس اکارڈ کا اصلاحی اور تعمیری انداز فکر اور جوہش ہوتا اس سے مثبت نتائج بھی حاصل ہو سکتے تھے مگر ان جماعتوں نے تو محض اپنے ذاتی مفادات پورا کرنے کے لئے ہاتھ ملائے تھے۔ اس سے اجارہ داری اور سفائی کا دائرہ وسیع ہوا۔ کسی نئے صحت مندرجہ ان کو جنم نہیں دیا گیا۔ اس کے برعکس گورنر راج کے دوران دیا متدار۔ بھوس اور ذاتی ڈھانچہ قائم کرنے کے لئے جو مساعی سرانجام دی گئیں انہیں بھی اُلٹ دیا گیا۔ جس انداز میں ۳۳ مارچ ۱۹۸۷ء کے انتخابات کا اہتمام ہوا اس سے ان کی غیر جانبداری کے بارے میں بہت ساری غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں۔ چند حلقہ بائے انتخاب میں نیشنل کانفرنس کے کامیاب ہونے والے امیدواروں کی سہقت کے ووٹوں کی تعداد مسترد کئے گئے۔ ووٹوں سے کم تھی۔ بیجپا ۱۵ میں یہ تعداد ۱۰۰ واقعی میں ۱۲۲ اور خپیاں میں ۳۲۶ تھی جبکہ ان حلقوں میں ناجائز فرائض دیئے گئے ووٹوں کی تعداد بالترتیب ۱۱۷، ۱۰۷ اور ۱۱۲ تھی بدقسمتی سے ان انتخابات کے بعد مسلم یونائیٹڈ فرنٹ کے چوٹی کے لیڈروں کی گرفتاری بھی عمل میں لائی گئی۔

جلد ہی یہ ناقابل قبول صورت حال سامنے آگئی۔ چند افراد اور لیڈروں نے اس مسئلے پر زبردست ناراضگی کا اظہار کیا۔ نیشنل کانفرنس ممبر پارلیمنٹ عبدالرشید کابلی نے کہا: ہمارے عکس کا شیرازہ بکھر گیا ہے۔ فاروق کا عکس پہلے ہی دباؤ، گھٹن اور روٹ چوری کا ہے۔ اس طرح ایک آزاد ممبر اسمبلی سید مصطفیٰ نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا: گورنر کی حکومت کے دوران ریاست نے ایک پیسہ بھی مرکز سے فاضل وصول نہیں کیا اس کے باوجود بھی سکول، سرکاری ہسپتال اور پینے کی پانی میسر ہوا اور انصاف راستے پر حاصل تھا۔ جگموہن کے عہد

میں ہوئی بھی سامنے آیا وہ۔ انتظامیہ عوامی مفاد میں کام کرتا تھا اور بنیاد پرستی محض سطحی تھی۔ عوام کا مطالبہ نظام مصطفیٰ یا پاکستان نہیں بلکہ ملازمتوں، مرکزی محکموں میں مزید نمائندگی اور بھرتی کے لئے غیر جانبدار پالیسی تھی۔ یہاں تک کہ اس قاضی نشاندہ کو بھی گورنر نے نقص اس کی پاداش میں گرفتار کیا تھا، نے تسلیم کیا۔ ہاں۔ اب افسوس کا مقام ہے کہ ریاستی مفاد میں کی گئی اصلاحات کو اُلٹ دیا گیا۔ جھیل ڈل سے جنگلی گھاس نکالنے کا کام لگ بھگ ختم کر دیا گیا ہے۔ دیہی علاقوں میں زیر تعمیر کھیل کے ایوانوں میں دھول جمع ہو رہی ہے۔ اس بات کے سرکاری ملازمت میں ڈاکٹروں کی پرائیویٹ پریکٹس پر عوامی مفاد میں پابندی پر ہائی کورٹ رولنگ نہ کام کاج کے معاملے میں معمول بحال ہو گیا تھا۔ جگموہن کی طرف سے قائم کردہ سبارڈینٹ سیکشن بورڈوں کو ختم کرنے کی کوشش بھی کی جا رہی ہے اور نان گریڈ انٹروں کی بھرتی کے معاملے میں ریاست بھر میں کنبہ پروری اور رشوت ستانی کا دور دورہ ہے۔ اکارڈ کو نئے خیالاتی پیکر پیدا کرنے کے لئے استعمال کیا گیا۔ فاروقی عہد اللہ کی طرف سے طمطراق سے اعلانات کئے گئے۔ جن میں جماعت اسلامی کی طرف سے چلائے جا رہے سکولوں کو بند کرنا بھی شامل ہے۔ ریاست کو ۱۰ ارب روپے کی خاص امداد کے بارے میں غلط فہمی پیدا کرنے والا کوئی دوسرا نہیں بلکہ خود وزیراعظم راجیو گاندھی تھا درحقیقت اس میں اعداد و شمار کے پیرہیم کے سوائے کچھ نہیں تھا۔ اس قسم کی فزیب کاری کی ناپسندیدگی کے علاوہ جھوٹے وعدے غیر تخلیقی ثابت ہوئے ان سے ملاوی اور تلخی کے ماقول میں اضافہ ہوا۔

راجیو فاروقی اکارڈ جس میں دو لیڈروں کی فطرتی سطحیت اور ریاستی حکومت کی بے عملی شامل تھی نے منفی طاقتوں کی حرکات کو فروغ دیا جس سے غیر صحت مندرجہ دلوں سے غیر صحت مندرجہ فصل پیدا ہونے میں سرعت آئی اس پر گندہ اور آلودہ ماقول میں نقصان اور تباہ کاری ناگزیر تھی۔ ناقص مٹی خراب بنجوں اور جل چلانے والے ناقص لوگوں کے ناقص نظریات کی وجہ سے جزئیات کو نشوونما حاصل ہوئی۔

دہشت گردی کی جڑیں! پوشیدہ ریشہ

”قطعہ ارضی کو چید کر نکل آنے کے بعد
تم نے خود کو کھوٹنے سے باندھ لیا ہے
کس قسم کے بیج تم نے بوئے ہیں
کہ تم ایک بھر پور فصل کی توقع کرتے ہو“
للہ وید

ایک قوم کی زندگی کا انحصار چند بنیادی قوتوں پر ہوتا ہے ان قوتوں سے سماجی اور سیاسی ڈھانچے میں پوشیدہ ریشوں کی تشکیل ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک ریشہ مذہب ہے جو سب سے زیادہ طاقتور اور اہم حیثیت رکھتا ہے۔

انسانی تاریخ کے ہر دور میں مذہب ایک طاقتور قوت رہا ہے۔ مارکس نے اسے غلام کیلئے انیول قرار دیا اور فریڈ نے اسے غلام کے لئے مفادِ اہل ب قرار دیا ہے۔ اس معاملے میں مجھے کارڈ نال گونسالوک اور نیولین کے دیوان باتِ حیات کی یاد آتی ہے۔ کارڈ نال کیتھولک چرچ کے کیس کی وکالت کر رہا تھا۔ کبھی نکتے پر جگر پیر نیولین نے کہا: ”آپ کی ممتاز شخصیت کو یہ علم ہونا چاہیے کہ ہمیں کیتھولک چرچ کو تباہ کرنے کا اختیار مل ہے“ کارڈ نال مسکرایا اور جواب دیا: ”جہاں پناہ ہم گھڑتے... ہمیں اس سے کیتھولک پادری میں اور ہم نے کیتھولک چرچ کو تباہ کرنے کی پوری کوشش کی ہے مگر ہمیں اس میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی اور نہ ہی یہ کامیابی آپ کو حاصل ہوگی“ اس باتِ حیات سے اندوہنا اور بیرونی تباہ کنندگان کی طرف سے مذہب کی دائمی حیثیت ظاہر ہوتی ہے۔

نقطہ تبصیر پر ناکامی

کثیر کے صوفیوں اور شیعوں کی روایت میں نجات اور رواداری، امن اور تقدس پھر ددی اور

وسیع القلبی کی اعلیٰ قدریں راسخ رہی ہیں۔ ان روایتوں کو بروئے کار نہیں لایا گیا۔ ان کو محک کر کے ٹی مشکل نہیں دی گئی اور نہ ہی انہیں اس انداز سے کام لیا گیا تاکہ حصولِ آزادی کے بعد کی حقیقتوں کا مقابلہ کر سکیں۔ تاریخ کے نقطہ تبصیر پر یہ ایک بھاری ناکامی تھی۔

اس نازک لمحے پر اپنی سطح سے نیچے اور پنہاں مذہبی اور ثقافتی طاقتوں کو سمجھنے میں کثیر ناکام رہا اگر ان قوتوں کی تبصیر اور سچے میں ڈھانے کا کام کیا ہوتا تو اس سے کثیر کے سیاسی ڈھانچے اور اس کے ہندوستان کے ساتھ تعلقات کو نئی بنیاد حاصل ہوتی۔ اس صورت میں یہ ذہن اور روح کا رشتہ ہوتا نہ کہ ایک آئینی و فذہ کا۔ اس سے کثیر میں اسلام کی اندرونی قوتیں ابھرتی اور جمک سے ہندوستان کے ساتھ رشتے کی روحانی تقویت کے لئے مثبت رابطہ قائم ہو سکتا مگر بد قسمتی سے ہم اٹھے چلے۔ نہ صرف کثیر کے تمدن کی صحت مند قوتوں کو نقصان پہنچا کر تباہ کیا گیا۔ بلکہ غیر صحت مند قدس کو فروغ دے کر ان کی نشوونما کی گئی۔

میں نے پہلے ہی اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ کس طرح شیخ عبداللہ نے اپنے سیاسی مفادات کو پورا کرنے کے لئے جب بھی ضروری ہوا سیاسی مفادات کی خاطر اسلام کے استعمال سے بھی گریز نہ کیا۔ اس کی وفات کے بعد اس کے فرزند ڈاکٹر فاروق عبداللہ اور نیشنل کانفرنس جماعت بھی انہیں خطوط پر چلتی رہیں اس بات کی شہادت اس انتخابی مہم سے مل جاتی ہے جو ریاستی اسمبلی کے ۱۹۸۳ اور لوک سبھا کے دسمبر ۱۹۸۴ء کے انتخابات کے دوران چلائی گئی۔ درحقیقت نیشنل کانفرنس کے اندر ہمیشہ سے ایسے عناصر موجود رہے ہیں جو اپنے اسلامی ذہنی جھوک کی نمائش کرتے رہے ہیں۔ بعض اوقات تو ان عناصر نے اس قسم کے کمزور قوتوں کے لئے جیسے کہ کوئی بنیاد پرست حرکت کر رہا ہو مثال کے طور پر نیشنل کانفرنس کے ایک سینئر لیڈر سابقہ وزیر اور ڈپٹی سپیکر عطاء اللہ سہاروی نے ریاستی قانون ساز کونسل میں مندرجہ ذیل تقریر کی۔

”میں پہلے مسلمان اور بعد میں ہندوستانی ہوں اسلام کو اپنی تبلیغ کے لئے کسی کے حمایت کی ضرورت نہیں۔ یہ اپنے بل بوتے پر پھیل رہا ہے۔ تقسیم وطن کے موقع پر ملک میں صرف ساڑھے چار کروڑ مسلمان تھے اور بیونڈی، مراد آباد اور علی گڑھ میں اور دوسرے علاقوں میں ہوئے فرقہ وارانہ فسادات جن میں ہزاروں کی تعداد میں مسلمان مارے گئے اس کے باوجود مسلم آبادی بڑھ کر ۱۰ کروڑ ہو گئی ہے... جہاں تک مذہب تبدیل کر کے اسلام قبول کرنے کا سوال ہے، یہ ہر مسلم کا بنیادی فرض ہے کہ وہ اس تبدیلی مذہب کے لئے کوشش کرے اور جس شخص کو اپنا یہ فرض یاد نہیں وہ مسلمان کہلانے کے قابل نہیں“

اسلام کیا ہے؟

اسلام کے لئے کوئی مخصوص تعریف مشکل ہے۔ بلاشبہ اس کی ایک روح ہے اور اس کے ارد گرد کا

دارت و سینچ ہے جو غیر تعینیت کا حامل ہے اور اس کی بابت مختلف تشریحات کو تسلیم کرتا ہے مگر یہ مسلمان یہ ماننا ہے کہ خدا صرف ایک ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پیغمبر ہیں اس سے آگے بہت کم اتفاق رائے ہے۔ اسلام کے اصول اور اسلامی خیالات مختلف موقوفوں پر مختلف تشریحات کے موضوع رہے ہیں۔

پاکستان میں ۱۹۵۳ء کے دوران روینا امدیہ مخالف فسادات کی تحقیقات کے دوران جسٹس میر نے علماء سے دریافت کیا کہ ایک مسلمان کی تعریف کیا ہے تو اس وقت مختلف قسم کے جوابات اسے موصول ہوئے اس پر جسٹس میر نے کہا: "اگر علماء ایک سادہ سوال پر تفسیق الرائے نہیں ہو سکے تو ایک عام آدمی کیسے سمجھ سکتا ہے؟" اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ حق اور واضح الفاظ میں یہ بات شخص کرنا مشکل ہے بلکہ اسلام کن اعمال کو لے کر بتا ہے اور کون سے اعمال اسلام میں شامل نہیں۔

جیسا کہ گویئے نے کہا: "اگر اسلام کے معنی خدا کے ہم موجود ہونا ہے تو ہم بھی اسلام کے لئے زندہ رہیں گے اور اس کے لئے اپنی جان دے دیں گے۔ یہ مسئلہ مرکز کا نہیں بلکہ دائرے کا ہے۔ یہ حدود جو روزمرہ زندگی کے اقتصادی تمدن اور سیاسی معاملات سے میل کھیتی ہیں۔"

مخصوص رنگ

کشمیر میں اسلام کا اپنا ایک مخصوص رنگ و روپ ہے۔ جیسا کہ سر آرل سٹائین نے ذکر کیا: "اسلام کشمیر میں فتوحات جبری نہیں بلکہ تدریج تبدیلی مذہب کے ذریعے داخل ہوا۔ بعض اوقات جبری طور طریقے بھی اختیار کئے گئے جیسا کہ سلطان سکندر کے عہد میں ہوا مگر زیادہ تر تبلیغ اسلام سید علی ہمدانی اور سید محمد بدائی جیسے خدمت خلق کا جذبہ رکھنے والے افراد کے ذریعے حاصل ہوئی۔ اگرچہ اس مذہب کو مسلسل طور پر قبول کیا گیا مگر اس نے کشمیریوں کے مقامی اعتقادات اور مروجات میں خلل نہیں ڈالا۔ ویسے بھی کشمیر میں اسلام کی روح جن صوفی اور سنی شجرات پر قائم ہے وہ عوام کے روحانی مزاج اور ہمال کے عام منظر کے مخالف نہیں یہ شجرات اپنے نظریات میں بنیادی طور پر باخ نظر اور اپنے میں مختلف مذاہب کی روح کو سمونے ہوئے تھے۔"

حالیہ دور تک۔ درحقیقت جب تک جماعت اسلامی اور دیگر بنیاد پرست جماعتوں نے دراندازی نہیں کی تھی۔ کشمیری قدیموں کی تشکیل و مذہبی شجرات صوفی اور رشتی۔ پر مشتمل تھی جو کہ چودھویں اور پندرہویں صدی کے دوران ظہور پذیر ہوئے۔ کشمیر میں صوفی شجرے کی خدمات فارس اور وسطی ایشیا کے مبلغین نے

سراخام دیں جبکہ رشتی شجرے کو حالانکہ صوفی شجرے سے فیضان حاصل ہوا۔ مگر اس پر مقامی پہلی روایات کے گہرے اثرات ہیں اور اس کی تبلیغ سرزمین کے فرزندان نے کی۔

صوفی مت کے اوصاف

اندرون اسلام میں ہی صوفی مت کو ایک نمایاں روحانی تحریک کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ مت اس دور کی سماجی نا انصافیوں کے خلاف۔ مغربی اندرونی بغاوت کے سبب پیدا ہوا اور ماہر دینیات کے ضرورت سے زیادہ دانشورانہ اور منقسمانہ رجحانات کے خلاف ایک رد عمل تھا۔

قرآن شریف میں چند ایسی حکایات موجود ہیں جن کے مطابق پیغمبر اسلام ترک دنیا یا فرار سے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ بہر کیف صوفیوں کے مطابق صوفی مت میں اسلام کی روح مضمر ہے۔ یہ فقیر خدا کی وحدت اور یوم حساب انجام اور سزا کے نظام پر یقین رکھتے ہیں۔ مگر یہ لوگ اندرونی پاکیزگی اور خدا کے ساتھ ذاتی اور براہ راست رسانی پر یقین رکھتے ہیں۔ یہ زندگی میں پاکیزگی اور سادگی کی وکالت کرتے ہیں۔ سادگی اور ذاتی اصلاح کے لئے مسلسل کوششیں ان کے لئے مشعل راہ ہیں۔ ان کا یقین ہے کہ حقیقی جہاد ان بدعتوں کے خلاف برسر پیکار ہونا ہے جو اس کی ذات کے اندر موجود ہیں اور حقیقی فتح اسی صورت میں ہے جب ہم دنیاوی خواہشات اور نفسانی آسودگیوں کو قابو میں رکھ سکیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ خدا کے ساتھ اس لئے فحش کی بھائی چاہیے کہ ہمیں اس سے عشق ہے کہ ہم اس سے کوئی ذاتی مفاد حاصل کرنا چاہتے ہیں جیسا کہ صوفی سنت را البعدہ رقمطراز ہے: "میں نے اس کی خدمت اس لئے کی ہے کہ میں اس کے ساتھ محبت کرنا ہوں اور اس کو حاصل کرنے کی خواہش پیچھے حاصل ہے۔ اس کے ساتھ میرے عشق نے میری ذات پر اس قدر ملکیت حاصل کر لی ہے کہ اب اور کسی چیز کے لئے گنجائش ہی موجود نہیں ہے۔"

کشمیر کا صوفی شجرہ

کشمیر میں صوفی شجرے کی ضوفشانی سید علی شاہ ہمدانی سے ہوئی۔ انہیں شاہ ہمدان کے طور پر مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کی ولادت ۶۱۳۱ھ میں ہمدان میں ہوئی۔ وہ ایک عظیم عالم اور مبلغ تھے۔ انہوں نے ۶۰ کتابیں اور کتابچے تحریر کئے وہ ایک صوفی اور ایک عالم اور دانشور تھے۔ ۱۳۶۲ھ میں کشمیر میں وارد ہوئے۔ ان کے ہمراہ سات سو پیروکار تھے۔ دوسری مرتبہ ۱۳۶۹ھ میں کشمیر آئے اور دھائی برس تک یہاں قیام کیا۔ تیسری مرتبہ ۱۳۸۳ھ میں کشمیر آئے۔ انہوں نے وادی کے طول و عرض کا دورہ کیا جہاں انہوں نے اسرار اسلامی کی تبلیغ کی اور اس اعتقاد کے تمکین تبدیلی مذہب حاصل کی انہوں نے مختلف مقامات پر ایسے پیروکار چھوڑے جن میں اونی پورہ اور ملن جیسے ہندو مذہب اور تمدن کے اہم مرکز شامل تھے۔

انہوں نے کشمیر میں اسلام پھیلانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اگرچہ کشمیر میں اسلام کی تبلیغ سید علی ہمدانی کی آمد سے قبل ہی شروع ہو چکی تھی۔ مگر انہوں نے اور ان کے پیروکاروں نے اس عمل کو تیز کر دیا۔ انہوں نے اسی خالق ہوں اور مرد رسول کا تسمیٰ عمل میں لایا جہاں سے تمام وادی میں تبلیغ اسلام کا کام سرانجام ہوتا تھا۔

سید علی ہمدانی کے اعتقاد کا دوزاویوں سے تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔ ایک زاویے کے مطابق خالق اور مخلوق دو نمایاں حقیقتیں ہیں اور خالق کی کوئی شکل و صورت نہیں اور اس کی مانند کچھ نہیں۔ اس کی بابت جو کوئی بھی کچھ تصور کرتا ہے وہ اس سے پرے ہے۔ ایک اور سطح پر وہ خالق کے ساتھ اسرار کی پہچتی پاکیزہ اور سادہ زندگی بسر کرنے سے حاصل کر سکتا ہے۔ ہمدانی چاہتا ہے کہ انسان مکمل ہو۔ وہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ بڑے لوگ راہ راست پر چلتے ہیں وہ خدا کا مقصد پورا کرتے ہیں کیونکہ خدا نے بشر کو اپنے نور کو پھیلانے کے لئے پیدا کیا ہے۔

سید علی کے بعد ان کا بیٹا سید عمر ہمدانی آیا اس کے انداز فکر میں جارحیت کا جذبہ زیادہ تھا۔ وہ ۱۱۲۹ء میں اپنے ۳۰۰ پیروکاروں کے ساتھ کشمیر میں وارد ہوئے اس نے یہاں پر ۲۲ برس تک قیام کیا۔ اس کے اثر و رسوخ کی وجہ سے ہی سلطان نے لاہور جوش و خروش کا مظاہرہ کیا۔

کشمیری رشیوں کا شجرہ

سید علی ہمدانی کی طرف سے تبلیغ شدہ صوفی شجرہ کے مقابلے میں شجرہ زیادہ فراخ دل غیر مشنری میں تھا اور اس کی جڑیں مقامی روایات میں پیوست تھیں۔ اس شجرے کی دو اہم شخصیتیں مل دید اور شیخ نور الدین تھے۔

مل دید ۱۱۳۱ء اور ۱۱۳۲ء کے دوران پانیوں میں پیدا ہوئے مگر پرورش پاکیزگی کے ماحول میں ہوئے۔ اوائل عمری میں اس کی شادی کر دی گئی۔ شوہر اور سسرال کے لوگ اس کے ساتھ بدسلوکی کیا کرتے تھے۔ اس نے گھر بار چھوڑ دیا اور اصرار دھرم گھوڑنے والی فقیر بن گئی۔ وہ جنگلوں میں اسی حالت میں گھومتی پھرتی کہ اس کے بدن پر شایید ہی کوئی کپڑا ہوتا۔ نور الدین اور اس کی حکایتیں اور مقررہ کرشی شجرے کی روح پیدا کرتی ہیں۔ مل دید کی اپنی ہی حکایت میں اس کے اثر و رسوخ کی جھلک ملتی ہے۔

میں نے اپنی زبان سے جو کچھ بھی کہا۔

وہ منتر بن کر رہ گیا

مل دید کی شاعری میں ایک پیدائشی فنکار کی چھاپ ہے۔ اس کی تعلیمات اشارات اور کنایات اس قدر مافوق اور قدرتی جھرنے کی طرح چھوٹے ہیں کہ اس کی قوت اظہار میں ہمارے گرد و پاس کی زندگی

کی اندرونی اور بیرونی حقیقتوں کا بیان دیکھ کر انسان انگشت بدندان رہ جاتا ہے۔ شیخ نور الدین نے بجا طور پر کہا ہے۔ مل دید ایک "اوتار" اور ایک تو گئی ہے اس کے متعلق ایک اور اہم راستہ مشاہدہ ہے کہ "خدا کو حاصل کرنے کے لئے اس کی تمام تر ملکیت کو نذر آتش کر دیا" مگر اپنی ذات کا بہترین اظہار اس نے خود کیا ہے۔

میں اس جہاں میں ایک تپسوی کی طرح آئی شہور نے میری ذات کے لئے راہوں میں حیران کر دیا۔ شیخ نور الدین مل دید سے ۳۰ برس چھوٹا تھا۔ چوبیس سالوں کے ایک کنبے میں ۱۱۳۸ء میں پیدا ہوئے باپ کی موت کے بعد اس کے بھائیوں نے اسے چوری کی وارداتوں میں اپنے ہمراہ شامل ہونے کی ترغیب دی مگر وہ ایک مقدس شخصیت تھے اور ریاضت کی عادت میں شامل تھے وہ ایک عظیم اوویسی بن گئے اور کشمیر کے رشی بچھے کا وہی حقیقی بانی تھے اس نے تندہی سے کام کرنے والے رشیوں کا مرتبہ ایک ترتیب سے دیا اور اپنی تحریک کے مرکز ہر ایک پر گز میں قائم کئے۔ اس نے مقبولیت اور شہرت حاصل کی سلطان زین العابدین آن کے جنازے (۱۱۳۹ء) میں شامل ہوئے اور افغان گورنر محمود خان نے انیسویں صدی کے اوائل میں ان کے نام سے سکنے جاری کئے۔

اثرات

رشیوں نے کشمیر کی سماجی اور تمدنی زندگی پر اپنی گہری چھاپ چھوڑی۔ ان کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ "انہوں نے وادی کو جنت میں تبدیل کر دیا۔ سترہویں صدی کے ایک شاعر نے لکھا: مذہب کی تبدیل رشیوں نے روشن کی ہے: اعتماد کی راہ کے وہ راہر ہیں پیشوا ہیں روح کو گہری دینے والی خوبی کا ظہور رشیوں کی پاکیزگی سے ہوتا ہے اس جنت بننے والی کشمیر کی خوبصورتی کا زیادہ دار و مدار ان روایات میں ہے جن کی داغ بیل رشیوں نے ڈالی ہے"

ابوالفضل بھی رشیوں کے رول سے متاثر ہوا تھا۔ اس کا اندازہ ہے کہ اس وقت ۲۰۰۰ ایسے رشی تھے۔ وہ قطعاً سب کشمیر میں سب سے ذی عزت طبقہ رشیوں کا ہے۔ اگرچہ انہوں نے عبادت کی روایتی اقسام کو ترک نہیں کیا ہے مگر وہ صبح عابد ہیں۔ وہ دوسرے مذہبوں کے لوگوں سے نفرت نہیں کرتے۔ وہ دنیاوی اشیاء سے متلاشی نہیں ہیں۔ عوام کے فائدے کے لئے وہ مزدار درخت لگاتے ہیں گوشت خوری سے احتراز کرتے ہیں۔ اور شادی نہیں کرتے بشہنشاہ جہانگیر نے کہا تھا "اگرچہ رشیوں نے علم حاصل نہیں کیا ہے وہ ایک غیر بہم اور سادہ زندگی بسر کرتے ہیں کسی کی تکیہ چینی نہیں کرتے اور کچھ طلب نہیں کرتے۔

اعتقادات

رشیوں کو جھوٹ اور تصنع سے نفرت تھی۔ شیخ نور الدین کی مشہور نظموں میں ایک یوں ہے:

”اے مولا تمہارے گلاب کا چین

ایک سانپ کی مانند ہے

تم اس وقت دانے گننا شروع کر دیتے ہو جب

تمہارے پیرو کار نزدیک آتے ہیں۔

تم ایک کے بعد ایک چھ بار کھانا کھاتے ہو

اگر تم شاہ ہو، تو

چور کون ہے؟“

رشی کتابی علم سے نفرت کرتے تھے۔ اس معاملے میں شیخ نور الدین نے کہا۔

”ایک روحانی پیشوا آب حیات سے بھرے برتن کی مانند دکھائی دیتا ہے

جو بوند بوند کر کے نکلتا رہتا ہے۔

اپنے پیلوں میں کتابوں کے ڈھیر لے

وہ انہیں پڑھ کر شاید وہ اُلجھ کر رہ گیا ہے۔

ٹٹولنے پر ہمیں معلوم ہوا کہ اس کا ذہن خالی ہے“

رشیوں نے بھی خواہشات نفسانی پر نفع حاصل کرنے پر بھاری زور دیا۔ شیخ نور الدین کی زندگی کے ساتھ وابستہ ایک کہانی کے مطابق، ایک دن ایک دوکان میں اس نے دیکھا کہ یہاں پر پھیلی پکائی جا رہی ہے۔ وہ اس مقام کے نزدیک گیا اور لچر بھر سوچنے کے بعد پھیلی کو اٹھانے کی بجائے اس نے جھٹی سے جلتی ہوئی ایک سلاخ کو اٹھا لیا اور اپنے منہ میں ڈال دیا۔ اس کی زبان جل گئی۔ وہ چملا یا۔

اس نفس نے مجھے بہت پریشان کیا ہے

اس نفس نے مجھے بالکل تباہ کر دیا ہے۔

یہی نفس ہیں دوسروں کو تباہ کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔

یہ نفس شیطان کے سلام میں

ان نفسوں کی خدمت اپنی آنکھوں میں

دھسول جھونکنے کے مترادف ہے

اس کے بعد کوئی بینائی کی توقع کیسے رکھ سکتا ہے

نفس ایک باغی پھڑے کی مانند ہے

جسے باندھ کر رکھنا چاہیے۔

اسے فاتے کی سلاخ کے ساتھ دھکا نا چاہیے۔“

لال دید کے خیالات میں بھی اسی قسم کی گورج ہے۔

”اے میری روح، میں تمہارے لئے روتارہوں گا، روتارہوں گا

دنیا نے نہیں اس عالم میں پکڑ لیا ہے

اگرچہ تم انہیں ایک نولادی چادر کے ساتھ چپکائے رکھتے ہو

اشیا کے سائے سے تم محبت نہیں کرتے ہو

یہ تمہارے ساتھ تمہاری موت کے ساتھ ہی جائیگی“

رشیوں نے زندگی کی حقیقتوں کو سمجھا اور ان کا اظہار سادہ اصطلاحات میں کیا ہے۔ ان کا اعتقاد تھا کہ خدا ہر جگہ موجود ہے اور کوئی شخص اسے اپنی ذات سے ابھرتے ہوئے محسوس کر سکتا ہے ہر جگہ موجود ہے جسے طاقتور خدا کا ظہور تمام افراد میں ہے۔ شیخ نور الدین نے ایک مرتبہ کہا: جب میں اپنے نفس کو پہچاننے کے قابل ہوا، میں خدا کو پہچاننے کے قابل بن گیا۔ یہ سودوزیاں میرے لئے یکساں بن گیا چونا پتھر زندگی اور موت کا فرق میرے لئے ختم ہو گیا لال دید نے بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔

”زائر سنیا سی ایک مندر سے دوسرے مندر تک جاتا ہے

اس توقع میں کہ وہ اس کو حاصل کرے گا، جو کہ اس کے اندر ہی موجود ہے۔“

کشمیر میں موجودہ طوفان سے قبل کشمیریوں کا مزاج تھا کہ کسی کو ہلاک نہیں کیا جائے یہ بات رشیوں کی تعلیمات اور ان کے افعال سے نمایاں ہوئی ہے۔ وہ قتل و غارت اور گوشت خوری سے نفرت کرتے تھے۔ جینیوں کی طرح وہ اس بات کی احتیاط رکھتے تھے کہ کڑوڑوں مکوڑوں تک کو بھی نہ مارا جائے یہاں تک کہ گھاس کو بھی نقصان نہ پہونچایا جائے مثال کے طور پر شیخ نور الدین نے گھاس پر چلنا تک بند کر دیا۔ اس نے تازہ سبزیاں کھانا بھی چھوڑ دیا۔

کشمیر میں جس اسلام کی رشیوں نے تبلیغ کی ہے وہ کیریت سے مطابقت رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر لال دید رقمطراز ہے۔

اللہ ہر جگہ موجود ہے، ہر جگہ دیتا ہے

بندو اور مسلمان کے درمیان تمیز مت کرو

اگر تم عقلمند ہو تو خود کو پہچانو

بھگوان کا حقیقی علم یہی ہے۔

ایک اور جگہ لال دید نے کہا۔

میں نے قریب کاری اور جھوٹ کو ترک کر دیا۔

میں نے اپنے ذہن کو سکھایا کہ میں اپنے ہزار افراد کو ایک سمجھوں چنانچہ میں آدمی اور آدمی کے درمیان امتیاز کیسے کر سکتی ہوں۔ اور ایک بھائی کی طرف سے پیش کردہ کھانے سے انکار کیسے کر سکتی ہوں۔ شیخ نور الدین نے ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا۔

خدا ایک ہے

اس کے سینکڑوں نام ہیں

گھاس کا ایک تنکا بھی ایسا نہیں

جو اس کی پرستش نہیں کرتا۔

کشمیری اسلام کی خوبیاں، غور و فکر یا ضمت، ترک دنیا، استرازا، سادگی اور رواداری وغیرہ ہندو مت، بودھ مت اور جین مت کے ساتھ مشترک ہیں۔ یہ ہندوستانی گونا گوں سماج کے عین مطابق ہے۔ کشمیری نفسیات کے ان اوصاف کے باعث ہی ۱۹۴۷ء میں کسی قسم کی خونریزی، نارواداری یا فرقہ وارانہ جنوں کا مظاہرہ نہیں کیا گیا جبکہ برصغیر کا باقی حصہ تنگ نظر فرقہ واریت اور مذہبی جنوں کے باعث شدید طور پر متزلزل ہوا۔

ہم ایک ہی والدین کی نسل ہیں

چنانچہ ہمارے درمیان امتیاز کیوں ہو؟

آئیے ہندو اور مسلمان صرف خدا کی عبادت کریں

ہم دنیا میں شریکوں کی طرح آتے ہیں

ہمیں اپنی سرزوں اور تخمینوں کو مل بانٹنا چاہیے۔

درحقیقت یہ افسوس کا مقام ہے کہ کشمیر کے روحانی منظر میں جن خیالات کی چھاپ ہے ان پر غور نہیں کیا گیا اور ان کی اہمیت کو ذہن نشین نہیں کیا گیا۔ مرکزی اور ریاستی سطح پر سربراہی کرنے والے اقتدار کے کھیل میں خود کو اس قدر خوکردیا کہ جو مذہبی اور تمدنی جڑیں اصولوں پر مبنی سیاست کو فروغ دے سکتی تھیں انہیں یکسر نظر انداز کر دیا گیا۔ یونین اور کشمیر کے جن اداروں نے سماجی نظام کو فروغ دیا، وہ ناکام ہو گئے اپنے چھوٹے ادنیٰ مقاصد کو پورا کرنے کے لئے استحصالی عناصر تنگ نظری کے بیج بو کر اس منظر پر خراب کاری اور نارواداری کے شجرہ نمایاں کر دیئے۔

جماعت اسلامی

ان برسوں کے دوران نئی سیاسی سرگرمیوں نے اس بات کا اندازہ کر لیا کہ نیشنل کانفرنس کی طرف سے اسلام کے استعمال کو وسیع کر کے اور کشمیری اسلام کو خدا پرست بنانا اگر کے وہ راستہ کرنا ہی منظر میں

اپنی جڑیں مضبوط کر سکتے ہیں۔ اس میدان میں سب سے طاقتور قوت جماعت اسلامی تھی۔ اس نے کشمیری سماجی اور سیاسی قدروں کو جنون اور بنیاد پرستی کی طرف جھکایا۔ اس نے کشمیری سیاست اور انتظامیہ کی شکستیں بہروں کو نئی صورت دی۔ اس نے ان گروپوں کے درمیان پاکستان لٹرا رتھریول کو فروغ دیا۔ جو بصورت دیگر بھی کشمیر کے پاکستان کے ساتھ الحاق کے حامی نہیں تھے۔ چنانچہ اس معاملے کے تعطیلی پس منظر کا مطالبہ کرنے کی ضرورت ہے۔

جماعت اسلامی ہند کی بنیاد ۱۹۳۸ء میں سید ابوالاعلیٰ مودودی کی طرف سے رکھی گئی۔ اپنے خیالات کے ساتھ مطابقت رکھنے والے مسلمانوں میں اس نے ایک دستور کا مسودہ تقسیم کیا۔ ۱۹۴۱ء میں چند تبدیلیوں کے ساتھ اس مسودے کو منظور کر لیا گیا۔ مودودی نے نظام مصطفیٰ کے تصور کو فروغ دیا جس کا تین پیچہ اسلام حضرت محمد نے کیا تھا اس نے قرآن اور سنت کو بالادستی دینا چاہی۔ اس کا عقیدہ تھا کہ سیاسی بالادستی صرف خدا کو حاصل ہے اور حکمران صرف خدا کی طرف سے ہی حکومت کر سکتا ہے۔ وہ ایک پراوصاف شخص ہونا چاہیے۔ اور امانہ یعنی مسلم کلفت ایسے شخص کو لازمی طور پر اپنا حکمران منتخب کرنا چاہیے۔

مودودی نے اسلامی طرز زندگی کو نمایاں مقام دیا۔ اسے اسلام کے قوم پرستی بالاکردار میں اعتقاد تھا۔ وہ قوم پرستی کو پسند نہیں کرتے۔ انہوں نے ایک مرتبہ کہا کہ اسلام قوم پرستی ایک پاکیزہ بیرونی کی طرح ایک متضاد اصطلاح ہے۔ وہ دنیا بھر کے تمام تر سماجی، اخلاقی، سیاسی اور اقتصادی نظام کو اسلامی تعلیمات کے مطابق بدل دینا چاہتا تھا۔

مودودی کی طرف سے جوڑہ ڈھانچہ ایک مجموعاتی ڈھانچہ تھا جو اپنی نوعیت سے ہی روایتی انداز ہے۔ جمہوری نہیں ہو سکتا تھا۔ مودودی نے خود ہی اسے لادینی جمہوریت کہا ہے جو خدا کی قوا میں کے تحت کام کرنے والی بہم قسم کی جمہوریت ہے۔ ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کی تقسیم سے قبل مودودی الگ ملک پاکستان کے خلاف تھا۔ اس نے سوچا کہ جب تک اسلامی طرز زندگی کو نہیں اپنایا جاتا، پاکستان بھی ایک غیر اسلامی اور خدا کے بغیر ایک ملک بن جائے گا۔ پاکستان کے قیام کے ساتھ مودودی نے اپنا موقف بدل لیا۔ اس نے اسے اسلامی ملک بنانے کے لئے کام کرنا شروع کر دیا۔ وہ اپنے اعتقادات میں اور بھی سخت گیر ہو گیا۔ اس نے ۱۹۵۳ء کے دوران مغربی پنجاب میں احمدیہ مخالف فسادات کرائے میں نہایت سرگرم رول ادا کیا۔ اسے سزائے موت دی گئی مگر بعد ازاں رہا کر دیا گیا۔ احمدیہ مخالف فسادات کی تحقیقات کے لئے حکومت پاکستان کی طرف سے قائم کردہ میٹھ کمیشن کے سامنے اس کی شہادت کے دوران اس کا جنون بالکل واضح طور پر سامنے آ گیا۔ سالہا سال کے دوران جماعت اسلامی پاکستان میں ایک طاقتور قوت بن گئی۔ اس نے ضیاء الحق کی طرف سے ذوالفقار علی بھٹو کا پہلے تختہ پلٹنے اور بعد ازاں اُسے پھانسی دیتے بھانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

مودودی کے تمام تر خیالات دلی طور پر بنیاد پرستی پر مبنی ہیں۔ اس کے خیالات بالکل غلط ملط ہیں۔ خدا کی طرف سے اس کی بالادستی کا نفاذ کون کرے گا۔ اگر قرآن و کتابت کی تشریح کے معاملے میں اگر کوئی اختلاف رائے ہوگا کس کی تشریح قائم رہے گی۔ کیا وہ حکمران جو خدائی بالادستی کے اختیارات کا استعمال کر رہا ہو وہ اس اختیارات کے سامنے سر تسلیم خم ہوگا جس کی تشریح اس سے مختلف ہوگی؟ اس اہمیت کا یقین کون کرے گا کہ کونسا شخص سب سے زیادہ پر اوصاف شخص ہوگا جسے ملک کا سربراہ بنایا جاسکتا ہے؟ اس بات کی بھی کیا ضمانت ہے کہ جس شخص کو اس امر کے لئے منتخب کیا گیا ہے وہ پر اوصاف ہی رہے گا۔

ان سوالات کے مناسب جواب کی عدم موجودگی میں مولانا مودودی کی مملکت اسلامی کا اقتدار ناممکنات اور جس پر پیچیدگیاں واضح ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عملی طور پر جہاں کہیں مملکت اسلامی کا قیام کیا مقصود ہوا وہ آمریت بن کر رہ گئی جہاں دینی اصولوں کا ذاتی مفادات کے لئے استحصال کیا گیا۔ اس بات کا بجا طور پر اشارہ کیا گیا ہے کہ "استبداد کی تمام صورتوں میں سے وہ ممانعتوں سے زیادہ خطرناک ہیں جو عوام پر مذہب کے نام پر جبراً اٹھائی جاتی ہیں۔ یہی بات جھگڑوں نے حکمران طبقے کے ساتھ مل کر کی جو کچھ خدا کا فرمان نہیں تھا عوام پر اس کے نام سے ٹھونسے گئے تاکہ انہیں غلام بنا کر دبا یا جاسکے۔"

اگست ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان میں جماعت اسلامی ہند کے نام سے ایک الگ جماعت کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ہندوستانی جماعت اسلامی کا تعلق ایک مملکت اسلامی کے قیام کے ساتھ نہیں تھا۔ یہ ہندوستانی مسلمانوں کا رابطہ عامہ اسلامیہ کے ساتھ قائم کرتی ہے اور اس نے ہندوستانی مسلمانوں کی انصاف پر مبنی اور مسلمانوں کے ساتھ منسلک کر دیا ہے۔ یہ جماعت بنیادی طور پر ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی اور تمدنی شناخت کے تحفظ کے کام میں مصروف ہے جن میں ان کے پرنسپل لاء، زبان اور مذہبی املاک وغیرہ شامل ہیں۔

اپنے نظریات کی تشہیر کے لئے جماعت اسلامی ہند ۵۸ کتب خانے ۳۸ دارالمطالعہ، ۲۸ بھڑی سرکل، ۲۶۶ زمزمی سکول اور ۴۴ جزوقتی مکتب یا بنیادی سکول ۳۶ جو نیس رہائی سکول اور ۲۳ کالج چلا رہی ہے۔ رام پور میں ایک مرکزی انسٹی ٹیوٹ چلا رہی ہے۔ اس کے کنٹرول میں ۷۰ مساجد ہیں اور ان مساجد سے اس کے لیڈر برآمد ہو کر لوگوں سے خطاب کرتے ہیں۔ جماعت نے اردو میں ۳۹۱ ہندی میں ۷۷ اور انگریزی زبان میں ۸۷ کتابیں قرآن اور اس کے مختلف پہلوؤں پر شائع کی ہیں یہ جماعت دہلی، رام پور، کلکتہ، گوالیار، احمد آباد، حیدرآباد، دہلی، کٹہ اور مدراس سے متعدد اخبارات اور رسائل بھی شائع کر رہی ہے۔

منایاں طور پر جماعت اسلامی ہند سیکولرزم کی حمایت کرتی ہے اور اسے ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ایک رحمت تصور کرتی ہے اس کے برعکس جماعت اسلامی پاکستان سیکولرزم کو ایک ناقابل تلافی گناہ قرار دیتی

ہے اور اسے اسلام کا دشمن تصور کرتی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کی برعکس روایت کے سبب جماعت اسلامی کے خیالات کا دوغلہ پن اور شکی مدیہ عیاں ہو جاتا ہے جس سے پاکیزگی اور تقدس کے لئے اس کی تشویش طشت از بام ہو جاتی ہے۔

جوں و کشمیر کی جماعت اسلامی ہند کا حصہ نہیں یہ ایک الگ تنظیم ہے۔ اس تنظیم کا قیام ۱۹۴۲ء میں شہرپاں میں مولوی غلام احمد جاناوید شہاب الدین اور دوسرے ہندو لوگوں کی طرف سے مل کر کیا گیا۔

نظریات اور اعمال دونوں پہلوؤں سے جماعت اسلامی جوں و کشمیر جماعت اسلامی پاکستان کے ساتھ لگا لگت رکھتی ہے۔ یہ جماعت سیکولرزم اور سوشلزم کو مسترد کرتی ہے یہ جماعت بقول اسکے ہندوستانی نوآباد کاری اور برہمن سمارجیت کی مخالفت کرتی ہے۔ یہ جماعت توہین آمیز انداز میں کرنی سرکار کو دہلی دربار سے موسوم کرتی ہے۔ تمام علمی مقاصد سے جماعت کشمیر کے پاکستان کے ساتھ ادغام کے لئے عمل پیرا ہے۔ یہ اسلام پر مبنی پرچار پر یقین رکھتی ہے۔ اپنے سیاسی اور سماجی پروگراموں کو رو بہ عمل لانے کے لئے اس جماعت نے صدق دل اور رقم مضبوط کے پابند اور مذہبی طور پر تیار کئے گئے نذرانہ پر مبنی ایک مضبوط ڈاکٹر کرپلے مدنی کی قیادت میں بیرونی میں جماعت نامی مصطفیٰ کی قیام کی وکالت کرتی ہے۔ جنرل ضیا کی طرح ایک اسلامی طرز کے سماج اور حکومت کے قیام کے لئے جنرل ضیا کی مساعی کی یہ جماعت ستائش کرتی ہے موجودہ سماج کے سماجی اور اخلاقی رویے کی جدید قدروں کی یہ جماعت شدید نکتہ چین ہے۔ یہ جماعت چاہتی ہے کہ کشمیری سماج کی اصطلاح کر کے اسے شریعت کے اصولوں اور خیالات کے مطابق ڈھال جائے۔

جماعت اسلامی کے اندازہ فکر خیالات اور نصاب المعین کی ایک واضح تصویر اس جماعت کے موجودہ ممتاز لیڈر سید علی شاہ گیلانی کی تقریروں اور تحریروں سے بھی نمایاں ہے۔ اپنی کتاب "یہ بھی رُخ تھا تصویر کشمیر کا" دار دو میں وہ اپنے خیالات کا اظہار رنگین اور شاعرانہ انداز میں کرتا ہے اور انگریزی نذرانوں کے لئے یہ کتاب بھاری کشش رکھتی ہے جن کی اس جماعت کے ساتھ جذباتی ہم آہنگی ہے۔

اس جو از کا ذکر کرتے ہوئے گراے شماری اور الحاق کا مسئلہ اب فزٹ ہو چکا ہے، گیلانی کہتا ہے۔ ہمارے بہت سارے صحافی ایک جملہ استعمال کرتے ہیں۔! جہلم سے بہت سا پانی بہہ چکا ہے۔ مگر میں اپنے ان دوستوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا انسانی حقوق بھی جہلم کے پانی کے ساتھ بہہ گئے ہیں۔ انسانیت کے اخلاقی اصول تو اس پانی کے ساتھ نہیں بہے ہیں اور نہ ہی آزادی کے لئے انگلیں اور جذبات اور نہ تمدن کے دائرے اس پانی کی لہروں کی تذر ہوئے ہیں۔ پانی تو گنگا اور جنت سے بھی کافی بہا ہے مگر ہندوستان میں بجا بدین آزادی نے اپنے حوصلوں کو بلند رکھا اور برطانوی حکمرانوں کو ہندوستان سے باہر نکال پھینکا۔ پانی تو بہرہم پڑے بھی بہا ہے مگر اس نے ہندوستان کو مشرقی پاکستان کی امداد کرنے سے روکا نہیں جس سے وہ بھگدیش میں گیا۔ پانی تو افغانستان کے دریاؤں اور ندیوں سے بھی بہہ رہا ہے مگر افغانستان میں آزادی کے لئے قہمت ہو جین

ہے اور وہ ایک عظیم طاقت کے خلاف ڈٹے ہوئے ہیں۔

شیخ عبداللہ کے مدول کے بارے میں گیلانی رقمطراز ہے: "۱۹۳۱ء سے وہ ہمارے خون کے ساتھ کھیل رہا ہے مگر اس ریسرے میں دھوکہ دیا جس پر ہم نے اعتبار کیا۔ گذشتہ ۴۰ برسوں سے نوجوان فریب کا شکار ہوا ہے۔ مگر اب وہ سنبھل چکا ہے۔ اُسے دوست اور دشمن میں تمیز ہے۔ اب وہ خود اعتمادی اور جرأت کے ساتھ پیش قدمی کر رہا ہے۔"

اپنے سیاسی اعتقادات کے بارے میں وہ اس بات کو واضح کرتا ہے: "سوشلزم اور سیکولرزم کی سیاست بالکل کھوکھلی ہے۔ میں نہیں پسند کرتا کہ کوئی مسلمان سوشلزم اور سیکولرزم اپنے سیاسی آدرش کے طور پر اپنائے۔" ایک اور کتابچے "مقدمہ الحاقی" میں جماعت اسلامی عوام سے ان الفاظ میں مخاطب ہوئی ہے: "آپ کشمیری قوم کب تک آسانی سے غلامی کو قبول کرتے رہو گے۔ سینہ ماؤں کی بلند عمارتیں اور عوامی مقامات جہاں غور میں عریاں قفس کرتی ہیں ہر گلی میں یہ شراب کی دوکانیں اور اجارہ جاتی سماج کے یہ مرکز جہاں مہذبیت بے میانی سے جمع ہوتے ہیں یہ سکول اور کالج تمام چیزیں اکٹبا کا نشانہ کرتی ہیں کہ تہااری وراثت تم سے چھینی جا رہی ہے۔ تہااری تہذیب کے تاج گل کو کس نے نئی میں ملا دیا ہے؟ کس نے تہارے نوجوانوں کی روٹوں کو انتخاب کر لیا ہے؟ کس نے تہارے مذہب اور عقائد کی اہمیت کو کم کر لیا ہے؟ انتخابیک تک نہیں لوریاں دے کر سلا یا جائے گا؟ کب تک تم اتحاد اور منکریت کے فلسفے کے شکار ہو گے؟ کیا تم افغانستان کی طرح اس موقع کا انتظار کر رہے ہو جب تہااری مسجدوں میں بے عقیدہ لوگ جمع ہو جائیں گے اور قرآن کے صفحات کو گر دو قبر صاف کرنے کے لئے استعمال میں لایا جائے گا؟"

اس کتابچے میں مزید لکھا ہے: "تہارے دشمن تہارے عقائد اور شناخت کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں وہ اپنی فوجوں اور ہتھیاروں کا استعمال پوری قوت کے ساتھ کر رہے ہیں۔ اگر تم اس انتباہ کو نظر انداز کر دو گے تو یہاں بھی مراد آباد کی تاریخ دہرائی جائے گی۔ بھونڈی چابا سہ سہلی ٹوٹھ، میدر آباد، جیلپور اور آسام کی طرح تہااری سرزمین کو بھی خون سے رنگا جائے گا۔ برقی نفسیات والی ایک سنگدل سامراجی قوت کا سامنا ہے تو آپ کے لئے ہر روز نئی مصیبت پیدا کر رہے ہیں۔ اگر یہ اب بھی آپ کی سمجھ میں نہیں آئی تو یقیناً تاریخ کے صفحات پر بھی جگہ نہیں ملے گی۔"

اس کتاب میں لارڈ ماونٹ بیٹن، اجواہر لال نہرو، پریم ناتھ بزاز جی ایم کول، سسرگپتا اور دیگر بزرگوں کے نظریات کو غلط پس منظر میں پیش کیا گیا ہے۔

انتہائی جذباتی اور دینی لب و لہجے میں ایسے نظریات کا پرچار بلا کسی حیل و حجت جنوری ۱۹۹۰ء تک جاری رہا۔ اس پرچار کا مقابلہ کرنے کے لئے نونوٹنی حکمت عملی کا تعین کیا گیا اور نہ ہی اس پر عملدرآمد کیا گیا۔ جماعت اسلامی کے پروپیگنڈہ کی نادرنگی کو دور کرنے کی خاطر عوام کی معلومات کے لئے کوئی اقدام نہیں کیا گیا جس کی

وجہ سے جنون اور بنیاد پرستی کے گڑھے پیدا ہوئے اور وہ حالات پیدا ہوئے جن کے سبب کشمیر کے تمدن اور شناخت پر پاکستانی غلبہ بڑھ جائے گا۔ اور یہ قدریں فوت ہو جائیں گی۔

انجام کار اپنی بد قسمتی کی وجہ سے ایک یاد و وقول کے دوران جماعت اسلامی نرم پہنے کے باوجود طاقت اختیار کرتی رہی۔ سیاسی سطح پر یہ نہایت شدت کے ساتھ پروپیگنڈہ کرتی رہی کہ ہندوستان کے ساتھ کشمیر کا الحاق حتمی نہیں ہے اور جہاں مسلمانوں کے لئے ایک جائز ہتھیار ہے۔ اس سلسلے میں انقلاب ایران قابل تقلید ہے اور پاکستانی سماج کو اسلامی رنگ دینے کا جنرل ضیا کا پروگرام قابل تائید ہے۔ سماجی میدان میں جماعت اسلامی نے کنبہ بندی کے خلاف ایک زہریلی ہم جاری رکھی اس کا پناہا ک کنبہ بندی ایک غیر اسلامی نسل ہے اور مرکزی حکومت کی طرف سے ریاست کی مسلم اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کرنے کا ایک حربہ ہے تبلیغی سطح پر اپنے ۱۵۰ سکولوں اور مدرسوں کے ذریعے یہ بنیاد پرستی اور رنگ نظری کے زنج بونی رہی۔ بچوں کو تو کچھ پڑھایا جا رہا ہے اس کی ایک واضح مثال اس نظم سے ملتی ہے جو جماعت سونم میں پڑھائی جا رہی ہے۔

جھوٹے بچو، خاموشی سے سنو

میں نہیں بتاؤں گا کہ اسلام کیا ہے

بلا فوج کے تم غصہ چند ایک رہ سکتے ہو

مگر لازمی طور پر تمہیں اسلام کے لئے لڑنا چاہیے۔

پرامنری جماعتوں کے لئے ایک کتاب کا ایک ہر اگراف ہے: "ہم کشمیری ہیں اور ہمارا ملک کشمیر ہے۔ یہ

ہندوستان، چین اور ایران سے گھرا ہوا ہے۔"

جون ۱۹۸۰ء میں مدینہ منورہ کی ایک وفد کشمیر آیا جس کی ہمان لٹاری کے فرائض جماعت اسلامی نے سرانجام دیے، شیخ عبداللہ نے بھی سرکاری طور پر اس کی خاطر کو وضع کی جو جماعت کی بیڑے ٹھونکنے کے مترادف تھا اس وفد کے ایک ممتاز رکن پروفیسر عبدالصمد نے یہ واقعہ کر یا کہ اسلامی انقلاب کے لئے افراد اور سماج دونوں کو تیار کرنا ہوگا۔ ان کا بنیادی مقصد چھوٹے بچوں میں اس جماعت اور اس کی پیش رفت منظم الحریث کی طرف سے چلائے جا رہے سکولوں کے ذریعے بنیاد پرست نظریے کا پرچار تھا۔ ان اداروں کے لئے سعودی عرب سے بھاری مقدار میں رقم موصول ہوتی رہی۔ مشرق وسطیٰ کے شیخوں کے پاس تیل نے انہیں کافی دولت فراہم کی تھی اور اس سے وہ ان سرگرمیوں کے لئے رقم فراہم کر سکتے۔ ان سکولوں پر پابندی یا ممانعت عائد کرنے کے لئے عملی طور پر کچھ نہیں کیا گیا۔ بعد ازاں ڈاکٹر فاروق عبداللہ ان سکولوں کی بابت غرائے توبیت مگر عملی طور پر کچھ نہیں کیا۔ اور تربیت یافتہ اور منصب کے شکاران نوجوانوں کی یہ جماعت بڑھتی رہی اور اس میں اضافہ ہوتا رہا۔ جماعت اسلامی کی سماجی، تعلیمی اور تمدنی سطح پر سرگرمیوں کے باعث اور اپنے کارکنوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر اس کی شکلی طاقت بیرونی طاقت کے مقابلے میں زیادہ مٹی، مافنی میں انتخابات کے دوران اس جماعت کی کارکردگی سے عوام پر اس کے غلبے کا بالکل نشانہ

نہیں ملتا۔ اس نے تین انتخابات میں حصہ لیا۔ پہلی مرتبہ ۱۹۷۲ء پھر ۱۹۷۷ء اور بعد ازاں پھر ۱۹۸۳ء اس کے بعد ۱۹۸۷ء کے دوران مسلم لیونائیٹ فرنٹ کے ایک حصے کے طور پر اس نے انتخابات میں شرکت کی۔ ۱۹۷۲ء کے دوران اسے ڈالے گئے کل ووٹوں کا ۱۸٪، فیصد حاصل ہوا۔ ۱۹۷۷ء کے دوران ڈالے گئے کل ووٹوں کا ۵۵٪ فیصد اسے حاصل ہوا۔ ۱۹۸۳ء کے انتخابات کے دوران اسے کوئی بھی نشست حاصل نہیں ہوئی مگر اس جماعت کو حاصل شدہ ووٹ بڑھ کر ۳۸٪ فیصد ہو گئے۔

ووٹ حاصل کرنے کے طرز سے حقیقی تصویر کا اندازہ نہیں ہوتا۔ ۱۹۷۷ء اور ۱۹۸۳ء کے انتخابات میں نیشنل کانفرنس نے اپنے تنگ نظر اور پاکستان نواز موقف کی وجہ سے جماعت اسلامی کی مقبولیت کو قربان کر دیا۔ یہ وہی کچھ تھا جو جماعت کرنا چاہتی تھی۔ نوجوانوں کی توجہ نہیں اس وقت خود کو جماعت اسلامی کے ساتھ وابستہ کر رہی ہیں وہ ان تنظیموں سے قطعی مختلف نہیں ہیں جنہوں نے ۱۹۷۷ء اور ۱۹۸۳ء کے انتخابات کے دوران نیشنل کانفرنس کے ساتھ وابستگی کی تھی۔ جب نیشنل کانفرنس نے پاکستان نواز اور ہندو مخالف رویہ اپنایا تو اس کے اور جماعت اسلامی کے پروگرام میں کوئی فرق نہیں تھا۔ ان کی سیاسی اپیلیں مدغم ہو گئیں۔ یہ جماعتیں جڑواں بہنوں کی طرح مسلم ہونے لگیں۔ مثال کے طور پر ۱۹۸۳ء کے انتخابات کے دوران ڈاکٹر فاروق عبداللہ "ہندوستانی غلبے" کے خلاف غرضاً یہاں تک کہ اس نے الیکشن کمیشن آف انڈیا نہیں بلکہ اقوام متحدہ کی زیر نگرانی انتخابات کرائے جانے کی دھمکی دی۔ جب ۱۹۷۵ء کے دوران شیخ عبداللہ کی طرف سے کشمیر سبائے پر دستخط ہوئے تو جماعت اسلامی نے اس کی ڈٹ کر مخالفت کی۔ کثیر تعداد میں محاذ پر اسے شہری کے وہ کارکن جواں کارڈ کے حق میں نہیں تھے۔ جماعت اسلامی کے ساتھ ہم آہنگی رکھتے تھے کیونکہ ان کا مقصد بھی وہی تھا جو جماعت اسلامی کا تھا۔ نوجوان تنظیموں کو ۱۹۷۷ء میں اس وقت دھکا دیا گیا جب پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دی گئی مقامی مسلمانوں کا خیال تھا کہ پھانسی کیوجہ جماعت اسلامی پاکستان کا صدر ضیاء الحق پر اثر و رسوخ تھا۔ وہ لوٹ مار کرتے چلے گئے اور جماعت اسلامی کے کارکنوں کے متعدد دکان خا کر کر دیے۔

جماعت اسلامی کو جو دھکا لگا وہ دیر پا نہیں تھا۔ جلد ہی اس نے اپنی پوزیشن بحال کر لی بلکہ یوں کہے کہ مضبوط بنائی۔ جزیوی طور پر اس کا سبب انتخابی بدعنوانی تھا جس کی وجہ سے نوجوانوں میں مایوسی پیدا ہو چکی تھی اور جماعت اسلامی نے اس بات کا فائدہ اٹھا یا اور جزیوی طور پر نیشنل کانفرنس کی لیڈروں کی طرف سے ایسے ہی جذبات کو بجا دیا جو جماعت اسلامی کی بنیاد تھے۔ شیخ عبداللہ نے ۱۹۷۷ء کے دوران ڈاکٹر فاروق نے ۱۹۸۳ء میں اور جی ایم شاہ نے دسمبر ۱۹۸۸ء میں اپنی انتخابی حکمت عملی اختیار کی۔ اس طرز عمل میں پنہاں خطرات کے بارے میں میں نے مرکزی حکومت کو واضح کر دیا تھا۔ ۱۲ فروری ۱۹۸۵ء کو راجیو گاندھی کے نام اپنے ایک خط میں میں نے لکھا۔

"یہ مسلمان لیگ کے ان واقعات کے بارے میں ہے جو کل سرنگرم میں مقبول ہٹ کی پہلی برکی کے موقع پر رونما ہوئے۔ مسلمان لیگ کے ان واقعات کے بارے میں ہے مگر اس کے پس پردہ وزیر اعلیٰ کا وہ فیصلہ ہے جو اس نے

جماعت اسلامی کے لیڈر سید علی شاہ گیلانی اور اس کے پیروکاروں کی رہائی کے معاملے میں لیا۔ اس فیصلے کا اعلان وزیر اعلیٰ نے ۲۶ دسمبر ۱۹۸۴ء کو ڈرامائی انداز میں کیا۔ اس معاملے میں حالانکہ ریاست کے تحفظ کا سوال تھا پھر بھی اس نے نہ میرے ساتھ اور نہ ہی مرکزی حکومت کے ساتھ مشورہ کیا۔ درحقیقت اس فیصلے کی بات تھی اخباری اطلاعات سے معلوم ہو سکا۔

"مندرجہ بالا رہائی سے لیکر گیلانی نہایت قابل اعتراض تقریریں کر رہا ہے، وہ اسلامی بنیاد پرستی کا پرچار کر رہا ہے اور ہندوستان پر الزام لگا رہا ہے کہ اس نے کشمیر پر جبراً قبضہ کیا ہے۔ وہ ایسے سربستی کی پیروی کا انقدا بھی کر رہا ہے جن میں اس جماعت کے سرفہرے پارٹی کا ڈر پر زور دے رہے ہیں کہ پاکستان کے ساتھ شامل ہو کر نہ صرف اسلام کی خدمت کریں گے بلکہ انہیں پاکستانیوں کی طرح اسلامی ممالک میں کثیر تعداد میں نوکریاں بھی مل چکی ہیں۔" اس معاملے میں تشویش اس بات پر ہے کہ جن علیحدگی پسندی اور سازش کی سازشوں کا ذکر سرانصرسانی کی مختصر سی رپورٹوں میں کیا گیا ہے ان کے مطابق گیلانی کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ قدرتی بات ہے کہ اس سے قوم دشمن عناصر کے قوصلے بڑھ گئے جن میں محاذ آزادی پیپلز لیگ کشمیر نیشنل لبریشن فرنٹ وغیرہ شامل ہیں۔

"میں یہاں پر اس بات کو واضح کر دوں کہ آئین جموں و کشمیر کی دفعہ ۴۴ اور قواعد کار کے برعکس وزیر اعلیٰ مجھے اندھیرے میں رکھ رہا ہے۔ اور ان اطلاعات کو مسند ذکر رہا ہے جن کا ویسے بھی ریاست کے تحفظ اور متوازن پولیس وغیرہ سے تعلق ہے۔

"عام لوگوں اور مرکز کو خوش کرنے کی خاطر وزیر اعلیٰ قوم پرستی کے حامی چند بیانات دے رہا ہے مگر اس کے ساتھ ہی وہ فرقہ پرست، خود مختاری کے حامی اور علیحدگی پسند طاقتوں کی قوصلہ افزائی کے لئے سب کچھ کر رہا ہے۔ یہ قوتیں دوسروں کے مقابلے زیادہ تباہ کن ہیں۔ کیونکہ ان میں اسلامی بنیاد پرستی کے علاوہ پاکستان نواز جذبات کا امتزاج ہے۔ ایک مرتبہ یہ قوتیں کشمیری قدروں کا عقد بن گئیں تو دائمی نقصان ہو گا۔ اس کے بعد کئی گئی کوئی بھی سیاسی مہم بازی ان بنیادی مسئلوں کو حل کرنے میں کامیاب نہیں ہوگی جو یہاں پر اٹھائے جا رہے ہیں۔ جو جو وہ صورت حال کی بابت جو بھی حل سوچا جائے۔ اس معاملے میں اصلاحی اقدامات لازمی ہیں۔"

بدقسمتی سے راجیو گاندھی ان تمام دلائل اور انتسابات سے بے بہرہ رہا۔ دوسری جماعتوں اور گروپوں نے بھی فوری سیاسی فائدہ حاصل کرنے کے لئے اسلامی بنیاد پرستی کا سہارا لینا مناسب سمجھا۔ ان جماعتوں میں پیپلز لیگ، اسلامی جماعت طلباء، اسلامی سٹوڈنٹس لیگ، امت مسلم، تحفظ اسلامی اسلامک سٹڈی سرکل، محاذ آزادی اور انجمن اتحاد مسلمین شامل ہیں۔ پیپلز لیگ کی بنیاد ۳۰ ستمبر ۱۹۷۷ء کو الفیہ کبیر کے ایک ملزم نذیر احمد ودانی نے رکھی بعد ازاں اس کی قیادت فاروق رحمانی اور شیر شاہ نے سنبھال لی۔ انہوں نے اس امر کا پرچار کیا کہ

+ قواعد کار کے مطابق بینا ملوں میں ریاست کے تحفظ کا سوال ہو وہ حکم جاری کرنے سے قبل گورنر کو دکھائے جاتے ہیں۔

اسلام کے پیروکاروں کا فرض ہے کہ ہندوستانیوں کو کشمیر سے باہر نکال دینا۔ جماعت طلباء، جماعت اسلامی کا طالب علم دستہ ہے، اس نے تحمل اسلام کی قیادت میں مسلم نو جوانوں کو بنیاد پرستی کے رنگ میں رنگنے کے لئے خاص ہم چلائی۔ اسلامک سٹوڈنٹس لیگ کے آئین میں اعلان کیا گیا تھا کہ ایک سپاہی کی زندگی اسلام کا بہترین حصہ ہے امت اسلام کی بنیاد ڈاکٹر قاضی نثار نے مارچ ۱۹۸۶ کو ڈالی اور مصدوم مسلم عوام میں تنگ نظر مذہبی جذبات کو بھڑکانے اور مسلم بنیاد پرستی کو ہوا دینے کے لئے سب کچھ کیا۔

سیاسی اقتدار کے پیچھے بھاگ دوڑ میں جوڑ توڑ کی اور ضرورت سے زیادہ اجارہ داری کی سیاست کے تحت ہر سیاسی پارٹی اور گروپ اس سرزمین کی محنت مند جڑوں کو کھاڑنے کی کوشش کرتے رہے اور تعصب اور بنیاد پرستی کے نئے بیج بوڑے رہے۔ اس کا المناک انجام آج سبھی کے سامنے ہے۔

انتظامی جڑیں

ایک محسوس اور مستحکم سیاسی ڈھانچے کے لئے ایک محسوس اور مستحکم انتظامی ڈھانچہ ایک جزو لا ینفک ہے مگر قسطنطنیہ کے جوں کو کشمیر میں دونوں قسم کے ڈھانچے مفقود رہے ہیں۔ یہاں پر ایک دوسرے کی پیچیدگیاں میں اضافہ کر دیتا ہے۔

تاریخ اس بات کی دافر شہادت پیش کرتی ہے کہ ایک مضبوط ذہن افسر شاہی ان مایوس گروپوں کو جوڑ کر انہیں ایک لڑی میں پرو کر سماجی اور اقتصادی ترقی کے معاملے میں ایک نمایاں رول ادا کر سکتا ہے۔ بھائی کے بعد جاپان اور انیسویں صدی کے بعد جرمنی اس معاملے میں واضح مثالیں پیش کرتے ہیں۔ دوسری طرف تیسری دنیا کے تنازعات سے یہ بات ظاہر ہے کہ کمزور اور دھڑوں میں منقسم افسر شاہی تباہ کاری کا موجب ثابت ہو سکتی ہے۔ یہ علاقائی، فرقہ وارانہ شیعہ قول کو تیز کر کے سماجی اور اقتصادی ترقی کی رفتار کو کم کر دیتی ہے۔

جوں کو کشمیر کے گونا گوں مسائل کے پیش نظر جوں کو کشمیر کے انتظامیہ کو مضبوط، ہموار دیانندار یا مقصد غیر سیاسی افعال موحد اور تخلیقی ہونا چاہیے۔ مگر زیادہ تر اسے مخالف سمت حاصل رہی اور یہ عارضی تنگ نظر اور چرما بن کر رہ گیا۔ اس کے ڈھلچنے میں۔ ریاست رس گئی۔

انتظامیہ اور ریاست کو محدود اور بند کر کے نہیں رکھا جاسکتا، درحقیقت یہ ایک ہی ڈھانچے کی یکجا مدت ہیں۔ یہ ایک ہی ہوا میں سانس لیتے ہیں یکساں قدروں پر چل کر یکساں قومی وراثت میں فروغ پاتے ہیں۔ سیاسی کلچر کا اس پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ اگر یہ کلچر غیر صحت مند ہے تو لازمی طور پر انتظامی کلچر کی بدنامی ہوگی۔ ایک پراگندہ سیاسی نظام سیاسی کلچر کو اور بھی زیادہ غیر صحت مند بنا کر رکھ دیتا ہے۔ ایک دوسرے کی کمزوریوں میں اضافہ کرتا ہے۔

جوں کو کشمیر میں عین ہی کچھ ہو رہا ہے۔ خاص طور پر کشمیر کا رڈ کے بعد کی حالت یہی ہے ۱۹۷۵ کے بعد

اقتدار کا نیا ڈھانچہ رونما ہوا اس نے انتظامیہ کو مزید غیر موثر اور تنگ نظر مفادات کے زیر کردیا۔ جن لوگوں کو یہ بات موافق آئی، انہوں نے انتظامیہ کے ان عناصر کی نشوونما کی اور سیاسی آقاؤں کو خوش کرنے کے لئے اس سمت میں پیش قدمی کی اور جلیبی اعلیٰ سطح پر کشمیری افسروں کے ایک گروپ نے وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ پر نسبتاً زیادہ اثر و رسوخ حاصل کر لیا۔ دوسری طرف وسطی سطح اور زیر سطح پر ایک گروپ نے سائون طور پر جماعتی آقاؤں کے ذاتی مفادات کو پورا کرنا شروع کر دیا۔ دوسری طرف اس دھڑے نے اپنے آئینے بنانے شروع کئے۔ اور اقتدار کے ڈھانچے پر غلبہ حاصل کرنا شروع کر دیا۔ شیخ عبداللہ کے گھوٹا بنایا گیا، شخص پرستی کے حربے کا پورے طور پر استحصال کیا گیا، اس طرح سیاسی اور انتظامی سطح پر ایک نیا دھڑ نمایاں ہو گیا۔ انتظامیہ اور ریاست میں ذاتی مفادات کو فروغ دینے والے دھڑوں نے ایک دوسرے کے مفادات کو زک پہونچانا شروع کر دیا۔

بہت سارے ایسے افسروں کو کلیدی ہمدے دیئے گئے جو جہاں تک ممکن ہو ریاست کو قومی دھارے سے زیادہ سے زیادہ دور رکھنا چاہتے تھے مثال کے طور پر انھوں نے دے کے اوائل میں جیف سرکریڈی قریباً ایک متعصب شخص تھا جس نے خود مختاری کے حق میں موقف اپنایا تھا۔ اس نے ایک منظم ڈھنگ سے وہ تمام کاغذاتیں لگا دیں جو صحت مند بنیادوں پر مرکوز اور ریاست کے درمیان تعلقات میں رفتہ ثابت ہو سکتی تھیں۔ مثال کے طور پر ۱۹ مارچ ۱۹۸۲ کو ایک ایسا حکم جاری کرنے میں اس نے نمایاں رول ادا کیا جس کے تحت ریاست کے اندر فوج کی طرف سے زمین حاصل کرنا غیر قانونی مان لیا گیا۔

اس تمام پس منظر کے انجام کار کل ہند سروسوں کا رول نادر دسا ہو کر رہ گیا۔ متعدد آسامیوں کو کاڈر سے نکال دیا گیا۔ مثال کے طور پر نومبر ۱۹۸۳ میں میں نے دیکھا صرف پولیس فکے کے اندر ہی ڈاکٹر جرنل کی ایک آسامی انسپکٹر جرنل کی تین آسامیاں ایڈیشنل انسپکٹر جرنل کی چھ آسامیاں اور سپرنٹنڈنٹ آف پولیس کی سینتالیس آسامیوں کو کل ہند پولیس کاڈر سے باہر رکھا گیا۔ متوازی ریاستی کاڈر پیدا ہوئے۔ آئی اے ایس اور آئی پی ایل میں افسروں کو لینا قریب از بند کر دیا گیا۔ ریاستی اور کل ہند کاڈروں میں بہت سارے انحراف پیدا ہوئے۔ علاقائی وفاداریوں کی جڑیں گہری ہو گئیں۔ حالانکہ قابلیت کے بنا پر ملے گئے فیصلوں میں ہی انصاف کو قبول نہیں کیا جاتا۔ ریاستی شہری اعتباریت ختم ہو کر رہ گئی۔ رشوت ستانی کی جڑیں مزید گہری ہو گئیں اور ریاستی انتظامیہ کی کارکردگی میں کمی آئی۔ بے مقصد تنازعات شروع کئے گئے۔ مرکز اور ریاست کے درمیان ایسے تناؤ پیدا کئے گئے جن سے احتراز کیا جاسکتا تھا۔

چند ایک استثنائات بھی تھے۔ چن ایک افسر اعلیٰ قابلیت کے مالک بھی تھے مگر وہ سیاست کے گورکھ دھندے میں اُلجھ کر رہ گئے یا پھر انہیں غیر اہم رول میں غیر فعال رہ کر اس موقع میں وقت گزارتے رہے کہ کسی دن ریاست کی ایک نصیبہ بدے گا اور اقتدار کے ڈھانچے میں وہ اپنا اہم رول ادا کر سکیں گے۔ ایک دوا افسر جو بلا تشک ایسے قابل تھے کہ وہ ریاست اور مرکز کے درمیان جوڑ توڑ کی سیاست اور دوسری طرف کانگریس اور دوسری جماعتوں کے

درمیان اپنا بیڑا شروع کر دیا کرتے رہے۔

فاروق عبداللہ کی تلون مزارق قیادت میں عوامی خدمات میں گندگی بڑھتی گئی، شیخ عبداللہ کو پتہ تھا کہ اس کے گرد و پاس منڈلی میں موجود چند قابل افسروں کو کس طرح بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔ مزید برآں اُسے انہیں دھڑوں اور گروپوں پر غلبہ حاصل تھا۔ ڈاکٹر فاروق نے یہ بھی گواہیاں گنتارا اور گردوار میں شگاف بڑھ گئے۔ انتظامی سرپرستیوں تقسیم کرنے کے معاملے میں بھی ڈاکٹر فاروق لحاظ داری سے کام لیتا تھا۔ افسر شاہی پچہ خیر بن گئی۔ نويس دہائی کے وسط میں انتظامیہ اس قدر بوجھل ہو گیا کہ اس کے اخراجات ملک میں سب سے زیادہ ہو گئے۔ اور اس کی کارکردگی بالکل کم تھی۔ سیاست کے ملازمین کی تنخواہ میں خیر منصوبہ جاتی اخراجات کا ۳۳ فیصد صرف ہو جاتا تھا۔ ۱۹۸۲ء سے ۱۹۸۹ء تک کے سات سالہ عرصے میں ملازمین کی تعداد کے برعکس پیداواری شرح ۴۰.۳۸ فیصد تھی جبکہ قومی سطح پر یہ اضافہ ۲۰ فیصد تھا۔ ریاستی انتظامیہ کی کمزور پیداواریت کا اندازہ اس جائزے سے ہو جاتا ہے جو ۲۰۰۰ کی تقریروں پر عمل درآمد کے سلسلے میں اس پر وگرام کو عملدرآمد کے سلسلے میں مرکزی وزارت نے لے لیا تھا۔ یہ ریاست اس سطحی کے آخری زینے پر تھی۔

جب پہلی مرتبہ میں نے ۲۶ اپریل ۱۹۸۱ء کو چارج سنبھالا تو جموں و کشمیر انتظامیہ کی بہن غصہ مارتی تھی۔ لکھنؤ میں اور جی باب تھیں۔ اعلیٰ سرور گروپ بندی میں منقسم تھیں وہ ایک دوسرے کی حامد تھیں اور ایک دوسرے کو اندر دوشی تصور کرتے تھے وہ قزاقوں و سنی کی جڑوں کا شکنجہ والے طور پر بقول کے عادی تھے مگر انہیں جدید دھنگ سے استحال کر رہے تھے۔ ایک مضبوط منصف اور تحریک یافتہ قیادت میں انہیں اس صورت حال سے نکال دیا جاتا تھا۔ مگر نہ تو ڈاکٹر فاروق عبداللہ اور نہ ہی جی ایم شاہ اپنی قدیم خندقوں سے باہر آ سکے۔ محترمہ اندرا گاندھی کے بعد جو قیادت منظر عام پر آئی وہ عملی حقائق کو سمجھنے میں ناکام رہی اور اس نے بے تلک کی ڈکڑوں میں اندھے رکھنے کی کوشش کی اگرچہ نہ وال کا یہ رجحان ۱۹۸۶ء میں ٹک گیا مگر اسے ختم نہیں کیا جاسکا۔ قیادت کے چند افسروں کو من مانے انداز میں ہٹا دینے سے حالات اور بھی دگرگول ہو گئے۔ اور ۱۸ نومبر ۱۹۸۶ء سے ۱۸ جنوری ۱۹۹۰ء تک ڈاکٹر فاروق عبداللہ کا عہد حکومت نا اہلیت اور بے اثر ہونے کی وجہ سے غیر سنجیدہ ثابت ہوا۔

اگر بات کی حقیقت اس واقعہ کے بیان اور تجزیے سے ظاہر ہو جاتی ہے جو جموں کے ایک علاقے میں ۱۳ جنوری ۱۹۸۹ء کو رونما ہوا۔ یہ علاقہ سول سیکرٹریٹ میں شکل سے چھ سو گز کے فاصلے پر ہو گا جہاں وزیر اعلیٰ اس کی کاہنہ کے رفقاء اور چیف سیکرٹری موجود تھے۔

۱۳ جنوری کا دن گورو گوبند سنگھ کے یوم ولادت سے پہلا روز تھا۔ اس موقع پر ایک جلوس کا اہتمام کیا گیا۔ اس جلوس کے شرکار نے چند ایسے بینر اٹھائے ہوئے تھے جن میں محترمہ اندرا گاندھی کے قاتلوں سنفوت سنیو اور کبیر سنگھ شہید قرار دیا گیا تھا۔ ڈسٹرکٹ جیسٹریٹ اور پولیس کے مطابق اس جلوس کی جائے

ابتداء پر ہی شرکار سے کہا گیا تھا کہ وہ اس قسم کے بیسروں کی نمائش نہ کریں اور وہ مان گئے تھے مگر جب یہ جلوس شہر کے اندر ایک گنجان آباد علاقے پرانی منڈلی میں پہونچا تو چند کرسیز دو بارہ بلند کر دئے گئے اور اشتعال انگیز نعشے لگائے گئے۔ اس سے اس علاقے کے چند ہندو دوکانداروں میں مینہ طور پر فتنہ پیدا ہوا جنہوں نے جلوس پر سنگ باری کی۔ اس واردات کے بارے میں ایک اور بیان کے مطابق اہل جلوس نے ہی دوکانوں کی دھڑ شروع کی اور قریباً ۵۰ کوکھوں کو نذر آتش کر دیا۔ افراتفری کے اس عالم میں جلوس منتشر ہو گیا اور فسادات شروع ہو گئے۔ اس جلوس میں شریک چند نوجوانوں نے مختلف سمتوں میں دوڑتے ہوئے کھڑی گاڑیوں کو آگ لگا دی اور ہنگامہ آرائی کے مرکز تک ہوئے اس کے بعد جو بھڑپس ہوئیں ان میں ۱۲ انسانی جاہیں تلف ہو گئیں اور ۱۲ افراد مجروح ہو گئے۔ ۱۲۵ گاڑیوں کو نقصان پہونچا اور کئی لاکھ روپے کی جائیداد تباہ ہو کر رہ گئی۔

انتظامیہ کی طرف سے ناقابل معافی کم اندیشی کا مظاہرہ کیا گیا۔ یہاں تک کہ بنیادی احتیاطی اقدامات بھی نہیں کئے گئے اور جب تشدد شروع ہوا تو اندرونی فوج کے تحت کاروائی کرنے کا ارادہ بھی غائب ہو کر رہ گیا۔ عملی طور پر وزیر اعلیٰ کے سیکرٹریٹ سے بہت کم فاصلے پر ہی پانچ گھنٹوں کے لئے سبھی کھل رکھے تھے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی انتظامیہ یہی نہیں۔ جب دوکانیں جلائی جا رہی تھیں تو پولیس کا کوئی اہلکار اٹھنے کو بھی تیار نہیں تھا۔ سفاکانہ حملوں اور یہاں تک ملاکتوں پر بھی پولیس نے کاروائی نہیں کی۔ پولیس نے ایک بھی لاشی نہیں چلائی ۱۱ شک آور گیس کا ایک بھی گولہ نہیں پھٹا اور ایک بھی گولی نہیں چلائی گئی۔ محترمہ اندرا گاندھی کے قاتلوں کو پھانسی دیئے جانے کے بعد احتیاط کے بارے میں واضح طور پر کہا گیا تھا۔ ضلع گورداسپور میں دہشت گردوں کی طرف سے چار افراد کو پھانسی پر لٹکائے جانے کے بعد بھاری تناؤ تھا۔ اکال تخت کے جتھہ دار درشن سنگھ راگی نے ۶ سے ۱۳ جنوری تک احتجاجی ہفتے کے بارے میں کال دی ہوئی تھی۔

بدقسمتی سے کسی اتفاقی صورت حال کا اندازہ نہیں کیا گیا۔ اور سرکاری کی پختہ اطلاعات کے بغیر اس جلوس کی اجازت دے دی گئی۔ جلوس کے ساتھ پولیس کا ایسا دستہ مامور کیا گیا جس کے پاس نہ تو پولیس اسلحہ تھا اور نہ ہی یہ واقعہ تھا۔ اشتعال انگیز بیسروں کو ضبط نہیں کیا گیا۔ جلوس کے ایک دھڑ کا کل طرف کی گئی آتش نشان تقریریں پر روک نہیں لگائی گئی۔ اس وقت بھی کوئی حقیقی احتیاط نہیں کیا گیا جب دوکانیں بند ہونے کے ساتھ صورت حال دھماکے خیز ہونے لگی۔ یہ ریاستی پولیس کی پشیل برائی کی حقیر سی ناکافی تھی۔ اس نے نہ تو لوگوں کے مزاج اور نہ ہی عوام کے جذبات کی شدت کا اندازہ کیا تھا۔ سینئر افسروں نے گہرائی کے ساتھ اس معاملے کی بابت نہیں سوچا تھا۔ پولیس کی تعیناتی نہایت کمزور تھی۔ نازک مقامات پر محفوظ نفری نہیں رکھی گئی تھی۔ یہاں تک کہ تنظیمی معاملات میں پولیس کا کنٹرول روم بھی بے چارگی کی حالت میں تھا۔ جلوس نکلنے کے اس دن یہاں تک کہ کشتہ اور میز (دافلہ) بھی شہر سے باہر چلے گئے تھے۔ اس صورت حال کی شکی لہروں کی بابت فہم کا اس قدر فقدان

تھا اور سرانفرسانی کے حالات کے بارے میں اطلاعات بھی اس قدر کمزور تھیں۔ یہ بات بھی ظاہر تھی کہ ذہنی اضیاط کسی بے پردہ وجہ سے حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ ریاست کی انتظامی قدروں میں عارضی پن رس چکا تھا اور اس سے بہت سارے گزیر المیات کا رد و نما ہونا ناگزیر تھا۔

آخر یہ افسوس ناک صورت حال کیونکر پیدا ہوئی۔ قانون و انتظام سے متعلقہ مشینری آخر اس قدر بے بہرہ اور نااہل کیونکر ہو گئی اور مجموعی زوال کیونکر ہوا۔ اس کی ایک بنیادی وجہ ماتحت ملازمتوں مثلاً اساتذہ اور انسپکٹروں جیسی آسامیوں پر بھرتی کا غیر واجب اور غیر منصفانہ سسٹم اور اس سلسلے میں رشوت ستانی اور سیاسی دخل کا گنگنا تھا۔ اس سلسلے میں ایک مثال حالات کی واضح تصویر پیش کرے گی اس کا تعلق جنوری، فروری ۱۹۸۸ میں پولیس انسپکٹروں اور سب انسپکٹروں کی بھرتی سے ہے۔

ظاہرًا جب انتخاب کا سلسلہ شروع ہوا تو ڈائریکٹر جنرل آف پولیس نے چند فہرستیں وزیر اعلیٰ اور چند بار سوخ سیاست دانوں سے حاصل کیں۔ جن امیدواروں کے نام ان فہرستوں میں دیئے گئے تھے ان کا انتخاب رسمی طور پر ڈائریکٹر جنرل آف پولیس نے خود مقرر کئے گئے پورے ذریعے کرنا تھا بہر حال اس تقسیم میں مقدمہ داروں کے درمیان باہمی تضاد پیدا ہو گیا اور وزیر زراعت نے اس معاملے میں بھیڑا کر دیا۔ کامیابی کی اس بیٹنگ میں کیا ہوا اس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

یہ جمعیہ اس وقت شروع ہوا جب ڈائریکٹر جنرل آف پولیس نے اس ضابطے کی وضاحت کی جو انتخاب کے معاملے میں اپنایا گیا تھا۔ اس نے کہا کہ وزیر اعلیٰ کی ہدایات کے مطابق اس نے ۶۰ فیصد امیدواروں کو قابلیت کی بنیاد پر اور بقایا ۴۰ فیصد مقرران جماعت کے لیڈروں کی سفارش پر منتخب کرنے کا فیصلہ کیا ہے پولیس سربراہ نے بتایا کہ ضلع بارہمولہ سے انتخاب کے سلسلے میں اس نے مقرران جماعت کے دو لیڈروں سے مشورہ کیا ہے جو کہ وزیر اعلیٰ کے قریبی دست راست تھے۔ اس سے وزیر زراعت طیش میں آ گیا۔ اس نے طنز کیا کہ وہ دونوں بارہمولہ ضلع کے واحد لیڈر ہی نہیں تھے وہ بھی آخر بارہمولہ ضلع سے تعلق رکھتا ہے اور وہ بھی اس ضلع کا نمائندہ ہے۔ حقے میں اگر وزیر اعلیٰ نے ٹوکتے ہوئے کہا کہ ان دو لیڈروں نے اس کے لئے لڑا ہے اور وہ ان کی قربانیوں کو فراموش نہیں کر سکتے۔ وزیر زراعت نے کہا کہ انہوں نے بھی کافی قربانی دی ہے۔ اس سے وزیر اعلیٰ مزید جھگڑ گئے کہنے کو ان کی قربانی دی ہے۔ تم چور ہو تم نے ۹ لاکھ روپے ہرپ لئے ہیں اور اس رقم کا سب بھجے دینا ہوگا۔ وزیر زراعت نے فوراً جواب دیا: تم زیادہ بڑے چور ہو۔ تم نے ۲۸ لاکھ روپے ہرپ لئے ہیں پہلے یہی جواب دینا چاہیے۔ حکومت پر آپ کی من مانی نہیں چلتی۔ تم نے اپنے تمام رشتے داروں کو اہم عہدوں پر بھرتی کر لیا ہے۔ وزیر اعلیٰ آپ سے باہر ہو گیا اور چلا آیا۔ میرے گھر سے باہر نکل جاؤ۔ وزیر زراعت نے جواب دیا۔ یہ تو تمہاری ذاتی جائیداد ہے۔ اور نہ ہی خاندانی جاگیر تم مجھے باہر جانے کے لئے کہنے والے کون ہوئے ہو۔ یہ وزیر اعلیٰ نے اپنی آستین چڑھانا شروع کر دیں اور حملہ آور ہونے کے لئے اس کی طرف بڑھا:

میں نے اس کیس کی مثال اس لئے پیش کی ہے کہ دکھا سکوں کہ قانون و انتظام قائم رکھنے کے لئے مستقبل کے نگہبانوں کی بھرتی کیسے کی جاتی ہے اور سیاست دانوں اور اداراتی ڈھانچے کے درمیان کسی طرح کا غیر صحت مند گھٹ جوڑ قائم تھا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ انتظامیہ کس قدر بدعنوان اور رشوت خور ہو چکا تھا۔ جنوری ۱۹۶۵ میں بخشی غلام محمد کے خلاف رشوت کے الزامات کی تحقیقات کے لئے جو فیس کمیشن قائم کیا گیا تھا۔ اس نے اپنی رپورٹ میں کہا ہے: جو مواد میرے سامنے پیش کیا گیا ہے اس کا افسوس ناک اور مایوس کن پہلو یہ ہے کہ جن اہلکاروں نے حلیفہ بیانات میرے دربارہ داخل کئے ان میں اس بات کو تسلیم کیا گیا ہے کہ انہوں نے بے جا کام سر انجام کئے اور یہاں تک کہ بخشی غلام محمد اور ان کے رشتے داروں کو فائدہ پہنچانے کی خاطر ریاستی املاک اور دولت کے ریکارڈ کو سخ بھی کیا تھا تاکہ اس کی خواہشات کو پورا کیا جاسکے۔ بد قسمتی سے اس میدان میں حاصل ویسی ویسی رہی۔ اکثر اوقات جوں و کشمیر کے سیاست دان اور ایڈمنسٹریٹو افسران نے ان تقاضوں کو ذبح کرنے کے لئے ناپاک گھٹ جوڑ قائم کرنے پر آمادہ رہے جن سے قابل اور صحت مند اداروں کا جنم ہوتا ہے۔

ایک اور واقعہ قدرے مختلف نوعیت کا ہے مگر قابل ذکر ہے۔ اس کا تعلق سال ۸۵-۱۹۸۴ء کے دوران سٹیٹ روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن میں بس ڈرائیوروں کی بھرتی سے ہے اس معاملے میں وزیر ٹرانسپورٹ نے کارپوریشن کے مینجنگ ڈائریکٹر کو ۱۵۰ افراد کی فہرست دی۔ اور اس سے کہا کہ وہ انہیں ڈرائیور تعینات کر دے۔ جب مینجنگ ڈائریکٹر نے اشارہ دیا کہ اس انتخاب کو عمل میں لانے کے لئے چند ضابطے طے کرنا ضروری ہیں اسے ہدایت دی گئی کہ وہ ضابطوں کے بارے میں پروانہ کرے اور جب ۲ یا ۳ روز کے بعد مینجنگ ڈائریکٹر نے بتایا کہ وزیر ٹرانسپورٹ کی فہرست میں متعدد افراد کے پاس ڈرائیورنگ لائسنس بھی نہیں ہے اور اس نے ڈرائیورنگ لائسنس حاصل کرنے کے لئے کہا تو وزیر موصوف نے جواب دیا۔ اگر تم چند ڈرائیورنگ لائسنسوں کا انتظام نہیں کر سکتے تو تمہارے مینجنگ ڈائریکٹر ہونے کا کیا فائدہ ہے۔ انتخاب اور بھرتی کا عمل کس قدر زوال پذیر ہو چکا تھا یہاں تک کہ کوئی شخص کے لوازمات کو بھی بالائے طاق رکھ دیا گیا۔ چنانچہ اس بارے میں حیرت نہیں ہوئی چاہیے کہ ریاست جوں و کشمیر میں حادثات کی شرح سب سے زیادہ ہے۔

عوامی تحفظ اور انصاف کے بنیادی تقاضوں کے تئیں یہاں پر عتنائی اس لئے برتی جاتی رہی ہے کیونکہ جوں و کشمیر میں نیشنل کانفرنس انتخابات میں تحفظ و انتظامیہ میں ایمانداری کی بنا پر تعجب نہیں ہوئی بلکہ اس نے اس کے لئے جذباتی نعرے بلند کئے اور علاقائی تنگ نظر اور فرقہ وارانہ جذبات کو مٹا دی۔

بھرتی کے لئے سیاسی دخل کے پست میبار کی بدولت بہت سارے ناپسندیدہ پہلو بھی پیدا ہوئے۔ کئی مرتبہ صرف ایک ہی قسم کے لوگوں کو بھرتی کیا جاتا۔ ان افراد پر مشتمل ایک رنگ دھڑا بن جاتا جس کا ایک ہی سیاسی مزاج اور کیساں سیاسی وفاداریاں ہوتیں۔ اس طرز عمل کی ایک منفرد مثال شیر کشمیر میں اعلیٰ چوٹ میں سینکڑوں کی تعداد میں زمرہ چہارم کی بھرتی کی بابت تھا جس کی تیر کے لئے مرکزی حکومت کے ذریعے

منصوبہ بندی کیلشن نے ۶۲ کروڑ روپے کی رقم صرف کی تھی۔ نیشنل کانفرنس کے صدر دفتر بجاہد منزل سے ایک ہی ٹیلیفون کال پر یہ لوگ کسی بھی جگہ مظاہرہ کرنے کے لئے پہنچ جاتے۔ وہ انسٹی ٹیوٹ کی لیسوں کا استعمال بھی کر سکتے تھے۔ جب ۱۹۸۳ء میں خیر مسرہ اندرا گاندھی سرینگر گلیں تو ان تمام ملازمین کو ایئر پورٹ بھیجا گیا تاکہ وہ اپنے سیاہ جینڈے دکھا سکیں اس طرح مرکزی حکومت نے اپنی ہی رقوم سے کشمیر میں وہ آلات پیدا کئے جو اس کے خلاف بے دریغی سے استعمال کئے گئے اگر ذرا عقلمندی سے ساتھ کام لے کر انتخاب کے ضابطوں پر زور دیا جاتا تو ایسی حالت سے بچا جاسکتا تھا۔ انکمپلائمنٹ ایکسچینجوں کے ذریعے بھرتی سے۔ یکساں سیاسی وابستگی والے ملازمین کے ایک دھڑے کے فروغ سے استرازم ہو سکتا تھا۔

میں نے اس معاملے کو درست کرنے کی کوشش کی۔ ۴ مارچ سے ۶ نومبر ۱۹۸۶ء اس چھ ماہ کے گورنری راج کی مدت کے دوران میں نے اس دائرے میں ایک اہم اصلاح کی۔ قانون سازی کے اپنے اختیار کو بروئے کار لاتے ہوئے میں نے جموں و کشمیر ماتحت ملازمتوں کا ایکٹ ۱۹۸۶ء نافذ کیا مگر کشمیر کے سیاسی نظام میں کنبہ پروری کی روایت اس طرح گھر گھر گئی تھی کہ جیسے ہی نومبر ۱۹۸۶ء میں ڈاکٹر فاروق عبداللہ برسر اقتدار آیا۔ اس کی حکومت نے اس ایکٹ کو واپس لینے کے لئے کارروائی شروع کر دی۔ جب اس قانون کو واپس لینے کا سودہ قانون میری رضامندی کے لئے لایا گیا تو میں نے ۱۹ اگست ۱۹۸۶ء کو ایک نوٹ ارسال کیا جس میں سب حیلان ہے۔ وہ ٹوٹے یوں ہے۔

میں شروع میں ہی اس بات کو واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ریاستی کابینہ یا قانون سازی کے دانشمندی کا بدلہ فراہم کرنے کی بجھے کوئی تینا نہیں اور نہ ہی مجھے اس جموں و کشمیر ماتحت ملازمتوں میں بھرتی کے ایکٹ کے پس پردہ کارفرما جذبے کے بارے میں بتانے کی ضرورت ہے جو میں نے گورنری راج میں نافذ کیا۔

میرے نوٹس میں متعدد کہیں ایسے آئے ہیں جن میں غیر آئینی یا معیوبی انتخابی بورڈ کے ذریعے سبیل چلنے پر دھڑے داری کی گئی ہے۔ اس سے نہ صرف انصاف اور غیر جانبداری کی قدروں کو ضرب کاری پہنچی ہے بلکہ نوجوانوں میں سماجی تناؤ، مایوسی اور غم پیدا ہوا ہے اس سلسلے میں مندرجہ ذیل مثالیں پیش کیا جاتا ہیں (۱) ۱۹۸۵ء میں سینکڑوں کی تعداد میں سکول اساتذہ کی بھرتی کے موقع پر مکمل طور پر استعمال کیا گیا۔ بی اے اور ایم اے امیدواروں کو نظر انداز کر کے تھرڈ ڈویژن میٹرکولیٹوں کو بطور اساتذہ تعینات کیا گیا۔ ایک کیس میں ایک بار سوخ سیاسی لیڈر کی تین خاتون رشتہ داروں کا تقرر کیا گیا اور اعلیٰ قابلیت والے امیدواروں کو نظر انداز کر دیا گیا۔ اس بارے میں نہیں سوچا گیا کہ انتخاب کی جانبداری کے علاوہ معمولی اہلیت کے اساتذہ کی تقرری سے متعلقوں کی تعلیم پر برا اثر پڑے گا۔ اور وہ مقابلے کے کسی امتحان میں قابلیت کی بنا پر پورا اترنے کے قابل ہو جائیں گے۔

(ب) ان تقرری انتخابات سے بعد اشرف مایوسی کے انجام کار ۱۹۸۵ء میں ایک اسد وار مجسٹریٹ

ایجوکیشن افسر کے دفتر میں خود سوزی کا مرتکب ہوا۔ اس واردات سے قابلیت کے مالک امیدواروں کی اس انتخابی طرز عمل کے خلاف مایوسی کا اظہار ہوتا ہے جو اس سلسلے میں اپنایا گیا تھا۔

(ج) بس ڈرائیوروں، لچ لیول ورکروں اور مانت پالیس کی ۸۶-۱۹۸۵ء کے دوران بھرتی سے صورت حال کا المناک پہلو عیاں ہوتا ہے۔

(د) آئینی طور پر قائم پبلک انڈر ٹیکنگ اداروں میں بار سوخ عناصر کو کنبہ پروری اور بدعنوانیوں کے مرتکب ہونے کے خاص مواقع حاصل ہوئے۔ اسٹیٹ خزانہ کارپوریشن میں لون آفسرز کی تقرری کے ایک معاملے میں ایک سیاسی شخصیت کے چار بیٹے تعینات کئے گئے۔

انصاف کے تقاضوں کی تعمیل اور اس کے انجام کار پیدا ہونے والے تناؤ اور مایوسی کے معاملہ کے انسداد کی خاطر آئین پر مبنی ایک باقاعدہ ڈھانچہ قائم کیا گیا جسے شرائط ملازمت کی قانونی ضمانت حاصل تھی۔ اس ڈھانچے اور ایکٹ کو اس طرح ترتیب دیا گیا کہ اسے روزمرہ کے سیاسی اور دوسرے دباؤ سے بالآخر رکھا جاسکے اور انتخاب کی غیر جانبداری میں خدائی اتحاد کو بحال کیا جاسکے۔ ان معاملات میں نہ صرف یہ امر لازمی ہے کہ انصاف کیا جائے بلکہ یہ بھی ظاہر ہو کہ انصاف کیا گیا ہے۔

اس معاملے میں ایک وسیع تر اور طویل مدتی مقصد بھی کارفرما تھا۔ اہلیت کے وقار میں خدائی اعتماد بحال کرنے کے بعد ان نوجوانوں کے دلوں میں ایک امنگ پیدا کی جائے جو بینک غیر فعال اور بے عمل رہتے ہیں۔ اس عمل میں نہ صرف کارکردگی کے بہتر معیارات کے حصول سے نہ صرف ایک فرد واحد کو فائدہ پہنچے گا بلکہ سماج کی خدمت بھی بہتر طور پر انجام دی جاسکے گی۔ اس معاملے میں ایک اور تقابلی جذبہ بھی کارفرما تھا کہ شکایات، جوابی شکایات اور عدالتی معاملات کو کم کر کے انتظامیہ پر بوجھ بھی کم کیا جاسکے۔ مگر اس کے جواب میں محض ایک جہلم سا جواب حاصل ہوا۔ یہ معاملہ حکومت ہند کے نوٹس میں بھی لایا گیا مگر اس نے بھی اس معاملے میں کچھ نہیں کیا۔

جن قدروں پر ریاست کے سیاسی حکمران عمل پیرا تھے اور جس بے اعتنائی کے ساتھ حکومت ہند خدائی انتظامیہ کے ان اہم معاملات کے ساتھ تھکتی رہی ہے اس کی واضح مثال ان واقعات سے حاصل ہو جاتی ہے جو ۸۵-۱۹۸۳ء کے لوک سبھا انتخابات کے دوران رونما ہوئے۔

دسمبر ۱۹۸۳ء میں جی ایم شاہ کی جرنی کی طرف سے سرینگر حلقہ انتخاب میں اپنے بیٹے مظفر شاہ کی کامیابی کو یقینی بنانے کی چالوں کے بارے میں مجھے بروقت اطلاع موصول ہو گئی۔ میں فوری طور پر پرواز کر کے سرینگر گیا جہاں میں نے ڈائریکٹر جنرل آف پولیس اور ڈیوٹنل آفسروں کی ایک میٹنگ طلب کی۔ اس میٹنگ میں میں نے ان آفسروں کو یاد دلایا کہ یہ انتخابات الیکشن کمیشن آف انڈیا کی زیر نگرانی ہو رہے ہیں میں نے اس معاملے میں ان کی قانونی انتظامی اور اخلاقی ذمہ داریوں کے بارے میں چند دعا باتیں بھی کہیں ان آفسروں کو مناسب اشارہ مل

گیا اور انہوں نے اس منصوبے سے کنارہ کشی کر لی تو اپنی نسبت اور نتائج کے لحاظ سے ایک کردہ منصوبہ تھا۔ یہ منصوبہ ناکام ہو گیا اور مظفر شاہ بڑی طرح ناکام رہا مگر وہ سیاسی حکمران جو بلا کسی تامل کے اپنی من مانی کرنے کے عہد ہی تھے اب جو اپنی کاروائی پر آگئے۔ وسیع پیمانے پر تعزیری تبادلوں کے لئے میں نے اس منصفانہ کاروائی کو روکنے کی کوشش کی مگر محسوس کیا کہ مجھے اس بات کا کوئی اختیار نہیں اس معاملے میں مرکزی حکومت کی سرمد میری بھی شامل رہی ہے یہاں تک کہ وزیر اعظم کے ساتھ میرا ذاتی تبادلہ خیال اور اس معاملے پر میرا ہم سرکاری خط بھی بے اثر ثابت ہوئے۔ ۹ جنوری ۱۹۸۵ء کے اپنے خط میں میں نے لکھا۔

” وسیع پیمانے پر تعزیری تبادلوں کے احکامات جاری کئے گئے ہیں اور ان پر چند گھنٹوں کے اندر عمل کیا گیا ہے۔ ان تمام انشروں نے ہمارے اس غیر رسمی مشورے پر عمل کیا ہے کہ وادی میں منصفانہ انتخابات کرائے جائیں اور اس طرح وسیع پیمانے پر تشدد کو نالا جاسکے۔ ان انشروں کو صریحاً زیرِ عتاب لایا گیا ہے اور ان کی توہین کی گئی ہے۔ اس معاملے میں میری جلد بازی سے کام لیا گیا ہے تاکہ مجھے اور مرکزی حکومت کو بے اختیار کر کے واقعات کے دھارے پر اثر اندازی کی جائے۔ ایک خط ناک اور دھماکا خیز صورت حال پیدا کی جا رہی ہے جس سے اس نازک ریاست کے سیاسی اور انتظامی ڈھانچے پر قلیل مدتی اور طویل مدتی دونوں طرح کے نہایت خطرناک نتائج ہو سکتے ہیں۔“

مقامی انفرشہابی ریوی گروہ بندی کا شکار ہونے کی وجہ سے کسی بیداری اور ذمہ داری کا اظہار نہیں کیا ان میں سے چند افراد نے نہایت شان کے ساتھ نئے مواقع کو حاصل کر لیا۔

انتخابات کے فوراً بعد وزیر اعلیٰ جی ایم شاہ نے خاص طور پر حمید اللہ خاں کی ذاتی فائل طلب کی جو انتخابات کے وقت سرسری نگر کا ڈویژنل کمشنر تھا۔ اس میں اس نے مندرجہ ذیل کیفیت درج کی۔

” میں نے اسے خوشامد اور بے اعتباری کے لحاظ سے ممتاز اور نمایاں پایا ہے۔“

اقتدار کی اس بے اصولی اور مطلق العنان نمائندگی سے ظاہر ہوتا ہے کہ ریاست میں انتظامی اور سیاسی زندگی کس حد تک زوال پذیر ہو چکی تھی۔

گورنر راج کے دوران حمید اللہ خاں نے اپنی مصداقہ میں جو مندرجہ ذیل نکتے اٹھائے ان پر غور کیا جانا لازمی ہے۔

” مارچ ۱۹۸۶ء کے ۲۲ دنوں کے سوائے ۸۶-۱۹۸۵ء کے تمام برس کے دوران مجھے بلا کسی کام کے بالکل بیکار رکھا گیا۔ ۱۹۸۳ء کے انتخابات کے فوراً بعد میں رخصت پر چلا گیا اور یکم اپریل ۱۹۸۵ء کو میں سیکرٹریٹ میں حاضر ہوا اور تب سے ۸ مارچ ۱۹۸۶ء تک میں تقرری کے احکامات کا انتظار کرتا رہا جب مجھے ۹ مارچ ۱۹۸۶ء کو گورنر راج کے نفاذ کے بعد ڈویژنل کمشنر تعینات کیا گیا۔ چونکہ اس دوران کوئی کام سرائی ہی نہیں کیا چنانچہ میری کارکردگی کا جائزہ کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

جب نومبر ۸۴ء میں لوک سبھا انتخابات کا اعلان ہوا تو جی ایم شاہ نے سرسری علاقہ انتخاب سے اپنے بیٹے کو امیدوار نامزد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کی کامیابی کو یقینی بنانے کے لئے وہ کوئی بھی حربہ نادا جب تصور نہیں کرتا تھا۔ یہ تمام بی بی ایس کو چمک کے شیر مال بناتے جانے کے ساتھ شروع ہوا۔

وزارت کا حلف لینے کے فوراً بعد کو چمک نے مجھے بلا کر اطلاع دی کہ سرسری نگر سے مظفر شاہ کنیشنل کانفرنس (رخ) کا امیدوار نامزد کیا گیا ہے اور سرسری پوزیشن کو مجھے میں ڈالتے ہوئے مجھے واضح الفاظ میں کہا کہ میں حکمران جماعت کے امیدوار کی کامیابی کو یقینی بناؤں۔

وزیر اعلیٰ جی ایم شاہ ۳ دسمبر ۱۹۸۴ء کو سرسری پہنچا تاکہ وہ اپنے بیٹے کے حق میں انتخابی ہم شروع کر سکے۔ اس نے یہ کام اپنے مشائیل میں کیا۔ ایک عام جلسہ کرنے کی بجائے اس نے ڈائریکٹر جنرل آف پولیس بیرنگل من شاہ ڈی، آئی جی (کشیپور) جی، ڈی، آئی جی کے ہمراہ مجھے طلب کیا۔ اپنے مخصوص اٹلے انداز میں اس نے یہ بات کہنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی کہ اس کے بیٹے کو منتخب کرانے کے لئے ہم اپنے رتبوں کو بروئے کار لائیں۔

۲۲ دسمبر ۸۴ء کو سرمانی راجہ حالی کے واپس آنے سے قبل وزیر اعلیٰ نے ڈپٹی کمشنروں کی ایک میٹنگ بلائی اور انہیں کہا کہ وہ کو چمک کا حکم مانیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ وزیر اعلیٰ کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ کو چمک نے مجھے اور ڈی، آئی جی کشیپور کو وزیر اعلیٰ کی رہائش گاہ پر بلایا جہاں بیگم خالدہ شاہ موجود تھیں۔ اس نے وادی میں خوف و ہراس کا ماحول پیدا کرنے کیلئے چند دنوں کے دھماکے کرانے کی خطرناک چال بتائی تاکہ عوام کو انتخابی عمل سے دور رکھا جاسکے۔ اس کی عقل سلیم کے مطابق اس سے وسیع پیمانے پر انتخابی دھاندلیاں ممکن ہو سکیں گی۔ اس نے کہا کہ اگر اس عمل میں ۱-۱۵ افراد ہلاک بھی ہو جائیں تو کوئی بات نہیں۔

پولنگ ختم ہونے کے بعد وزیر اعلیٰ کی طرف سے اعلیٰ جنگ شروع کی گئی وزیر مال اور اس کے حامیوں نے ڈائریکٹر جنرل آف پولیس، ڈی، آئی جی اور مجھے ۲۵ دسمبر کے روز اپنی رہائش گاہ پر بلایا۔ انہوں نے دوپٹے چیموں میں سیر اچھی کے منصوبے کی بابت بتایا اور اس چال کو کامیاب بنانے کے لئے ہماری مدد طلب کی اس نے یہاں تک کہا کہ سرسری علاقہ انتخاب کے رٹرننگ آفیسر ریڈی کو اس بات کے لئے مجبور کرنے کے لئے کہا جائے کہ وہ ڈپٹی جی ایم شاہ کی رہائش گاہ پر موجود ہیں۔

۲۶ دسمبر ۸۴ء کو ڈائریکٹر جنرل آف پولیس نے مجھے وزیر اعلیٰ کی یہ ہدایات ہم پہنچائیں کہ میں اور ڈی، آئی جی پولیس بیگم خالدہ شاہ سے ملیں۔ ہم نے ایسا کیا۔ مظفر شاہ بھی موجود تھا۔ ایک کانفی کے پیالے کے بعد مال اور بیٹے دونوں کی طرف سے یہ ہیبت مغالہ سامنے آیا۔ ان کے خیالات کا اظہار اس وقت سامنے آیا جب بیگم خالدہ شاہ نے تجویز پیش کی کہ ہر صورت انتخابی نتائج کے بعد توں فراہم اور ہلاکتیں ہوتی چاہئیں۔ اس سے پورا فائدہ کیوں نہ اٹھایا جائے اور مظفر کو انتخاب کا ایسا کامیاب کروایا جائے۔

دریں اثناء اطلاعات موصول ہوئی تھیں کہ حکمران جماعت نے مایوسی کے عالم میں خزانہ کو دھماکے سے

اُڑانے کا منصوبہ تیار کیا تھا کیونکہ وہاں دو لوگوں کی صندوقچیاں رکھی جانی تھیں۔ انتظامیہ نے اس صورت حال کا مقابلہ کیا اور وہاں پر بھاری تعداد میں پولیس تعینات کرنے کے علاوہ تمام طرف سے ناک بندی کر دی۔

جب کہ گنتی سست روی سے جاری تھی کیونکہ حکمران جماعت کے غنڈوں نے بہت ساری روکاوٹیں کھڑی کیں۔ اطلاع موصول ہوئی کہ انہوں نے اس جنگ میں آئری حریف کے طور پر کاؤنٹنگ ہال کو نذر آتش کرنے کا منصوبہ بنایا ہے تاکہ انتخابات کا نتیجہ ان کے حق میں ہو۔ ریڈنگ افسر نے حکم دیا کہ کاؤنٹنگ ہال کے اندر بھی پولیس تعینات کر دی جائے چنانچہ آئی۔ آر۔ پی۔ ایف کے افراد کو ڈیوٹی پر مامور کر دیا گیا۔ آئرش نیشنل کی کوششیں ناکام رہنے پر حکمران جماعت مایوس ہو گئی۔ ان کے غنڈوں کے ایک ٹولہ نے جنہیں انتخابی ایجنٹ کہا گیا تھا ایک اور بدنام سماج دشمن بشیر احمد طوطا کی قیادت میں ووٹ کی پرچیوں کو تباہ کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے کاؤنٹنگ ہال میں ڈیوٹی پر مامور افسروں پر حملہ آور ہونے کی کوشش بھی کی۔ نیشنل کانفرنس (خ) کے صوبائی صدر اے۔ آر۔ شاہ نے میرے اور ڈی۔ آئی جی پولیس دہلی کے ساتھ گالی گھوج کیا۔ اس نے گنتی ہال سے فون پر میگ فلف شاہ کے ساتھ رابطہ قائم کیا اور وہ چاہتا تھا کہ ڈی۔ آئی جی اس کے ساتھ بات کرے مگر ڈی۔ آئی جی نے اس کی بات نہیں مانی۔ اگلے روز وزیر اعلیٰ نے ڈائریکٹر جنرل پولیس سے کہا کہ وہ ہال سے پولیس فورس ہٹا لے کر ڈائریکٹر جنرل نے مذکورہ کی کا اظہار کیا۔

۶ جنوری ۱۹۸۵ء کو سیکریٹری جنرل ڈیپارٹمنٹ نے مجھے فون پر اطلاع دی کہ میں ڈیوٹی پر کیشنر کے ہمدے کا چارج دے کر رخصت پر چلا جاؤں۔ رخصت منظور کی جا چکی ہے۔

ابھی میں رخصت پر ہی تھا کہ حکومت نے وسیع پیمانے پر تبادلوں کے احکامات جاری کئے انتخابات کے بعد ہونے کا بینڈ کی پہلی بینڈ میں کثیر سے انتخابات کے ساتھ وابستہ بھی افسروں کو تبدیل کر دیا گیا۔

میں جب اپریل ۱۹۸۵ء میں ڈیوٹی کے لئے چیف سیکریٹری کے پاس حاضر ہوا تو میری تقرری کہیں پر نہیں کی گئی۔ مجھے کوئی کمرہ بھی الاٹ نہیں کیا گیا اور یہاں تک کر بیٹھنے کے لئے بھی جگہ لڑائی کرنا پڑی۔ ریاست کے سب سے سینئر ترین کیشنر کو ایک برس سے زیادہ عرصے کے لئے ایک اردو لی جیسی مولی ہولٹ کے بغیر ہی قناعت کرنا پڑی۔ نازی جرمینی جیسے حالات کے مطابق تیرے سمیت دوسرے متوطن افسروں پر خفیہ پولیس نے نگرانی رکھی۔

سینئر افسروں پر یہ ناجائز کتاب جی۔ ایم شاہ حکومت کے آخری دن تک جاری رہا ان کا گناہ یہ تھا کہ انہوں نے آئین کے تقدس کو بحال رکھا تھا۔ مگر قیمتی کی بات یہ ہے کہ ماسوائے ایک شخص کے ملک بھر میں کسی نے بھی ہماری پروا نہیں کی۔ ہم نے عزت مآب گورنر کو اپنے تمام مصائب کے بارے میں باخبر رکھا۔ اگرچہ اُن کی ہمدردی حاصل نہ ہوئی تو ہم حکومت کے جبر و استبداد کے آگے ٹوٹ گئے ہوئے۔ ابھی انتخابات کا عمل جاری ہی تھا تو عزت مآب گورنر نے ہمیں آزادانہ اور منعفا نہ جیناؤ کرنے کی ہدایات دی تھیں۔

میں نے حمید اللہ خاں کی عرضداشت سے تفصیلی اقباسات اس لئے پیش کرنا لازمی سمجھا کہ اس سے

کثیر کی سیاست میں اُن قدروں کی جھلک مل جاتی ہے جن پر ان دنوں عمل پیرا ہو جاتا تھا۔ جی ایم شاہ اور اس کے حواریوں نے جو کچھ بھی کیا جو کچھ بھی کرنے کا ارادہ تھا وہ اس کے معاملے میں کوئی نئی بات نہیں تھی اس سے پہلے اور اس کے بعد آنے والے چند سیاسی نظام بھی اس قدر خطا وار تھے۔ اس بات کی کوئی وقعت نہیں کہ انہوں نے ایک یا دوسرا حربہ استعمال کیا ان سب کا شہرہ پہلو یہ تھا کہ یہ واضح طور پر ایک بے اصولی بات تھی۔ اس اخلاقی افراتفری کے طویل مدتی غمناکات کیا ہو سکتے ہیں۔ اس قسم کی سیاسی اور انتظامی تباہ کاری ہیں کہاں لے جا سکتی ہے؟

گورنری راج کے دوران گل بند سروسز کی جی میں انڈین اینڈ منسٹر پیٹھ سروس انڈین پولیس سروس اور انڈین فادر سٹ سروس شامل ہیں، تنظیم نو کی گئی۔ ان کے کاڈر کو منقول بنایا گیا اور ان کا حوصلہ بلند کیا گیا بھرتی کے عمل کو منصفانہ اور غیر جانبدار بنانے کے لئے ماتحت ملازمتوں کا انتخابی بورڈ آئینی طور پر قائم کیا گیا۔ نیم عدالتی مساطوں سے نمٹنے کے لئے آزاد ٹریڈ یونین قائم کئے گئے رشوت ستانی کے خلاف ایک زبردست ہم کا آغاز کیا گیا اور ملازمتوں کوئی زندگی دینے کیلئے جن کا وہ پرزے پٹا دیئے گئے۔ اکیس سینئر افسروں کو جبری طور پر ریٹائر کیا گیا۔ عوامی ملاقاتوں کا ایک سلسلہ شروع کیا گیا جس سے غریب ترین اور سب سے وسیلہ اشخاص بھی میرے ساتھ مل سکتے تھے۔ اس سسٹم سے نہ صرف عوامی شکایات کو فوری طور پر دور کرنے میں مدد ملی بلکہ اس سے انتظامی مشینری سے عکس کو دیکھنے کا موقع بھی حاصل ہوتا تھا۔ اس سے مجھے معلوم ہو جاتا تھا کہ انتظامیہ کی مختلف سطحوں پر کیا ہو رہا ہے اس نظام کے تحت میں تقریباً ۲۲۰۰ افراد کے ساتھ ملتا تھا۔ اس سے تمام انتظامی مشینری چمک رہی تھی اور عوامی تقاضوں کو پورا کرنے کے قابل ہو گئی اور اس میں انسانی قدروں کا مضبوط شامل ہو گیا۔

جب گورنری راج ختم ہونے والا تھا تو میں نے مرکزی حکومت کو مشورہ دیا کہ میں نے جو جی ادارتی ڈھانچہ قائم کیا ہے، اور جس کی انہوں نے خود بھی تائید کی ہے، اُسے ریاستی حکومت نیست و نابود نہ کرنے پائے خاص طور پر ان حالات میں جب یہ حکومت راجہ فاروق مہاراجے کے نتیجے میں قائم کی جا رہی ہے۔

سیاسی اتحادوں نے پھر اپنا پرانا کھیل کھیلنا شروع کر دیا۔ ذاتی اور جماعتی سرپرستی کے لئے بوڑھوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مثلاً ۱۹۸۹ء کے وسط میں حکمران زراعت ہی میں ۱۱۰۰ آسامیاں نکالی گئیں۔ ان آسامیوں کو پر کرنے کے معاملے میں اتحادی حلقے داروں میں تنازعہ پیدا ہو گیا کہ آیا آسامیاں نیشنل کانفرنس (ایف) اور کانگریس (آئی) کے درمیان ۲۰:۳۰:۴۰:۶۰ کے تناسب سے تقسیم کی جائیں اس تنازعے سے نہ صرف تقرریوں کے معاملے میں تاخیر واقع ہوئی بلکہ دونوں سیاسی جماعتوں کے درمیان کافی تناؤ بھی پیدا ہوا۔ یہ اس وقت ہوا جب دہشت گردی اور تشدد ریاستی حکومت کا دروازہ کھٹکھٹا رہی تھیں۔

آئی اے ایس اور آئی پی ایس افسروں کو ضلع میں تقرری سے احتراز کرنے کا عمل بحال کر دیا گیا مثال کے طور پر ۱۹۸۸ء کے دوران ڈپٹی کیشنر کی ۱۲ آسامیوں کے برعکس صرف چھ آئی اے ایس افسر کام کر رہے تھے۔

میں نے یہ مثالیں اس لئے بیان کی ہیں کہ معلوم ہو جائے کہ کشمیر میں رشوت ستانی اس قدر گہرے کچھ تھی کہ اس کو سنکر سمجھ کر برداشت کر لیا جاتا تھا۔ اس نے روح اور جسم دونوں کو مفلوج کر دیا تھا۔ انہوں نے تاجروں اور سیاستدانوں کی طرف سے وسیع و عریض بیش قیمت بیجگوں اور فارم ہاؤسوں کی تعمیر ان کے طرز زندگی، نمایاں مصروفیتوں پر کشمیریوں کی طرح رہنمائی ہوئی مارتیاں ٹیکسوں کی کم آمدن یہ تمام باتیں ریاست میں وسیع پیمانے پر پھیلی رشوت ستانی کی طرف اشارہ کرتی تھیں مگر ان بھی بدلتوں کو ختم کرنے کے لئے عملی طور پر کچھ نہیں کیا گیا انجام کار جو بھی خوبصورت ندی نالے کشمیر میں مدغم آواز سے رواں دواں ہیں۔ ماحولیاتی کشادگی کے باعث انہوں نے اپنی پاکیزگی اور ریشمی رنگت کو ختم کر دیا ہے۔ رشوت ستانی کا ناپاک دریا اپنی بے دریغ بھڑکتی کے ساتھ رواں دواں ہے۔

اپریل ۱۹۸۳ء میں اپنی تقرری کے کچھ دنوں کے دوران مجھے اس بات پر حیرت ہوئی تھی کہ آخر سرکاری ملازمتوں کے لئے اس قدر دوڑ دھوپ کیوں ہے بہت سی آسامیاں کیوں پیدا کی جاتی ہیں جن کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ بڑی رشوت کی صورت میں بھاری رقوم ادا کرنے کے لئے تیار ہیں اور وزراء ایسا کیوں سوچتے ہیں کہ انہوں نے اپنے قریبی رشتے داروں کی ادنیٰ ملازمتوں کا انتظام کر کے ان کے لئے عمر بھر کی معنویت حاصل کر لی ہے۔ ان سوالوں کے جواب مجھے جلد ہی حاصل ہو گئے جموں کشمیر میں ملازمتوں کو معمول سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ ان سے اچھی خاصی فاضل آمدنی ہو جاتی ہے۔ ایک دفعہ تقرری ہو جائے تو ان پر زیادہ محنت نہیں کرنا پڑتی جلدی سے پیسہ کمانے کے بہت زیادہ مواقع حاصل ہیں زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی۔ تعطیلات بہت زیادہ ہیں بیفطری کام بہت اور جلدی سے پیسہ کمانے کے بہت سارے مواقع حاصل ہیں۔ اگر کوئی ڈاکٹر ہے تو وہ اپنے ذاتی شفا خانے پر مریضوں کو دیکھ سکتا ہے اور اسے ہسپتال میں معمول کا کام نہیں کرنا ہے۔ اگر کوئی استاد ہے تو وہ ٹیوشن کلاس اپنے گھر میں شروع کر کے طلباء سے پیسہ وصول کر سکتا ہے۔ جو لوگ ٹیوشن کے لئے نہیں آتے ان کے ساتھ سخت اور جو اس کی خدمات حاصل کرتے ہیں ان کے ساتھ نرم رویہ اپنا سکتا ہے۔ چونکہ ملازمتیں ناواقف طریقوں سے حاصل کی جاتی ہیں ان پر مقرر افراد کا منہ پرور ہوتا ہے اور غلط کام کرنے میں ان کے منہ پر کو اندرونی غلط محسوس نہیں ہوتی۔

رشوت ستانی کے تمام نظام سے انسانی عنصر خارج کر دیا گیا گورنر راج کے دوران جون ۱۹۸۶ء میں میں دورے پر کشمیر گیا۔ میرا یہ معمول تھا کہ اپنے دورے کے دوران میں ہسپتالوں، سکولوں، دفاتروں اور دوسرے ایسے مقامات پر جایا کرتا تھا جہاں عوام کے ساتھ براہ راست رابطہ ہو سکے۔ کشمیر ہسپتال میں میں نے دیکھا کہ ۱۵ برس کا ایک نوجوان لڑکا بھاری کرب میں مبتلا ہے۔ گرجانے کی وجہ سے اس کے دونوں بازو لٹک چکے تھے۔ پوچھنے پر اس لڑکے کے والد نے مجھے بتایا کہ ہسپتال کے انچارج ڈاکٹر نے اسے کہا تھا کہ بچے کو جیکسی میں ڈال کر جموں لے جائے تاکہ شکستہ عضو کو درست کیا جاسکے۔ اس طویل اور دشوار گزار پہاڑی

راستے پر سفر کیلئے اسے ۲۰۰ روپے خرچ کرنا پڑیں گے مگر اس کے پاس ۲۰ روپے بھی نہیں تھے۔ میں نے پیسے کا انتظام کیا اور اس لڑکے کو جموں روانہ کیا۔ مگر یہ بات تو دوسری تھی۔

اس واقعے سے اس رشوت خور اور بے راج ڈھانچے کی جھلک ملتی ہے جس نے کاغذی طور پر تو منصوبے کے نشانے پورے کر لئے تھے مگر عملی طور پر نہایت ضرورت مند شخص کو کبھی کوئی خدمت حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس واقعے سے اہل اقتدار کے چین بھی کھل کر سامنے آجاتے ہیں اور سیاست دانوں اور ڈاکٹروں کے درمیان کٹھ جوڑ کا بھانڈا پھوٹ جاتا ہے۔ مجھے معلوم ہوا کہ کشتواڑ ہسپتال میں ایک آپریشن ٹیم موجود ہے جہاں پر مناسب اہلیت والا سرجن بھی ہے انتھک نہیں ہے حالانکہ وہاں ہر منظور شدہ آسانی موجود ہے مجھے معلوم ہوا کہ سرکاری ڈاکٹروں کو پرائیویٹ پر ٹیکس کی اجازت ہے اور انتھک نہیں ہے سیاسی خداوندوں کی مدد سے سری نگر یا جموں میں قیام کو ممکن بنا لیتے تھے اور پرائیویٹ شفا خانوں میں کام کر کے کافی روپیہ پیسہ کمالیتے تھے۔

غریب مریضوں کی ٹوٹ اور غیر انسانی رویے کے بہت سارے واقعات میرے سامنے آئے۔ میں نے سرکاری ڈاکٹروں کی پرائیویٹ پر ٹیکس پر ممانعت عائد کر دی اور اس کے ساتھ ہی ان کے لئے اس کے عوض پر ٹیکس نہ کرنے کا الاؤشن منظور کر دیا۔ اس اقدام کا اقبالات اور عوام نے ہماری تیر مقدم کیا۔ ہسپتالوں کی خدمات میں نمایاں تبدیلی واقع ہوئی۔ بدعنوانیوں میں کمی واقع ہوئی مفت ادویات آسانی سے میسر ہونے لگیں اور میڈیکل کالجوں میں درس و تدریس کے کام میں باقاعدگی آگئی۔ جب چند ڈاکٹروں نے میسر اس حکم کو ہائی کورٹ میں چیلنج کیا تو ہائی کورٹ نے اسے مفاد عامہ میں جائز قرار دیا مگر جیسے ہی نام ہناد مقبول وزارت واپس آئی اس نے مقبول اصلاح کو الٹ دیا۔ کشمیر میں چند جنرلیوں پر مبنی حلقہ اقتدار سرفہرست کو بے حسنی بنا کر رکھ دیا ہے۔

جس طرح ہمدردی اور دیانتداری شانہ بشانہ چلتے ہیں اس طرح بے پروائی اور رشوت میں چولی دامن کا ساتھ ہے یہ عام رشوت ستانی کا تمدن ہی ہے جو انتظامیہ کو غیر انسانی اور بیش قیمت بنادیتا ہے رشوت ایسے اعتنائی اور صارفانہ تمدن میں بنیاد پرستی کے رجحانات نمایاں ہوتے ہیں۔ رشوت ستانی کی وجہ سے عوامی بے چینی حکومت کے عکس کو ظاہر کرتی ہے اور بنیاد پرستوں کی صفوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر چیلز لیگ کا ایک سابقہ چیئرمین اور تخریب کار لیڈر سالہا سال سے اس بات کا پرچار کر رہا ہے کہ ہمدردی افراد کی نوبت ہی کیا یہاں تک کہ ہمارے اپنے لوگ ہمیں بھیٹر بکری تصور کرتے ہیں اور بے دردی کے ساتھ ہماری اونٹن اٹھا کر رہے ہیں۔

عام طور پر مرکزی حکومت نے کشمیر میں رشوت ستانی کی وسیع پیمانے پر موجودگی سے چشم پوشی کی ہے۔ ۱۹۵۳ء میں جب علی غلام محمد وزیر اعظم بنا تو وہ کشمیر کو خوش کر کے ان کی تشفی کیا کرتا تھا اس نے مرکزی خزانے

سے بھاری رقم لائیں اور انہیں سرپرستی کی تقسیم اور ترقیاتی امور پر فراخ دل سے ساتھ فرج کیا۔
بخشی غلام محمد اپنے ہی املا میں ایک عظیم رہنما، ایک عظیم منتظم اور ہندو مسلم اتحاد کا ایک عظیم پرچارک تھا۔
اس کا مروجہ معقول سے ہوا تھا چنانچہ اسے ایک عام کشمیری کے دکھ درد اور وسائل کا بخول اندازہ تھا مگر
اس کا المیہ تھا کہ سماج کی تنظیم نو اس کی بنیاد میں اصلاح اور انتظامیہ کی جدید کاری کی بجائے اس نے جاگیر
دارانہ معمولات پر انحصار کیا اور اپنی ذات، کنبہ کے افراد اور رفقاء کے لئے بھاری دولت جمع کی مرکز بنی اور
ریاستی سطح پر اس کے مخالفین نے اس کے خلاف کافی دھول اڑائی اور آخر کار مارج منصوبے کے تحت
اسے اقتدار سے ہٹا دیا گیا۔ ۲۰ جنوری ۱۹۶۵ء کو جوں و کشمیر تحقیقاتی کمیشن ایکٹ ۱۹۶۲ء کے تحت بخشی
غلام محمد کے خلاف رشوت ستانی کے الزامات کی تحقیقات کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا گیا۔ یہ ایک نفری کمیشن
جسٹس آئیننگر پر مشتمل تھا۔ آئیننگر کمیشن کے انکشافات نے لگ بھگ انہیں باتوں کی تصدیق کی جو عوام کو معلوم
تھیں۔ اور جہاں تک بخشی کے مخالفین کا مقصد تھا وہ حاصل کر لیا گیا اور عملی طور پر وہ ایک سیاسی طاقت کی
حیثیت سے ختم ہو کر رہ گیا۔ مگر یہ کمیشن ریاست سے رشوت ستانی کے خاتمے یا اس میں کمی لانے میں بالکل ناکام
رہا۔ رشوت کی ندیاں رواں دواں رہیں۔ درحقیقت جو واقعات بد میں رونما ہوئے انہوں نے ثابت کر دیا
کہ بخشی غلام محمد کو گتہ کاری سے زیادہ بدنامی کا سامنا کرنا پڑا۔

”سرخ کتاب“ کے عنوان سے ایک کتابچے میں شیخ محمد عبداللہ اور اس کے ارکین کنبہ کی طرف سے مرتکب
رشوت کے افعال کی فہرست دی گئی ہے۔ نوین دہے کے اوائل میں یہ کتاب پوشیدہ طور پر جاری کی گئی تھی جو سکتا
ہے کہ اس کتاب کے پس پردہ کوئی سیاسی مقصد کارفرما ہو۔ مگر یہ الزامات اس قدر واضح تھے کہ صرف شیخ کی تاریخی
عقلمند نے ہی ایک آدمی کو ان الزامات پر یقین کر لینے کے معاملے سدا رہ ثابت ہوئی ہر کیف اس حقیقت
سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ شیخ عبداللہ کے ناک تھے ہی رشوت ستانی کو فروغ حاصل ہوا اور اس کا بیمار
ناک رشوت ستانی کی بدبو کا اندازہ نہیں کر سکا۔ جنگلات کے ٹھیکوں، ہوٹلوں کے لئے زمین کی الاٹمنٹ سرکاری
املاک کی فروخت اور زمین کے معاہدات کا ناجائز استعمال ان معاملات میں رشوت ستانی بہت حد تک نمایاں تھی۔
۱۹۷۷ء کے بعد شیخ عبداللہ کو قریب لاکھ دو واخترات حاصل ہوئے۔ رشوت ستانی کا بہن بھیل گیا اور
اسے مزید گہرائی حاصل ہوئی حلقہٴ اقتدار تنگ ہو گیا سرکاری ملازمین اور سیاست دانوں کے کردار غلط ملط ہوئے اور
دفعہ ۳۰ کا پردہ مزید پگڑا ہو گیا اور اسے بدخواہ مسافٹ حاصل ہوئی۔ استحصال اور دولت کی طاقت پر زیادہ
انحصار رکھا جانے لگا۔ ایما ندار اور دھونس کام سرانجام دینے کی بجائے تنگ نظری کا سہارا لیا گیا۔ لارڈ
ایکٹن کے مشہور محاورے ”اقتدار رشوت ستانی اور مکمل اقتدار رشوت ستانی کا موجب ہے“

POWER CORRUPTS AND ABSOLUTE POWER CORRUPTS ABSOLUTELY

۴ ملاحظہ ہو باب ۱۱ ”انتظامی جڑیں“ اور ماحولیاتی تخریب میں جڑیں: دہشت گردی کی جڑیں: دفعہ ۳۰

اس کی مثال کے طور پر میں صرف ایک ہی واقعہ بیان کروں گا۔ اس معاملے کا تعلق جمیل ڈل کے
کنارے یوں کیے طاس پر ہوٹلوں کی تعمیر سے ہے جسے بلیوارڈ کہا جاتا ہے۔ یہاں پر بارہ سوخ تاجروں کو ہوٹلوں
کی تعمیر کی خاطر ارزان نرخوں پر بیسولہ لاکھ کے لئے اور اس جمیل کے نفرتی سینے پر ایک مستقل گھوڑ
لگا دیا گیا۔ ان تعمیرات سے خارج ہونے والی گندگی کو جمیل میں بسنے کی اجازت دے کر اس نقصان
میں مزید اضافہ کیا گیا اور عام گاڑیوں کو کھڑا کرنے کے لئے کوئی بھی جگہ نہیں چھوڑی گئی۔ اس طرح جمیل کے
کنارے پر ایک جدید گندی بستی وجود میں آگئی جس سے قدرتی مناظر کتبای ہوئی جمیل کے ”تے“ میں ریڈیو کنکر
جمع ہو گئے اور جھنگلی گھاس میں اضافہ ہوا۔ حلقہٴ اقتدار بشمول تاجروں اور سیاست دان، شاید سبھی کو فائدہ
ہو چکا ہو جمیل کا سکڑا ہوا حلقہ رشوت اور اقتدار کے مزاج المانگ تمدن کی علامت رہے گا۔

اپنی کتاب ”شیخ عبداللہ کی زندگی“ میں عابد حسین رقمطراز ہے۔
”ذہیر اعظمی کے طور پر اقتدار حاصل کرنے کے قبل شیخ عبداللہ اور اس کے افراد کنبہ مولیٰ ذرائع کے
افراد تھے۔ آج اس کی غیر متوازن نداء کا اندازہ بیس کروڑ ہے۔“

یہ بتدریج اضافہ ۱۹۷۵ء سے ۱۹۸۱ء کے مختصر عرصے میں ہوا ہے۔ اس کی جائداد میں عموماً ناہائز قبضوں
کے ذریعے حاصل ایسے سرکاری راضیات ہیں جن کی بہت زیادہ کاروباری قیمت ہے اور ان زمینوں پر محل نما
عمارتوں کی قطار تعمیر ہو چکی ہے۔ یہاں پر یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ان عمارتوں کی تعمیر ان مشکوک
ذرائع سے کی گئی ہے جو ٹھیکیداروں نے سرکاری محکموں سے حاصل کئے ہیں۔

انکم ٹیکس چھاپوں کا ذکر کرتے ہوئے محمد فاروق رحمانی جیڑ میں ہیلز بیگ رقمطراز ہے ”پوشیدہ آمدن کی
تلاش کے لئے مارے گئے انکم ٹیکس چھاپوں سے جہاں کشمیر کے عوام خوش ہوئے تھے وہاں شیخ عبداللہ کو بھاری
کوفت ہوئی اور اس نے اپنی ناراضی کا اظہار کیا۔ اس بات میں شبہ نہیں کہ شیخ عبداللہ سرمایہ داروں اور کمزور بازوں
کا محافظ بن چکا تھا جنہوں نے بے ایمانہ طور پر یقین سے غیر منسوب فائدے حاصل کئے تھے۔ ایما ندری اور قوانین
صرف اُن لوگوں کے لئے تھے جن کا کوئی اثر و رسوخ نہیں تھا شیخ عبداللہ اور اس کے ارکین کنبہ کو کو قانون سے بالاتر تصور
کرتے تھے۔“

۲ مارچ ۱۹۸۳ء سے ۶ جولائی ۱۹۸۶ء تک جی ایم شاہ کے ہمد حکومت کے دوران نے ہوٹل کپکس
کے نزدیک پاکستانی فوج کے ایک ریٹائرڈ سبجر جنرل کا ایک خالی قطعہ زمین کو دستیاب کر کے مزید نقصان
ہو چانے کی کوشش کی گئی جسے اس بات کے لئے راضی کیا گیا کہ وہ جائداد مہاجرین کے طور پر اس پر
دعویٰ دائر کر دے۔ مجھے اس معاملے کا یہ پھل گیا اور میں اس تجویز کو روکے میں کا سیاب ہو گیا۔

جو کچھ ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے کیا وہ قطعی حیران کن تھا اور اس سے معلوم ہوتا تھا کہ اقتدار کا

ڈھانچہ کس قدر سنگ اور گندگی کا شکار ہو چکا تھا اور کس طرح خوشامد اور موقع پرستی کو مکمل عبور حاصل تھا۔ ۱۹۸۳ء کے اوائل میں ایک مذاکرے کے دوران جس کا میں نے افتتاح کیا، بلیوارڈ میں ہوٹل تعمیر کرنے کی اجازت کے معاملے میں شیخ عبداللہ کی طرف سے اجازت دینے جانے کے فیصلے پر کس طرح ڈاکٹر فاروق عبداللہ برس پڑا۔ اس نے کہا: "ان ہوٹلوں کی تعمیر کی اجازت دینے سے ایک عظیم گناہ سرزد ہوا ہے۔ ان بھی کو نذر آتش کر دینا چاہیے انہوں نے جھیل کے کنارے کو غارت گری اور عصمت دری کا شکار بنایا ہے۔" میں ان الفاظ کو سن کر خوش ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ ڈاکٹر فاروق عبداللہ ایک بیدار مغز لیڈر ہے جو مایوسی کی کثافت کے نقصان سے استرا کرنا چاہتا ہے مگر مجھے یہ بات سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ بیٹھ کے لباس میں ایک بیٹھ بابے۔ اس اعلان کے چند عینے بعد اس نے ایک نہایت ہی موافق معاہدے پر ایک بڑے ہوٹل کے کمپلکس کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس مقام سے اس جھیل میں سب سے زیادہ کثافت پیدا ہو رہی ہے۔ منظر سب سے زیادہ مسخ ہو رہے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں ہلکی گاڑیوں کی آمدورفت کے لئے سڑک تراشنے کی خاطر پہاڑیوں کے تنگوں میں ضرب کاری لگائی جا رہی ہے۔ ایک بار کہنے اور دوسری کرنے کی اس سے زیادہ افسوس ناک مثال نہیں مل سکتی۔ درحقیقت کشمیر کے سیاسی منظر کا سا لہا سال میں یہ خاصہ بن چکا ہے کہ ایک طرف بااؤنبلند راشی افعال کی مذمت کرو اور دوسری طرف براہ راست یا بالواسطہ طور پر ایسے افعال کا ارتکاب کرو۔ شیخ عبداللہ کے عہد حکومت کے دوران رشوت ستانی کے وجود کو ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے اس وقت تسلیم کر لیا تھا جب وہ شیخ عبداللہ کی وفات کے بعد ستمبر ۱۹۸۲ء میں وزیر اعلیٰ بنا۔ اس نے اپنی وزارت میں پیشل کانفرنس کے متعدد اہم لیڈروں کو شامل نہیں کیا۔ ان میں ڈی۔ ڈی تھاکر جی این کوچک اور جی۔ ایم بھدر وہاڑی شامل تھے جو شیخ عبداللہ کی وزارت کے رکن تھے۔ ڈاکٹر فاروق ایک پتھر سے دو پرندوں کو ہلاک کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے باپ کی کابینہ میں شامل ہوا ہوس افراد کو دور رکھنا چاہتا تھا جس سے عوام کو یہ تاثر حاصل ہو کہ وہ عوامی زندگی سے رشوت ستانی کا خاتمہ چاہتا ہے۔ اور یہ کہ فاروق عبداللہ کی وزارت اوصاف کا ایک جسم ہے یا گندشتہ وزارت سے کسی طور پر مختلف ہے۔ اور جلد ہی یہ بات واضح ہو گئی۔

+ فاروق رحمانی کتاب "شیخ عبداللہ کے نقوش" سے ماخوذ

++ ۱۹۸۱ء کے دوران انکم ٹیکس حکم نے ملک سے سب سے بڑے کاپیٹ ڈیلروں پر ایک ساتھ چھاپے مارے۔ سیرنگ میں اس چھاپے مار پر پارٹی پر حملہ کیا گیا۔ فاروق عبداللہ ممبر پارلیمنٹ نے بھیم کو اشتعال دیا۔ چند مقامات پر ضبط کے کئے دستاویزات کو بھیج کر جھیل ڈل میں پھینک دیا گیا۔ ۶۹ میں سے ۴۰ افراد بھروسہ ہوئے۔

+ ملاحظہ ہو "مارشلسٹ" شمارہ ۲۰۰۲ء

بخشی غلام محمد کے عہد حکومت کی بدعنوانیوں کے سلسلے میں جسٹس آئینگر نے دو باتیں کہیں تھیں۔ سیاسی سربراہ کی ایما پر افسروں کی غلط کام کرنے کی رضامندی۔ اس رضامندی کے پہلو پر میں نے اسٹیکامی جڑوں کے حصہ میں بحث کی ہے جسٹس آئینگر کی طرف سے دوسرے پہلو میں "قواعد کار" کی خلاف ورزی کر کے کابینہ کی میٹنگ میں چند غیر اہم مدت کا شامل کرنا یہ غیر صحت مندرجہ جہان بھی جاری رہا جی ایم شاہ اور فاروق عبداللہ کی وزارت اعلیٰ کی مدت کے دوران چند ایسے معاملے کابینہ کی میٹنگ میں بالواسطہ طور پر اٹھائے گئے جن کا تعلق بدعنوانیوں کے ساتھ تھا حالانکہ اس معاملے میں کوئی ضرورت نہیں تھی اور متعلقہ حکام نے ان پر پہلے ہی غور کیا تھا۔ ظاہر الکوشش یہ تھی کہ ناواقف امور کو ریکارڈ میں آنے پر روکا جائے اور ذمہ داری کے دائرے کو سمجھ رکھا جائے۔ جی۔ ایم شاہ وزارت اعلیٰ کی مدت کے دوران اس کی مثالیں سلیز جیکس معاملوں کا گفت و شنید کے ذریعے پیشا رہے اور نزول اراضیات کی مستقبل بنیادوں پر قطع بندی؛ جو نیڈ وز اور منظور ہوٹلوں اور گولف کورس سے متعلقہ تھیں۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے عہد حکومت میں یہ تجویز نہیں لگی تھی۔ تحقیقاتی کمیشن ایکٹ کے تحت ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے شیخ عبداللہ کے عہد حکومت میں چند وزراء کو الٹ کئے گئے مکاناتی پلاٹوں میں ہونے والی دھاندلیوں کے الزامات کی چھان بین کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا۔ جموں کشمیر ہائی کورٹ کے ریشائرڈ جسٹس کو تو اس تحقیقات کا کام سونپنا لغو بیٹھ گیا۔ مگر جیسے ہی جی۔ ایم شاہ کی وزارت وجود میں آئی کمیشن کو پوری طور پر ختم کر دیا گیا۔ دوسری طرف ڈاکٹر فاروق عبداللہ پر رشوت کے الزامات کی تحقیقات کے لئے کابینہ کی ایک ذیلی کمیٹی قائم کی گئی اس کمیٹی کا سربراہ نائب وزیر اعلیٰ ڈی۔ ڈی تھاکر تھا۔ اس کمیٹی نے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی بدعنوانیوں، قوم دشمن سرگرمیوں اور انحرافات کے لئے سرزنش کی مگر ان تحقیقاتوں اور مخالف تحقیقاتوں سے کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوا۔

جی۔ ایم شاہ اور ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے عہد حکومت کے دوران کئے گئے ناجائز اور نامناسب فیصلوں کی فہرست اس قدر طویل ہے کہ کہاں پر اس کا بیان یا تجزیہ ممکن نہیں ہے۔ ایک مخصوص مثال ہی کافی ہوگی۔

دسمبر ۱۹۸۴ء کے بعد فاروق عبداللہ کی وزارت میں وزیر مال و شہری ترقیات پی ایل پنڈت کے داماد رمن مٹھو کی طرف سے ۱۹۸۴ء کے دوران شروع کی گئی زمین پر آباد کاری کے کاروبار کے لئے ایک غیر مشروع کی گئی۔ اس بارے میں متعدد شکایات موصول ہوئیں جن کے مطابق پنڈت کے ساتھ گہرے گرم سازش کے تحت اسرا بلڈرس نے میونسپل اور محکمہ مال کے ضابطوں کی خلاف ورزی کر کے جموں اور اس کے گرد و نواح میں وسیع رقبہ جات اراضی کی خرید کی ہے اور محکمہ جات سے نقصان کی اور سروس پلان کی منظوری کے بغیر اس کے رہائشی پلاٹ بنا کر فروخت کر دیئے ہیں اور اس طرح بھاری مالی فائدہ اٹھایا ہے۔ میں نے یہ بات وزیر اعلیٰ فاروق عبداللہ کے نوٹس میں لائی اور اس موضوع پر میں نے اسے تین خط لکھے۔ ۲۸ دسمبر ۱۹۸۴ء کو اپنے تیسرے خط میں میں نے لکھا: "مجھے اس بات کو واضح کرتے ہوئے نہایت افسوس ہے کہ اسرا بلڈرس کی کاروائیاں اب بھی جاری ہیں۔"

اس سلسلے میں میں اس اشتہار کی فوٹوٹیٹ کاپی منسلک کر رہا ہوں جو اسرا بلڈرس نے مقامی اخبارات میں جاری کیا ہے، مجھے یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ اپنے رہائشی بلاٹ میونسپل حکام یا ڈیپلیمٹ اتھارٹی کی منظوری کے بغیر کیسے فروخت کئے جاسکتے ہیں۔ اس سلسلے میں ٹاؤن پلاننگ قواعد کی پابندی بھی نہایت ضروری ہے۔ اس تشہید شدہ منصوبے پر سرسری نظر سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بلاٹ صرف کاغذ پر ہی تیار کئے گئے ہیں۔ اسرا بلڈرس جو کچھ کر رہے ہیں وہ ٹاؤن پلاننگ علاقائی ترقی اور ماحولیاتی تحفظات کی صریح خلاف ورزی ہے چنانچہ ظاہر ہے کہ زمین کی سٹر بازی اور میرا پیوری بلاڈریج جاری ہے۔ غیر قانونی اور بے قاعدہ ہونے کے علاوہ اس قسم کی سرگرمی سے بھاری ماحولیاتی اخراجات پر آئینہ سٹونوں پر پوچھل ثابت ہوگی۔ بینقرس پارٹی کے جنرل سیکریٹری اور دسے چند اور ڈاکٹر قاضی سار سہراہ امت اسلام اور میر واطد جموں کشمیر کے الگ الگ جج سے رسائی کی کہ میں انسداد رشوت سٹانی ایکٹ کے تحت پی۔ ایل ہنڈو پر مقدمہ چلانے کی اجازت دوں۔ میں نے ان درخواستوں کو وزیر اعلیٰ کے پاس اس کے تبصرے کے لئے ارسال کر دیا مگر اس کا کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔

اس سلسلے میں محکمہ جی اینس نے مشہور قانون دان اور سابق وزیر قانون ایس این بکر کی رائے طلب کی تھی۔ اس کی رائے میں اسرا بلڈرس نے قانون کی متعدد دفعات کی خلاف ورزی کی تھی مگر ایس این بکر کی رپورٹ پر کارروائی کرنے اور امت اسلامی اور بینقرس پارٹی کی عرضداشتوں پر اپنے تاثرات مجھے ارسال کرنے کی بجائے براہ راست قانونی راستے کو محدود کر دیا گیا اور یہ معاملہ قانون سازی کی ہاؤس کی کمیٹی کو بھیج دیا گیا۔ صاف ہے کہ ہاؤس کمیٹی اس معاملے کا پتہ اشارہ کرنے کے اہل نہیں تھی۔ چنانچہ یہ معاملہ جلد ہی اپنے فانی انجام تک پہنچ گیا۔

بہت سارے دوسرے ایسے معاملوں کا بھی یہی حشر ہوا جن کی بابت میں نے رپورٹ طلب کی تھی۔ کاروبار سرکار کا سارا نظام اس قدر مفلوج کر دیا گیا ہے کہ کسی طور پر تصور و افراد کے خلاف کوئی کارروائی ممکن ہی نہیں تھی۔ ایک معاملے میں ایک بار سوخ پارٹی ملوث تھی۔ یہ معاملہ بینقرس محکمے کے سپرد کیا گیا تھا اور میں نے اس بارے میں رپورٹ طلب کی تھی۔ مگر حسب معمول اس معاملے میں ملوث ان ارباب دولت اور مشتبہ افراد کے تحفظ کے لئے ہائی کورٹ آگئی تھی۔ عدالت نے یہاں تک کہا کہ محکمہ جی اینس کی طرف سے جاری تحقیقات پر حکم امتناعی جاری کر دیا گیا ہے ایک اور معاملے میں چیف جسٹس کی طرف سے ایک خاص معاملے میں رشوت کے الزامات کو کی بی آئی کے سپرد کر کے کیٹے جاری احکامات پر ہائی کورٹ کے دو ججوں نے حکم امتناعی جاری کر دیا۔ یہ الزامات ایک ڈسٹرکٹ جج کے خلاف دستاویزات سے ظاہر تھے۔ مزید ایک معاملے میں سپریم کورٹ نے ریاست حکومت کو ایک نوٹس جاری کر دیا کہ جھیل ڈول کو جوہنے والے ماحولیاتی نقصان کو کیوں نہیں روکا جا رہا ہے۔ ہائی کورٹ نے سرٹیکر میونسپلٹی کو بلا سماعت ایک حکم جاری کر دیا کہ اس جھیل کے ایک سرسہ حصے

میں ایک تعمیراتی نقشے کو منظوری دے دی جائے۔ واضح ہے کہ عدالتوں کی طرف سے دکھائی گئی خدمت داری کی وجہ سے عوامی زندگی میں رشوت کا سہونا ناگزیر تھا۔

کوئی بھی ادارہ اگر وہ پاس کے سیاسی اور سماجی ماحول سے بچ کر نہیں رہ سکتا۔ اور ریاست کی عدلیہ اس معاملے میں متبر نہیں تھی۔ رشوت کے ذریعہ اس پر بھی اپنا اثر تھا۔ ہائی کورٹ میں زبردست دھڑلے بندی نے ماحول کو مزید کمزور کر دیا۔ اس سلسلے میں اصلاحی اقدامات کی بابت سفارشات پر مرکزی حکومت نے کوئی ٹور نہیں کیا۔ اور نہ ہی اس امر کا کوئی جواب ارسال کیا گیا کہ میری سفارشات کو منظور کرنا کیوں ممکن نہیں۔ اس کے انجام کار عدلیہ شدید طور پر زوال پذیر ہوا اور بسا اوقات عدلیہ مشیز کو غیر منصفانہ حالات کا سامنا کرنا پڑا۔

رشوت ستانی کا کثیر حکومت اور سماج کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہا مگر صورت حال کی سنگینی کو کبھی محسوس نہ کیا گیا۔ سیاست دان حد قدانہ انداز فکر پانے کے موڈ میں نہیں تھے۔ سرکاری اہلکار بغیر صحت مند سیاسی عناصر سے ناظر نہیں ٹوڑنا چاہتے تھے۔ دانشور قانونی عمل میں رشوت اندازی کے لئے اپنی عادات کو ترک نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اور عدالتیں اس امر کو محسوس کرنے کے لئے تیار نہیں تھیں کہ مشتبہ افراد کے حق میں ان کی بار بار دخل اندازی کی وجہ سے کیا نقصان ہو رہا ہے۔ اس طرح عام رشوت ستانی کی نوعیت نہایت انتشار کن بن کر رہ گئی۔ اس کی ہیئت اس قدر وسیع ہو گئی کہ اس نظام میں اپنے ہی اثر کے تحت شگاف پڑنے لگے۔ اس سے ان لوگوں میں تنازع پیدا ہوا۔ جو اس میں ملوث تھے۔ وہ لوگ بھی متاثر ہوئے جنہیں فائدہ ہوا وہ بھی جنہیں کچھ نہ ملا۔ چنانچہ یوم حساب دور نہیں تھا۔

ماحولیاتی تباہ کاری میں پوشیدہ جڑیں

کسی مقام کا ماحولیاتی منظر اس کی روحانی صحت مندی کا غماز ہے۔ ماحولیات کے معاملات کا تعلق تمدن کے گہرے معاملات، قدروں، اور کسی طبقے کے اقتصادی سیاسی اور سماجی رجحانات سے ہے جس حقیقت کی واجہیت کشمیر کے معاملے میں واضح طور پر عیاں ہوتی ہے۔ جہاں قدرت نے وادی کو خوبصورت تحفے عطا کئے ہیں وہاں مادی اور ذہنی، اندرونی قوتیں ان تحفوں کے وجود کو بتدریج انداز میں ختم کر رہی ہیں نفاذ کی سفاکانہ تباہ کاری جھیلوں اور ندیوں میں ریت کثرت جمع کرنے، ہوا، پانی اور زمین کی کثافت اس

+ اپنے جواب مضمون - رشوت ستانی کے سیاسی خمیازے میں IN HIS ESSAYS POLITICAL

CONSEQUENCES OF CORRUPTION (COMPARATIVE POLITICS: July 1986

مائیکل جوسٹن نے اٹمی وی اور انتشاری رشوت ستانی کے درمیان امتیاز بیان کیا ہے۔ اول الذکر لوگوں اور گرد و پوں کو چوڑنا ہے مگر بعد ازاں شدید تنازعات پیدا ہوتے ہیں۔

طرز عمل کو وسیع تر بناتی ہیں۔ ترقیاتی عمل کی ترجیحات امن کے ساتھ فیصلہ لینے کی من مانے انداز کا تعلق ہے۔ اس معاملے میں بہت حد تک معاون ثابت ہوئے ہیں۔ عام طور پر اس کے پس پردہ حرص نہ سبب زار کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ قدرتی مناظر کی بے پناہ خوبصورتی کے پیش نظر ہمارا نظریہ ہونا چاہیے۔ اسے دھرتی مانتا، ہم تمہیں سلام کرتے ہیں۔ ہمیں معاف کرو کہ ہم تمہیں پاؤں کے ذریعے چھوتے ہیں۔ مگر کھسیر کے قدرتی حسن کو درندہ تباہ کر رہا ہے۔ یہ درندہ جو چند اعلیٰ لوگوں کے اندر قہام پذیر ہے اور جسے استحصالی جمہوریت کی قوتیں فراخ دل سے تقویت دے رہی ہیں۔ یہ بات جمیلوں اور یادوں، جنگلوں، مٹی اور شہروں کی حالت زار سے عجیب ہے۔

مشہور مصروف جمیل دل جیسے ابوالفضل نے "دنیا کی خوشی" قرار دیا تھا۔ ۴۴ کھومیڑ سے سکڑ کر اکھومیڑ رہ گئی ہے۔ اب بھی ۱۵ اٹن فاسفورس اور ۳۲ اٹن نائٹروجن ہر سال اس میں پڑتے ہیں۔ ۱۹۸۷ء کے سیلابوں نے یہ ثابت کر دیا کہ ناجائز قبضوں کی بدولت اس جمیل کی قدرتی روانی کس قدر مسدود ہوئی ہے۔ اس جمیل کے گرد تعمیر کردہ ایک ہزار دوسو مکانات کو نقصان پہونچا اور ۱۲ جاہیں تلف ہو گئیں۔ کل نقصان اسکا اندازہ ۸۵ کروڑ روپے لگایا گیا ہے۔ دہرمانی بل جیسی دوسری جمیلوں کی حالت زار بھی کچھ مختلف نہیں ہے۔ آپنا اور گھسار جمیلیں اب قریباً ختم ہو چکی ہیں۔

دریائے جہلم وادی کے لئے شہر رگ کی حیثیت رکھتا ہے مگر اس کی تہ میں تنویش ناک رفتار سے ریت کنکڑ جمع ہو رہے ہیں۔ صرف پورے ۷۰ کیر علاقے سے ہی ۲۴ لاکھ ایکڑ فٹ بلبر ہر سال اس دریا میں داخل ہوتا ہے تمام وادی کا کھانا اور ٹھوس صنایع مادہ اس میں جاتا ہے اب تو معمولی سی بارش کیوجہ سے بھی اس دریا میں سیلاب آجاتا ہے جس کی وجہ سے ہمارا دار اور فعلوں کا بھاری نقصان ہوتا ہے ۱۹۸۶ء اور ۱۹۸۷ء کے سیلابوں کے دوران نقصان کا اندازہ بالترتیب ۳۸ کروڑ روپے اور ۲۱ کروڑ روپے لگایا گیا تھا۔

ابھی کچھ عرصہ پہلے تک جموں کے شوالک اور کشمیر کے بلند قامت پہاڑوں کو دنیا بھر کے گنجان ترین اور امیر ترین بہمن محل بن چکا تھا جس میں اراضی کا کل ۹۰ فیصد علاقہ سے زیادہ علاقہ شامل تھا۔ آخر کار۔ خاص طور پر انھوں نے دہے کے وسط سے سرسبز درختوں کا بے شمار قتل عام ہوا ہے۔ دو برس قبل تک ریاست کے جنگلات سے قریباً ۴ کروڑ فٹ لکڑی کا کٹا ہوتا تھا۔ حال میں بس ۷۷ لکڑی کے ایک مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۷۶ء تک ۹۱ ہزار ہیکٹر رقبہ مختلف ترقیاتی پروجیکٹوں کی نذر ہو گیا۔ ایندھن کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اب بھی صرف سرینگر شہر میں ہی ۵۷ لاکھ کوئٹل لکڑی سالانہ دستیاب کی جاتی ہے ریاست بھر کے لئے ایندھن کی موجودہ ضروریات ایک کروڑ کوئٹل خیال کی جاتی ہیں۔

کارخانوں اور کیمیا کے پے دریغ استعمال سنجیدہ صورت حال اختیار کر چکا ہے۔ جن کیمیا کا مصرف ہوتا ہے انہیں سے صرف ایک چند ہی نشانے ٹک پہونچتا ہے اور باقی ماحول میں جذب ہو کر رہ جاتا ہے۔ قومی سطح پر جرائم کش ادویات کے ۵۰۰ گرام فی ہیکٹر کشمیر خطے میں ۶۰۰۰ سے ۱۲۰۰۰ گرام فی ہیکٹر سارا ذخیرہ کے باغات میں استعمال ہوتا ہے۔

یہ امر باعث حیرت ہے کہ حصول آزادی کے ۴۳ برس بعد بھی ریاست کے گرمائی دارالحکومت میں بلیوین سسٹم کا فقدان ہے کلیدی شہر میں بمشکل ایک یا دو فیصد گھروں میں جدید طرز کے فرش بہت اعلیٰ اور سوینچ پٹ میں۔ پانچ لاکھ کمروں پر ریاستہائے گھریلوں پر لے جایا جاتا ہے۔ جس سے ہر طرف بدبو پھیلی ہے ہیڈ میں کیڑوں جیسی بیماریاں عام پائی جاتی ہیں۔ ڈونگوں میں رہنے والے باجی (دکھتی بان) اور باؤس بوٹوں میں رہنے والے لوگوں کا فضلہ دریائے جہلم یا جمیل ڈل میں بہتا ہے اور یہ مقامات گندے پانی کے گڑھے اور نالیاں بن کر رہ گئے ہیں۔ گورنمنٹ ایس۔ پی کالج کی ہائڈرو بائسٹا جیکل لیبارٹری کی طرف سے حال ہی میں کئے گئے مطالعہ میں انکشاف کیا گیا ہے کہ سری نگر شہر کے مختلف حصوں میں جو پانی فراہم کیا جاتا ہے۔ وہ دریائے جہلم کے کثافت آلودہ پانی سے بھی بدتر ہے۔ یہ بھی انکشاف کیا گیا ہے کہ اس قسم کے آلودہ پانی کی وجہ سے جنگلی جانوروں کی زندگی کے لئے بھی خطرہ لاحق ہے۔ خاص طور پر ان جنگلی جانوروں کے لئے جو ڈاچی کام نیشنل پارک میں قیام کرتے ہیں۔

پری محل، شکر کھارہ پہاڑی اور زیتھار پہاڑوں میں واقع ۹۰ ہیکٹر رقبہ نظر انداز کیا گیا ہے۔ اس میں جنگلی جھاڑیاں اور جنگلی گھاس ہے۔ اب یہاں پر ناجائز قبضے ہو رہے ہیں۔ اپنی افق تاجی تقریر میں میں نے اس کا ذکر کیا اور کہا کہ اس علاقے میں سٹی فارسٹ کے فروغ کی بھاری کجائش موجود ہے تاکہ وادی میں آنے والا ایک سیاح اس روحانی خوبصورتی کے ساتھ روبرو ہو سکے۔ اور جب وہ یہاں سے رخصت ہو وہ نہ صرف تروتازہ ہو بلکہ اس کے باطن میں بھی خوبصورتی پیدا ہو چکی ہو۔

طلوع آفتاب کے وقت صبح کی شبنم

جب وہ اس خوبصورت سرزمین کا نظارہ بھر کریں

تو اس کے سبب ہمارے بیاہوں کے تناؤ مٹ جائیں۔

وزیر اعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے اپنی تقریر میں اس تصور کی گنجائش ستائش کی۔ اس نے کہا: ایک جوان سال، متحرک اور پرنیمیل شخص کے روپ میں جگمگوہن کی نگاہ انتخاب اس علاقے پر پڑی ہے جس پر فوری توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ مجھ میں بھی جوان خون موجود ہے۔ ان دو جوانوں کے ہاتھ ملانے سے ریاست میں انقلاب آسکتا ہے۔ مگر یہ بات ایک خام خیالی ثابت ہوئی۔ نہ تو ڈاکٹر فاروق عبداللہ اور نہ ہی اس کے بعد آنے والے جی۔ ایم شاہ نے اس معاملے میں کچھ کیا۔ اور یہ علاقہ نظر اندازی اور بے اعتنائی کا شکار رہا۔

گورنری راج کے دوران میں نے حکم جاری کیا کہ اس علاقے کی فاسٹ کے طور پر فروغ دیا جائے۔ جو سرنگر کے دارالحکومت کے اندر ہی ایک خوبصورت جنگل ہے۔ تمام راستے پر زنجیر لگا کر اس کی قدرتی محل وقوع کو برقرار رکھا گیا اور پیدل چلنے والوں کے لئے - ^{by path} - تعمیر کئے گئے۔ پتھروں کو صاف کر کے مصنوعی گڑھوں کو بھر دیا گیا پرانے جھڑوں کی مرمت کی گئی اور انہیں بحال کیا گیا اس کی ابدی خوبصورتی کو بحال کر دیا گیا۔ نئی شجرکاری کے لئے، بغیر علاقوں کی نشاندہی کی گئی۔ شجرکاری اور تعلیم قدرت کے دو پہلو مقاصد سے باقاعدگی کے ساتھ سکولوں کے طلباء کو لایا گیا۔ ایک پرانی اور خستہ عمارت میں گفتگو کا مرکز قائم کیا گیا۔ نمائشوں، مصوری مقابلوں اور جنگلی جانوروں کی زندگی پر فلمیں دکھانے کی ضروریات کے مطابق اسے ڈھالا گیا۔ ایک کونے میں جانوروں کی پناہ گاہ بھی قائم کی گئی اور اس میں ہاشنگ اور دوسرے جانوروں کی پرورش کی گئی۔

قدرتی مناظر کے ساتھ آئسن رکھنے والوں کے لئے تمام کمپلکس ایک جہت کی حیثیت اختیار کر گیا۔ صبح کی سیر کرنے والے نزاروں افراد کے لئے زندگی ثابت ہوئی۔ ایک صاف شفاف ماحول جہاں پرندوں کی چیمپا ہٹ ہو، درخت اور جھاڑیاں مستی میں جھومتی ہوں چشمے اور ندیاں رواں دواں ہوں اور بے ضرر جانور ہر طرف کھیل اور رقص پیش کر رہے ہوں امام آدمی کے لئے اس سے زیادہ آسودگی کی زیادہ ضرورت نہیں تھی شہروں کے شور و غر سے دور اس ماحول میں گھومتے سے بہتوں کو بھی کیف حاصل ہوتا۔ یہ پروجیکٹ وادی میں ہر زبان پر کیا گیا۔ بلکہ تمام ریاست کے لوگوں نے اسے پسند کیا۔ جموں کے عوام نے بھی اسی قسم کے سٹی فاریسٹ کے لئے مطالبہ کرنا شروع کر دیا۔ آل انڈیا سوسائٹی آف نیچر زونوگرافی نے قدرتی تحفظ کے معاملے میں ایشیا ہیکا رقرار دیا۔ یہاں تک کہ گورنر راج کے خزانے کے بعد جنگلی جانوروں کے تحفظ سے متعلق ریاستی بورڈ نے ایک قرارداد منظور کی جس میں اس پروجیکٹ کی تائید کی گئی ہے اور ستم ظریفی یہ کہ اس امر کی قرارداد وزیر اعلیٰ نے پیش کی۔

اب یہ سب تباہ ہو چکا ہے۔ پیدل راستے چشمے اور جنگلی جانور سب مفعود ہو چکے ہیں سینکڑوں تعداد میں درخت پودے وغیرہ بھی غائب ہو چکے ہیں۔ اس زمین پر اب - اکروڑ روپے کی کثیر رقم صرف کر کے لگاتار تعمیر کیا گیا ہے۔ ایک خوبصورت چیز دائمی آسودگی کی حامل ہے - ^{is a thing of} - ^{beauty is a joy for ever} کے نیا ورے کو مسخ کر دیا گیا ہے۔ درحقیقت کالٹ کورس کی بجائے یہ مخصوص افراد کا کورس ہے جسے کسی اور جگہ بھی تعمیر کیا جاسکتا تھا۔

میرے لئے خاص طور پر یہ بات باعث رنج رہی ہے کیونکہ کوئی بھی محقق اپنی تخلیق کو تباہ ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ مگر عام لوگوں کے لئے یہ بات ایک بھاری نا انصافی کے مترادف ہے۔ یہ ان سے ایک تازہ ہوا اور

کی طرف سے مخصوص اشخاص کی خاطر ایک نہایت مہنگا طرز عمل جو ہماری ضروریات سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اس کالٹ کورس کی بدولت سرنگر کی سیاحت کو فروغ نہیں ملے گا۔ موسم گرما کے دوران اوسطاً دو یا تین غیر ملکی سیاح کالٹ کھینٹتے ہیں۔ ان سیاحوں کا مزاج کالٹ کا نہیں اور نہ ہی سرنگر کی آب و ہوا میں وہ زیادہ رقم اکیل پر صرف کرتے ہیں غیر ملکی سیاح زیادہ تر گھرگ اور پہل کام جیسے نسبتاً سرمقامات کو چلے جاتے ہیں چنانچہ اس کالٹ کورس کی تعمیر میں فائدوں کی نسبت نقصانات زیادہ ہیں۔

چند کمپیوٹر میں پھیلے ہوئے ایک وسیع قطعہ ارض کی دیکھ بھال کیلئے بیسڈ کالٹ بواٹن کی تقرری ضروری ہے۔ اس میں لاکھوں گیلن پانی صرف ہوگا۔ مختصر یہ کہ سادہ الفاظ میں ترقیاتی طرز عمل جو کم خرچ ہو اور عام آدمی کی زندگی میں بہتری لائے اور آبادی کے ایک کثیر حصے کے لئے فائدے مند ہو، کو ترک کر دیا گیا ہے اور اس کے مقابلے میں نہایت مہنگا، مخصوص افراد کی خاطر، بکثرت طرز عمل اپنایا گیا ہے۔

ایک اور نامناسب تعمیر گھر کیسیل کار پروجیکٹ ہے جس میں سواریوں کے لئے گھرگ سے کنگ ٹوری اور وہاں سے ابھڑت تک رستوں کے راستے روپ کی تعمیر کی جاتی ہے۔ اس پروجیکٹ کا مقصد سیاحت کو فروغ دینا تھا جب پروجیکٹ کو منظوری حاصل ہوئی تو اس کا تخمینہ ۴ کروڑ روپے تھا مگر اب جبکہ پروجیکٹ ابھی نصف ہی مکمل ہوا ہے اور اب اس کی لاگت تخمینہ ۸ کروڑ روپے ہے اور یہ لاگت مزید بڑھ سکتی ہے۔

اس بات میں شک ہے کہ یہ منصوبہ سودمند ثابت ہوگا۔ سماجی اور ماحولیاتی اعتبار سے پروجیکٹ کافی مہنگا ثابت ہوگا۔ اس پروجیکٹ کی عمل آوری کے دوران پہلے ہی مکمل طور پر بڑھے ہوئے ۲۵۴ درخت بھی کاٹے جا چکے ہیں۔ ہائی ٹینشن HIGH TENSION لائنیں پھانے نا اور کھینے نصب کرنے کے لئے مزید ایسے درختوں کو ذبح کر دیا جائے گا۔ بارش کے دوران کافی پانی بہے گا، زمین کاٹناؤ ہوگا اور زمین کھسک آئے گی۔ روپ وے میں بجلی کا بھی اچھا خاصہ صرف ہوگا اور گنڈوے کا شور گھرگ کے خاموش ماحول میں خلل پیدا کرے گا اس سے اس مقام کی خوبصورتی اور اہمیت کم ہوگی۔ مزید برآں سینکڑوں کی تعداد میں دو گھوڑے ٹٹو والے جن کا روزگار سیاحوں کو پہاڑوں پر لے جانے پر منحصر ہے وہ بے کار ہو کر رہ جائیں گے۔

یہ ایک المناک واقعہ ہے کہ جب مغربی ممالک ایسے پروجیکٹوں کو ترک کر رہے ہیں تاکہ ماحولیاتی اور قدرتی وراثت کا تحفظ ہو سکے اور ریاست جموں و کشمیر جیسی ریاستیں ایسے پروجیکٹوں کو بائٹھ میں لے رہی ہے۔ ایک آزاد اور ترقی یافتہ ریاست اپنا نام کی بجائے جو ریاست کی ہم آہنگی اور تمدنی وراثت کے مطابق ہوگا۔ ذہنی غلامی کا مظاہرہ کر کے اندھی تقلید کے راستے کو اپنایا جا رہا ہے۔ زندگی کے بہتر میدان کے حصول کے نصب العین کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ ذرا غور کیجئے اگر یہی ۸ کروڑ روپے کی رقم صاف شفا

پانی کی فراہمی یا بہتر محنت اور تعلیم کی سہولتوں پر خرچ ہوتی تو انفرادی شہری کی تخلیقی صلاحیت میں اضافہ ہوا ہوتا اور انہوں نے سماجی اور اقتصادی ترقی کے بہتر راستوں کی مثال پیش کی ہوتی۔

اس پر حیکمت شاید ہی کوئی اقتصادی یا مالی فائدہ ہو۔ اگر ہوا بھی تو اس پروجیکٹ سے بے ہولے لوگ مستفید ہونگے۔ چند ٹھیکیدار اور درمیاندار دولت کمائیں گے۔ اور اس گنڈوے کا استعمال کون کرے گا ہر شخص جو اس پر چڑھے گا اُسے ۵۰ روپے ادا کرنا ہونگے۔ اور پانچ افراد کے کنبے کو چسپاں ۵۰۰ ادا کرنا ہونگے۔ ایسے ہندوستانی کنبوں کی کیا شرح فیصد ہے جو ریاست میں اپنی سیاست کے لئے دوسرے اخراجات کے علاوہ گنڈولہ کے چکر پر ۵۰۰ روپے خرچ کر سکتے ہیں صرف تکریم ہانڈوں انے اور پرانے لوگوں کے کنبے اس قسم کی پراسود سوار کر سکتے ہیں۔ اس قسم کے پروجیکٹ صرف انہیں توکل کو فروغ دے سکتے ہیں جو رشوت کی جڑیں ہیں۔ اعلیٰ اخراجات کی طرف کشش کا بڑا انجنا پہوتا ہے۔ اور یہ سب سماج میں پیدا کیا جا رہا ہے۔

ترقی کے معاملے میں غلط ترجیحات اور طرز عمل سے عوام کے دلوں میں بھاری فصد اُبال کھارہا تھا۔ اس بات کو محسوس نہیں کیا گیا اور نہ ہی اس بات کو محسوس کیا گیا کہ قائد رستم جمار حانہ دخل اندازی جبر و استبداد کو جنم دیتی ہے۔ سینکڑوں کی تعداد میں گھوڑے اور ٹٹو والے جگرگ کے اس گنڈولہ پر ویکٹ کے سخت مخالف تھے کیونکہ اس سے ان کا یرینہ دھندہ ختم ہو رہا تھا اور ان کی آمدن لوٹی جا رہی تھی۔ اسی طرح صبح کے وقت سیر کرنے والے ہزاروں افراد طلباء اور اساتذہ جو سیر و تفریح کے لئے بچے فارسٹ آتے تھے اور فنکار اور دوسرے افراد کو اس مقام کی تباہی سے بھاری نفیس پہنچی ان کے جذبات کا احساس کرنا بھی لازمی ہے۔ جوان سال طلباء کا ایک گروپ میرے پاس ملاقات کیے آیا اور مجھے بتایا کہ ۲ اکتوبر ۱۹۸۶ میں انہوں نے جو پودے میری موجودگی میں لگائے تھے ان پر بڑے ڈنڈے چلا دیا گیا ہے۔ مجھے بھاری دھچکا لگا مگر میں نے اپنے جذبات کو عیاں نہ ہونے دیا۔ میں نے نومبر ۱۹۸۶ کے بعد بارہا وزیر اعلیٰ کے ساتھ اس بابت گفت و شنید کی تھی اور حسب معمول اس نے غصہ وعدے کئے اور بلا آنکھ جھپکائے اُن سے منکر گیا۔ اس کے ذہن میں یہ تاثر تھا کہ مرکز اس کی رپورٹ پر میرے تو جی کامرنگ رہے گا۔ پھر پچودہ مزید لاہروا اور غیر ذمہ دار ہو گیا۔ جو ختمے جو ان سال طلباء میرے پاس یہ شکایت لے کر آئے تھے انہیں میں انتخابی کمرسٹک گورنر راج کے خاتمے کے بعد میں شاید ہی اس معاملے میں کچھ کر سکتا ہوں اور جو مقروض بہت اس معاملے میں کر سکتا تھا۔ وہ میں نے وزیر اعلیٰ کو یہ مشورہ دے کر کر دیا ہے کہ کسی فارسٹ میں گھاس کے ایک تنکے کو بھی نہ چیرا جائے کیونکہ ایسا کرنا ایک نہایت مقبول اور قابل محبت پروجیکٹ کی تباہی کا مرتکب ہونا ہے اور اس سے ترقی و ترقی کا ایک وہ نمونہ واصل ہو جائے گا جو گجراتی سے قابل مطالعہ ہی نہیں بلکہ کم خرچ، سادہ اور قدرت کے ساتھ ہماری ہم آہنگی اور وراثت کی علامت ہے۔ بچوں کا ایک گروپ عیش میں آگیا اور پوچھنے لگا۔ جناب والدہ

کی اس شدت کو دیکھ کر حیرت ہوئی اور ان تمام مایوسیوں سے تحریب کاری کی ہر کوفروغ حاصل ہونا لازمی تھا۔ جو لوگ اس پاس راستے میں کھڑے تھے وہ ان بچوں کے اندرونی جذبات پر مزید فائدہ ہو گئے۔ بے یقینی کی اس ندی کے ساتھ کم و غصے کے چھوٹے چھوٹے نالے بھی شامل ہو گئے اور جلد ہی انہوں نے ایک طوفان کی صورت اختیار کر لی اور ندی اپنے کناروں سے گزرنے لگی اور ذی شہر قوتوں نے راستے میں جو بھی صفائی پیش بندیاں کی تھیں ان سب کو ہمارے لے گئی۔

علاقائی جڑیں

یہ محض ایک تاریخی حادثہ تھا جس کے سبب مختلف نسلی طبقے گذشتہ صدی کے پانچویں دہے کے دوران ڈوگرہ خاندان کے تحت آ گئے۔ جغرافیائی محل وقوع، زبانی نسل، مذہب اور تمدن کی وجہ سے وہ الگ حیثیت رکھتے تھے۔ جموں کشمیر اور لداخ میں نمایاں خطے ہیں۔ پہاڑی طبقوں کی خصوصیت گجروں سے مختلف ہے۔ بکر والوں کے رہن سہن کا اپنا خانہ بدوش انداز ہے۔ ہندوستان کی گونا گوں نمنی یکجہتی کے علاوہ ان طبقوں کے درمیان مشترکہ رشتہ یہ تھا کہ ان پر ہمارا راجہ کی مطلق العنان حکومت تھی۔

ہندوستان کے حصول آزادی کے موقع پر ان نسلی اختلافات کو دانشمندی، تعمیری قیادت اور بالغ نظری کے ساتھ ان کنڈا اختلافات کو کم ہوا کر کے ان کے لئے ایک نیا سماجی اقتصادی اور سیاسی ڈھانچہ تیار کیا جاسکتا تھا۔ وہ ڈھانچہ جس کی ان تنگ و تاریک کانوں کے مکینوں کے لئے نہایت ضرورت تھی تاکہ یہ پیچھے حال لوگ بھی آزادی کی دھوپ بھرے دن دیکھ سکتے۔ اس کے برعکس ایک مخصوص طرز کی جمہوریت کو فروغ دیا گیا جس سے ریاست علاقائی اور مذہبی اور نفعیوں کی آماجگاہ بن کر رہ گئی۔

جموں اور کشمیر کے دونوں خطوں کے درمیان رقابت اور شبہات کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ فساد پرستی کا پہلو بھی اپنا رول ادا کر رہا ہے۔ اکتوبر ۱۹۶۳ میں کشمیر کے مسلمان اماموں نے لاہور میں کوئٹہ صدر پیش کیں ان موصداشتوں میں الزام لگایا گیا تھا کہ "مذہب اسلام" کی توہین کی جا رہی ہے اور مسلمانوں کو تعلیمی اور ملازمتوں کی سہولیات سے محروم رکھا جا رہا ہے حالانکہ وہ سپریم کورٹ کی طرف سے مادی اور اخلاقی قوت کی ضروریات کو پورا کرنے کیلئے ہر دم تیار ہیں۔

چشمیتی سے عصر نو کے مختلف سیاست دانوں علاقائی اور مذہبی مسئلوں کو ابھارنے میں مصدلت خیال کرتے ہیں کشمیر خصوصاً نیشنل کانفرنس کے چند لیڈروں نے جب بھی کبھی دیکھا کہ وادی میں سپریم کورٹ سے ان کی مراد بڑا لڑی حکومت بند ہے۔

ان کی قیادت کو خطروہے تو انہوں نے وادی میں اپنی قیادت کو چمکانے کے لئے "جہول کا پتہ" پھینکا ہے۔ مثال کے طور پر شیخ عبداللہ کی طرف سے بہاراجہ ہری سنگھ کے خلاف بسا اوقات وادیلا معمولی آزادی کے بعد کے عرصے میں قطعی طور پر نامناسب، غیر ضروری اور بے معنی تھا۔ یہ اتنا ہی اس کے پاس غور کا آئینہ دار تھا جتنا کہ کشمیری ذہن پر اپنے غلطی کو تقویت دینے کے لئے حکمت عملی کی پیداوار تھا۔ اسی طرح جہول کے چند سیاستدان کشمیری پتہ "تھیل رہے ہیں۔ تاکہ اپنے علاقے میں اپنی ساکھ بنے چنانچہ ذاتی مفادات کے پیش نظر سیاستدانوں نے ریاست میں رواداری اور ہم آہنگی پیدا نہیں ہونے دی۔

ڈوگرہ جہول حکومت کے دوران متعدد جہول پر برطانوی ہند کے افسرانز تھے جن کی خدمات کو حاصل کرنے کے لئے بہاراجہ کو منایا گیا تھا۔ دیگر اہم جہول پر زیادہ تر وہ ڈوگرہ راجپوت فائزر تھے جو کہ حکمران خاندان کے قریب تھے۔ مسلم جاگیرداروں کے چند وفادار اراکین کو بھی شامل کیا گیا تھا۔ انگریزی تعلیم کے پھیلاؤ کے ساتھ اور نئی سیاسی میداری کے پیدا ہونے کے ساتھ جن کی تفاعل باب دوم "تاریخ کے جہول کے" میں دی جا چکی ہیں کشمیری مسلم زیادہ سرکاری ملازمتوں میں داخلہ دینے کا مطالبہ کرنے لگے۔ ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کے کشد اور عام بے چینی کے بعد برطانوی حکومت ہند کے دباؤ کے تحت بہاراجہ نے مختلف طبقوں اور فرقوں کی شکایات کی چھان بین کرنے کے لئے ایک کمیشن کا قیام عمل میں لایا اس کمیشن کا سربراہ ایک برطانوی افسر برٹرانڈ جے گوانسی تھا۔ اس کمیشن کی طرف سے فرقہ وارانہ اور علاقائی تفاوتوں کی تحقیقات کی گئی اس نے سفارش کی کہ ریاست میں تمام ملازمتوں کو شہر کیا جائے اور اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ سرکاری تقرریوں میں تمام فرقوں کو مناسب حصہ ملے۔ کمیشن نے یہ بھی سفارش کی کہ مقامی تقرریوں کے سلسلے میں متعلقہ ضلع کے افراد کو سب سے پہلے کیا جائے۔

گوانسی کمیشن کی سفارشات کی بدولت کشمیری مسلمانوں کو راحت نصیب ہوئی کیونکہ ریاست کا بنیادی مسئلہ اس کی اقتصادوی پسماندگی تھا۔ بہت کم ملازمتوں کی گنجائش تھی اور عوام کی امتیاز بھی پوری نہیں ہو سکتی تھیں۔ بے اطمینانی جاری رہی اور مختلف ایجنسیوں کی صورت میں اس کا اظہار ہوتا رہا۔ اکتوبر ۱۹۳۴ء کے بعد ریاستی حکومت پر کشمیری قیادت کو غلطہ حاصل ہو گیا اور اب یہ جہول کے لوگوں کے لئے نا انصافی کے احساس کی بازی تھی۔ انہوں نے محسوس کیا کہ کشمیر خطے کو خوش کرنے کے لئے ان کے جائز حقوق اور مفادات کو قربان کیا جا رہا ہے۔

جہول خطے میں مسلسل تعلیمی اور ہونے والی ایجنسیوں کے پیش نظر ریاستی حکومت نے ۱۹۳۶ء کو ایک کمیشن مقرر کیا جس کا نام گجیندر گڈ کر کمیشن تھا۔ اس کمیشن کے علاقائی تفاوتوں کا جائزہ لیا گیا ہے بتایئے کہ بڑا احکام کون ہے؟ گورنر یا وزیر اعلیٰ۔ آپ اسے کہیں کہ یہ بے راہ روی چند کردے اور ہمارے بوسے دوبارہ لگائے ورنہ ہمیں کچھ اور کرنے کے لئے مجبور ہونا پڑے گا۔ مجھے جذبات

مطالعہ کیا اور آئینی ریاستی سر قیاتی بورڈ اور تین خطوں۔ جہول، کشمیر اور لداخ کے لئے علاقائی سر قیاتی بورڈ قائم کرنے کی سفارش کی۔ اس کمیشن کا مشاہدہ تھا کہ جہول اور لداخ سیاسی و عروجیت کے شکار رہے ہیں۔ اس کا یہ بھی مشاہدہ تھا کہ اگر تمام مسائل کا حل یکساں طور پر کر دیا جاتا ہے تو یہ کچھ حد تک سیاسی بے چینی بھی برقرار رہے گی حتیٰ کہ مختلف علاقوں کے سیاسی اہلکاروں اور احساسات کو پورا کیا جائے۔

ان میں سے بیشتر سفارشات کو یا تو منظور نہیں کیا گیا یا انہیں رو بہ عمل نہیں لایا گیا جو سفارشات رو بہ عمل لائی گئیں وہ نہایت بے دلی کے ساتھ زیر عمل لائی گئیں۔ شیخ عبداللہ نے خود بھی اس رپورٹ کی مذمت کی و نتیجے کے طور پر جہول کے باشندوں کے دلوں میں شکایات بڑھتی رہیں۔ دسمبر ۱۹۴۸ء کے دوران پوچھ راجہ جاری اور جہول میں طلبہ کے غم و غصے کے باعث تشدد ہوا۔ کرنیو نافذ کرنا اور فائزرنگ کرنا پڑی۔ ۲۶ دسمبر ۱۹۴۸ء کو ایک کل جماعتی جہول ایکشن کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا تاکہ جہول خطے کی شکایات کا ازالہ کرنے کے لئے ایک ایجنسی شروع کی جاسکے۔ شیخ عبداللہ پر الزام لگایا گیا کہ انہوں نے جہول کے جبر و استبداد کا ایک دور شروع کیا ہے۔ اس معاملے پر عوامی ایجنسی کمیشن ۹ دن تک جاری رہی۔ بخاری مزاج میں حرارت کو سرد کرنے کے لئے حکومت نے ایک اور کمیشن مقرر کر دیا۔ ایس۔ ایم سیکری کی سربراہی میں مقرر کیا جو ہندوستان کے ریٹائرڈ چیف جسٹس تھے اور اس کمیشن کے زیر نظر معاملات بھی گجیندر گڈ کر کمیشن کے ساتھ مطابقت رکھتے تھے۔ اس کمیشن نے ۲۵ اگست ۱۹۸۰ء کو حکومت کو پیش کی۔ مگر اس کی سفارشات کا بھی وہی حشر ہوا جو کہ اس سے قبل قائم کئے گئے کمیشن کا ہوا تھا۔

اس سے الگ طور پر نئے اصطلاح کے مقام کا معاملہ بھی ہماری اختلاف رائے کا موجب بن گیا۔ اکتوبر ۱۹۴۲ء میں ریاستی حکومت نے خائن شل کمیشن ایس۔ ایس۔ ایس قادری کی سربراہی میں ریاست کی دو ڈویژنوں کے لئے دو کمیٹیوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ان کمیٹیوں کی سفارش تھی جہول یا کشمیر ڈویژن میں کسی نئے ضلع کا قیام عمل میں نہ لایا جائے۔ بریک جولائی ۱۹۴۹ء کو ریاستی حکومت نے وادی کشمیر میں اچانک تین ضلعات بنڈگام، پلہاماد و کپواڑہ قائم کرنے کا فیصلہ کر دیا اور لداخ میں کرگی کا نیا ضلع قائم کیا گیا۔ ریاستی حکومت کا یہ فیصلہ کیڑا قرار جاننا راجہ تصور کیا گیا۔ جہول خطے میں اس کے بعد متعدد ایجنسیوں میں جس میں کنوڑا کی طویل ایجنسی ٹیشن بھی شامل ہے۔

۱۲ نومبر ۱۹۸۱ء کو ریاستی حکومت نے ایک اور کمیشن جہول و کشمیر ہائی کورٹ کے ریٹائرڈ چیف جسٹس جے این وزیر کی سربراہی میں ان سوالات کی چھان بین کے لئے قائم کیا۔ اس کمیشن نے جہول خطے میں تین نئے ضلع کشتواڑ، مسابندہ اور ریاستی قائم کرنے کا فیصلہ کیا نیز کشمیر وادی میں بانڈی پور کا نیا

ضلع قائم کرنے کی سفارش بھی کی گئی چونکہ اس کمیشن کی سفارشات جموں خطے کے تین میں تھیں چنانچہ یہ تابع عمل رہیں حالانکہ ان سفارشات کو جو جنوری ۱۹۸۳ء کے بعد کافی عرصہ گزر چکا ہے۔

اس پس منظر میں جموں کے باشندوں کو شکایات تھیں اور انہیں انھیں پھیس پہنچتی تھی۔ شکایات کی یہ فہرست دن بدن طویل ہوتی جا رہی ہے۔ اس خطے میں پانی جانے والی خشکی مایوسی عام طور پر علاقائی ایجی ٹیشنوں کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں ایک ایجی ٹیشن دربار موڈ (۱۹۸۷ء) اور دوسری ریاسی ضلع قائم کرنے کے لئے ایجی ٹیشن خصوصاً قابل ذکر ہیں۔

اکتوبر ۱۹۸۷ء میں ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی حکومت نے ریاستی حکومت کے سیکرٹریٹ اور دوسرے دفاتر کو سرینگر سے جموں منتقل کرنے کے بارے میں طرز عمل میں اچانک تبدیلی کی۔ اس تبدیل شدہ طرز عمل کو قبول عام میں "در بار موڈ (URBAR MOVE) کہا جاتا ہے اس فیصلے کے نتیجے میں ایک بڑی ایجی ٹیشن ہوئی جس کے نتیجے میں بہت سارے دوسرے مسائل پیدا ہو گئے۔

"در بار موڈ" کا یہ سلسلہ ۱۸۷۰ء سے چل رہا ہے۔ جموں کے عوام نے اس فیصلے کو ان کے خلاف شدید امتیاز کی صورت میں محسوس کیا انہیں خدشہ تھا کہ یہ فیصلہ سرینگر کو ریاست کا مستقبل دارا حکومت قائم کرنے کے لئے پہلا قدم ہے اور اس سے جموں خطے کی اقتصادیات کو نقصان پہنچے گا۔

ظاہری طور پر یہ فیصلہ وزیر اعلیٰ نے اس معاملے پر سنجیدہ غور و خوض کے بغیر کیا تھا اور اس مقصد کے لئے کامیاب کے لئے مناسب ایجنڈا نوٹ بھی تیار نہیں کیا گیا تھا۔ جس جلد بازی سے اس فیصلے کا پریس میں اعلان کیا گیا اور جس انداز میں پریس نوٹ کے الفاظ تھے ان میں چند پہلوؤں کو نظر انداز کر کے دیگر پہلوؤں پر زور دیا گیا تھا اس سے یہ غلطی اور بھی سنگین صورت اختیار کر گئی اور جموں کے عوام میں یہ تاثر دیا گیا ان کے مفادات کو قدرے بے دھڑک انداز میں بالائے طاق رکھ دیا گیا ہے اور ڈاکٹر فاروق عبداللہ اپنے تنگ نظر سیاسی مفادات کو پورا کرنے کے لئے کشمیر کے عوام پر کھلے عام کرم فرمائی کر رہا ہے۔

یہ ایجی ٹیشن قریباً چار ہفتے تک جاری رہی جس کے دوران جموں اور جہلم خطے کے متعدد قصبوں میں مکمل بند رہا۔ طلباء کا اندر بھی بھاری بے چینی تھی لہذا ریاستی حکومت نے تعلیمی اداروں کو غیر متین عرصے کے لئے بند کر دیا۔ جموں کے عوام کی طرف سے جس یکجہتی کا مظاہرہ کیا گیا اور اس فیصلے کے خلاف وزری کے سخت رویے کے پیش نظر مرکزی وزیر داخلہ یو۔ ٹی۔ سنگھ ۱۲ نومبر کو سرینگر گئے تاکہ وہ وزیر اعلیٰ کے ساتھ اس معاملے پر تبادلہ خیالات کر سکیں اس کے فوراً بعد وزیر اعلیٰ نے اس فیصلے کو منسوخ کرنے کا اعلان کر دیا۔

اگرچہ حکومت کی طرف سے جموں کی توں حالت برقرار رکھنے کے احکامات سے کشمیریوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تاہم عوام کے ایک طبقے نے غصے اور طیش کا اظہار کیا سرینگر بار ایبوسی ایشن نے بقول اس کے

جموں کے ایجی ٹیشن کرنے والوں کے سامنے حکومت کی طرف سے جھکنے کے خلاف بند کی کال دی۔ بند کی اس کال کو بھاری حمایت حاصل ہوئی اور اس روز چند ناخوشگوار واقعات بھی پیش آئے۔ اس کے بعد چار روز تک سرینگر میں تشدد کے اگاد کا واقعات پیش آتے رہے۔

اگرچہ یہ ایجی ٹیشن پانچ ہفتوں کے بعد ختم ہو گئی مگر اپنے پیچھے یہ تلخیاں چھوڑ گئی جس کی بنا پر ریاست کے دونوں خطوں کے درمیان تناؤ بڑھ گئے۔ قومی مفادات کو نقصان پہنچا اور تنگ نظری کو قومیت حاصل ہوئی۔ علاقہ پرستی کی جڑیں گہری ہو گئیں اور جموں میں پر جا پریش کی ایجی ٹیشن کی پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ یہاں تک کہ جموں کی الگ ریاست کا مطالبہ اب سنجیدگی سے پیش کیا جانے لگا۔

اس فیصلے سے کشمیر کے انتظامیہ کی طرف سے فیصلہ لینے کے عمل کے سلسلے میں ناہنجنگی اور قطعیت کی جھلک ملتی ہے۔ اگر یہ فیصلہ جلد بازی میں نہ ہوتا، اس کے مثبت اور منفی پہلوؤں کا قبل از وقت اندازہ کیا گیا ہوتا اور اگر ایک معمولی سمجھ رکھنے والے شخص نے اس امر کی پیچیدگیوں پر غور کیا ہوتا تو بعد ازاں جو بھاری مسائل پیدا ہوئے ان سے گریز کیا جاسکتا تھا۔

"در بار موڈ" کے بارے میں یہ فیصلہ افسوسناک امر تھا اور اس کا عمل و موقع نہایت نامناسب تھا۔ یہ ایک المناک واقعہ تھا کہ جب ریاستی حکومت خشک سالی اور کئی دوسرے ترقیاتی مسائل سے تڑپ رہی تھی تو اس کا وقت اور قوت ایجی ٹیشنوں پر ضائع ہوا اور یہ قابل گریز تھا۔ یہ مشاہدہ کہ ہمارے ملک کے اقتصادی مستقبل پر لرزاں سیاست کے سوائے کوئی امر بھی اثر انداز نہیں ہوگا۔ اس وقت جو ریاست میں صورت حال پیدا ہوئی یہ بات اس سے عیاں ہے۔

دوسری ایجی ٹیشن ریاسی کا الگ ضلع قائم کرنے کے لئے شروع کی گئی پہلے بھی بتایا جا چکا ہے کہ وزیر کمیشن نے ریاسی کو ایک الگ ضلع بنائے جانے کی سفارش کی تھی مگر سفارش عدم تفصیل رہی چنانچہ ستمبر اکتوبر ۱۹۸۸ء میں ایجی ٹیشن شروع کی گئی۔ پہلے دس روز کے دوران حکومت نے کوئی کارروائی نہیں کی۔ اور قریباً اپنی اتھارٹی سے دست بردار ہو گئی۔ ایجی ٹیشن کرنے والوں نے ریاسی کو ایک ضلع بنائے جانے کا اعلان کر دیا اور انہوں نے نہاد چٹی کشمیر مقرر کر لیا۔ بعد ازاں ان لیڈروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ یہ ایجی ٹیشن دو ماہ تک جاری رہی "ہڑتالیں" اور "دھرنے" اس ہڑتال کے معمولات میں شامل تھے۔ حکومت کی طرف سے چند یقین دہانیوں کے بعد اس ایجی ٹیشن کو معطل کر دیا گیا۔

اکتوبر ۱۹۸۷ء کے بعد جموں خطے میں یہ احساس پیدا ہوا ہے کہ وادی کی طرف سے ریاست پر غلبے کے نتیجے میں جموں کے خطے کے ساتھ بھاری نا انصافی ہوئی ہے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہتا ہے کہ مرکزی قیادت وادی کو فوش کر رہی ہے اور کشمیر کے حق میں متعدد فیصلے کئے گئے ہیں جبکہ جموں کے خطے کی حق تلفی کی گئی ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان میں سے زیادہ تر شکایات بجا اور جائز ہیں۔ میں نے آئندہ باب

میں اس معاملے میں دفعہ ۴۰ کے بے جا استعمال کا تجربہ کیا ہے۔ اس بات میں بہت معمولی جواز معلوم ہوتا ہے کہ خالص کثیر میں ۳۱۰۰۰ کی آبادی کے لئے قانون ساز اسمبلی کی ایک نشست اور جنوں خطے میں ۹۰۰۰۰ کی آبادی کے لئے ایک نشست ہے۔ نہ ہی یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اہم اداروں اور پروجیکٹوں کے معاملے میں غیر مناسب تقسیم کی گئی ہے۔ انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز، انجینئرنگ کالج، ڈنیل کالج، زرعی یونیورسٹی و میجرز کالج، کنولشن ہال، کیبل کارپرو جیکٹ وغیرہ داخلین مقیم ہیں۔ رقوم کی تقسیم کا منصوبہ بھی غیر منصفانہ ہے۔ دو دھان پروجیکٹ — کیبل کارپرو جیکٹ اور سری نگر کالف کورس پروجیکٹ سری ۵۰ کروڑ روپے صرف کئے جا چکے۔ اس کے مقابلے میں جنوں کی ڈوگرہ آرٹ گیلری جس میں فن کے فنون لطیفہ کے نادر نمونے ہیں، فن تعمیر کی اعلیٰ قدروں کی علامت قدیم محلات نہایت کمبری کی حالت کے شکار ہیں۔ وادی میں ترقی کی ضروریات کو ہرگز کم نہیں کیا جاسکتا مگر یہاں اس بات کو بھی ہرگز فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ علاقہ قابلِ امتیازات سے سنگین تناؤ پیدا ہوتے ہیں اور یہ قانون انتظام کے مسئلوں کو جنم دیتے ہیں اور ان مسائل سے نمٹنے میں ریاست کے بیش قیمت ذرائع صرف ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ اس سے تیز تر ترقی اور زیادہ پیداوار حاصل کرنے کی عام صلاحیت میں کمی واقع ہوتی ہے۔

لداخ

جب ۱۹۴۷ء میں باقی ہندوستان آزادی کی خوشیاں منا رہا تھا لداخ لداخانی خود کو آسمان سے گرا کھو رہا دکھانے کے مصداق محسوس کر رہے تھے۔ ہندوستان کے آزاد فرزند بننے کی بجائے انہیں حکومت جنوں و کشمیر کے سوتیلے سلوک پر چھوڑ دیا گیا یہ وہ جذبات اور علاقائی مایوسیوں اور تنہاؤ میں جن کا احساس عہدِ نو کے لداخ میں پایا جاتا ہے۔ اور مختلف اوقات پر پیش کی گئی یادداشتوں میں اثر نہیں دہرا لگتا ہے۔ مارچ ۱۹۹۰ء میں لداخ بھٹ ایسوسی ایشن نے کہا: "گاندھی جی اور دوسرے ہندوستانی لیڈروں نے ہندوستانی عوام کو مطلق العنان اور نوآبادیاتی نظام کے جبر و استبداد اور غیر ملکی استعمار سے نجات دلائی مگر ایک نمایاں شناخت کے مالک ہم لداخانی عوام کو کشمیر پول کے استبدادی غلبے کے تحت جھونک دیا گیا آزادی کے ثمرات سے ہم محروم رکھا گیا آزادی کے گذشتہ بیالیس برسوں کے دوران ہم نے ہندوستان کی کشمیری غلبے کا شکار ہونا پڑا ہے بلکہ علیحدگی پسندی کے نشیب و فراز بھی دیکھنا پڑے ہیں۔"

باب دوم: بنوانہ تاریخ کے جھروکے سے "میں ذکر کیا گیا ہے کہ لداخ ایک کم آباد علاقہ ہے۔ اس کا رقبہ جنوں اور کشمیر کے مجموعی رقبے سے دوگنا ہے۔ اس کا رقبہ ۹۸۰۰۰ مربع کلومیٹر ہے جہاں کی اوسط بلندی ۴۰۰۰

میٹر ہے۔ ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی ۱۰۲۰۰۰۰ افراد پر مشتمل ہے۔ اس کی طویل سرحد چین اور پاکستان کے ساتھ ملتی ہے۔ چنانچہ دفاعی لحاظ سے اس کا محل وقوع نہایت اہم ہے۔

لداخ کی خوبصورتی بھی مغرب ہے۔ یہاں پر خاموشی کی اپنی کشش ہے۔ بحر اور نظیر سموار علاقے کی اپنی سی شان ہے۔ نداریت کا وسیع عالم ذہن پر اپنی چھاپ چھوڑتا ہے۔ انسانی ظہور کے ایک غیر معروف پہلو کا بھی یہ علاقہ علامت ہے اور انسان کے لئے یہ ایک عجیب و غریب تجربہ ہے۔

لداخ کے اس منظر میں درختوں کا قطعی فقدان ہے ماسوائے اس علاقے کے جہاں دریائے سندھ اور دوسری ندیوں کا پانی رواں دواں ہے۔ یہاں پر سفیدے اور پید کے درخت اُگتے ہیں۔ اس علاقے کے چند حصوں میں بھاری برف پڑتی ہے۔ اور یہ دنیا بھر میں دوسرا سوترین مقام ہے۔ یہاں پر درجہ حرارت گریڈ زیر صفر منفی ۴۰ گریڈ سینٹی گریڈ تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پر انٹارکٹک تک جانے والے ہندوستانی ہم کے کچھ اراکین کو آب و ہوا کی موافقت یہاں پر فرما، ہم کی گئی تھی۔

لداخ میں بہت کم بارش ہوتی ہے۔ سال بھر میں ۲۰۰ دن دھوپ نکلتی ہے۔ سائے میں شدید سردی کا احساس ہوتا ہے دھوپ کی گرمی بہت تیز اور ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔ اگر کوئی اپنا سردھوپ اور پاؤں چھانک میں رکھ کر کسی پر بیٹھا ہو تو سر پر سلطان ہو سکتا ہے جبکہ پاؤں میں برقی کبرا کاٹ سکتا ہے۔

لداخ کی مطابقت چاند کی دھرتی سے ہے۔ پہلی مرتبہ لداخ کا دورہ کرنے کے بعد میں اپنے دوستوں کے ساتھ مذاق سے کہا کرتا تھا کہ امریکیوں نے لاکھوں ڈالر صرف کر کے آرم سٹر انک کو چاند تک بھیج کر سبجاری غلطی کی انہیں اسے لداخ بھیجنا چاہیے تھا۔ نہ صرف اس نے چاند دیکھا ہوتا بلکہ اس علاقے کو کم دشوار پایا ہوتا۔

لداخ کے لیے علاقے میں بودھوں کی اکثریت ہے اور اس کی آبادی ۶۰۰۰ نفوس پر مشتمل ہے۔ بہت کے مقابلے دلائل لامہ کی یہاں زیادہ عزت کے مقابلے ہے۔ اس علاقے کو — تبتی بودھ مت کا خارجی مورچہ کہا جاسکتا ہے۔ چند مشاہدین کے مطابق تبت — بودھ مت یہاں زیادہ مضبوط ہے۔ مگر یہاں اکثریت شیعہ مسلمانوں کی ہے۔ نظریات میں وہ از حد قدامت پسند اور سخت تحفظ میں۔ منگول تراچھو، گامگی، بروکسپا اور مانگرک نسلوں سے آئے ہیں۔

یہ بدقسمتی کی بات ہے کہ چاند کی یہ دھرتی جہاں دور دور تک خلائی جہازاں بھی موجودہ دور کی سیاست کے زیرِ غلبے اثرات سے پنج نہیں پائی جو لائی تا اکتوبر ۱۹۸۹ء پر دور افتادہ علاقہ جہاں کے لوگ "خوش مزاج" تک خلیہ ہمیشہ سے نہ کہ جھگڑنے کے لئے مشہور، مقرر دیے جاتے تھے انہیں بھی ایک طویل اور بعض اوقات مشدد

۱ فریڈرک ڈیوینے کی کتاب "ناردرن فریڈرک آف انڈیا" میں یہ تفصیل بیان کی ہے علاوہ ان میں ملاحظہ ہو باب دوم "تاریخ لداخ"۔

ایچی ٹیشن کا سامنا کرنا پڑا اس ایچی ٹیشن کی قیادت لداخ بدھ صٹ ایسوسی ایشن نے کی تھی۔

ایچی ٹیشن کو جائز قرار دیتے ہوئے لداخ بوجھوں نے کہا "آج لداخ کے عوام یہ محسوس کرتے ہیں کہ دیرینہ تمدنی وراثت شرافت اور وفاداری کو بزدلی اور لاپرواہی سمجھنے کی جسارت کی جا رہی ہے۔ آخر کار انہوں نے ایک ایچی ٹیشن شروع کی جو کسی مذہبی فرقے کے جموئی طور پر خلاف نہیں بلکہ "لیبر" میں تمام جھگڑوں اور فسادات کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ حکومت کشمیر ان تمام بدعتوں کا منہ نہ ہے" ایسوسی ایشن نے الزام لگایا ہے "حالانکہ لداخ ۳۲ برس کے تمام تر عرصے کے دوران امتیازی سلوک کے شکار رہے مگر ۱۹۷۵ء میں شیخ عبداللہ کی اقتدار میں واپسی کے بعد یہ امتیاز واضح طور پر موجود ہے۔ ظاہری طور پر ایک سیاسی تفرقہ کھڑا کیا گیا جس سے وہ لہجہ اور کرکھ کو الگ کر کے دو ضلع میں تقسیم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ کرکھ کو لیبر سے الگ کرنے میں شیخ عبداللہ کا وہ ارادہ مضبوط تھا جس کے تحت وہ کرکھ کے عوام کو یاد دلانا چاہتا تھا کہ شیعہ اکثریت ہونے کے سبب تاریخی اور تمدنی رشتے اسلامی طرز سیاست میں غیر اہم باتیں ہیں اور وہ ریاست پر اس کو ٹھونس رہا تھا۔ جب ڈاکٹر فاروق عبداللہ اقتدار میں واپس آیا تو حکمہ امور لداخ کو ایک غیر فعال محکمہ بنا کر رکھ دیا۔"

ایسوسی ایشن نے واضح کیا کہ حکومت ہند نے ہماری ہمدردی لانے بغیر عزمی کا کبھی مثبت جواب نہیں دیا۔ اس کی بجائے ان دنوں کے دوران انہوں نے ہم پر کشمیریوں کو قحوپ دیا اور ہم پوری طرح تباہ ہو کر رہ گئے۔ آزادی کے بعد ہمارا مزہ اپنی ہی گھر میں غلاموں کا سامنا کرنا کھنا لگایا ہے۔ حکومت کشمیر کی استبدادی حکومت کے زیر اثر ہماری سماجی اور تمدنی قدریں ملیا میٹ کر دی گئی ہیں۔"

بودھ محسوس کرتے تھے کہ ان کے ساتھ سوخی مال جیسا سلوک کیا جا رہا ہے اور ریاستی حکومت ایچی اقتصادنی تعلیمی اور انتظامی ضروریات کو نظر انداز کر رہی ہے۔ انہوں نے واضح کیا کہ لداخ کے متعدد سکولوں میں پاس ہونے والے طلباء کی شرح فیصد صفر ہی کیونکہ ریاستی حکومت نے اساتذہ کی آسامیاں پُر کرنے کی ابھی پروا نہیں کی اُردو و کسرکاری زبان کے طور پر پڑھنا لکھنا اور بوجھی کو نظر انداز کر دیا گیا۔

ایسوسی ایشن نے یہ بھی الزام لگایا کہ مسترد امیر اور بارہ سوخ کشمیری تاجروں نے لداخ میں آثار قدیمہ کی دوکانیں کھولی ہیں تاکہ لداخ میں آثار قدیمہ کی چوری جیسے بھری کی جائے اس سے نہ صرف یہاں کے تمدنی اثاثے کا ناکس ہوا بلکہ ان تاجروں نے وہ چند مواقع بھی چھین لئے جو اس خطے میں موجود ہیں۔

لداخ بدھ صٹ ایسوسی ایشن نے زور دار شکایت کی کہ دفعہ ۳۰ پر یقین دہانی حاصل ہو جانے کے بعد کشمیریوں نے اب بودھوں کی حقیر آبادی کو اپنے مناسبات کا نشانہ بنایا ہے جس کا مقصد اس آبادی کو اسلامی اعتقادات میں لانا ہے۔ کشمیری مسلمانوں سے منسوب ریاستی حکومت بودھوں کو مذہب تبدیل کر کے اسلام قبول کرنے کی تلقین جو صلا افزائی کر رہی ہے اس کے پس پردہ مدعا یہ ہے کہ آبادی کے توازن کو مسلمانوں کے حق

میں کیا جائے۔ حالیہ برسوں کے دوران تبدیلی مذہب نے تشویشناک ہیئت اختیار کر لی ہے۔ ریاستی حکومت نے بنیاد پرست اسلامی عناصر کی حوصلہ افزائی کی ہے جو تبدیلی مذہب کی پیہم ہم چلائے ہوئے ہیں۔ دولت کی قلت اور معرکہ پر و پیگنڈہ کو بروئے کار لاکر انہوں نے سینکڑوں کی تعداد میں بودھ لڑکیوں کو اسلام قبول کر لیا ہے۔ تبدیلی مذہب کے پس پردہ لداخ کو اسلامی رنگ دینے کا مقصد کارفرما ہے تاکہ وادی کے علاقہ نگ پسند ریاست کو مستحکم بنایا جاسکے۔

شدید غصے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ چند کشمیری اضروں کی تقرری کر کے کشمیری سنی مسلمانوں کے ایک چھوٹے سے فرقہ انغورا کے ساتھ ایک ٹھکانہ جوڑ قائم کیا گیا تھا۔ یہ سرکردہ تاجر لداخ میں برسوں پہلے آکر آباد ہوئے تھے۔ حکومت اور اس فرقے کے گٹھ جوڑنے کے منصوبے باقی رقوم دہشتے کا ناجائز استعمال کیا اور لداخ کی جو تھوڑی بہت ترقی ہو سکتی تھی اس سے بھی اسے محروم رکھا۔

لداخوں کی ایک شکایت یہ تھی کہ ۱۹۸۹ء میں ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی وزارت میں ۳۰ وزیر تھے مگر ان کے علاقے سے ایک بھی نہیں تھا۔ انہوں نے متعدد دو و غیر سوالات بھی اٹھائے۔ حکومت کے پاس سیاست بجلی اور باغبانی جیسے شعبہ کارہ کیے کے ضلع منصوبے میں شامل کرنے کا کیا توازن ہے جبکہ دوسرے اضلاع کے لئے یہ رقوم ریاستی شعبے سے حاصل ہوتی ہیں۔ یہ بات بھی کیسے ہوئی کہ گذشتہ ۳۴ برسوں کے دوران عالمی بینک کی امداد سے سوشل فارمسی سکیم کے لئے ۴۴ کروڑ روپے حاصل ہوئے اور لیبر ضلع کو اس میں شامل نہیں کیا گیا۔ اعلیٰ سطح پر مقامی اضروں کو لداخ میں تعینات نہیں کیا جاتا ہے اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہ غیر وابستہ نہیں ہوں گے۔ گمرکی میٹار کشمیر میں کیوں نہیں برتا جاتا جہاں بالکل برعکس میٹارات اختیار کئے گئے ہیں۔" جیسا کہ آئندہ باب میں بیان کیا گیا ہے کہ ریاست کے بہت سارے مسائل دفعہ ۳۰ کے ناجائز استعمال اور کشمیریوں کے اس مزاج سے پیدا ہوئے ہیں کہ ریاست میں اقتدار کے ڈھلچے کو وادی کے مفادات کے مطابق ڈھالا جائے۔

لداخ کی خاص ضروریات کی چشم پوشی کی گئی ہے۔ جب میں نے ۱۹۸۴ء میں پہلی مرتبہ اس علاقے کے دور افتادہ اور قرباناقابل راعلاقوں بشمول چشول پانگ لائنگ جمیل رنگا راوڈی برا کور و کیا تو مجھے ایک بات محسوس ہوئی کہ اس غیر معمولی ماحول میں انتظامی مشینری معمول کے انداز میں کام کر رہی ہے۔ انتظامیہ کا طرز عمل لگ بھگ دوسرے اضلاع سے مطابقت رکھتا تھا۔ بہر حال پہلو کے قطع نظر تھا کہ ماحول کی مشکلات اور حیوانات کے حالات اس دور افتادہ علاقے میں بالکل مختلف تھے۔ یہاں پر موجود فوج کی امداد نہ ہوتی تو یہ لوگ نہایت قدامت کی زندگی بسر کرتے اور موجودہ دور میں ایک شہری حکومت کی طرف سے جو سہولیات فراہم کی جاتی ہیں۔ وہ ان سے محروم رہ جاتے اور موتی حالات کے رحم و کرم پر بھی انہیں زندہ رہنا پڑتا۔

اس میں حیرت نہیں کہ متعدد ترقیاتی منصوبے کئی دہوں سے زیر عمل چلے آ رہے ہیں۔ سنگنہ بائینڈل پر و جسٹ

۲۰ برس قبل شروع کیا گیا تھا اور جب میں نے یہاں کا دورہ کیا تو اس پروجیکٹ کا اچھا خاصہ حصہ ابھی مکمل کیا جانا تھا۔ شمالی کمان کے کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل ایم۔ ایل جھبیر نے مجھے بتایا کہ جب وہ اس علاقے میں کپٹن کے عہدے پر کام کر رہا تھا۔ تو اس پروجیکٹ پر کام شروع ہوا تھا اور اب جبکہ وہ آرمی کمانڈر بن چکے ہیں۔ یہ کام ابھی تک چل رہا ہے۔ ۱۹۸۶ء میں گورنری راج کے دوران میں نے لداخ کی خصوصی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے چند اقدامات کئے۔ البتہ قصبے میں شہری ترقیات کے کاموں کو سرانجام دینے اور شہری خدمات کی جدید کاری کے لئے لپیڈ ڈویلپمنٹ اتھارٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس اقدام کا مقصد سیاتوں کی مدد و رفت کو فروغ دینے کے لئے اس قصبے کو صاف اور نئی صورت دینا تھا۔ لداخ کے لئے ایک کل وقتی چیف انجینئری تفری کی گئی اس عہدے کے لئے ایک لداخی انسداد کو منتخب کیا گیا۔ وہ کافی مقبول تھا اور اسے دیانتداری خودی اور علاقے کے مسائل کی عینیت واقفیت کے بارے میں کافی شہرت حاصل تھی "تیز دھوپ اور شدید سردی، ایکٹیلے خاص طور پر موافق ملکیت کا ایک منصوبہ تیار کیا گیا تھا ڈرامے وال سسٹم PROMBEE SYSTEM کو بروئے کار لاکر ۲۰ گھروں کی تعمیر شروع کی گئی جو دن کی گرمی اور رات کی سردی کیلئے موافق تھے۔

مقامی زبان اور ادب کو فروغ دینے کے مقصد سے محول اور کشمیر یونیورسٹیوں سے کہا گیا کہ وہ لداخی مطالعات کے الگ شعبوں کا قیام عمل میں لائیں۔

لداخ میں ماحولیات، جنگلات اور حیوانات کے بارے میں خصوصی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ایک غیر سرکاری رضا کارانہ تنظیم "لداخی کالجیکل سوسائٹی" کی توجہ افزائی کی گئی تاکہ وہ اپنی سرگرمیوں کو چند مزید مدد کے بارے میں وسعت دے سکے۔ ماحولیات سے متعلق مرکزی حکمہ بھی وسیع پیمانے پر اس کام میں شامل کیا گیا۔ میں نے چند طویل مدتی سیکس تیار کی تھیں جن میں دور افتادہ علاقوں کی انتظامی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اداراتی تبدیلیاں شامل تھیں مگر سری نگر اور دہلی میں سرگرم عمل سیاسی عناصر کے طفیل گورنر راج کو اچانک ختم کر دیا گیا اس سلسلے میں نہ صرف اداراتی تبدیلیوں کے منصوبوں کو ترک کر دیا گیا بلکہ خاموشی کے ساتھ چند ایک فیصلوں کو الٹ دیا گیا۔ مثال کے طور پر چیف انجینئر دادا کو تبدیل کر دیا گیا جس سے لداخیوں میں بھاری رنجش پیدا ہوئی۔ بعد ازاں دادا نے استعفیٰ دے دیا۔

دادا کے ساتھ جو سلوک کیا گیا وہ لداخی بدھسٹ ایسوسی ایشن کی طرف سے ۱۹۸۹ء میں چلائی گئی متشدد احتجاجی مہمیں کا پس پردہ محرک تھا۔

پس یہ ظاہر ہوا کہ ریاست کو درپیش چند سنگین مسائل علاقائی جڑوں سے پیدا ہوئے ہیں جیسا کہ میں نے اس کتاب کے نڈشتہ باب میں اشارہ دیا ہے کہ تعمیری اور تخلیقی کام سرانجام دینے، ایسی تبدیلیاں، اصلاحات اور جدید کاری لاسے جنکی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کی جا رہی ہے۔ کے لئے ایک خاص قسم کی ذہنی تربیت اور جذبہ کی ضرورت ہے اگر اس کا فقدان ہو تو مختلف خطوں میں رواداری کو فروغ نہیں مل سکتا۔ اس کے

برعکس صورت حال ابتر ہوتی چلی جائے گی۔ پہلے ہی لداخی بدھسٹ ایسوسی ایشن مرکزی درجے کے لئے ایک ایجنسی ٹیشن شروع کرنے والی ہے کشمیر وادی میں روٹنا ہونے والے واقعات کے رد عمل کے طور پر محول میں یہ کسی وقت بھی شروع ہو سکتی ہے۔ ان حالات میں علاقائی منافرت و رش میں حاصل ہوئی ہے بدقسمتی سے اولیٰ سیاست نظر یاتی فقدان اور جڑوں کی تہہ تک پہنچنے سے انکار کے باعث بہت سے تکرار پیدا ہو سکتے ہیں۔

خونی ندی

میں نے ان پوشیدہ ریشوں کی نشاندہی کی ہے جس میں سے کشمیر کی سیاسی اور سماجی زندگی کی خونی ندی رواں دواں ہے۔ میں نے اس کام میں ایک یونانی مورخ پالیس کے مقالے کو ذہن نشین رکھا ہے۔ جس نے دوسری صدی قبل مسیح میں کہا تھا "اگر آپ ذرا غ سے اپنی اہمک وجود اصولوں اور مقصد کی تشریحات کو نکال دیں گے۔ تو جو منظر پیش آوے گا وہ سبق آموز نہیں ہوگا۔ اگرچہ علمی طور پر ریووش آئندہ ہوگا، مگر اس کی کوئی دائمی وقعت نہیں ہوگی۔"

دہشت گردی کی جڑیں: دفعہ ۳۷۰

آں ہمے بے اقتدار سبھی کچھ ہے، انصاف اور جانبداری
کی کوئی وقعت نہیں۔ انھوں نے ایسی سر زمین پیدا
کی ہے جہاں انصاف نہیں۔ یہ سر زمین کو ختم کی اور
نصاحات سے بھر پور ہے۔“

مصنف کی ڈاٹری
(۱۵ اگست ۱۹۸۶ء)

کشمیری علیحدگی پسندی اور اجنبیت کی ایک مضبوط ترین جڑ آئین ہند کی دفعہ ۳۷۰ میں مضمر ہے جس کے تحت اس ریاست کو خاص درجہ حاصل ہے۔ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کا تعلق نہ صرف دور رس تاریخی آئینی سیاسی سماجی اور اقتصادی پہلوؤں کے ساتھ ہے بلکہ نفسیاتی اور جذباتی پہلو بھی اس معاملے سے تعلق رکھتے ہیں۔ قومی سطح کی ایک زوردار بحث اس معاملے پر چھیڑی گئی ہے۔ اس کی تنسیخ اور قحطی کے بارے میں زبردست دلیل بازی کی گئی ہے مگر ایک بنیادی پہلو پر ہمیشہ چشم پوشی کی گئی ہے اس کا تعلق مفادات خصوصی رکھنے والوں کی طرف سے اس کے غلط اور بے جا استعمال کے ساتھ ہے۔

گورنری راج کے دوران بنیادی اصلاحات کی ضرورت پر غور و فکر کے دوران میں نے اگست ۱۹۸۶ء میں اپنی ڈاٹری میں لکھا کہ دفعہ ۳۷۰ اس کے سوائے کچھ نہیں کہ یہ ان افراد کے لئے فروغ پانے کی جگہ ہے جو اس جنت ارضی پر بوجھ ہیں۔ یہ غریبوں کی کھال کھینچ رہی ہے یہ اپنے سراب سے انہیں فریب دے رہی ہے۔ یہ اہل اقتدار کی جیبیں بھر رہی ہے۔ یہ نئے سلاطین کی انا کو ہوا دے رہی ہے۔ بختخیز کہ یہ ایک ایسی سر زمین کو وجود میں لا رہی ہے جہاں انصاف کا فقدان ہے ایسی سر زمین جو کھٹگی اور تصادم سے بھری ہے۔ جو فریب کاری اور دھوکے پر کی سیاست اور سہیت کو پروان چڑھا رہی ہے۔ اس سر زمین پر تحریک براہیم فروغ پار ہے میرا یہ قومی نظریے کے ناپاک ورثے کو زندہ رکھ رہی ہے۔ یہ ہندوستان کے تصور ہی کا انکار دہا رہی ہے اور کشمیر

کئی کھاری تک ایک عظیم سماجی اور تمدنی تجربے کے نظریے کو دھندلا رہی ہے۔ یہ وادی میں ایک متشدد زلزلے کا مرکز بن سکتی ہے۔ ایک ایسا زلزلہ جس کے جھٹکے ملک بھر میں مسوس کئے جائیں گے اور انجام نامتوقع ہوں گے۔ اس کے بعد میں نے اپنے نظریات مرکزی حکومت کو ارسال کئے اور ریاست میں ایک نیا اداراتی ڈھانچہ قائم کرنے کے لئے چند مشورے بھی دیے مگر ان مشوروں کو نظر انداز کر دیا گیا اور ایک عظیم موقع سے ہاتھ دھو بیٹھے گئے۔ سا لہذا سال کے دوران دفعہ ۳۷۰ حکمران سیاسی لوگوں اور نوکر شاہی خاندان اور وکلاء اور تاجر طبقے میں مفادات خصوصی رکھنے والوں کے ہاتھوں آکر استعمال بن کر رہ گئی ہے۔ اس کے سبب مفادات خصوصی کا دائرہ قائم ہوا ہے۔ یہ ان علیحدگی پسند قوتوں کی نشوونما کرتی ہے جو اس کے عوض دفعہ ۳۷۰ کو قائم رکھتے اور اسے تقویت پہونچاتے ہیں۔ سیاست دانوں کے علاوہ امیر ترطباقوں نے اسے دولت جمع کرنے کے لئے آسائش کن ذریعہ پایا اور ریاست میں مالی قوانین کو نافذ نہیں ہونے دیا۔ دولت میکس اور غربی زمین کی زیادہ سے زیادہ حد کا ایکٹ، تحائف ایکٹ وغیرہ جو مرکز کے فائدہ مند قوانین ہیں کو ریاست میں نافذ العمل نہیں ہونے دیا گیا۔ اور ان پر دفعہ ۳۷۰ کی پردہ پوشی کی گئی۔ عام افراد کو اس امر کو محسوس کرنے سے روکا جا رہا ہے کہ دفعہ ۳۷۰ انہیں مفاسد اور کنگال بنادیتی ہے اور انہیں انصاف کی حق اور اقتصادی ترقی کے حق سے محروم کر دیتے ہیں۔ یہ وہ کون سے حالات تھے جن کے تحت دفعہ ۳۷۰ کو ہمارے آئین میں شامل کیا گیا؟ اس کا نفس مضمون کیا ہے؟ اور ان برسوں کے دوران اس دفعہ کو کمزور کیونکر بتایا گیا اور کیا ایسا ہوا بھی ہے؟ اس موضوع پر مزید بات کرنے سے قبل ان باتوں کا جائزہ لازمی ہے۔

جب پاکستان نے آزاد کشمیر فورسز کے نام پر کشمیر پر حملہ کر دیا تو ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو ہمارا جبرہری سنگھ نے حکومت ہند سے امداد طلب کی۔ ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو اس نے الحاق کا معاہدہ کیا جس کے تحت اس نے تین دائرہ جات اختیار و دفاع، خارجی امور اور مواصلات مرکزی سرکار کو سونپ دیے۔ معاہدہ الحاق کا دستاویز مذہبی تھا تو دوسرے والیان ریاست کے ساتھ کیا گیا۔ حکومت ہند کی ایماء پر یہ بات تسلیم کی گئی کہ الحاق کی بابت آئینی فیصلہ جموں و کشمیر کی دستور ساز اسمبلی کرے گی۔ تاوقتیکہ ایسا ہو جائے درمیانی مدت کے لئے آئین ہند میں عارضی انتظام لازمی تھا چنانچہ دفعہ ۳۷۰ کو شامل کر کے یہ کام کیا گیا۔

دفعہ ۳۷۰ کا لب و لہجہ یہ تھا کہ جموں و کشمیر کی بابت دفاع امور خارجہ اور مواصلات کے علاوہ مرکزی حکومت مرکزی اور مشرک فہرست کی مدت کی بابت قانون بنا سکتی ہے مگر اس کے لئے ریاستی حکومت کی منظوری حاصل کرنا لازمی ہے۔ اس سے جموں و کشمیر ریاست کو خصوصی بنیاد حاصل ہو جاتی ہے جبکہ مرکزی حکومت کو اختیار نہیں جاتی ہے۔ جبکہ مرکزی اور مشرک فہرست کی بابت قانون سازی کے لئے مرکزی حکومت کو اختیار حاصل ہے۔ مگر ریاست جموں و کشمیر کے معاملے میں وہ صرف حکومت جموں و کشمیر کی رضامندی کے ساتھ ہی کام انجام دے سکتی ہے۔ دفعہ ۳۷۰ کے نفس مضمون کی دفعہ عارضی نوعیت کی ہے۔ جموں و کشمیر دستور ساز

اسمبلی نے فوری ۱۹۵۶ء میں۔ الحاق کی تصدیق کردی اور اس تصدیق کے ساتھ ہی الحاق کا معاملہ حتمی طور پر طے ہو گیا مگر دفاع امور خارجہ اور مواصلات کے بارے میں پارلیمنٹ کے اختیارات کو چکدار رکھا گیا۔ صدر جمہوریہ ریاستی حکومت کی رضامندی کے ساتھ آئین ہند کی دفعات کا اطلاق ریاست پر کر سکتا تھا۔

دفعہ ۳۰ کے تحت صدر جمہوریہ ہند کا پہلا حکم ۱۹۵۰ء میں جاری کیا گیا۔ اس حکم کے تحت معاہدہ الحاق کی رُو سے قابل نفاذ دفاع کا جین کوریاست جموں و کشمیر پر اطلاق تھا۔ آئین ہند کی مزید مدت کی ریاست جموں و کشمیر پر توسیع کی تجویز کے بارے میں مرکزی حکومت نے ریاستی حکومت کے ساتھ تبادلہ خیالات کیا اس وقت شیخ محمد عبداللہ ریاست جموں و کشمیر کا وزیر اعظم تھا۔ اس تبادلہ خیال کے نتیجے میں دونوں حکومتوں کے درمیان ایک معاہدہ طے ہوئی۔ اس معاہدہ کو پہلی معاہدہ (۱۹۵۲ء) سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس معاہدے کے تحت صدر جمہوریہ نے آئین (جموں و کشمیر پر اطلاق) یکم اکتوبر ۱۹۵۴ء جاری کیا۔ اس حکم کے تحت آئین ہند کی متعدد دفعات کا نفاذ ریاست جموں و کشمیر پر کیا گیا۔ اس حکم میں موقوفہ موقوفہ تو سب کر کے آئین ہند کی مزید دفعات کا اطلاق ریاست پر کیا گیا۔ اس توسیعات کی تفصیل مندرجہ ذیل دی گئی ہے۔ آئین جموں و کشمیر میں ۱۹۹۴ء کے دوران الگ طور پر رقم کردہ صدر ریاست کے عہدے کا نام بدل کر گورنر اور وزیر اعظم کا وزیر اعلیٰ کر دیا گیا۔

مختصراً آج جو صورت حال ہے اس کے تحت دفاع امور خارجہ اور مواصلات کے علاوہ ریاست جموں و کشمیر پر بہت ساری دفعات کا اطلاق ہو چکا ہے ان میں دفعہ ۳۵۶ اور سپریم کورٹ انتخابی کمیشن اور پشاور اور آڈیٹر جنرل کا دائرہ اختیار شامل ہے۔

بہر کیف ایک وسیع دائرہ اختیار اب بھی باقی ہے جہاں ریاستی حکومت کو کئی اختیار حاصل ہے اس میں مشترکہ فہرست میں دفعہ ۳۵۲ کے تحت جائداد سے تعلق اختیار دفعہ ۳۶۰ جس کے تحت صدر جمہوریہ قومی طور پر ہنگامی صورت حال کا اعلان کر سکتا ہے کا اطلاق بھی ریاست جموں و کشمیر پر نہیں نہ ہی صدر جمہوریہ ریاست جموں و کشمیر کے آئین کو مستقل کر سکتا ہے۔ اور نہ ہی دفعہ ۳۶۵ کے تحت کوئی ہدایت جاری کر سکتا ہے۔

ریاست کا اپنا آئین ہے اور یہ آئین دفعہ ۳۶۰ کی ذیلی پیداوار ہے۔ اس ملک کی کسی بھی ریاست کا الگ آئین نہیں ہے۔ دیگر تمام ریاستوں کا یکساں ڈھانچہ ہے جو کہ آئین ہند کے حصہ چہارم میں دیا گیا ہے۔

آئین جموں و کشمیر کی دفعات کے موجب بہت سارے مسائل پیدا ہوئے ہیں خاص طور پر جائداد کی ملکیت کا حق، شہریت کے حقوق اور آباد کاری کا حق ہندوستان کے شہری خود بخود ریاست جموں و کشمیر کے شہری نہیں بن جاتے۔ انہیں ریاست میں آباد ہونے کا کوئی آئینی حق نہیں ہے۔ آئین ہند صرف ایک شہریت کو تسلیم کرتا ہے

مگر ریاست جموں و کشمیر کو دوسری مراعات حاصل ہیں۔ ایک ہندوستان کے شہری اور دوسرے ریاست کے باشندے کے طور پر حاصل ہیں۔ وہ لوگ جو جموں و کشمیر کے شہری نہیں انہیں ساری سمنڈریلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ ریاست میں جائداد نہیں رکھ سکتے۔ انہیں ریاستی اسمبلی مقامی اداروں یا کوپریٹو سوسائٹیاں اور چھائیٹوں وغیرہ میں رائے دی کا حق حاصل نہیں۔ اس بارے میں ایک اور نا انصافی یہ بھی ہے کہ اگر جموں و کشمیر کی باشندہ کوئی خاتون + ایسے شخص سے شادی کرتی ہے جو ریاست جموں و کشمیر کا باشندہ نہیں ہے تو وہ اپنی جائداد سے باہر محدودیتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے والدین کی جائداد کو بھی وراثت میں حاصل نہیں کر سکتی۔ آئین کی یہ دفعات بد نظمی پیدا کرنے والی اور قانونی اور آئینی طور پر غیر مروج ہیں جو ریاست اور مرکز کے درمیان جذباتی رویوں پیدا کرتے ہیں اور فیصلے بھی انصاف کے سبھی تقاضوں کے منافی ہیں۔ اس امر سے یہ غیر معتمد پوزیشن مزید خراب ہو گئی ہے کہ ریاست کا اپنا پرچم اور نشان ہے سرکاری عمارتوں میں ریاستی اور سرکاری دونوں پرچم لہراتے ہیں نیشنل کانفرنس سے تعلق و ذرا قومی اور نیشنل کانفرنس دونوں پرچم لہراتے ہیں۔ جیسا کہ اس باب کے تین ابتدائی پیرا گرافس میں ذکر کیا گیا ہے کہ دفعہ ۳۰ ریاست کے عام لوگوں کے حق میں نہیں ہے اس کی چند مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ مارچ ۱۹۸۸ء میں نیڈوز ہومل کے پٹے کی تجدید کا معاملہ ایک چھوٹی سی جمنڈی کی طرف سے دفعہ ۳۰ کا استحصال اس بارے میں ایک عجیب مثال ہے اس معاملے میں نیڈوز ہومل کے پٹے کی میعاد جون ۱۹۸۰ء میں ختم ہو گئی۔ مارچ ۱۹۸۸ء میں گذشتہ جون ۱۹۸۰ء سے نافذ العمل پٹے کی تجدید ریاستی حکومت نے ۹۵ برس کے لئے کر دی۔ اس کا سالانہ کرایہ ۵۲۰۰ روپے تھا جو کہ دن کے آخری برسوں کے دوران بڑھا کر دو گنا کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی پٹے دار کو یہ اجازت بھی دے دی گئی کہ یہ جائداد انڈین لو یا کو کمپنی کو ذیلی پٹے پر دے دے جو ویل کم گروپ کے نام سے ہوگیوں کا ایک سلسلہ چلاتی ہے اس کے لئے سالانہ کرایہ ۴ لاکھ روپے طے کیا گیا تھا آئندہ برسوں کے دوران دو گنا کر دیا جائیگا۔ اور آخری رہن کے دوران یہ کرایہ ۲۰ لاکھ روپے ہو گا۔ دوسرے لفظوں میں رہن کی مدت کے دوران پٹے دار کو کرائے کے طور پر ۹ کروڑ روپے حاصل ہونگے اور اُسے اسی عرصے میں ۸۰ لاکھ روپے کرایہ ادا کرنا ہو گا اس طرح اُسے بے پناہ فائدہ ہو گا اور حکومت کو درمیان دار کے طور پر ۲۰ لاکھ روپے کا نقصان ہو گا اگر ۱۳ اکنال رقبے پر مشتمل قطعہ ارضی تقابلی ٹینڈروں کے ذریعے نیلام کی گئی ہو تو ریاستی حکومت کو پٹے کی رقم کی صورت میں کروڑوں روپے حاصل ہوئے ہوتے۔

گمراہ سگری جسے اب مینہ طور پر ہومل کہتے ہیں کی تعمیر کا معاملہ بھی دفعہ ۳۰ کے معیار اور حفاظتی دیوار کی ایک اور مثال ہے۔ اس معاملے میں حیدر ڈل پرواقعہ بہاؤ کی ایک چوٹی پر ایک فائبرسٹار ہومل تعمیر کیا گیا۔

یہ معاملہ اس وقت میرے نوٹس میں آیا جب روس میں سفیر نے۔ این کول سری نگر میں مجھ سے ۹۸۵ء کے وسط میں ملاقات کی۔ وہ رخصت پر تھا اور چشمہ شاہی گیسٹ ہاؤس میں قیام پذیر تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ چشمہ شاہی سے کمرالاسنگری کا نظارہ بہت خوبصورت دکھائی دیتا ہے اور اسے ایک سڑک تعمیر کر کے ملیا بیٹھ کیا جا رہا ہے۔ میں نے اس معاملے کی چھان بین بھی کرائی تھی۔ مجھے معلوم ہوا کہ جب سید میر قاسم وزیر اعلیٰ تھا تو اس مقام پر چند سرکاری ہسپتال تعمیر کرنے کے معاملے میں چند اسماعیلی اقدامات کئے گئے مگر عملی طور پر زیادہ کچھ نہیں کیا گیا۔ جب شیخ محمد عبداللہ برسر اقتدار آیا تو خاموشی کے ساتھ ایک مقامی بارہو سوخ تاجر نے اس غیر تحریری وعدے کے ساتھ اس جگہ کا ایک حصہ حاصل کر لیا کہ اسے اس جگہ ہسپتال تعمیر کرنے کی اجازت دے دی جائے گی۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے عہد حکومت کے دوران سرنگرنی ہسپتال سے ایک بہم قسم کی منظوری بھی حاصل کر لی گئی۔ ابھی یہ تاجر اس تلاش میں ہی تھا کہ وہ اس منظور شدہ عمارتی نقشے اور پلاٹ کو بیرون ریاست کے کسی باذرائع ہوٹل والے کو فروخت کر سکے کہ فاروق عبداللہ کی حکومت گر گئی۔ کچھ عرصہ تک غیر فعال رہنے کے بعد اس تاجر نے وزیر اعلیٰ جی۔ ایم شاہ سے فرزند منظور شاہ کی مبینہ حمایت سے اس نقشے کی تجدید کرائی۔ اسی عرصے کے دوران ایک مناسب پارٹی منظور ہوئی۔ کوڈھوٹہ نکالا گیا تھا۔ اور مناسب معاہدہ ہو چکی تھی۔ یہ وہ مرحلہ تھا جب اس پہاڑی کو کاٹنے کا کام شروع کیا گیا۔

ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی جماعت نیشنل کانفرنس رالیف ہوا جس تاجر کے حربوں سے واقف تھی اس نے منظور شاہ کی مبینہ کروٹوں کی چند شکایات مجھ سے کیں۔ ۳۰ اکتوبر ۱۹۸۵ء کو دو سابقہ وزراء اپنی ایل ہنڈو اور محمد شفیع اس سلسلے میں مجھ سے ملاقاتی ہوئے۔ وہ اس معاملے سے اس قدر وابستہ تھے کہ انہوں نے مجھے دفتر سے باہر لے کر دیکھنے پر مجبور کر دیا کہ اس طرح قدرتی خوبصورتی کو بد صورت بنایا جا رہا ہے اور جیل ڈال کی جنگی اور حیوانی زندگی کو نقصان پہنچایا جا رہا ہے۔

۴ مارچ ۱۹۸۶ء کو ریاست پر گورنری راج نافذ ہو گیا۔ فائیو لوں کے مطالعہ کے بعد زمین کی ملکیت اور نام نہاد منظوری کے بارے میں متعدد بے ضابطگیوں اور میری معلومات میں آئیں۔ چنانچہ اس پروجیکٹ کو منسوخ کر دیا گیا۔ میں خوش تھا کہ جنگلات اور حیوانات کی زندگی سے متعلق ایک تباہ کاری کو ٹال دیا گیا ہے۔ میری رائے میں قدرتی مناظر کو تباہ کرنے کے علاوہ اس ہوٹل سے جیل کی تہہ میں بھاری مقدار میں ریت پتھر اور گندگی ہمہ کر جمع ہو جائے مگر گورنری راج کے خاتمے کے بعد اس مقام پر تعمیراتی سرگرمی پورے شد و مد سے جاری ہو گئی۔ استفسارات کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ اس ہوٹل کی کیکس کا سٹب بنیاد رکھنے والا کوئی دوسرا نہیں بلکہ وہ خود وزیر اعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبداللہ تھا۔ اس صورت حال کا الٹا پہلو یہ ہے کہ جس شخص اور جماعت نے گویا ذکر شور مچایا تھا، رشوت ستانی اور مافولیاتی تباہ کاری کے الزامات عائد کئے تھے اب اسی شخص نے مقامی تاجر اور ہوٹل مالک دوست کے فائدے کیلئے اس پروجیکٹ کو جانور و اما تھا۔ جس سے ریاستی حکومت کو بھاری نقصان ہوا۔

یہ معاملہ اس امر کو کاٹنے کی انداز میں واضح کرتا ہے کہ کسی طرح دولت کمانے اور اقتدار پر سدا کر نیوالے ٹولے اور جھنڈ لیبال ریاستی اقتصادیات جنگلات اور حیوانات کی عصمت دری اور تباہ کاری کے موجب بنتے ہیں اور اس کے لئے انہوں نے ۲۰۰۰ کا موٹا سالخاف اور چھاپا ہے اسی قریب کاری کی سیاست اور اقتصادی استحصال کے سبب کشمیر کا المیہ پیدا ہوا۔

اگر کاروباری ارضیات کو تقابلی ٹینڈروں کے ذریعے نیلام کی بنیادوں پر الاٹ کیا جائے۔ جو ہر کسی کے لئے قابل شمولیت ہوں تو ریاست کو بھاری تعداد میں فائدے حاصل ہوں گے۔ انہی ذرائع درمیانہ وار نہیں لے جائیں گے۔ ریاست کے مافولیاتی کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ اور سیاہ دولت میں کمی واقع ہوگی۔ بدعنوان اور شہلوگوں کو سرگرم ہونے کی بنیاد حاصل نہیں ہوگی۔ حکمرانوں اور تاجروں کے درمیان سازشی رشتے بھی ختم ہو کر رہ جائیں گے چونکہ خفیہ اور منمنی انداز میں کوئی کام نہیں ہوگا اس لئے جنگلات مافولیاتی اور حیوانات کو ہونے والا نقصان بھی کم از کم ہو سکے گا۔ بیرون ریاست سے سرمایہ آئے گا اور مقامی آبادی کے لئے روزگار کے مواقع میں اضافہ ہوگا۔ سماج مزید کھلی صورت اختیار کرے گا۔ تعمیر و ترقی کا تمام تر عمل تیز تر ہو سکے گا۔

۱۹۸۶ء کے گورنری راج کے دوران میں نے ہری نواس نامی کمپلیکس کو کھلے نیلام پر چڑھایا۔ اس بارے میں ریاست کی باشندگی کوئی تہید نہیں تھی۔ یہ کمپلیکس سابقہ مہاراجہ کی ملکیت تھا۔ آٹھویں دہائی کے اوائل میں ڈاکٹر کون سنگھ نے یہ کمپلیکس ریاستی حکومت کو ۵۰ لاکھ روپے کی عوض فروخت کیا اور عملی طور پر اس کا کوئی استعمال نہیں کیا گیا کھلی بولی سے ۶ کروڑ روپے کی رقم حاصل ہوئی۔ اہل اقتدار کی طرف دفعہ ۲۰۰۰ کا ہوا کھڑا کرنے کی کوشش کی پیش بندی کے لئے میں اس کے ساتھ یہ اعلان بھی کر دیا کہ اس نیلامی سے جو رقم حاصل ہوگی۔ وہ شہر میں گندے پانی کے نکاس کے لئے نایاب تعمیر کرنے پر صرف ہوگی نیلام کی اس آمدن کو مندرجہ بالا کے فائدے کے لئے شہر کی ترقیاتی سکیم کے ساتھ جوڑ کر میں نے ریاست کے ذرائع کی بنیاد رکھ کر میں نے سوچا کہ دفعہ ۲۰۰۰ کے مضمر اثرات کو روکا جا سکتا ہے اور میں نے اس بات کو ثابت کر دیا تھا۔

شہری جائداد باقی عدالتی اور زیادہ سے زیادہ ۱۹۸۶ء تک تمام ہندوستان میں نافذ العمل ہے مگر اس ایکٹ کی توسیع جوں و کشمیر میں نہیں کی گئی۔ اس ایکٹ کی توسیع ذکر کرنے کا جوں و کشمیر کے خاص درجے کے ساتھ کیا واسطہ ہے؟ بنیادی طور پر یہ بات اہل اقتدار کے مفادات خصوصی کے تحفظ کے لئے کی گئی اور ایکٹ کو توسیع نہیں دی گئی۔

مارچ ۱۹۸۸ء میں مجھے رشوت ستانی کے چھ سنگین معاملوں کا جائزہ لینے کا موقع ملا ایک معاملے میں شیر مال اور اس کے داماد کے خلاف الزامات تھے۔ دوسرے معاملے میں سابقہ سیکرٹری حکمران مال اور سابقہ مشیر مال ملوث تھے۔ تیسرے معاملے میں سابقہ شاہی خاندان کے ایک رکن نے پوشیدہ لین دین کے ذریعے بھاری مالی فائدہ اٹھایا تھا جو مجھے معاملے میں جاندار مہاجرین کے ریکارڈ میں پیرا پھیری کی گئی تھی۔ پانچویں معاملے میں ایک سابقہ

وزیر اعلیٰ کے بیٹے نے شہر کے بالکل اندرون میں بیش قیمت زمین حاصل کر لی تھی۔ چھٹے معاملے میں ایک سیاسی جماعت کے چوٹی کے لیڈر نے ممول کے نرخوں سے زیادہ معاوضہ حاصل کر لیا تھا۔ ان تمام معاملوں میں دو پہلو مشترک تھے۔ شہری زمین اور سیاسی اور اعلیٰ افسر۔ بیش قیمت اراضیات حاصل کر کے ان کی سہ ماہی بازی کی تھی اور اس سے بھاری رقوم جمع کی گئیں۔ اگر شہری اراضیات (زیادہ سے زیادہ) عمدہ اور باقاعدگی ایکٹ ۱۹۷۶ نافذ العمل ہوتا تو اس غیر صحت مند سرگرمی کو روکا جاسکتا تھا مگر مفادات خصوصی رکھنے والوں نے ایسا ہونے نہیں دیا۔

چند افراد پر مشتمل حکومت قائم کرنے کے لئے بھی دفعہ ۳۷ کا بے جا استعمال کیا گیا۔ مثال کے طور پر قانون سازی میں دل بدلی مخالف قانون کو نہ تو جموں و کشمیر میں توسیع دے کر نافذ العمل کیا گیا اور نہ ہی اسے من و عن جموں و کشمیر میں اپنایا گیا۔ مقامی قانون کو اس انداز میں مرتب کیا گیا ہے کہ یہ قانون جماعتی سربراہ کو آمرانہ اختیارات تفویض کرتا ہے۔ اس وقت تو قانون ریاست میں نافذ العمل ہیں ان کے تحت سپیکر کو نہیں بلکہ جماعتی سربراہ کو اس بات کا فیصلہ کرنے کا اختیار دینے گئے ہیں کہ فلاں رکن نے دل بدلی کی ہے یا کہ نہیں۔ بد الفاظ دیگر وہ حکومت کا سربراہ بھی ہے اور جماعت کا بھی وہی شخص جماعتی ملکیت تقسیم کرتا ہے وہی ذرا کو نامزد کرتا ہے اور یہی شخص فیصلے کرتا ہے اور اگر اس کی قیادت پر انگلی اٹھائی جائے تو یہی شخص حرف اثر ہے یہ قانون آئین جموں و کشمیر (اٹھارویں ترمیم) ایکٹ ۱۹۸۷ میں پاس کیا گیا۔ اس میں درج ہے ”اگر یہ سوال پیدا ہو جائے کہ آیا ایوان کا کوئی رکن اس شیڈول کے مطابق نااہل قرار دیئے جانے کا مستحق ہے تو یہ معاملہ اس جماعت کی قانون سازی میں پارٹی کے قائد کے سپرد کیا جائے جس سے اس کا تعلق ہو۔ اس کا فیصلہ متقی تصور ہوگا۔“ اس سے شخص پرستی کی جڑیں گہری ہوتی ہیں اور یہ امیر جماعت کے قائد کی آئینی آمریت کی منظوری کے مترادف ہے میں نے پہلے ہی اس قانون کی بابت ذکر کیا ہے جو عورت ایسے ہندوستانی سے شادی کر لیتی ہے جو ریاست کا مستقل باشندہ نہیں ہے وہ اپنے حقوق سے محروم ہو جاتی ہے اس کی مثال کے طور پر آئیے میں آپ کو ایک حالیہ معاملے کے بارے میں بتاؤں۔ ڈاکٹر روبینہ نصرت ”ریاست کی مستقل باشندہ شہری“ تھی۔ اس نے ایم بی بی ایس ڈگری حاصل کی اور پوسٹ گریجویٹ کے لئے گورنمنٹ میڈیکل کالج میں درخواست دی اس کے پاس مستقل باشندہ کا سرٹیفکیٹ تھا تو اس نے اس عرض کے برابر پیش کیا مگر اسے کہا گیا کہ وہ شادی کے بعد مستقل باشندہ ریاست کا سرٹیفکیٹ پیش کرے جس کا مطلب یہ تھا کہ شادی کے بعد اس کا مرتبہ تبدیل ہو گیا ہے اس نے لازمی سرٹیفکیٹ کے لئے حکام کو درخواست دی مگر اسے انکار کر دیا گیا۔ کیوں؟ وہ اس لئے کہ اس نے ایک ہندوستانی شہری کے ساتھ شادی کی تھی جو ریاست کا باشندہ شہری نہیں تھا۔ ڈاکٹر روبینہ نصرت ۲۲۶ کے تحت بانی کورٹ میں ریٹ دائر کرنا پڑی جس کے تحت ریاستی حکومت کے مراسلہ مجوزہ ۶۵ فروری ۱۹۸۵ کو منسوخ کرنے کی گزارش کی گئی تھی جس کے تحت اسے شادی کے بعد

مستقل باشندہ ریاست کا سرٹیفکیٹ پیش کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اور اس بنا پر اس کی اہلیت سے انکار کیا گیا ہے کہ وہ مطلوبہ سرٹیفکیٹ پیش کرنے میں ناکام رہنے پر پوسٹ گریجویٹ کورس میں داخلہ حاصل نہیں کر سکتی۔ یہ ریٹ نیشن ابھی زیر سماعت ہے۔

یہاں پر بنیادی سوال یہ ہے کہ جو حکومت کر رہے ہیں ان لوگوں کا انداز فکر کیا ہے؟ اور ہندوستانی پالیسی سازی کیا سوچتے ہیں جو دفعہ ۳۷ کے اور اس کی حاصل بدین لبادے میں اس قسم کی حکومت کی اجازت دیتے ہیں۔ ایک شخص جو ہندوستان کا شہری ہے اور ریاست جموں و کشمیر کا شہری مستقل باشندہ ہے اس میڈیکل کالج میں داخلہ حاصل نہیں کر سکتا جو مرکزی حکومت کے مالیات سے قائم ہوا ہے یہ فیصلہ اس لئے کہ وہ ایک ہندوستانی شہری کے ساتھ شادی شدہ ہے۔ کیا اس سے زیادہ نا انصافی اور اس سے زیادہ قدامت پسندی اور پرستی ہے

مغربی پاکستان کے اکثرے جیسے اشخاص کا معاملہ نا انصافی کا اس سے بھی بدتر معاملہ ہے مغربی پاکستان سے چند ہزار کنبے بہا جبر ہو کر جموں و کشمیر میں آکر یہاں آباد ہو گئے۔ وہ چار دہوں سے زیادہ عرصے سے اس ریاست میں رہ رہے ہیں مگر یہ ایسے بدقسمت لوگ ہیں جنہیں ایسے حالات کی پہچان ہو جو بے ترک وطن کرنا پڑا ہو کہ ان کے بس سے باہر تھے، لیکن یہودیائی انسانی حقوق سے بھی محروم کیا گیا ہے۔ انہیں ان کے بچوں اور پوتوں کو جموں و کشمیر میں شہریت کے حقوق حاصل نہیں ہیں۔ وہ ریاستی اسمبلی بلدیات یا نجیاتی انتخابات میں شرکت نہیں کر سکتے۔ یہاں تک کہ وہ ریاستی حکومت اور اس کی ایجنسیوں سے قرضے بھی حاصل نہیں کر سکتے۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ریاست کے میڈیکل انجینئرنگ یا ذراعتی کالج میں داخلہ حاصل نہیں کر سکتے۔

جو کچھ ہمارے ملک کے اس حصے میں ہو رہا ہے کیا وہ المناک صورت حال نہیں ہے۔ وہ ملک جو سماجی اقتصاد اور سیاسی انصاف میں وقت بے وقت فخر محسوس کرتا ہوا اور جنوبی افریقیوں اور فلسطینیوں کے انسانی حقوق، لینے آئندہ جہاں ہوا اس کے لئے یہ صورت حال کیا مایوس کن نہیں۔ یہاں پر بنیادی سوال ان سے وابستہ افراد کا نہیں بلکہ اس قومی رجحان کا ہے کہ ہم ادنیٰ مفادات اور خوش رکھنے کا سیاسی کھیل کھیلے ہیں اور ہمدردی اور پابندی کو مصلحتوں پر قربان کر دیتے ہیں۔

موجودہ دور کی دنیا میں چار قسم کے مجرم غیر شرافت مندہ رہتے ہیں۔ ایک ایسا ذمہ دار ہے جو دو کھائی دینے والے داؤ پیچ کے ذریعے گناہ سرزد کرتا ہے۔ اس نمرے کی ایک مثال وہ اے گتے چوٹی کے افراد ہیں جو قطعی طور پر اپنے مفاد کے لئے اقتصادی نظام کو موڑ دیتے ہیں اور بھاری تعداد میں لوگ کو قحط سالی کا شکار بنا کر قحط کے لئے بیماری اور موت کا موجب بنتے ہیں۔ مجرموں کا ایک اور طبقہ بھی ہے جو وہ ہم رکھتا ہے جنہیں مائولیاں دتی بھول سے منسوب کیا جاسکتا ہے وہ نہ صرف جموں و کشمیر میں بلکہ زمین بھر میں اور ہندوستان میں بھی زہر گھول دیتے ہیں۔ مجرموں کا ایک اور بھی ذمہ دار ہے جو غلط پروپیگنڈہ کے فن پر زندہ رہتا ہے اور حقیقت کو میاں ہونے سے روکتا ہے۔ ایک اور طبقہ ایسا بھی ہے جو غلطیوں کے گناہ سرزد کرتا ہے جو اس کے منکب ہونے سے کسی طور بھی

کم نہیں ہے۔ ہم سبھی اس کی بابت جانتے ہیں مگر ہم سبھی خاموش ہیں۔ اگھرے ہوئے اشخاص اور دوسرے معاملوں میں پورا ملک گنہگار ہے۔ گناہ یہ ہے کہ دفعہ ۳۷ اور اس کے ذیلی اثرات میں پنہال انسانیت کے فقدان اور غیر معاویت کو ہم سبھی پہچانتے ہیں ناکام رہے ہیں۔

دفعہ ۳۷ کی بابت چند بنیادی سوال اٹھانے کی ضرورت ہے۔ اس کا جواز اور اس کی معقولیت کیا ہے۔ اس دفعہ کے بارے میں ایسا خاص کیا کچھ دفعہ دوسری ریاستوں پر نافذ نہیں ہو سکتی۔ اگر دفعہ ۳۷ کا مقصد کشمیر کی تمدنی شناخت کا تحفظ ہے تو اس قسم کی دفعہ تمام ریاستوں کے بارے میں وضع کی جانی چاہیے تھی کیونکہ تمدنی شناخت کے تحفظ کی ضرورت سبھی ریاستوں کے لئے مشترک ہے کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ تامل ناڈو یا بنگال کی تمدنی شناخت کے تحفظ کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور اگر یہ مراعات کشمیر کو حاصل ہیں تو دوسری ریاستوں کو کیوں نہیں دیا گیا یہ اس لئے ہے کہ یہ واحد مسلم اکثریتی ریاست ہے کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ دفعہ ۳۷ کو جاری رکھ کر ہم پوشیدہ طور پر دو قومی نظریے کو تسلیم کر رہے ہیں۔

ہم نے دو قومی نظریے کی مخالفت کی اور دنیا بھر میں اعلان کیا کہ ہندوستان کی تشکیل کی بنیاد علمی دگی یا استیلا نہیں اور ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ ہیں لوگ کشمیر میں دو قومی نظریے کو رو بہ عمل لارہے ہیں۔ بد قسمتی کی بات ہے کہ ہم یہ کام خود کشانہ طریقے سے کر رہے ہیں۔ دو قومی نظریے کی بنیاد پر پاکستان وجود میں آیا اور آج وہ اپنے ہی ذرائع پر زندہ ہے مگر یہاں کشمیر میں دفعہ ۳۷ اور اندرونی خود مختاری کے بارے میں اس انداز سے جوڑ توڑ کی گئی ہے کہ ہم نے ہندوستانی روپے پیسے سے ہی شیخ شاہجی یا سلطنت یا چھوٹے سے پاکستان کی نشوونما کی ہے۔ بد قسمتی کی بات ہے کہ اس چال کی گہرائی میں جھانکنے کی بابت نہ تو ہم میں رجحان ہے اور نہ ہی اہلیت کشمیری قیادت کا ہندوستان کے تئیں رویہ ہے۔ جاؤ گے تو کیا دے کر جاؤ گے، آؤ گے تو کیا لے کر آؤ گے یہ رشتہ محض ہندوستانی روپیہ پیسہ حاصل کرنے کے لئے ہے اور حقیقی طور پر منصفانہ سیکولر اور ترقی پسند بنیادوں پر مداحی رشتہ قائم کر کے مرکز کا کوئی بھی قانون یا انتظامی اقدام عوام کے لئے کس قدر بھی فائدہ مند کیوں نہ ہو، ٹھکرا دیا جاتا ہے۔

جو لوگ دفعہ ۳۷ کے زبردست حمایتی ہیں ان کی دلیل ہے کہ ریاست کے لئے دائمی اندرونی خود مختاری کے لئے یہ دفعہ لازمی ہے مگر قابل قبول اندرونی خود مختاری کا اس دفعہ کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ جب اس یونین کی دوسری ریاستیں زیادہ اندرونی خود مختاری کا مطالبہ کرتی ہیں تو ان کا مطلب ہر خود شائستوں کی علیحدگی نہیں ہے ان کی حقیقی مراد یہ ہے کہ وہ اتھارٹی مرکزیت کو توڑنا چاہتی ہیں اور اختیارات کی تفویض اس انداز سے چاہتی ہیں تاکہ انتظامیہ اور ترقیاتی کاموں کی رفتار تیز ہو اور عوامی خدمات میں بہتری پیدا ہو۔ جموں و کشمیر میں دفعہ ۳۷ کو اپنی ابدی پاکیزگی کے ساتھ برقرار رکھنے کا مطالبہ اس عمل کے بغیر کیا جاتا ہے اس کے تحت ۱۹۵۳ء سے اس دفعہ کو کمزور کیا گیا ہے تو یہ انداز فکر کسی اور شعبہ سے نکلتا ہے۔

یہ فیصلہ قومی دھارے سے دور رہنے کی ایک شاطرانہ چال ہے ایک الگ جاگیر قائم کرنا، ایک الگ پرچم لہانا وزیر اعلیٰ کی بجائے وزیر اعظم اور گورنر کی بجائے صدر ریاست رکھنا اور زیادہ اقتدار اور سرپرستی حاصل کرنا اس کا مدعا ہے۔ یہ اس لئے نہیں کہ عوام کی زیادہ بہبود ممکن ہو، گونا گونیست میں تمدنی یکجہتی بحال رہے یا امن اور ترقی کا کار مضبوط ہو بلکہ اس لئے ہے کہ چند اٹنے گئے افراد اور نئے شیخوں کے مفادات پورے ہوں۔

دفعہ ۳۷ میں دو قومی نظریہ کس طرح مضمر ہے، کس طرح اس نظریے کی حرکت سے ریاست کی فرقہ وارانہ نفسیات پیدا ہوتی ہے، یہ امر اس خاندان کے لیڈروں کے یہود کنبہ پروگرام کے تئیں رویے سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ قریباً تمام قومی سیاسی جماعتیں اور گروپ اس پروگرام کی مخالفت میں مصلحت تصور کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر عوامی نیشنل کانفرنس کے سربراہ اور سابقہ وزیر اعلیٰ جی۔ ایم شاہ نے حال ہی میں کہا: ضبط تو لیں کے سرکاری پروگرام کا مقصد ریاست میں مسلم اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کرنا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں مسلمان ریاستی آبادی کا ۸۰ فیصد تھے جو اب کم ہو کر صرف ۵۴ فیصد رہ گئے ہیں۔ آئندہ دس برسوں کے دوران کم ہو کر جموں آبادی کا ۴۸ فیصد یعنی اقلیت بن کر رہ جائیں گے۔ ایسے بیانات نہ صرف اعداد و شمار کے طور پر دروغ بیانی ہیں بلکہ یہود کنبہ پروگرام کی افادیت کو کم کرتے ہیں۔ ان سے ان کے بنیاد پرست اور ظلمت پسند نظریات کی جھلک ملتی ہے۔ وہ اس پروگرام کو غیر اسلامی اور ہندو۔ ہندوستان کی سازش تصور کرتے ہیں جس کا مقصد مسلم اکثریت کو غیر نمایاں اقلیت میں تبدیل کرنا ہے۔ یہی رویہ اس پروگرام کی ۱۹۷۱ء سے ۱۹۸۱ء تک ناکامی کا باعث رہا ہے جموں و کشمیر کی آبادی کا اضافہ ملک بھر میں سب سے زیادہ تھا۔ یہاں یہ اضافہ ۲۹۴۹ تھا جبکہ قومی اوسط ۲۵ تھا۔ عملی کامیابیاں نشانوں سے کہیں زیادہ کم تھیں۔

ریاست جموں و کشمیر منصوباتی اور غیر منصوباتی دونوں قسم کے اخراجات کے لئے مرکز پر انحصار رکھتی ہے۔ اس کے پانچسا لہ منصوبوں کی تمام رقم مرکزی حکومت ۱۰۱ کرتی ہے۔ غیر منصوباتی رقم کا ایک خاصہ حصہ بھی مرکز فراہم کرتا ہے۔ مثال کے طور پر ۸۹-۱۹۸۸ء کے بجٹ میں ۴۴ فیصد مالیاتی وصولیات مرکزی حکومت کی طرف سے منتقل کی گئی تھیں۔ جبکہ ریاست کو مرکزی حکومت کی طرف سے گرانٹس کی صورت میں ۱۰۰۳ کروڑ روپے حاصل ہوئے۔ اور اس کی اپنی وصولیات ۲۳ کروڑ روپے تھیں۔ اس برس کے دوران ریاستی ملازمین کی تنخواہوں پر ۲۷ کروڑ روپے صرف لگے یعنی وصولیات سے زیادہ یہ اخراجات تھے۔ اگر ریاست حقیقی

۱۔ حال ہی میں ۱۹۹۰ء کے دوران خوش کرنے کی پالیسی کے تحت مزید رعایت دی گئی۔ اس پالیسی کو کوئی بھی نام دیا جاسکتا ہے۔ ۱۰۱ مدد کی طرز اب ۹۰ فیصد گرانٹ اور ۱۰ فیصد قرضے کی صورت میں تبدیل کیا جا چکا ہے۔ اگرچہ یہ طرز اب شمال مشرق میں صرف نئی ریاستوں کی بابت اپنایا گیا ہے جو کسی وقت مرکزی انتظام کے تحت علاقے تھے۔

معنوں میں خود مختار ہوتی اور اپنے ہی ذرائع پر اسے چھوڑ دیا جاتا تو اسے ترقیاتی کام کے لئے ایک بھی پیسہ نہیں ملتا۔ بلکہ وہ متعدد ملازمین کو تنخواہیں بھی ادا نہیں کر پاتی۔ اس کی نہایت کمزور مالی حالت اور تنگ اقتصادی بنیاد کے پیش نظر جموں و کشمیر کے لئے اندرونی خود مختاری نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی قابل قبول ہے۔

مرکز کے ساتھ مکمل مالی یکجہتی کی عدم موجودگی میں ریاست بہار اجرہ کے وقت کی طرح قرون وسطی کی افرا تفری کے سوائے کچھ نہیں ہوگی جبکہ ریاست کی فی کس آمدن ۱۱ روپے تھی جس میں سے ۲۱ فیصد بطور ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا۔ ۳۰-۹۳ فیصد آبادی ناخواندہ تھی۔ صرف ۶۶ مربع میل کے علاقے میں لڑکیوں کا ایک پرائمری سکول تھا۔ جبکہ ۳۶۴ مربع میل کے دائرے میں لڑکیوں کا ایک پرائمری سکول تھا۔ زراعت، صحت عامہ، صنعتوں، سڑکوں اور تعلیم پر کل سالانہ خرچ ۳۶ لاکھ روپے تھا۔ ۳۸-۱۹۴۰ میں ریاستی بجٹ کے کل اخراجات ۸۱،۸۱ کروڑ روپے تھے۔ سال ۸۹-۱۹۸۸ کے لئے تقابلی اعداد و شمار کے مطابق ریاست کی فی کس آمدن ۶۳۵ روپے تھی۔ ان تقابلی اعداد و شمار سے وہ فوائد عیاں ہوتے ہیں جو ریاست کو مرکز کے ساتھ مالی یکجہتی کے بعد حاصل ہوئے۔ ساٹھ سالہ منصوبہ کے دوران ریاست کو مرکز کی طرف سے ملنے والی رقم ۸۳۸ کروڑ روپے تھی۔ ۱۴ کروڑ روپے منصوباتی اور ۴۴ کروڑ روپے غیر منصوباتی تفاوت کو پورا کرنے کے لئے ۳۳۳ برسوں کے اس مرحلے کے دوران مرکزی حکومت نے کئی ہزار کروڑ روپے ریاست کو ادا کئے ہیں۔ اس ریاست کے معاملے میں فی کس مالی امداد قومی اوسط سے کہیں زیادہ ہے۔ مرکز کی طرف سے تقسیم کی جا رہی کل مالی امداد سے ریاست کو ۲،۵۴ فیصد ادا ہوتے ہیں جبکہ ریاست کی آبادی ملک کی مجموعی آبادی کا ۵.۸ فیصد ہے مثال کے طور پر سال ۹۰-۱۹۸۹ کے دوران جموں و کشمیر کے لئے فی کس گرانٹ ۱۱۲۲ روپے ہے جبکہ جموں و کشمیر کے لئے ۵۵۲ روپے آسام کے لئے ۳۲۵ روپے بہار کے لئے ۹۰ روپے یوپی کے لئے ۹۱ روپے اور مغربی بنگال کے لئے ۶۷ روپے ہیں۔

ایک اور معاملے کو یہ ہے۔ آئین جموں و کشمیر میں دفعہ ۳۵۶ کی توسیع اس دفعہ کے تحت صدر جمہوریہ ریاست میں صدر راج نافذ کر سکتا ہے۔ اکثر یہ کہا جاتا رہا ہے کہ یہ دفعہ ریاست کی اندرونی خود مختاری میں شہنا اندازی کرتی ہے مگر اس سے وابستہ سوال یہ بھی ہے کہ ریاست میں اگر اتنی مشہری مصل ہو کر رہ جاتی ہے اور اگر ریاستی حکومت دفاع، امور خارجہ اور مواصلات کے بارے میں کوئی ہدایت ماننے سے انکار کرتی ہے تو دفعہ ۳۵۶ کے تحت صدر جمہوریہ کے اختیارات کی عدم موجودگی میں کیا صورت حال ہوگی۔ فرض کیجئے کہ گورنر کو متوازی اختیارات حاصل ہوں۔ تو اس کا مطلب کیا ہے ہوگا کہ صدر جمہوریہ کو اپنے ہی مقرر کردہ گورنر کے فیصلے پر تسلیم کرنا ہوگا۔ یہ بھی فرض کیجئے کہ گورنر کو صدر ریاست بنادیا جاتا ہے جسے صدر جمہوریہ مقرر نہ کرے اور منتخب ریاستی اسمبلی

منتخب کرے تو اس صورت میں صدر ریاست کا فیصلہ کیا حرف آخر نہیں ہوگا اور اس صورت میں مرکز ریاست کے ماتحت نہیں آجائے گا۔

ایک اور عملی معاملے کو یہ ہے۔ دفاع مرکز کے تحت معاملہ ہے جبکہ زمین حاصل کرنے کا معاملہ ریاستی معاملات میں شامل ہے۔ اگر ایک خاص قطعہ ارضی پر مرکزی حکومت چھاونی قائم کرنا چاہتی ہے تو اس کے لئے زمین ریاستی حکومت کی طرف سے حاصل کی جائے گی اور یہ بھی فرض کیجئے کہ ریاستی حکومت اس کام سے انکار کر دے تو اس کا علاج صرف یہ ہے کہ دفعہ ۳۵۶ کے تحت صدر جمہوریہ کے منشا پر عمل کیا جائے۔ دوسرے الفاظ میں انتظامیہ کے روزمرہ کے کام کاج کے دوران متعدد مسائل پیدا ہو سکتے ہیں کیونکہ اس معاملے میں مرکزی ضروریات کو ریاستی حکومت کو پورا کرنا ہے۔ اور اگر ریاستی حکومت مرکزی ضروریات کو پورا کرنے سے انکار کر دے تو مرکزی حکومت کے منشا کو نافذ العمل کرنا ہوگا۔

مشرقی یورپ میں موجودہ دور میں خود مختاری کے حق میں جو ہوا چل رہی ہے اسے چند خطوں کو زیادہ خود مختاری دینے کے لئے ایک دلیل کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ غربت پس ماندگی، جہالت، اقامت پسندی اور تنگ نظری کے مسئلوں سے پیشے بغیر زیادہ خود مختاری کے بارے میں سوچنا گھوڑے کے سامنے ٹھیل باندھنے کے مترادف ہوگا۔ ہمیں اندھی تقلید سے اپنی تباہی نہیں کرنی ہے۔ ہماری جنگ کے دیوتاؤں کے پیش نظر آزادی اور انسانی ترقی کے بلند اصول نہیں ہوں گے بلکہ ادنیٰ اور تنگ نظریات ہوں گے جن کے سبب ہر طرف بھینٹیل اور خونریزی پھیلے گی۔ آجی ما قول سے مستار خود مختاری کی اس خام خیالی سے ملک کے حقے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ اور سماج بکھر کر رہ جائے گا۔

جو لوگ کشمیر کے لئے خود مختاری کی بات کرتے ہیں وہ ریاست جموں و کشمیر کے وسیع اور گونا گوں سماجی، اقتصادی حالات کو نظر انداز کرنے کی ہر ہنسی کو شش کرتے ہیں جموں کے عوام کی اپنی انگلیں اور احساسات ہیں۔ وہ ایک وصال ایک نشان اور ایک پردھان (ایک آئین، ایک پرچم اور ایک صدر) کے لئے پابند ہیں ان کا تمدن اور تہذیب الگ ہے۔ راجپوت اور پوچھ کے سماجوں کی مختلف قدیں ہیں اور جموں پر پردیش کے ساتھ سرحد پر رہنے والوں کی بھی یہی حالت ہے جو ہزاروں دیگر لوگوں کا بھی نمایاں گروپ ہے اور لداخ قطعی طور پر مختلف ہے۔

اگر دفعہ ۳۵۶ کو برقرار رکھا جاتا ہے اور اندرونی خود مختاری کے معاملے کو زیادہ طول دیا جاتا ہے تو ہر علاقائی اور تمدنی اکائی دفعہ ۳۵۶ کے تحت مساوی پابندی خود مختاری چاہے گی تاکہ کشمیریوں کے غلبے کا مقابلہ کیا جاسکے۔ یہ دعوے اور مخالف دعوے نا تمام ہونگے اور ریاست کا خیرازہ بکھر کر رہ جائے گا۔

جموں کے عوام ذہن میں ایک دیرینہ شکایت نشوونما پاتی رہی ہے کہ دفعہ ۳۵۶ اور ریاستی آئین کے پس پردہ وادی کے لبرل روئے فیصلے لینے کے معاملے میں جو سیرا پیسری کی ہے اس سے اقتدار کا ڈھانچہ کشمیر خطے کے حق میں دائمی طور پر جھک گیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات سامنے لانی چاہیے کہ ۱۶ لاکھ نفوس کی آبادی پر جموں

سے لوگ سبھا کا ایک نمائندہ منتخب ہوتا ہے جبکہ کشمیر سے ہر نمائندہ دس لاکھ کی آبادی کے لئے منتخب ہوتا ہے۔
 جموں خطے کا کل علاقہ ۱۰ فیصد ہے اور کشمیر سے زیادہ ہے اور راکھ کے آبادی ریاست کی مجموعی آبادی کا ۳۵ فیصد ہے۔
 مگر جموں کے لئے ریاستی اسمبلی میں کل ۶۹ میں سے صرف ۲۲ نشستیں ہیں اور کشمیر کے لئے ۲۴ نشستیں ہیں۔ جموں خطے سے ۸۰۰۰۰۰ نفوس کی آبادی کے لئے ایک نمائندہ منتخب ہوتا ہے جبکہ کشمیر سے ۲۰۰۰۰۰ نفوس کی آبادی ایک نمائندہ منتخب کرتی ہے۔ جبکہ ۱۹۴۹ کے دوران وادی میں تین نئے اضلاع کا قیام کیا گیا مگر جموں کے لئے وزیر کمیشن کی طرف سے (۸۳-۱۹۸۱) سفارش کے باوجود ایک بھی نیا ضلع قائم نہیں کیا گیا۔ بلان رقوم کی تقسیم بھی غیر منصفانہ ہے شمال کے طور پر وادی کی سیاحت کے لئے ہر برس اوسطاً لاکھ سیاح آتے ہیں جبکہ جموں میں ویشنوادی استھان پر ۲۰ لاکھ سے زیادہ تہذیبی سیاح آتے ہیں اس طرح ریاست کی اقتصادیات میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ مگر ان سیاحتوں کو بنیادی سہولیات کی فراہمی کے لئے عملی طور پر کچھ نہیں کیا جاتا۔ یہاں تک کہ کڑھ تک کی سڑک جہاں سے جڑاؤں کی تعداد میں بیس روزانہ گزرتی ہیں، نہایت تنگ ہے۔ دوسری طرف بھاری رقوم کسی بھی تو ۹۰ فیصد سیاحتی بجٹ۔ وادی کے لئے الاٹ کی جاتی ہیں دوروں پر وینکٹ مگرگ کیبل کار اور سری نگر کالف کورس پر ۵ کروڑ روپے صرف کئے جائیں گے جبکہ جموں کی ڈوگرہ آرٹ گیلری جہاں فن کے نادر نمونے ہیں نہایت کمپرسی کی حالت میں ہے۔ یہی نہیں جموں کے خطے کا کل رقبہ ۲۹۳۲ مربع کلومیٹر ہے جہاں ۳۵۰ کلومیٹر سے سڑکیں ہیں جبکہ کشمیر خطے کا رقبہ ۱۵۸۵۳ مربع کلومیٹر ہے اور وہاں ۴۹۰۰ کلومیٹر سڑکیں ہیں۔ جموں کی صورت میں ۱۸ فیصد رقبہ میں سڑکیں دستیاب ہیں جبکہ کشمیر خطے کے لئے یہ فیصد ۴۰ ہے۔

لذا فیوں کو بھی یہ فکریہ ہے کہ دفعہ ۳۷ کی چابی کشمیری قیادت کے ہاتھ میں ہے وہ لوگ شکایت کر رہے ہیں کہ آزاد ہندوستان کے آزاد فرزندوں کی بجائے انہیں "کشمیریوں کے رحم و کرم" پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ انہیں اکثر یہ کہتے سنا گیا ہے۔ "اگر ہندوستان انہیں کشمیری غلبے کے زیر رکھنا چاہتا ہے تو یہ بات اتنی ہی بری ہے کہ ہم چینی غلبے میں رہیں یہاں تک کہ ۱۹۳۹ میں ہی وزیر اعظم نہرو کے نام ایک پر عذبات لیل میں لداخ بدھسٹ البیوسی ایشن نے زور دیا تھا کہ لداخ کو براہ راست مرکز حکومت کے تابع کیا جائے۔ انہوں نے کہا یہ تبت ہندوستان کی تمدنی بیٹی ہے اور ہم چھوٹا تبت ہونے کے ناطے مال کی ان چھاتیوں کی تلاش میں ہیں تاکہ اپنے قد کی مکمل نشوونما سے لئے زیادہ خوراک حاصل کر سکیں۔ کیا یہ عظیم مال (ہندوستان) اپنے کمزور معیشت زدہ اور تنہا بچے کو اپنی باہوں میں لینے سے انکار کرے گی؟ بد قسمتی کی بات ہے کہ ان نیک خیالات کا کسی نے مناسب جواب نہیں دیا اور دفعہ ۳۷ کی ضمانت کی بنا پر وادی کی لیڈر شپ نے لداخ پر لگ سبک لداخ و غلبہ جمایا جہاں تک کہ جو ادراقی تحقیقات ملک کے دوسرے حصوں میں حاصل تھے لداخیوں کو ان سے بھی خروم رکھا گیا جو لائی۔ ستمبر ۱۹۸۹ کے

دوران لداخی بودھوں کی منتشر دایکیشن بقول ان کے کشمیری غلبے اور استحصال کے خلاف شدید غصے اور احتجاج کے اظہار کے مترادف تھی۔

جموں کشمیر میں بنیادی کام خود مختاری کے جملی سکے کو رائج کرنا اور عوام کو تمدنی شناخت کے نام پر بے وقوف بنانا انہیں بلکہ بھوک افلاس اور بیماری کا خاتمہ اور ان عوام کی یکساں طور پر متوازن ترقی کو یقینی بنانا ہے جو خروم ہیں اور جنہیں کم مراعات حاصل ہیں۔ جب تک پسماندگی کو ختم نہیں کیا جاتا تب تک حقیقی آزادی اور جمہوریت قائم نہیں ہو سکتی یہاں تک کہ کشمیر کے تمدن میں بھی جمود طاری ہو جائے گا۔ درحقیقت دفعہ ۳۷ کے اختتام سے عزت پسماندگی دور کرنے میں مدد ملے گی اور اس کے عوض کشمیری تمدن کو تقویت حاصل ہوگی اور مجموعی طور پر یہ ریاست کے تشخص میں اضافہ ہوگا۔ کوئی بھی تن و تنہا فروغ نہیں پاسکتا اس میں مختلف النوع کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسے رابطے کے محرکات کی ضرورت ہوتی ہے۔

چند لیڈر اور مبصر یہ بات مسلسل کہہ رہے ہیں کہ دفعہ ۳۷ انتقاد کا معاملہ ہے مگر وہ اس سے آگے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ وہ خود سے یہ سوال نہیں کر سکتے کہ آخر اس انتقاد اور اعتماد کے معنی کیا ہیں؟ اس کی مغفولیت اور جو ان کیا ہے؟ آئین ہند کے مکمل دائرے میں لانے سے کیا ریاست کو زیادہ تابانی اور درخشانی حاصل نہیں ہوگی اور اس پر اعتماد اور اعتماد زیادہ تیز نہیں ہوگا کیلئے زیادہ منصفانہ اور باقاعدہ نہیں ہوگا؟

اسی سلب ولبہ میں تاریخی حیثیت اور خود مختاری کی بات کی جاتی ہے مگر عملی طور پر ان اصطلاحات کے کیا معنی ہیں؟ کیا تاریخی ضرورت کے یہ معنی ہیں کہ انڈین یونین میں آپ ایک مقابلہ کشمیر پر بھاری لاگت سے شامل کروادیں دوسری طرف اسے ایک طلائی طشتری پر ڈال کر واپس کر دوں خود مختاری ۱۹۵۳ سے قبل یا۔ ۱۹۴۷ سے قبل کی پوزیشن کے آخر کیا معنی ہیں۔ کیا یہ سب کشمیری قیادت کو یہ بات کہنے کے مترادف نہ ہوگا۔ تم بھجوں گے میں خراج کروں گا: اگر میں بد عنوان اور بے پرواہ چند سرور حکومت کا قیام بھی کروں اور اسی حالت میں بھی کروں کہ علیحدگی پسندی کی تلوار تمہارے سر پر لٹکتی رہے تو بھی تم کچھ نہیں کہہ پاؤ گے۔ یہ کیا دفعہ ۳۷ کی تسخیر ہو سکتی ہے؟ اگر ہو سکتی ہے تو کیسے؟ بعض اوقات یہ دلیل پیش کی گئی ہے کہ ریاست کی دستور ساز اسمبلی کی منظوری حاصل کئے بغیر آئینی طور پر اس دفعہ کو منسوخ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آئین کے واضح مطالعہ سے اس معاملے میں پوزیشن بالکل صاف ہے۔ دفعہ ۳۷ کا متعلقہ حقہ یوں ہے:

"اس دفعہ کی اس سے قبل ضمانت کے قطع نظر ایک نوٹیفکیشن کے ذریعے صدر جمہوریہ یہ اعلان کر سکتا ہے کہ یہ دفعہ قابل عمل نہیں رہے گی۔۔۔ بشرطیکہ ضمن (۲) کے تحت دستور ساز اسمبلی کی سفارش صدر جمہوریہ کے نوٹیفکیشن جاری کرنے سے قبل لازمی ہوگی۔"

صدر جمہوریہ کی طرف سے نوٹیفکیشن جاری کرنے کے معاملے میں دستور ساز اسمبلی کی سفارش کو بنیادی لوازم قرار دیا گیا ہے دوسرے لفظوں میں اگر مرکزی حکومت اس دفعہ کی تسخیر کا فیصلہ کرتی ہے تو وہ ریاست کی

دستور ساز اسمبلی کی شمولیت اور اس کی سفارشات حاصل کئے بغیر آئینی طور پر یہ کام سرانجام نہیں دے سکتی۔ دفعہ ۳۶۸ کے تحت اختیار اختیار اس معاملے میں ملانے و مددگار ثابت نہیں ہوں گے۔
ظاہری طور پر یہ دلیل متاثر نہیں ہے مگر آئین کی کسی قسم کی یا دفعہ کا تین تنہا مطالعہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس سلسلے میں دفعہ ۱ بنیادی اہمیت کی حامل ہے اس کے مطابق:

۱۔ یونین کا نام اور علاقہ

- ۱۔ ہندوستان یعنی بھارت ریاستوں کی ایک یونین پر مشتمل ہوگا۔
 - ۲۔ زمین کے تحت ریاستیں اور علاقوں کی تفصیل شیڈول اول میں درج ہوگی۔
 - ۳۔ ہندوستان کا علاقہ (۱) ریاستوں کے علاقہ جات (ب) شیڈول اول میں مخصوص مرکزی علاقے اور (ج) ایسے وہ علاقے جو حاصل کئے جائیں گے پر مشتمل ہوگا۔
- ریاست جموں و کشمیر گوشوارہ شیڈول اول میں ہندو ریاست ہے۔ آئین ہند کی دفعہ اول مجموعی حیثیت سے نافذ العمل ہے۔ آئین کے حصہ اکس (A) کا عنوان "عارضی اور خاص دفعات" ہے۔ پس جب دفعہ ۳۶۰ کی تفصیل کی گئی اس وقت یہ معاہدہ ختمی کہ اس دفعہ کا اطلاق متغیر تغیراتی عرصے کے لئے ہوگا چونکہ ریاست کی دستور ساز اسمبلی اب موجود نہیں ہے لہذا دفعہ ۳۶۰ کے تحت اس کی رضامندی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ دفعہ ۳۶۸ کے تحت اختیارات کی رو سے آئین میں ترمیم کی جاسکتی ہے۔ پارلیمنٹ ریاست کے عوام کی بھی نمائندگی کرتی ہے۔ اس کے بعد دستور ساز اسمبلی کی سفارشات سے متعلق شرط کو حذف کیا جاسکتا ہے۔ یہ شرط حذف ہو جائے تو صدر جمہوریہ ضروری نو فیملش جاری کر سکتا ہے اور دفعہ ۳۶۰ ختم ہو کر رہ جائے گی۔

جب بھی آئین کی ایک دفعہ کا دوسری دفعہ کے تحت تصادم ہوگا۔ بنیادی دفعہ کی بالادستی ہوگی۔ آئین کی دفعات کی تشریح کرتے ہوئے عدالتوں نے تبدیل شدہ حالات اور آئین کے مجموعی قومی نصب العین پر غور کیا ہوگا۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے دفعہ اول بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ سوویت یونین کے آئین کے برعکس کسی بھی ریاست کو علیحدگی کا حق حاصل نہیں ہے۔ تمام ملک کے علاقائی اور سیاسی معاملات مرکزی پارلیمنٹ کے دائرہ کار میں آتے ہیں۔ اور اسے یہ بات یقینی بنانے کا کفایت حق حاصل ہے کہ کوئی ایسی بات نہ ہو جس سے ملک کی علاقائی سالمیت کی افادیت میں کمی واقع ہو۔

کشمیر کی موجودہ صورت حال سے ظاہر ہے کہ دفعہ ۳۶۰ نے علیحدگی پسند نفسیات کو جنم دیا ہے۔ اور اس طرح ملک کی علاقائی یکجہتی کے لئے خطرہ پیدا کیا ہے۔ چنانچہ مرکزی پارلیمنٹ کو لازمی طور پر حرکت میں آنا چاہیے۔ اور جب عدالتوں سے آئین کی تشریح کے لئے کہا جائے اور دفعہ اول دفعہ ۳۶۸ اور دفعہ ۳۶۰ کو

ہم آہنگ کرنے کے لئے کہا جائے تو انہیں لازمی طور پر علاقائی سالمیت کے بارے میں دلیل کو قبول کرنا چاہیے اور دفعہ ۳۶۰ کو حذف کرنے کے پارلیمنٹ کے فیصلے میں دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے۔ خاص طور پر ان حالات میں جبکہ اس دفعہ کو نا انصافی کا آلہ کار بنایا جا رہا ہے۔ عدلیہ کا بنیادی نصب العین غیر متصفیات حالات میں انصاف کو یقینی بنانا ہے۔ یہ الفاظ دیگر عدلیہ آئین کی تخلیقی اور فوک تشریح کہتے ہیں اور اس صورت میں یہ دفعہ ۳۶۰ کے احزاب کو اس صورت میں یقینی طور پر بحال رکھے گی۔ جب اس کی تمت کو دفعہ ۳۶۸ میں ترمیم کر کے حذف کیا جائے گا۔

آئین ہند کی دفعہ ۳۵۵ بھی بھاری اہمیت کی حامل ہے۔ اس دفعہ کے تحت مرکزی حکومت پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ بیرونی حملے اور اندرونی گڑبڑ کے خلاف ریاستوں کا تحفظ کرے۔ اگر دفعہ ۳۶۰ اس بارے میں مرکزی حکومت کی راہیں آئینی فرائض کی انجام دہی میں مسدود کرتی ہے تو اسے ختم کر دیا جانا چاہیے۔ موجودہ حالات میں جب جموں و کشمیر کو بیرونی حملے اور اندرونی بغاوت دونوں جانب سے خطرہ ہے اور جارج عناصر دفعہ ۳۶۰ کا آسرا لے کر اندرونی گڑبڑ کرانے کے قابل ہو رہے ہیں تو مرکزی حکومت پر یہ لازم آئے کہ وہ اس دفعہ کو حذف کرنے کے لئے اقدامات کرے تاکہ دفعہ ۳۵۵ کے تحت تقویٰ پس کردہ فرائض کو یہ بخوبی سرانجام دے سکے چنانچہ اگر دفعہ ۳۶۰ کو دفعہ اول اور دفعہ ۳۵۵ کے تحت چڑھا جائے تو دفعہ ۳۶۰ کی شرط کی دفعہ ۳۶۸ کے تحت آئینی ترمیم بالکل جائز ہوگی اور اس شرط کو حذف کرنے کے بعد مجموعی طور پر دفعہ ۳۶۰ کو حذف کرنے سے متعلق صدارتی اعلانیہ الپوزیشن کو بالکل واضح کر دے گا۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ دفعہ ۳۵۵ (الف) کو حذف کر کے دفعہ ۳۶۰ کے مضمر اثرات کو بہت حد تک کم کیا جاسکتا ہے۔ اگر یہ تخریف دفعہ ۱۹ (الف) (د) اور (ص) کے تحت عمل آتی ہے تو بات صاف ہو جاتی ہے۔ ان دفعات کے مطابق:

"تمام شہریوں کو حقوق حاصل ہونگے کہ

(۱) وہ ہندوستان کے کسی حصے کے شہری بن سکتے ہیں اور وہاں آباد ہو سکتے ہیں۔

(ب) وہ کوئی بھی پیشہ اختیار کر سکتے ہیں کوئی بھی تجارت کاروبار کر سکتے ہیں۔

آئین ہند کا حصہ سوم (III) پہلے ہی ریاست جموں و کشمیر میں نافذ العمل ہے۔ دفعہ ۱۹ (د) (ر) اور (ص) کے بغیر حدود استعمال اگر کوئی بھی ہندوستانی جموں و کشمیر میں آباد ہو سکتا ہو تو آئین جموں و کشمیر کے تحت شہریت اور آباد کاری سے متعلق حقوق کی تمام مطلق العنان دفعات جو آئین ہند کے ساتھ غیر موافق ہیں ختم ہو جائیں گی۔

ریاست میں مستقل باشندگی کی دفعات کی صفائی دینے والوں نے بعض اوقات اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ پابندیاں شیخ عبداللہ نے ۱۹۴۷ء کے بعد عائد نہیں کیں بلکہ مہاراجہ نے ۱۹۴۳ء میں ڈگری

اور پنڈت سبھاؤں کی عرضداشتوں پر عائد کی ہیں۔ ۱۸۹۳ء کے حالات اور انداز فکر ہماری رہبری نہیں کر سکتے بلکہ آج کے حالات ہی ہمارے رہبر آئیں ہند کے بنیادی اصول میں ان پابندیوں کے بغیر منصفانہ ہونے کی بابت ۳۲-۱۹۳۱ء کا اشارہ دیا تھا۔ جب شکایاتی کمیشن کے جبر میں برطانوی عدالتیں نے اپنی رپورٹ میں کہا تھا "سٹیٹ سمیکٹ (مستقل باشندہ ریاست) کی موجودہ تقریباً نصف سے زیادہ سخت ہے۔ اس تقریب کے مطابق ایک ہزار برس کا مسکین بھی اس کا اہل شخص نہیں۔ ایسے ہی شخص کو رائے دی کے حق سے محروم رکھنا غیر منصفانہ اور مصالحت آمیز ہوگا حالانکہ گذشتہ مسلسل پانچ برسوں کے دوران اس سکونت پذیر کرنے یہاں کے حالات سے خود کو آشنا کر لیا ہے۔

ان پابندیوں کو نہ صرف جاری رکھا گیا بلکہ غیر ریاست دارانہ طور پر آئینی تحفظات بھی عطا کئے گئے۔ اس بات کو صریحاً فراموش کر دیا گیا کہ بنیادی طور پر ان پابندیوں کا غلاف ہمارا جس نے برطانویوں کو کثیر برسے باہر رکھنے کے لئے کیا تھا۔ اس اجڑے ہوئے شخص کے بارے میں میں نے گذشتہ باب میں تبصرہ کیا ہے۔ سپریم کورٹ نے اس بارے میں نا انصافی کو تسلیم کیا مگر ریاستی آئین کی دفعہ ۳۰ اور اس کے تحت بنائے گئے قوانین کی وجہ سے راحت نہ دے سکی۔ سپریم کورٹ کے شایعات کے متعلق اقتباس پیش کرتا ہوں۔ ++

تقسیم وطن کے نتیجے میں ۱۹۴۷ء میں جو اشخاص بھی پاکستان سے ہجرت کر کے ریاست جموں و کشمیر میں آئے اور جو ہندوستان کے شہری ہیں، انہیں حق ہے کہ وہ پارلیمنٹ کے انتخابات میں حصہ لیں مگر اندرون ریاست میں ان کا حق نہایت بے قاعدہ ہے وہ ریاستی اسمبلی کے فہرست ہائے انتخابات میں شامل کئے جانے کے اہل نہیں، انہیں بجاہت کے لئے منتخب نہیں کیا جاسکتا اور یہاں تک کہ وہ کوئی زمین خریدنے کے حقدار نہیں اور نہ ہی ریاستی حکومت کے تحت کسی ملازمت کے وہ اہل ہیں۔ ان تمام منکرات و محرومیوں کے باعث آئین جموں و کشمیر کی دفعہ ۱ کے تحت مستقل باشندہ ریاست کی تعریف جاری اہمیت کی حامل ہو جاتی ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ یہ دفعات ان حقوق کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتیں بلکہ ان حقوق کیلئے ایک کھلی ہوئی آئین ہند کے حصہ سوم (III) میں جن کی ضمانت دی گئی ہے۔ صدر جمہوریہ کی طرف سے آئین ہند کی دفعہ (۵) (۲) کے تحت جاری آئینی حکم ۱۹۵۴ء کے تحت آئین جموں و کشمیر میں دفعہ ۳ (۵) کا اضافہ کیا گیا تھا۔ اس بات کا اصل نتیجہ یہ نکلا ہے کہ یہ افراد حالانکہ ہندوستان کے شہری ہیں اور آئین کے تحت جن بنیادی حقوق کی ضمانت دی گئی ہے وہ انہیں حاصل ہو سکتے ہیں مگر ریاست جموں و کشمیر کے اندر وہ ان حقوق سے استغناء نہیں کر سکتے حالانکہ یہ لوگ اس ریاست میں گذشتہ ۳۰ برسوں سے سکونت پذیر ہیں۔ ان حالات میں اور ریاست جموں و کشمیر میں ایک مخصوص آئینی پوزیشن کے پیش نظر

++ ملاحظہ ہو باب دوم، تکریم کے تھرو کے ۱۹ اور باب پنجم، دہشت گردی کی جڑیں۔ پنہاں ریشے۔ (حصہ - علاقائی جڑیں)

ہیں انہیں کوئی راحت دینا ممکن نظر نہیں آتا۔ ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ یہ صورت حال بے قاعدہ ہے اور یہ اس کا دارومدار جموں و کشمیر کی قانون ساز یہ ہے کہ وہ جموں و کشمیر کا قانون عوامی نمائندگی کا قانون معمول اراضی اور قانون دیہی پنچایت میں ترمیم کرے تاکہ ہر فرد ۱۹۴۷ء میں مغربی پاکستان سے ہجرت کر کے آئے ہیں۔ وہ یہاں کی انتخابی نشستوں میں شامل کئے جانے، زمینیں حاصل کرنے اور پنچائتوں وغیرہ میں منتخب ہونے کے قابل ہو سکیں۔ یہ کام متعلقہ قوانین میں مناسب ترمیم کر کے کیا جاسکتا ہے اور اس کیلئے آئین جموں و کشمیر میں ترمیم لائی نہیں جاتی حکومت کے تحت روزگار کے مواقع فراہم کرنے کے لئے جموں و کشمیر سول سروس رولز میں تبدیلی کر کے یہ کام کیا جاسکتا ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے تکنیکل تعلیم کے اداروں کے معاملے میں بھی حکومت ان افراد کو مناسب انتظامی ہدایت جاری کر کے اہل قرار دے سکتی ہے اس کے لئے قانون پاس کرنے کی کوئی ضرورت نہیں مسائلوں کی شکایت جانتے رہے اور یقینی طور پر انہیں حکومت جموں و کشمیر کی طرف سے تحفظات کی توقع رکھنے کا حق ہے۔

سپریم کورٹ کی یہ تجویز کہ اس قسم کے غیر منصفانہ قوانین میں ترمیم کی جائے کو نظر انداز کر دیا گیا بد قسمتی سے ریاست کے حکمرانوں کا پس پردہ مقصد انصاف نہیں بلکہ سیاسی شہیدہ بازی ہے تاکہ چھوٹی چھوٹی سرداریاں قائم کی جاسکیں اور ریاست میں غریب اور بے وسیلہ افراد کو مستقبل کنفوزن اور اختلاف کا شکار رکھا جاسکے۔

اس معاملے میں ہمارے پوزیشن میں بیرون سیاستی افراد کی طرف سے زمین خریدنے پر عائد کردہ پابندی کا متوازی بیان کیا جاتا ہے۔ یہ متوازی پوزیشن غلط ہے۔ ہمارے پوزیشن میں یہ قانون مرکزی حکومت نے اس وقت نافذ کیا جب ہمارے پوزیشن مرکزی حکومت کے تحت ملا تھا۔ اس کا بنیادی مقصد غریب اور ناخاندانہ کاشتکاروں کے مفادات کا تحفظ ہے۔ آئین کے تحت اس پر غور و قرض ہو سکتا ہے۔ اور یہ بنیادی حقوق کے تابع ہے۔ عدالتیں ہر اس ضمن کو ناجائز قرار دے سکتی ہیں لیکن دارانہ پابندیوں کے تحت نہیں آئیں۔ مزید برآں یہ پابندیاں لگی نہیں۔ زرعی زمین کی خرید و حکومت کی اجازت کے تحت ہو سکتی ہے۔ جموں و کشمیر میں یہ ممانعت لگی حیثیت رکھتی ہے یہاں تک کہ سپریم کورٹ بھی دخل اندازی نہیں کر سکتی یہ بات متذکرہ بالا فیصلے سے ظاہر ہو چکی ہے۔

۲۱ راکٹ ۱۹۶۲ء کو دفعہ ۳۰ کے بارے میں پنڈت پریم ناتھ جاز کے فیصلے کے جواب میں جو ہر لال نہرو نے لکھا۔

معتیق طور پر آئین میں اس دفعہ کے باوجود بہت کچھ کیا جا چکا ہے اور جو کچھ باقی بچا ہے وہ بھی ختم ہو جائے گا۔ یہ کسی اور سپریم سے جذبات کا سوال ہے۔ بعض اوقات جذبات بھی اہم ہوتے ہیں مگر ہمیں دونوں پہلوؤں کا موازنہ کرنا ہے۔ میرے خیال میں فی الحال اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہونی چاہیے۔ اس خط سے ظاہر ہے کہ نہرو بھی مستقبل میں دفعہ ۳۰ میں تبدیلی کے امکان سے منکر نہیں تھا اور جہاں تک جذبات کا تعلق ہے یہ بات بالکل واضح ہو چکی ہے کہ اس دفعہ نے ایسی علیحدگی پنڈت تحریک کا نفسیات کو تقویت دی ہے جس نے ملک کی یکجہتی اور سالمیت کے لئے یہ خطرہ پیدا کر دیا ہے۔ اب وقت آ گیا ہے۔ جب اس غیر محنت مند پودے کو جڑ سے ہی اکٹھا کر دیا جائے۔

۲ جولائی ۱۹۸۳ء

ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی برطرفی

”ہر شے کا ایک موسم ہوتا ہے
خاموش رہنے کا وقت
اور بات کہنے کا وقت“

ہمارے بعض سیاسی مبصرین کی ایک عام کمزوری یہ ہے کہ اپنے ”باوثوق“ تاثرات کا اظہار کرنے سے قبل وہ حقائق کے یقین کی سہی نہیں کرتے۔ ان حالات میں حقیقت سبکی نکتہ چینی کی کئی پرتوں سے دب کر رہ جاتی ہے۔ تاریخ کے پاس خود کو درست کرنے کا راستہ تو بے ٹکریہ صرف وقت گزرنے پر ہی ممکن ہوتا ہے۔ ۲ جولائی ۱۹۸۳ء کو ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو وزیر اعلیٰ کے عہدے سے برطرف کرنے کا میرا فیصلہ بھی اسی صورت حال کا شکار ہے۔ چند خطے اب بھی اس فیصلے کو دیا نندارائے ارادوں کے فقدان میں لیا گیا فیصلہ قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ یہ لازم آتا ہے کہ اس معاملے کا مکمل پس منظر میں تفصیلی جائزہ لیا جائے۔

تناؤ زدہ ماحول

ریاست کی صورت حال گہرے تناؤ کی شکار تھی۔ ۵ جون ۱۹۸۳ء کے اسمبلی انتخابات کے بعد سیاسی ماحول نہایت پر اگندہ ہو چکا تھا۔ اس کے پس پردہ وہ طاقتیں کارفرما تھیں جن کی بابت میں پنجاب تو بہت گہری کی جڑیں میں بحث کی ہے۔

متذکرہ بالا انتخابات کے دوران جماعتی منتظمین نے فسطائی حربوں کا سہارا لیا۔ جان بوجھ کر دروغ گوئی کا سہارا لیا گیا۔ مذہبی اور علاقائی جذبات کا بے اصولے طور پر استعمال کیا گیا۔ وادی میں اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کے لئے مرکز مخالف رائے شماری کے حامی اور مسلم ووٹ حاصل کرنے کی خاطر ذہنی فضا پیدا کرنے کے لئے اپنے حق میں ایک بھاری بیڑہ تیار کرنے کی خاطر ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے میرا موٹو مولوی

فاروق کے ساتھ ہاتھ ملائے۔ حالانکہ موخر الذکر کے لئے اپنا رائے شماری اور پاکستان نواز موقف عارضی طور پر بھی ترک نہیں کیا گیا۔ سابق میرزا مظہر مولوی کا چچا یوسف شاہ ہجرت کر کے پاکستان چلا گیا تھا اور آزاد کشمیر کا صدر بن گیا تھا۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ مختلف مقامات پر مختلف زبان میں بات کرتا تھا مگر وادی میں اس نے ان گروپوں کی امداد حاصل کر لی تھی جن پر ”محاذ رائے شماری“ اندرونی کا ڈر تھا۔ اور جنہوں نے شیخ عبداللہ سے اس وقت قطع تعلقی کر لیا تھا جب اس نے کشمیر کا رڈ (۱۹۷۵ء) کیا تھا۔ ڈاکٹر عبداللہ نے وادی میں انتخابی مہم خود چلائی۔ یہ انتخابات ایک رائے شماری کے مترادف ہیں۔ یہاں عوام کو یہ کہنے کی اجازت ہوگی کہ وہ کون سی جماعت پسند کرتے ہیں۔ نیشنل کانفرنس یا کانگریس (آئی)۔ دوسری طرف محمد اندرا گاندھی اور کانگریس (آئی) نے پاکستان کی بابت اور تعقیب عناصر کے خلاف جموں کے عوام کے خدشات کو ابھارا تو ان وطن دشمن عناصر کے حق میں تھے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رائے دہندگان فرقہ وارانہ اور تنگ نظر تعظیم میں مبتلا ہو چکے تھے۔ وادی میں مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر نیشنل کانفرنس اور جموں خطے کے وہ علاقے جہاں غیر مسلموں کا غلبہ تھا اور ہندوؤں نے کانگریس (آئی) کے حق میں ووٹ دیا۔ انتخابی مہم کے دوران چند ایسے ناخوشگوار واقعات رونما ہوئے جو اپنی تلخ یادیں اور جارحیت کو پیچھے چھوڑ گئے۔ مثال کے طور پر ۳ جون کو اقبال پارک میں محترمہ گاندھی کے جلسہ تشدد پر گڑ بڑ کی گئی اور ناپسندیدہ طور پر غلط حربے استعمال کئے گئے۔ مرکزی اور ریاستی ایجنسیوں کے درمیان تنازعات بھی پیدا ہوئے۔ یہاں تک کہ ہندو ریٹنگ افسروں نے الیکشن کمیشن آف انڈیا کی ہدایات کی خلاف ورزی بھی کی۔ ریاست میں انتخابی فرائض کے لئے نیم فوجی دستوں کے ۱۰۰۰ افراد روانہ کئے گئے تاکہ خاص طور پر انتخابی مراکز پر غلط فہم فوری دستیار کی جاسکے۔ مگر حکام نے انہیں غیر اہم کام پر مامور کر دیا اور انتخابی مراکز کو مقامی پولیس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ دوسری طرف ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے ریاست میں جاری تہذیبی مراکز اور الیکشن کمیشن آف انڈیا کے مشاہدین کی بھاری تعداد میں موجودگی پر اعتراض کیا۔

فیصلہ سطح پر سیاسی اور انتظامی عناصر کے درمیان اتھار کی وجہ سے نیشنل کانفرنس کے امیدواروں کے حق میں انتخابی دھاندلیوں کے الزامات سے آسانی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس حلقہ ہائے انتخاب میں ۱۸ پولنگ سیٹوں پر قبضہ کرنے کی واضح شکایات تھیں۔ بہت سارے مقامات پر بھاری تعداد میں ایسی انتخابی پرچیاں ملیں جن کا کوئی حساب کتاب نہیں تھا۔ مثال کے طور پر جڈی بل حلقہ انتخاب میں نیشنل کانفرنس امیدوار نے ۹۰ فیصد ووٹ حاصل کئے جبکہ ۱۹۷۷ء میں جن دنوں شیخ عبداللہ اپنے عروج پر تھا جماعتی امیدوار کو ۱۰ فیصد ووٹ حاصل ہوئے تھے۔ ریاستی کانگریس کے سربراہ مفتی محمد سید نے یہ آگے بھرتے ہوئے کہا۔

۱۹۷۸ء میں بھٹو کی الیکشن کے عین مطابق ہے اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے۔ یہ فراڈ پر مبنی ہے۔ کانگریس

رائے نے ہم انتہائی عمدہ داریاں دائر کیں۔ دوسری طرف ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے الیکشن کمیشن پر جانبدارانہ رول کا الزام لگایا۔

حفاظتی اور انتظامی ماقول

۱۵ اگست ۱۹۸۳ء کے بعد متعدد دم دھماکے ہوئے جن کا ذکر میں پنجاب اڈل میں کیا ہے۔ اس سلسلے میں یوم جمہوریہ تقریب کے ایک واقف کی گفتگو میں محترمہ اندرا گاندھی کی ہدایات پر لی گئی چار مشہد افراد۔ اقبال قریشی، الطاف قریشی، الطاف ہاجن اور یحیٰ دلالہ گرفتار کئے گئے۔ اقبال قریشی باغ قریشی کا بھائی تھا جس نے ۱۹۷۱ء میں انڈین ایر لائنز کے ڈاکٹر فریڈ شپ جہاز کا انڈیا تھا۔ الطاف قریشی اس شرف قریشی کا بھائی تھا جو اس جہاز کے انڈیا میں شریک کار تھا۔ اس قسم کے خطرناک افراد کی موجودگی اس امر کی مثال کرتی تھی کہ ہوا کی سمت میں چل رہی ہے۔

۱۳ اکتوبر کو ہندوستان اور ویسٹ انڈیز کے درمیان ایک روزہ بین الاقوامی کرکٹ میچ کے دوران تخریب کے قابل مذمت واقعات پیش آئے۔ ہندوستانی کھلاڑیوں کی توہین کی گئی، ان کو گالیاں دی گئیں ان کی آواز دہانے کی کوشش کی گئی اور ان پر آواز سے کئے گئے یہاں تک کہ ان پر گلے مڑے پھولوں، کشتکوں اور پرجی ڈھنکوں سے حملہ کیا گیا۔ پاکستانی پرچم لہرائے گئے۔ میچ پیتھ کو کھودنے کی کوشش کی گئی ستمبر ۱۹۸۶ء میں گورنری راج کے دوران ہندوستان اور آسٹریلیا کے درمیان ایک میچ نہایت سلیقے اور ترتیب سے کھیلا گیا اس وقت ہندوستانی ٹیم کے کپتان کپسل دیو نے مجھے ۱۳ اکتوبر ۱۹۸۳ء کے غضبناک تجربات کے بارے میں بتایا۔ اس نے کہا کہ میری ٹیم کے چند افراد نے سوچا کہ انہیں ہلاک کر دیا جائے گا۔ ان ناخوشگوار واقعات کو ہندوستان میں ہزاروں شعلی ویزن دیئے جانے دیکھا اور اس سے تمام ملک میں غم و غصے کی ایک لہری دوڑ گئی۔ قوم کو دوسرا جھٹکا اس وقت محسوس ہوا جبکہ برہمن میں تعینات ہندوستانی سفارتکار رویندر ہمارے کافروری ۱۹۸۳ء میں جے اینڈ کے لبریشن آرمی نے انڈیا لیا اور ایک ہفتہ کے بعد اُسے ہلاک کر دیا۔ لبریشن آرمی محاذ پر انڈیا کے شہری کا درشت گرد دستہ تھا۔ اس المناک واقعہ کو وادی میں گڑ بڑ زدہ حالات اور ہند مخالف اور پاکستان نواز عناصر کے خلاف غیر فعالی تصور کیا گیا۔ درحقیقت یہ عناصر اور بنیادی سطح پر پرنشئل کانفرنس کا رکنوں کے درمیان جذباتی ہم آہنگی میں اختلاف نہیں تھا۔ ۱۱ فروری ۱۹۸۳ء کو مقبول پٹ کو پھانسی دیئے جانے کے بعد ریاست میں مزید تناؤ پیدا ہو گیا۔

اس وقت ایک اور بھاری پہلو سامنے آیا کہ مسلم اور ان سکھ نوجوانوں کے درمیان ایک گٹھ جوڑ پیدا ہو چکا تھا جو مرکزی حکومت کے خلاف تھے اور تحریک کاروائیوں کے مرکز بپتے تھے شمال کے طور پر ۲۹ مئی ۱۹۸۳ء کو ان عناصر نے ظاہر ان فسادات کے خلاف سری نگر میں ایک مشترکہ جلوس رکھا تھا۔

بھونڈی میں ہوئے تھے۔ فوج اور سرحدی حفاظتی فورس (بی۔ ایس ایف) کی سات گاڑیوں پر حملے کئے گئے۔ جن میں پانچ جوان مجروح ہوئے۔ اس جلوس میں انتہائی اشتعال انگیز نعرے۔ پاکستان زندہ باد تھا! اللہ زندہ باد!، نوزائیدہ نوزائیدہ، ضیاء الحق، ضیاء الحق۔ لگائے گئے، رجون کو ایک اور مشترکہ جلوس نکال لیا جس میں کھیلے عام ننھی تلواریں لہرائی گئیں۔ جرم لوٹ مار پر آمادہ ہو گیا متعدد دوکانوں اور گھروں کو نذر آتش کر دیا گیا ان میں آریہ سماج سکول اور نرنگاری بھون شامل تھے۔ ہنومان مندر پر بھی حملہ کیا گیا۔ بیماری کو زد و کوب کیا گیا اور مورقی کو جہلم میں پھینک دیا گیا۔

اس نوعیت کے بہت سارے واقعات پیش آئے۔ ۱۵ اگست ۱۹۸۳ء سے ۲ جولائی ۱۹۸۳ء تک کے عرصے میں جو واقعات ریاست پر اثر پذیر ہوئے ان کی تفصیل میں نے صفحہ بارہ میں دی ہے اگر اس ضمیمہ اور جو کچھ میں نے اوپر کہا ہے ٹھوکی طور پر پڑھا جائے تو ۲ جولائی کے آئینی حیران سے قبل حالات کی تصویر واضح ہو جاتی ہے۔

کنبے کی سیاست

شیخ عبداللہ کے کنبے کی کنس میں سیاست رچی بسی تھی اس کی سب سے بڑی بیٹی بیگم خالدہ شاہ بھی اپنے بھائی ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی مانر سیاسی بوا بھوسی کی شکار تھی۔ لیڈی میکیتھ کی طرح وہ بھی چاہتی تھی کہ اس کا شوہر بادشاہ بنے۔ بھائی اور بہن کے درمیان جھگڑا کا ایک خاص پس منظر ہے۔ شیخ کی خالدہ کے لئے خاص رغبت کے اور ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی غیر سنجیدہ شخصیت اور دونوں کے درمیان سرد کے بارے میں بہت ساری کہانیاں رواں ہیں۔

جی ایم شاہ ہر وقت یہ محسوس کرتا تھا کہ ریاست کی وزارت اعلیٰ اور پرنشئل کانفرنس کی قیادت پر اس کا سب سے زیادہ حق ہے۔ شیخ عبداللہ کی طرف سے اپنے فرزند کی تاج پوشی کے بارے میں کئے گئے فیصلے کے ساتھ اس نے کبھی تجویز نہیں کیا۔ وہ سرگوشا انداز میں کہا کرتا اس نے مشکل اوقات میں شیخ عبداللہ کا ساتھ دیا جیل بھی گیا ہے اور محاذ پر شہری کے سکریٹری کے طور پر بھاری محنت کر کے جماعتی ڈھانچے کے بارے میں وسیع تجربہ حاصل کیا ہے جبکہ ڈاکٹر فاروق عبداللہ ہمیشہ انگلینڈ میں عیش کرتا رہا اور اپنی میڈیکل ڈگری حاصل کرنے کے لئے برسوں لگا دیئے اور اس کے بعد شاہی محل کی سازشوں کے ذریعے اپنے باپ کی گدی حاصل کر لی۔

بعد ازاں جی ایم شاہ پر ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو دھوکہ دینے کا الزام لگایا گیا مگر اسی دلیل کے ساتھ وہ واضح کرتا کہ شیخ عبداللہ نے بھی تو اُسے دھوکہ دیا ہے اور یہ بعض اتفاق ہے کہ اسی نے اپنی زندگی بھر کے رفیق اور بہت سارے نصیب و فرائض شریک مرزا افضل بیگ کو بھی دھوکہ دیا ہے۔

جی ایم شاہ کچھ عرصہ تک غیر محرک رہا اور ظاہری طور پر اس نے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے ساتھ وفاداری بھی

دکھائی۔ جون ۱۹۸۳ء کے اسمبلی انتخابات کے دوران اس نے اپنی ساس کے ذریعے کم از کم اپنے اکلے حمایتوں کے لئے پارٹی ٹکٹ حاصل کرنے کا انتظام کر لیا۔ جب کانگریس (آئی) اور نیشنل کانفرنس کے دوران تعلقات میں تلخی پیدا ہوئی تو شاہ نے اسے موقع غنیمت تصور کیا اور اوند کرنے سے وجہ مند اشارے دیے۔ نصف درجن کے قریب اُن سابق وزراء نے بھی اہم شاہ کے ساتھ خاموشی سے ہاتھ ملا لئے جنہیں ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے شیخ کی وفات کے بعد نہایت اکلے پیچ نکال دیا تھا۔

اس سے الگ طور پر کانگریس (آئی) نے ڈاکٹر فاروق کی انتخابی دھاندلیوں اور بدعنوانیوں کے خلاف ایک عوامی ایگزیٹیشن شروع کی۔ متعدد مظاہرے کئے گئے۔ ۱۵ جنوری ۱۹۸۴ء کو ایسے ہی ایک مظاہرے کے دوران پولیس نے گولی چلائی جس میں کانگریس کے چار جماعتی ہلاک ہو گئے۔ کانگریس (آئی) کے لیڈر محمد شفیع قریشی نے کانگریس کے اس وقت کے سیکرٹری اعلیٰ کر کے ہونے کہا، یہ حیرت کا موجب ہے کہ جب آزاد ہندوستان زندہ باد کا نعرہ لگائیں تو آپ کو ہلاک کر دیا جاتا ہے اور اگر آپ پاکستان زندہ باد اور دیواری گٹھ واپس جاؤ کے لئے لگتے ہیں تو آپ عیش کرتے ہیں۔ سب سے سب سے بھی ڈاکٹر فاروق عبداللہ پر الزام لگایا کہ وہ قوم دشمن طاقتوں کے ہاتھوں جان بوجھ کر قیدی بن کر وہ گیارہ ماہ اپنی طرف سے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی ایسی شدت سے کانگریس کی نکتہ چینی کیا کرتا۔ یہاں تک کہ اُس نے دھمکی دی کہ اگر مرکزی حکومت نے فراخ دلانہ مالی امداد نہیں دی تو وہ امداد کے لئے سعودی عرب سے رجوع کرے گا۔ وہ کشمیر میں کانگریس کی یکجہات کو "چوروں اور غنڈوں کا گروپ" کہا کرتا جو اقتدار کے بغیر نہیں رہ سکتی۔

مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے درمیان تعلقات مزید کشیدہ ہو گئے اس کی وجہ خاص طور پر ریاست جوں و کشمیر میں سکھ نوجوانوں کے لئے تربیتی کیمپوں کی موجودگی تھی۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے جون ۱۹۸۳ء کے انتخابات میں اکیلیوں کی حمایت حاصل کی تھی اور سکھ نوجوان کے لئے اس کے دل میں مزہم گوشہ پیدا ہو چکا تھا۔ مرکزی وزیر داخلہ پی سی سنگھ نے ان دونوں موضوعات پر ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو متعدد خط تحریر کئے۔ اس نے ان تربیتی کیمپوں اور پنجاب اور کشمیر کے تحریک کاروں کے درمیان پیدا ہو رہے رابطے پر گہری تشویش کا اظہار کیا۔ انہوں نے وادی میں علیحدگی پسندوں اور پاکستان نواز عناصر کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کی مذمت کی۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ اور ریاستی حکومت نے ان الزامات کی زوردار تردید کی۔ ان اختلافات کی وجہ سے دونوں حکومتوں کے مابین بھاری چپقلش اور مناقشات پیدا ہوئے۔

جنوری ۱۹۸۴ء کے اواخر میں یہ بات اب پوشیدہ نہیں رہی تھی کہ جی۔ ایم شاہ اور اس کے حامی کانگریس (آئی) کی حمایت سے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی حکومت کو گرانے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ بی۔ کے نہرو کے ۲۰ جنوری ۱۹۸۳ء کے اس خط سے جس کا ذکر اس باب میں آگے چل کر میں نے کیا ہے یہ واضح ہے کہ اس کے ساتھ یہ معاملہ اٹھا یا گیا اور اس بارے میں اس نے فاروق عبداللہ سے بات چیت کرنے کے بعد اس امر کا یقین دلا دیا تھا۔

کر لی تھی کہ معمول کے قواعد کے مطابق مناسب نوٹس اور بحث کے بعد وہ اعتماد کا ووٹ حاصل کرے گا۔ کانگریس کا ایک ممبر اسمبلی شیخ عبدالجبار الم بناوت بلند کرنے والا پہلا شخص تھا۔ اس نے صدر جمہوریہ کو ایک یادداشت پیش کی تھی جس میں اس نے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی بدعنوانیوں کی فہرست پیش کرتے ہوئے اس کی برطرفی کا مطالبہ کیا تھا۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے حامیوں کا تو عمل مکمل طور پر کشمیری طرز کی سیاست کے عین مطابق تھا۔ انہوں نے شیخ جبار کو ہراساں کرنا شروع کر دیا اور جہاں کہیں وہ جاتا اُس کے ساتھ زور زبردستی کی جاتی تھی۔ ایم شاہ اور دیگر مخالفہ شاہ نے کھلے طور پر اس کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ ۲۳ اپریل ۱۹۸۴ء کو جب راکہ جی میں ایک عام جلسے سے خطاب کرنے کے لئے روانہ ہوئی مگر راستے میں اس پر حملہ ہوا اور وہ زخمی ہو گئی۔

ڈاکٹر فاروق عبداللہ اور جی۔ ایم شاہ کے درمیان تنازعہ تکمیل پر پہنچی تھی جب ان کے گروپوں نے حمایت کے الگ الگ کنونشن منعقد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ جی۔ ایم شاہ نے اپنا کنونشن ۲۳ مئی ۱۹۸۴ء کو کرنے کا فیصلہ کیا اور ڈاکٹر فاروق عبداللہ کا کنونشن چند روز بعد کرنے کا فیصلہ ہوا۔

تناؤ کی تناؤ

ہر طرف تناؤ کی تناؤ تھا۔ ریاست اور مرکزی نیشنل کانفرنس اور کانگریس (آئی) ڈاکٹر فاروق عبداللہ اور محمد اندرا گاندھی اور شیخ عبداللہ کے کنبہ کے افراد کے درمیان بھی تناؤ تھا۔ پاکستان اور خالصتان نواز عناصر بنی بھڑی پکا رہے تھے۔ ماقول میں زبردست تیزی تھی اور میری طرف سے ایک مولیٰ سی غلطی بھی چنگاری کا کام کرے اس بارود کا دھماکہ کرسکتی تھی جس کا نتیجہ موت، تباہی اور تلخی کی صورت میں ہو سکتا۔ بد قسمتی کی بات ہے کہ ہمارے ملک میں اگر کسی ایسے کو ٹال دیا جاتا ہے اور بھاری نقصان کو روک دیا جاتا ہے تو کوئی بھی اس امر کا نوٹس نہیں لیتا۔

ایک نازک رات

یکم جولائی رات ۳۰-۱۰ بجے میرے سیکورٹی عملے نے مجھے اطلاع دی کہ ممبران اسمبلی اور ممبران کونسل کا ایک گروپ جی۔ ایم شاہ اور ڈی ڈی ٹھاکر کی قیادت میں آکر مجھ سے ملاقات کرنا چاہتا ہے اور کوئی اہم گزارش کرنا چاہتا ہے۔ اس امر کا اشارہ دیا گیا تھا کہ انہوں نے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی حکومت سے اپنی حمایت واپس لے لی ہے اور اب یہ حکومت اقلیت میں رہ گئی ہے کیونکہ کانگریس (آئی) پارلیمان پارٹی نے نئے گروپ کی حمایت کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں نے اپنے سیکورٹی عملے سے کہا کہ وہ اس گروپ سے کہیں کہ وہ صبح ۸-۳ بجے آئے مگر یہ گروپ بعد تھا۔ اس کے جواب میں انہوں نے عملے کے ذریعے کچھ بول کہاں بھیجا۔ اگر پولیس بے لاگ ہوتی

تو ہمارے لئے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اور نہ ہی بے موقع اگر اس وقت ہم آپ کو زحمت دیتے۔ ہمارا حقیقی مسئلہ یہ ہے کہ انتظامیہ بالکل قیدی بن چکا ہے۔ چونکہ آپ پولیس کو تحفظ فراہم کرنے کے لئے کہیں گے ہمارے جمع ہونے کی خبر فوری طور پر ڈاکٹر فاروق عبداللہ تک بھیج دی جائے گی۔ اور پولیس کی سازش کے ساتھ ہم پرنسڈے جھوٹ دیئے جائیں گے۔ ہمارا قتل عام کر دیا جائے گا، ہمارے گھر جلا دیئے جائیں گے اور ہمارے افراد گنہ کو نقصان پہنچایا جائے گا۔ اگر آپ ہمارے ساتھ صبح کے وقت ہی ملنا چاہتے ہیں تو ہمیں راج بھون کے احاطے میں داخل ہو جانے دیجئے تاکہ ہمارے جمع ہونے کی خبر جب باہر پہنچے تو ہم پر حملہ نہ ہو۔

میں مانتا تھا کہ اس گروپ کے خدشات بے بنیاد نہیں تھے ہر کیف میں اپنے پہلے کے موقف پر ہی ڈٹا رہا۔ اس سلسلے میں میں نے صرف اتنی رعایت دی کہ وہ صبح ۳-۸ بجے کی بجائے ۷ بجے مل سکتے ہیں۔ حالات کی اس اچانک کروٹ کی وجہ سے میں قدم پریشان سا ہو گیا۔ حالانکہ یہ افواہ ضرور سچی کہی ایم شاہ اور اس کے ساتھی ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی حکومت کو کانگریس (آئی) کی حمایت سے گرانے کی کوشش کر رہے ہیں تاہم اس بات کا بہت کم امکان دکھائی دیتا تھا۔ درحقیقت اس بات کے اشارے مل رہے تھے کہ ڈاکٹر فاروق عبداللہ اور محترمہ اندرا گاندھی کے درمیان غلط فہمی کو دور کیا جا رہا تھا۔ انہوں نے خود مجھے جون کے آخر میں بتایا کہ اگر ڈاکٹر فاروق عبداللہ تخریب کاروں کے خلاف موثر کاروائی کرے تو وہ ان کے بہت سارے انحرافات کو نظر انداز کر سکتی ہیں۔ ان کے خیال میں اس کے عینا دوست اس کی ناپختہ ذہنی کاروائی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اُسے مسلم اور سکھ بنیاد پرستوں کو کیجیا کرنے کی خطرناک راہ پر گامزن کر رہے ہیں تاکہ پاکستان اپنا تھیل کھل کر کھیل سکے۔

ماہ جون کے آخر میں میری محترمہ گاندھی کے ساتھ ہوئی بات چیت کی روشنی میں متفانی کانگریس (آئی) کی قیادت کی طرف سے جی۔ ایم شاہ کے ساتھ ہاتھ ملانے کا فیصلہ مجھے قدرے حیرت مکن معلوم ہو رہا تھا۔

میں نے جلد ہی خود کو سنبھالا اور محسوس کیا کہ مجھے اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ فلاں واقعہ کیوں ہو رہا ہے اور ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔ جب فاروق خاں لطف اور فاروق نواز گروپوں کے درمیان جھگڑا جمع کو سامنے کھل کر سامنے آجائے گا۔ کیا ریاست میں آگ نہیں لگ جائے گی اور وادی کے اندر اور سرحد پار کی جارج قوتیں اس پر تناؤ و صورت حال کا فائدہ نہیں اٹھائیں گی۔

اس ادنیٰ کھیل کی بابت معلوم تھا جو سیاست دان کشمیر میں کھیل رہے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ کسی کارکن کے لئے ان کی پابندی کس قدر بناوٹی اور مصنوعی تھی اور کس طرح ان میں سے بہت سارے افراد نے اپنے ضمیر کا احساس تک بھی نہیں دکھایا تھا اور قدیم پسند، فرقہ واریت اور علاقہ پرستی کو اپنے اقتدار کی اساس بنایا تھا۔ ایسے لیڈروں کے لئے انسانی جائزوں کو تلف ہونے دینا اخلاقی طور پر ناقابل دفاع ہو گا۔ ان لوگوں کے لئے اقتدار ہی سبھی کچھ تھا، عوام، اصول یا قدریں ان کے لئے کوئی وقعت نہیں رکھتے تھے۔

میں نے سوچا، دونوں گروپ اپنے اپنے گھوٹلوں کی نگہبانی کریں گے۔ دونوں محض اپنے ہی رائے گئے افراد کے مفادات کو پورا کریں گے۔ دونوں غریبوں کو بے وقوف بنانے کی کوشش کریں گے۔ دونوں غلط بیانی اور نفسانی شکستوں کا سہارا لیں گے۔ دونوں آئین ہند کی دفعہ ۳۷۰ کے بارے میں عوام کو گمراہ کریں گے۔ عوام کے جان و مال کا تحفظ اور قومی مفادات کی حفاظت میرا بنیادی مقصد تھا۔ حقیقی انصاف حقیقت سے غیر جانبداری جو بناوٹی انصاف اور مصنوعی جانبداری سے قطعی طور پر مختلف ہو میرا مقصد تھا چنانچہ میں نے اپنی حدود کے اندر رہتے ہوئے سرگرم رول اپنانے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ اگر میں کبھی غیر فعالی میں ہی مبتلا رہوں تو اس کا خطرناک غمناک نتائج سے بھگتنا پڑ سکتا ہے۔

میں نے پہلا کام یہ کیا کہ کاغذی سیکریٹری سی آر کرشنا سوامی رائے صاحب اور داخلہ سیکریٹری ایم۔ ایم کے ولی کے ساتھ ملی فون پر بات کر کے انہیں اس صورت حال کی بابت پیشگی اطلاع دی جو صبح کے وقت پیدا ہو سکتی تھی۔ میں نے اس معاملے میں ریاستی حکومت کی جانب سے کچھ نہ کہا بلکہ محض انہیں مطلع کر دیا۔ میں نے ایسا اس لئے کیا کہ پہلی کاغذ شدہ تجربہ یہ تھا کہ جہاں کہیں ایسا تنازعہ پیدا ہوا یا گڑبڑ پیدا ہوئی مرکزی حکومت کی تنصیبات اور دفعوں کو سب سے پہلے جملے کا نشانہ بنایا گیا یہاں تک کہ قومی کارٹریوں کو بھی نہیں بخشا جاتا تھا۔ مذہبی اور تاریخی اہمیت کے مقامات پر دھماکے بھی ہو سکتے تھے اور انہیں نقصان بھی ہو سکتا تھا تاکہ تمام آبادی کے مذہبی جڑ بات کو اُبھارا جائے جیسا کہ کشمیر اسلام کے موعود مسیح کی دسمبر ۱۹۶۳ء۔ جنوری ۱۹۶۴ء کے دوران چوری کے بعد ہوا تھا۔ چنانچہ میرا فرض تھا کہ مرکزی حکومت کو اس بارے میں مطلع کروں اور انہیں غیر رسمی طور پر مشورہ بھی دوں کہ وہ مرکزی پولیس فورس کو وادی کے نزدیک رہنے کے بارے میں انتظامات کر سکیں۔ تاکہ صبح کو وسیع پیمانے پر گڑبڑ ہونے کی صورت میں مرکزی تنصیبات کا تحفظ ہو سکے۔

بعض اخبارات نے اس معاملے میں میری اس کاروائی پر بعد ازاں بھاری شور مچا دیا۔ اس بارے میں کہا گیا کہ معلوم ہوا ہے جیسے میں نے ریاستی حکومت کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے۔ اس معاملے میں زیادہ دروغ گوئی کی کوئی بات نہیں میں نے کوئی حکم جاری کیا تھا اور نہ ہی ریاستی حکومت کی طرف سے اس امر کی کوئی غدارش کی تھی مرکزی حکومت کو ان حالات کے بارے میں ہر وقت اطلاع دینا جو ایک سنگین عوامی بد نظمی پیدا کر سکتے تھے یا ریاست میں تحفظ کی افادیت کو کم کر سکتے تھے، میری جان بوجہ ذمہ داری ہی نہیں بلکہ آئینی فرض بھی تھا۔ مزید

بر آں انسانی جانوں کا تحفظ ایک انسانی فرض بھی تھا۔ جو تمام دوسرے فرائض سے بالاتر فرض تھا۔
اپنی کتاب "مائی ڈسمل" My Dismissal کے صفحہ ۳ پر ڈاکٹر فاروق عبداللہ رقمطراز ہے: اگر مجھے غیر
آئینی طور پر برطرف نہیں کیا جاتا تھا تو گورنر نے قانون و انتظام کے حالات کا معائنہ کرنے کے لئے خاص انتظامات
کا اہتمام کیوں کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ میں نے تمام متعلقہ افراد کو مطلع کر دیا تھا کہ فورسز کو نزدیک ترین رکھا
جاسکے۔ میری کچھ یہ کہتی تھی کہ صبح کے وقت میرے فیصلے کا جو بھی نتیجہ ہو فورسز کی ضرورت پڑ سکتی ہے جیسا کہ میں
امید کرتا تھا کہ اگر گورنری راج ہو جائے تو مجھے فورسز کی ضرورت ہوگی اگر فاروق کی حکومت جاری رہتی ہے
اور امن و امان مفلوج ہو جائیں تو فورسز کی ضرورت پڑے گی۔ اور اس صورت میں بھی فورسز درکار ہو سکتی کہ
جب شاہ حکومت اقتدار سنبھال لے تو اس کے مخالف وسیع پیمانے پر گڑبڑ شروع کر دیں۔ میں نے مطلع کیا۔ میں
نے مشورہ دیا اور میں نے خبردار کیا پہل قدمی کی خاص طور پر جب وہ عوامی مفادات میں ہو کہیں بھی مخالفت میں
ہے۔ اس صورت حال میں ادبی جے محسوم کو اے اصول سیاست والوں کی چال بازیوں کا نشانہ بننے سے بچانا ہو۔
میں نے شمالی کان کے جنرل انیسٹر گمنٹنگ لگنٹن جنرل ایم۔ ایل جیمز کے ساتھ فون پر رابطہ قائم کیا۔
اسے ان حالات کی بابت آگاہ کیا تاکہ وہ اپنے افسروں کو خبردار کرے کہ وہ گمراہ شہریوں کے کسی فعل سے اشتعال نہ
نہ آئیں خاص طور پر تب جب عام ڈیوٹی پر جاری فوجی گاڑیوں پر خشت باری ہو۔ میں نے اُسے سرنگر آنے کی
تجویز بھی پیش کی کہ اگر حالات سنگین ہو جائیں تو جلدی سے فیصلے کئے جاسکیں۔ عوامی مجلس عمل کے ریڈر مولوی
محمد فاروق کے ... ڈاکٹر حامیوں اور ان کی طرف سے تشدد کا خدشہ بھی ایک ایسا پہلو تھا جسے نظر انداز نہیں کیا
جاسکتا تھا۔ مجھے یہ یقین نہیں تھا کہ جموں و کشمیر آرڈیننس کی چھ بنالیوں کا کیا رویہ ہو گا۔ مجھے بتایا گیا تھا
کہ اس فورس کی بھرتی کے معاملے میں ان لوگوں کی لحاظ داری کی گئی تھی جن میں مرکز مخالف جذبات بھرے ہوئے تھے۔
انتظامی تنظیم کے ایک مضبوط عمل اور تحقیق حکمت عملی کے طور پر میں نے بدترین حالات کا پیشگی اندازہ کر لیا اور ان
سے نمٹنے کے انتظامات کر لئے۔ انتظامیہ میں چند عظیم ترین اور ہر ایک حادثے اس وجہ سے اور
ان لوگوں کے سبب ہوئے تو اس بات کا یقین کامل رکھتے تھے کہ حالات ان کی سوچ کے مطابق ہی رخ لیں گے۔
موجودہ دور کے انتظامیہ میں ایک طبقے کی حماقت کے سبب اور معاملات کی تہہ تک پہنچنے کی نااہلیت مہلک
خطاؤں کا باعث ہوتی ہے۔ ان کوتاہیوں کی وجہ سے لاتعداد فسادات ہوئے جن کے باعث جان و مال کا ہر
نقصان ہوا اور اس کے علاوہ قومی یکجہتی اور استحکام کی قوتوں کی افادیت میں کمی واقع ہوئی۔
میں نے انیشی جنس بورڈ کے مقامی سربراہ کے پی سنگھ کے ساتھ بھی رابطہ کیا اس نے مجھے بتایا کہ اس وقت عوام
کو یہ خبر نہیں ہے کہ کیا ہو رہا ہے مگر صبح کے وقت خبر پھیل جائے گی ایک لازمی امر ہے اور چند ریڈر کو کشش کریں گے کہ
رجیم سڑکوں پر لائے جائیں اور انہیں مشتعل کیا جائے۔
کے پی سنگھ کے ساتھ تہذیبی اطلاعات نے میرے اس نظر سے کوئی فرق نہ دے گا کہ وہ معاملے میں کوئی خطہ

مول نہیں لینا چاہیے اور نہ ہی کسی نظریاتی مصلحت کو اس میں سدا راہ ثابت ہونے دینا چاہیے۔ آئین جموں و کشمیر کی
اہم دفعات کے بارے میں مجھے مکمل واقفیت تھی مگر میں نے مناسب سمجھا کہ ان دفعات پر ایک مرتبہ نظر ڈالی
جائے۔ یہ بات ان حالات اور واقعات پر منحصر ہے کہ جن میں ان کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ تمام امکانات پر غور نہ کرنا
نا بھی کی بات ہوگی اور کسی پیشگی واردات سے خیل شدہ امکان پر بھی مسئلے کے ساتھ نمٹنا بھی بڑی کم عقلی ہوگی۔ بہر کیف
صبح کے وقت میری حکمت عملی کا دار و مدار اس بات پر ہو گا کہ صبح کے وقت متعلقہ پارٹیاں کیا موقف اختیار کرتی ہیں۔

ایک نازک دن

اس غور و فکر تہذیبی اطلاعات اور لکھنے پڑھنے میں عملی طور پر تمام رات گزر گئی میں ان حالات میں اس قدر
مخو تھا کہ مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ ۲ جولائی ۱۹۸۳ء صبح ۳ بجے چکے ہیں۔ اس بات کا اطمینان ہو جانے پر کہ عملی طور پر جو بھی ممکن
ہو سکتا تھا میں نے کر لیا ہے میں بالائی منزل پر سونے کے لئے چلا گیا۔ دو گھنٹے تک میں گہری نیند سو یا یہ وہ نیند تھی جو
انسان کو اس وقت آتی ہے جب اُسے اس بات کا احساس ہو کہ کوئی کام محنت اور شعور کے ساتھ سرانجام دیا گیا ہے اور
اس کے جو بھی اچھے یا بُرے نتائج ہوں گے وہ انہیں صبر و استقلال کے ساتھ برداشت کرنا ہو گا۔

جب میں ۷ بجے صبح دفتر واپس پہنچا تو مجھے بتایا گیا کہ جی۔ ایم شاہ کی قیادت میں گروپ وارد ہو چکا
ہے اور کلیدی عمارت سے ۳۰ سے ۳۵ میٹر دور بال میں انتظار کر رہا ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ کانگریس آئی۔ پی۔ ایم
پارٹی لیڈر افتخار حسین انصاری بھی ان کے ہمراہ ہے۔ میں نے چند منٹ تک حالات پر دوبارہ غور کیا اور تب
اس وفد کو غور و وقت پر شبہ سے ملنے کی اجازت دے دی۔

جی۔ ایم شاہ نے مجھے ۲۸ جون ۱۹۸۳ء کا تحریر کردہ خط پیش کیا جس پر ۱۱۲ راکین اسمبلی منشی حبیب اللہ
کرگل، محمد دلاور میر رفیع آباد، مسام الدین باندے، معزز علی شیخ، عبدالجبار رنگن، طالب حسین راجوری ڈاکٹر محبوب
بیگ، انتہا ناگ، حاکم محمد یاسین خان نصاب، محمد خلیل جوہر باندی پور، گورنر جین کمار رانا، نامزد غلام حسن میسر
گھرگ، کیم لٹا، مکمل نامزد اور شہناز اللہ ڈار پلوامہ نے دستخط کئے تھے۔ اس خط میں کہا گیا تھا۔

ہمیں توقع ہے کہ عمران نیشنل کانفرنس میں اندرونی انتشار کی بابت آپ کی ذات گرامی کو معلوم ہی ہے
نمبر ۱۹۸۲ء میں ہمارے محبوب رہنما شیر کشمیر کی وفات حسرت آیات کے بعد ہم نے اتفاق رائے سے ڈاکٹر فاروق عبداللہ
کو نیشنل کانفرنس کا قائد منتخب کیا تھا۔ ہمیں توقع تھی کہ وہ اپنے والد کے اصولوں اور راستے پر کاربند رہے گا۔ گذشتہ
اُنیس ماہ کے قریب اس عرصے کے دوران وہ ان اصولوں پر کاربند نہیں رہا ہے اور جماعت اور اس کے رہنما کے
پر وگراموں پر عمل درآمد میں بُری طرح ناکام رہا ہے۔ اس نے شیر کشمیر کی تمام کاہنہ کو اس بہانے سے برطرف کر دیا کہ
کاہنہ تھا اس کے نتیجے میں ہمارے اس عظیم رہنما کا بدنام ہوا جس نے ایک طویل عرصے تک کاہنہ کی صدارت کی تھی۔

شیر کشمیر اور جماعت کی بدایات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے احتجاج دشمن عناصر اور بنیاد پرست عناصر کے

ساتھ ناپاک گٹھ جوڑ کیا گیا ہے جن کے خلاف شیر کشمیر ۵۲ برسوں تک کے طویل عرصے کے دوران برسرِ پیکار رہے۔ جماعتی ڈھانچے کو اس قدر تبدیل کر دیا گیا ہے کہ اسے پسپا نا بھی نہیں جاسکتا۔ ناپسندیدہ افراد کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے اور حقیق کارکنوں کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ جی۔ ایم شاہ جس نے جماعت کے لئے جی جان لٹا دی ہے اور جس نے شیر کشمیر کے ساتھ دہائیوں تک مصوبتیں برداشت کیں، کو بھی ڈی۔ ڈی ٹھاکر کے ہمراہ جماعت سے نکال دیا ہے۔ ٹھاکر ہمارے قائد کا نزدیک رقیب تھا۔ دیگر سینئر لیڈروں کو بھی جماعت بدر کر دیا گیا ہے اس مرحلے پر ہم راقمان جی۔ ایم شاہ کے ساتھ سالمیت کا اظہار کرتے ہیں۔ اور ہمیں احساس ہو گیا ہے کہ صرف وہی جماعت کو انتشار سے بچا سکتے ہیں۔ ہم نے غیر مبہم الفاظ میں ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو بتا دیا ہے کہ اس نے ہماری حمایت کھودی ہے اور ہم اس کی حکومت کی پالیسیوں کی مزید حمایت نہیں کر سکتے۔

۷۔ جنوری ۱۹۸۳ء کو ہمیں خدشہ تھا کہ ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ وہ ایوان میں اکثریت کا اعتماد کھو چکا ہے۔ شدید عیاوی کے اس عالم میں یا تو وہ اسمبلی کو توڑنے کی سفارش کر سکتا ہے یا اکثریت سے اس امر کی قرارداد منظور کرا سکتا ہے۔ اس روز ڈاکٹر عبداللہ اور اس کے وفادار دلہنیں دم کیا اور اس دباؤ کے تحت اعتماد کا ووٹ حاصل کر لیا جو ہمارا رضا کارانہ ووٹ نہیں ہے۔

ہم گزارش کرتے ہیں کہ ڈاکٹر فاروق عبداللہ ایوان زیریں میں اکثریت کی حمایت کھو چکا ہے۔ چنانچہ اُسے ایوان کو توڑنے کی سفارش کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ لہذا ہماری گزارش ہے کہ اگر وہ اس قسم کی سفارش کرے تو اُسے نظر انداز کر دیا جائے اور مسترد کر دیا جائے۔

ہم مزید درخواست کرتے ہیں کہ ہم نے جی۔ ایم شاہ جس کی قیادت میں مکمل اعتماد کا اظہار کیا ہے جسے اللہ ان کے دوسرے حقوق کا اہتمام بھی حاصل ہے جو حکومت تشکیل دینے کے لئے کہا جائے جو ایک مستحکم حکومت ہوگی ہیں توقع ہے کہ یہ حکومت ہمارے رہنما شیر کشمیر کی پالیسیوں اور پروگراموں پر عمل پیرا ہوگی۔

اس درخواست کے ہمراہ ایک آزاد ممبر اسمبلی علی محمد نانک کا ۲۳ جولائی ۱۹۸۳ء کا تحریر کردہ ایک نوٹ لکھا اور ۲۲ جولائی ۱۹۸۳ء کو غورہ ایک اور خط مولوی افتخار حسین انصاری کی طرف سے تھا۔

جی۔ ایم شاہ نے پیش کش کی کہ وہ ان ۱۲ اراکین اسمبلی کو میرے سامنے پیش کر دے گا۔ اس نے اپنی پہلی درخواست کے تسلسل میں ایک اور درخواست تحریر کی۔ اس کے بعد اس نے ان ۱۲ اراکین اسمبلی کو پیش کیا جنہوں نے میرے روبرو اس پر دستخط کئے دوسری درخواست یوں تحریر کی گئی تھی۔

۱۰۔ اپنے ۲۸، ۳۶، ۶۹ کے خط کے تسلسل میں ہم جموں و کشمیر کا لڑن سارا اسمبلی کے مندرجہ ذیل اراکین جن کا تعلق نیشنل کانفرنس کے ساتھ ہے خود کو آپ کی ذات گرامی کے سامنے پیش کرتے ہیں اور گزارش کرتے ہیں کہ ہم نے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے تئیں انہی حمایت واپس لے لی ہے جو ڈاکٹر فاروق عبداللہ اس حمایت کے واپس لئے جانے کے نتیجے میں اراکین اسمبلی کا اعتماد کھو چکا ہے۔

ہم نے جی۔ ایم شاہ ممبر قانون ساز کونسل کو اپنا لیڈر چنا ہے چنانچہ ہم آپ سے گزارش کرتے ہیں کہ آپ جی۔ ایم شاہ کو ریاستی حکومت تشکیل کرنے کے لئے تلقین کریں۔

ہم مزید گزارش کرتے ہیں کہ کانگریس (آئی) قانون سازی پارٹی کے تجویزیں اراکین کے علاوہ ایک آزاد رکن اسمبلی علی گھڑناٹیک نے بھی حمایت کا اہم کیا ہے۔

جی۔ اہم شاہ کی قیادت میں گروپ سے میں نے پوچھا کہ وہ اپنی طاقت کا مظاہرہ قانون ساز اسمبلی میں کیوں نہیں کرتے ان کا جواب صاف اور سیدھا تھا۔ یہ سیکرٹری جنرل رول اداکرے گا۔ یہ بات گذشتہ اجلاس میں واضح ہو چکی ہے جب تمام قواعد کو چانگ نزم کر کے ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے اعتماد کا ووٹ حاصل کر لیا یہ بات بی کے نیرو کو دی گئی اس یقین دہانی کے باوجود ہونی وہ اس بارے میں شفقناز کاروائی نہیں کرے گا اور یہ ووٹ معمول کے طور پر بقول سے حاصل کیا جائے گا۔ ریاستی پولیس کے چند عناصر کے علاوہ فنڈز کو ہم پر بھروسہ دیا جائے گا۔ اور ہمارے خلاف عوامی ہفتے کو ابھارنے کا فسطائی حربہ استعمال کیا جائے گا۔ مجھے اس فیصل میں وزن معلوم ہوا مگر میں قدرے شک میں رہا کثیر میں ہمارے کسٹمرز کی بھروسیت ہے جب غنہ گردی اور فسطائی طور طریقے حالات کی روش کا تعین کرتے ہیں۔

میں نے جی۔ ایم شاہ اور اس کے رفقاء اُسے دستاویزات حاصل کر لئے اور انہیں بال میں منتقل کرنے کے لئے کہا۔ میں نے ڈاکٹر فاروقی عبداللہ کو ٹیلی فون کیا اور اُسے رات بھون تک آنے کی درخواست کی۔ اس نے کہا کہ وہ غسل کرنے کے بعد آجائے گا۔ اُسے آنے میں ۳۵ منٹ کا وقت لگا۔ دیریں اشنا میں نے جی ایم شاہ اور اس کے رفقاء کے خط کی فوٹو سنٹ کاپی تیار کر لی تھی۔ اسی دوران لفٹننٹ جنرل ایم اے حبیب الرحمن جیو ٹی وی کے ساتھ چائے کی پیالی پیش کی اور حالات کی بابت اُسے مطلع کیا۔ جب میرے اے۔ ڈی۔ سی نے اعلان کیا کہ فاروقی عبداللہ پہنچ چکا ہے۔ میں نے کہا کہ اسے ڈرائنگ روم میں بیٹھا جا جائے اور لفٹنٹ جنرل حبیب کو اپنے دفتر میں چائے پیئے چھوڑ کر میں ڈرائنگ روم میں آگیا۔

عام مصفا اور روانی باتوں کے بعد میں قریباً ان الفاظ میں ڈاکٹر فاروق عبداللہ سے مخاطب ہوا۔ ”معمولاً سیاسی بحران پیدا ہو گیا ہے ہمیں اس پر خاموشی سے غور کرنا ہو گا۔ میں اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ اس کا فوہ کچھ نتیجہ ہو ہمیں امن وامان کا مسئلہ پیدا نہیں کرنا ہے۔ یہ وہ خطوط ہیں جو جی۔ ایم شاہ اور دوسروں نے مجھے دیئے ہیں۔ شاہ کا دعویٰ ہے کہ اب آپ اقلیت میں ہیں اور اس کا مطالبہ ہے کہ آپ کو ہٹا دیا جائے اور اکثریت میں ہونے کی وجہ سے اُسے وزیر اعلیٰ کا حلف دلایا جائے۔ شاہ کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ ریاست میں پیدا کی گئی دھماکہ خیز صورتحال اور ۲۶ جنوری ۱۹۸۴ء کو جو مصنوعی ووٹ حاصل کیا گیا ہے اس کی روشنی میں اُسے ایوان اسمبلی کے اندر طاقت کی غیر جانبدارانہ آزمائش کی امید نہیں۔“

ذاکر فاروق عبداللہ کافوری ردِ ثعلبی یہ تھا کہ وہ میران و شمسدر رہ گیا اور اس نے حیدرآباد سے الفاظ ہے

پتور اور بد معاش منمنانے اس نے اس درخواست اور اس پر مثبت دستخط کو پہنچ نہیں کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان چوروں اور ان بد معاشوں سے کسی سلوک کی توقع رکھتا تھا جو وہ اس وقت کر رہے تھے۔ وہ سازش یا دھوکہ سمجھتا تھا جسے اسے اس قدر یقین تھا کہ اس نے اس بات کی تصدیق بھی نہ کی کہ جو بیگم ام شاہ کہہ رہے آیا وہ درست بھی ہے یا نہیں اپنے کتاب کے مافیہ ذمہ میں وہ خود کہتا ہے۔ میں ان تمام لوگوں کے چہرے نہیں دیکھنا چاہتا تھا جنہوں نے مجھے دھوکہ دیا۔ ان ناموں سے ہی اسے اپنے خلاف ہونے والی بغاوت کے بارے میں معلوم ہو گیا جو کان و زرا کو نکالے جانے کا نتیجہ تھی جو شیخ عبداللہ کی کاہنہ کے اراکین تھے۔ اور دوسرے چند ایسے افراد تھے جن کی بواہر میں نے اسے دھوکہ دیا تھا۔

ڈاکٹر فاروق عبداللہ کچھ کہنے کے لئے شیشا رہا تھا مگر دراصل اسے پتہ نہیں تھا کہ کیا کہنا چاہیے۔ اس کے ذہن کی بغیر یقینی کیفیت کا اندازہ کرتے ہوئے میں نے کہا۔ دیکھئے ڈاکٹر صاحب آپ کو اس بحران کی وسعت کو سمجھنا چاہیے۔ اب آپ واضح اقلیت میں ہیں اور ظاہر ہے کہ میرے لئے یہ ممکن نہیں ہوگا کہ اقلیتی حکومت کو قائم رہنے دوں۔ آپ کو استغنیٰ دینا پڑے گا۔ آپ کو میری مجبوریوں کو سمجھنا چاہیے۔ اور اس نازک ریاست میں امن عامہ کے قیام کے لئے میری تشویش کو بھی سمجھنا چاہیے۔ میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ مجھے آپ پر بھروسہ ہے مگر آپ کے پاس یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ پر بھروسہ کر سکتا ہوں۔ جو تمام متعلقہ افراد کے لئے منصفانہ بھی ہوگا۔

کوآئین جموں و کشمیر کی دفعہ ۹۲ کے تحت گورنر راج نافذ کر دوں اور دوسرے معاملات کا پتہ اشارہ بعد ازاں کر دوں۔ جس لمحہ میں نے گورنر راج کا تذکرہ کیا تو ڈاکٹر فاروق عبداللہ گویا اپنی نشست سے اچھل پڑا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس میں نئی زندگی آگئی ہو۔ گورنر صاحب اس تجویز کے لئے میں آپ کا مشکور ہوں۔ اور مکمل اعتماد لاتے ہوئے اس نے کہا: جب تک آپ چاہتے ہیں اقتدار اور حکومت اپنے پاس رکھیے مگر ان چوروں کے پاس نہیں۔ ہماری گفتگو میں بے ترقی یقینی طور پر ختم ہو چکی تھی اور ذہنوں میں تناؤ ختم ہو چکا تھا۔ ہم نے ان حالات کے بارے میں مختصر طور پر بات چیت کی جن کی وجہ سے گورنر راج کی توازین بھی موجود تھی۔ میں نے سمجھا کہ بحران ختم ہو چکا ہے مگر میں کشمیر کی سیاست کے داؤ پیچ اور چند افراد اور قوتوں کی چالوں کو شمار میں نہیں لایا تھا۔ میں نے ڈاکٹر فاروق عبداللہ سے کہا کہ بہتر یہ ہوگا کہ اگر وہ تحریری طور پر اس بات کی تصدیق کر دے

کہ وہ ریاست میں عارضی طور پر گورنر راج نافذ کرنے کے میرے خیال کی حمایت کرتا ہے۔ وہ بلا تامل یہ بات مان گیا۔ اس نے کہا کہ گھر پر جا کر وہ اپنی اہل ہنڈ کی مدد سے خط کا مسودہ تیار کرے گا اور مجھے ارسال کر دے گا۔ میں یہاں یہ بات واضح کر دوں کہ اس قسم کا خط مجھے آئین اور قانونی تقاضوں کے لئے دیکر تھا۔ میں نے سوچا کہ صدر جمہوریہ مرکزی حکومت کو آئین جموں و کشمیر کی دفعہ ۹۲ کے تحت گورنر راج نافذ کرنے کے لئے

اعلانہ جاری کرنے میں یہ خط فائدہ مند ثابت ہوگا۔ میں صدر جمہوریہ مرکزی حکومت کو یہ بتا سکتا ہوں کہ آئین جموں و کشمیر کی دفعہ ۹۲ کے تحت مطلوبہ میرے اطمینان کے علاوہ ڈاکٹر فاروق عبداللہ بھی میرے اس اقدام کی حمایت کر رہے ہیں اور ان کا تعلق ان مجھے امن و امان برقرار رکھنے میں مددگار ثابت ہوگا۔ میرے اندازہ کے مطابق یہ اقدام نہایت اہم ہوگا۔

جو بیگم ڈاکٹر فاروق عبداللہ ڈرائنگ روم سے باہر نکلا تو اس نے دیکھا کہ سامنے دفتر کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے لفٹ جزل چمکے کو دیکھا اور ان سے معافی کیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ اچھی طرح واقف تھے۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے رخصت ہو جانے کے بعد میں نے جزل چمکے کے ساتھ اندر قی سلامتی سیک کی بابت بات چیت کی میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ ریاست گورنری راج کے تحت آنے والی ہے اس نے سوچا کہ اس طرح بہترین کام ہوگا کہ میں نے اسے بتایا کہ میں دیگر واقعات کے بارے میں بھی اسے مطلع رکھوں گا۔

میں اس ادنیٰ اور معمولی واقعہ کا ذکر اس لئے کر رہا ہوں کہ پریس میں یہ بات اڑائی گئی تھی کہ جزل چمکے کو اس لئے طلب کیا گیا تھا کہ وہ ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو ڈرا دھمکا سکے۔ یہ بات حقیقت سے بعید ہے۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ دفتر میں اسی وقت داخل ہوا جب وہ مجھے ڈرائنگ روم میں مل چکا تھا اور گورنری راج نافذ کرنے کی بابت میری تجویز کو خوشی قبول کر چکا تھا۔

میں سڑکوں پر تشدد کو روکن چاہتا تھا کیونکہ کشمیر میں ہجوم آسانی سے مشتعل ہو سکتے ہیں اور وہ طیش میں آجاتے ہیں۔ یہاں یہ بات وقعت نہیں رکھتی کہ آیا وہ کسی لاکھ حمایت کرتے ہیں یا اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ اگر ایک مرتبہ ان میں جذباتی تناؤ پیدا ہو جائے تو شہر کے مختلف حصوں سے بیک وقت کارروائی کرنے سے انہیں کوئی بھی نہیں روک سکتا۔ خاص طور پر سرینگر شہر میں یہ بات حادراتی ہے۔ سڑکوں پر رکاوٹیں کھڑی کرنے اور بسوں اور کاروں پر تیراؤ کرنے میں انہیں خاص مہارت حاصل ہے۔ ان کے روپے میں معمولی سی غنڈہ گردی کا جذبہ بھی شامل ہے عام طور پر یہ لوگ بے روزگار یا کم روزگار ہیں اور انہیں مصروف رکھنے کے لئے تعزیری سرگرمیاں برائے نام ہیں۔ انہیں اس کا زکے جواز کا بھی پتہ نہیں ہو سکتا جس کی بابت وہ لڑ رہے ہوتے ہیں۔ ان میں سے بھاری اکثریت ان افراد کی ہوتی ہے جن کے ساتھ افسوس کے اظہار کے بغیر کوئی کارروائی کرنا ممکن نہیں ہے۔ چونکہ عوامی جلسہ عمل کے صدر مولوی فاروق کو ان پر جوش ... افراد کی حمایت حاصل ہے۔ جو

تشدد کے مرتکب ہو سکتے ہیں اور وہ شہر کے بالکل اندرون میں امن عامہ کی برقراری کے معاملے میں ایک کلیدی شخصیت کی حیثیت رکھتا ہے میں نے اسے فوری طور پر راج بھون میں مدعو کیا تاکہ اس آئینی بحران کے وقت میں اس کی دانشمندانہ اور پختہ ذہن رائے حاصل کر سکوں مولوی فاروق خوش تھا کہ گورنر اس کی پیشین

قیمت رائے کا متنتی ہے اور میں اس لئے خوش تھا کہ جب تک شہر میں امن وامان برقرار رکھنے کے معاملے میں تمام انتظامات مکمل نہ ہو جائیں میں اسے راج بھون میں ہی مصروف رکھوں۔

جبکہ میں ان دھماکے خیز معاملات کو خاموشی اور سہمت کے ساتھ نمٹانے میں مصروف تھا۔ آل انڈیا ریڈیو کے صبح ۸ بجے کے بلٹن نے یہ خبر نشر کر دی کہ قیام شاہ کی سربراہی میں ۱۳ اراکین اسمبلی راج بھون گئے ہوئے ہیں تاکہ وہ ذاتی طور پر گورنر کو یہ بتا سکیں کہ انہوں نے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی حمایت واپس لے لی ہے۔ اور جی ایم شاہ کو وزیر اعلیٰ بنانے کا دعویٰ کر سکیں کیونکہ اسے اراکین اسمبلی کی اکثریت کی حمایت حاصل ہے۔ نیز یہ بھی کہا گیا کہ ان اراکین اسمبلی کے ساتھ کانگریس وائی قانون ساز یہ پارٹی کے لیڈر افتخار حسین انصاری بھی فاروق بالشر حکومت کی برطرفی کا مطالبہ کر رہے ہیں تو کہ اب اقلیت میں رہ گئی ہے جب میرے غلطی نے مجھے اس خبر کے بارے میں بتایا تو مجھے کافی الجھن ہوئی۔ میں حیران تھا کہ کیلئے کسی کی حماقت تھی یا کچھ شخص جان بوجھ کر میری ان کوششوں کو سبوتاژ کر رہے ہیں جو میں شہر میں گڑبڑ روکنے کے بارے میں کر رہا ہوں۔ بہر کیف میں نے اس نشریے سے پیدا شدہ پیچیدگیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ ان میں سے ایک قدم تھا کہ مولوی فاروق کو اپنی رہائش گاہ پر مدعو کروں اور مشوروں کا خط لکھنے اور آئینی اور انتظامی امور کا فوراً اپنا بارہ کر سکوں۔ میں نے ایک فوری ترجیح کا مراسلہ صدر جمہوریہ کے نام لکھوایا جس کی نقل کا بینہ سیکریٹری داخلہ سیکریٹری اور وزیر اعظم کے سیکریٹری کو ارسال کیں۔ یہ بے تاہم مطالبہ یوں تھا۔

”تجزیب کاروں“ سرگرم کارکنوں کی طرف سے امن وقانون وریاستی تحفظ کو سنگین خطرہ درپیش ہے اور ۱۳ ممبران اسمبلی ۱۲ حکمران نیشنل کانفرنس اور ایک آزاد کی طرف سے وزیر اعلیٰ اور اس کی وزارت کو حمایت واپس لئے جانے کے پیش نظر سیاسی عدم استحکام بھی پیدا ہو چکا ہے۔ ان ممبران اسمبلی کی حمایت واپس لئے جانے کے بعد فاروق عبداللہ قانون ساز اسمبلی میں اقلیت میں رہ گیا ہے۔ مجھے اس امر کا اطمینان ہو چکا ہے کہ آئین جموں و کشمیر کی رو سے ریاست کی حکومت نہیں چلائی جاسکتی۔ چنانچہ آئین جموں و کشمیر کی دفعہ ۹۲ کے تحت میں فرمان جاری کر کے ریاستی حکومت کے وہ تمام اغبیارات جو کسی اور ادارے یا حاکم کو اس خود کو تعویض کرنا چاہتا ہوں آئین کی دفعہ ۹۲ کی تحت دفعہ ۵ کے تحت آپ کی رضامندی مطلوب ہے۔ حالات سنگین ہیں۔

میں نے کا بینہ اور داخلہ ٹیم کے سیکریٹریوں کے ساتھ ٹیلی فون پر گفتگو کی۔ میں نے ان پر زور دیا کہ آئین جموں و کشمیر کی دفعہ ۹۲ کے تحت فرمان جاری کرنے کی رضامندی فوری طور پر عطا کی جائے۔ میں نے دلیل پیش کی کہ مذکورہ دفعہ کے تحت مدنی مشینری کے متعلق کے بارے میں یہاں گورنر کا اطمینان لازمی ہے جو کہ اس معاملے کا خاصہ ہے۔ اس کے علاوہ میں نے یہ بھی دلیل دی کہ وقت نہایت نازک ہے اور اگر بے یقینی کی حالت میں چند واقعات رونما ہو گئے تو حالات قابل سے باہر ہو جائیں گے۔ صورت حال کی بابت میرے انداز کے ساتھ داخلہ سیکریٹری اور کا بینہ سیکریٹری کو اتفاق تھا۔ موخر الذکر نے مجھے بتا دیا کہ گاندھی سری لنکا کے صدر معاورد نے

کے ساتھ تبادلات میں مصروف ہیں۔ وہ ان کے ساتھ اُسی وقت بات کر سکتے ہیں جب یہ تبادلہ خیال ختم ہو جائے۔ میں نے انہیں بتایا کہ ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے بھی میرے ساتھ اتفاق کیا ہے اور مجھے یقین دلایا ہے کہ امن وامان میں رخنہ اندازی نہیں کی جائے گی۔ کا بینہ سیکریٹری اور داخلہ سیکریٹری دونوں نے اس بات کو تسلیم کیا کہ یہ ایک مثبت بات ہے چنانچہ وہ اس منظوری کو حاصل کرنے کے عمل کو تیز تر کر دیں گے۔ میں نے ذاتی طور پر بھی صدر جمہوریہ سے بات کی۔

ایک دوران میں اپنے غلطی سے کہا کہ وہ چیف سیکریٹری اور ڈائریکٹر جنرل آف پولیس کو بلا میں چیف سیکریٹری صبح کے وقت کال فون کیا گیا ہوا تھا چنانچہ اسے صورت حال کی بابت معلوم نہیں تھا۔ ڈائریکٹر جنرل پولیس کو ان حالات کی بابت اس وقت معلوم ہوا جب وہ راج بھون پہنچے۔ اور جب وہ یہاں پہنچے تو میں نے انہیں بتایا کہ کیا ہو رہا ہے میں نے انہیں ان کی قانونی اور انتظامی ذمہ داریوں کی بابت بتایا۔ امن وامان کی برقراری کے لئے انہیں گورنر یا سیاسی سربراہ کے احکامات کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے الفاظ نے انہیں حالات سے آگاہ کر کے ان میں اعتماد پیدا کیا اور انہیں خبردار رہنے کا مشورہ دیا۔

ابھی کچھ دیر قبل میں نے ایک خاص اہلی کے ذریعے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو مندرجہ ذیل خط ارسال کیا تھا۔

”عزیز من وزیر اعلیٰ“

”جموں و کشمیر قانون ساز اسمبلی کے ۱۳ ممبران اسمبلی (نیشنل کانفرنس جماعت کے ۱۲ اور ایک آزاد) آج صبح ذاتی طور پر مجھ سے ملاقات ہوئے ہیں انہوں نے مجھے بتایا اور تحریری طور پر بھی مطلع کیا ہے کہ انہوں نے آپ کی حکومت کے تین حمایت کو واپس لے لیا ہے اور اپنی حمایت غلام محمد شاہ ۱۵ ایم۔ ایل۔ سی کو دینے کا عہد کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی کانگریس (آئی) قانون ساز یہ پارٹی کے لیڈر مولوی افتخار حسین انصاری ممبر اسمبلی نے مجھے تحریری طور پر مطلع کیا ہے کہ اپنے ۲۶ اراکین کی تعداد کے ساتھ انہوں نے غلام محمد شاہ کی حمایت کا فیصلہ کیا ہے۔ ان مراسلات کی ایک نقل شامل ہے۔ مجھے اس امر کا اطمینان ہو چکا ہے کہ آپ کو اب اسمبلی میں اکثریت کی حمایت حاصل نہیں ہے چنانچہ آپ نے وزیر اعلیٰ کے عہدے پر اپنے اور ریاستی حکومت کی سربراہی کا حق گنوا دیا ہے۔

میں ان حالات میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ وزارت اعلیٰ سے اپنا استعفیٰ آپ فوراً اے بی مؤدبانہ التزام کے ساتھ

آپ کا صادق

دستخط (جگموہن)

براہ کرم ملاحظہ فرمائیں! ہم اپنی ملاقات میں اس معاملے پر تبادلہ خیال کر چکے ہیں آپ نے اسمبلی کو مطلع کر کے آئین جموں و کشمیر کی دفعہ ۹۲ کے تحت گورنری راج قائم کرنے کا مشورہ مجھے دیا ہے۔ میں مشکور ہوں گا اگر آپ اس بارے میں تحریری طور پر اپنی تصدیق مجھے فوراً ارسال کر دیں۔

اس خط اور دیگر نازک حقائق سے ظاہر ہے کہ ڈاکٹر فاروق عبداللہ اور اس کی وزارت کی کونسل نے مجھے مزید کوئی رائے دینے کا حق گنوا دیا تھا۔ مجھے جب جی ایم شاہ اور اس کے حامیوں نے اپنی اکثریت کا مظاہرہ کیا تھا تو انہوں نے مطالبہ کیا تھا کہ اس بارے میں وزیر اعلیٰ کے اسمبلی تحلیل کے بدلے کے بارے میں کسی مشورے کو تسلیم نہ کر دلو۔ حقیقت اس وزیر اعلیٰ کے مشورے کو درست اور جائز قرار نہیں دیا جاسکتا جس کے مخالفوں نے ذاتی طور پر حاضر ہو کر اور دستاویزی طور پر اس کی اتلیٹی پوزیشن ثابت کر دی ہو اور اس نے خود بھی اسے تسلیم کر لیا ہو۔ اگر ڈاکٹر فاروق عبداللہ اور اس کی وزارت کی کونسل نے اس قسم کی گذارش ایک روز قبل پیش کی ہوتی تو سوال دوسرا تھا۔ دوسرے ۲۰ جنوری ۱۹۸۳ء کا بی کے نہرو کا وہ خط جس کا تفصیلاً ذکر میں بعد ازاں کروں گا اپنے اس خط کے آخری حصے میں اس نے یہ الفاظ واضح طور پر تحریر کئے تھے: میں یہ الفاظ ان حالات میں تحریر کر رہا ہوں اگر اس قسم کے وفد میرے پاس آئیں اور فراوی گنتی کرنے کے بعد مجھے یقین ہو جائے جو طرز عمل اپنانے سے میں نے سختی کے ساتھ انکار کیا ہے کہ آپ نے اپنی اکثریت محمودی ہے تو میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہے گا کہ مناسب آئینی عمل کے تحت آپ کی حکومت کو برطرف کر دوں جسے روکنے کی اب تک ہزانت احتیاط سے کاروائی کی گئی ہے۔

میں نے دوبارہ کابینہ سیکریٹری اور داخلہ سیکریٹری کے ساتھ رابطہ قائم کیا۔ دونوں نے مجھے اطلاع دی کہ میرے بتا دیے نام کے بارے میں وزیر اعظم کے ساتھ تبادلہ خیال ہو چکا ہے اور نظریاتی طور پر وہ میری گذارش منظور کر چکے ہیں اور سیاسی امور پر کابینہ سب کمیٹی کی میٹنگ ان خاص میٹنگ بلائی ہے اس کے فوراً بعد صدارتی منظوری حاصل کر کے مجھے بھیج دی جائے گی۔ کابینہ سیکریٹری نے مجھے بتایا کہ یہ منظوری مجھے ایک بجے بعد دوپہر تک حاصل ہو جائے گی۔ اس کے فوراً بعد میں نے جی۔ ایم شاہ اور ڈی ڈی میٹا کو جو کہ ہال میں انتظار کر رہے تھے، کو اپنے دفتر میں بلایا اور انہیں بتایا کہ میری رائے میں بہترین راستہ یہ ہو گا کہ فی الحال کچھ عرصے کے لئے گورنری راج نافذ کر دیا جائے۔ ان کے چہرے دھل گئے انہوں نے کہا کہ یہ بات منصفانہ نہیں ہوگی اور مشورہ کرنے کے لئے پہلے سمجھئے۔

کابینہ سیکریٹری کی طرف سے جو اطلاع مجھے موصول ہوئی تھی اس نے مجھے تشویش سے راحت دلائی۔ چیف سیکریٹری کی مدد سے میں نے وہ اخباری بیان (پریس نوٹ) تحریر کرنا شروع کیا جو گورنری راج کے نفاذ کے بعد جاری کیا جانا تھا اور جس میں اس اقدام کی وجوہ بیان کرنے کے علاوہ نئے انتظامیہ کو پورا تعاون دینے کی اپیل تھی۔

وزیر اعلیٰ نے چونکہ اس خط کو ارسال کرنے میں تاخیر کر دی تھی جس کا انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ چنانچہ میں نے چیف سیکریٹری سے کہا کہ وہ اس کی رہائش گاہ تک جا کر صورتحال کا تعین کرے۔ کچھ عرصے کے بعد صبح سیکریٹری وہ خط لے کر واپس آئے۔

جس کی بابت وزیر اعلیٰ پہلے مان گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وزیر اعلیٰ کو کچھ چالاک رفقاء کی رہنمائی یا گمراہی حاصل ہوئی ہے۔ درحقیقت یہ معاملہ آئین کا قدروں کا نہیں بلکہ سیاسی حالات کا مبع جانزہ لینے اور واضح سوچ کا تھا۔ گورنری راج کے نفاذ کے ساتھ ڈاکٹر فاروق عبداللہ کا نہیں بلکہ جی۔ ایم شاہ کا نقصان تھا کیونکہ اگر اس کے حمایتی حصول اقتدار کے لئے جمع ہوئے تھے تو وہ بکھر کر رہ جائیں گے۔ مجھے یقین تھا کہ اگر ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو آئین کے بارے میں بنیادی واقفیت ہوئی اور اس نے اپنے دماغ کا استعمال کیا ہوتا تو اس نے صحیح فیصلہ لیتے ہوئے مجھے وہ خط ارسال کر دیا ہوتا جس کا میں نے وعدہ کیا تھا۔ اس سے مجھے اس کو برطرف کرنے کے فرض سے راحت مل جاتی۔

جو خط ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے چیف سیکریٹری کے ذریعے ارسال کیا تھا اس کا متن مندرجہ ذیل تھا۔ عزت مآب!

مجھے آپ کا ڈی اوغیر جی ایس۔ ایل اے جی ۲۰ مورخہ ۲ جولائی ۱۹۸۳ء، مع شمولات وصول ہوا۔ میں نے اس معاملے پر گہرائی سے اپنی کابینہ کے رفقاء کے ساتھ غور کیا ہے اور میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ جمہوری روایات کا یہ تقاضہ ہے کہ اعتماد کے فقدان کے سوال کا فیصلہ ہمیشہ ایوان کے اندر لیا جانا چاہیے۔ درحقیقت آپ کی ذات گرامی کو جو خط ۲۸ جون ۱۹۸۳ء کو تحریر کیا گیا اس کے متن کی بابت بہر حال مجھے کچھ پتہ نہیں۔ مجھے یہ بھی احساس نہیں کہ آپ دل بدلی مخالف قانون کی بابت واقف ہیں یا نہیں جس کی رو سے ایک رکن جب جماعت کے وہی کی مخالفت کرتا ہے تو وہ نااہل ہو جاتا ہے چنانچہ ۱۲ دستخط کنندگان بشمول دو نامزد اراکین اپنے ووٹ کا حق گنوا بیٹھے ہیں چنانچہ جو کچھ انہوں نے تحریر کیا ہے اس کی کوئی وقعت نہیں۔ لہذا میں اپنی کابینہ کی جانب سے آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ آپ فوری طور پر قانون سازی کا اجلاس طلب کریں تاکہ قانون سازی میں جو اعتماد مجھے حاصل ہے اس کا مظاہرہ کر سکیں۔ اس خط کے آخری حصے میں آپ نے اس تبادلہ خیالات کا ذکر کیا ہے جو میرا آپ کے ساتھ ہوا ہے اور آپ نے کہا ہے کہ میں نے آپ سے دفعہ ۹۲ کے تحت گورنری راج نافذ کرنے کی سفارش کی ہے اس میں شک نہیں کہ ہم نے اس صورت میں مختلف راستوں کی بابت غور و خوض کیا تھا کہ اگر میں یہ بات ثابت کرنے میں ناکام رہوں کہ مجھے قانون سازی کا اعتماد حاصل نہیں تو میں ایوان کے اندر ثابت کر سکتا ہوں تو یہ بھی ایک صورت ہو سکتی ہے لہذا میں اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ اجلاس طلب کریں اور اگر میں ایوان کے اندر اعتماد کا مظاہرہ کرنے میں ناکام رہتا ہوں تو اس کے بعد ریاستی آئین کے تحت دستیاب مختلف راستوں پر غور کیا جاسکتا ہے۔ بہر حال اگر آپ جمہوری روایات پر عمل کرنا چاہتے ہیں تو میں کابینہ کی جانب سے آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ آپ ہماری اسمبلی کو تحلیل کرنے کی سفارش کو منظور کر لیں تاکہ ہم واپس اپنے عوام کے پاس جاسکیں جو دوبارہ اسرا لیں گے۔

آپ کا صادق

(دستخط) ڈاکٹر فاروق عبداللہ

ڈاکٹر عبداللہ اس بات سے واقف تھا کہ میں نے اُسے صبح کے وقت ہی واضح کر دیا تھا کہ اس پُرپوش ماقول میں اسمبلی کا اجلاس نہیں کر سکتا اور اسمبلی کا اجلاس گورنری راج کے چند دن بعد ہی ہو سکتا ہے جب اس وقت انتظام برقرار رکھنے کے معاملے میں مناسب انتظامات کئے گئے بغیر اور عسکریوں اور مظاہروں کے تمام تر امکانات کو ختم کر لیا جائے

اس خط کے بارے میں مزید چند نکات غور طلب ہیں۔ اول یہ کہ خط اس امر کے بعد آیا جب میں نے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو استعفیٰ دینے کے لئے کہہ دیا تھا اور جب اس نے جوش میں اگر گورنری راج نافذ کرنے کے میسر خیال کی حمایت کر دی تھی اور باقی ماندہ امور کو نبھاتا ہوا اس ماقول پر چھوڑ دیا تھا تاکہ اس ماقول میں اعتماد پیدا ہو اور انتظامی مشینری کے ناکام ہونے کا خطرہ کم از کم رہ جائے

دوسرے اس خط میں بالواسطہ طور پر تسلیم کیا گیا تھا کہ اس کی جماعت کے ۱۲ اراکین اس کے مخالف ہو گئے ہیں اور اس کی حکومت سے اپنی حمایت واپس لے لی ہے چنانچہ یہ نکتہ چینی کہ افراد کے اعداد و شمار کے معاملے کا فیصلہ راج ہون میں کیا گیا بالکل غلط ہے۔ اس امر کی دستاویزی شہادت بھی ۱۲ اراکین دل بدلی کر چکے ہیں۔ اس بارے میں شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی کہ اس امر کا فیصلہ گورنر کو کرنا ہے۔ اس سے ایک فریق جی۔ ایم شکا دعویٰ دوسرے فریق کا ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے اقرار سے ہی ثابت ہو جاتا ہے جہاں تک ان ۱۲ اراکین اسمبلی کو نااہل قرار دیے جانے کے معاملے کا تعلق ہے۔ صرف جموں و کشمیر ہائیکورٹ ہی انہیں مقامی قانون کے رُوسے نااہل قرار دے سکتی تھی اور جب تک ہائی کورٹ ایسا نہیں کرتی تب تک میں انہیں اہل اراکین اسمبلی ہی تصور کروں گا ویسے بھی قانون کی شرائط کے مطابق یہ بات واضح تھی کہ یہ اراکین کی نااہلیت کے مرتکب نہیں ہوئے تھے۔ اتفاق کی بات ہے کہ بعد ازاں ہائی کورٹ نے بھی حکم جاری کیا کہ یہ ۱۲ اراکین اسمبلی دل بدلو نہیں تھے۔ بلکہ نیشنل کانفرنس تقسیم ہو چکی ہے۔

تیسرے ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے صبح کے وقت گورنری راج کے نفاذ سے متعلق اپنی حاکم کے بارے میں کوئی براہ راست جواب نہیں دیا۔ اس بارے میں اس نے بہم طور پر تذکرہ کیا اور کہا کہ یہ بھی ایک راستہ ہے جس کے بارے میں تبادلہ خیال ہوا۔ اس نے اسمبلی کا اجلاس طلب کرنے کی بابت کہا جبکہ آئین کے تحت موجود دوسرے راستوں پر بعد ازاں غور کیا جائے گا۔ اس بارے میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ اقلیت میں تھا تو ایوان میں اکثریت کا مظاہرہ کیسے کر سکتا تھا کیا وہ نام نہاد دل بدلوؤں کو دوبارہ اپنے حامی بنائے گا یا پسپا کر کے عہدہ کا استعمال اس مقصد کے لئے کرے گا کہ وہ ان ۱۲ اراکین کو ووٹ نہ دینے دے یا ان میں سے چند اراکین کو وزیر بنائے جانے کی سفارش کر دے گا۔

چوتھے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ جب اُسے مستعفی ہونے کے لئے کہا جا چکا تھا تو اُسے اسمبلی تحلیل کر دینے کی بابت سفارش کرنے کا مطالبہ کرنے کا کوئی بھانپ نہیں تھا اور نہ ہی اس امر کی اعازت

دی جاسکتی تھی تحلیل کرنا ایک انتہائی جداگانہ اقدام ہے ایک معروف آئینی ماہر سر جان میرٹھ نے کہا ہے کہ وزیر اعظم کو کسی بھی حالت میں یہ نہیں کہہ دینا چاہیے کہ وہ شہنشاہ سے پارلیمنٹ تحلیل کے جانے کا مطالبہ کرے۔ اپنے تاجناک دستاویز "پارلیمنٹ تحلیل کرنے کے انتہائی اختیارات" میں سر نے فرس کا کہنا ہے کہ "بینہ خصوصاً وزیر اعظم کے اختیار میں بہت زیادہ اضافہ یہ سوال پیدا کرتا ہے کہ شہنشاہ کے پاس پارلیمنٹ کو تحلیل کرنے کا حق محفوظ رکھنا یا اس کا انکار کرنے کے لئے مجبور کرنا۔ حکمران دھڑے کے لیڈر کی آمریت کے خلاف تحفظ نہیں۔ برطانوی پارلیمانی سسٹم کا نصب العین کبھی رائے شماری پر مبنی جمہوریت کا قیام نہیں رہا جہاں پارلیمنٹ کسی معاملے پر محض سطحی طور پر بحث کرتی ہے اور اسے ہمیشہ حکومت کی طرف سے تحلیل کئے جانے کا خطرہ رہتا ہے اس قسم کے نظام کو پارلیمانی طرز حکومت" کہلانے کا کوئی حق نہیں ہے اور اس امر کو بہت کم سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ جمہوری ہے یا کہ نہیں۔

گورنروں کی پوزیشن خراب کرنا

ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی تسلسل سوچ نے مجھے پریشان کر دیا۔ یہاں میں تھا کہ اُسے نہایت صبر آزما حالات میں انصاف بہم پہنچانے کی کوشش کر رہا تھا اور دھردہ پیری پوزیشن قرب کر رہا تھا۔ اپنے کتابچے "قائم و کسمل" کے صفحہ ۱۲ پر ڈاکٹر فاروق عبداللہ لکھتا ہے: "۲ جولائی ۱۹۸۸ء کو دہلی نے گورنری راج کے نفاذ کے بارے میں گورنری سفارش کو نافذ کر دیا۔ یہاں پر اس امر کو واضح طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ میں گورنری راج نافذ کرنے کے حق میں تھا چنانچہ مرکزی حکومت اور گورنری امور میں کسی طرح کسی سازش کے مرتکب ہو سکتے ہیں جب وہ مخالف مقاصد کے لئے کام کر رہے ہوں اور اگر موثر الذکر کی سفارشات کو اول الذکر مسترد کر دے یا بیماری کی اصلی جڑ تو فاروق عبداللہ کی تسلسل فطرت ہے جسے انتظامی مشینری اور آئینی دفعات پر محض سطحی عبور ہے اگر ڈاکٹر فاروق عبداللہ میرے ساتھ ہوئی مفاہمت پر قائم رہتا تو میں صدر جمہوریہ پر گورنری راج نافذ کرنے پر زور دیتا اور جب وزیر اعلیٰ نے اپنے اس وعدے کی تصدیق نہیں کی تو مرکزی حکومت کے سامنے میری پوزیشن خراب ہو گئی اور جو امر اسلحہ بھی گیا وہ اس کے برعکس تھا جو باہمی طور پر منظور کیا گیا تھا مرکزی حکومت میں ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے مخالفین نے کہا کہ یہ ہم نے نہیں بتایا تھا کہ وہ بالکل ناقابل اعتبار ہے کہ گورنری راج نافذ کرنے کا میرا خیال ہی مقصد ہی تھا کہ پہلے اداراتی ڈھانچہ درست کروں اور پھر اُس وزیر اعلیٰ کو حکومت سونپ دوں جو اکثریت میں ہے۔

ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے صرف میری ہی پوزیشن خراب نہیں کی تھی بلکہ اس نے لی کے ہر وہ ساتھ بھی یہی سلوک کیا تھا۔ اسمبلی کی کاروائی کو مضائقہ ڈھنگ سے چلانے اور اس معاملے میں معمول کا ضابطہ اختیار کر دینا وعدہ کرنے کے بعد ڈاکٹر فاروق عبداللہ ٹکڑا گیا۔ غصے میں آکر لی کے ہر وہ ۱۹۸۳ء کو لکھا: "آپ کو معلوم ہی ہے کہ گزشتہ چند ہفتوں سے نیشنل کانفرنسی اراکین اسمبلی میں سے ممکنہ دل بدلو کئے یہ

تجويز پيش کرتے رہے ہیں کہ جب اُن میں سے ۱۳ افراد ایک شکم صورت میں میرے پاس آکر کہیں کہ ہمیں آپ اور آپ کی وزارت میں اعتقاد کا فقدان ہے اور کانگریس قانون ساز پر پارٹی کے ۳۶ راکین اسمبلی کی حمایت کا یقین دلائیں تو مجھے فوراً آپ کی حکومت کو برخاست کر دینا چاہیئے اور اس شخص کو وزیر اعلیٰ بنا دینا چاہیئے جسے کانگریس پارٹی اور دل بدلوؤں جو اس صورت میں اکثریت تشکیل دیں گے، کا اعتماد حاصل ہو۔

”میں نے انہیں یہم کہا ہے کہ میں یہ کام نہیں کروں گا کیونکہ اعتماد کے فقدان کا اظہار کرنے کے لئے قانون ساز اسمبلی ہی مناسب مقام ہے میں نے کہا کہ اس کی بجائے میں آپ سے مجھے اسمبلی کا اجلاس منسوخ کرنا طلب کرنے کا مشورہ دینے کے لئے کہوں گا تاکہ آپ کی اعتماد کی تحریک کو مناسب طور پر پیش کر کے اس پر مناسب بحث ہو اور مناسب طور پر ووٹنگ ہو سکے۔

”وہ اس ضابطے کو اختیار کرنے کی بابت دو وجوہ پر گریز کر رہے تھے ایک یہ کہ اُن کے میرے پاس آتے اور ایوان میں ووٹ کے وقفے کے دوران اور آپ کے احکامات کے تحت پولیس ان کے افراد کنبہ پر حملہ آور ہوگی اور ان کے گھروں کو نذر آتش کر دیا جائے گا۔ دوسرے ان کو خدشہ تھا کہ ایوان کے قواعد کو یوں موڑا جائے گا کہ آزادانہ اور غیر جانبدارانہ بحث اور ووٹنگ ہونے سے روکا جاسکے۔ مجھے بھی ان دونوں وجوہ پر خدشات کا احساس تھا مگر آئینی تقدس کو بحال رکھنے کے لئے یہ لازمی تھا کہ خطرات مول لئے جائیں۔

”مجھے معلوم ہوا۔ آپ سے نہیں کہ گورنر کے خطاب کے بعد جب صرف کچھ معمول کی کاروائی ہی ہونا پڑ پڑا تھا۔ آپ نے ایک تحریک پیش کی جس میں ایوان سے اعتماد کا ووٹ طلب کیا گیا تھا۔ اس معاملے میں معمول کے قواعد کی خلاف ورزی کر کے ۷ دن کے توٹس کی سسٹر کو پیش دیا گیا تھا۔ اور بحث کے بغیر فوراً ووٹ کی ضد کی گئی تھی جبکہ کانگریس جماعت احتجاج کے طور پر ایوان سے باہر جا رہی تھی۔ راکین کی کسی معنی رائے کے بغیر اعتماد کا ووٹ پاس ہو گیا کیونکہ منفی رائے رکھنے والے راکین ایوان سے باہر جا چکے تھے۔

”ضابطے کے مطابق اب موجودہ اجلاس کی مدت تک اسمبلی میں عدم اعتماد کی تحریک پیش کی جانے پر ممانعت ہے۔ میں اس تحریک کے ذریعے کہہ رہا ہوں کہ اگر کبھی اب اس قسم کا وفد میرے پاس آیا اور افراد شماری۔ ایک ضابطہ جسے اپنانے کی بابت اب تک میں نے سختی سے امتزاج کیا ہے کے ذریعے مجھے یقین ہو جائے کہ آپ اعتماد اٹھائیں گے تو مجھے آپ کی سرکار کو برطرف کرنے کے سوائے کوئی چارہ نہیں رہے گا۔ کیونکہ مناسب آئین ضابطے کو ٹالا جا چکا ہے۔“

اس خط کی ایک اور پہلو سے بھاری اہمیت ہے۔ اس میں گورنر کا یہ واضح اشارہ موجود ہے کہ اُسے فاروق عبداللہ وزارت کی قسمت کا فیصلہ افراد شماری کے سوائے کرنے کا اور کوئی راستہ نہیں رہا ہے۔ میں نے دہلی فریقہ کے دستاویزات پر واقعی یقین کیا اور گورنری راج کے چارے پر عمل کیا۔ اگر میں نے راج بھون میں افراد شماری پر ہر جملہ کاروائی کی ہوتی تو اس عہدہ پر میرے جتنی بھی کے بند کے خط کی موت دگی میں مجھے مکمل حوازا حاصل تھا۔

مجھے اس امر کی بھاری حسرت ہوئی جب ۳ بجے بعد دوپہر کے قدرے بعد کا بینہ سکر میڑی نے اطلاع دی کہ کا بینہ سب کمیٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ آئین جوں و کشیر کی دفعہ ۹۲ کے تحت صدر جمہوریہ کی رضامندی ارسال نہ کی جائے۔ جمع کی انداز فکر کے بعد یہ تبدیلی کیونکر واقع ہوئی۔ اس بارے میں وثوق سے میں کچھ نہیں کہہ سکتا ہو سکتا ہے کہ بنیادی حقیقتوں کو بجا طور پر غور نہ کیا گیا ہو یا کا بینہ سب کمیٹی نے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے بدلتے ہوئے رویے پر بظن ہوئے ہوں یا ہو سکتا ہے کہ ان تمام پہلوؤں کا مرکب ہو۔

میں اپنی کوششوں کے ایسے انجام پر مایوس تھا۔ آئینی طور پر میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ کوئی ایم شاہ کو حلف دلاؤں۔ میں پہلے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو استعفیٰ دینے کے لئے کہہ چکا تھا۔ میرے ذہن کے ایک گوشے میں دوسرا خیال یہ تھا کہ شاہ حکومت اور وقت کے نوکر شاہی نظام کی ایک دوسرے کے ساتھ ملتی۔ سمجھتے ہیں اور اسے جانبدار انتظام کی طاقت کمزور ہو جائے گی۔ جہاں تک میرا تعلق تھا۔ میرا ذہن بالکل صاف تھا کہ اگر فیصلہ کرنے کے تمام اختیارات میرے پاس ہوتے تو ۲ جولائی ۱۹۸۳ کو میں نے گورنری راج نافذ کر دیا ہوتا۔

ریاست میں اقتدار کا خلا رکھنا بھی خطرناک بات ہے۔ میں نے جی۔ ایم شاہ کو حکومت کی تشکیل کے لئے تلقین کی۔ میں نے اس سے یقین دہانی بھی حاصل کر لی کہ ایک ماہ کے اندر اندر وہ اسمبلی کا اجلاس طلب کر لیا میں نے دیکھا کہ جی۔ ایم شاہ اور ڈی ڈی ٹھاکر کے زرد اور تھکان زدہ چہرے اچانک خوشی سے کھل اٹھے۔ وہ فوری طور پر راج کا حکومت سنبھالنا چاہتے تھے۔

حلف و فاداری کی رسم ۳۰-۵ بجے بعد دوپہر ہو ناٹے پایا۔ شاہ اور اس کے حامیوں کی طرف سے جلد ہی ایک جھوم جمع کیا گیا۔ انہوں نے دکھانے کی کوشش کی کہ انہیں کوئی حمایت بھی حاصل ہے۔ اور عوام ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی بڑی پر خوش ہیں میں نے جی۔ ایم شاہ کو فوری طور پر خبردار کیا کہ وہ کوئی ایسا کام نہ کرے جس سے مخالف رد عمل کو اشتعال حاصل ہو۔ میں نے اُسے یہ بھی کہا کہ اُسے سیاسی مخالفین کے ساتھ احترام اور انکساری کے ساتھ پیش آنا چاہیئے اور پرامن اور سازگار ماحول پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جانی چاہیئے۔

دوبارہ اکثریت کا ثبوت

یہ بات کہنا غلط۔ ہوگا کہ گورنر نے جی۔ ایم شاہ کو اپنی اکثریت ثابت کرنے کے لئے ایک ماہ کا موقع دیا۔ (جیسا کہ ڈاکٹر فاروق عبداللہ کا الزام ہے) اس کی اکثریت پہلے ہی ثابت ہو چکی تھی میں نے تو اُسے صرف یہی کہا تھا کہ وہ اسمبلی کا اجلاس ایک ماہ کے اندر طلب کرے اور اس مدت کے دوران اعتماد کا ووٹ حاصل کرے۔ دوسرے الفاظ میں ایک مرتبہ پھر اعتماد کا ووٹ حاصل کرے میں نے، جولائی کے اس خط میں یہ بات بالکل واضح کر دی تھی تو ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے اسی روز لکھے گئے خط کے جواب میں ارسال کیا

گیا تھا۔ ان دونوں خطوط کا متن مندرجہ ذیل ہے۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے اپنے خط میں لکھا تھا۔ جولائی ۱۹۸۳ء
”ڈیر گورنر صاحب!“

۲ جولائی ۱۹۸۳ء کو اسمبلی نے بارہ مئی کی دلدل لیڈر کی رسم حلف برداری کے ساتھ ہی یہ اعلان کیا
گیا تھا کہ قانون ساز اسمبلی کے اس دلدل لیڈر کو اپنی اکثریت کی آزمائش کے لئے کہا جائے گا۔
آج ۷ جولائی ہے اور اب تک کوئی نوٹس جاری نہیں کیا گیا ہے اس سے قانون ساز اسمبلی کا اجلاس بلانے کے
معاملے میں ایک ماہ سے زیادہ دیر لگ سکتی ہے اس مرحلے پر وہ دلدل لیڈر کو اپنی بنیادی وفاداریوں
کو ترک پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں جو کہ وزارتی کونسل کے اراکین میں بالیہ دوسرے افراد کو وہ تمام دشمن
پالیسیوں کے سلسلے میں اپنی بات نہیں مان رہے۔ جمہوری رواداری کے تمام تقاضوں کے خلاف آپ نے میری
طرف سے اسمبلی کا اجلاس تیزی طور پر طلب کرنے کے مشورے کو منظور نہیں کیا جس کی وجہ کی بابت آپ بہ طور پر
جانتے ہیں اور نئے بلانے کے شخص پر یہ شرط عائد کر دی ہے کہ وہ ایران کا اعتماد ایک ماہ کے اندر حاصل کرنے
اور وہ اس مفاہمت پر عمل نہیں کر رہا ہے۔ باور کیا جاتا ہے کہ کل ہند وفد مخالف کے لیڈروں نے
اس معاملے پر آپ کے ساتھ ملاقات میں بات چیت کی تاکہ ہماری ریاست اور ملک کے حوام کا اعتماد
ہماری ریاست کے مخصوص ڈھانچے میں بحال کیا جاسکے۔ مجھے بتایا گیا کہ آپ نے کل ہند وفد کو یقین
دلا یا ہے کہ مناسب مدت کے اندر اسمبلی طلب کرنے کے بارے میں اقدامات کئے جائیں گے۔ زیادہ سے
زیادہ حد یعنی ۳۰ دن مقرر کی گئی ہے ۲ جولائی ۱۹۸۳ء سے شروع ہوتی ہے۔ میں آپ سے گزارش کرتا ہوں
کہ اس وعدہ پر جس قدر جلد ممکن ہو عمل آوری کرائیں۔ احترام کے ساتھ

آپ کا صادق

(درخط)۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ

میرا جواب تھا۔

عزیز من ڈاکٹر عبداللہ

آپ کے خط نمبر ۱۱/۸۴/۷ پی پی خرقہ ۷ جولائی ۱۹۸۳ء کے لئے شکریہ جس میں شری بی ایم شاہ
کی طرف سے ایران کے اندر اکثریتی حمایت کی تصدیق کے لئے اسمبلی کا اجلاس طلب کرنے کی بابت کہا گیا ہے۔
میں آپ کو اس بات کا دوبارہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ شری شاہ کو اس تحریری یقین دہانی پر
حکومت بنانے کی حکومت دی گئی تھی کہ وہ عہدہ نبھانے کے ایک ماہ کے اندر ایران کے اندر اپنی اکثریت کا دوبارہ ثبوت دے گا
میں نے آپ کے خط کی نقل وزیر اعلیٰ کو ارسال کر دی ہے کہ اگر اس معاملے میں پہلے کاروائی نہیں کی گئی تو اب شروع کر دے۔
آپ کا صادق
نیک احترام کے ساتھ

غلط مفروضات: خاموشی کی سازش

یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ میرے اس فیصلے پر سیاسی مقاصد سے کی گئی نکتہ چینی غلط مفروضات
اور غلط بیانیوں پر بھی مبنی تھی۔ یہ بات نہایت اہمیت کن ہے کہ پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں کسی بھی مرکزی
وزیر بشمول وزیر داخلہ یا نیشنل کانفرنس ڈائیف کے کسی ایسے نمائندے نے جسے پتہ تھا کہ آئینی طور پر میں نے گورنری
راج کے لئے اقدامات کئے تھے اور صدر جمہوریہ کو آئین جموں و کشمیر کے تحت منظوری ارسال کرنے کے لئے کہا تھا۔
اور بھی اگر بات کا ذکر نہیں کیا گیا اخلاقی اور قانونی طور پر یہ قابل دفاع ہے کہ کیا یہ مراعات شکنی کا معاملہ نہیں ہے کیا
کوئی وزیر محسوس اور اہم حقیقت کو چھپا سکتا ہے؟

ناپاک ارادے سپیکر کا کردار

سپیکر کی ٹھکانے پر جو روں کا کردار ادا کیا اس سے یہ بات اور بھی واضح ہو چکی تھی کہ ڈاکٹر فاروق عبداللہ
اور اس کے حامی غلط حربے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ جموں و کشمیر ریاست کے دلدل مخالف قانون کے لوازمات
کے مطابق سپیکر کے لئے یہ لازم ہے کہ وہ ۱۲ اراکین اسمبلی کے بارے میں معاملہ بائی کورٹ کو پیش کرے اور اس
بارے میں فیصلہ حاصل کرے۔ تمام فریقین کی سماعت کے بعد اپنے ۳۰ جولائی ۱۹۸۳ء کے فیصلے میں چیف جسٹس نے
کہا: ”میں قراردادیں ہوں کہ کوئی نمائندگی ایکٹ کی دفعہ کے تحت یہ ۱۲ اراکین اسمبلی کسی نااہلیت کے مرتکب نہیں۔
چنانچہ اس معاملے کا یہی جواب ہے۔“

عدالت نے اس بات کو واضح کیا کہ وہ اپ کا اطلاق کسی پالیسی پر ہے لیڈر پر نہیں۔ اس نے فیصلہ دیا کہ
پارٹی کی قیادت کی حمایت سے انکار کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ اس نے جماعت کی مرکزیت کو ترک کر دیا ہے۔
جب چیف جسٹس اس فیصلے کا اعلان کر رہے تھے تو اس قانون کی دفعات کے برعکس سپیکر نے غیر ذرا
کوشش کی کہ بائی کورٹ کو پیش کردہ اس معاملے کو واپس لے لیا۔ اس سلسلے میں چیف جسٹس نے فیصلہ دیا: ”ہائیکورٹ
ایک ریکارڈ کی عدالت ہے اور کوئی بھی فریق اپنی مرضی سے اس کے سامنے پیش کردہ معاملے کو واپس
لیا گیا تصور نہیں کر سکتا۔“

سپیکر اس سے بھی ایک قدم آگے گیا اور اس نے نفاست کی تمام حدود کو پھلانگ دیا۔ آئین جموں و کشمیر
کی دفعات دلدل مخالف قانون اور بائی کورٹ کے فیصلے کو بالائے طاقت رکھتے ہوئے اس نے خود ہی ان ۱۲
اراکین اسمبلی کو نااہل قرار دینے کا فیصلہ کرتے ہوئے ان نشستوں کو خالی قرار دے دیا۔
آئین اور اخلاقی طور پر اس سے بڑا کیا ہو سکتا ہے ہر سچا اور جان بوجھ کر اور ڈاکٹر فاروق عبداللہ
کے ساتھ ملی بھگت سے سپیکر نے غیر قانونی حکم جاری کیا۔ اس نے اس بات کا ذرا بھی احساس نہیں کیا کہ

خود ہی اس نے معاملہ ہائی کورٹ کو پیش کیا تاہم لوگ گھبراڑے پھاڑے چلا رہے تھے ان کے اپنے اصول اور ان کے اپنے اعمال اور قدیس ایسی تھیں اور وہ جمہوریت کی دہائی دے رہے تھے اس امر کو جانتے ہوئے بھی کہ میرا فیصلہ دودھ کی طرح صاف اور شفاف ہے اور ان حالات میں اس سے شائش کن کوئی اقدام آگئی انتظامی اور اخلاقی طور پر بہتر نہیں ہو سکتا کہ مختصر عرصے کے لئے گورنری راج نافذ کر دیا جائے انہوں نے میرے فیصلے کی نکتہ چینی کی۔

۳۱ جولائی کو صبح دس بجے شدہ پروگرام کے مطابق خصوصی اجلاس شروع ہوا۔ میں نے اپنے سیکرٹری کو ایوان میں کاروائی دیکھنے کے لئے مامور کیا۔ ایوان کی فہرست کار میں تین مدتیں (i) جی ایم شاہ کی سربراہی میں وزارت میں اعتماد کی تحریک (ii) سپیکر کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک (iii) ڈپٹی سپیکر کا انتخاب چونکہ اس روز کی فہرست کار میں سپیکر کے خلاف عدم اعتماد کی مدت شامل ہے۔ اور اس کے گزشتہ روز کے چلن نے اس کے ارادوں کے بارے میں کسی کو بھی شک و شبہ میں نہیں رہنے دیا تھا اس لئے قاعدہ ایوان اور وزیر تعلیم علی محمد نائیک نے سپیکر سے گزارش کی کہ وہ اپنے خلاف عدم اعتماد کی تحریک کو سب سے پہلے لیں اور خود اپنی عکس سے نیچے آجائیں تاکہ حدود کے پینل اس مقام پر بیٹھ سکیں۔ سپیکر نے اس گزارش کو منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ قاعدہ ایوان کی تحریک کی حمایت میں ۲۲ اراکین اٹھ کھڑے ہوئے۔ حدود کے پینل کے ایک رکن ریگیل سنگھ نے ممدارت کی سپیکر کو ہٹانے جانے کے خلاف اجتماع کرتے ہوئے اراکین ایوان سے پار چلے گئے۔

سپیکر کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک کو پہلے لیا گیا اور ۲۲ اراکین نے حق میں ووٹ دیا۔ کسی نے خلاف ووٹ نہیں دیا۔ اس کے بعد ایوان نے منگٹ رام شرما کو سپیکر منتخب کیا اور سپیکر نے ایوان کی باقی کاروائی کی ممدارت کی۔ جی ایم شاہ کی وزارت میں اعتماد کی تحریک انفاق رائے سے منظور ہو گئی۔ اس کے بعد ایوان نے ملک غلام الدین کو ڈپٹی سپیکر منتخب کیا۔ نئے سپیکر نے ایوان میں اعلان کیا کہ اس نے گزشتہ روز اپنے پیش رو کی طرف سے جاری اس حکم کو منسوخ کر دیا ہے۔ جس کے تحت اس ایوان کے ۱۲ اراکین کو جموں و کشمیر قانون ساز اسمبلی کے اراکین ہونے کا نااہل قرار دیا تھا۔ کیونکہ یہ احکامات غلط تھے جن کی خلاف ورزی اور ہائی کورٹ کی حکم عدولی کے مترادف تھے جس کے بارے میں سپیکر نے خود مامد پیش کیا تھا۔

ضابطے کی باریکیوں اور رویے کی قدروں کے قطع نظر اس سوال کا واضح طور پر جواب مل چکا تھا کہ اکثریت میں کون ہے۔ اراکین اسمبلی کو نااہل قرار دیا جائے یا کہ نہیں اس امر کا فیصلہ بھی ہائی کورٹ نے کر دیا تھا۔ صرف یہی امر کہ ڈاکٹر فاروق عبداللہ اور سپیکر طاقت آزمائی کو مثال رہے تھے اور سپیکر کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک کی بابت ان کا رویہ اس بات کا مضمر تھا کہ ان کا گروپ اقلیت میں تھا اور سپیکر کے عہدے کا غلط استعمال کر رہا تھا۔

روایات کہاں ہیں؟

متذکرہ بالا صحیح صورت حال میں مجھ پر روایت کی مینہ خلاف ورزی کے بارے میں نکتہ چینی کی شاید ہی ضرورت محسوس ہوتی مگر مجھے حیرت اس بات کی تھی کہ یہ نکتہ چینی ہندوستانی آئین کے پس منظر میں کن روایات کی بات کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر کی کلاسیکی تعریف کے مطابق آئین کی روایات میں 'ایسے رواج' اعمال مقولے یا تصورات شامل ہوتے ہیں جو نہ تو عدالتوں میں تسلیم کئے جاتے ہیں اور نہ ہی عدالتیں ان کا نفاذ کرتی ہیں مگر جو سیاسی اور آئینی قدروں سے متعلقہ قوانین کو تشکیل دیتے ہیں۔ جہاں تک گورنروں کے فیصلے ہیں اس قسم کی روایات کہاں ہیں؟

آئین کے نفاذ سے لے کر اگر گورنروں کے فیصلوں کا تجزیہ کیا جائے تو شاید ہی کوئی یکساں طرز عمل معلوم ہو جہاں تک کہ یکساں نوعیت کے معاملات میں مختلف گورنروں نے مختلف فیصلے کئے ہیں۔ مثال کے طور پر ۱۹۵۲ میں ٹراونکور کو چین کے راج پر سکھ نے اس وزیر اعلیٰ کی سفارش پر اسمبلی کو تحلیل کر دیا جو اسمبلی میں اکثریت کھو چکا تھا مگر ایسے ہی حالات میں ۱۹۶۸ میں گورنام سنگھ کی ۱۹۶۸ میں چرن سنگھ اثر پردیش راجہ نریش چندر سنگھ مدھیہ پردیش ۱۹۶۱ میں سکھ دیو اڈیہ کی سفارشات کو نہیں مانا گیا۔ یہاں تک کہ وزیر اعلیٰ کی تقرری کے بارے میں بھی اس صورت میں گورنروں نے تب یکساں طرز عمل نہیں اپنایا جب اس عہدے کے لئے بہت سارے دعویدار تھے۔ چند گورنروں نے اسمبلی میں سب سے بڑی جماعت کے قائد کو اس صورت میں دعوت نہیں دی جب مختلف دعویداروں کی پوزیشن کا محاسبہ کیا جا چکا تھا۔ مثال کے طور پر ۱۹۶۷ میں مغربی بنگال اور بہار میں کانگریس جماعت کے لیڈر کو حکومت بنانے کی دعوت نہیں دی گئی۔ حالانکہ اسمبلی میں کانگریس سب سے بڑی تنہا جماعت تھی دوسری طرف اتر پردیش اور راجستھان میں سب سے بڑی تنہا جماعت جو اتفاقاً کانگریس ہی تھی حکومت بنانے کی دعوت دی گئی۔ مزید برآں دعووں اور جوبلی دعوؤں کے محاسبے کیلئے مختلف گورنروں نے مختلف راستے اپنائے۔ چند گورنروں نے فہرست سسٹم کو اپنایا تھا اور چند نے ذاتی جانچ پڑتال کے طریقے کو اپنایا تھا مثال کے طور پر ۱۹۶۷ کے دوران گجرات میں شریمن نارائن نے فہرست اور ذاتی جانچ پڑتال کے طریقہ کار کو اپنایا، ۱۹۶۷ میں راجستھان کے گورنر سردار حکم سنگھ نے بھی یہی طرز عمل اپنایا جبکہ ڈی سی پاوتے نے ۱۹۶۹ میں افزا شماری کا طریقہ کار اپنایا جبکہ ۱۹۵۲ میں مدراس کے گورنر سری پرکاش نے پہلے راج گوپال آپچاریہ کو ایوان بالا میں نامزد کیا اور اسے حکومت بنانے کی دعوت دی یعنی دوسرے الفاظ میں وہ کسی بھی ایوان کا رکن نہیں تھا اور اس کی تقرری کے بارے میں اپنی مرضی کا استعمال کیا۔ یہاں تک کہ اسمبلی کا اجلاس برخواست کرنے کے معاملے میں جموں و کشمیر کے گورنر بنگال سہلے نے ۱۹۶۰ میں جی ایم صادق کے مشورے پر اسمبلی کا اجلاس برخاست کر دیا حالانکہ جموں و کشمیر میں ۳۵ اراکین اسمبلی نے صادق سے حمایت واپس لیکر تیسرے قیام کی حمایت کا اعلان کیا تھا۔ مدھیہ پردیش کے گورنر نے بھی ایسا ہی طریقہ کار اپنایا دوسری طرف بنگال کے گورنر وصرم ویر نے اپنے حقوق وزارت کو تسلیم کر دیا کہ اس نے فوراً پارلیمانی کاموں کا بلائے جانے کی بابت

گورنر کی ہدایت ماننے سے انکار کر دیا تھا چنانچہ جبکہ جموں و کشمیر اور مدھیہ پردیش کے گورنروں نے عاملہ اور قانون ساز کو یکجا کرنے کے اصول کی کاربندی نہیں کی مگر مغربی بنگال کے گورنر نے وزارت کے خلاف ان وجوہ پر کاروائی کی کہ وہ عاملہ اور قانون ساز یہ کیجا ہونے پر آمادہ نہیں تھی۔

میں یہ نہیں کہہ رہا تو بات یہ ہے صبح راستہ اپنا یا ہے بلکہ میں اس بات پر باور کرانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ مختلف گورنروں نے مختلف فیصلے کئے ہیں اور اس بارے میں کوئی بھی روایت قائم نہیں کی گئی ہے۔ جس معاملے کا فیصلہ کرنے کی مجھے ضرورت تھی وہ یہ تھا کہ وزیر اعلیٰ ڈاکٹر فاروق جہاندل نے اسمبلی کو تحلیل کرنے کی بات بھائی صمدت میں کہا۔ معجب اُسے مستغنی ہونے کے لئے کہا جا چکا تھا اور اس نے اپنی دستاویزی شہادت پیش کی تھی جس کے بارے میں انکار نہیں کیا جاسکتا اور اُسے واضح کر دیا گیا تھا کہ وہ اقلیت میں رہ گیا ہے چنانچہ اسمبلی کو تحلیل کرنے کی بات میرے فیصلہ اس گورنر سے زیادہ حق بجانب تھا جس نے اُس مرحلے سے پہلے اسمبلی کو تحلیل کرنے کی سفارش کو ماننے سے انکار کر دیا تھا جب کہ متعلقہ وزیر اعلیٰ کو ابھی مستغنی ہونے کے لئے بھی نہیں کہا گیا تھا۔ اس سلسلے میں یہ بات واضح کرنا ضروری ہے کہ ہر کسٹش سمجھ بادل کی سفارش پر پنجاب کے گورنر نے اسمبلی کو تحلیل کر دیا حالانکہ کالی دل میں اس کی اکثریت مشکوک ہو چکی تھی۔ اس کے فیصلے کی تردید نکتہ چینی ہوئی اور الزام لگایا گیا کہ گورنر کی سنت اکالی دل کے ساتھ ساتھ کسانچے کا نکتہ ہے۔

اختیار تیزی

ان حالات میں بنیادی سوال یہ ہے کہ آیا گورنر کو کوئی اختیار تیزی حاصل ہے۔ اور یہ بات بالکل حیاں ہے کہ اُس کو یہ اختیار حاصل ہے۔ اگر وہ ان اختیارات تیزی کا استعمال مخصوص انداز میں کرتا ہے تو۔ اُن جماعتوں اور گروہوں کی نکتہ چینی کا شکار ہو سکتا ہے جنہیں اس فیصلے سے نقصان پہونچ سکتا ہے۔ مگر اگر وہ فیصلے کو غیر قانونی یا غیر آئینی قرار نہیں دیا جاسکتا چنانچہ اس معاملے میں کسی گورنر کے فیصلے کا صیغہ انداز فکر یہ ہوگا کہ سیاسی اور انتظامی حالات کے سمیت تمام صورت حال کا مجموعی جائزہ لے جن میں اُسے اپنا اختیار تیزی استعمال کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تمام حالات میں کسی مخصوص انداز میں کارسوائی کرنا قطعی طور پر غیر معیاری اور خطرناک ہوگا۔ یہ حالت موجودہ حالت سے بھی اتر ہوگی اور یہاں وہاں چند انحرافات پیدا ہو سکتے ہیں۔ کوئی بھی گورنر ایسے وزیر اعلیٰ کو درحقیقت قائم نہیں رکھ سکتا جسے اسمبلی میں اکثریت حاصل نہ ہو۔ آندھرا پردیش کے معاملے میں اکثریت این پی رامارائو کے ساتھ تھی اس بات کے قطع نظر کہ گورنر رام عمل نے کیا کیا مگر صورت حال چند دنوں کے اندر ہی واضح صاف ہو گئی۔ دوسری طرف جموں و کشمیر میں اکثریت فاروق جہاندل کے ساتھ نہیں تھی۔ اُس کے رفقاء نے حالانکہ کافی شور شرابہ کیا مگر جولا کی ۱۹۸۴ء سے مارچ ۱۹۸۶ء تک کسی بھی موقع پر پھر پنی اکثریت کا

حقیقی مجرم

یہ مسائل اس لئے پیدا نہیں ہوتے کہ گورنر کو اپنے خاصے اختیارات تیزی حاصل نہیں بلکہ اس لئے پیدا ہوتے ہیں کہ مرکز میں وقتاً فوقتاً جیسا کہ عناصر اقتدار میں آئے وہ اپنی سیاسی مفادات سے بالاتر نہیں ہو سکتے۔ اگر سیاسی عناصر کے ارادے نیک ہوتے تو ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے میں کوئی دقت پیش نہ آتی جن کی بابت فی ٹی کشنچاری نے دستور ساز اسمبلی میں تقریر کے دوران کہا۔ اس نے کہا۔ اگر ہم اہل ایوان مستقبل کے گورنروں کو، جن کی نامزدگی صدر جمہوریہ کرے گا، کسی طور مرکز حکومت کے ایجنٹ تصور کریں تو میں فوری طور پر اپنے تمام خیالات سے دستبردار ہو جاؤں گا۔ میں اس بات کو بالکل واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ جن گورنروں کا تصور ہم مستقبل کے لئے کرتے ہیں وہاں اس قسم کے خیال کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اگر تمام سیاسی جماعتیں واقعی صدق دل ہیں کہ گورنروں کی تقرری مدت برطرفی کر دار اور فرائض کے بارے میں تمام اختلاف رائے کو ختم کرنا چاہتے ہیں تو وہ کیوں ایک جگہ مل کر سرکاری کمیشن کی سفارشات کو من و عن قبول نہیں کر لیتیں تو اس معاملے میں کی گئی ہیں۔ آخر اس کمیشن کو قائم کرنے کا فائدہ کیا ہے جس کی سفارش کو بعد ازاں بالائے طاقت رہنے دیا جائے۔ آج کوئی بھی ایسی ہمد گورنر کے مقابلے زیادہ غیر محفوظ نہیں اس کا عرصہ ملازمت ایک روپیہ اجرت پر کام کرنے والے مزدور کا نہیں تو کسی مخصوص کام کے لئے تنخواہ دار ملازم کی طرح لان کر رہ گیا ہے۔

چند تھیکر حکومت نے گورنر کی رپورٹ کی پروا کئے بغیر تامل ناڈو حکومت کو برطرف کر کے جو کام کیا اس نے آئینی ناموزونیت کا مظاہرہ کیا اور ثابت کیا کہ مرکزی حکومت ایسا کر سکتی ہے اور اُسے کوئی پوچھنے والا نہیں اس معاملے میں حقیقی مجرم سب سے اصولی سیاست ہے حالیہ وقتوں کے دوران کسی بھی سیاسی جماعت نے کسی زوجوں اور آئینی اخلاقیات کا مظاہرہ نہیں کیا ہے۔ ۱۹۷۷ء میں جن لیڈروں نے بعد ازاں جنتا پارٹی کی صورت میں ہاتھ ملانے وہ گورنر کے عہد کے ناجائز استعمال کے معاملے میں فخر مند اندرا گاندھی کی نکتہ چینی کیا کرتے تھے مگر جب جنتا پارٹی اقتدار میں آئی تو اس نے جانبدارانہ نقطہ نظر سے گورنروں کی تقرری کی ان میں سے چند افراد کو یہ عہدہ محض انعام کے طور پر حاصل ہوا وہ واضح طور پر اس کام کے نااہل تھے۔ محبہ باد ہے کہ جب ۱۹۸۱ء فروری ۱۹۸۰ء کو میں دہلی کا لیٹننٹ گورنر مقرر ہوا تو مجھے گورنروں کی کالفرنس میں شمولیت کا موقع حاصل ہوا۔ میں نے دیکھا کہ چند گورنر بھرے تھے۔ اور اے ڈی سی کے سہارے کے بغیر کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اس قدر بوڑھے اور نحیف ہو چکے تھے۔

۱۹۸۹ء کے اواخر میں وی پی سنگھ کی نیشنل فرنٹ حکومت اقتدار پر ہوئی اس نے تمام گذشتہ حکومتوں کو مات دے دی اس نے وسیع پیمانے پر گورنروں کو تبدیل کر دیا اس نے آئینی میں درج گورنروں کی پانچ برس

کے لئے مدت کا مذاق بنادیا یہی پہلو کہ صدر جمہوریہ کی فوجی کو واپس لے لیا گیا اس امر کا مظہر ہے کہ یہ کام سیاسی مصلحتوں نہ کہ انفرادی اہلیت کی بنا پر سرانجام دیا گیا۔ اس فیصلے نے گورنری پوزیشن کو ایک آزاد آئینی شناخت سے بدل کر مرکزی حکومت کا وہ ملازم بنا کر رکھ دیا جہاں اسے وجہ بناؤ تو شس کے بغیر بٹایا جاسکتا ہے۔ حالانکہ ادنیٰ ترین ملازم کو بھی یہ حق حاصل ہے۔ جب چند رشیکہ حکومت وجود میں آئی تو اس نے آئین کی روح سے ہماری زوجہ کی فقدان کا مظاہرہ کیا۔ اس نے گورنروں کو واضح الفاظ میں اشارے دیے: "یا تو ہمارے کہنے پر چلو یا یہ عہدہ ترک کر دو!"

بدقسمت سے کسی بھی گورنر نے اس آئینی حرات کا مظاہرہ نہیں کیا کہ وہ گورنر کے عہدہ "اور گورنری آزادی" وقار اور عزت کی حفاظت کر سکے۔ اگر حکمران جماعت نے گورنر کو آئین کے ایجنٹ کی بجائے سیاسی ایجنٹ بنانے پر زور دیا ہے تو کسی نے مستفی ہونے کی دھمکی نہیں دی۔ ہر معاملے میں صدر جمہوریہ نے وزیراعظم کو یا وزیر داخلہ کو اتنا بھی مشورہ نہیں دیا کہ وہ کم از کم پارلیمنٹ کو اتنا تو بتا دے کہ گورنر کا منشا گورنری راج قائم کرنے کا تھا اور گورنر نے آئین کیوں وکٹری کی دفعہ ۹۲ کے تحت فرمان جاری کرنے کے لئے صدر جمہوریہ کو فرمان بجائی کرنے کے بارے میں رجوع کیا تھا مگر مرکزی حکومت نے اس کی اجازت نہیں دی۔

صدر جمہوریہ نے اس بات کو فراموش کر دیا کہ وہ نہ صرف اس ملک کا سربراہ ہے جہاں ذمہ دار پارلیمانی حکومت کا نظام ہے بلکہ وہ اس انفاقی نظام کا اعلیٰ ترین عہدہ ہے۔ اسے اراکین پارلیمنٹ اور اراکین اسمبلی کا انتخابی کالج منتخب کرتا ہے اور آئین میں اس کے مواخذہ کی آئینی گنجائش ہے اور اگر اس کو فرض صفر کی حیثیت سے کام کرنا ہے تو اس دفعہ کے کوئی نسخہ نہیں رہیں گے۔ اگر ان معاملات میں جہاں صدر جمہوریہ محسوس کرتا ہے کہ گورنر کو مرکزی حکومت کی طرف سے اپنی میعاد سے قبل تبدیل کرنا، ہٹایا جانا یا اسے مستفی ہونے کے لئے کہنا مقصود ہے۔ کیونکہ ریاست میں کسی دوسری سیاسی جماعت کی حکومت ہے تو گورنر اگر نقطہ نظر سے خطا کرنے سے انکار کر کے مستفی ہونے کی دھمکی دیتا ہے اور قوم کو اعتماد میں لینے کی بات کہتا ہے تو کوئی وزیراعظم گورنر کے عہدے کے ساتھ جھجھکیا نہیں کرے گا۔ اور اس سے گورنر اور صدر جمہوریہ دونوں عہدوں کا وقار بڑھے گا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم سب ایک ملک کی بیماری کے شکار ہیں۔ جیسا کہ ڈاکٹر امبیڈکر نے آئین کو منظور کرتے وقت کہا تھا۔ "آئین تو اہل کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو لیکن یہی طور پر اس صورت میں برآجہو کا جب اس پر عمل پیرا ہونے والے جسے بن جائیں گے۔"

باب آٹھ

میرے آنے سے قبل کے حالات

اشیاء بکھر جاتی ہیں، مرکز انھیں تھام نہیں سکتا
زہر پر محض انفرادی کو ہی ڈھیل ملتی ہے
تھوڑا بڑھ کر ہر ڈھیل بڑھ جاتی ہے اور ہر مقام پر
معصومیت کی رسم ڈوب کر رہ جاتی ہے
تمام نظریاتی پابندیوں کا بہترین فقدان جبکہ بدترین
جذبات کی شدت سے بھرپور رہتے ہیں:
ڈبلیو۔ بی۔ سٹین

چند سیاسی عناصر اس نظریے کا پرچار کر رہے ہیں کہ نیشنل کانفرنس کا ٹکڑا کر کے ایک مخلوط حکومت کے دوران صورت حال اس قدر خراب نہیں تھی جتنی کہ بعد ازاں رونما ہوئی یہ نظریہ گمراہ کن اور سلیبی ہے اس کے تحت تمام حقائق کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ یہ اصل اور جڑوں کو فراموش کر دینا ہے۔ یہ نظریہ ملامت کو بنیادی ملال پر فقیہ دیتا ہے۔ ۱۹ جنوری کو گورنری راج کے نفاذ سے قبل ہم ذہنی طور پر ہتھیار ڈال چکے تھے اور انفرادی اور سماریت کے گھیرے بادلوں نے تمام وادی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

انتھامیر سے موسوم طاقت جب ہتھیار ڈال دیتی ہے تو اس سے دو اموات ہوتی ہیں اور نہ ہی یہ اموات کا موجب بنتی ہے۔ یہ ملک کو ہتھیار ڈالنے کے مترادف دھوکہ دیتی ہے۔ اگر حکومت کی باگ ڈور ۱۹ جنوری ۱۹۹۰ء کی بجائے ۶ جنوری تک ڈاکٹر فاروق محمد اللہ کے ہاتھ میں رہتی تو قوم کو کشمیر انتظامیہ کے سنگین اور المانک رجحان سے بیدار ہونا پڑتا۔ ۱۲ جولائی ۱۹۸۹ء تک جب میں اپنے میعاد عہدہ کے بعد پہلی مرتبہ چارج سے سبکدوش ہوا تو میں نے اس صورت حال کی تصویر باب سوم کے خطرے کے علامات میں دی ہے۔ اس باب میں صرف جولائی ۱۹۸۹ء سے ۱۹ جنوری ۱۹۹۰ء کے واقعات تک ہی اکتفا کروں گا۔

+ ملاحظہ ہو باب اول میرا جنرل غبار۔

دھماکے کے ساتھ دہشت گردی کی آمد

۲۷ اکتوبر ۱۹۸۸ء کو لال چوک میں ایک ماروٹی وین کھڑی تھی۔ اس میں دھماکہ ہوا۔ یہ بم ظاہری طور پر اس کے وہاں کھڑے کرنے کے قلیل عرصے کے بعد ہی رکھا گیا۔ یہ وین تباہ ہو گئی۔ ایک مسلم خاتون وکیل سمیت گیا و افراد کو شدید زخموں میں آئیں۔ بے چاری خاتون کا پاؤں ختم ہو گیا۔

دہشت گردی نے حملہ کر دیا تھا۔ یہ ایک سنگدلانہ مہم کی صورت اختیار کرنے والی تھی۔ اس میں اس بات کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی کہ اس عمل میں ایک مسلم خاتون بڑی طرح سے مجروح ہوئی شدید سر اسیمگی کا مائل پھیل چکا تھا۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے میں نے اتنا ہی کیا تھا آج کی کاروائی بروقت ہو سکتی ہے اور کئی تک بہت دیر ہو چکی ہوگی اور بد قسمتی سے وہ کل دھماکے کے ساتھ آپہنچا تھا۔ اس کے بعد مزید دھماکوں مزید دہشت گردی تشدد کو مزید عوامیت اور مزید شدت کے ساتھ آتا تھا۔

۱۳ جولائی ۱۹۸۹ء کو ان خواتون کو لے جانے کے لئے ایک سی آر پی کی بس آئی جنہوں نے اپنی ڈیوٹی ختم کر دی تھی۔ جو بھی وہ لوگ بس میں سوار ہو رہے تھے ان پر گولیوں کی بوچھاڑ کی گئی۔ یہ گولی باری معتمد اور منصوبہ بندی تھی۔ یہ گولیاں لڑائی مکاؤں اور مرکز کی طرف سے آرہی تھیں۔ بس سرعت کے ساتھ نکل گئی اور اس کے ساتھ ساتھ گولی باری کا جواب بھی دیا گیا۔ اس افراتفری کے عالم میں چند حملہ آور ہجوم میں ہل مل گئے اور چند حملہ آور قریب کی تنگ گلیوں میں نکل گئے۔ سی آر پی ایف کے دو جوان ہلاک ہو گئے اور ۹ مجروح ہوئے۔ بچاڑ معصوم راہ گیروں کی جانیں بھی تلف ہو گئیں۔

اس حملے سے عصر نو کی دہشت گردی کی تمام تر خصوصیات عیاں ہو جاتی ہیں۔ بے خبری، بیڑی احتیاط سے منصوبہ بندی اور ہجوم کے ساتھ ہل مل جانے کے تمام مناہر اس میں موجود تھے اس سے قوا کو سرا سمید کرنے اور قومی اور بین الاقوامی ذرائع ابلاغ میں وسیع تر تشہیر بھی عیاں تھیں۔ اس کا بنیادی نمونہ طے کیا جا چکا تھا اور اسے مختلف اشکال میں دہرایا جاتا تھا۔

۱۶ جولائی کو بموں و گیسز پریشن فرنٹ نے سی آر پی حملے کی ذمہ داری قبول کرنے کا رسمی طور پر اعلان کر دیا۔ اس نے واضح کیا کہ اس قسم کے حملے تب تک جاری رہیں گے جب تک ہندوستانی جبر و استبداد اور سامراجیت کا خاتمہ نہیں کیا جاتا۔ چند دن بعد ایک اور تنظیم حزب اللہ اسلامیہ جمہوریہ نے اسی قسم کا اعلان کیا۔ اس نے خدایوں کو سخت وارننگ دی اور کہا کہ انہیں مثالی سزا دی جائے گی۔

۳۰ جولائی کو خیامینہ کے زنا نہ بیت الخلاء میں دھماکہ ہوا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ چند خواتین کو بھی

پھانسی لیا گیا ہے۔ ۲۹ جولائی کو ان نوجوان خواتین پر تیزاب پھینکا گیا جو برقعہ کے بغیر چل رہی تھیں۔ اس کا مقصد ان خواتین کو وارننگ دینا تھا جنہوں نے چند بنیاد پرست گروپوں کی طرف سے سخت پردہ کرنے کی ہدایت کو نہیں مانا تھا۔

ماہ اگست کے دوران تشدد ڈرانے دھماکے، تخریب کاری، دہشت گردی کے واقعات تشویشناک رفتار کے ساتھ جاری رہے۔ ۳۰ اگست کے روز پاکستان کا یوم آزادی تیز و احتشام کے ساتھ منایا گیا۔ ۵ اگست کو مختلف تخریب کار اور دہشت گرد تنظیموں کی کال پر ہڑتال رہی ترنگے پرچم جلانے گئے، بجی مکاؤں یہاں تک کہ عوامی عمارتوں پر سیاہ پرچم بلند کئے گئے۔ ٹریفک کی آمدورفت کی اجازت نہیں دی گئی۔ اس سے قبل سکول جلانے والے طلباء کے والدین کو خطوط ارسال کئے گئے جن میں وارننگ دی گئی کہ اگر انہوں نے اپنے بچوں کو یوم آزادی کی پریڈ یا یوم آزادی تقریبات میں کسی طور شرکت کی اجازت دی تو اس کا شدید فیضانہ انہیں بگھٹا پڑے گا۔ رات کے وقت بازاروں کی روشنیاں اُگلی کر دی گئیں، یہاں تک کہ سول سکرٹریٹ بھی تاریکی کی چادریں ڈوبارہا۔

۱۱ اگست کو ٹنگر کے نزدیک پستول دکھا کر ریاستی حکومت کی ایک بس کو اغوا کر لیا گیا۔ تمام مسافروں کو تار کر کے دھماکے سے اڑا دیا گیا۔ ۱۸ اگست کو ہونے والے تشدد کے واقعات میں ۵۰ سے زائد افراد زخمی ہوئے اور ۱۲ اگست کو سرنگر کے اندرون سقا کدرل میں نیشنل کانفرنس کے لیڈر محمد یوسف حلائی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ اس سے قبل پردیش کانگریس ڈائی کیٹی کے صدر محمد شفیع قریشی کے گھر میں بم دھماکہ ہوا۔۔۔۔۔

۱۸ اگست کو شفیع قریشی نے انجمنوں کیوں کے ساتھ بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ یہ پہلی مرتبہ ہے کہ جب علیحدگی پسند اس قدر دلیر ہو گئے ہیں کہ انہوں نے حکومت کی ناک تلے ہی پاکستان کے یوم آزادی کی تقریبات کا اہتمام کیا۔ گورنمنٹ یسڈیم میں ایک مارچ پاسٹ کا اہتمام کیا گیا۔ ۲۱ توپوں کی سلامتی کی علامت کے طور پر ۲۱ راؤنڈ گولیاں چلائی گئیں۔ پولیس نے اس قوم دشمن کاروائی کو روکنے کے لئے کچھ نہ کیا۔ جب میرے مکان کے گیراج میں بم پھٹا تو مکان کو زبردست نقصان پہونچا۔ میری ماروٹی کار کو اس قدر نقصان پہونچا کہ اب اس کی مرمت بھی نہیں ہو سکتی۔ یہ ستم ظریفی ہے کہ یہ قریشی کی طرح کے لوگ ہمتے جنہوں نے میری اُس وقت نکتہ چینی شروع کر دی جب میں نے ان لوگوں کے خلاف کاروائی شروع کی تو ان کی سلامتی کے لئے رہے تھے، ترنگے پرچم جلا رہے تھے اور دن دہائے معصوم عوام کو قتل کر رہے تھے۔

فاروق عبداللہ کی نیشنل کانفرنس سٹڈس رائی حکومت فلاح کی شکار ہو چکی تھی۔ اس کی نااہلیت اور بے امانی تو فدا تھی۔ ان دو جماعتوں کی بے اعتنائی اور بے اثری اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ عوام کے دلوں سے ڈر نکالنے والا کوئی بھی شخص موجود نہیں تھا۔ کوئی بھی راستے عام کو منظور کرنے والا نہیں تھا۔ اور کسی نے بھی جوابی چینج پیش نہیں کیا۔ ان دونوں کے پاس صرف زبانی جمع خرچ کا ایک ہتھیار تھا اور اس کے بار بار استعمال کے بعد اس کا اثر بھی ختم ہو چکا تھا۔

۸ ستمبر ۱۹۸۹ء کو شیخ عبداللہ کی بری ٹی نیشنل کانفرنس نے اس روز بھاری حفاظت میں اس کے مزار پر ہر ایک عا مجلسہ کر کے اکتفا کر لیا۔ تخریب کاروں نے اس روز یوم نجات منانے کا الگ الگ ہنگامی اور اس کا ل کے خواب میں سرنگزانت ناگ بار بھولا اور وادی کے دوسرے قصبوں میں مکمل ہڑتال رہی۔ ہڑتال پر زیادہ شریفک بھی نہیں تھا۔ شیخ کے پتلے جلانے گئے۔ رات کے وقت قریباً ۹۰ فیصد مکانات نے روشنی نہیں جلائی اور ایک بلیک آؤٹ سا اس روز رہا۔

کیا کوئی اس بات پر یقین کر سکتا ہے کہ وہی عبداللہ تھا، سات برس قبل جس کی موت پر انسانی سمندر میں شہرہ بہتا ہوا سرنگزانت کی سڑکوں پر آمد پڑا تھا۔ اور دو روز بعد جس کے جنازے کے موقع پر ہر دیہہ ہر چھت اور ہر مکان بھرا ہوا تھا کیا یہ بات واضح نہیں تھی کہ یا تو اس کی عظمت کسی مصنوعی مارے سے قائم کردہ تھی اور اس پر سونے کا پانی پڑھا ہوا تھا یا وہ لوگ جو اس کے جانشین بنے وہ اس قسم کی ناپاک اور گندی مٹی کے بنے ہوئے تھے کہ ان کے اعمال نے اس کی عظمت کو چوس کر اس کو مزار سے باہر رکھ دیا تھا۔

کسی بھی دیگر شہر میں نیشنل کانفرنس کے کارکنوں کی کوئی سرگرمی دیکھنے میں نہ آئی۔ یہ تنظیم اس قدر موثر نہ تھی کہ وہ اس شخص کے لئے اپنی آواز اٹھانے کو تیار نہیں تھی۔ جیسے وہ شیر کشمیر اور بالائی قوم کہتے ہوئے نہیں تھی تھی۔ اس واقعے کے کشمیر میں تخریب کاروں کی پیش قدمی کے لئے میدان کھلا چھوڑ دیا۔

۱۴ ستمبر کو ۵۸ سالہ کشمیری پنڈت اور بانی کورٹ کے ایڈووکیٹ لکالال چیلو جو کہ بھارتیہ جنتا پارٹی کی جموں و کشمیر یونٹ کا نائب صدر بھی تھا، چٹکراں محلہ سرنگزانت میں اپنے گھر سے باہر آ رہا تھا۔ ہیلیکپٹر پہنچے دو نوجوان اس کے سامنے نمودار ہوئے ان میں سے ایک نے اس کے ساتھ مصافحہ کیا، شاید وہ اس کی شناخت کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ دوسرے نے اچانک اپنی کلاشنکوف لٹائی اور نزدیک سے پانچ گولیاں اس کے پیٹ میں داغ دیں۔ وہ خون میں لت پت وہیں ساکت پڑا رہا۔ نصف درجن گولیاں جو اس کی بدن سے نکلیں وہ نزدیکی دیوار میں چھید کر گئیں۔ اس سے اس محلے کے اعتماد اور سنگدلی کی جھلک ملتی تھی۔ حکومت کا ڈر بالکل موجود نہیں تھا۔ قاتل دن دباڑے چلتے بنے۔

کشمیری پنڈت طبقے کو ایک اشارہ دے دیا گیا کہ وہ تخریب کاروں کے رحم و کرم پر رہے وہ کسی بھی وقت اس طبقے کے کسی بھی رکن کو ہلاک کر سکتے ہیں۔ اگر ایک پنڈت سری نگر سے اس علاقے کے اندرون میں محفوظ نہیں جہاں کشمیری پنڈت آباد ہیں تو کوئی انگ انگ تنہا دور افتادہ حصوں اور علاقوں میں کیسے محفوظ ہو سکتا ہے ان میں خوف و ہراس کا احساس بڑھنے لگا۔

دوسرے قوم پرستوں کے لئے بھی بات صاف اور واضح تھی جے کے ایل ایف نے اس قتل کے بعد ایک اخباری بیان میں کہا: ہم ان تمام لوگوں کو ہلاک کر دیتے ہیں جو یہ بات کہتے ہیں کہ جموں و کشمیر ہندوستان کے ساتھ الحاق ناقابل تینسہر۔ ہر ایک مسلمہ و ہر ایک کھد۔ ہر ایک شہر۔ ہر ایک

کارکن تھا اور دل کی عینق گہرائیوں سے قوم پرست تھا۔

۱۶ ستمبر کو اعجاز ڈار کی پہلی برسی تھی اور اس کا یوم شہادت منایا گیا۔ ڈار وہ نوجوان تھا جو ڈی۔ آئی جی علی محمد وٹالی کی سرنگزانت پابلیک گاہ کے باہر ایک جھڑپ میں ۱۸ ستمبر ۱۹۸۸ء کی رات کو مارا گیا تھا۔ ڈار اس کے تین رفقاء اپنے ہتھیاروں سمیت وٹالی کو ہلاک کرنے کے لئے آئے تھے جسے ریاستی حکومت کی ایک سرگرم علامت تصور کیا جاتا ہے۔ تم غازی بھی ہے دو برس بعد جے کے ایل ایف کے چوٹی کے لیڈر وٹالی کے بھائی کی رہائش گاہ سے ہی گرفتار کئے گئے۔

ڈار کی عظیم قربانی کی ستائش میں وسیع پیمانے پر اشتہار تقسیم کئے گئے اس کے اعزاز میں نظم خوانی کی گئی۔ متعلقہ مسجیدوں میں منازاد کی گئی۔ تخریب کاروں کی پروپیگنڈہ چیخیں نے پوری جارحیت سے کام کیا۔ ریاستی حکومت نے کوئی حرکت نہیں کی۔ اشتہار پٹائے نہیں گئے اور برائے نام بھی کوئی جوابی کارروائی نہیں کی گئی۔ اور اس کے نتیجے کے طور پر عوام کے جذبات کو ابھارا گیا اور اعجاز ڈار کے ارد گرد شہادت کا حلقہ تیار کر دیا گیا۔

اس روز متعدد تشدد کی وارداتیں ہوئیں۔ نو اکدل میں ایک پولیس پارٹی پر ریاستی ساخت کے دس بم پھینکے گئے جن سے ۱۰ پولیس والوں سمیت ۱۶ افراد زخمی ہو گئے۔ نو اکدل جاتے ہوئے راستے میں ڈپٹی انسپکٹر جنرل سی آر پی پر بسنت باغ میں دو موافراد کے ہجوم نے حملہ کیا۔ اسے ذاتی تحفظ کے لئے ہوا میں گولی چلانا پڑی تا کہ وہ ہجوم کو ڈر کر بھاگ سکے۔ عید گاہ کے نزدیک پولیس کی ایک گشتی کار پر بھی گولی چلائی گئی صفا کدل میں جے اینڈ کے بینک کی شاخ پر حملہ کر کے اسے نقصان پہونچایا گیا۔ علی کدل میں بارہ تخریب کاروں نے اندھا دھند فائرنگ کی کلاشنکوف رائفلیں لہرائی گئیں۔

تشدد کی ان کارروائیوں میں ۵۰ افراد ہلاک ہوئے جبکہ ریاستی حکومت کی پیشگی منصوبہ بندی نہیں کر رہی تھی تخریب کارین مافی کر رہے تھے۔ انہوں نے ایک بھاری نفیاتی فائدہ حاصل کر لیا اور کشمیر میں دہشت گردی کی جڑیں گہری ہوتی گئیں۔

پینلن لیگ کے صدر شیر شاہ کو ۲۸، ۲۹ ستمبر کو جموں و کشمیر قومی شاہراہ پر رام بن کے نزدیک گرفتار کر لیا گیا۔ اس گرفتاری کے لئے جہاں اینٹلی جنس بیورو نے بھیجا تھا۔ یہ ایک صاف شفاف کارروائی تھی۔ مگر چند بیان شدہ وجوہات کی بنا پر شیر شاہ کو نظر بندی کے لئے جہوں نہیں لایا گیا بلکہ اسے ڈائریکٹر جنرل آف پولیس غلام جیلانی پنڈت کی ہدایات پر واپس سرنگزانت لایا گیا۔ وادی میں گڑبڑ کے لئے یہ واضح اشارہ تھا۔ پناہ وادی میں وسیع پیمانے پر گڑبڑ ہوئی اور ریاستی سبزی میں ہمنعلاہٹ واضح طور پر عیاں ہوتی رہی۔ چار دن تک سرنگزانت اور دیگر اہم قصبوں میں مکمل ہڑتال رہی۔ فائرنگ میں پانچ افراد جاں بحق ہو گئے۔ متعدد دعوائی ممالکوں کو نذر آتش کر دیا گیا۔ ان

میں سو پور منڈی کرافٹ سینٹر، بارہمولہ شیعہ سبب سے آفس، پلوامہ ضلع میں تہساب کے مقام پر لڑکوں کا ایک ہوشیار دہنی پورہ میں لڑکیوں کا سکول اور پلوامہ کے نزدیک لکڑی کا ایک پل شامل ہیں۔ لال پوک میں بھی چینی سائنت کا ایک گرنید پھینکا گیا جس سے ہر طرف افراتفری پھیل گئی۔

حکمران اتحاد نے اپنے پیر و کاروں کو صف آرا کرنے کے لئے علامتی کوشش بھی نہیں کی تاکہ ہڑتال توڑی جاسکے گویا ہر طرف بے پروائی کا اعلان سامنے۔

اشغالی طور پر صورت حال میں مزید بے اعتنائی تھی۔ سرنگر کے ڈپٹی کمشنر ولی نے شبیر شاہ کے نظر بندی اور گامتا پر دستخط کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اننت ناگ کے ڈپٹی کمشنر نے بھی ہمدردی اختیار کیا۔ ریاستی حکومت کی بیرونی کرنے کے لئے ایڈووکیٹ جنرل عدالت میں پیش نہیں ہوا۔ اس نے یہ ذمہ داری ایڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل اور سرکاری وکیل پر ڈالنے کی کوشش کی۔ وہ بھی پیش نہیں ہوئے۔ مقامی اخبارات میں اجرت شدہ ایسے اشتہارات جاری تھا کہ ان میں شائع ہونے سے شروع ہو چکے تھے جن میں نیشنل کانفرنس اور کانگریس دا آئی کے کارکنوں نے ان جماعتوں کے ساتھ اپنی لائقیت کا اظہار کر دیا تھا اور ریاستی حکومت کے اہم اہلکار دہشت زدہ تھے اور وہ اپنے بنیادی فرائض ادا کرنے پر رضامند نہیں تھے جبکہ ریاستی اور مرکزی حکام کے نظریات کا خدشہ تو ایسی صورت میں بنیادی سطح پر کارکنوں کی صفوں میں خوف و ہراس پیدا ہونا ایک قدرتی امر ہے۔

اکتوبر کا مہینہ بھی اسی طرح کا بڑا خوب تھا۔ تشدد کے واقعات جاری رہے۔ اس ماہ کے دوران ۵۰ ہجوم لگے ہوئے جن میں ۳۹ افراد مجروح ہوئے اور آتشزدگی کے بیسیوں واقعات پیش آئے۔ دہشت گردوں کی طرف سے فائرنگ کے پندرہ واقعات رونما ہوئے جن میں تین افراد ہلاک ہو گئے اور ایک درجن کے قریب زخمی ہوئے پولیس کے ایک سب انسپکٹر شبیر احمد نے ضلع کپواٹھ میں اپنے علاقے میں دہشت گردی کو قابو میں رکھنے کے معاملے میں کچھ مفید کام سرانجام دیا۔ اسے اس کار نمایاں کے لئے اپنی باری سے پہلے ترقیاب کیا گیا۔ ۲ اکتوبر کی شب کو دہشت گرد اس کے گاؤں داگورہ میں آئے جہاں شبیر احمد کا بھائی بشیر احمد عظیم سکونت پذیر تھا۔ عظیم کے مکان کے جھروکے سے انہوں نے گلاشکوف سے اندھا دھند گولی باری کی جس کے نتیجے میں شبیر احمد کی بوی اور اس کی اسالہ بیٹی ہلاک ہو گئی یہ نہایت سفاکانہ قتل تھا جہاں تک کہ بچی کو بھی نہیں بخشا گیا اس سب انسپکٹر کے فرائض منصبی کے ساتھ دو تو بوی اور بی بی کو کچھ لینا دینا تھا مگر دہشت گرد ایسی کسی بات کو نہیں سمجھتے تھے ان کا مقصد دہشت گردی پیدا کرنا تھا اور اس میں وہ کامیاب ہو گئے۔ ۵ اکتوبر کو ایک طاقتور ہندو گرنید پورہ کی باری بازار میں پھینکا گیا جس میں ۱۰ افراد زخمی ہو گئے جن میں پولیس کے پانچ اہلکار شامل تھے۔ چھتر بل پولیس تھانے کے اسٹنٹ سب انسپکٹر کو قتل کرنے کی کوشش بھی کی گئی۔

باب دوم تاریخ کے جھروکے سے ہم بتلایا گیا ہے کہ ۲۰ اکتوبر کا دن کشمیر کی تاریخ میں بیماری ابھرت کا خاص ہے۔ ۱۹۴۷ء میں لکھنؤ ٹرینل ڈی آر۔ رائے کی کمان میں سندھ و سرحد افواج کا صدارت سرنگر میں ۱۱ اکتوبر

پراسی روز آرتھام اس وقت حملہ آوروں کے لئے سرنگر چند گھنٹوں کی پیش قدمی کے مترادف رہ گیا تھا۔ کرنل رائے نے بارہمولہ میں ان کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا اور اس قبضے کے لازمی علاقوں میں بہادری کے ساتھ لڑنا ہوا وہ جہاں جتن ہو گیا۔ سرنگر ہوائی اڈے کے دفاع کے لئے بھجور سومناٹھ شرمائے اپنی جان نثار کر دی مگر اکتوبر ۱۹۸۹ء میں وادی ایک مرتبہ پھر حملہ آوروں کے فرسے میں تھی احمدی اور بیرونی حملہ آوروں کے زرخیز تھیں معلوم ہی رہتا تھا کہ اکتوبر ۱۹۸۹ء میں ہندوستانی بہادروں کی تمام قربانیاں گویا رائے کال چلی گئی ہیں۔ درحقیقت اشغالی اور سیاہی بے راہ روی ناقابل معافی گناہ تھا۔ ۲۶ اور ۲۷ اکتوبر کو ہڑتال کی وجہ سے وادی کی زندگی مفلوج ہو کر رہ گئی اس کی کال علیحدہ کی پسندوں اور دہشت گردوں نے دی تھی۔

۳ نومبر کو ریشا رڈ ڈسٹرکٹ اوریشن بیج ایل۔ کے گنجو جو دشمنوں کے ایجنٹ ایکٹ کے تحت خاص عدالت کا صدر رتی افسر تھا۔ اور جس نے مقبول بٹ کو قتل کے الزام میں پھانسی کی سزا سنائی تھی سہری سنگھ بانی سٹریٹ میں دن دباڑے قتل کر دیا گیا۔ اس کا مقصد صرف دہشت گردی کے عروج کا مظاہرہ کرنا تھا بلکہ عدلیہ کے ذہن میں بھی خوف و ہراس پیدا کرنا تھا۔ یہ اشارہ خالی نہیں کیا کیونکہ بعد ازاں مقامی عدلیہ کا رویہ سے یہ بات پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے۔

جیسے جیسے لوگ سب کے انتخابات قریب آتے جا رہے تھے تخریب کاری کی کاروائیوں میں تیزی آتی جا رہی تھی۔ ماہ نومبر میں بموں اور گرنیدوں کے ۵۰ دھماکے کئے گئے ہڑتالوں اور جلوسوں کی رفتار میں بھی اضافہ کیا گیا۔ ۳۰ نومبر کو دن یوم سیاہ کے طور پر منایا گیا۔ ایک چوٹی کے دہشت گرد حمید شیخ کی گرفتاری پر غور توں نے ایک پرتشدد مظاہرہ کیا۔ پولیس کے ساتھ مقابلے میں حمید شیخ زخمی ہو گیا تھا اور وہ میڈیکل انسٹیٹیوٹ میں زیر علاج تھا۔ ڈاکٹروں نے حمید کی تفتیش کے معاملے میں ہر ممکن رخصت اندازی کی۔ جیسا کہ باب دوم "تخریب کاری کی طرز عمل میں تفصیلی طور پر بیان کیا گیا ہے ریاست کا پورا نظام تخریب کاروں اور ان کے ساتھ ملے ہوئے افراد کے ہاتھوں میں چلا گیا تھا۔

اکتوبر ۱۹۸۹ء کے دوران تخریب کاروں نے جموں ڈوڈن کے ڈوڈہ جھرواہ اور کشتواڑ علاقوں میں بھی اپنی جڑیں قائم کر لی تھیں۔ ان علاقوں میں شبیر شاہ کی گرفتاری کے خلاف جلوس رکالے گئے تھے۔ ۳۰ اکتوبر کو ڈوڈہ میں اسلانی پرچم بلند کیا گیا اور مسجدوں میں اشتعال انگیز تقریریں کی گئیں۔ ان تقریبوں میں ۲۷ اور ۲۸ اکتوبر کو مسلمانوں نے ہڑتال کی ڈوڈہ اور دوسرے قصبوں میں دہشت گردی کی کاروائیوں کی توسیع کا مقصد عظیم تر کشمیر منصوبے کا ایک حصہ تھا۔

بین جماعتی اور اندرون جماعتی جھگڑے

ریاست کے لئے بالکل بے فعال تھیں۔ اس کے برعکس وہ آپس میں جھگڑ رہی تھیں۔ دونوں جماعتوں کے درمیان بھاری بد اعتمادی بھی پیدا ہو چکی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کر رہی تھیں۔ ابھی بہت عرصہ نہیں گزرے کہ کانگریس (آئی) کے لیڈر ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو برٹش فرنٹ کے ایک لیڈر کے رنگ میں پیش کر رہے تھے یہاں تک کہ جنک راج گپتا کے رتبے کے لیڈر نے جو بعد ازاں نوک بھاگا کن بن گیا ڈاکٹر فاروق بلالہ پر یہ الزام عائد کر دیا کہ وہ پاکستان نواز تحریک کاروں کا بھٹ ہے۔ ۱۵ مارچ ۱۹۸۴ء کو قانون ساز اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے جنک راج گپتا نے مظفر آباد اور راولپنڈی سے ایک ساتھ شائع ہونے والے اردو ہفت روزہ انصاف سے دریغ تر اقتباسات پیش کئے جس میں کہا گیا تھا کہ ڈاکٹر فاروق عبداللہ ۱۹۷۴ء میں پاکستان اور پاکستانی مقبوضہ کشمیر کے دورے پر گیا ہوا تھا جہاں اس نے آزاد اور خود مختار کشمیر کی حمایت کا اعلان کیا تھا۔ اس نے یہاں تک کہا تھا کہ اگر شیخ عبداللہ نے اس کے خیالات کو قبول نہیں کیا تو وہ اپنے والد کے خلاف بھی بناوت کر دے گا پرانی جارحیت اور غلط فہمیاں آسانی سے دور نہیں ہوتیں۔

ریاست میں رومناحالات کے پیش نظر بین جماعتی اور اندرونی جماعت جھگڑے غیر تشخص شدہ ارادہ مرگ کے سوا کچھ نہیں تھے۔ جب کہ گھر میں آگ بھڑک اٹھی تھی اس کے اندر کے لوگ اس بات پر باہمی جھگڑوں میں مبتلا تھے کہ وہ عہدوں کے فوائد کو کس طرح منقسم کر سکیں۔ اقتدار حاصل کرنے کی شدید بیماری میں وہ اس قدر مبتلا ہو چکے تھے کہ باہری دیواروں پر لپکتے ہوئے اشلوں کے خطرات انہیں محسوس نہیں ہو رہے تھے۔

ان کی کھلے عام ایک دوسرے پر کچڑ اچھالنے کی عادت بھی اس قدر نقصان دہ تھی اس نے دونوں جماعتوں کے عکس کو مزید تراب کیا اور انہیں نفرت اور توہین کا مرکز بنا دیا۔ کیا اس قسم کی جماعتیں منظم اور مصمم تحریک کاری کا مقابلہ اندر یا باہر سے کر سکتی تھیں۔

اس طرز عمل کی چند نمایاں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ جون ۱۹۸۹ء میں پردیش کانگریس (آئی) کے صدر محمد شفیع قریشی نے نیشنل کانفرنس کی کارکردگی اور نظریات کے بارے میں نہایت نکتہ چین باتیں کیں۔ یہاں تک کہ اس نے شیخ عبداللہ کو بھی نہیں بخشا۔ اس نے کہا۔ شیخ نے اپنے ذاتی مفادات کے لئے عوام کا استحصال کیا ہے۔ ریاست میں داخلی طریقہ کار کے ذریعے چند ایک کنہوں میں دولت کی تقسیم ہوئی ہے۔ ایک مرتبہ پھر ۱۸ اگست کو قریشی نے کھلے عام کہا۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی حکومت ریاست کے تینوں خطوں میں گڑبڑ کو روکنے میں قطعی طور پر ناکام رہی ہے۔ مسلسل تشدد اور بدہشت گردی کی وجہ سے کانگریس (آئی) بہم اپنی بنیاد دھوئی جا رہی ہے۔ اس نے کف اسٹوس ملے سمجھے کہا کہ نیشنل کانفرنس اور کانگریس (آئی) کے درمیان مناسب رابطے اور تعاون کا فقدان ہے۔ ۱۸ اگست کو اس نے کانگریس کو بھی جواب دینے کے لئے نیشنل کانفرنس کی نکتہ چینی کی۔ جموں میں قریشی گروپ کی طرف سے منعقدہ کنونشن میں ۱۶ ستمبر کو قریشی نے ڈاکٹر فاروق عبداللہ حکومت کی بے اثری کی شدید مذمت کی۔

اس نے انتہا کیا کہ اگر بنیاد پرستی اور بدہشت گردی کی قوتوں کو قابو نہ کیا گیا تو اس سے نہ صرف ریاست بلکہ پورے ملک کی یکجہتی اور سالمیت کو خطرہ پیدا ہو گا۔ ۱۷ ستمبر کو قریشی نے ایک پریس کانفرنس میں شکایت کی کہ نیشنل کانفرنس کی طرف سے کانگریس (آئی) کے ساتھ سوتیلی ماں کا سلوک کیا جا رہا ہے۔ ۱۵ اور ۱۶ اکتوبر کو قریشی نے اس قسم کے بیانات دیئے۔ اس نے کہا کچھ دیر سے ریاست افراتفری کے عالم میں مبتلا ہے یہ صورت حال بہتر ہونے کی بجائے بد سے بدتر ہوئی ہے۔ الگ طور پر نیشنل کانفرنس سے پہلے قدمی چھیننے کی کوشش میں قریشی نے مرکزی حکومت کو تجویز پیش کی کہ وہ مسکریوں کو گرفت و شنید کے لئے دعوت دے۔ نیشنل کانفرنس نے کانگریس (آئی) کی جارحیت کو کچھ کمزور کیا جواب نہیں دیا۔ ۱۸ اگست کو دیئے گئے ایک پریس انٹرویو میں وزیر مملکت برائے تعمیرات مصطفیٰ کمال جو وزیر اعلیٰ کا برادر اصغر بھی بنے کہا: "راجہ فاروق اکارڈ کی افلاہیت اب ختم ہو چکی ہے۔ وقت آگیا ہے جب دونوں جماعتیں صورت حال کا از سر نو جائزہ لیں۔ وسط اکتوبر میں نیشنل کانفرنس کے ۲۷ اراکین قانون ساز نے محمد شفیع قریشی کے رویے کی مذمت کی۔ انہوں نے اس پر علانیہ ہتھی کی سازش کرنے کا الزام لگایا اور کہا کہ وہ راجہ فاروق اکارڈ کو بھی سوتا ز کر رہا ہے۔ ۲۰ اکتوبر کو ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے اندرونی جذبات نے اس کو دھوکہ دے دیا اس نے کہا کہ مرکزی حکومت برطانوی پالیسی۔ تقسیم کرو اور حکومت کرو کی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔ یہاں تک کہ اس نے جمیر آف کامرس کو بتا دیا کہ نئی دہلی میں کشمیری مسلمانوں پر اقتدار نہیں کیا جا رہا ہے وہ منہذب ہونے کے پرانے حربوں پر واپس آگیا تھا دادیوں تک بات کہتا، دوسری جموں میں اور دہلی میں وہ بالکل الگ بات کہتا۔

اتحادی شرکا میں ہی نہیں بلکہ جماعتوں کے اندر بھی مختلف گروہوں میں کھلی جھگڑا بھی پورے شد و مد سے طشت از بام ہونے لگیں۔ کانگریس (آئی) کا گھر خاص طور پر بیروٹ کا شہر تھا۔ ماہ جولائی کے دوران دو اہم گروہوں ایک کی قیادت پردیش کانگریس (آئی) کے صدر محمد شفیع قریشی کر رہا تھا۔ اور دوسرے کی وزیر برقیات غلام رسول کار کے درمیان تعلقات بالکل خراب ہو گئے۔ اگست میں صورت حال یہاں تک پہنچ گئی کہ جی آر کارمنگٹ رام شرما اور میر حسین پر مشتمل گروپ نے مطالبہ کیا کہ پردیش کانگریس کیٹی (آئی) کی تشکیل نو کی جائے۔ اور جموں و کشمیر میں کانگریس (آئی) مسلمات کے نگہبان اور کل ہند کانگریس (آئی) کے سیکرٹری کے این سنگھ کو بھی ہٹایا جائے۔ اس کے جواب میں ۱۳ اگست کو قریشی گروپ نے ناراض لیڈروں میر حسین محمود شاہ اور رنگیل سنگھ کو نوٹس جاری کیا کہ وہ وجہ بتائیں کہ کیوں وہ انہیں جماعت مخالف کاروائیوں کے سبب تنظیم سے خارج کر دیا جائے۔ ستمبر اور اکتوبر کے دوران ان گروہوں کے درمیان جھگڑا بلا کسی نام جاری رہی۔ کانگریس (آئی) کے مقابلے نیشنل کانفرنس کا اندرونی انتشار اس قدر کھلا اور واضح نہیں تھا کہ ڈاکٹر فاروق عبداللہ اور اس کی جتنی بھی کے خلاف جذبہ شدید طور پر پرمپ رہا تھا اندر ہی اندر شدید ناراضگی تھی مثال کے طور پر ماہ اگست کے دوران فاروق عبداللہ نے کانگریس (آئی) وزیر خزانہ حسین انصاری کے ہمراہ بد کام

جانے کا فیصلہ کیا۔ جماعت کے اس بار سوخ دھڑے کو یہ بات پسند نہیں آئی جس کی بیٹی بیگم شیخ محمد عبداللہ اور جہاں سیکرٹری شیخ نذیر عٹوک رہے تھے ڈاکٹر عبداللہ کو نیور کیا گیا کہ وہ یہ دورہ ترک کر دے۔ اسی طرح جماعتی پتقیاتشوں کے باعث اُسے آخری لمحہ پر سترال کا دورہ بھی منسوخ کرنا پڑا۔ اس سب کو مشعل کانفرنس کے نوجوان شعبہ کے دو دھڑوں کے درمیان کھل کر لڑائی ہوئی۔ ایک گروپ کی قیادت وزیر علی محمد ساگر کر رہے تھے اور دوسرے کی بشیر احمد ہنس۔

۱۶۔ اگر تہ کو وزیر سیاست آراء میں چپ بے استغنی دے دیا چپ نے اپنے استغنی کے لئے وجہ بیان کرتے ہوئے کہا: حکومت بے راہ روی اور بے سعی کی شکار ہے۔ اور انتظامیہ میں بے پناہ رشوت ستانی اور افراتفری ہے۔ اس نے کہا کہ ریاست کے تینوں راجن ایک طوفان میں مبتلا ہیں اور بھرتی کے طریقوں نے ریاستی حکومت کو عوام میں بدنام کر دیا ہے۔

جماعتی کارکنوں کی مصلحتوں میں استغفول کی بھرمار سے نیشنل کانفرنس بھی کٹنا کا شکار ہو رہی تھی۔ اس بارے میں قریباً ہر روز اجرت شدہ اشتہارات مقامی اخباروں میں شائع ہوتے۔ ۸ اگست کو تخریب کا تنظیمیوں نے اس امر کا بیان دیا کہ یا تو نیشنل کانفرنس کا رکن جماعت سے مستثنیٰ ہو جائیں یا اس کا فیاضہ بنائیں۔ اس بات کو ثابت کرنے کیلئے کہ یہ ایک خفیہ خالی دھماکی نہیں تھی نیشنل کانفرنس لیڈروں کے گھروں کے باہر بم دھماکے کئے گئے۔ ۱۲ اگست کو کشمیر کے صوبائی نیشنل کانفرنس کے صدر عبدالسلام دیوا ۱۳ اگست کو گاندربل میں جماعت کے ایک اہم کارکن غلام احمد میر کے گھروں کے باہر بم دھماکے ہوئے اور ۱۸ اگست کو دہلہ کے ایک قیدی عبدالغفور صاحب کے گھر کے باہر یہ دونوں نیشنل کانفرنس کے سینئر لیڈر تھے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ ۲۱ اگست کو نیشنل کانفرنس کے زینہ کدل بلاک کے صدر محمد یوسف حلوانی کو دہشت گردوں نے گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ انہیں دہلی میں نیشنل کانفرنس کے ایک لیڈر اور ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے چچا زاد بھائی شیخ رشید نے اپنے گھر کے باہر بم دھماکے کے بعد جماعت سے استغفی دے دیا۔ اپنے استغفی کے خط میں شیخ رشید نے ڈاکٹر فاروق عبداللہ اور نیشنل کانفرنس کے بنیادی اصولوں کو ترک کرنے کے لئے نکتہ چینی کی۔

پروینگٹون کا کرشمہ

متشدد حملے، فائرنگ، گولی باری اور بم دھماکے اور ان کے ساتھ ہڑتالیں اور پروپیگنڈہ کا کوشش سب کچھ ایک ساتھ جملہ اقامت شال کے طور پر آگست کے مہینے میں ۱۲ دن تک ہڑتال رہی حالانکہ کسی سیاسی پارٹی نے ہڑتال کی کال نہیں دی تھی۔ ۲۵ اگست کو سرینگر کے ایک دوکاندار نے اخبار نویسوں کو کف افسوس ملتے ہوئے کہا: اس برس کے ایام کاروبار سے زیادہ ہڑتالیں اور ہند کے رشتہ

کتا بچوں اور اشتہاروں کی بھرمار دیواری اشتہار کیسٹ اور دوسرے پروپیگنڈہ مواد نے اپنے اپنے راستے سے عوامی ذہنوں پر اپنا اثر ڈالا۔ تجزیہ کاروں نے ولادی کی بیشتر آبادی کے خیالات پر غلبہ جمالیا۔

دہشت گردی کے فروغ کے لئے انتخابات

ماہ اکتوبر کے آخر تک تمام متعلقین کو یہ واضح ہو جانا چاہیے تھا کہ ریاست کی سیاسی نظام کا کوئی ایسا شہید باقی نہیں بچا تھا جو اس موذی بیماری کا شکار نہیں تھا اور موجودہ حالات میں لوگ بھلائی انتہا بات کروانا ریاست میں دہشت گردی کو فروغ دینے کے مترادف تھا۔

جن لوگوں نے کثیر میں انتخابات کرانے کا فیصلہ کیا ان کی سطحیت اور کھوکھلا پن واقعی حیران کن ہے۔ وہ کیا توقع رکھتے تھے، کیا وہ سوچتے تھے کہ ہزاروں بم دھماکے پیسیوں ہلاکیں، سیکورٹی فورسز پر ان دباؤ بار بار حملے، متواتر ہڑتالیں اور جماعتی کارکنوں کے استغناء ان حالات میں کیا عوام ووٹ ڈالنے کے لئے آئیں گے، کیا رائے دہندہ ان ڈپٹی کمشنروں پر اعتبار کرے گا۔ جنہوں نے تبادلہ وارنٹ پر دستخط کرنے کے بنیادی فریضہ بھی ادا نہیں کئے اور جن کے ایڈووکیٹ جنرل نے ہائی کورٹ میں پیش ہونے سے انکار کر دیا۔

فیصلہ کرنے والوں کو کوئی سمجھ نہیں تھی اور حالات کی حقیقت کا کوئی احساس نہیں تھا وہ خوابوں کی دنیا میں ہی مست تھے۔ خود مختاری کے لئے ان کی بنیادی صلاحیت مکمل طور پر عیاں ہو چکی تھی۔ ۲۲ نومبر پولنگ کے ذخیرہ ویرانی کے عالم میں تھے اور دیہات اونگھ رہے تھے۔ تحریک کاروں نے اس روز کے لئے سولہ کرفیو اور رات کو بلیک آؤٹ کا اعلان کر دیا۔ ایک طنزیہ بیسٹیشن کش کے طور پر چند پولنگ مرکز کے نزدیک ٹی وی سیٹ رکھ دیے گئے تھے۔ جن پر گتے کی تختیاں آویزاں تھیں جس پر لکھا تھا۔ جو شخص بھی اپنا ووٹ ڈالے گا اُسے یہ ملے گا: حکومت کا منشا اس قدر کھوکھلا ہو گیا تھا کہ سیاسی حکومت نے اپنے طور پر بقول کا مذاق بنالیا تھا۔ رائے دی کے لئے آنے والوں کی برائے نام تعداد نے دنیا بھر کے سامنے ثابت کر دیا کہ وادی طوفان میں مبتلا ہے اور نیشنل کانفرنس اور کانگریس (آئی) لاشوں کے سوا کچھ نہیں۔

سوربور غلام رسول کار کا آبائی قصبہ ہے۔ کاران دولز ریاستی حکومت میں وزیر تھا۔ یہ قانون ساز کونسل کے جے جی میں حلیم جیسیب الہ اور نیشنل کانفرنس کے ایک سابقہ ممبر پارلیمنٹ اور کابینہ وزیر عبدالاحد وکیل کا بھی آبائی قصبہ ہے۔ اس کے باوجود سوربور قصبے میں پانچ ووٹ ڈالے گئے۔ بارہمولہ کے کلیدی قصبے میں ایک بھی ووٹ نہیں پڑا متعدد دوسرے پونگ مراکز پر بھی یہی صورت حال تھی۔

سرنگرم میں باریکٹا کی وجہ سے شہر متضیق پٹ کو بلا متعلقہ مقب قرار دے دیا گیا بہت ساری عمارتوں پر لاک
روز جے کے ایل ایف کے جمنڈے لہا رہے تھے۔ تمام تر مل ایک مرق ایک الین کر دیا گیا نیشنل کانفرنس
اور کانگریس (آئی) دونوں نے نہایت افسوسناک کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ کوئی انتخابی جلسہ منعقد نہیں کیا گیا۔

رائے عام کو منظم کرنے کا کوئی بھی اقدام نہیں کیا گیا یہاں تک کہ امیدوار اپنے گھروں سے نکلے تک نہیں۔ ۲۲ نومبر پولنگ کے دن۔ کی جو تفصیلات اخبارات میں شائع ہوئیں انہوں نے کسی بھی شے میں نہیں رہنے دیا کہ تحریک کاروں کی مرضی پوری طرح چلتی تھی اور حکمران اتحاد بالکل بے بہرہ تھا۔ ہندوستان ٹائمز کے نمائندے نے لکھا: یہ ایک حقیقت ہے کہ اس نمائندے کو کشمیر وادی میں بارہمولہ اور اننت ناگ اضلاع کے دیہی علاقوں میں آج کسی پولنگ سٹیشن کے اندر کوئی بھی دھڑکھائی نہیں دیا۔ کہیں بھی کسی سیاسی جماعت کا کوئی پولنگ ایجنٹ نہیں ملا ان میں نیشنل کانفرنس کے موجودہ ممبر پارلیمنٹ پروفسر سیف الدین سوز کا حلقہ انتخاب بھی شامل ہے ریاستی دار الحکومت سے پہلے نیشنل کانفرنس کے امیدوار کو بلا مقابلہ کامیاب قرار دیا گیا ہے۔ مگر آج وہاں بند رہا۔ سرکاری دفاتر میں میلے کی موجودگی بھی نادر تھی۔ انڈین ایکسپریس نے اطلاع دی کہ کوئی قطاریں نہیں تھیں پولنگ ایجنٹ نہیں تھے اور بہت زیادہ تشدد ہوا۔ اس نے کہا: عام طور پر جل پہل کا دن ہونے کی بجائے ۲۲ نومبر کے روز وادی پوری طرح مفلوج رہی کیونکہ قصبوں اور شہروں میں مکمل بند رہا۔ بارہمولہ اور اننت ناگ کے پولنگ بوتھوں پر دھڑوں کی کوئی قطار دکھائی نہیں دی۔ بہت سارے پولنگ مراکز پر نیشنل کانفرنس کے پولنگ ایجنٹ بھی موجود نہیں تھے۔ وادی کے دوسرے بڑے قصبے اننت ناگ اور بارہمولہ سو پور اور شوپیان میں پولنگ مضاف ایک فیصد تھی پریڈیاٹ کا تبصرہ اتنا ہی تحریر تھا اس نے کہا: کشمیر میں اب دہشت گردوں کی حکومت ہے اور دہشت گردوں کی طرف سے کامیابی کے ساتھ انتخابی بائیکاٹ اس امر کو ظاہر کرتا ہے کہ گذشتہ تین برسوں کے دوران نیشنل کانفرنس کا انگریس (آئی) اتحاد کس قدر کھوٹے پن کا شکار ہوا ہے۔ ان کا میدان چھوڑ دینا ایک افسوسناک امر ہے۔ شیخ عبداللہ اور محاذ رائے شماری کے دھڑوں میں بھی انتخابی بائیکاٹ کا کبھی اس قدر حیرت کن اثر نہیں ہوا۔

اور ایسا اس وقت پیچیدہ صورت اختیار کر گیا جب منتخب ہوجانے کے فوراً بعد شیخ بٹ اور سیف الدین سوز نے ایسے بیانات دیے جو قومی مفادات کے منافی ہیں۔ بٹ نے کہا: کشمیر میں موجودہ طوفان کے لئے مرکز اور کانگریس (آئی) ذمہ دار ہیں۔ یہ صورت حال مرکز کی کمزوریوں کا نتیجہ ہے جس نے بول و کشمیر کے ساتھ نوابا دینی سلوک کیا ہے مرکز نے وعدہ پورا نہیں کیا ہے جو اس نے کشمیر کے عوام کے ساتھ ۱۹۴۷ء میں کیا تھا اس وعدہ کے آخر کیا معنی ہیں۔ قدرتی طور پر اس کا مطلب آسوداں رلے ہے۔ سوز نے بھی ایسا ہی بیان دیا۔

دو غلط چہرے

مندرجہ بالا اتفاقی سے شیخ بٹ کا نظریہ اور نمائندہ کردار مظہر ہوجاتا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ لوگ کشمیر کی طرف سے پارلیمنٹ میں بیٹھے ہیں۔ بلند آواز میں شور مچاتے ہیں غلط پرچار کرتے ہیں اور غلط قسم کے دوسرے پیدا کرتے ہیں۔ ۱۹۵۳ء سے قبل کا موقف اختیار کر کے وہ قوم پرستوں کو نالال کرتے ہیں۔ اپنی خوشامد سے کشمیری قوتوں کو بروخت کرتے ہیں۔ کوئی بھی ان کے جھانسنے میں نہیں آتا۔ ان کے دو غلط چہرے ان کی اپنی ہی دغا بازی

کو ظاہر کرتے ہیں اور نفع اور نفع کی عام فضا کو تقویت دیتے ہیں۔

لوک سبھا انتخابات کے دوران نیشنل کانفرنس (ایف) اور کانگریس (آئی) کی نامزدگی پوری طرح سے عوام پر عیاں ہوجانے کے بعد تشدد کی لہر مزید بڑھ گئی۔ یکم دسمبر کو ماسٹر بازار پولیس تھانے کے سٹیشن ہاؤس انسپیدانٹ کو سقا کا زور پر قتل کر کے پولیس کے سپلے سے ہی پست تو جیل کو ایک اور جھجکا دیا اس کی لاش بازار میں گھنٹوں تک لاوارث پڑی رہی۔ دار الحکومت میں سراسیمگی پھیل گئی۔ اور انتظامیہ بے حرکت اور ناکارہ ہو کر رہ گیا۔ یہاں تک کہ پولیس میں سید اللہ کے رفقاء کی جرأت گئی کہ پولیس کے بلکہ ہمدردی کا بھی فقدان ہو پیدا ہو گیا۔ بلا قیادت اور انجمن افراتفری کی وجہ سے ان کی آنکھوں کے آئینہ ہونے لگے۔

۵ دسمبر کو شیخ عبداللہ کے یوم ولادت پر تحریک کاروں نے سرنگرم میں مکمل ہڑتال اور رات کے وقت بلیک آؤٹ کر دیا۔ شیخ عبداللہ کے نام کی بھاری قدر قیمت تھی متعدد دہلیزیں اور دروازے ان سے منسوب تھے مزاح کے طور پر کہا جاتا تھا کہ ریاست میں سب کچھ کشمیر کے بڑے بڑے خوراک ہم کھاتے ہیں جس ہوا میں ہم سانس لیتے ہیں جس ٹرک سے ہم گزرتے ہیں جس ہسپتال میں ہم گئے اور جس پارک یا باغ میں ہم چلے گئے۔ دسمبر کو نیشنل کانفرنس کا ایک بھی کارکن ہڑتال یا بلیک آؤٹ کو ناکام بنانے کے لئے ملا جلا تک نہیں نیشنل کانفرنس کی باہانے قوم کے تین عقیدت اور ان کے اصولوں کی پابندی کہاں فائز ہو چکی تھی ان کی خوشامد پرستی واضح طور پر عیاں تھی اور اس طرح نیشنل کانفرنس زوال پذیر ہو گئی۔

ڈاکٹر روبیہ کا انوا۔ ایک عقابانی حملہ

ایک کے بعد دوسری کامیابی سے اس انتخاب کو قومی خوراک حاصل ہوئی۔ اس کی آنکھیں تیز ہو گئیں اور اس کے بچوں میں دلیری پیدا ہو گئی۔ اس کے بال و پیر تیز ہو گئے اور رفقاء کا زیادہ سے زیادہ احاطہ کرنے کے لئے اس نے یہ بال و پیر تیزی سے بلانا شروع کر دیے اس میں اعتماد پیدا ہو گیا اور جلد ہی اس نے عمل اقتدار کی جھٹ پر واقع بارغ میں ہی اپنے شکاک کو تلاش کر لیا۔

۸ دسمبر ۱۹۸۹ء کو جس کے ایل ایف کے دہشت گردوں نے مرکزی وزیر وادہ مفتی محمد سید کی بیٹی ڈاکٹر روبیہ سید کو اغوا کر لیا جس سے ہماری قوم حیرت اور اداسی کے عالم میں ڈوب گئی۔ قوم پر باغی روز تک خوف اور تشویش کا عالم طاری رہا۔ مرکزی اور ریاستی حکام اندھیرے میں جھٹکتے رہے اور مافی میں اپنی آنکھوں پر انتہا بات کے باوجود جو بیٹی ہاندھ رکھی تھی اس نے انہیں کوئی سراغ حاصل کرنے کے قابل بنا کر رکھ دیا تھا۔ اس اغوا کے موقع پر ڈاکٹر فاروق عبداللہ بیرون ممالک میں تھا اور اس کی کامیابی کے رفقاء تذبذب میں مبتلا تھے تقریباً ۲۰ مسلم تنظیموں نے

اس افواج کی مذمت کی جماعت علمائے اسلامی کے سربراہ مولانا فضل الرحمان سمیت پاکستان کے چند لیڈروں نے اس افواج کو غیر اسلامی قرار دیا۔ میر واعظ مولوی فاروق نے بھی اسے اسلام مخالف قرار دیا۔ اس تمام کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ اس کے برعکس پاکستان میں جیتیم جی اینڈ کے لبریشن فرنٹ کے صدر امان اللہ خاں نے ڈاکٹر روبہ سید کو جان سے مار ڈالنے کی دھمکی دی۔ پاکستانی حکومت ہارنگی اور چوٹی کے پانچ دہشت گرد۔ عید شیعہ شبیر خان، مجاہد احمد زنگر، نور محمد کھیل اور شہد الطاف بٹ کو رہا کر کے ڈاکٹر روبہ سید کو دہشت گردوں کی فہرست سے رہائی حاصل کی تھی۔

اس نقاب کو ایک اور نمایاں کامیابی حاصل ہو چکی تھی اور وہ تاحد نظر صورت حال کا مالک بن چکا تھا اور اس سراسیمہ وادی پر وہ واضح طور پر منڈلاتا رہا۔

ڈاکٹر روبہ سید کے معاملے کی تفصیل باب چودہ "بالادستی حاصل کرنا" میں دی گئی تھی اس معاملے میں ریاستی مشنری بالکل بے اثر ثابت ہوئی۔ ایک عظیم جم غفیر نے رہا شدہ لشکریوں کا عظیم الشان استقبال کیا انہوں نے جشن فتح منایا۔ اس باختری تصدیق کر دی کہ دہشت گرد اپنے تئیں عروج پر ہیں اور اب وہ اپنی جانب ہو گئے تھے کیونکہ ان کی آخری فتح کے بارے میں انہیں اب کوئی شک و شبہ نہیں رہا تھا۔

ایسا ہونا ناگزیر تھا۔ دہشت گردی کے واقعات میں سرعت اور تیزی آئی۔ ۱۷ دسمبر کو کرنیو کی مدت کے دوران سیکورٹی فورسز گرفتار ہوئی۔ ۲۰ دسمبر کو نائٹنگ بک آف انڈیا کی رینڈرسے روڈ شاخ کو لوٹا گیا اور ۲۲ دسمبر کو الہ آباد کے سیکورٹی گارڈوں کو اندرون شہر میں گولی مار دی گئی۔ دو بم دھماکوں میں پانچ افراد زخمی ہو گئے۔ ۲۳ دسمبر کو دہلی پولیس کے جوان ہلاک ہو گئے اور سات شدید طور پر زخمی ہوئے۔ مسز عائشا بھین کے صحن میں ایک زوردار بم دھماکا ہوا کیونکہ اس نے ڈاکٹر روبہ سید کے افواج کی مذمت کی تھی۔ ۲۵ دسمبر کو جوں و کشیر آرمڈ پولیس کے ایک کانسٹیبل کو خانیار میں گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ ۲۶ دسمبر کو اننت ناگ کے ایک ممتاز صحافی پریم ناتھ بٹ کو ہلاک کر دیا گیا۔ پولیس کا ایک ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کشمیر یونیورسٹی کے نزدیک گولی لگنے سے شدید طور پر زخمی ہوا۔ اسی روز وادی میں پانچ بم دھماکے ہوئے۔ ۲۸ دسمبر کو اننت ناگ میں حکمہ چنڈی کراٹ کی عمارت کو بم دھماکے سے تباہ کر دیا گیا۔ ۳۰ دسمبر کو پولیس کے دو انسپروں پر گولی دالی گئی۔ ایک سب انسپکٹر ہلاک ہو گیا اور ایک ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ شدید طور پر زخمی ہوا۔ اسی روز کپواڑہ میں ایک سابق فوجی کو گولی مار دی گئی۔ اسی دن وادی کے مختلف شہروں میں پانچ بم دھماکے ہوئے۔ ہاری پرست کے ارشد شیلاٹ شیشیدہ رجبی ایک گرینڈ میڈیکا گیا۔ ۱۹۸۹ کا برس تشدد اور خونریزی کی فتنی مٹی لہروں کے ساتھ ختم ہو گیا۔

برس ۱۹۹۰ کے طوع پر ایک طاقتور بم دھماکا ہوا جس میں سات افراد زخمی ہو گئے۔ ۲ جنوری کو تو گڑبڑ ہوئی اس میں دو افراد ہلاک ہوئے اور ۲ زخمی ہوئے۔ ۳ جنوری کو انیشلی جنس بیور کے انسپکٹر آر۔ این پل منگہ کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ ۵ جنوری کو جب اقوام متحدہ کا پہلا دستہ سرینگر پہنچا، یوم خودارادیت کے

کرنیو کے دوران ہوا کے اور گڑبڑ کے واقعات ہوئے جن میں ایک شخص جال بحق ہو گیا اور چند زخمی ہوئے۔ ۱۷ جنوری کو تشدد کے واقعات ہوئے اور وادی بم دھماکوں سے ہل گئی ان میں تیس افراد زخمی ہو گئے اس سے سرینگر بارہمولہ، سولہ اور بڈگام میں پچاس افراد مجروح ہوئے۔

۸ جنوری کو گڑبڑ کے واقعات مزید بلند ہوئے۔ پونچھ گئے جن میں تیرہ افراد لقمہ اجل بن گئے اور ایک سٹو زخمی ہو گئے۔ عید گاہ کے نزدیک ایک ایمر ایٹھری مرکز کو نذر آتش کر دیا گیا۔ دہشت گردی کے اثر میں شدت لانے کے لئے ایک پولیس اہلکار کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اس کے منہ میں کپڑا ٹھونسے گیا۔ اُسے اذیتیں پہنچائیں گئیں اور پھر حیدر پورہ میں ایک درخت سے پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ ستر گاؤں کے امام کو بھی اسی طرح اذیتیں پہنچا کر اسی طریقے سے پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

بے وجود ریاستی حکومت اور بہرہ مرکز

کوئی یسوس نہ کرے کہیں مایوس کن تصویر پیش کر رہا ہوں چنانچہ اس بارے میں وقت کے آزاد مشاہدین کی آڈیو پیش کی جاتی ہے۔ میں نے ہر ایک مشہور قومی روزناموں کی ہم عصر آراء و فتنب کی ہیں نظریات کی ایک دہائی کے کسی کو اس پر شبہ نہیں رہے گا کہ ۱۹ جنوری ۱۹۹۰ کو میری آمد سے قبل ہی قوم کشمیر کو کھو چکی تھی۔ ۱۱ نومبر کے معاصر ٹیلی ویژن میں شیخو رکافی نے رپورٹ کیا۔

"کشمیر وادی کی موجودہ صورتحال پر عسکریوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ جیسا کہ حالات ہیں قوم کشمیر کو لگ بھگ کھو چکی ہے۔ چند ماہ قبل ہی انتظامیہ کا وجود ختم ہو چکا تھا۔ مگر اس کا نقصان یہ ہے کہ نازک انتظام آخری دم لدا کر رہا ہے۔ عسکریوں کو اس کا پتہ نہیں ہے۔ شک ہے ہم جارہے ہیں۔ تم جو چاہو کرو۔ عوام کے لئے بغیر حاضرت نظامیہ اور مکمل طور پر بہرہ مرکز، آخری تنکوں کے مترادف ہیں۔ اگر جاہلوں کے لئے پہلے کی ہمدردی سرانجام کی پہل واد تھی، مگر اب یہ اعتقاد کی پیداوار ہے۔ عوام بددوق برداروں کے لئے لڑائی کو تیار ہیں اور اب انہیں تحریک آزادی کے سپاہی سمجھا جا رہے ہیں۔

اگر آپ ایک عام عورت سے پوچھیں کہ آپ مرکز سے کیا چاہتے ہیں۔ اس کا رد عمل بد ظنی اور بے اعتمادی سے بھر پور ہوگا۔ "تم اب بھی سوچتے ہو کہ ہم مرکز سے کچھ چاہتے ہیں۔"

اب تو مرکز بھی کچھ نہیں ہے۔ "ہندوستان اور کشمیر کی علیحدہ شناخت ہے۔ یہ بینام ایک سیاح کے ذہن میں پرزور انداز سے ڈالا جاتا ہے۔

وادی میں ہر شخص کہے گا کہ مرکز سے کوئی نہیں آیا ہے اور ہو سکتا ہے کہ حالات ایسے مرحلے پر پہنچ گئے ہوں جہاں کوئی بھی قدم رکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ کوئی انہیں انتظامی مشنری کے ٹھپ ہونے کی بات بتائے گا۔ دنیا کی تمام سی آر پی ایف اب کچھ نہیں کر سکتی۔ یہ اب ایک کھلا راز ہے کہ ریاستی پولیس کا اعلیٰ ڈھانچہ اب

بکھر چکا ہے۔

اگر امن و قانون کی مشینری ٹھپ ہوئی ہے تو یہ اس لئے کہ سیاسی آقامرچکے ہیں۔ افسروں کو یہ بتانے والا کوئی نہیں کہ انہیں کیا کرنا چاہیئے۔ میٹنگیں اُسی وقت ہوتی ہیں جب کہ نہایت ضروری ہو اور شاید ہی کوئی فیصلہ ہو پاتا ہے۔

سیاسی آقا اپنی بقا کی جنگ کا کھیل کھیل رہے ہیں۔ راجیو فاروقی اگر ڈو لوز جماعتوں کو کھلایا ہے۔ درحقیقت شیخ عبداللہ بنیویشنل کانفرنس کامرادن ہے اب عتاب بن چکا ہے۔ اس کے مزار کو سن کر دیا گیا ہے کیونکہ وہ سوچتے ہیں کہ شیخ نے انہیں ۲۵ برس تک اپنا علام بچھا۔ اس کے فرزند ڈاکٹر فاروق کو وہ کم بڑا نہیں سمجھتے۔ درحقیقت بنبال کے شمال میں ایک بلاجماعت ریاست ہے۔ حزب مخالف جماعتوں نے اپنے ہاتھ کھڑے کر لئے ہیں گویا وہ غیر متعلقہ ہو کر رہ گئی ہیں۔ کانگریس بھی ٹھوس مواد کی جگہ نہیں رہی اس کو بھی اسی برش کے ساتھ مسخ کیا گیا ہے جویشنل کانفرنس کے لئے استعمال کیا گیا۔

اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں کہ عسکری داخل ہو چکے ہیں۔ بازاروں پر ان کا غلبہ ہے اور وہ دن دور نہیں جب وہ ریاست پر غلبہ جمائیں گے پھر کشمیر کے کلیدی دھارے میں واپس آنے کے معاملے میں دیرپائی ہوگی۔ ۲۵ اگست ۱۹۸۹ کو ماسٹر جندوستان ٹائمز نے لکھا۔

عوام جن میں نیشنل کانفرنس کے پیروکار بھی شامل ہیں کا اعتماد اب انتظامیہ سے حکومت چلانے اور ان لوگوں کے مسائل میں مداخلت کرنے پر مرکوز ہونا چاہیئے۔ ریاست کی موجودہ صورت حال ڈاکٹر عبداللہ کے انتظامیہ میں سب سے بڑا اعتماد کا دھڑ ہے۔

۲۳ نومبر ۱۹۸۹ کو ماسٹر ٹائمز آف انڈیا نے تبصرہ کیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ دہشت کی حکومت کے خلاف خاموشی کی سازش کی جارہی ہے کیونکہ انتخابات کے اعلان سے کافی عرصہ قبل پاکستانی تربیت یافتہ عسکریوں کی طرف سے ہر روز توہین کے باوجود ریاستی وزیر اعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی چند گزیر دارقہروں کے سوائے نئی دہلی نے ذرا بھی فکر و تشویش کا اظہار نہیں کیا۔ امن و امان پر رقرار رکھنے والی ایجنسیوں کا ظاہر اعلیٰ ہونا اور سیاسی ڈھانچے کو تقویت دینے کے لئے کچھ کرنے پانے میں سری نگر اور نئی دہلی کی مجبوری اس کی اہم وجوہات ہیں بہر حال غارتق عبداللہ کی طعناور اور کارکردگی میں جری طرح ناکام رہنے کی وجہ سے ہی موجودہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

۱۱ جنوری کو اپنے ادارے میں ماسٹر جندو ر قسط اڑے۔

اب گذشتہ چند ماہ سے وادی کشمیر میں علیحدگی پسندوں اور تحریک کا رول نے اُدھر چھا رکھا ہے۔ امن و قانون کی حالت آج کی مانند کبھی ابتر نہیں تھی۔ کچھ روز قبل قربانیتا مریاست میں کریمو کے اغوا کا فیصلہ ملی اقدام ہوا جس میں ہری نگر، اننت ناگ، سولہ، دوہ، پٹنہ، جالندھر، لکھنؤ، ممبئی، بھوپال،

خطرے کی علامت ہے۔ ریاستی انتظامیہ حالات کو برائے نام بھی مول پر لانے میں ناکام رہا ہے۔ اس سبب کی ابتداء میں فوری واقعات کے بعد ہونے والی پولیس فائرنگ میں ۱۸ افراد جاں بحق ہو گئے اس سے قدرتی طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ حکومت کو یہ معلوم ہی نہیں کہ صورت حال کو قابو میں کیسے لایا جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ فاروق عبداللہ کا انتظامیہ اس وقت سے لے کر اس بات کا عادی ہو چکا ہے جب یوم آزادی کے موقع پر پاکستانی پرچم بلند رکھنے لگے اور بندر کھنے کی کال دی گئی۔ کریمو کے دوران بھی توڑ پھوڑ کرنے والے عناصر وادی کے مختلف حصوں میں لڑھکے کرنے اور عوامی عمارات کو نذر آتش کرنے میں کامیاب ہو گئے اس سے انتظامیہ کی غیر فعالی نمایاں طور پر سامنے آئی ہے ڈاکٹر فاروق عبداللہ نہ صرف انتظامی بلکہ سیاسی طور پر بھی بے عمل رہے ہیں۔

ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے عہد حکومت میں رونما حالات کی بابت تحریر کرتے ہوئے ممتاز صحافی کوکھل چکرورتی نے ۱۱ مارچ ۱۹۹۰ کو اپنے سیاسی تبصرے میں لکھا۔

اس مرحلے کے دوران وادی کے دوبارہ دورے کے بعد اس نامہ نگار کو نہایت مایوس کن تجربہ حاصل ہوا کہ ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے سیاسی جوش و خروش اور نمائش کے پس پردہ اس کی وزارت شدید رشوت ستانی اور بدانتظامی کی علامت بن کر نمایاں ہوئی ہے۔ اسی مرحلے پر ہی تجویز کارٹوپ کھل کر سامنے آئے۔

وادی کشمیر میں ماضی کا عاید اس لئے ضروری ہو گیا ہے کہ ہمارے کوریوٹو گاندھی کی طرف سے وزیر اعظم کو تحریر کردہ خط میں تصویر نہایت توڑ موڑ کر پیش کی گئی ہے۔ مشرک اندھی اور ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو یوم آزادی کے روز ہونے والے واقعات کی بابت یاد دلانا واجب ہو گا۔ ۱۵ اگست کو علیحدگی پسند کھل کر سامنے آئے اور جبراً ایک آؤٹ کرا دیا۔ بہت ساری عمارتوں پر پاکستانی پرچم بھی لہا رہے تھے۔ ان کی طرف سے عوام کے ساتھ سیاسی رابطہ قائم رکھنے کی کیا بھی مثال ہے اور کیا کبھی بھی انتظامیہ عوام سے الگ تھلگ نہیں پڑا

افغانی کے حالات کا پاکستانی اخبارات میں بھی نوٹس لیا گیا۔ دسمبر ۱۹۸۹ میں پاکستان کے مشہور روز نامے نیشنل کے کثیر کے حالات پر اپنے ادارے میں تبصرہ کیا۔ اپنے ایک تبصرے میں یہ ماحرہ نظر آ رہا ہے۔ ”سرپرست کے موصول ہونے والا پیغام بالکل واضح اور صاف ہے کہ وادی میں نئی دہلی کا حکم نہیں چلتا اور لڑکھائی ہوئی آئیڈنٹریشن کو درست کرنے کی بجائے ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے اپنے لئے چمکیے ہوئے شوق پال رکھے ہیں۔

اور دوسرا تبصرہ یوں تھا:-

وادی کشمیر میں گذشتہ ہفتے کے ذرا دانی واقعات سے دو باتیں بھر کر سامنے آئی ہیں۔ ہندوستانی حکومت کے خلاف حالات بناوٹ کے مزادوں ہو چکے ہیں اور فوجی کریک ڈاؤن سے کم کوئی بھی اقدام صورت حال کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ آزادی کے لئے کشمیری عوام کی جدوجہد ایک نازک مرحلے پر پہنچ چکی ہے اور اب یہ تاریخی وقت

ان کا انتظار کر رہا ہے کہ وہ ہندوستانی غلامی کی زنجیروں کو کاٹ سکتیں۔

جماعت اسلامی کے ترجمان جلدت نے بھی لکھا۔ ان دنوں کشمیر میں تشدد کی لہر اپنے پورے عروج پر ہے۔ ایک اور روزنامے نے پاکستان پر زور دیا کہ پاکستان کے ساتھ ملحقہ علماء قول میں سکھ اور مسلم تحریکوں کے مابین حرکات کے پیش نظر دستیاب راستے کو بند نہ کرے۔

یہاں تک کہ غیر ملکی اخبارات نے بھی ریاستی معاملات کا نوٹس لیا۔ جنوری ۱۹۹۰ء کے آخری ہفتے کے دوران نیویارک انٹرنیشنل نے لکھا۔

ہندو اکثریتی ہندوستان میں اور مسلم اکثریتی ریاست جموں و کشمیر میں علیحدگی پسندی کے جذبات قریباً دو تہائی قبل ابھرنا شروع ہوئے۔

ہندوستانی ریاست جموں و کشمیر کے شمالی دارالحکومت سری نگر میں تمام مسلمانوں کے خلاف پیکروں پر اس امر کے بلاوے ہیں کہ آپسک جہاں نفاذ کا وقت چکا ہے۔ "بہاد کشمیری" اپنے گھروں سے نکل آئیں۔ وی۔ پی سنگھ نے یہ حال اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ کشمیریوں کو چند جائز شکایات ہو سکتی ہیں۔ دو ہفتے قبل اس نے مگن کو گورنر مقرر کیا تھا ایک قابل ایڈمنسٹریٹر ہے۔ اور ۱۹۸۳ء سے ۱۹۸۹ء تک ریاست کا گورنر رہ چکا ہے۔ پناپن فاروق عبداللہ کے غیر مقبول نظام کو مستغنی ہونا پڑا ہے۔

اپنی غیر سنگالی کا مظاہرہ کرنے کے لئے جگمگوں نے کشمیر کے دوران عوام میں فوراں تقسیم کی اور نئی آسائیاں پیدا کیں۔ ہندوستانی فی فظول کی طرف سے ہلاک کئے گئے تین افراد کے کہنوں کو اس نے ۳۰۰ ڈالر کی گیند پیش کئے مگر اب بھی لوگوں کے جذبات بھڑکے ہوئے ہیں اور انہیں علاقائی اقدامات سے محمول پر لانے کی ضرورت ہے۔ دوسرے امور بھی اس میں شامل ہو چکے ہیں۔ عام غرہ ہے۔ ہم وہی کریں گے جو جرمنی کے عوام نے کیا ہے۔ ہم دیوار کو تباہ کر دیں گے اور سرحد پار کر جائیں گے۔

اخبارات اور سیاسی مبصرین ہی نہیں بلکہ مسند دیننا سیاسی لیڈر بھی افغانی کے حالات پر ماتم کناں تھے۔ شمال کے طور پر سابق وزیر اعلیٰ سید میر قاسم ڈاکٹر فاروق عبداللہ اور اس کے کئے کا مخالف نہیں تھا۔ اس نے بھی ۲۵ اگست ۱۹۸۹ء کو کہا۔ "اگر عوام کو تشدد کے خلاف کوئی تحفظ نہیں دیا گیا تو صورت حال ناقابل نجات ہو جائیگی۔ اسی آناوی پی سنگھ جو اس وقت جن مورچہ کا سربراہ تھا بھی رٹھانہ ہے۔ زیادہ تشویش اس لئے ہو رہی ہے کہ وہاں ایک غیر مقبول حکومت ہے جو نہ تو ایک علیحدگی پسند گروپ کا موثر طور پر مقابلہ کر سکتی ہے اور نہ ہی پرامن شہریوں کے جان و مال کی حفاظت کر سکتی ہے۔

وہاں پہنچنے کے بعد میں نے اپنے دو تہائی مشرور۔ وید مرواہ اور جیل قریشی کو صورت حال کا ایک مختصر جائزہ کرنے کے لئے کہا تھا۔ وید مرواہ کی رپورٹ کا اقتباس باب اول میں پیش کیا جا چکا ہے۔ اس بارے میں جو قریشی نے کہا مندرجہ ذیل ہے۔

قریباً تمام تر لوگوں کو اس امر کا یقین ہو چکا تھا کہ جنوری ۱۹۹۰ء میں ہی یا تو وادی آزاد ہو جائے گی یا پاکستان کا حصہ بن جائیگی۔ درحقیقت عوام نے مسکروں نے وعدہ کیا تھا کہ ۲۶ جنوری کو متوجہ نجات حاصل ہو جائے گی جب اسلامی جمہوریہ خود مختار کشمیر کے وجود کا اعلان کیا جانا تھا اور اس وجود کا مشاہدہ کرنے کے لئے غیر ملکی نمائندوں کو دعوت دی جا چکی تھی سرکاری حکم ان کے کنڈر ووم دائروں کے باہر نہیں چلتا تھا۔ پولیس کا حوصلہ از حد پست ہو چکا تھا اور جب جموں و کشمیر آرگنڈ پولیس نے ہندو ق کی لوک پر اپنے سینئر اہلکاروں کو گولی کر لیا۔ تب پولیس کے اندر بغاوت پیدا ہو چکی تھی۔ انتہا پسندوں کا تعاقب کرنا تو درکنار پولیس اہلکار خود بھی ان کے ساتھ سانحہ کا منہ کر کے ان کی امداد کر رہے ہیں۔

۱۹ جنوری سے قبل جن واقعات کی تفصیل اور مشاہدات میں نے فراہم کی ہے ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کشمیر لاقانونی اور زبردست افغانی کا شکار ہو چکا تھا۔ درحقیقت (۸ دسمبر) ڈاکٹر ویو سید کے اغوا کے روز تک جب دہشت گردی کے عقاب نے ریاست پر پوری طاقت سے جھپٹا مارا، وادی میں تشدد کے ۱۶۰۰ واقعات رونما ہو چکے تھے جن میں سے ۳۵۱ بم دھماکے سال ۱۹۸۹ء کے دوران ہی ہوئے تھے وادی تشدد و خونریزی اور دہشت کا شکار تھی۔ معصومیت کی روایت پورے طور پر دفن ہو چکی تھی۔ بھاری بھر کم انتظامیہ بے جان ہو چلا اور کشمیر بن کر رہ چکا تھا کشمیری دہشت گرد حقیقی حکمران بن چکا تھا۔ اس کے لئے اس حد تک میدان چھوڑ دیا گیا تھا کہ عوامی ذہن مغلوب ہو چکے تھے۔ یہ واقعی بدستھی ہے کہ باب "تخریب کی نوعیت اور طرز عمل" میں دیئے گئے محسوسات کے باوجود ان نڈلی کے خدو خدائے بے رحمیوں اور صفائی پیش کرنے والوں پر عوام کا ایک طبقہ اب بھی یقین کرتا ہے اور یہ قوم میں عموماً پائی جانے والی بدعت کا آئینہ دار ہے۔ موت کے سے زیادہ اہم کوئی اور بات ہو سکتی ہے کشمیر کے ایسے کا ذمہ داران لوگوں کا بہترین بے جنہوں نے براہ راست یا دورے کنٹرول کر کے حکومت کی وہ موت کی گڑ گڑاہٹ کو نہیں سنا۔

انداز فکر حملہ اور جوانی حملہ

قبیری حُصا صرف یہ ہے کہ میں دوسروں کا کوب کروں تو کیا
کہ میں ان کے اجسام میں قیام پزیر ہوں اور مجھے
کوب سے راحت دے کر انہیں خوش کرنے کی مجھ میں سکت ہونی چاہیے۔
بھگوتم

کشمیر میں موجود اس نازک صورت حال کے ساتھ نمٹنے کے معاملے میں پالیسی طے کرتے وقت مجھے ان
قوتوں اور امور کا محاسبہ کرنا تھا میں نے گذشتہ ابواب میں جن پر بحث کی ہے۔ بے رحم تاریخ نے اس کے ذہن
پر گہرے اور بدنامانہ پھوڑ دیے ہیں۔ تمام تروادی میں وحشی اور افراطی کی فصلیں پیدا ہو چکی تھیں جس کے
زہر آلودہ بیج مائیں کھل کر بوٹے گئے تھے۔ پھر دہشت گردی اور تحریک کاری کی تلخ حقیقتیں تھیں جن کی جڑیں
مضبوطی کے ساتھ مختلف سمتوں میں پھیلی ہوئی تھیں۔

ان کے ساتھ باخود غرض اور تنگ نظر سیاست کے تیز اور سنگدل برجھے تھے جنہوں نے فوج کا پیسے
موت کا شکار ہوتے لوگوں کو زخم لگانے میں کوئی عار محسوس نہیں کیا اور نہ ہی کوئی ایسی دیانتدارانہ کاوش کی تھی اس
دلیل سے چکھنے کا نیا راستہ تلاش کیا جاسکے۔

مجھے اس بارے میں بہت کم شک تھا کہ عصر نو کے ہندوستان میں سلطنت دور دور تک گہری ہو کر راس
چسکی ہے۔ ہماری سیاست کا اخلاقی ڈھانچہ ہمارے اداروں کی کمزور تفہیم اور لیڈروں کا کھوکھلا پن اس منظر
پر غالب آچکا ہے اور کشمیر جیسے پیچیدہ اور وسیع مسئلے کی بات تو کجا قوم کو کسی بھی سنجیدہ مسئلے کے حل کے ناقابل بنا
دیالیا تھا کیا وہ قوم عظیم ہونے کی خواہش کر سکتی ہے جو ایسے اُبھرتے ہوئے طوفان کو نظر انداز کر سکتی ہے
جس کا خاکہ میں نے باب "خطرے کی علامات" میں پیش کیا ہے اور فزیب کاری اور دھوکے پن اور بناوٹی جمہوریت
اور سیکولرزم کی سیاست کے تحت قدامت پسندی اور زعمہ پرستی اور اشتیاق

وہ قومیں جو بالغ نظر ہوتی ہیں اور قومی تعمیر نو کا نصب العین جنہوں نے طے کیا ہوتا ہے وہ اتفاقی اور لاپرواہ
طور پر عمل نہیں کرتیں مگر کشمیر میں یہ سب کیا گیا ہے۔

اس تمام عمل میں ملک کے اخلاقی پستی اور افراطی کے ماقول کے بارے میں درونک حد تک باشعور
رہا جس میں اصلاح اور احیائے نو کا فقدان ہے۔ اس کے باوجود بھی میں نے کہا کہ یہ بات قابل مسامحہ ہے۔
۲۶ جنوری ۱۹۹۰ء کے لئے تحریک کاری کے مکروہ منصوبے کو ناکام بنانے اور ان کے وادی پر عملی
طور پر قبضہ کرنے کے فوری بحران پر قابو پانے کے بعد مجھے دو سنگین مسائل کا مقابلہ کرنا تھا۔ ایک تو دہشت گردوں
کی اس طوفانی مہم کا تجزیہ اور داشت کرنا جو پاکستان سے ۱۲ فروری تک سالیٹ ہفتہ منار کشمیر میں ہوا کو
تیز تر کرنا چاہتا تھا اور دوسرا تمام دہشت گرد تنظیموں کی طرف سے افراطی کو یوم مقبول بٹ کا پورے طور
پر استحصال کرنے کا فیصلہ میری طرف سے دوسرے منصوبے کا مقصد اس اثر کو حاصل کرنا تھا جہاں سے میں دہشت
گردوں کو بھگانے کا منصوبہ بنا سکتا تھا۔

میں نے بنیاد ڈالنے کا کام شروع کیا۔ تمام ڈھانچہ دوبارہ تعمیر کیا جانا تھا۔ حکومت کی اتھارٹی کا وقار
نواقم کیا جانا تھا۔ اس تمام کاوش کے لئے سب سے اہم بات تھی اسر نو تعمیر کردہ کشمیری کے لئے ایک محتمل
تفہیم فراہم کرنا۔ مجھے احساس تھا کہ اس فریضہ میں کارفرما جذبے کو سرگرم کرنے کے بغیر انتظامیہ قابل قدر نتائج
فراہم نہیں کر سکتا چنانچہ ایک تفہیمی جذبہ کیا جانا لازمی ہے ایک اعلیٰ معیار کی نشاندہی لازمی ہے ایک تحریک بخش
لیڈر شپ فراہم کرنا ہوگی ایک ایسی لیڈر شپ جو نہ صرف انتظامی ڈھانچے کی تعمیر نو کر سکے بلکہ اس میں نئی جان بھی ڈال سکے۔

مثالی ڈھانچہ

کافی بحث و مباحثہ کے بعد میں گورنری راج کے ۱۹۸۶ء کے پہلے مرحلے کی تقلید شروع کی۔ وہ کوئی
مثالی ڈھانچہ تھا۔ اس وقت کیا کہا گیا تھا میری تفہیم کیا تھی؟ جو کچھ میں نے کیا اس کا خواہی رد عمل کیا تھا؟ اور جو
حالات مجھے اس وقت درپیش تھے وہ ان سے متعلقہ کیونکر تھا؟
میرے خیال میں ان سوالات کا جواب دینے کا اور تمام تر پس منظر کو واضح کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ
میں اس وقت اپنی دائری میں تحریر شدہ کیفیاتوں سے چند اقتباسات پیش کروں۔ ان کیفیات میں اس وقت کی ہوا
موجود ہے اور پوری رویداد بیان کرتی ہیں۔

۶ مارچ ۱۹۸۶ء

آج میں نے جی ایم شاہ وزارت کو برطرف کر دیا ہے۔ اس کا عہد حکومت کشمیر کی بد نصیب تاریخ کا ایک

جذبات بھر کے ہوئے ہیں اقلتیں خوف و ہراس کا شکار ہیں۔ حکومتی مشینری بے ہتھ اور بے۔ افسروں کے تھوڑے
پست ہیں۔ ریاستی سیکریٹریٹ میں بے راہ روی اور بے نظم کی جڑیں گہری ہیں۔ بنیاد پرست اور فتنہ انداز
اپنے حربے استعمال کر رہے ہیں۔ رشوت بدعنوانیاں اور سازشیں جاری ہیں۔ اقتصادیات پہلے ہی بد حالی
کی شکار رہے اور یہ مزید زوال پذیر ہو رہی ہے۔ عدلیہ بے راہ روی کا شکار ہے۔ علاقائی تناؤ بڑھ رہا ہے
شام دیر گئے جوں کے راج بھون میں اپنے معمول کے مطابق ایک دستہ چلتے ہوئے مینٹھن کی ایک کیمپ
ذمہ داری میں درپیش بنیادی مسائل ہیں بلکہ اقتدار کے منصب العین بھی ہیں آخر اقتدار کی مقصد کے لئے درکار
ہوتا ہے ریاست میں بہت سی طرح کی انتظامیہ جملانے یا اپنے مقصد کو حصول حقیقت میں تبدیل کرنے کے نیک
فریضے کیلئے اقتدار کو ہونا چاہیے مگر یہ اس کے لئے ضروری ہے۔ اقتدار کے عنوان اور اس کی بھی بنیاد لگنا ہے
اس سے بہتر اور اونچے ستون بلند رکھے جاسکتے ہیں اور انسانوں کو شریف النفس بنایا جاسکتا ہے۔ نیک
ہونے اور نیکی کے لئے دائرہ وسیع تر ہونے لگتا ہے ایک طرح سے جدید ہندوستان کا المیہ یہ ہے کہ اقتدار زیادہ تر
ان لوگوں کے ہاتھ میں رہا ہے جو شاذ و نادر ہی نیک نیتی سے تحریک حاصل کرتے ہیں۔ اور جن لوگوں
کے سامنے مقصد اور منصب العین ہوتا ہے انہیں موقع ہی نہیں ملتا۔ یا یوں کہئے کہ یہ نظام اس میں مانع ہے۔
مجھے ہر چیز میں بھول کا بار محسوس ہو رہا ہے مگر مجھے اس امر میں خوشی کا احساس ہے کہ میں اقتدار کے نیک تر
جوشاذ و نادر قابل تر اور زیادہ چمکدار پہلو کا نگاہ کر سکتا ہوں اب یہ دکھا سکتا ہوں کہ ایک غریب اور ترقی پذیر ملک میں
حکومت کو کیسے کام کرنا چاہیے اور وہ شخص جسے اعلیٰ مقصد کی تحریک حاصل ہے ایک مثالی ایڈمنسٹریٹر کے طور پر کام
کر سکتا ہے۔ اس نے اپنے افراد کے غلبے کو کس طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ بنیاد پرستوں اور قدامت پسندوں کے استعمال
کو کس طرح روکا جاسکتا ہے۔ نو جوانوں کو بنیاد پرستی سے کیسے دور رکھا جاسکتا ہے۔ کس طرح ایک نئے مذہب
کے طور پر انصاف قائم کیا جاسکتا ہے۔ کم ترقی اور اقتصاد کی بددیت کے مفاد پرست دائرے کو کس طرح ختم کیا
جاسکتا ہے۔ میں یہ بھی دکھا سکتا ہوں کہ انتظامیہ صرف قلم کاغذ اور لال فینڈہ شاہی کا نام نہیں بلکہ اس سے بہت
زیادہ سب سے نظر یہ ہے تخلیق ہے پابندی ہے ہمدردی ہے اسہال ہے انسان دوستی ہے اور یہ ایک اسلوب ہے۔
اس میں قبولیت کا اختصار ہے رفتار اور قیادت ہے یہ سخت محنت بھرا ہے خون پسینہ بھی ہے ایک خیال ہے اور
سماجی اقتصاد اور فنی تبدیلی کا ایک آلہ ہے کیا میں خود سے زیادہ طلب نہیں کر رہا ہوں کہ کس طرح —
یک دستہ افراد خواہ اس میں کتنی ہی تحریک و تہنیم ہو اس منظر کو تبدیل کر سکتا ہے جس پر مزدوروں راجوں کا خدشہ ہو۔ کیا ایک
فساد ایک نیا نظریہ لا سکتا ہے؟ تاریخ ان اشخاص سے واقف ہے جنہوں نے لگ بھگ ایک دستہ ہی اس
کی روش بدل دی۔ مگر کیا ایسی شخصیتوں کے پاس زیادہ خدا داد تحریک زیادہ قوت نہیں تھی۔ جس کی محنت
سے انہوں نے وہ حربے حاصل کئے۔ انہیں وسیع تر میدان عمل حاصل ہوا یہ بعض ایک ایڈمنسٹریٹر کا کام کہ جو نہ ہو سکتا
ہے کہ وہ بنیادی تبدیلیاں لائے اور بالیس کو نیا رنگ و روپ دے؟ مزید برآں اس تھماہ کی مدت کے دوران

زیادہ سے زیادہ کیا حاصل کیا جاسکتا ہے۔ کس طرح بہت سارے کوئلوں اور مقامات پر جمع گندگی کو صاف کیا
جائے۔ اس کی سڑی گندگی کو ہاتھ لگانا بھی خطرہ ہوا لینا ہے بہر کیف مجھے کوشش کرنا ہوگی کہ نیکو کش میں ملینا
کا راز مضمر ہے اور کسی طرح اس سے کچھ نہ کچھ اچھے نتائج حاصل ہوں گے لاہور وای اور بے اعتنائی کے شکار لوگوں
کے دکھ درد میں شرکت کی جائے تاکہ اس سے ایسے افراد بن سکیں جو ہمدرد اور انسان دوست ہوں۔
میں نے آج — ایک چھوٹی سی شروعات کی اور ایک بیان جاری کیا جس میں کہا گیا ہے — میرا زور
امن اور پیداواریت ہر ایک کے لئے یکساں انصاف رشوت کا صفایا اور غریبوں بچاؤں اور چارٹرڈ کی خدمت
ہوگا۔ میں انتظامیہ کی اصلاح کرنے کے لئے انتظامی مشینری کی تنظیم نو کرنے پر خاص توجہ وقف کروں گا۔ اور
حکومت کو صاف خرک اور نتائج دکھانے والی انسان دوست اور عوام کی ضروریات امنگوں
اور احساسات کا آئینہ دار بنائوں گا۔ شہروں، چھیلوں، ندیوں، ساحلی مراکز، باغوں اور پارکوں کی صفائی کی جائے گی
اور ریاست میں ماحولیات کے تحفظ اور اس کے فروغ سے حاصل ہونے والے فوائد کی نمائندگی کی جائے گی۔

۲۸ اپریل ۱۹۸۶ء

میرے عملی منصوبے کا نمایاں پہلو وہ عوامی خدمات ہیں جو مختلف مقامات پر از حد حاجت مند عوام کو
فراہم کی جا رہی ہیں جہاں بنیادی سطح کے عوام اثر پذیر ہوتے ہیں۔ وہ لوگ جو بازاروں سڑکوں، گلی کوچوں گندی پستوں
جھونپڑوں، دیہات اور موصفات میں رہتے ہیں وہ اس کے فوائد محسوس کر رہے ہیں جن کو پہلے کے لئے گدلا پانی
حاصل ہوتا تھا اور صفائی اور شہری سہولیات بنیادی طور پر بھی دستیاب نہیں تھیں۔

۳۰ اپریل ۱۹۸۶ء

انتظامیہ میں نئی تفہیم کی وجہ سے عوام کا تخیل بن چکا ہے اور وہ کہتے سنتے جاتے ہیں کہ پہلے کسی نے بھی ان
کی پروا نہیں کی تھی کوئی بھی بازاروں گلی کوچوں میں نہیں گھومنا تھا اور ان کے روزمرہ کے بھون کی صحت و تندرستی
کی دیکھ بھال کی پروا نہیں کی تھی یہ قابل دید تبدیلی ہر جگہ محسوس کی جاسکتی ہے گاؤں، قصبوں یہاں تک کہ طلباء میں بھی
اس کا اثر پڑا ہے جو اکثر حکومت کے تنہا جارحانہ رویہ رکھتے تھے۔ اس امر کی ایک مثال سرنگرمیڈیکل کالج کے طلباء
سے ملتی ہے جو میری ایبل پرسیلاب سے متاثرہ کنیوں کو راجستھان پہنچانے کے لئے نہ صرف دیہات میں گئے بلکہ انہیں گورنر
کے جمہوری فنڈ کے لئے عطیات کے طور پر ایک اچھی خاصی رقم بھی جمع کی۔

۱۵ مئی ۱۹۸۶ء

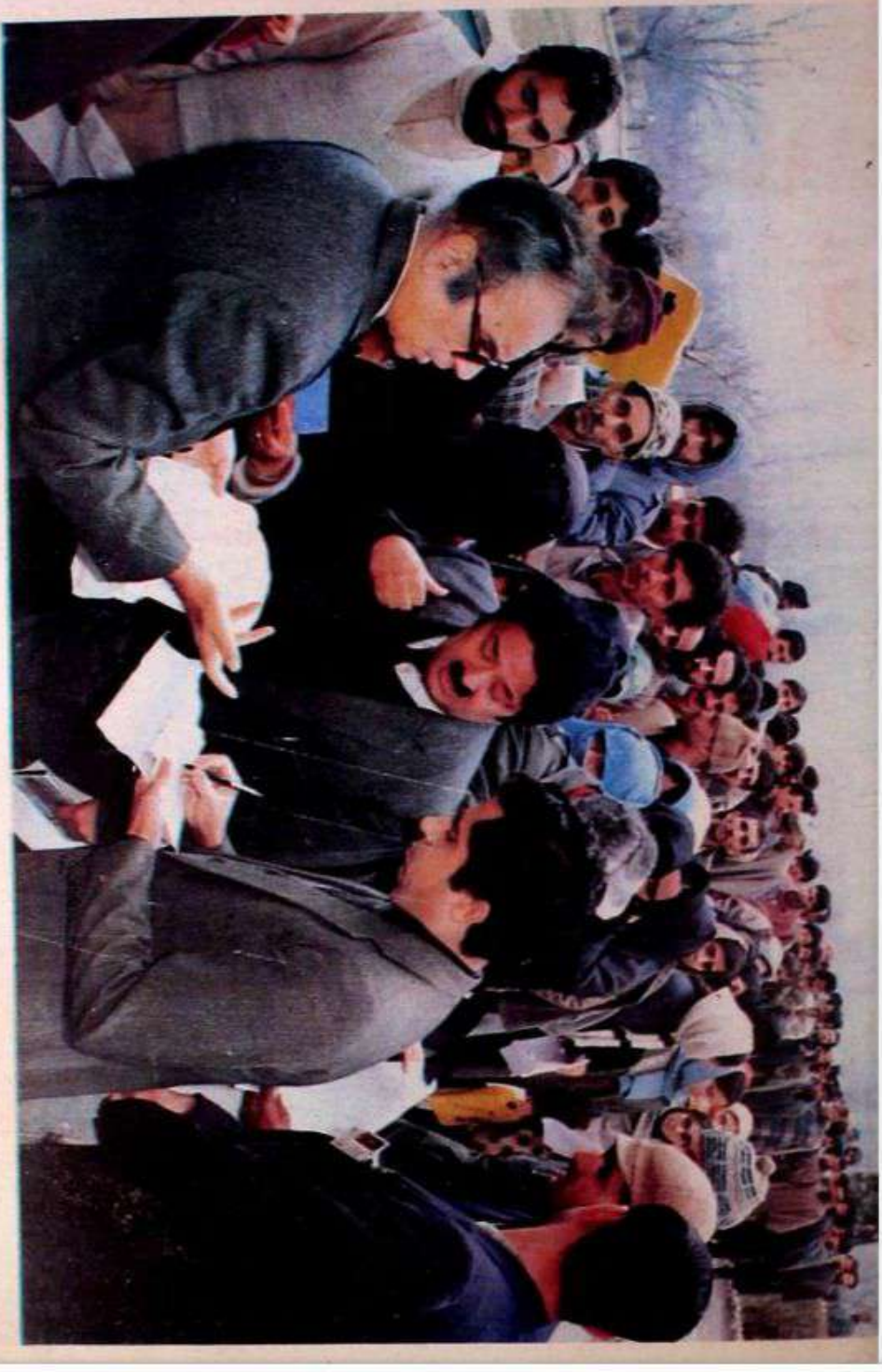
ایک طرح سے انقلابی نوعیت کی تبدیلی کو محسوس کیا جا رہا ہے پہلے ان کیلئے مرکزی اخباری سائنڈ کے سامنے



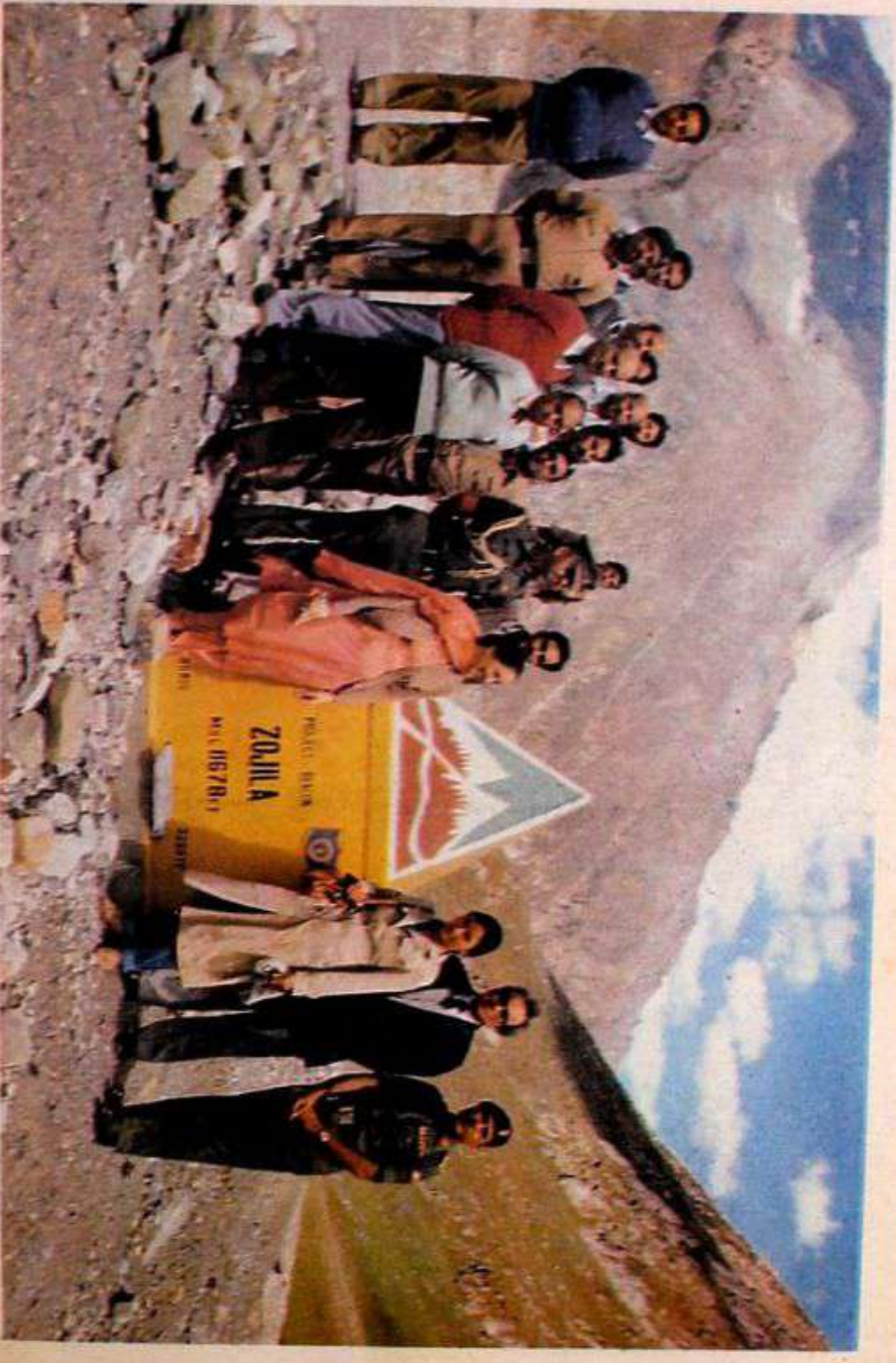
بائیں سے : مصنفہ فاروق عبداللہ، لاجپور گاندھی اور سوسنیا گاندھی (جہوں میں)



صدر جمہوریہ گمانی ذیل سنگھ، مصنفہ ابرار کے خاندان کے دیگر ممبران کے ساتھ، بالکل دائیں صدر جمہوریہ کے
بڑے بھائی سید تقی احمد سر رابطہ خاندان سوسنی ٹکڑ میں صدر جمہوریہ کے اہل خانہ کی تقریب کے وقت کی گئی۔



مصطفیٰ لاج بھون میں عوام سے ملاقات کرتے ہوئے درفوری - ۱۹۹۰ء



مصطفیٰ اپنے اراکین کے ساتھ نوجویا پاس پر (جولائی ۱۹۸۵ء)

ایک سرخ کپڑے کے ٹکڑے کی مانند تھی مگر اب مرکزی نمائندے کی حکومت کی ہر جگہ تائش کی جا رہی ہے۔ گورنر کی قدر و منزلت کی جاتی ہے۔ پیار کیا جاتا ہے اور اُسے تعاون دیا جاتا ہے۔

۳۰ مئی ۱۹۸۶ء

ہفتہ وار عوامی سمائشیں اور تحریک اب بنیادی سطح پر محسوس کی جا رہی ہے اور اب ایک ماقول پیدا ہونے لگا ہے جہاں عام آدمی میں یہ احساس پیدا ہونے لگا ہے کہ اس کی آواز کو سنا جاتا ہے اور منصوبہ بند ترقی کے فوائد میں اُسے مساوی طور پر حصہ مل سکتا ہے۔

گورنری راج نفاذ کے بعد موجودہ اقدامات اور تبدیلیوں کا ایک واضح اثر دکھائی دینے لگا ہے۔ اگر یہ رد عمل موجودہ دور کی طرح موافق ہی رہا تو کشمیر کی سیاست اور کشمیر کے انتظام میں ایک واضح تبدیلی رونما ہوگی اور جن انفرسٹنگ مسائل کا ہمیں سامنا ہے وہ مزید دیر تک ہمارا منہ نہیں دیکھے گی۔ ایک صحیح راستہ تلاش کیا جا رہا ہے اور ایک دیانتدار صحاف قابل تحریک اور عوام کی خدمت سے سرشار انتظامیہ قائم ہونے کا بہر حال اس معاملے میں از حد اطمینان بخوشی اور نظریے کے علاوہ سخت محنت کی ضرورت ہے تاکہ قطب نما کی سوئی کو جھیک سمت میں رکھا جاسکے۔

۳۰ جون ۱۹۸۶ء

تیز اور قابل دید ترقی کے موجودہ پس منظر میں گزشتہ برسوں کے ان ایڈروں کی کارکردگی مشہور و مشکوک ہو کر عیاں ہونے لگی ہے جو سب سے چارے کشمیریوں اور خاص طور پر کشمیری مسلمانوں کے علمبردار ہونے کا نقاب پہنے تھے۔ عوام کا ایک اچھا خاصہ طبقہ ایسے سوال کرنے لگا ہے: اس قسم کی ترقی پہلے کیوں نہیں ہوئی، سرکوں کی مرمت کیوں نہیں کی گئی، گلی کوچوں اور بازاروں میں گندگی اور کوڑا کرکٹ کیوں جمع رہا، جھیلوں کی صفائی کیوں نہیں کی گئی، سکول خستہ حال، تاریک اور دیمک زدہ عمارتوں میں کیوں چلتے رہے۔ سکولوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم عامہ کامیاب اس قدر پست کیوں رہا۔ جموں اور سرنگر شہروں کا ایک اچھا خاصہ حصہ آب و ساری کے بغیر کیوں کر رہا۔ دیہی عوام کا ایک اچھا خاصہ طبقہ اب بھی مسلا پانی کیوں پی رہا ہے۔ ڈاکٹری پیشے پر خض چند گھرانوں کی اجار داری کیوں ہے اور وہ کوئی ٹیکس بھی ادا نہیں کرتے۔ ہائی کورٹ ٹیکسوں کی عدم ادائیگی میں آسائش دیتی ہے جب ہندوستان کے دوسرے شہری ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ عدلیہ اور انتظامیہ نے جنگلات کی رٹھلی کے کروڑ روپے کا نقصان کیا ہے۔ بارہ سو سیاست دان عناصر اور اعلیٰ فوکر شاہی کو عام آدمی کی قیمت پر ایک دوسرے کے مفادات کے تابع ہیں۔ بھرتی کا عمل قابلیت کی بنا پر نہ ہو کر سیاست دانوں اور انتظامیہ کے اٹنے گئے افراد کی مرضی پر منحصر ہے مفادات خصوصی رکھنے والوں پر اٹھنے کا یہ عمل جاری رہنا چاہیے۔ اس سے مرکز و نواز قوتوں کو

تقویت ملے گی۔ کشمیریوں کی غلامی کا جو ہوا کھڑا کیا جا رہا ہے۔ وہ ختم ہو کر رہ جائے گا۔ جھوٹے پروپیگنڈہ کے بلے تلے دبی ہوئی حقیقت نمایاں ہونے لگے گی۔

۳۱ جولائی ۱۹۸۶ء

خود مرض عناصر نے ریاست کا خون چوس لیا ہے انہوں نے تمام ذرائع کو ہڑپ لیا ہے اور ٹیکس اور دیگر واجبات بھی ادا نہیں کئے ہیں۔ وہ نام نہاد اندرونی خود مختاری کے موقف کا فائدہ حاصل کرتے ہیں تحفہ ٹیکس زیادہ سے زیادہ شہری زمین رکھنے پر حد بھیسے قوانین کی ریاست میں عمل آوری نہیں ہونے دی گئی۔ ہائی کورٹ قوانین انے گئے افراد کے حامی ہیں۔ وہ بھی اندرونی خود مختاری نواز قوتوں کی حمایت کرتی ہے اور ایسے ٹیکس اقدامات کو نفی کر دیتی ہے جو ذرائع پیدا کرنے کے لئے بنائے جاتے ہیں اور جن سے اقتصادی توازن قائم رہتا ہے۔

چند کنڈوں کے مفاد پرست عناصر نے سماجی اقتصادی اور سیاسی ڈھانچے پر کنٹرول حاصل کر لیا ہے۔ انہیں مفادات خصوصی رکھنے والے افراد کی ریاست پر کنٹرول کیا ہوا ہے انتظامیہ بددیانت کالت کے پیشے اور کاروبار اور صنعت و طبع پر انہیں لوگوں نے غلبہ حاصل کیا ہوا ہے حکمران طبقے کے اٹنے گئے افراد پر مختل مفاد پرست عناصر ریاست کو کلیدی دھارے میں لانے میں رکاوٹ ہیں اور یونین کے انتظامی آئینی اور قانونی رشتے استوار کرنے میں مانع ہیں۔ خوش قسمتی سے رواں تبدیلیوں کے زیر اثر مفاد پرستوں پر عدلیہ ڈھیل پڑتا جا رہا ہے۔ اور ان کا اثر زوال پذیر ہے۔ حالیہ ٹیکس چھاپے اور ان لوگوں کی شور و غوغا کرنے کی مجبوری اور عوامی جنوں پیدا کرنے میں ناکامی اس طرز عمل کی ایک مثال ہے ۱۹۸۹ء میں جو عناصر شور و شراب اور ہنگامہ کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے ان کے ہاتھوں سے اقتدار اور چوڑوڑ کے لیو رکھ سک رہے ہیں۔

اگر اصلاح اور تنظیم نو کا موجودہ عمل جاری رہا اور اگر نیا ادارتی ڈھانچہ اپنی صورت اختیار کر لیتا ہے تو ہماری ریاست بدعت کی مانند مفادات خصوصی رکھنے والے افراد کے شکنجے سے آزاد ہو جائے گی جنہوں نے ایک طرف ریاست کو مرکز سے الگ رکھا۔ اور دوسری طرف مزہبوں اور نانا ناندہ لوگوں کا استحصال کیا۔ اپنے مفادات کیلئے انہوں نے فر دہانہ مناقشات کو ہادی اور ہندوستانی غلبے کا ہوا کھڑا کیا۔

۳۱ اگست ۱۹۸۶ء

ریاست میں امن وامان کی جو نفاذ اس وقت موجود ہے وہ گزشتہ تین ماہ کے دوران راج کی گئی تبدیلیوں کے مثبت اثرات واضح طور پر عیاں کرتا ہے۔ گزشتہ چند برسوں کے دوران پہلی مرتبہ ادوی کشمیر کے مختلف شہروں اور قصبوں میں جنم شمش کی جلوس ترک و احتشام کے ساتھ نکالے گئے۔ ترقیاتی سرگرمیوں کی رفتار میں بھی تیزی آئی ہے اور ریاست

کی ہموار اقتصادی ترقی کے لئے ماحول پیدا کیا گیا ہے۔

جب تک کشمیر تہنہا تہنہا ہے اور مرکزی قوانین کی ریاست میں توسیع نہیں کی جاتی تہنہا پانی کی تنگ نظری اور علیحدگی پسندی کی قوتیں مضبوط رہیں گی۔ اور اندرونی خود مختاری و ازمنہ صحر کے غرض مصلحت کو کبھی توڑا نہیں جاسکے گا۔ اگر موجودہ نظام یہاں نہیں ہوتا تو ہندوستانی آئین کی دفعہ ۳۴۹ کے نفاذ پر اس قدر شور نہیں مچایا جاتا۔ موجودہ حالات کا ریاست پر مرکزی قوانین کی توسیع کر کے فائدہ اٹھایا جانا چاہیے۔ موجودہ ڈھانچہ عوام کا مزاج ہیں مکمل تریک جیسی کہ موقوفہ فراہم کرتے ہیں۔ وقت کا تقاضا ہے کہ بناوٹی طاقتوں کے علیحدگی پسند عناصر اور حکمران افراد کے روانی دائرے کو توڑا جائے اور اس وقت عام آدمی کو یہ احساس دلایا جاسکتا ہے کہ مرکزی حکومت اور ملک کے عوام ان کی بہبود کے متلاشی ہیں۔

میری ڈائری میں مندرجہ کیفیتیں ۱۹۸۶ء کے مثالی دور کے بارے میں عوام کی نفسیات کو عیاں کرتی ہیں۔ یہ بات مختلف افراد کے تبصروں سے عیاں ہے۔

میں نے محسوس کیا کہ تبدیل شدہ حالات اور دہشت گردی کے اس ماحول میں ۱۹۸۶ء کا ترقیاتی عمل جلد شروع نہیں کیا جاسکتا مگر اس مقصد کے لئے کارفرما جذبہ ہیں رہنمائی فراہم کر سکتا ہے۔

فاروق ولدی کو ترک کر گیا

فاروق حکومت نے عملی طور پر وادی کو ترک کر دیا تھا اور اُسے سرینگر گنڈر اور ڈپٹی انسپکٹر جنرل آف پولیس کے حوالے کر دیا تھا کہ وہ اپنے حال پر زندہ رہیں۔ موجودہ حالات کے پیش نظر سب سے بڑی کام لینے کے لئے مجبور تھے اور کم از کم مزاحمت کرنے کی لائن اختیار کئے ہوئے تھے۔ ان کے اور ان کے ماتحت عملے کے بھی اپنے ذاتی مسائل تھے ان میں بہت سارے افراد اور ان کے رشتے دار اندرون شہر میں رہتے تھے۔ وہ دہشت گردوں کی معمولی کی ناراضی بھی مول نہیں لے سکتے تھے۔ ان کی ذات اور رشتہ داروں کے لئے دہشت پریشانی کا سبب تھی۔

وادی میں ایک اعلیٰ سطح کی مضبوط لیڈر شپ درکار تھی جو کافی حد تک میل اور جرأت کا مظاہرہ کر سکے مگر یہاں حسیانہ قیادت بھی موجود نہیں تھی کسی حسی کو دہشت گردی کی مزاحمت کی ملامت تو خدا تعالیٰ کا سائن کو بیٹنگ سے پکڑا جاسکتا تھا۔ چنانچہ میں نے سرینگر میں ہی قیام کرنے اور وہاں پر مستقل سرمائی سیکرٹریٹ قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

عوام سے ملاقاتیں

اگست ۱۹۸۶ء سے عوام سے ملاقاتوں کے سلسلے کو بحال کرنے اور راج بھون کے دروازے

کھولنے کا فیصلہ کر لیا تھا میں نے یہ بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ کوئی مسئلہ اور مشکلات کا موقعہ میری تدارک کیا جائے یہ طرز عمل بار آور ثابت ہوتا معلوم ہو رہا تھا۔ ۳۱ جنوری ۱۹۹۰ء کو ۳۰ افراد مجھے ملاقاتی ہوئے۔ اس سے اگلے روز (۲۸ فروری) ۶۰۰ افراد مجھے ملنے کے لئے آئے ان میں سے چند افراد بار ہولہ اور کپڑاڑہ کے دور افتادہ علاقوں سے بھی آئے۔ قریب تمام دن عوام کی مشکلات سننے میں ہی گذر جاتا۔ بہت سارے مسائل واقعی حقیقی تھے۔ سابقہ حکومت کی طرف سے لاپرواہی تمام تر نظام کا ایک حصہ بن کر رہ چکی تھی۔ مثال کے طور پر اسلامیت زنا نہ کاری سو پورے ایک وفد نے مجھے بتایا کہ اس کالج کے ساتھ ملازمین کو گزشتہ ۱۰ ماہ سے ان کی تنخواہیں ادا نہیں کی گئی ہیں۔ اسی طرح بار شیکھلہ اور مارکیٹنگ کارپوریشن کے جوئے کے کوٹین ماہ سے ان کے واجبات حاصل نہیں ہوئے تھے متعلقہ حکام کے ساتھ ٹیلیفون پر بات چیت کر کے بعد میں میں نے ان شکایات کا سیدھے طور پر زالہ کر دیا۔ حکومت میں اعلیٰ ترین عہدے کی طرف سے فوری کارروائی کی وجہ سے مایوسی جزوی طور پر کم ہو گئی اور ماحول میں قدرے راحت محسوس ہوئی۔

بھاری تعداد میں شکایات کا تعلق ماتحت ملازمتوں کے لئے غیر منصفانہ بھرتی کے ساتھ بھدان میں سے بیشتر شکایات اساتذہ کی بھرتی سے متعلق تھیں۔ اس معاملے میں شکایات کا ازالہ کرنے کے مقصد سے میں نے قانونی طور پر سبار ڈیپٹ سروس سلیکشن بورڈ کے ذریعے بھرتی کا کام سرانجام دینے کی بابت ایک عام اعلان کیا یہ بورڈ میں نے آئین جوں و کشیر کی دفعہ ۹۲ قانون سازی کے اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے قائم کیا۔ انجینئرنگ کاموں کے بارے میں تو شکایات زیادہ واضح تھیں۔ سیاسی حکومت کی طرف سے مختلف کاموں کا اعلان بناماریاتی منظوری کیا گیا تھا۔ ٹھیکیدار سپنڈرہ کو ڈروپے کی ادائیگی کا مطالبہ کر رہے تھے حالانکہ موقعہ پر شاہیدی کوئی کام ہوا تھا۔ ۵۰۰۰ افراد جو شاذ و نادر ہی کام پر آئے انہیں تقریر شدہ دکھا یا گیا تھا۔ افراتفری کے ان حالات کو ختم کرنے کے لئے میں نے ان ضابطوں اور اعمال کو ختم کر دیا جن سے خزانہ عامہ کی لوٹ میں آسائش ہو رہی تھی۔ شکایات کو دور کرنے اور گندگی کی صفائی کے لئے میں نے فیصلہ کیا کہ مناسب عرصے کے دوران رشوت، کنہ پروری اور خزانہ عامہ کو بے راہ روی سے خرچ کرنے کے معاملے میں تمام تر شکایات کی جانچ کے لئے اعلیٰ اختیار اور آزاد کوٹھی کا قیام عمل میں لایا جائے۔ میں نے کفایت شناری کے اقدامات کو فوری مانا اور شروعات پٹی ذات سے کی۔ میں نے کوئی تنخواہ حاصل نہیں کی اور لے ڈی سی کی ایک آسانی ختم کر دی۔

عوامی ملاقات کے دوران متعدد لوگوں ملازمت کے طلبہ گارنٹے ان میں سے تھو مندر افراد کو میں نے بارڈر سیکورٹی فورس میں آسامیوں کے لئے درخواست دینے کی صلاح دی۔ اس سے قبل ۲۴ جنوری کو میں نے ٹیری لوجوانوں پر مشتمل ایس ایف کی پانچ شاہین کھڑا کرنے کے حکومتی فیصلے کا اعلان کیا تھا ان میں ۵۰۰۰ آسامیوں کا انسدادی اور ۲۰۰ افراد متعلقہ کالج کے لئے مامور ہونگے اس فورس کی بھرتی اور تربیت سری نگر میں ہی ہوگی ایسا اس لئے کیا گیا کہ کشمیری لوجوان وادی سے باہر جانے سے کتراتے ہیں۔ چند دیگر اقدامات کا اعلان بھی کیا گیا۔ قانونی بلڈینٹ

بھرتی بورڈ کے ذریعے تین ہزار ساتھ کی بھرتی کا کام بھی سرانجام ہوتا تھا جمیل ڈل کی مٹاسانی طور پر صفائی کا کام شروع کیا تھا اس کا دوبہرہ مقصد یہ تھا کہ ایک طرف جمیل کی صفائی ہو سکے اور دوسری طرف کشتی ہالوں کو روزگار بھی حاصل ہو۔

عوام کے ساتھ براہ راست رابطہ قائم کرنے اور ان کے جمع شدہ مسائل کو حل کرنے کے علاوہ دیگر جوانوں سے یہ اپیل کرتا رہا کہ تشدد کا راستہ ترک کریں اور غربت اور ناوا فرستی کے مسائل کا حل کرنے میں میرا ہاتھ بٹائیں میں نے بار بار انہیں یاد دلایا کہ دنیا میں کہیں بھی دہشت گردی نے قابل قدر نتائج نہیں دیئے ہیں پینا پنچہ ہماری منزل وحشی پن میں نہیں انسان دوستی کے بکھرے ہوئے شیرازے میں نہیں بلکہ گونا گونیت میں یکجہتی میں مضبوطی

جوابی حملہ

ان تمام اقدامات کا صحت بخش اثر ہوا۔ عام تناؤ میں قدر کی واقعہ ہوئی۔ ٹرانسپورٹ میں غل اور دیگر دشواریوں کے باوجود تجربے ملاقات کے لئے لوگ راج بھون تک آتے رہے بہر حال مجھے اس بات کا احساس تھا کہ یہ جنوری ۱۹۹۰ء ہے مارچ ۱۹۸۶ء میں اول الذکر کی دہشت گردی سے متاثرہ تاول میں نہیں بھونکی جاسکتی اقتدار کے ڈھانچے میں تخریب کا ریکہ گہرے طور پر رس چکی تھی عمل آوری کے آلات موجود نہیں تھے مختلف سطحوں پر اندرونی اور بیرونی طور پر طاقتور عناصر میرے ہر اس فعل کو جو میں کرنا چاہتا تھا ناکام بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہمارے ملک کے خلاف عناصر کے نقطہ نظر سے یہ محسوس کیا جا رہا تھا کہ وہ میری حکمت عملی کو شکست دینے کے لئے حتی المقدور سب کچھ کرنا چاہتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ کشمیر کو ہندوستان سے منسوب کرنے کے لئے انہیں ایسا موقع دوبارہ نہیں ملے گا۔ انتظامی مشینری کمزور ترین تھی۔ ہندوستانی لیڈر شپ میں اختلاف رائے تھا۔ اور قدر کنٹرول بھی تھا۔ وہ اپنے ہی جہال میں چپس کر رہے تھے جہاں اقتدار کے لئے ادنیٰ سیاست کی دلال تھی اور مسئلے کی بنیادی وجوہات کو سمجھنے کے لئے اس کے پاس وقت نہیں تھا۔

پاکستان اپنی ہم کو تیر بکرنے کے لئے تیار رہتا تھا۔ اُسے تو قریباً ۲۶ جنوری ۱۹۹۰ء کو ڈرامائی واقعات ظہور پذیر ہونے لگے لیکن اس روز اس بات کی اجازت نہیں دی گئی ہماری طرف سے اندادی اقدامات پر ہم ڈٹے رہے۔ مایوسی کے عالم میں پاکستان نے ۵ سے ۱۲ فروری کو منسلک جانے والے سالمیت پھٹنے کے دوران زیادہ تر درگاہے کا قیصل کیا۔

اس سالمیت پھٹنے کے دوران قومی اتفاق رائے پیدا کرنے اور کشمیر کے عوام کی پاکستان کی مکمل حمایت کے اظہار کے مقصد سے قرارداد پاس کرنے کے لئے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کا ایک مشترکہ اجلاس منعقد ہوا۔ حقیقی قبضہ لائن کو چار مقامات - سبجیت گڑھ، جڈالیاں نور پور، پٹنہ اور بھوپال پر عبور کرنے کی کوشش کی گئی اس مقصد کے لئے بھوپال میں ڈاکٹر سیکھوٹ اور سخت گڑھ سے لائے گئے تھے۔ اشتعال انگیز تقریریں کی گئیں۔

سرحد عبور کرنے کا دھماوا کیا گیا ان میں سے قریباً ایک تہا افراد واقعی سرحد عبور کر گئے تھے مگر ہندوستانی مسلح افواج کی طرف سے سخت کارروائی کی وجہ سے وہ پسپا ہو گئے۔ ان اقدامات کا بنیادی مقصد تناؤ میں اضافہ کر کے یہاں وہاں جھڑپیں کرنا اور بین الاقوامی توجہ مرکوز کرنے کے لئے اسلامی برادری کی بنا پر جذبات کو بھڑکانا تھا۔ اس سے قبل ۲۱ جنوری کو پاکستانی وزیر خارجہ صاحبزادہ یعقوب خان نے کشمیری دہشت گردوں کو پاکستانی حمایت حق بجانب قرار دی۔ اور انہیں درحقیقت مجاہدین آزادی کے نام سے پکارا۔ وہ غرایا۔ میں بھولوں کا گلہ ستر لئے ہندوستان کی امنگ کانٹوں کی پٹاری لئے ہوئے واپس آیا۔ قومی پارلیمنٹ میں اپنی تقریر کے دوران مزید بے نظیر جھٹو نے تمام تر زہر اور آتش فشاں کی۔

جہول و کشمیر لبریشن فرنٹ کے چیئر مین امال اللہ خان نے جلی پریلہ جھٹو کے کام شروع کر دیا اس کا جنگی جذبہ مزید عیاں ہو گیا جب اس نے آزاد کشمیر سے سرحد عبور کرنے کے لئے ۱۰۰۰۰ کانڈر روانہ کرنے کی دھمکی دی۔ ۲۶ جنوری کو اپنے "منصوبے" پر عمل کرنے میں ناکام رہنے پر وہ قدرے مدغم ہو چکے تھے۔ اور پہل مائل کرنے میں انتظامی اقدام سے انہیں تشویش ہوئی تھی مگر تمام دہشت گرد گروپوں نے ۱۱ فروری کو یوم مقبول بٹ پر طوفان کھڑا کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس روز مقبول بٹ کو تہاڑ سنٹرل جیل میں پھانسی دی گئی تھی۔ جے اینڈ کے لبریشن فرنٹ نے یہاں تک اعلان کر دیا کہ اس روز میسول پولیس افسروں خاص طور پر سی آئی ڈی اور انٹیلیجنس بورڈ سے وابستہ افراد کو اغوا کر کے انہیں پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا عوام کے نام بار بار اس امر کے فرمان جاری کیے گئے کہ وہ گورنر سے زہلیں۔ دہشت گردی کی رفتار میں شدت پیدا کرنے کے لئے دہشت گردوں نے نرم نشانوں کی تلاش شروع کر دی۔

ایک سفاکانہ قتل

۲ فروری کو ایک کشمیری پنڈت لڑکھوان سیتھ کو کو بیہ کسل میں اس کے گھر کے قریب ہلاک کر دیا گیا۔ وہ ایک سماجی کارکن تھا جس نے اپنے طبقے کے افراد کی شکایات کا ازالہ کرانے کے لئے عوام کی امداد کی تھی وہ اس علاقے کے ہندو اور مسلمان لڑکھوانوں میں یکساں طور پر مقبول تھا۔ صبح سویرے دو مسلم جوان جن سے وہ وقت تھا آکر اس کے دروازے پر دستک دی۔ اس کی بہن نے اس دستک کا جواب دیا وال میں کچھ کالا مٹوس کر کے اس کی بہن نے انہیں بتایا کہ سیتھ گھر پر نہیں ہے وہ چلے گئے مگر قریب کے کوپوں میں ہی منڈو لے رہے۔ انکو اپنے گھر سے باہر آیا تو اس کی بہن نے ان دونوں جوانوں کا تذکرہ کیا جو اس کے ساتھ ملاقات کے لئے آئے تھے۔ وہ قدرے خفا ہو گیا اس نے اپنی بہن کو ڈانٹ دی کہ ضرورت سے زیادہ شک و شبہ نہ کرے اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ کہ کسی نے اُسے ہلاک کر دیئے کا منصوبہ تیار کیا ہے۔ وہ اپنے گھر سے باہر نکلا اور گرد و نواح کے گلی کوچوں میں اس نے حمانہ لکھ بھر میں ہی پستول کا ایک خوفناک فائر سنائی دیا۔ کنبہ کے افراد باہر دوڑے مگر تب تک سیتھ ملے

بے حس و حرکت خون میں لت پت پڑا تھا۔
کشمیری پنڈت طبقے کا توصلہ تو پہلے ہی ٹوٹ چکا تھا اور ستیش ملک کی ہلاکت نے اسے مزید ایک جھٹکا دیا۔ اور ان کے گھر اور سیکالال پٹیل اور بی این بھٹل — کی ہلاکتوں کے بعد ترک مکان کا جو عمل جاری تھا اس کا نیز تر ہونا ناگزیر تھا۔

اس طبقے میں کچھ اعتماد پیدا کرنے اور سوگوار کنبے کے ساتھ ماتم پر سی کرنے کے مقصد سے میں نے اگلے روز ملک کے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ ۳۰ فروری کی شام کو میں سرینگر کے اندرون میں واقع ایک قدیم گنبدان آباد علاقے جبکہ دل میں گیا سمیت ملک کرنیو میں ڈھیل کی مدت ختم ہو چکی تھی ہماری گاڑیوں کی طویل قطار کے سوائے بازاروں میں کچھ بھی دکھائی نہیں دیا بعد دوپہر کے وقت بارش سے معلوم ہوتا تھا کہ گوام مایوسی کے عالم میں ڈوب چکے ہیں جو چند کھڑکیاں کھلی تھیں اندر مدھم سی روشنی بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ آسمان پر گہرے سیاہ بادلوں نے قنوطیت کی اور صوری تصویر مکمل کر دی تھی۔ ہمارے ساتھ کے ایک افسر نے کہا: "اس طرح تنگ گلیوں میں ہمارا گھومنا ایک نادانی کی بات ہے۔ اچھی طرح سے منصوبہ بند ایک گرنیدر حملہ ہم بھی کو ختم کر سکتا ہے۔" میں نے اثبات میں سر ہلادیا۔ میرا ذہن مگر کہیں اور تھا سڑک پر پھیلے ہوئے کچھ اور میل آسمان پر دھمکاتے ہوئے بادل تنگ و تاریک خاموش گھر اور ان سب پر غالب سناٹا ہر طرف پھیلا ہوا۔

ملک کا گھر ایک کھرا ہوا گھونسلہ تھا۔ ہر شے کبھری ہوئی تھی۔ میں دوسرے افراد کنبہ کے ساتھ زمین پر بیٹھ گیا ایک پرا نا چراغ جلا دیا گیا تھا۔ میں اپنے گرد و پاس کی تاریکی کو گھورتا رہا۔ ستیش کے والد نے ٹک ٹک کر بلی آواز میں تمام ایسے کو بیان کیا اس پاس کا خوبیاں ماقول اس داستان کو اور بھی واضح طور پر بیان کر رہا تھا۔
جونہی میں رخصت ہونے والا تھا اس کنبے کے دوست اور رشتے دار جمع ہو گئے۔ انہوں نے بیک آؤنڈاپیکو انہیں وادی کے باہر بسا یا جائے۔ ستیش کے چچا کی آواز قدر بلند اور رعب دار تھی۔ اس نے صدی کی کر میں چھت کی دوسری منزل پر جا کر ان کی خاندانی دیوی کے درشن کروں۔ میں مان گیا۔

جلدی وہ خاموش اور شاندار مورق دکھائی دی۔ وہ خاموشی میں بھی نہایت پروقار دکھائی دیتی تھی۔ ستیش نے کچھ سنے جذبات میں تھر تھرائی ہوئی آواز میں کہا: "اس دیوی کی کرپا سے ہم صدیوں سے یہاں رہتے آئے ہیں۔ یہ گھر یہ گلی یہ کوئی جہاں ہم اپنی پیدائش سے لے کر رہتے آئے ہیں۔ ہم جاسکتے ہیں مگر ہماری دیوی نہیں۔ چنانچہ آپ ہیں سب ملکیت لازمی طور پر فراہم کیے۔ میں خاموش رہا۔ میں نے سوچا کہ یہ موقع ان مطالبات پر بحث کرنے کا نہیں پر ہم انکھول کے ساتھ انہوں نے میرا اور میرے ہمراہ آئے انزان کا شکریہ ادا کیا۔ ہیں اس کنبے کی حالت نے کافی متاثر کیا۔

یہ تنگ اور ایک دوسرے کے ساتھ ملحقہ گھر ایک خوش اسلوب شیرازے کی طرح تھے۔ میں حیران تھا کہ جن کے دیوں دیوتا ہیں ہر میں اس دھرتی میں جن کی جڑیں گہری ہیں۔ وہ کس طرح اس سر زمین کو چھوڑ کر غیر مائوس علاقہ میں آکر آباد ہو سکتے ہو؟

اور صوبہ میں برداشت کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا خاموشی کے ساتھ وہ کھلی نہیں برداشت کریں یا چلائیں۔
شام دیر گئے ہم راج بھون میں اپنے معمول کے مطابق روزانہ میٹنگیں کیا کرتے تھے جن میں صورت حال کا جائزہ لے کر اس کا مقابلہ کرنے کے لئے مزید اقدامات کی بابت فیصلہ کرتے۔ ان میٹنگوں میں ایک مندر پر بحث ہوئی۔ وہ اس قسم کے دورے کرنے کی بابت تھی۔ عام اتفاق رائے یہ تھا کہ ان سے استراذ کیا جائے ان سے ہمیں دستیاب سیکورٹی فورسز پر بہت زیادہ دباؤ پڑتا تھا اور دوسرے انسانوں کے تحفظ سے ان کی توجہ فصل ہو جاتی تھی۔

قابل گزیر المیہ

اس کے چار روز بعد، ۲ فروری کو ایک اور المناک واقعہ ہوا۔ لال چوک میں ایک بیکہ گنبد میں ایک ہم رکھا گیا تھا۔ دفتر بند ہونے کے بعد یہ ہم پھٹ گیا۔ جس کے بعد ایک خوفناک آگ بھڑک اٹھی جو لواحق دوکانوں میں پھیل گئی ایک ملحقہ دوکان میں سلائیڈر جمع تھے یہ بھاری آوازوں کے ساتھ پھٹنا شروع ہوئے غلطی سے قریب کی ایک بی ایس ایف چوکی پر مامور افسرانے سمجھا کہ دہشت گردوں نے دوکان کو آگ لگا کر فائرنگ شروع کر دی ہے۔ جواؤں نے اس دوکان کی سمت میں فائرنگ شروع کر دی جہاں سلائیڈروں کے دھماکے ہو رہے تھے۔ اس واردات میں دو معمول تو جوان جو پندر پوری اور شیر احمد ہلاک ہو گئے۔ بیسیوں دوکانیں خاکستر ہو گئیں۔

یہ ایک افسوس ناک واقعہ تھا۔ میں نے ڈسٹرکٹ جسر میٹ سری نگر کے تحت مجسٹریٹ تحقیقات کا حکم دیا مگر اس فیصلے سے میرے اندر کا طوفان نہیں ختم سکا۔ میں اس رات اس قدر مایوس تھا کہ تمام رات اس واقعہ کی بابت غور خیال رہا کیا یہ خدائی فعل تھا یا محض ایک حادثہ؟ ایک گھبراہٹ میں مرکب فعل یا پر تشدد ماقول کی تحستی پیداوار تھا یا ہمارے غم فوجی دھوکے کی تربیت اور نگہداشت کا افسوس ناک پہلو تھا۔ کیا دہشت گرد اس قسم کے حالات پیدا کرنے کے لئے بنیادی طور پر زہد دار تھے جہاں اس قسم کے المیات ناگزیر ہو کر رہ جائیں۔ اگلی صبح میں نے جذبات کا بوجھ اتارنے کے لئے شبیر احمد کے والد ڈاکٹر خدیوسف خان کے نام ایک خط تحریر کیا۔

راج بھون

سرینگر

۸ فروری ۱۹۹۰

بیمارے ڈاکٹر خان —

لال چوک کے نزدیک گذشتہ رات حادثے میں آپ کے بیٹے کی المناک موت کے بارے میں جان کر مجھے بھاری صدمہ پہنچا ہے۔ یہ آپ کا نقصان آپ کے اہل و عیال اور دوستوں کا نقصان ہے اور درحقیقت یہ صدمہ بے پناہ اور بے کراں ہے۔ ہم بھی آپ کے غم میں شریک ہیں۔

میری بات کا یقین کیجئے میں تمام گذشتہ رات سو نہیں سکا۔ اس واقعے کی انسانی ہیئت سے ہم بھی حساس لوگوں کی رو میں بل جاتی جا رہی ہیں۔ یہ ایک فرد کا خون نہیں بلکہ بیٹے والا یہ خون ہمارے تمام بھائی بہنوں کا خون ہے۔

ہمارے بیٹے اونیٹیوں کا خون ہے۔ وہ خون ہے جو کشمیر کے نام پر دامغ ہے۔ یہ واقعہ اس خوبصورت وادی کے اندرونی اور بیرونی منظر پر ایک بدنما نشان چھوڑ جائے گا۔

آئیے ہم خداوند کریم سے دعا کریں کہ وہ ہمیں امن اور عقلمندی کا راستہ دکھائے۔ آئیے ہم ایسے حالات پیدا کریں جہاں سرکوں پر پولیس اہلکاروں کی بجائے سیاح اور ہشاش بشاش لوگ نظر آئیں۔ آئیے ہم اپنے چھوٹے بھائیوں کو محسوس کر لیں کہ جندو کی لہر میں کوئی فائدہ نہیں ہے اور اس بات کو ذہن نشین کریں کہ اس سے کس قدر دھوکہ تکلیف رنج و الم پھیلتا ہے آئیں ہم انہیں یقین دلائیں کہ اگر وہ کشمیر کا راستہ ترک کر دیں تو ان کے ساتھ محبت، ہمدردی اور انسان دوستی کا سلوک کیا جائے گا۔ ہمیں انہیں یہ بھی یاد دلانا ہوگا تاکہ آئین بھی کے ساتھ انصاف کی ضمانت دیتا ہے اور ہمیں اس بات کو یقینی بنانا ہوگا کہ صحیح معنوں میں انصاف مل سکے۔

اب کسی بھی کی موت نہ ہو، کسی بھی شخص کو ہمارے عزیز و اقارب کا داغ جلدائی محسوس نہ ہو۔ میں صدقہ لائے انسوس کا اظہار کرتا ہوں اور داغ اجل دے گئی روح کے چھین کے لئے دعا گو ہوں آپ کا صادق
(خط) چٹک موہن

موت کا نشانہ

۱۱ فروری کو صبح آٹھ بجے بی ایس ایف صدر مقام کے نزدیک دہشت گردوں نے دو ہتھیار بلی اسراف کاسٹیبلوں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ یہ دونوں اہلکار ریوٹس سے فارغ تھے۔ اور نزدیکی دوکان سے ذاتی ضروریات کی خرید کرنے گئے ہوئے تھے۔ قاتلوں کو اپنے کتاب کی شناخت معلوم تھی انہوں نے اپنے وقت کا انتخاب نہایت احتیاط کے ساتھ کیا۔ دوکاندار عید المجید شیخ کو بھی گولی کے زخم لگے اور وہ بھی بعد ازاں ہسپتال میں دم توڑ گیا۔

جس منصوبہ بندی، نشانے، اعتماد اور خاموشی کے ساتھ یہ قتل کئے گئے تھے ان سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ کام باقاعدہ پاکستانی سپاہیوں کی ایس آئی / ایف آئی کو کا ہے جنہوں نے کشمیر لوں کا نقاب پہن رکھا ہے۔ اس جیس میں افغان مجاہدین کی موجودگی سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ وادی میں متعدد دہشت گرد تنظیموں نے افغان مجاہدین سے تحریک حاصل کی تھی ان میں خاص طور پر وہ لوگ شامل تھے جو اسلامی بنیاد پرستی کے علمبردار تھے۔ انہوں نے اپنی تنظیموں کے نام افغان باغی گروپوں کی طرز پر حزب اللہ، حزب اسلام ڈالے۔ افغان باغی گروپوں کی آتش فشاں تقریروں کے ویڈیو کیسٹ تقسیم کئے گئے تھے ایک مقامی دہشت گرد گروپ "پیشروں بالاکوٹ" کے سربراہ اعظم انقلابی نے ایک بیان جاری کیا جس میں اس نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ افغان باغیوں اور کشمیری عسکریوں کے درمیان رابطہ اور تعاون پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے اس سلسلے میں وہ افغانستان اور پاکستان میں افغان کیمبل کا دورہ بھی کر چکا ہے۔

یوم مقبول بٹ

ہمیں انکی فکر اور فوری ۱۹۹۰ کو یوم مقبول بٹ کی تھی۔

مقبول بٹ ضلع کپواڑہ کے گاؤں تربہم میں ۱۹۳۹ء میں پیدا ہوا۔ ۱۹۵۸ء میں وہ پشاور پاکستان میں ترک مکانی کر کے چلا گیا جہاں اس نے ایم اے (اردو) اور ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ وہ مختصر عرصہ تک صحافی بھی رہا۔ ۱۹۶۵ء میں وہ جوں و کشمیر محاذ کے شمارے کا سیکرٹری میں سیکریٹری بن گیا۔ ۱۹۶۶ء میں وہ در اندازی کر کے وادی کشمیر میں آ گیا۔ اپنے دہشت گردی کے ایک فعل کے طور پر اس نے ریاستی سی آئی ڈی کے ایک اہلکار امر چند کو ہلاک کر دیا۔ اس عزم کی یاد میں اسے سزائے موت سنائی گئی مگر ۱۹۶۸ء میں وہ سرینگر سے فرار ہو کر پاکستان پہنچ گیا۔ ہندوستانی انیشیاتی جنس کا ایجنٹ ہونے کے شک میں کچھ عرصہ تک اسے پاکستانی حکام نے نظر بند رکھا۔ ۱۹۷۱ء میں پاکستانی حکام نے اسے دوبارہ گرفتار کر لیا کیونکہ اسے ہندوستانی ایجنٹ تصور کیا جاتا تھا۔ حال اسے ایک پاکستانی ٹریننگ بٹ کے احکامات پر رہا کر دیا گیا۔

فروری ۱۹۷۵ء کے کارڈ کے بعد مقبول بٹ دوبارہ در اندازی کر کے کشمیر آ گیا۔ اس نے لنکیسٹ ایک جنگ میں ڈاکو ڈالا اور اس کے منہ پر ہلاک کر دیا۔ ڈسٹرکٹ اوریشن بیج سرینگر لین کے بخو کی عدالت میں اس پر مقدمہ چلایا گیا جہاں اسے سزائے موت کا حکم سنایا گیا۔ اسے تہاڑ جیل دہلی میں منتقل کر دیا گیا کیونکہ اسے رکھنا بہت خطرناک تصور کیا گیا۔ شاید حکومت ہند اس کو پھانسی نہیں دینا چاہتی تھی اور کشمیری سیاست دانوں کے ایک بار سوخ طبقے کی طرف سے ہم شروع کی گئی تھی کہ اس کی سزائے موت کو کم کر کے عرصہ میں تبدیل کر دیا جائے۔ قسریاً اسی وقت مدوینہ رہا تھے کا لندن میں قتل کر دیا گیا اور یہی بات مقبول بٹ کی سرعت سے پھانسی کا موجب بنی۔ کیا مقبول بٹ ایک ہم باز تھا یا جاسوس، دہشت گرد تھا یا کشمیری حریت کا حقیقی عقیدت مند؟ اس کا صحیح جواب دینا مشکل ہے بشرطیکہ کی مانند اس کی زندگی تضادات سے بھری ہوئی تھی۔ ظاہری طور پر وہ سازشوں سے مبرا تھا۔ ایک ہی وقت میں ہندوستانی اور پاکستانی دونوں حکام اس کو دغلہ ایجنٹ تصور کرتے تھے۔ ایسی بھی شہادت موجود ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مقبول بٹ کشمیر میں دھڑے بندی کا شکار ہوا ان اللہ خاں اور اس کے دوستوں نے چال چل کر برطانوی ہائی کمیشن کے ساتھ منسلک ہندوستانی سفارت کار مدہاترے کو قتل کر کے ہلاک کر دیا۔ اس کا دہرا مقصد تھا کشمیر پر ریش فرسٹ کے لئے پہلشی اور اس کے ساتھ ہی اس تنظیم میں موجود حریف یعنی مقبول بٹ سے نہایت حاصل کرنا۔

مقبول بٹ کو پھانسی دیے جانے کے بعد کشمیر پر ریش فرسٹ ملوث تنظیمیں اور پاکستان نواز جماعتیں ۱۱ دردی کو یوم مقبول بٹ کے طور پر مناتی ہیں اس سے حکومت کو پریشان کرنے کے لئے جمع ہونے اور پہلشی حاصل کرنے کا موقع حاصل ہوتا ہے۔

۱۱ فروری ۱۹۹۰ء کو شدید قسم کی تخریب کا راتہ سرگرمیاں ہونے کا خدشہ تھا۔ اس امر کے اعلانات مختلف تخریب کار تنظیموں کی طرف سے کئے گئے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اس روز کم از کم ایک سو پولیس اہلکاروں کو پھانسی پر لٹکنے کی دھمکی دی تھی۔ اس مقصد کے لئے بہت سارے دیواری اشتہارات چسپاں کئے گئے تھے اور دستی اشتہارات تقسیم کئے گئے تھے مسجدوں سے بھی بار بار ایلیس کی گئی تھیں حاجی کے تجربے سے ظاہر تھا کہ مقبول بٹ کی نام نہاد شہادت کو عوامی جذبات بھڑکانے کے لئے آئے کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔

یوم مقبول بٹ نے گزشتہ تین برسوں کے دوران اس آئے کو اور بھی تیز کر دیا تھا اور یہ بات ریاستی حکومت کی طرف سے غیر نمائی کی وجہ سے ہوئی تھی۔

۱۹۸۷ء، ۱۹۸۸ء اور ۱۹۸۹ء کو اور فروری کو بلاروک ٹوک وسیع پیمانے پر گڑ بڑ ہوئی اور ریاستی حکومت نے منہ پھیر لیا۔ یہاں تک کہ ۱۱ فروری ۱۹۸۹ء کو ڈاکٹر فاروق عبداللہ ریاست سے غیر حاضر رہے۔

اس مرتبہ ریاستی حکومت میں ہم لوگوں نے دہشت گردوں کو کوئی ڈرامائی واردات کرنے سے روکنے کا مصمم ارادہ کیا تھا تمام وادی میں سخت نگرانی کی گئی تھی اور کرنیو سٹی سے نافذ کیا گیا تھا۔ ریاستی اور مرکزی حکومت کے افسروں کو ہدایات جاری کی گئی تھیں کہ چند یوم تک وہ فورسٹ ریسپنڈنٹ میں ہی مقیم رہیں۔ اور نقل و حمل سے احتراز کریں اس کے پس پردہ کارفرما جذبہ تھا کہ دہشت گردوں کو نرم نشانے دھرنے کا کوئی موقع نہ ملے۔ ایسے اور دیگر اقدامات کی بدولت دہشت گردوں کے اعلانات، اغوا اور قتل کے تمام تر منصوبے اور دہشت گردی کی رفتار کو تیز تر کرنے کی کوششیں اور اقتدار کے اجزا پر غلبہ بنائے رکھنے کے منصوبے دھرنے کے دھڑلے رہ گئے۔

۲۶ جنوری کی کامیابی کا اعادہ

۲۶ جنوری کی کامیابی کا اعادہ کیا گیا۔ ان دونوں مقولوں پر حکومتی اختیار کی تقدیس کا غیر مبہم الفاظ میں مظاہرہ کیا گیا اور انتظامی میدان میں پاؤں جمائے اس بارے میں مدد حاصل ہوئی۔ یہ ایک نفسیاتی فتح و کامرانی بھی تھی۔

اس حقیقت کا ذرا کچھ ابلاغ نے فوجی اہل مشال کے طور پر اگلے روز کھلے گزشتہ دو برسوں کے دوران وادی میں اس روز تشدد کے واقعات ہوئے تھے اور اس برس بھی تشدد کے واقعات دہرائے جانے کی وسیع تر شبہہ بازی تھی مگر سخت حفاظتی اقدامات نے اس کی پیش بندی کر دی۔ جاکر آف انڈیانے اطلاع دی۔ آخر عسکریوں نے یوم سیاہ کی کال دی تھی مگر سری نگر میں کسی مکان یا سہ کار کی عمارت پر کوئی سیاہ پرچم نظر نہیں آیا۔ اور دوپہر کو عسکریوں کی طرف سے بجاری تعداد میں نکلنے کا منصوبہ بھی ناکام بنادیا گیا۔

دوسرا کانہ قتلوں کا ارتکاب

بہر حال قتل کی دو وارداتوں کے سبب سرکاری اختیار کی دوبارہ بحالی اور اعتماد پیدا کرنے کے اقدامات کی افادیت میں کمی واقع ہوئی۔ ان میں سے ایک اگلے روز اور دوسرا اس سے اگلے روز ہوا۔ ۱۲ فروری کو انٹیلی جنس بیورو کا ایک اہلکار ایم ایل جھانگل کی گال اور ۱۳ فروری کو سری نگر دور درشن کے سیشن ڈائریکٹر لکھل کو کو ہلاک کر دیا گیا۔

عام ہدایات کے مطابق بھان دفتر کے احاطے میں ہی موجود رہا مگر قبضہ سستی یوم مقبول بٹ کے دوران کوئی واردات نہ ہونے کے سبب وہ قدرے لاپرواہ ہو گیا اور اس نے فیصلہ کیا کہ وہ سرنگر کے پابن شہر میں اپنے والدین کے پاس جائے گا۔ ۱۲ فروری کو جب وہ اپنے دفتر تک واپس آیا تھا تو کوئی شخص اس کے قریب آیا۔ دو تین منٹ تک اس کے ساتھ چلتا رہا اور اپنے پیرن کے اندر سے پستول نکال کر اس کے بطن میں اور پر کی طرف گولیاں داغ دیں جو اس کی گردن اور منہ سے ہوتی ہوئی اس سے نکل گئیں۔ بھان نے بلٹ پروف جیکٹ پہن رکھی تھی اور قاتل شاید اس بات سے آشنا تھا کہ وہی وجہ تھی کہ اس نے اُسے سینے میں گولی مارنے سے احتراز کیا اور اس کے شانہ بشانہ پلٹنے کی حکمت عملی اپنائی تاکہ گردن سے اوپر کی طرف گولی مار کر اس کی فوری طور پر موت واقع ہو سکے۔ اس واقعے نے ایک مرتبہ پھر اس امر کو واضح کر دیا کہ حکومت کے مختلف محکموں کے اندر دراندازی کسی حد تک اور کس قدر گہری ہو چکی ہے۔

۱۳ فروری کو شام دیر گئے ہیمنہ کالونی میں اپنے گھر کے نزدیک کول پر گولی داغی گئی تھا ہرے کے قاتل اس کا انتظار کر رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ بجے۔ شام اپنے دفتر سے چلا ہے۔ کول کے دفتر میں سے کوئی شخص بذات خود یا ایسے درمیاندار کے ذریعے قاتلوں کے ساتھ رابطہ قائم کئے تھا کول دہشت گردوں کے غصے کا نشانہ اس لئے بنا تھا کہ اس نے ٹیلی ویژن پر وہ پروگرام دکھائے تھے جنہیں غیر اسلامی اور ہندوستان کی طرف سے تمدنی حملہ قرار دیا گیا تھا۔ اس نے دفتر پر اپنا حکم چلانے کی کوشش کی تھی اس کے ماتحت عملے کے چند افراد یا تو خوف اور یا سازش کے تحت دہشت گردوں کے اشارے پر چل رہے تھے اور اس گڑ بڑ کو انسداد اور اسے درست کرنے میں کول کی کوشش نے دہشت گردوں کو مزید فائدہ دلایا چنانچہ وہ اپنے معضل منصوبے کے تحت عمل پیرا ہوئے۔ اور انہوں نے قلعہ بندی کی آواز کو خاموش کر دیا اور اس طرح جو افسر قتل کے ساتھ اپنے فرائض نبھا رہے تھے انہیں مرعوب اور دہشت زدہ کر دیا گیا۔

دہشت گردوں کی طرف سے ایک شریف النفس انسان اور کلیدی اہلکار کے قتل نے ہم جم کو مضطرب کیا۔ ہمارے ڈھانچے پر یقینی طور پر اس کا حوصلہ شکن اثر ہوا جہاں ایک جانب دہشت گردوں نے یہ دعویٰ کیا کہ انہوں نے ایک دشمن کو ختم کر دیا ہے وہاں دوسری طرف دور درشن میں ان کے شریک ساز شیول نے

ہماری اینڈسٹریشن پر کول پر دباؤ ڈالنے کا الزام لگایا جس سے بالواسطہ طور پر اس کی موت ہوئی۔

بلا کسی خامی کے تحفظ

بلا کسی خامی کے تحفظ فراہم کرنا شاید ناممکن ہے خاص طور پر موجودہ وقت میں یہ امر پوری طرح صادر آتا ہے جب مہلک پتیار آسانی کے ساتھ دستیاب ہیں وادی میں روایتی لباس پہننے نے پتیار چھپانے کے کام کو اور بھی آسان بنا دیا ہے اس کے نیچے آسانی سے پستول اور کلشٹکوف جیسے ہتھیار اور یہاں تک کہ گریڈ بھی چھپائے جاسکتے ہیں۔

میرے نوٹس میں ایک اور بات آئی کہ صورت حال کی سنگینی عام لوگوں اور خاص طور پر انہوں پر پوری طرح سے طاری ہو چکی ہے۔ اس بات کو محسوس نہیں کیا گیا کہ مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے قریب تمام دفاتر میں دروازوں کی جڑیں گہری ہو چکی ہیں اور نہ ہی اس بات کو محسوس کیا گیا کہ اس معاملے میں ہدایات پر نہایت سنجیدگی سے عمل کیا جائے اگر ان ہدایات پر عمل کیا گیا ہوتا تو تجارتی ہوائی بیڑے کے انفرمافیلوں سمیت درجن کا انتظار کرتے جوان کے گھروں سے آکر انہیں لے جاتی، بارڈر سیکورٹی فورس کے اہلکار رے وقت جا کر خرید نہ کرتے۔ یہاں ایک دہائی کے والدین سے ملاقات کے لئے گھر پرانے علاقے کے بچوں کو لے کر لایا جاتا ہے اور کول۔ اپنے دفتر یا ڈورسٹریشن میں قیام پذیر ہوتا۔

دہشت گردی ایک سنگدلانہ طرز عمل ہے۔ ایک دہشت گرد زمین پر عیار ترین شخص ہو تب۔ وہ مرد یا عورت پر اس مقام پر حملہ کرتا ہے جہاں اس حملے کی کم از کم توقع ہوتی ہے اور اس کا مقصد وقت بھی کم از کم متوقع وقت ہو تب تک حفاظتی انتظامات میں کمزوری رابطے اور سست روی کا پورا پورا فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ مندرجہ بالا میں حاملہ میں عین یہی ہوا اور بعد ازاں شیرالحق ایچ ایل کیمسٹر اور دیگر معاملات میں بھی یہی ہونے والا تھا۔

تباہ کن کردار

ایک طرف ہم اندرونی تخریب کاری اور بیرونی سازش کے گونا گوں مسائل میں درمیش مشکلات کے ساتھ نمٹنے کے لئے برسرِ پیکار تھے تو دوسری طرف ڈاکٹر فاروق عبداللہ اور اس کی جماعت کے لوگ نہایت تباہ کن بلکہ تخریب انگیز لٹریچر کا کردار ادا کر رہے تھے اور بار بار میری پیشیہ میں چھڑا گھونپ رہے تھے جس قدر زیادہ کامیابی مجھے حاصل ہو رہی تھی اسی قدر ان کی لادشیں بھی تیز تر ہو رہی تھیں۔ شاید وہ اہل مدینہ جندونا ہران کی پیٹھ ٹونک رہے تھے۔ وہ کسی بھی طور مجھے کامیاب نہیں ہونے دینا چاہتے تھے کیونکہ میری کامیابی سے ماضی میں ان کی لاپرواہی اور

بے اعتنائی کا پردہ فاش ہو سکتا تھا جو کشمیر کے معاملے میں قوم کو دھوکا دینے کے مترادف تھی۔

نیشنل کانفرنس اور اس کے لیڈروں کو کوئی نہیں پوچھتا تھا۔ وہ کوئی مثبت کام سرانجام دینے کے قابل نہیں تھے مگر وہ نقصان ضرور کر سکتے تھے وہ بے اصول ذرائع سے عوام میں افواہیں پھیلا سکتے تھے یہاں تک کہ وہ تخریب کاریوں کے رفقاء ہونے کا دم بھی بھر سکتے تھے۔ وہ ان کے کانوں میں سرگوشی سے کہہ سکتے تھے ہمراہ کریم غلط فہمی میں نہ رہیے۔ آپ جو کام باہر سے سرانجام دے رہے ہیں ہم اندر سے کر رہے تھے۔ وہ دہشت گردوں کے کارکنے ملبر دار بھی بن سکتے تھے۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر فاروق کی وزارت میں سابق وزیر مملکت علی محمد ساگر نے یوم مقبول بٹ پر ہی ایک بیان جاری کیا جس میں جبر و استبداد سے گریز کرنے کے لئے نیم فوجی دستوں کو ہٹائے جانے کا مطالبہ کیا گیا تھا اور وہ اس بات کو آسانی سے بھول گیا تھا کہ نیشنل کانفرنس (ایف) کی حکومت ہی تھی جس نے ان دستوں کو بلا یا تھا۔ ۲۰ فروری کو نیشنل کانفرنس کے دس اراکین قانون سازی نے ایک بیان جاری کیا جس میں انہوں نے کہا۔ ہم شیر سے نیم فوجی دستوں کو ہٹانے کا مطالبہ کرتے ہیں کیونکہ انہوں نے جبر و استبداد کا ایسا دور دورہ لایا ہے جو جنوبی افریقہ میں بھی نہیں سنا گیا۔ ان میں سے ایک رکن اسمبلی عبدالرشید ڈار نے متذکرہ بالا بیان کو تقویت دینے کے لئے اپنی جماعت نیشنل کانفرنس سے تعلق رکھنے والے خود جہاد آزادی میں شامل ہو جائے اس نے اعلان کیا کہ وہ اپنی خدمات جے اینڈ کے لبریشن فرنٹ کے تابع دے رہا ہے۔

ان بیانات سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ نیشنل کانفرنس کے ہندوستان کے ساتھ تعلقات بعض ایک بہانے کی طرح بین ایک موقف جو محض اقتدار اور حکومت حاصل کرنے کے لئے اختیار کیا جاتا ہے جیسے ہی اقتدار گیا تو وفاداری بھی گئی۔ ان سیکورٹی فورسز کو واپس بلانے کی بات کی جارہی ہے جنہیں ان کی اپنی ہی حکومت نے بلا یا تھا۔ انہوں نے الزام لگایا کہ سیکورٹی فورسز نے ایسا جبر و استبداد شروع کیا ہے جس کا موازنہ جنوبی افریقہ سے کیا جاسکتا ہے مگر دہشت گردوں اور ان کے جرم کے خلاف زبان تک نہیں کھولی گئی بلکہ عبدالرشید ڈار ایڈووکیٹ جیسے چند لوگ نام نہاد جہاد آزادی میں شامل ہونے کی وکالت کرتے ہیں۔

میرے پاؤں تلے کی زمین کھسکانے کے معاملے میں شروع سے ہی کوشش جاری تھی۔ ۲۰ جنوری ۱۹۹۰ کو ہی نیشنل کانفرنس نے ایک تابع مقصد بیان جاری کیا۔ ۲۹ جنوری کو مرکزی لیڈروں کے ساتھ ملاقات کے فوراً بعد واپسی پر پریگڑ میں ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے ایک ذہر آلود بیان جاری کیا۔ ان بیانات کے بارے میں پہلے ہی باب اول میں بحث کر چکا ہوں۔ یہاں پر میں صرف اسی پر بحث کروں گا جو تخریبی بیان اس نے ۱۵ فروری کو جاری کیا۔ اس بیان میں میری ان لادشوں کو ناکام بنانے کی سعی لا حاصل کی گئی تھی جو میں دہشت گردوں پر قابو

پاسنے کے لئے کر رہا تھا اور ملک کو تباہی کے دبانے سے واپس لانے کی حمایت کر رہا تھا۔ یہاں ایک محب الوطن "کشمیر کو عزیز وطن" قرار دے رہا ہے، جس کے مطلب معنی یہ ہیں کہ کشمیر ایک الگ شناخت ہے۔ یہاں ایک قومی لیڈر کشمیر میں "ہندوستانی فوج اور غیر قومی دستوں کی طرف سے قتل عام کی بین الاقوامی تحقیقات کا مطالبہ کر رہا ہے۔ یہاں ایک ذمہ دار شخص گذشتہ پچیس روز سے متواتر کرفیو کی بات کر رہا ہے چنانچہ اس امر سے وہ بے خبر ہے کہ کتنے مسو غیر مسلم اور معصوم کشمیریوں کا قتل عام ہوا اور کتنے مکان مسمار کر دیے گئے، حالانکہ وہ اس بات سے بخوبی واقف تھا کہ بہت سارے ایسے دن بھی رہے جب دن کے وقت کرفیو نہیں تھا۔ وہ جزوی طور پر یا مکمل طور پر اٹھایا گیا تھا۔ حکام نے ہلاک شدگان کی فہرست شائع کی تھی جو ۱۶ فروری تک کی ۴۰ تھی۔ اور عوام سے کہا تھا کہ اگر اس میں کوئی اضافہ ہو تو حکام کو مطلع کریں تاکہ ہم اپنی فہرست میں درستی کر سکیں۔ یہاں ایک ایسا سابق وزیر اعلیٰ بھی تھا جو اس امر کو بتانے کی زحمت گوارہ نہیں کرتا کہ معصوم اور غیر مسلح عوام کس طرح آئی۔ اے ایف افسروں، بی ایس ایف جوانوں، ٹیلی وژن اور فلمیوا حصالات کے سینئر افسروں اور گلی کوچوں میں فوجیوں کو گولی مار کر ہلاک کر رہے ہیں وہ طویل اور آتش فشاں بیانات کے ذریعے عوام کو کس طرح اگسا رہا ہے مگر اسے سفاکانہ ہلاکتوں کی مذمت کے لئے ایک لفظ نہیں مل پاتا۔

ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے متذکرہ بالا بیان کے لئے آخر کو فحشا اشتعال تحقیق طور پر دیا گیا تھا یہ اشتعال یہ تھا کہ یوم مقبول ہٹ (۱۱ فروری) کو کوئی واردات نہیں ہوئی اور گورنر کے انتظامیہ کو بالادستی حاصل ہو رہی تھی۔ یہ اس کی ذاتی دہلی میں اس کے آقاؤں اور اس کے سازشی رفقاء کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ چنانچہ وہ کشمیریوں کے جذبات کو بھر کا تار ہا اور وادی میں مدمم ہوتے ہوئے دشمنوں میں تل ڈالتا رہا۔ میری پیشہ میں پھر اگھو پینا کوئی خاص بات نہیں تھی مگر اس معاملے میں اہم بات یہ تھی کہ ڈاکٹر فاروق عبداللہ اور اس کے آقا ہماری اس قومی کاوش کی پیٹھ میں پھر اگھو پ رہے تھے جو دہشت گرد کے خلاف ایک کامیاب جنگ کے طور پر جاری تھی اس معاملے کو گرم رکھ کر انہوں نے کشمیریوں کے کرب میں اضافہ کیا تھا جس سے بہت ساری اموات اور بھاری تباہی واقع ہوئی تھی۔ ریاستی اور قومی خزانہ عامہ کا نقصان بھی ہوا تھا۔ جتنی زیادہ میں نے قوت ارادی اور مزاحمت کا مظاہرہ کیا ان کے برہمنوں کی پٹھن اور کاٹ اتنی ہی تیز ہوتی جا رہی تھی۔ خود پرستی اور بے سلیقگی کی سیاست ظالم ترین اور وحشیانہ طور پر تحقیق پسندیوں کی شکار ہو چکی تھی تمام حقائق اور اپنے سابقہ بیانات اور اعلانات کے برعکس اور اس ناقابل تردید شہادت کے خلاف جس کا ذکر میں نے اس باب کے اس سے قبل حصے میں کیا ہے۔ وہ دروغ بیانی اور من گھڑت باتیں کرتے رہے۔ جہاں میری کامیابیوں کے آثار نہ ڈاکٹر فاروق عبداللہ اور اس کے آقاؤں کو ہلا کر رکھ دیا کیونکہ انہیں اپنی کمر توڑوں کے فاش ہونے کا خدشہ تھا اس سے اتنی ہی تشویش مسز نے نظیر بھٹو سمیت آئی۔ ایس آئی اور دوسری پاکستانی ایجنسیوں کو ہونے لگی انہیں محسوس ہو گیا کہ میں نہ صرف انتظامی مشینری کو دست کر سکتا ہوں۔

بلکہ اے اندرونی تخریب سے پاک کر سکتا ہوں اور نوکرتا ہی کے ایک اچھے خاصے حصے کی وفاداری اور تقاضا میں حاصل کر سکتا ہوں اور رنجوت ستانی کے خلاف ہم شروع کر کے عوام کی شکایات کو دور کر سکتا ہوں۔ اس کے علاوہ ۱۹۸۰ء کا دور اور درخت برتری کو داپس لاسکتا ہوں۔ چنانچہ انہوں نے میرے خلاف ایک خاص مہم شروع کی۔ اس سے مسز نے نظیر بھٹو کی میری ذات کے خلاف آن پر جنوں باتوں کا پس منظر واضح ہو جاتا ہے جو اس نے پاکستان ٹیلی ویژن اور عوامی تقریروں کے دوران کہیں۔ ورنہ ملک کے وزیر اعظم یا وزیر داخلہ یا دوسرے اہلکاروں کو چھوڑ کر ایک گورنر کو متاثر کرنا نہ بنانے کا کیا جواز تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ میں کشمیری پالیسی کے گہرے رموز اور انتظامیہ سے مکمل طور پر واقف ہوں اور میرا انداز عمل شرآوار ثابت ہو گا۔ مسز بھٹو یہ بھی جانتی تھی کہ سابقہ حکومت کی بناوٹ اور کھوٹے پن سے اس نے کافی فائدہ اٹھایا ہے۔ وہ اپنی اور آئی ٹی۔ آئی کے اپنے اندروں کی کامیابی کو رائیگاں کیسے جانے دیتی جب کہ انہوں نے اپنا مقصد لگ بھگ حاصل کر لیا تھا۔

وہ تمام لوگ جو اس قوم کے ہی خواہ ہیں انہیں اس معاملے پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس بنیادی سوال پر غور کرتے وقت ذاتی یا سیاسی تعصب کو بالائے سر کھانا چاہیے۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ مجھے ہلاک یا چنگیز خان سے موسوم کیوں کر رہا تھا۔ راجہ گاندھی محض دہلی سے سرنگرن تک کیوں آیا تھا کہ وہ میرے دفعہ ۴۰ مخالف کشمیری مخالف ہونے اور مسلم مخالف ہونے کا "پردہ فاش" کر سکے اور عین اس وقت مسز نے نظیر بھٹو میرے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی بات کرتے ہوئے کیوں کہہ رہی تھی۔ جگ جگ موہن کو جگ بھگ موہن کر دیں گے۔

باب دس

تخریب اور دہشت گردی کی نوعیت اور طرز عمل

ملی بھگت گٹھ جوڑ اور سازشیں

”جب بنیادوں کی تعمیر ایسے کھوکھلے مواد سے کی گئی ہو جیسے اسٹرچی اسٹرکچر بنے چاٹ لیا ہو تو معمولی ہوا کا ایک جھونکا بھی تمام توڑھا بچے کو مسمار کر سکتا ہے اس کے بلے طوفان کی ضرورت نہیں“

مصنف کی ڈائری

(۲۴ جنوری ۱۹۹۰ء)

گذشتہ باب میں جن انداز فکر اور طرز عمل کا میں نے اشارہ دیا ہے جیسے ہی میں اس راہ پر پیش قدمی کرتا گیا، اتنے ہی زیادہ جوابی حملے پھر ہونے لگے اور اتنا ہی میں تخریب اور دہشت گردی کے رموز کو سمجھتا گیا اس کی مراد میلے کے تلے دیکھنا، ذکر اس عمارت کو کریدنا جو گر بکلی ہے اور جس کے بکھرے ہوئے ریزوں میں بہن عناصر نے اپنے گھونسلے قائم کر لئے ہیں وہ دوسرے ریزوں کے ساتھ ملکر شگاف اور دراں گہری کرتے ہیں اور آخر کار تمام ڈھانچہ کنکر پتھر بن کر رہ جاتا ہے۔

سوالات

یہ عناصر کون تھے؟ ان کی تفہیم کیا تھی؟ ان کی حوصلہ افزائی کہاں سے ہوئی تھی؟ ان کا کام کرنے کا دھنگ کیا تھا؟ وہ کس طرح تشو و غما پاتے اور گہری جڑیں قائم کرتے ہیں؟ انہیں اپنے گھونسلوں سے بلا روک ٹوک کام کیسے کرنے دیا گیا۔ ان گھونسلوں کو غوث کیسے بنایا گیا اور ابتدائی مرحلے پر ہی انہیں تباہیوں نہیں کروایا؟ جب اسے معلوم ہوا کہ دیمک چاٹ رہی ہے تو اس دیمک کو بٹانے کا کوئی علاج شروع کیوں نہیں کیا گیا؟ میں اس باب میں ان تمام سوالات پر بحث کرنا چاہتا ہوں۔ اس عمل میں جس انداز سے اقتدار کے ڈھانچے کے قیام و جزا ویر قبضہ کیا گیا کس طرح ڈرانے دھمکانے جوڑ توڑ اور سازشوں کا عمل واقع ہوا اس

سے بھی پردہ اٹھایا جائے گا۔ دوسری ایجنسیوں کے ردول اور تقویت پہنچانے کے ردول کو بھی سامنے لایا جائے گا۔ اور ایک بہت بڑی پروپگنڈہ مشینری کے خدو خال بھی عیاں کئے جائیں گے۔

اس صورت حال کی المناک ستم ظریفی یہ ہے کہ میں ہی تھا جو کہہ رہا تھا کہ نہریلے بیج بوئے جارہے ہیں اور مجھے ہم کانتوں کی فصل کا مقابلہ کرنے کے لئے آنا پڑا۔ یہ میں ہی تھا جس نے ۱۹۸۶ء میں بخشی منظر میں انسانیت کا رنگ بھرنے کی کوشش کی تھی اور مجھے اس وحشی منظر کا سامنا کرنا پڑا۔

دہشت گرد تنظیمیں اور ان کے تربیتی مراکز

جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ وادی میں ۳۴ دہشت گرد تنظیمیں سرگرم عمل ہیں۔ ان میں سے اہم تھیں۔ جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ حزب المجاہدین سٹوڈنٹس لبریشن فرنٹ پیپلز لیگ ترمب اسلامی حزب اللہ اپریشن بالاکوٹ اور الجیشی ان گیارہ اہم تنظیموں کی سرگرمیوں کو روک دینے والی چوٹی کی تنظیم ایم ایڈوکیٹ میاں عبدالقیوم کے تحت موجود تھی مگر لگ بھگ تمام تنظیموں کو ہدایات پاکستانی مقبوضہ کشمیر یا پاکستان سے حاصل ہوتی تھیں۔ جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ کے کیمپ لیڈر امان اللہ خان، راجہ منظر اور فاروق حیدر تھے وہ کھلے عام سرگرم تھے اور اکثر اوقات اعلانات کرتے تھے۔ دوسری تنظیموں کے لیڈر اکثر روپوش انداز میں سرگرم عمل تھے۔

۱۹ جنوری ۱۹۹۰ء کو گورنری راج نافذ ہونے کے بعد اور اطلاعات جمع کرنے کی ہمد گیر ہم شروع کی گئی اس معاملے میں سرحد عبور کرنے والوں سے بھی خاص طور پر امداد حاصل کی گئی۔ تب ہمیں پتہ چلا کہ پاکستانی مقبوضہ کشمیر اور پاکستان میں کم از کم ۳۹ تربیتی مراکز ہیں۔ پاکستانی مقبوضہ کشمیر میں ہم مرکز ان مقامات پر تھے۔ پھنگ بیٹ پورہ کلاملا چاکوئی، تلوڑی، خوشہری، اٹھ گام نیک رام کامری، منی مرگ اور بنڈی باں پورہ مرکز جھمچکوال، منظر آباد، دوغھیل، شیکاری کوہ، کوٹلی، علی آباد، بترہ پانی، میر پور، کوٹلی، امان پور، علی پور، جلیاں، بخاری، راولپنڈی، راتیل، بٹ، گوجرانولہ، شیک پور، بنواری، منگ، بجری، لاہور، پشاور، لیپا، ملتان، فیصل آباد، بترہ، حیدر آباد، راولپنڈی، ایسے مراکز تھے وادی کے اندر بھی چند تربیتی مراکز تھے مگر وہ بہت تحلیل و تدریس کے لئے کام کرتے۔ جلدی جلدی انہیں ایک مقام سے دوسرے مقام تک ہٹالیا جاتا۔ جن کی کوئی شہادت نہیں چھوڑی جاتی جس سے تربیت دہندگان اور تربیت یافتگان کو پکڑنے کا کام مشکل سا ہو جاتا۔ بھاری تعداد میں تفہیم کا راور راہر بھی بھرتی کئے گئے اور ان سے ایک مضبوط تنظیم تیار ہو گئی تھی جو تلوڑی، کوٹلی، بترہ، حیدر آباد، راولپنڈی اور دہشت گردی اور اس سے وابستہ کام سرانجام دینے میں انہیں آسانش ہو رہی تھی۔

دہشت گردوں نے وادی پر جو اپنا دبدبہ قائم کر لیا تھا وہ پوری وادی میں عیاں تھا۔ عوام سے کہا تھا کہ اپنے پاسپورٹ واپس کر دیں کیونکہ جو پاسپورٹ ان کے پاس تھے وہ ہندوستانی تھے۔ دوکانداروں

سے کہا گیا تھا کہ وہ اپنے پورے پیرسز رنگ کریں پر ہم بلند کریں 'غیرے' لکھیں اور جب کبھی کال دی جائے تو ہڑتال کریں۔ ان کا فتویٰ ہی قانون تھا اور جو کوئی حکم عدالتی کرتا اسے سنگ ساری گھر جلائے یہاں تک کہ کوئی ماسے کی سڑک دی جاتی۔

عوام کو یہ بھی ہدایت جاری کی گئی کہ وہ ٹیکس ادا نہ کریں اور اس حکم کی تعمیل میں انہیں بھاری خوشی ہوئی۔ ریاستی شینزری ناکارہ ہو چکی تھی اور غیر کی ٹیکس محصول چونگی وغیرہ معمول کے ٹیکس جمع کرنے کے معاملے میں بھی کوتاہ اندیشی سے کام لے رہی تھی۔ برس کے آخر تک اس میں بقایا اجات کی رقم ۲۴ کروڑ روپے تک پہنچ چکی تھی۔ خاص طور پر ہم عہدوں پر فائز غیر کشمیریوں کو دہشت زدہ کرنے کے مقصد سے درمیانہ داروں کے ذریعے خطوط ارسال کئے گئے۔ ایسا عجیب خط میرے ہاتھوں میں آیا جس کا معنی یوں ہے۔

”ہم جانتے ہیں کہ آپ کشمیر میں کافی عرصے سے رہ رہے ہیں بربر شاہ میں آپ کی فلور مل اور لال منڈی میں مکان ہے۔ تمہیں فوری طور پر کشمیر چھوڑنے کے لئے کہا جاتا ہے ہم کشمیر میں تمہارے کارخانے اور گھروں کو آگ لگا دیں گے، ہم دہلی میں بھی تمہارے گھر اور ہوٹل کو آڑ دیں گے۔

ہم تمہیں فوری طور پر کشمیر چھوڑ دینے کا حکم دیتے ہیں ورنہ تمہارے بچوں کو نقصان پہنچایا جائے گا۔ ہمیں پتہ ہے کہ وہ کہاں پر تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ آپ کی ایک بیٹی کی شادی ابھی گذشتہ سہ ماہ میں ہی ہوئی ہے اپنا کاروبار فوری طور پر بند کر کے پھلے جاؤ۔

ہم آپ کو غرض فو فزوہ نہیں کر رہے کیونکہ یہ سرزمین صرف مسلمانوں کی ہے اللہ کی سرزمین، سکھ اور ہندو یہاں نہیں رہ سکتے۔ اگر تم حکم نہیں مانو گے تو اب تباہی پتوں سے کی جائے گی

آزادی کشمیر۔ زندہ باد“
اس طرح سے مالکان مکان کو بھی یہ وارننگ دی گئی کہ وہ تمام غیر کشمیری غیر مسلم کرایہ داروں کو فوری طور پر نکال دیں اس کے بعد والہ کرنے بے دخلی کے نوٹس جاری کر دیئے۔ ایسے نوٹس اخبارات میں شائع ہونے لگے تاکہ مسکریوں کو اس بات کا علم ہو جائے کہ ان کی ہدایات کی تعمیل ہو چکی ہے۔

ملازمین اور اوقات دار کے دوسرے اجزاء میں تخریب

ریاست میں اقتدار کے ڈھانچے کے اہم اجزاء میں جو گندگی اور بدبو پیدا ہو چکی تھی وہ واقعی مایوس کن تھی۔ پولیس عام خدمات، ہسپتال انتظامیہ، اجالات، وکلاء، بیج سبھی پر اس کا اثر پڑا۔

پولیس

مجھے معلوم ہوا کہ جرائم کی شدت کے باوجود مقامی پولیس تھانوں میں مطلوبہ دہشت گردوں کے فوٹو گراف بھی نہیں تھے۔ پھر کس طرح کسی دہشت گرد کو ڈھونڈ کر اسے گرفتار کیا جاسکتا ہے۔ ایئر پورٹ اور بس اڈوں پر نگہداشت اور چوکی کا کام کیسے سرانجام ہو سکتا تھا۔ شاید ہی کوئی ان حالات اور استفسارات کا جواب دے پاتا تھا۔ جب میں نے سنگین جرائم سے وابستہ نالین طلب کیں تو مجھے اس معاملے میں برقی گئی بے اعتنائی اور بے اثری پر بھاری حیرانی ہوئی۔ معمولی سی تفتیش بھی نہیں کی گئی تھی۔ ابتدائی اطلاع درج کرنے کے علاوہ کوئی اور کام نہیں کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر روبینہ سید کے اغوا کے معاملے میں بھی غرضیہ دہشت گرد کی گئی تھی، ملازمین کا کوئی علم نہیں اور کوئی شہادت نہیں مل رہی، حالانکہ اس واقعہ سے نہ صرف پوری قوم دہل کر رہ گئی تھی۔ بلکہ اس معاملے کو پورے عالم میں تشہیر حاصل ہوئی تھی۔

مقامی پولیس میں سب سے زیادہ انداز ہی ہو چکی تھی کہ اس کا ایک حصہ لو جھل اور سردار بن چکا تھا۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اس عرصے کے دوران انیشی جنس بیورو کے جوابدار مارے گئے۔ وہ مقامی پولیس میں دراندازوں کے قریب کے شکار ہوئے اور ان کا حلیہ اور پتہ رابطوں یا براہ راست طور پر دہشت گردوں کو دے دیا گیا۔ مثال کے طور پر کرشن گوپال جو کہ پولیس تھانے کے ساتھ ملحقہ کارڈروں میں قیام پذیر تھا۔ جنوری ۱۹۹۰ء کو پولیس تھانے سے روانہ ہونے کے فوراً بعد مارا گیا۔ انیشی جنس افسروں کی سفارشات ہلاکتوں کے بعد ملازمین کو گرفتار کرنے کے معاملے میں کوئی کاروائی نہیں کی گئی۔ اس سے اس تنظیم کی صفوں میں حوصلہ شکنی پیدا ہوئی اور اس سے اس ادارے کے ذرائع اطلاعات ختم ہونا شروع ہو گئے۔

یہاں تک کہ میری پائلٹ کار کے ڈرائیور کا بھی تخریب کاروں کے ساتھ رابطہ تھا۔ اس کی جیب کا وائٹس سیٹ ان کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ ڈرائیور نے آسانی کے ساتھ اپنے افسروں کے پاس اطلاع داخل کر دی کہ وائٹس سیٹ اس کا چوری ہو گیا جب اس نے رات کو جیب اپنے گھر سے باہر کھڑی کی اس میں حیرت کی بات نہیں کہ اس جیب میں ایک دھماکہ بھی ہو چکا تھا۔

جوائنٹ انٹرو گیش بیورو میں متبیین بے اینڈ کے پولیس کا ایک ہیڈ کانسٹیبل وائٹس سیٹ کے دہشت گردوں کے ساتھ گہرے رابطے سے کام کر رہا تھا۔ انٹرنٹ ناگ کا ایک اور پولیس کانسٹیبل چوٹی کے دہشت گردوں کا ساتھی بن کر کام کر رہا تھا ان میں مشتاق واہ اور بلال احمد بیگ شامل ہیں۔

سری نگر کا ڈھماکہ مالو علاقہ دہشت گردی کی بڑی طرح لپیٹ میں تھا چند نہایت گھن آنے کے جرائم بھی پورے ہوئے تھے۔ سابق آزاد ممبر اسمبلی میر مصطفیٰ ایچ ایم فی جنرل منچرا ایچ ایل کھیٹر کی لاشیں اسی علاقے سے ملی تھیں بعد ازاں معلوم ہوا کہ اس علاقے کے درمیانہ سطح ایک پولیس افسر کی دہشت گردوں کے ساتھ

سانٹھ کاٹھ تھی۔ اس کے محلے کے دو اراکین سرگرمی کے ساتھ ملوث تھے۔ سرنگر کے ایس ایس پی کا ڈرائیور بھی تخریب کاروں کے ساتھ ملا ہوا تھا اور ایس ایس پی کی گاڑی کو اس نے ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل و حرکت کے لئے استعمال کیا۔ کثیر تعداد میں اہلکار زیر زمین تنظیموں کے راہبر اور مخبرین تھے۔ بارہمولہ کا ایک درمیانہ سطح کا افسر بھی ملوث تھا۔ ڈاکٹر رویہ سید کے بدلے میں جس حمید شیخ کو رہا کیا گیا اس کے پاس بھاری تعداد میں کرنیو پاس تھے اور یہ پاس انہیں لوگوں نے فراہم کئے تھے جو کرنیو پاس جاری کرنے کے کام سے وابستہ تھے۔

پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق مقامی پولیس میں چند عناصر نے تخریب کاروں کی کس طرح حمایت کی ۲۲۵، ۲۲۶ جنوری ۱۹۹۰ء کے واقعہ سے پوری طرح عیاں ہو جاتا ہے۔ آری پولیٹو اوزن کے ایک چھوٹے سے دستے نے لال بازار کے نزدیک ایک اینٹیڈر کار کو دیکھا شبہ ہونے پر اسے اُسے روکنے کا اشارہ کیا مگر یہ کار روکی نہیں بلکہ تیز رفتاری سے چل دی۔ پولیٹو اوزن نے گولی چلا دی جس سے کار کو معمولی نقصان ہوا اور اس میں بیٹھا ہوا ایک شخص مجروح ہو گیا۔ چنانچہ صورہ پولیس ہٹانے سے مقامی پولیس کی ایک جیب مسلسل تیز سائرن بجاتی ہوئی آگئی۔ اس سے ہر شخص کی توجہ ہٹ گئی اور ایمبیڈڈ کار ریج کر تنگ گئی۔ تقریباً دس منٹ بعد وہی جیب سی آری پولیٹو اوزن نے ایک نواحی علاقے چل دی۔ دیکھی اور اُسے روک لیا۔ تلاشی پر ضلع بارہمولہ میں اوڑی کا ایک شخص پولیس ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا ملاجب وہ باہر آیا تو اس نے کنسل جیب میں ہی چھوڑ دیا۔ جس کے تلے ۳۸ ایک جگہ لہو لہو لہو یعنی ساخت کا ایک گرینڈ ایک چھڑا اور ایک کھلو ناپستول چھپائے گئے تھے کنسل ہٹانے پر یہ سارا مواد برآمد ہوا بارہمولہ کا ایک اور شخص اور بچے اینڈ کے مسلح پولیس کے تین کانسٹیبل بھی اس سازش میں ملوث تھے۔ ان سبھی کو حراست میں لے لیا گیا۔

۴۰ دہشت گردوں کی رہائی

اس کے باوجود کراچی ریاست کے حالات نہایت سنگین تھے اور ان کے ساتھ ہوشیاری سے نمٹنے کی ضرورت تھی۔ انتظامیہ دہشت گردوں کی رہائی جیسے معاملات کے ساتھ الجھا ہوا تھا۔ جبکہ ایک طرف پولیس ڈھانچہ بہتر راجح حوصلہ شکنی کا شکار ہو رہا تھا۔ ملازمتوں میں دراندازی گہری اور مزید گہری ہوئی جاری تھی اور اخبارات ٹوپک پلان جیسی خبریں شائع کر رہے تھے اور اس اعتبار ہوئی صورت حال پر قوم متواتر تشویش کا اظہار کر رہی تھی اور سازشوں کا طرز عمل جب پورے طور پر واضح ہو رہا تھا ہر ریاستی حکومت نے کثیر تعداد میں دہشت گردوں کو رہا کرنے کا فیصلہ کر دیا۔ جولائی اور دسمبر ۱۹۸۹ء کے دوران اس نے ۴۰ دہشت گردوں کو رہا کیا۔ چنانچہ ان معاملوں پر سیری نظر رکھی اور جو کچھ غلط معلوم ہوا وہ واقعی حیرت کن تھا۔ اس کی ایک جھلک یوں ہے۔

رجیم اکھرا افضل شیخ سرحد عبور کر کے اپنے بہنوئی غلام محمد والی کیساتھ بھڑا جو پاکستانی مقبوضہ کشمیر میں

انھماک کے مقام پر آباد ہو گیا۔ مقام مظفر آباد میں وہ مقبولیٹ کے سینٹرل جاوید مقبولیٹ اور شرکت مقبولیٹ سے ملا جس میں اُسے جملہ کثیر لبریشن فرنٹ کے جیڑمین امان اللہ خاں کی حمایت حاصل ہوئی اسکی ملاقات بے کے ایل ایف کے ایک چوٹی کے لیڈر عبداللہ وازہ کے ساتھ بھی ہوئی۔ اس نے مظفر آباد میں حلف وفاداری لیا اور فارم بھر کے خون کے ساتھ اپنا انگوٹے کا نشان چسپاں کر دیا۔ تربیت کے لئے وہ کچی گھڑی پشاوڑ گیا واپس آنے پر اس نے بسوں میں بم دھماکے کئے۔ اسے نظر بند کر دیا گیا۔ اور اس کی نظر بندی کو تو شیخ بے اینڈ کے ہائی کورٹ کی صدارت میں مشاورتی بورڈ نے بھی کر دی۔ اس کے باوجود فاروقی حکومت نے اُسے جولائی ۱۹۸۹ء میں رہا کر دیا۔

چند ایسے بھی افراد تھے جو نہایت کثرت قسم کے تخریب کار تھے۔ یہ لوگ خطرناک ہتھیار چلانے میں تربیت یافتہ تھے۔ ان افراد کے پاکستانی مقبوضہ کشمیر میں اعلیٰ ترین سطح پر تعلقات تھے یہ وہ لوگ تھے جو پاکستان آنے جلنے کے تمام جینی راستوں سے واقف تھے۔ ان لوگوں کو دہشت گردی کے ہر پہلو۔ سرحد عبور کرنا پاکستان سے ہتھیار لانا اور دہشت گردانہ جرائم کا ارتکاب کرنا سے واقف تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کی نظر بندی کی چیف جسٹس کی صدارت میں سسر رکنی مشاورتی کمیٹی نے تصدیق کر دی تھی۔ پھر بھی وہ شخص تھے جنہیں رہا کر دیا گیا۔ اور وہ بھی ایسے وقت میں جب تخریب کی قوتوں کی فولادی ہاتھوں کی ضرورت تھی۔

یہ امر ان رہائیوں میں سے کوئی بھی رہائی بجا نہیں تھی اس بات سے ثابت ہوتی ہے کہ جب میں نے ان تمام دہشت گردوں کی دوبارہ گرفتاری کے احکامات جاری کئے تو پولیس ان میں سے کسی کا بھی سراغ نہیں لگا سکی۔ ظاہر ہے کہ یہ سبھی افراد درویش ہو چکے تھے اور انہوں نے دہشت گردی کی کاروائیاں دوبارہ شروع کر دی تھی جس سے مزید اموات، مزید دم دھماکے اور آتشزدگی کے مزید واقعات رونما ہو رہے تھے۔

چونکہ یہ دہشت گرد اپنی کاروائیوں میں ماہر تھے انہوں نے آسانی کے ساتھ رابطہ قائم کر لیا۔ چنانچہ سرحد عبور کرنے اور ہتھیاروں کی سمگلنگ کے واقعات میں بھاری اعائد ہو گیا۔ انہوں نے دوسرے افراد کو بھی ان کی صفوں میں شامل ہونے کے لئے راعب کر لیا۔ انہیں قائل کرنے کے لئے اپنی مثال میتے ہوتے وہ سینڈھونک کر کہتے: "دیکھو ہمیں دیکھو ہم پاکستان گئے تھے وہاں ہم چوٹی کے لیڈروں کے ساتھ ملے۔ ہم نے بم دھماکوں کی ہم بازی کی ہے۔ ہمارا کچھ نہیں بچا۔ ہم صبح سلامت موجود ہیں۔"

پس ان ۴۰ دہشت گردوں کی رہائی نے ان چند پولیس افسروں کی بھاری حوصلہ شکنی کی جو تھوڑی بہت وفاداری کے ساتھ اپنے فرائض سرانجام دے رہے تھے بلکہ اس سے دہشت گردوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا۔ دہشت گردوں کی آوازیں مزید تیزی آگئی اور حکام کا چوتھوڑا بہت خوف ان کے دلوں میں پہلے موجود تھا وہ بھی جاتا رہا۔

سب سے ناقابل معافی بات یہ تھی کہ ان تمام ۴۰ دہشت گردوں کو تقریباً ایک مشن رہا کر دیا گیا اس سے وہ تخریب کاری کے دھانچے میں کیدی رہتے حاصل کرنے کے قابل ہو گئے۔ اور اس کڑی کو پورا

کرنے کے لئے وہ دوبارہ پاکستان چلے گئے۔ جہاں سے وہ ہلاکتوں، اغواؤں اور دہشت گردی کے مزید واقعات کے ارتکاب کے لئے مزید ہتھیار لے آئے۔ مثال کے طور پر رہا شدہ افراد میں سے ایک شخص محمد داؤد خان سکد گانڈیل ایک دہشت گرد تنظیم القاعدہ کا ڈپٹی کمانڈر ان چیف بن گیا۔ اس نے ۲۵۰۰ کشمیری نوجوانوں کی ایک فوج منظم کرنے میں رہبرانہ رول ادا کیا۔ ایک اور رہا شدہ نوجوان عبداللہ بھٹ نے بھون و کشمیر پریشن فرنٹ اور حزب المجاہدین کی طرف سے پاکستان میں تربیت حاصل کرنے نئے بھاری تعداد میں نوجوانوں کی فہرست تیار کی۔

تمام ملازمتیں

پولیس کے علاوہ دوسری ملازمتوں کی کیا حالت تھی؟ مجھے پتہ چلا کہ بھاری تعداد میں سرکاری ملازم تخریبی کاروائیوں میں ملوث تھے۔ ان میں سے چند افراد آرگنائزڈ اور گروپ لیڈر بھی تھے۔ جس طریقے سے سرکاری ملازمین نے ان کاروائیوں میں حصہ لیا وہ مندرجہ ذیل دو منفرد معاملوں سے ظاہر ہو جاتا ہے۔

پلوام میں محکمہ بجلی کا ایک انسپکٹر حزب المجاہدین کے ایئر یا کمانڈر کے طور پر کام کر رہا تھا۔ اگر یہ ہلاکار لگ بھگ کھلے عام کام کر رہا تھا اور اپنے دفتر سے کافی عرصے تک غیر حاضریاں گزروا کر فحشاء و فساد کر رہا اور اس نے دوسری مراعات بھی حاصل کیں وہ محکمہ بجلی کی کاروائیوں اور ٹیلیفون جیسی سہولیات کا استعمال تخریبی کاروائیوں کے لئے کر رہا تھا۔

محکمہ توانیج کا ایک درجہ چہارم ملازم ایک تخریب کار تنظیم کا سرگرم رکن تھا۔ وہ آئندہ دہائی کے ایک معاملے میں ملوث تھا۔ اس کے اور اس کے والد کے گھر سے ۱۳ بم برآمد ہوئے۔ حالانکہ وہ روپوش رہا مگر اس کی غیر حاضری کا کوئی مستند ثبوت نہیں لیا گیا۔

ایک پورا فضل شاہ سرگرم ملازمت میں رہتے ہوئے بھی پاکستانی مقبوضہ کشمیر تک گیا۔ وہاں وہ امان اللہ خان اور راجہ مظفر جیسے چوٹی کے لیڈروں سے ملاقاتی ہوا جب وہ واپس لوٹا تو دوسرے شخص کے ذریعے بستیوول اور گولبول سے بھرے میگزینوں کا ایک صندوق اسے ارسال کیا گیا۔

ارشاد حسین ریاستی حکومت سے جو تیرا انجینئر کے طور پر تنخواہ حاصل کرتا رہا مگر وہ ترقیب کار کا کام سر انجام دے رہا تھا۔ اس نے پاکستانی مقبوضہ کشمیر میں تربیت حاصل کرنے کے لئے نوجوانوں کے دو گروپ روانہ کئے۔ اس نے متعدد بم دھماکے بھی کئے جن میں کشمیر کلب اور زیر و بروج کے بم دھماکے شامل ہیں۔ دہشت گردوں مثلاً احمد شیخ اور بلال احمد کی طرف سے اس نے غیر قانونی طور پر اسلحہ اور بارود بھی رکھا۔

ایک اور ملازم محمد اکرم یاسین ملک جیسے چوٹی کے دہشت گردوں کے ساتھ تعلقات بنائے ہوئے تھا اور وہ راجوری کی طرف سے پاکستانی مقبوضہ کشمیر تک نوجوانوں کے ایک گروپ کو اپنے ہمراہ لے گیا۔

متذکرہ بالا معاملات سے چند متعلقہ سوال پیدا ہوتے ہیں۔ یہ بات کوئی ممکن ہو سکتی ہے کہ اس قدر کثیر تعداد میں سرکاری ملازم تخریب کاری کے آلہ کار بنے؟ اور ان میں سے ہر ایک کو طویل عرصے تک اپنے سرگرمیاں جاری رکھیں اور یہاں تک کہ وہ پاکستانی مقبوضہ کشمیر بھی گئے؟ کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ ان کی سرگرمیوں کا کسی کو پتہ نہ چلا ہو جب تک بازو و خ حلقوں کی طرف سے ان کی حوصلہ افزائی نہ ہوتی ہو یا ان کا کوئی مذکورہ سیاسی سرپرست یا کوئی دیگر نہ ہو؟ ان گناہوں نے جرائم کا سرانجام لگوانے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ کسی مخصوص قلم کے جو تیرا انجینئر اس قسم کے معاملات میں ملوث تھے۔ میں نے متعلقہ چیف انجینئر کو بلایا اور دریافت کیا کہ سب کیوں ہوا اس نے بتایا کہ چند جو تیرا انجینئر اور اس طرح کے دوسرے لوگ اپنے سینئر انفلو کی شاذ و نادر ہی پرواہ کرتے ہیں۔ وزراء اور دوسرے سیاسی عناصر تک ان کی براہ راست کے علاوہ بیچ اور بھی بہت کچھ تھا۔ یہ چیف انجینئر تھے جو جو تیرا انجینئروں کو جواب دہ تھے۔ حالانکہ معاملہ آلتا ہونا چاہیے تھا۔

سازشیں

سرینگر سنٹرل جیل سے ۱۲ خطرناک نظر بندوں کے فرار کے معاملات سے اس امر کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ نازک حکموں کے اندر بھی کس حد تک دراندازی ہو چکی تھی۔ فرار کا یہ واقعہ ۲۴ مارچ ۱۹۹۰ء کو ہوا مگر اس کے لئے منصوبے کافی پہلے تیار کر لئے گئے تھے۔ وہی لوگ جو ان نظر بندوں کی جیل میں حوالات کے لئے ذمہ دار تھے انہوں نے خود یہ فرار ممکن بنایا۔

قریباً تمام متعلقہ ملازمین خواہ گزٹڈ یا نان گزٹڈ تھے، جیل یا پولیس یا محکمہ بجلی سے وابستہ تھے بھی پر تخریب کاری کا ذریعہ کر چکا تھا چند آدمیوں نے سازش کی دوسرے ملی حکمت میں شامل تھے اور کچھ اور تھے جنہوں نے منہ پھیر لیا۔ فرار کے لئے ہر ایک سہولت فراہم کی گئی تھی کیلوں فولادی جالیوں کو کاٹنے کے لئے ایک فولادی آدمی تھی۔ بیڑھیاں تیار کرنے کے لئے نواحی خالی بڑی بیرکوں میں ملہری کا سامان پڑا ہوا تھا۔ نظر بندوں کو ان بیرکوں میں کرکٹ کھیلنے کے بہانے جانے کی اجازت دی گئی تھی۔ آسانی کے ساتھ کرکٹ بالوں اور گیند کی ٹمک سے بیڑھی میں کھیل ٹھونکنے کی اجازت جانی تھی۔ نظر بندوں کو بستروں پر بچھانے کے لئے لمبی چادریں فراہم کی گئی تھیں تاکہ انہیں جیل ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے سوارٹھریں دیوڑھی تک لٹکایا جاسکے۔ اس دیوڑھی کا دروازہ کھول کر وہ ایسا راستہ اپنا سکتے جہاں سے بی ایس ایف سنٹری کی نظروں سے بچ کر نکلا جاسکتا تھا۔ ایک دو گھنٹوں کو عبور کرنے کے بعد نگین جھیل تک پہنچا جاسکتا تھا جہاں سے نظر بندوں کو جھیل سے پاس لے جانے کے لئے چھوٹی چھوٹی کشتیاں کھڑی تھیں۔ جب یہ انتظامات مکمل کر لئے گئے تو جیل کا ڈرائنگ روم گرم ہو گیا اور ایلیکٹریشن جو عموماً رات کے وقت ڈیوٹی پر نہیں ہوتا عین موقع پر نمودار ہو گیا تاکہ وہ ٹرانسفارمر کا سوچ بند کر سکے۔ اس سلسلے میں ہر گزٹی نے اپنا رول ادا کیا اور ایک دوسرے کے ساتھ سلسلہ جڑتا گیا۔

یہ منصوبہ اس طرح تیار کیا گیا تھا کہ درست موقع پر درست شخص موجود تھا۔ تخریب کار کے لیور کو حرکت دینے کے لئے ایڈمنسٹریشن میں ابھی خامی تھا۔ ادیں غالباً نہ عناصر کام کر رہے تھے۔ اگر کسی کو سوال کیا جاتا تو نہایت تاسف آمیز چہرہ بنایا جاتا اور شکایت کی جاتی کہ کسی مخصوص طبقے کے مقامی افراد پر اعتماد نہیں کیا جاتا اور جب ان غالباً نہ ہاتھوں کے سراغ کی کوشش نہیں کی گئی تو حالات نہایت تیزی اور مستندی کے ساتھ آگے بڑھتے گئے۔

یہ سازشیں گہری تھیں اور ان کی جڑیں دودھ در دودھ تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس سلسلے میں شاید ہی کوئی ٹری تھی جس نے اسے تو فیض شدہ کام نہ کیا ہو یا کاڈر بالکل مفتوح تھا۔ کوئی شخص تنخواہ اور مراعات بھی حاصل کر سکتا تھا اور وہی اسی وقت جمع و جید آزادی کا میر و بھی بن سکتا تھا۔ ان کے لئے روٹی دونوں طرف سے چھڑی گئی تھی۔ اس میں حرمت کی بات نہیں کہ کی رفتار بڑھی گئی اور معاملہ گرم ہوتا گیا۔

سانٹھ گانٹھ کے مراکز سرکاری ہسپتال

حکومتی شیشی کے اندر چست بار سوخ ڈاکٹروں نے قوم دشمن کام کے لئے اندر ہی اندر ایک طاقتور جرنی کی تشکیل کر لی تھی۔ سری نگر کے ہسپتال خاص طور پر شیشی انٹی ٹیوٹ ہسپتال اور لال دیہہ کے وقت گزرنے کے ساتھ سازشوں اور سانٹھ گانٹھ کے مرکز بن گئے۔ ان ہسپتالوں میں دستیاب قریباً تمام سہولیات و ہشت گردوں کو حاصل تھیں۔ وہ ہسپتال میں کھانا کھاتے تھے، ہسپتال کے بستروں پر سوتے تھے، اپنے ہتھیاروں کو چھپانے کے لئے ہسپتال کے سٹور کا استعمال کرتے تھے۔ جب کبھی ضرورت محسوس ہو وہ سٹاف کو اسٹروں میں گھس جاتے تھے اور پھوڑے سے نکل کر خفیہ راستوں سے بچ کر نکل جاتے تھے مثال کے طور پر محسن کی بیرونی دیوار میں نہایت احتیاط سے منتخب مقامات پر شیشی گف ڈالے گئے تھے۔ جہاں سے کوئی شخص آسانی سے تنگ لگی کوچوں میں آ جاسکتا تھا۔ حمید شیخ یا سین ملک جیسے چوٹی کے دہشت گردوں کا فرار اور ڈاکٹر و میر سعید کے اغوا اور مورہ میرڈیکل انسٹی ٹیوٹ کے اندر اور گرد و نواح میں قتل کے معاملات ایک دوسرے کے ساتھ کسی نہ کسی طور پر ہسپتال ایڈمنسٹریشن کے ساتھ وابستہ تھے۔ مختصر یہ کہ برصغیر کے دوران ڈاکٹر نے اپنے گونڈے اپنے رتبے اور اثر و رسوخ کا سیاسی آقاؤں کے لئے استعمال کیا تھا تاکہ وہ مقامی ڈاکٹری طبقے پر اپنا تسلط قائم کر سکے۔ وہ ان معاملات میں اہم آدمی تھا۔ ان معاملات کا تجزیہ باب چہارم میں پیش کیا گیا ہے۔

عدالتوں پر مضمناثرات

دہشت گردی اور تخریب کاری نے عدلیہ پر بھی اپنے مضمناثرات ڈالے تھے۔ ضلع اور سب ڈویژن عدالتوں کے جج اور جج مددگاروں کو دہشت گردانہ کارروائیوں سے متاثر کیا گیا۔

کر لیا تھا اور جماعت اسلامی کا مقامی لیڈر عوام سے یہ تلقین کرتا تھا کہ وہ اپنے تنازعات اس عدالت کے سامنے پیش کریں۔

اس ماحول کا بانی کورٹ پر اثر ہوا۔ سری نگر میں کام کر رہے دو ججوں نے ایسے احکامات صادر کرنا شروع کر دیئے جن کی درستی کے لئے میں بار بار سپریم کورٹ کا رجوع کرنا پڑا۔ تلبہاں تک کہ جب ہندوستانی عوامی وقت کی بجائے "پاکستان کا عوامی وقت" استعمال کرنے والوں کے خلاف کارروائی کی گئی تو ججوں نے دخل دے کر معاملے پر حکم امتناعی جاری کر دیا۔ ان اخبارات نے بھی ویسی ہی صورت تھی جہاں ہم نے خبروں کے لباس میں دھمکیاں دینے کی پاداش میں کارروائی کی۔

سری نگر میں کام کر رہے بانی کورٹ کے طرز عمل کی ایک اور مثال یہ بھی ہے کہ وہاں دو ججوں پر مشتمل ڈویژنل بینچ کا قیام خود بخود کر لیا گیا۔ بانی کورٹ کے قواعد کے مطابق صرف چیف جسٹس ہی ڈویژنل بینچ کا قیام عمل میں لاسکتا ہے مگر یہاں ان خود ہی ججوں نے ڈویژنل بینچ کا قیام عمل میں لادیا اور ان کے طرف سے جاری ہر ایک حکم کے خلاف سپریم کورٹ تک جانے کے لئے مجبور ہو گئے۔ اگر کوئی واحد جج کا حکم ہوتا تو ہم اسی بانی کورٹ کے ڈویژنل بینچ میں اپیل کر سکتے تھے جو ریاست کے دارالحکومت جہاں میں کام کر رہا تھا۔

سری نگر بینچ میں پاس کئے گئے چند احکامات کا نوٹس لینا لازمی ہے۔ ان احکامات کا تعلق حکومت کو عسکری کاموقع فراہم کئے بغیر امتناعی احکامات کے امراء حکومت کو کر فیو نافذ کرنے کے قانونی اختیارات اور ان دہشت گردوں اور تخریب کاروں کی پیشگی ضمانتوں سے بے جینس پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بند کیا جانا مقصود تھا۔ ان احکامات سے متاثرہ فریق کے طور پر ہم نے سپریم کورٹ کا رجوع کیا جہاں بانی کورٹ کے فیصلوں پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے ان فیصلوں کو الٹ دیا گیا۔

وکلاء

سری نگر باران عناصر کے تسلط میں آ گیا تھا جو تخریبی خیالات کے پرچار کے لئے اسے ایک طاقتور آلہ کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے۔ یہ قراردادیں منظور کر کے ان کی وسیع تر تفسیر کرتا۔ مثال کے طور پر اقوام متحدہ کے مقامی دفتر کو دی گئی یادداشت میں کہا گیا ہے۔ ہندوستانی آزادی ایکٹ، ۱۹۴۷ء پاس ہونے کے بعد جموں و کشمیر پر برطانوی اقتدار اعلیٰ ختم ہو گیا اور بین الاقوامی قانون کے مطابق جموں و کشمیر ایک آزاد و خود مختار ملک بن گیا۔ ملک ڈوگرہ ہمارا جبراستی مسلمانوں کی بھاری اکثریت کی اُمنگول کو محسوس کرنے میں ناکام رہا۔ اور جموں و کشمیر کے عوام کی اُمنگول کے خلاف اس نے ہندوستان کے ساتھ الحاق کے بارے میں ساز باز شروع کر دی۔ اس سازش کے نتیجے کے طور پر جموں صوبہ میں ۵۰ لاکھ سے زیادہ مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔ اور ان میں سے بیشتر کو بھاگ کر پاکستان کے قریبی علاقے میں جانا پڑا۔ صوبہ جموں میں مسلمانوں

کے قتل عام کے خطرے اور اس فراڈ کے خلاف چند قبائل کی مدد سے ریاستی باشندوں نے ہمارا جہ کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کی کوشش کو ناکام بنانے کی کوشش کی۔ بہر حال اس سے قبل کہ ریاست کو ہمارا جہ کے جبارانہ حکومت سے آزاد کرایا جاتا ہمارا جہ ہری سنگھ نے ریاست جموں و کشمیر کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کا نفی معاہدہ ۴۷-۲۲۱ کو رو بہ عمل لایا:

میاں عبدالقیوم کی سربراہی میں بارالہ سوسائشن نے بھی وکلاء سے تعلقین کی کہ سیکورٹی فورسز کی زیادتیوں کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے اپنی نظریاں نصف گھنٹہ پیچھے کر لیں اور جمعہ کے دن عدالتوں میں حاضر نہ ہوں۔ ارادہ بالکل واضح تھا۔ وہی کیجئے جو پاکستان میں ہو رہا ہے۔

اخبارات کے ذریعے تخریب

دہشت گردی کا رومدار افعال اور اعلانات کے ذریعے جاری پروپیگنڈہ پر موتا ہے اس کی کوشش ہوتی ہے کہ تخریب خالف کی حوصلہ شکنی کی جائے اور لڑائی کے لئے ان کی قوت ارادی کو کمزور کر دیا جائے اور اس عمل سے خوف کا نفسیاتی ماحول پیدا کر دیا جائے۔ ۱۹۷۲ میں سیاہ بزم دہشت گردوں کی خوف سے گیارہ کھلاڑیوں کے قتل کا واقعہ دنیا بھر میں ۵ کروڑ افراد نے جمعی وغیرن پر دیکھا جو اس طرز عمل کی سبب تابندہ مثال ہے۔

ہونہی وادی پر دہشت گردی کے سلسلے میں بہت گئے بہت معمولی انحراف کے علاوہ اردو اخبارات اپنی مرضی سے ان کے آلاکار بن گئے۔ ان میں سے ایک حقد دہشت گردوں کی گولی سے خائف تھا۔ اردو سرا تخریبی رول ادا کرنے کی مرضی رکھتا تھا اور ایک حصے نے اسلامی بنیاد پرست نظریے کے پیروار کے جذبے میں شدت اختیار کر لی۔ اس کا حقیقی نتیجہ یہ ہوا کہ تمام تر اردو پریس تخریب کا رخصا کر کے بھونچون کر رہ گیا۔ عملی طور پر اس نے سازش کر کے دہشت گردی کو ہوا دی۔ اُسے حق بجانب قرار دیا اور اس کو شان بخشی یہ بات محضوم اور راست گو افراد کی سفاکانہ بلاتوں کے لئے ذمہ دار تھی۔

دہشت گرد تنظیموں کے پریس نوٹ شائع کرنے کے بھانے ان بیانات اور پروگراموں کی جاری نشر کی جاتی اور انہی سرخیوں جہانی ٹی وی ۱۰ ایریا کمانڈروں چیف کمانڈروں اور ملحدی ایڈوائسروں کے عہدے اس طرح استعمال کئے جاتے گویا کہ وہ حقیقی عہدے ہوں۔ اسلامی عسکریت میں موجود دھمکی آمیز انداز آتش بیانی کے اشارات و کنایات وغیرہ کو دہرایا جاتا۔

بنیاد پرست اصطلاحات میں تخریب کاری کے پیغام کو نمک مرچ لگا کر وادی کے کوئے کوئے میں پھیلا یا گیا۔ چونکہ نومبر ۱۹۸۹ء میں ریاست کی اختاری میں مزید کمی واقع ہوئی اور پریس زیادہ

ریاست میں پہنچا شاید ہی ہندوستان یا اس کی نمائندگی کرنے والے افراد کے حق میں کوئی لفظ تحریر کیا جاتا تھا۔ براہین سامراجیت اور دہلی دربار جیسی اصطلاحات کا آزادانہ استعمال کیا جاتا تھا اس معاملے میں چٹان اور وادی کی آواز نے بڑھ چڑھ کر رول ادا کیا۔ دوسروں نے بھی جلد ان کی تقلید کی تمام مفتاحی اخبارات ایک محسوس برہمچے کی صورت اختیار کر گئے اور ہر روز کلیدی وطن اور وادی کے ساتھ اس کے دشمنوں پر بار بار وار کرنے لگے۔ مذہبی کی بات ہے کہ جب یہ سب ہو رہا تھا تو اشتہارات اخباری کاغذ کے کوئے اور قرضے نہیں فراخ دی کے ساتھ دیئے جا رہے تھے۔ ایک قدم پرست کی اس سے زیادہ کیا مثال ہو سکتی ہے۔ کیا یہ دانشمندی تھی کہ ان باتوں کو بھرا جائے جو تخریب کاروں کی لگائی ہوئی چنگاری پر ہر روز تیل چھڑک رہے تھے۔

چند اخبارات عملی طور پر حزب مجاہدین جیسی چوٹی کی دہشت گرد تنظیم کے بھونچون پکے تھے۔ ایک اخبار نے حکومت کے سینئر اہلکاروں کو ہلاک کر دینے کی دھمکی کی نشر شائع کر دی جبکہ دوسرے نے پٹنوں اور غیر کشمیریوں کو ۸۰ گھنٹے کے اندر وادی سے چلے جانے کی دھمکی شائع کی اور ہندوؤں کو ہلاک کر دیا جائے گا۔ ان خبروں نے اقلیتوں میں گھبراہٹ پیدا کر دی اور ان میں سے چند افراد نے وادی چھوڑ جانے کے لئے تیاریاں شروع کر دیں۔

۲۹ مارچ کو وادی کی آواز نے اپریشن بالاکوٹ کے سربراہ اعظم انقلابی کا ایک بیان جاری کیا کہ جب تک گورنر جموں کو ہلاک نہیں کیا جاتا اور کشمیر کو ہندوستانی نہیں سے آزاد نہیں کر لیا جاتا وہ چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ یکم اپریل کو آفتاب نے اٹھ بجائیں کا ایک بیان شائع کیا جس میں آئی اے ایس اور آئی بی ایس افسروں سے کہا گیا کہ وہ ۵ اپریل تک ریاست سے چلے جائیں۔ اسی بیان کے ذریعے عوام کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ خود گوشت کھائیں۔

۱۵ اپریل کو سونگر ٹاؤن نے ایک اطلاع میں کہا کہ ۱۴ اپریل کو حزب المجاہدین کی ایک خاص میٹنگ ہوئی جس میں اس تنظیم کے تمام لیڈروں نے حصہ لیا۔ اس میٹنگ میں گورنر جموں کو ہٹ کر دیا گیا اور کہا گیا کہ ہٹانے اس قوم کو چیلنج ہے جو لا الہ الا اللہ میں یقین رکھتا ہے اور یہ کہ اس قوم نے نظام مصطفیٰ کے قیام کے لئے ہر شے داؤ پر لگا دی ہے۔ اس میں عبد کیا گیا کہ ہندوستانی سامراجیت کے ایجنٹوں مخبروں اور آئی بی ایل اہلکاروں کو دی گئی دامننگ کی میز پر پوری ہو چکی ہے لہذا وہ موت سے قبل اپنی آخری خواہشات کی تکمیل کر لیں۔ اسی دن اس اخبار نے ایک اور اطلاع میں کہا کہ جے اینڈ کے سنوڈنٹس لبریشن فرنٹ نے چیف ایریا کمانڈر بلال احمد بیگ کی مداخلت میں مشق ۱۵ اپریل ایک جنگی میٹنگ میں عوام سے اپیل کی کہ فریو میں مزی کی مدت ختم ہو جانے کے بعد جمعہ کو کوئٹہ پر تین تاروں کو مکمل طور پر چیلنج کیا جائے۔

اس قسم کی پروپیگنڈہ کا اثر کیا ارادہ تھا؟ حزب المجاہدین کی زبردست تعبیر کی گئی اور مظاہر کیا گیا کہ

اس تنظیم کے بہت سارے لیڈر ہیں دوسرے گورنر کو بدنام کیا گیا اور ظاہر کیا گیا کہ اس نے کشمیری قوم کو چیلنج کیا ہے۔ وہ قوم جس نے اسلام سے جوش حاصل کیا ہے اور نظام مصطفیٰ کا قیام جس کا نصب العین ہے اس طرح معصوم عوام کے مذہبی جذبات کو بھڑکایا گیا ہے۔ نیز سامراجیت کے نام بنیاد یجنٹوں اور خبروں کو ہلاک کرنے کی دھمکی دی گئی ہے جو تحریک عوام کو رینو کی پابندیاں توڑنے کے لئے اشتعال دیا گیا ہے۔

عوام کو مرعوب کرنے اپنا نصب العین حاصل کرنے کے لئے اس نے جو شراذک کیا ہو سکتا ہے۔ دہشت گرد اپنی پالیسیوں اور پروگراموں کے لئے اور کس طریقے سے مفت پبلٹی حاصل کر سکتے تھے؛ اپنی تمام تر تحریری اور جرمانہ پیچیدگیوں کو لئے ایک بلا دستخط پریس نوٹ ذرائع ابلاغ تک پہنچنے کے لئے کافی تھا۔

فکر پولیس کے سی آئی ڈی شے کے ملازمین کی طرف سے ایک نوٹ جاری کیا گیا۔ ۲۸ اپریل ۱۹۹۰ء کے سرٹیکرٹائلز میں یہ یوں شائع ہوا ہے:-

”جہاد بول کی مخالفت کرنے والا کون بد بخت شخص ہو گا۔ ہم جہاد تنظیموں کو یہ بھی اپیل کرتے ہیں کہ سی آئی ڈی کا کوئی بھی ملازم خبروں کے طور پر کام نہیں کر رہا اور کوئی بھی نقاب پہن کر گرفتاریاں نہیں کرتا۔ ہم جہاد تنظیموں کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم کسی ایسی کارروائی میں ملوث نہیں ہیں جس سے کشمیریوں کے مقدس کاز کو نقصان پہنچے۔“

فکر سی آئی ڈی کے ملازمین

تصدیق کے ممبر اس قسم کے نوٹ کو تشہیر دینے کا آخر کیا ارادہ ہو سکتا تھا، کیا اس کا مقصد تلاش کرنا مشکل تھا، غلط فہمیاں پیدا کرنا، شبہات کو جنم دینا اور سرورسز کی حوصلہ شکنی کرنا مقصد ہے مگر تحریک کاری کے کاز کو تقویت مل سکے۔

زبردست پروپیگنڈہ

مقامی اخبارات میں وسیع تر پبلٹی حاصل کرنے کے علاوہ تحریک کا تنظیمیں بھاری مقدار میں پروپیگنڈہ اور فہمی مواد بھی لے آئیں جن میں نعرے، نغمے، سٹکر، کتابچے، اشتہارات، جریدے، آڈیو اور ویڈیو کیسٹ شامل تھے۔ چند نعرے اور میں مندرجہ ذیل دہرائے جاتے ہیں۔

یہاں الہیات قابل غور ہے کہ یہ مشکار اور نعرے شدید طور پر ہندو مخالف ہیں اور کشمیریوں سے تلقین کرتے ہیں کہ وہ ہندوستانی کیپ ڈپو اور ہندوستانی موجودگی کے واضح نشانوں کو جلا کر رکھ دیں۔ جہاد زبردست وکالت کی گئی ہے اور کشمیر کی آزادی کو اسلامی حمیدے اور اللہ کی مرضی کے ساتھ منسلک کیا گیا ہے۔

توحید ہماری دعوت ہے
جہاد ہمارا راستہ ہے

اسلامی ریش یو تھ فورس مظف آباد

اور
اسلامی انقلاب
کی نفی ہے

جنوں و کشمیر حزب الجہادین

کشمیر
کی مکمل آزادی

PRICE OF FREEDOM

IS BLOOD

آزادی کشمیر جہاد، اتحاد اور
کشمیر جہاد فی سبیل اللہ ہے

اسلامی ریش یو تھ فورس مظف آباد

یلا، و پیچہ یک، و تجارت کے سب فوجی ٹھکانوں کو
مست و ابوی کشمیر میں ان کے نشانوں کو

البدر

اسلامی علامتوں اور استعارات کا استعمال

تخریب کاروں کے تفسیحی ادب کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس میں اسلامی علامتوں استعارات و کنایات کا کھل کر استعمال کیا گیا ہے۔ ساتویں اور آٹھویں صدی کی اسلامی تاریخ کے شجاعی کارناموں کی تعلیمات کو کھل کر دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر بدیع بن مسلم حضرت عمرؓ کی خاص فتح و کامرانی علامت ہے جو انہوں نے مکہ کے عرب کے مسلمانوں کے غیر شائستہ قبیلوں پر حاصل کی۔ اس کا بار بار ذکر کر کے کشمیر کو متاثر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر کشمیر کے نغمہ آزادی میں مذہبی جند بائیت ہماری تعداد میں موجود ہے۔ یہ نغمہ یوں ہے۔

غلغلہ پر چار سو ہے نعرہ تکبیر کا
جاگ اٹھا ہے مسلمان وادی کشمیر کا
جرات فاروق و حیدر زوصلہ کشمیر کا
موت کا کچھ خوف ہے دل میں زدار و گیر کا
یا شہادت پائیں گے یا ہوں گے ہم فتح یاب
لائیں گے کشمیر میں اسلام کا ہم انقلاب
سرفروشی کے لئے نیتار ہیں پیر و جوان
نغمہ توحید لب پر عزم چہروں سے عیان
رائفل ایک ہاتھ میں ہے دوسرے میں حق
پھر سے دہرائے کو ہیں بدر و احد کی داستان
فتح و نصرت ساتھ ہے اور کامرانی ہم کا ہے
لائیں گے کشمیر میں اسلام کا ہم انقلاب

واضح ہے کہ اس سے مذہبی جنوں پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تاریخ اسلام میں عسکری تاریخی طور پر اٹھائے گئے ہیں۔ زبان میں از حد مخموری ہے اور اصطلاحات میں شہادت کی تلمیحات ہیں۔

اسلامی اصطلاحات کے استعمال کا یہی طرز عمل مختلف تنظیموں کے لیڈروں نے بھی اپنا یا اقتدار کے طور پر پہلو لیگ کے چیرمین شبیر احمد شاہ کے تحریر کردہ کتابچے اقبال کے مندرجہ ذیل شعر سے شروع ہوتے۔

فضائے نو پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اترتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

شبیر کی تقریروں کا تذکرہ ہوتا ہے اسلام کے دشمن تمام محاذوں پر اس کے دشمن کو ناکام بنانے کے لئے متحد ہو رہے ہیں۔ اس کی مثال کشمیر پر قبضہ ہے مگر اسلام سے رہبری اور جوش حاصل کر کے اب کشمیری قوم بیدار ہو چکی ہے۔ اسلامی انقلاب کا آفتاب طلوع ہو رہا ہے۔ اب فرزند ان کو حیدر کو متحد ہو جانا چاہیئے اور بھارت سے آزادی حاصل کرنے کے لئے میدان عمل میں آنا چاہئے۔ ہمارا راسخ اللہ ہے حق ان ہمارا آئینہ ہے، صدا ہماری فکر ہے۔

ہے اور شہادت ہماری اُمنگ ہے۔

عوام کو اس بات کا قائل کرنے کے لئے کہ موجودہ تحریک بنیادی طور پر خالص اسلامی حکومت قائم کرنے کی ایک کوشش ہے، اس پروپیگنڈہ نے رجعت پسندی کے تمام اصولوں کو نمایاں کیا۔ اسلامی اصولوں سماجی کردار اور سلوک کی سخت پابندی کے لئے متعلقین کے مقصد سے مفصل ہدایات ہماری کی گئیں۔ اس سلسلے میں بھاری تعداد میں کتابچے اور پوسٹر شائع کئے گئے۔ ان میں سے ایک پوسٹر جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ الیڈ ٹائیگرس اور حزب المجاہدین کی طرف سے کشمیری خواتین کے نام اپیل کی صورت میں جاری کیا گیا۔ اس میں کہا گیا ہے۔ اللہ کا فرمان ہے کہ جب ایک مادہ بلوغت اختیار کرتی ہے تو اس کے لئے واجب نہیں کہ وہ اپنے ہاتھوں اور چہرے کے سوائے اپنے جسم کے کسی حصے کو دکھائے۔ اپنے اعتماد کے اس اصول کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ہم ہر مسلم ماں بہن اور بیٹی سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ برکتہ کا استعمال کریں جو دفتر میں کام کر رہی ہیں، کالجوں یا سکولوں میں پڑھ رہی ہیں انہیں ضرورت ہے کہ وہ برقعہ یا نقاب اوڑھیں تاکہ جائے کار و بار تک پہنچنے کے بعد ان کی آنکھوں کے سوائے کچھ دکھانی نہ دے۔ جھوٹی لڑکیوں کو سرکار فہنشنے چاہئیں اور اپنے سروں کو دوپٹے کے ساتھ ڈھانپنا چاہیئے۔ ہم اس اپیل کی تعمیل کے لئے وہ دن کا وقت دیتے ہیں اور جو اس پر عمل کرنے میں ناکام رہیں گے۔ ان کے چہروں پر ایسا رنگ غمت کیا جائے گا جسے دنوں تک نہیں دھویا جاسکے گا کہیں توقع ہے کہ تم ہمیں نہ مانو گوار کام کرنے پر لاچار نہیں کرو گی۔

یہ دھمکی خالی فوٹی نہیں ہے اس لئے اس کشمیری خاتون کے گھر کی چار دیواری پر ہم دھماکا کر دیا گیا جو خواتین کی پردگی کی سخت پابندی کو پسند نہیں کرتی تھی۔ اس سلسلے میں یہاں یہ یاد دلانا ضروری ہے کہ اہل ان کے حجت اسلام علی اکبر باشمی رفسن جانی نے ایک مرتبہ کہا تھا زلف کا ہر ایک حلقہ زنجیر دکھاتا ہے کہ تہ تیہ سے اوچی چادر کے نیچے ایک ایسا خنجر ہے جو ہمارے شہداء کے دلوں کی طرف نشانہ لگا رہا ہے۔ ہر یکہ ایران کو اپنے تئیں تتر تینکوں ہمساروں اور میزانیوں کے چچا پد ماروں کے ذریعے شکست نہیں دے سکتا ہے مگر اسلام کو اس صورت میں شکست حاصل ہوگی جب اس کی عزتیں اپنے سر ڈھانپنے اور مناسب ملبوسات پہننے سے انکار کر دیں۔ +

سماجی اور مذہبی مضابطہ عمل کی پابندی پر اتنا زیادہ زور رکھوں دیا گیا مقصد یہ تھا کہ عوام کے ذہنوں میں اسلام کو برقرار رکھا جائے اور اسلامی اصولوں کی متواتر ہماری کی جائے تاکہ اسلامی بیداری کا جذبہ ان میں داخل کیا جائے۔ سیاسی مقاصد کو اسلامی لبادہ پہنایا گیا۔ مذہب اور دہشت گردی دونوں کو تخریب کاری کے منصوبے کے طور پر استعمال کیا گیا۔ انہوں نے عوام کے ذہن میں اللہ اور بندہ کا خوف ثبت کر دیا کہی مرتبہ وہ کہتے تھے۔ اس پر عمل کرو ورنہ اللہ تمہیں سزا دے گا۔ اور دوسرے موقع پر وہ کہتے۔ اس پر عمل کرو ورنہ ہم تمہارا قتل

کرویں گے یا تمہیں ناکارہ بنا دیں گے۔
بعض اوقات جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ اور حزب المجاہدین کے درمیان امتیاز کی کوشش کی جاتی ہے
اول الذکر کو سیکولر نظریے والا بیان کیا جاتا ہے اور آخر الذکر کو بنیاد پرست ہے مگر یہ بات بالکل درست
نہیں ہے۔ ان دونوں کے درمیان محض درجے کا فرق ہے جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ غیم مذہبی سیاسی بجا بدو حزب المجاہدین
بنیاد پرست سیاسی مجاہد ہیں۔

تین اہم مہنٹال

تخریب کا تنظیمیوں کے تین اہم مہنٹال تین ہفت روزہ اخبارات تھے۔ صدائے حریت، صدائے حق
اور صدائے کشمیر۔ اور انہیں وہی شائع کرتے تھے۔ میں ہر ایک میں سے ایک مہنٹال پیش کروں گا تاکہ ان کی
حقیقت بیان کر سکوں۔

۹ فروری ۱۹۹۰ء کو صدائے حریت نے صلال احمد بیگ کا ایک مختصر خاکہ شائع کیا جو شوڈنٹس لبریشن فرنٹ
کا اہم راکھتا تھا جس میں اس کی قربانیوں کا صحیح راستے کو تلاش کرنے کے مزاج اور کشمیر کی آزادی کے لئے اس
کی صدقہ کی ستائش کی گئی تھی اس کا مطلب تھا کہ اس سے ایسی خوبیاں وابستہ جاتیں جس سے دوسرے جموں و
کے لئے تحریک حاصل ہو اس طرح انہیں تحریک آزادی کے لئے لڑنے والے مجاہدوں کی صفوں کی طرف راغب
کیا جائے۔ اس شمسائے میں ہلال کا انٹرویو دیا گیا تھا جس میں اس نے کہا تھا: مسلمان کا سب سے بڑا
بتیں اس کا ایمان اسلام ہے۔ افغانستان اور فلسطین کے عوام کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ اگر اسلام کی
روحانی کشمیری مسلمانوں کے دلوں کو آغ دی جائے تو یقیناً ہم جلد ہی آزاد ہو جائیں گے کیونکہ ہماری جنگ
کسی بہادر وں سے نہیں بلکہ بزدلوں سے ہے اس کے علاوہ ہم تنہا ہی نہیں ہیں۔

قدرتی طور پر اس کا مقصد یہ ہے کہ اسلام کے نام پر کشمیریوں کے جذبات کو بلند کیا جائے اور وہ مقابل کو کمزور
اور ناتوان گردانا جائے۔

اس ناشر کو دور کرتے ہوئے کہ جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ سیکولر تنظیم ہے ہلال بیگ نے امان اللہ رحمان
کے حالیہ بیان کی طرف توجہ مبذول کروائی جس میں کہا گیا تھا: "اسلام ہماری روح ہے ہمارا ایمان ہے۔
ہم کسی اور نظریے میں یقین نہیں رکھتے ہم صرف اسلامی جمہوریہ کے کار کو وقف ہیں۔ ہم مکمل طور پر نظام مصطفیٰ
کا قیام کرنا چاہتے ہیں۔"

صدائے حریت کے اسی شمسائے میں سری نگر کے ایک علاقے کا ڈھارہ میں ہلاکتوں کی بابت ایک
رپورٹ شائع کی گئی تھی اس میں کہا گیا تھا: "۹ فروری کو کشمیر لبریشن فرنٹ کے کارکنوں نے کاڈھارہ میں آڑی
کے ایک ٹرک برفا ٹرک کا جس کے نتیجے میں چار فوجی جوان ہلاک ہو گئے۔ اور متعدد دوسرے زخمی ہوئے۔ درحقیقت

یہ علاقہ ہندوستانی درندوں کے لئے جہنم زار بن کر رہ گیا ہے۔ ان پر چار مرتبہ حملہ کیا گیا ہے جس میں ان کے ۱۵۰
افراد مارے گئے ہیں۔ ہندوستانی سامراجیت کے ایک ایجنٹ سیتیش کمار کو بھی جہنم رسید کیا گیا ہے۔ یہ تمام
اعداد شمار من گھڑت تھے۔ یہ بات جان لو جوہر کر کی گئی کیونکہ اس کے پس پردہ کارفرما جذبہ تخریب کاروں کی
طاقت کے باوجود عوام کو قائل کرنا اور مزید عوام کی حمایت حاصل کرنا تھا۔

دوسرے ہفت روزہ - صدائے حق - کے باوجود ۲۳ فروری کا شمار نمونے کے طور پر میں
پیش کر رہا ہوں۔ اس میں ایک مضمون تھا جو مندرجہ ذیل شعر سے شروع ہوا۔

اٹھ کر آزادی ہی تیرے خواب کی تعبیر ہے
اب ترا عزم جوان ناقابل تفسیر ہے

اس مضمون میں کہا گیا تھا: "جن گناہوں کا بھی نئی لفظ انسان کو سامنا کرنا پڑتا ہے ان میں سے بدترین
گناہ غلامی ہے تو کبھی صاف نہیں کیا جاتا۔ قیامت کے روز چن گندہ گار لا چاڑی کا پہاڑ پیش کریں گے مگر ان کے
اس جواز کو قبول نہیں کیا جائے گا۔ اور گندہ گاروں کو سزا ملے گی۔ انہیں بتایا جائے گا کہ اللہ کے فرمان کے مطابق
ہر قیمت پر آزادی حاصل کرنا ان کا فرض تھا یہاں تک کہ اس مقصد کے لئے اپنی جان بھی خطرے میں
ڈال دیتی۔ مگر ان میں اس عمل کی جرأت نہیں تھی تو وہ اپنی غلام سرزمین کو ترک کر سکتے تھے کسی آزاد ملک میں جاسکتے
تھے تاکہ وہ دشمن پر حملہ کرنے کے لئے ہتھیار بند ہو سکتے۔"

یہ بات ظاہر ہوگی کہ تخریب کاری کی فوجی حکمت عملی کے ایک حصے کے طور پر بے چارے کشمیری مسلمانوں کو
یہ بتانا تھا کہ اگر وہ "کشمیر کی آزادی" کے لئے نہیں لڑیں گے تو ان پر قدرتی قہر نازل ہوگا اور یوم حساب پر انہیں
سزا ملے گی۔ اس میں یہ بھی تجویز پیش کی گئی ہے کہ وہ پاکستان جاتیں ہتھیاروں سے لیس ہٹاؤ لڑنے کے لئے واپس آئیں
تیسرے ہفت روزہ - صدائے کشمیر - نے ۲۵ فروری کے اپنے شمارے میں: "کشمیر کی جدوجہد آزادی
کے بیالیس برس" کے زیر عنوان ایک تبصرے میں لکھا ہے: "۱۹۶۵ء کی ہند پاک جنگ کے بعد ہندوستان نے
کشمیر کو مکمل طور پر یکجہتی کے لئے ہر ممکن حکمت عملی اختیار کی مجاہدین آزادی کو یا تو گولی مار دی گئی یا جیلوں اور
تفتیشی مراکز میں انہیں ضعیف النسل بنا دیا گیا۔ ہندوستانی سامراجیوں کو یہ بجا طور پر مسلم تھا کہ جب تک
کشمیر میں اسلامی قدریں سلامت ہیں۔ اس ملک کو غلام نہیں بنایا جاسکتا۔ چنانچہ انہوں نے اسلام کے
اثر کو زائل کرنے کے لئے کروڑوں روپے صرف کئے۔ شیلی ویشن کو برہمن واد کا پیغام دینے کے لئے برفے
کار لایا گیا بینک کاری اور قرضوں کو عوامی زندگی کا حصہ بنایا گیا۔ حکومت کی طرف سے چلائی گئی شراب کی
دکانوں میں شراب نوشی کی قوصلہ افزائی کی گئی۔ سینما، بالوں اور ریڈیو کی دکانوں کی تو صد افزائی
کی گئی۔ سباحت کے نام پر کشمیر کی عزت و آبرو کو ریزہ ریزہ کر دیا گیا۔ اس کے پس پردہ مقصد کو تلاش
کرنا کیا حال ہے؟ آئین کی دفعات کے قطع نظر ہندوستان کو برہمن واد کے مترادف کہا گیا جس سے ٹی وی ورن

اور دوسرے ذرائع سے ثقافتی یلغار ہوئی تاکہ کشمیر کے تشخص کی اسلامی قدروں کو نیست و نابود کیا جاسکے۔ وادی کی سماجی منہجی اور تمدنی زندگی کے معاملے میں ہندوستان کا آسیب ان قدروں کا گلہ دہار ہے۔ ایسے جذبات ابھارے گئے۔

متذکرہ بالاتین مثالوں سے تخریب کاروں کے بھاری پروپیگنڈہ کا ڈرو واضح طور پر نمودار ہو گیا۔ یہ تینوں روزنامے خفیہ طور پر تقسیم کئے جاتے تھے۔

شاعرانہ، ولولے، مذہبی جذبات، اسلامی شہادت پرستی، جدیدیت کا اثر، خلائی اور حلقہ بگوشی کے استعارات، اسلامی فرائض اور قدیق قبر کا خوف۔ ان سبھی کو اس طرح توڑا موڑا گیا کہ وہ پروپیگنڈہ جنگ کے موافق بن جائے۔ تخریب کارانہ کے دینی باپ اس موقعے میں پختہ یقین رکھتے تھے کہ پروپیگنڈہ ہی عالمی حکم ہے۔

مسجدیں

ریاست میں اقتدار کے ڈھانچے کے قریباً سبھی عضو کو توڑنے موڑنے مقامی اخبارات پر مکمل تسلط جمانے اور اپنی وسیع پروپیگنڈہ مشین کو حرکت میں لانے کے علاوہ اپنی سرگرمیوں کو نشوونما، فروغ اور توسیع کے لئے مسجدوں کا استعمال بھی مکمل کر لیا گیا۔ درحقیقت اپنے کتاچوں دیواری اشتہارات اور بہت روزوں کی تقسیم کے ذریعے ایک اور ہدایت ہم پہنچائی گئی کہ وہ مسجدوں کو اسلامی انقلاب کا مرکز بنائیں اور اس بات کو یقینی بنائیں کہ ان مساجد کا کنٹرول اور انتظام مجاہدوں کے ہاتھوں سونپ دیا جائے۔ مساجد میں نصب طاقتور لاؤڈ سپیکروں سے اپیلیں، نعرے، اعلانات اور پروگرام نشر کئے جاتے۔ اطلاعات ہم پہنچانے رابطے اور مجمع اکٹھا کرنے کے لئے یہ مسجدیں ایک ہم ذریعہ بن گئیں۔ مسجدوں میں پوسٹوں والی مذہبی تقاریب کا مکمل طور پر استحصال کیا گیا اور عوام کو اسلام اور آزادی کے نام پر گراہ کیا گیا۔ یہاں تک کہ کسی مجاہد آزادی کی موت پر خاص نماز جنازہ بڑی بڑی مسجدوں میں ادا کی جاتی اور عوامی ہجون پیدا کرنے کے مقصد سے اشتعال انگیز تقریریں کی جاتیں۔

سرحد کی دوسری طرف سے

سرحد کی دوسری طرف سے پاکستانی لیڈروں اور اخبارات نے کشمیریوں کے جذبات بھڑکانے کیلئے شد و مد سے ہم شروع کی۔ انہوں نے "جدوجہد آزادی کی تحریکوں کے پل باندھے اور وادی میں تخریب کاری کی۔ رفتار کو شدت دی ۱۹۸۹ء کے آخر میں کشمیر میں جدوجہد آزادی کی مدد کے لئے آئندہ کشمیر میں ایک گلیا و جماعتی اتحاد قائم کیا گیا۔ جنوری ۱۹۹۰ء میں اس مقصد کے لئے اسلامی جمہوری اتحاد نے اپنا بھی ایک سیل قائم کیا۔ اس کے

سربراہ قاضی حسین نے کشمیر میں داخل اندازی کی زبردست وکالت کی۔ ۵ جولائی کو اس نے کہا: ہم ایک چھوٹی طاقت سی مگر مسلم ملک ہیں۔ ہم مسلم برادری کے سمندر میں رہتے ہیں۔ ہندو ہماری طرح نہیں۔ برہمن اور اچھوت ملکر کبھی ایک قوم کی تشکیل نہیں کر سکتے۔ کشمیر کے عوام نے پاکستانی پرچم اٹھایا ہے۔ امت مسلمہ کی طرح یہ ہمارا دینی فرض بن جاتا ہے کہ ہم کشمیری مسلمانوں کی حمایت کریں۔

اسی طرح پاکستانی اخبارات نے کشمیر کا مسئلہ اچھا نشانہ کر دیا۔ ۸ جنوری کو ڈان نے اپنے ایک مضمون میں تبصرہ کیا: "حق دہلی کو یہ بات تسلیم کر لینی چاہیے کہ کشمیر اب ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ایک مسئلہ نہیں رہا بلکہ اب مقامی آبادی کی طرف سے ایک بغاوت کی صورت اختیار کر گیا ہے بالکل اسی طرح جیسے عرب کے مغربی ساحل پر فلسطینی انتہادہ ہے۔" "مساحہ مزید قطر اڑے۔" کشمیریوں کو پاکستان کے بھٹکے گرتے پاکستانی افراد سے نہیں بلکہ ان بہادر افغان مجاہدین سے جوش حاصل ہوا ہے جنہوں نے اپنے گھر سے دنیا کی سب سے بڑی فوجی طاقت کو نکال باہر بھیجا ہے۔"

۱۶ جنوری کو اسلامی جمہوری اتحاد نے عوام سے اپیل کی کہ کشمیری مجاہدین آزادی کے لئے مکمل سالیٹ کے اظہار کے لئے ۱۹ جنوری کو روم و عامنائیں۔ اس نے علماء، کونقلین کی کہ وہ کشمیریوں کی طرف سے شروع کئے گئے جہاد کی کامیابی کے لئے خاص نماز کا اہتمام کریں۔

۳۰ جنوری ۱۹۹۰ء کو پاکستان کے وزیر خارجہ صاحبزادہ یعقوب خان نے ایک خاص نشریے میں حق خودارادیت کے حصول کے لئے کشمیر کے عوام کی جدوجہد کو مکمل حمایت کا یقین دلایا۔ یکم فروری کو پاکستان کے دی امور کے وزیر خان بہادر خان نے اعلان کیا: "ہم کشمیر کو آزاد کرنے کے لئے پابند ہیں کیونکہ یہ پاکستان کا خطہ زندگی ہے۔" ۲ فروری ۱۹۹۰ء کو کشمیر کے عوام جدوجہد آزادی کے تین پاکستان کی اتفاق رائے پابندی کے اظہار کے لئے حکومتی اور حزب مخالف لیڈران کی ایک مشترکہ میٹنگ منعقد ہوئی۔ اس میٹنگ میں چار وزرائے اعلیٰ اور وفاقی وزیر بھی شامل ہوئے۔ میٹنگ کی شروعات میں اجلاس مذہب نے نظریہ جٹوکی عدم موجودگی میں یکم نصرت بھٹو نے کہا: "جوں و کشمیر کے عوام کی گونا گوں قربانیوں نے کشمیر کے معاملے میں پاکستانی موقف کو تقویت بخشتا ہے کشمیری عوام بنیادی حق حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ کشمیر میں جاری عوامی بغاوت کی طاقت اور قوت ارادی سے بلاشبہ یہ بات حیاں ہے کہ بہادر کشمیریوں کو ان کے حق خودارادیت سے محروم نہیں رکھا جائے گا اور نہ ہی وہ جدوجہد کی طاقت کے سامنے جھکیں گے۔"

کشمیریوں کے ساتھ یکجہتی اور سالیٹ کے اظہار کے لئے ۵ فروری کو پاکستان بھر میں بڑے پیمانے پر حکومت کی طرف سے شروع کی گئی بڑے پیمانے پر سیاسی جماعتیں شامل ہوئیں۔ بڑی بڑی جماعتوں کی نمائندگی گئی بان پر لکھا تھا: "کشمیر بھٹو نے پاکستان ملک کے تقریباً تمام اہم قصبوں میں عوامی جلسے منعقد ہوئے اور دھواں دار تقریریں کی گئیں۔ لاہور میں ایک ایسے ہی اجتماع میں جماعت اسلامی کا لیڈر گر جیل: "ہندوستانی فوجوں نے کشمیر کا حاصرہ

کر لیا ہے۔ مگر انہیں شاید معلوم نہیں ہے کہ جہاد کے جذبے کو دبانے والا بتیجہ آج تک ایجاد نہیں ہوا ہے۔ جنرل افضل بیگ بھی خاموش نہیں بیٹھا۔ اس نے کہا: "کشمیر کے بدلے ہونے منظرے ہمارے لئے نئے چیلنج پیدا کر دیے ہیں اب ہمارے سامنے نئے فریضے اور نئے مشن ہیں۔ اس سے اگلے روز وزیر مملکت برائے دفاع کرنل (ریٹائرڈ) جی ایس چیمہ نے کہا: "کشمیر کے بغیر پاکستان نامکمل ہے۔"

۱۰ فروری کو بیگم بے نظیر بھٹو نے پاکستان پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں ایک بحث شروع کی۔ اس نے کہا: "کشمیر میں موجودہ گزٹروہال کے عوام کا حصول آزادی کے لئے مصمم ارادہ ہے۔" "کشمیر کے اندر یہ آگ گزشتہ ۴۲ برسوں سے شلگ رہی تھی۔ یہ انقلاب ایک نسل سے دوسری نسل تک ورثے میں ملا ہے۔"

بیگم بھٹو نے "کشمیر اور شرقی یورپ میں آزادی کی جدوجہدوں کے درمیان موازنہ کیا۔ اس نے کہا: "جب تمام دنیا آزادی کی لہر کی لپیٹ میں ہے تب کشمیری بھی ہندوستان کے غیر قانونی اور غیر آئینی نظام کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔" "کشمیر میں یہ آگ ۴۲ برسوں سے شلگ رہی ہے اور ایک نسل سے دوسری نسل تک چلتی آ رہی ہے۔" "کشمیر یوں کی قربانیاں رائے کال نہیں جائیں گی۔ پاکستان کشمیر یوں کے حق خود ارادیت پر کبھی سمجھوتہ نہیں کرے گا۔" "ہندوستان نے وعدہ خلائی کی ہے اور وہ اپنے قول سے ٹکر گیا ہے۔"

"کشمیر یوں کو شہید گردانتے ہوئے اس نے کہا: "کشمیر میں گولیوں کی گونج ہے۔ عوام ایک نئی تاریخ لکھ رہے ہیں وہاں پر بچتے ہوئے خون کے ہر قطرے کے ساتھ ایک نیا جہاد آزادی پیدا ہو رہا ہے۔"

پاکستان کی تشویش کو حق بجانب قرار دیتے ہوئے اس نے کہا: "پاکستانیوں کے کشمیر یوں کے ساتھ خون کے رشتے ہیں۔ تاریخی، جغرافیائی اور تمدنی یکسانیت ہے اسی لئے تو سالمیت جتنے کے دوران پاکستانی عوام نے کشمیر یوں کے ساتھ مکمل یکجہتی کا مظاہرہ کیا ہے۔"

سرگرم امداد

پاکستان نے نہ صرف اخلاقی، سیاسی اور پروپیگنڈہ کے ذریعے وادی میں تحریک کاروں کی مدد کی بلکہ جیسا کہ اس نے خود ہی اعتراف کیا ہے انہیں گوریلا جنگ کی تربیت بھی دی اور عہدہ فوجی و جنت گردی کی ٹیکنیک سے آراستہ کیا۔ پاکستانی مقبوضہ کشمیر اور پاکستان میں دستوں کے دستوں کو تربیت فراہم کی۔ اعلیٰ ساخت کے ہتھیار اور نقدی فراہم کی گئی۔ بھرتی تعلیم اور تربیتی کے لئے ایک مضبوط اور خفیہ جال قائم کیا گیا، انھوں میں غلام محمد وادی اور مظفر آباد میں راجہ ظفر کی رہائش گاہوں کے علاوہ چکھوٹی، ٹلوری، نوشہری، دوڈیالا، کھیل، کمری اور مٹی مرگ میں فیملڈ اینٹی جیسروٹ کی بیریگیں بھی اس مقصد کے لئے بنیاد کے طور پر بروئے کار لائی گئیں۔ اس مقصد کے لئے ایک ثبوتی حکمت عملی طے کی گئی تاکہ اس بات کو یقینی بنایا جاسکے کہ آخر کار کشمیر ایک پختہ سبب کی طرح پاکستان کی جھولی میں آکر رکے گا۔

اس طرح ایک ریاست کے اندر ریاست کا کم کر رہی تھی۔

تعاون اور رابطہ

یہ ترتیبی مراکز پاکستانی مقبوضہ کشمیر اور پاکستان دونوں مقامات پر تھے مگر تھوڑی سرگرمیوں کا مرکز پاکستانی مقبوضہ کشمیر میں ہی رہا۔ یہ اس لئے کیا گیا تاکہ پاکستان کے براہ راست ہاتھ ہونے کے ثبوت کو راز میں رکھا جاسکے۔ امان اللہ خان، ڈاکٹر فاروق حیدر، راجہ ظفر علی اور جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ کے دوسرے لیڈروں کو کاروائیاں کرنے کی کھلی اجازت تھی۔ یہ بات ظاہر کی گئی کہ ہتھیار خفیہ اسلحہ بازار سے اور یہاں تک کہ افغان مجاہدین سے خریدے جا رہے ہیں۔ حکومت آزاد کشمیر کی نیم حکومتی اور حکومتی ایجنسیوں کی خدمات بھی دستیاب کی گئی تھیں۔

وہ تمام ۴۲ تنظیمیں جن کی تصویر میں نے اس باب کے آغاز میں وضع کی ہے کو وسیع طور پر دو زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک گروپ آزاد اور خود مختار گروپ کے لئے کام کر رہا تھا اور دوسرا پاکستان کے ساتھ الحاق کے لئے پہلے زمرے کی اہم تنظیمیں جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ اور دوسرے زمرے میں حزب المجاہدین شامل ہیں۔ جے کے ایل ایف کے چیرمین امان اللہ خان کے الفاظ میں فرنٹ کا نصب العین یہ ہے کہ ہم ناقابل انکار حقائق اور محسوس وجوہات کی بنا پر یقین رکھتے ہیں کہ جموں و کشمیر کی ریاست کی معلوم تقسیم شدہ اور دہلی چلی ریاست کی مکمل آزادی اور دونوں حصوں کو دوبارہ یکجا کرنا شاید مسئلہ کشمیر کا بہتر حل ہے اور عملی حل ہے۔ یہ حل نہ صرف کشمیر بلکہ ہندوستان اور پاکستان کے چیرمین مفادات میں ہے۔

پاکستان کی آئی ایس آئی کا جس کا وہ قدرتی طور پر حزب المجاہدین اور ایسے خیالات کی دوسری تنظیموں کی جانب تھا جو لوگوں ان تنظیموں کے ذریعے آتے انہیں فراخ دلانہ امداد دی جاتی زیادہ مہلک اور اسلحہ ساخت کے ہتھیار دیے جاتے۔ جبکہ جموں و کشمیر کے طور پر جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ کے ذریعے آنے والے نوجوانوں کی بھی امداد دی جاتی مگر آخر کار ان کا لشکار آزادی نواز تنظیموں کی بجائے پاکستان نواز تنظیموں کے بالادستی قائم کرنا تھا۔ بہر حال خودی اولیت رکھتی کشمیر کو انڈین یونین سے باہر کیا جائے۔ بہر کیف دونوں صورتوں میں اسلام مشترکہ امر تھا۔ ایک ذمہ خود مختار اسلامی جمہوریہ کشمیر کا قیام چاہتا تھا جبکہ دوسرا مزہ چاہتا تھا کشمیر اسلامی جمہوریہ پاکستان کا حصہ ہے۔

ایک مرحلے پر پاکستان کی آئی ایس آئی مختلف گروپوں کو یہ بات منوانے میں کامیاب ہو گئی کہ وہ جماعت اسلامی کے لیڈر سید علی شاہ گیلانی کی رہائی میں اپنی سرگرمیوں میں رابطہ پیدا کریں یہی وجہ ہے کہ جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ حزب المجاہدین اور اللہ نائیکس کی طرف سے متعدد مشترکہ اشتہارات شائع کئے گئے ہیں۔ اتحاد المسلمین پر زور دیا گیا۔ بیشتر اشتہارات پر ایک شعر لکھا ہوتا جس کے معنی تھے۔

”اللہ ایک ہے، مقدس مقام ایک ہے، قرآن ایک ہے اور اس بات کو بھی یقین بنایا جائے گا کہ مسلمان بھی ایک ہو جائیں۔“
 ”تحریک ترمیم کشمیر کے نام سے گیارہ تحریب کا تنظیموں کی رابطہ کمیٹی کا قیام مختلف تنظیموں میں اتحاد پیدا کرنے کے لئے ایک اور قدم تھا کشمیر پارلیمنٹری ایجنٹ کا صدر میاں عبدالقیوم اس کا صدر منتخب کیا گیا۔“

اپریشن ٹوپیک

مجھے ان اطلاعات اور اخباری رپورٹوں کو دیکھنے کا موقع ملا جسے اپریشن ٹوپیک (OPERATION TOPIC) کہا جاتا ہے۔ اس اپریشن کا تصور صدر پاکستان آجہاںی جنرل ضیاء الحق سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس پر رو بہ عمل کا کام پاکستانی فوج فیڈرل انشٹیٹیوٹ جس یونٹ رائف آئی یو کے سپرد کیا گیا۔ اس اپریشن ٹوپیک کا بنیادی نصب العین کشمیر کو پاکستان کا مقصد بنانا تھا جو ۴۸-، ۴۹-، ۱۹۶۵ اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں سے حاصل نہیں ہوا۔
 انجین ساری تحریب طاقت اور مذہبی بنیاد پرستی کے ذریعے حاصل کیا جانا تھا۔
 اپریشن ٹوپیک پر تین مرحلوں میں عمل کیا جانا تھا۔ مرحلہ اول میں اقتدار کے ڈھانچے کے سبھی اجزاء میں دراندازی کر کے ان کی اندرونی تحریب مقصود تھی تاکہ رجعت پسند بوڑھوں اور والد دوست نظام اقتدار قائم کرنا پولیس، عام خدمات اور انتظامی مشینری کے دوسرے مضامین نہایت شماری کے ساتھ وسیع تر دراندازی لانا۔ اس بارے میں احتیاط یہ رکھنا کہ جب تک مکمل اندرونی گڑبڑ اور پاکستانی افواج کے داخل کی حد پہنچنے تک ہنگامہ بازی و دخل اندازی سے احتراز کرنا طلب اکوا مشترک حاصل کرنے پر خاص توجہ دینا اور مقصد کے لئے ان کے مذہبی جذبات کو بھڑکانا۔

مرحلہ دوم میں ہندوستانی فوج پر سیاہن، مکرگنل اور دوسرے نازک علاقوں میں دباؤ بڑھانا تاکہ کم رفتار شدت پسندی اور اندرونی تحریب کاری سے نکلنے کے لئے اس کے پاس فالتو صلاحیت نہ رہے۔
 مرحلہ سوم کے تحت تیار کردہ اور مزہب مومن جیسی فوجی مشقوں کے لئے تیاریاں کرنا تھیں اور پورا اندرونی تحریب کاری کو تیز کر کے اور سرحد پار سے حملہ کر کے دہلی کشمیر کو حاصل کرنا یہ سب جنرل ضیاء نے چند اے گئے فوجی کمانڈروں انشٹیٹیوٹ جس یونٹ کے سینئر اہلکاروں کو بتایا۔

شریف النفس حضرات! اس بابت میں پہلے ہی تفصیلی بات چیت کر چکا ہوں چنانچہ میں تفصیلات بیان نہیں کروں گا۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ افغانستان میں ہم اسلام کی خدمت میں معروف عمل ہیں۔ چنانچہ

+ تہران ریڈیو سے نشر شدہ تقریر کے تحت جو ۱۹۸۶ء کو نشر کی گئی۔

میں یہ منصوبہ پہلے آپ کے سامنے نہیں رکھ سکا۔ اس بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی چاہیے کہ نشانہ بالکل واضح اور نکتہ ہے۔ وادی کشمیر کو آزاد کرانا۔ ہمارے مسلم برادران اب زیادہ دیر تک ہندوستان کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ ماحمی میں ہم نے پہلے نامکمل فوجی راستے اختیار کئے چنانچہ ہمیں ناکامی ہوئی چنانچہ جیسا میں نے پہلے کہا ہے کہ فوجی دستہ ہمارے لئے آخری لمحہ کے لئے وقف ہو گا اور کبھی یہ ضروری ہو تو اسے ضرب کاری کے لئے استعمال کیا جائے گا کشمیر یوں کی عام حفاظت کے بارے میں جنرل ضیاء نے مندرجہ ذیل مشاہدات کئے۔

”وادی کشمیر میں ہمارے برادران گو ذہن و قلب سے ہمارے ساتھ ہیں مگر یہ سادہ لوح عوام جنگ کے ان طور پر یقین کو نہیں اپنا سکتے جنہیں پنجابی یا افغان غیر ملکی غلبے کے خلاف اپنا سکتا ہے بہر کیف کشمیر یوں میں وہ خصوصیات ہیں جن کا استعمال ہم کر سکتے ہیں۔ اول وہ ذہین اور تیز دماغ ہیں دوسرے وہ دباؤ میں اپنا آپ محفوظ رکھ سکتے ہیں اور تیسرا اگر میں یہ کہوں کہ وہ سیاسی سازش میں ماہر ہیں تو غلط نہیں ہو گا۔ اگر ہم انہیں ذرا تیز کر دیں جن کے سبب وہ اپنی ان خوبیوں کو بروئے کار لا سکیں تو وہ ہمارے کام آئیں گے۔ ہر طور پر قسم کے طرز جنگ میں انتہائی طاقت کی غنور میں ہوتی خاص طور پر کشمیر جیسی صورت حال میں یہ بات صادر آتی ہے۔ جنرل ضیاء نے کشمیر کے خاص حالات کا ذکر کیا اور ہندوستانیوں کی جو صلہ شکنی کرنے اور انہیں بدنام کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ اس نے کہا۔“

ہمیں جنگ کے وہ طور طریقے بروئے کار لانے ہیں جو کشمیری ذہن کے لئے قابل فہم ہوں اور وہ ان کے ساتھ چل سکتا ہو۔ دوسرے لفظوں میں اخلاقی اور جسمانی ذرائع کا مربوط استعمال فوجی راستے کے علاوہ دوسرے تمام وہ راستے اختیار کرنا جس سے دشمن کی قوت ارادی نیست و نابود ہو جائے یا اس کی سیاسی صلاحیت کو زکد ہو جائے اور دنیا کے سامنے اسے جابر کے طور پر عیاں کرے۔“

جنرل ضیاء نے اپنی حکمت عملی کا لب و لہجہ ان الفاظ میں بیان کیا۔ پہلے مرحلے کے طور پر اگر ضروری ہو تو ایک دو برس تک کشمیری برادران کی سیاسی تحریب اور سازش کے ذریعے اقتدار کے ڈھانچے پر قبضہ کرنے کے لئے ہم مدد کریں گے۔ ظاہر طاقت ان لوگوں کے ہاتھ میں رہنی چاہیے۔ جو نئی دہلی کے منظور نظر ہیں۔ چنانچہ ہمیں اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ حکمران لوٹے سے چند منظور نظر سیاست دانوں کو منتخب کیا جائے جو ریاست کے تمام موثر افسو کو تباہ کرنے میں ہماری مدد کر سکتے ہیں۔“

اپنے منصوبہ اور خفیہ نام اپریشن ٹوپیک کے مختلف مرحلوں کو الگ الگ بتائے ہوئے جنرل ضیاء نے کہا۔

+ ملاحظہ ہو انٹرنیشنل ریفرنس ریلوے۔ جولائی ۱۹۸۹ء صفحات ۳۸-۳۵

+ - ایضاً

مرحلہ اول

حکومت کے خلاف کم سطحی بغاوت تاکہ یہ محصور رہے مگر یہ ڈھانچہ ہرگز سمار نہ ہو کیوں کہ اس مرحلے پر ہم نہیں چاہیں گے کہ نئی دہلی کی طرف سے مرکزی حکومت انتظام سنبھال لے ہم اپنے افراد کو کلیدی عہدوں پر چاہتے ہیں کہ وہ پولیس فورس مالی اداروں اور مواصلاتی ڈھانچے اور دیگر اداروں میں تخریب پیدا کریں۔ طلبہ اور کسانوں میں ہم ہندو مخالف جذبات پیدا کریں۔ ترمیمی طور پر دنگوں اور حکومت مخالف مظاہروں میں ان کے سرگرم حمایت کو یقینی بنائیں۔ تخریب کار عناصر کو منظم کر کے انہیں وادی میں موجود دیم فوجی دستوں کے ساتھ ابتدائی طور پر جھڑپوں میں تربیت فراہم کریں۔ جوں اور کشمیر اور لداخ کے درمیان طاقت کے استعمال کے بغیر رازداری کے ساتھ مواصلاتی سلسلے کو منقطع کر دیں نہ جیلا سے گرگی اور کھار دنگ لاسٹوک پر ہماری خاص توجہ ہونی چاہیے۔ وادی سے توجہ ہٹانے کے لئے سکھ انتہا پسندوں کے ساتھ اشتراک سے جوں میں دہشت اور افراطی پھیلائیں اور اس نازک مرحلے پر ہندو ذہن میں بھی حکومت کو پامال کر دیں۔ وادی میں ان حصوں پر قریب تسلط جمالیں جہاں ہندوستانی فوج تیناٹ یا موجود نہیں اس قسم کا ایک خط جنوبی کشمیر کا علاقہ ہو سکتا ہے۔

مرحلہ دوم

سیاحن، گرگل اور اجوری پونچھ سیکڑوں پر زیادہ سے زیادہ دباؤ ڈالیں تاکہ ہندوستانی فوج محفوظ صفوں کو وادی سے باہر استعمال کرنے پر مجبور ہو جائے سری نگر پٹن پکواڑہ بارہمولہ بانڈی پور اور چوکی بل میں واقع بنیادی ڈپو اور صدر مقام تباہ کر دیئے جائیں اس مقصد کے لئے متعینہ وقت پر غیہ کار وائی کی جملے تب چند افغان مجاہدین کو آزاد کشمیر میں آبلو کیا جائے تاکہ وہ ہمارے ریسورس کے دائرے کو وسیع کرنے کے لئے متعینہ علاقوں میں دراندازی کریں اس پہلو کے لئے تفصیل اور واضح منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ اپریشن جیراٹر (۱۹۶۵ء) کی ناکامی ہمیں کافی سبق سکھاتی ہے۔ آخر کار متعینہ ریشٹرا فزوں کے تحت ایک خاص فورس جس میں آزاد کشمیر اور خطرناک افغان شامل ہوں ہوائی اڈے ٹریڈ یوشین تباہ کرنے اور بارہمولہ مرنگ اور گرگل لیڈر مرکز بند کرنے کے لئے تیار اپریشن پنجاب کے ایک متزہ مرحلے پر جوں کو تخریب کا حقہ علاقے ہماری جارحانہ کاروائیوں کے سب سے زیادہ دباؤ کے تحت لائے جائیں۔

مرحلہ سوئم

اس کے بعد وادی کشمیر کو آزاد کرانے اور ایک آزاد اسلامی مملکت کا قیام کے لئے اہم اقدامات متیرے مرحلے کے طور پر رکھے جائیں گے۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ یہ منصوبہ ایک مفصل خاکہ تھا جسے کافی غور و خوض کے بعد ترتیب دیا گیا تھا اور سیاسی اور فوجی اعتبار سے اس میں ہماری وزن تھا۔

مرحلات دوم و سوم کو رو بہ عمل لانے کے معاملے میں پاکستانی حکام کو کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی سیاحن کرگل اور دوسرے نازک علاقوں پر کوئی خاص دباؤ نہیں ڈالا گیا۔ نہ ہی فوجی ڈپو اور تنصیبات کو ہاتھ لگایا جاسکا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستانی افواج نہایت چوکس تھیں چنانچہ انہیں جیشٹرا نہیں جاسکا مگر سول انتظامیہ میں صورت حال بالکل مختلف تھی۔ یہاں پر اپریشن ٹوپیک کو اس کے خالقوں کی توقعات سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی منظم طور پر تمام تر حکومتی ڈھانچے میں تخریب کی گئی جیسا کہ میں نے اس باب اور باب ہشتم میرے آنے سے قبل حالات میں لکھا ہے کہ حکومت کے تمام اہم محکموں میں تخریب کاروں کی مرضی پر عمل ہوتا تھا ریاست کے سیاسی اور انتظامی ڈھانچے میں قدامت پسند اور ہمدرد عناصر نے اس تخریب کو آسانئ گن ہی نہیں بنایا بلکہ اس معاملے میں ملی جگت بھی کی۔ ان میں سے چند عناصر کھلے طور پر پاکستان نواز تھے دوسرے وقت آنہ وہ غیظ پر ابھرتے چند انتہا تھے اور ڈبل دیکھنٹوں کا رول ادا کر رہے تھے تاکہ اس فرق سے جا ملیں جس کو فتح و کامرانی حاصل ہو رہی ہو۔ اندرونی تخریب کاری کو روکنے اور اس کا مقابلہ کرنے کے لئے شاید ہی کوئی شخص تیار تھا۔ تخریب کے بیج برسوں سے بونے جا رہے تھے اور جیسا کہ ابواب سوئم سے ششم تک درج ہے اس کی جڑیں گہری تھیں حالات سازگار تھے جنرل ضیاء الحق اور عبدالزاں بیگ نے نظر بھٹونے اس صورتحال کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔

بعض حلقوں میں یہ شہید ظاہر کیا گیا ہے کہ آیا اپریشن ٹوپیک کی تشکیل واقعی پاکستانی حکام نے کی تھی۔ کیونکہ پاکستانی حکام نے اس کے وجود سے انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ تحقیقی اور تجرباتی شیعہ راو (RAW) کی کارستانی ہے۔ یہاں یہ بات اہمیت کی حامل نہیں کہ آیا اس منصوبے کا تصور اور اس کی تکمیل پاکستانی حکام نے کیا یا تحقیقی و تجرباتی شیعہ یا ہندوستانی حکومت کے کسی اور شعبے کی طرف سے حالات کی مثالی صورت کا خاکہ ہے۔ یہاں پر کلیدی بات یہ ہے کہ اس قسم کی تخریب کی نوعیت اور طرز عمل کی بابت مرکزی حکومت واقف تھی مگر اس نے کچھ نہیں کیا۔ اس کی بنیادی ناقابل معافی ہے۔ موجودہ طوفان خون خرابہ اور مصائب اور جن خطرات کا ملک کی سالمیت کو آج کل سامنا ہے انہیں معمولی سی چوکی اور بروقت کاروائی سے ٹالا جاسکتا تھا مگر مہتمی سے ملک اُن لوگوں کے ہاتھ میں تھا جن کا کوئی نظریہ نہیں تھا اور جن کے ذہنی نابینا بن کا مقابلہ محض ان کی دھوکے بازی اور اقتدار غرور کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔

کشمیری دہشت گردی ایک نمایاں استخراج

کشمیری دہشت گردی کا قیام کے لئے اہم اقدامات متیرے مرحلے کے طور پر رکھے جائیں گے۔

سے مختلف عناصر کی آمیزش سے ایک نمایاں استخراج پیدا کیا ہے۔

دہشت گردی کی سب سے مستند تعریف ایک وہ بھی ہے جو امریکہ کے فکرمخارجین نے متعین کی ہے۔ اس کے مطابق دہشت گردی میں سیاسی مقاصد کے لئے افراد یا گروہوں کی طرف سے تشدد کی دھمکی شامل ہوتی ہے اور ان کا مقصد نشانہ شدہ گروہ کو فوری طور پر نشانہ بنانے کی بجائے مہربان کرنا اور حیرت میں ڈال دینا ہوتا ہے خواہ یہ گروہ وقت کی حکومت کے حق میں یا مخالف کام کر رہے ہوں۔

مگر اس تعریف کے دائرے میں کئی دہشت گردی کے تمام پہلوئیں آتے ہیں۔ یہاں دہشت گردی زیادہ تر قومی ملک پاکستان کی طرف سے شروع کی گئی ہے اور ان طاقتوں نے اس کو ہوا دی ہے جنہیں افغانستان کے واقعات کے بعد کھلا چھوڑ دیا گیا ہے۔ مقتدر طور پر اسلامی دہشت گردی کی روایات کا استعمال جو بی نظیر منصوبے کی تکمیل کے تحت کیا جاتا ہے۔ جہاں تک زمین پر کی جانے والی کارروائیوں کا تعلق ہے۔ اس میں ماؤتے سنگ اور چی گوارا کے تصورات کو خالصتہ سے مستعار لیا جاتا ہے۔ ایرانی اور الجیرائی انقلابات اور فلسطینی تنظیم آناری کی جدوجہد کی مثالوں کو اکثر ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔

اس سچائی کی ایک مثال میں۔ راجہ محمد مظفر کے راہبرانہ خطوط کے کتابچے سے دوں گے جو بے بیڈ کے بریٹن فرنٹ کی طرف سے اپنا راکٹیں کو جاری کیا گیا ہے۔ اس کا عنوان ہے "آزادی یا شہادت"۔ اس میں جمہوریت آزادی کے لئے مفصل ہدایات درج ہیں ان پر سختی سے پابند رہنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ یہ ہدایات جو عام طور پر گوریلا اور زیر زمین سرگرمیوں سے متعلق ہیں۔ عام طور پر ماؤتے سنگ کے مشہور مضامین کی آدھور ترجمہ ہیں۔ ان میں "جب دشمن پیش قدمی کرتا ہے" ہم نیچے ہٹ جاتے ہیں دشمن کے فیوں میں ہم ہر س پھیلاتے ہیں۔ اور جب دشمن ٹھک جاتا ہے تو ہم بیلغا کر دیتے ہیں اور جب دشمن پسپا ہو جاتا ہے تو ہم اس کا لقمہ قہر کرتے ہیں۔ اور چی گوارا کے ضابطے کے مطابق ہر ایک جمہور آزادی کو سخت متاثر کرنا کرنا چاہیے۔ اس میں سخت ضبط النفس ہونا چاہیے۔ اور وہ مقامی آبادی کو گوریلا طرز جنگ سکھائے تاکہ اسے بناوٹ کی حمایت کے فائدے معلوم ہو سکیں۔ مسجدوں اور دینیات کو مرنے کو لانے کی بات ایرانی انقلاب سے لی گئی ہے۔ اس ذرائع سے یہ پروپیگنڈہ بھی جنم لیتا ہے کہ کھوان ٹولڈر اسرائیلی طور پر عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہا ہے اور عوام کو عزت کے غرور میں ڈھکیا جا رہا ہے اور انہیں تمام قسم کی سماجی اقتصادی اور انتظامی نا انصافیوں کا شکار بنایا جا رہا ہے جو مسکری اسلام کے خلاف ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ کئی دہشت گردی مختلف اقسام کا امتزاج ہے۔ تحریک کاروری اور ٹوڑ پھوڑ کے طرز عمل کو ہر جانب سے حاصل تجربات کی بنا پر طے کیا گیا ہے بنیاد پرست جنون کا عنصر کارکنوں کا حوصلہ برقرار رکھنے کے لئے متواتر بھرا گیا تاکہ وہ اپنے لئے دعویٰ حمایت کا جذبہ پیدا کر سکیں۔ اس طرز عمل کو ہر فوجی نشانہ ناقابل چوک نزاکت اور وقت کے عین احساس کے ساتھ عمل پیرا کیا جاتا ہے اور بے اثر اور مغلوب بدخالف کا

اس طرح ایک جانب تحریک کاروری اور دہشت گردی کا ایسا منصوبہ تھا جس کو اچھی طرح طے کیا گیا تھا اور اس پر خوش اسلوبی سے عمل کیا جا رہا تھا اور دوسری طرف ہندو ہن لوگ اپنے ہی خالوں کی جنت میں رہ رہے تھے جبکہ زمین پر دوسری جنت ان کے ہاتھوں سے کھسکتی جا رہی تھی۔

ضیاء اور راجیو: دو متضاد نظریات

۱۹۸۳ء میں جب میں اقوام متحدہ اقتصادی پروگرام کی امداد سے مکانات اور شہری ترقیات کی کانفرنس میں شرکت کے لئے کراچی گیا تو مجھے صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق کے ساتھ ملاقات کا اتفاق ہوا۔ خاص طور پر دارالحکومت اور عام طور پر تاریخی شہروں کے مسائل پر تبادلہ خیالات کے لئے اس نے مجھے دعوت دی۔ مجھے اس کی شکل مزاج یا حکمت شخصیت نے نہایت متاثر کیا جسے کسی مسئلے کی گہرائی کو سمجھنے کی پوری صلاحیت اور اسے دوبارہ عمل لانے کا پورا پورا وقت تھا میرے ساتھ تبادلہ خیالات قیسل انہوں نے میری کتاب "سی بلڈنگ شاہجہاں آباد والا ڈی آف دہلی" کے کم از کم چند صفحات ضرور پڑھے تھے۔ انہوں نے امریکہ کو میں کراچی ڈیو پلیمینٹ اتھارٹی کے سینئر افسروں سے تبادلہ خیالات کروا کر لاہور دیواروں سے گھرے شہر کو دور کروں۔ دوسری طرف جب مجھے راجیو گاندھی کے ساتھ جموں و کشمیر کے اہم اور نازک ترین مسائل پر تبادلہ خیالات کرنے کا موقع ملا تو میں نے دیکھا کہ وہ جلد ہی میں تھا اس میں بیونس آئرس سطحیت کا رجحان تھا جو ٹھوس دستاویزات پر مبنی نوٹ کی بجائے شمسائی باتوں اور سرگوشیوں پر زیادہ انحصار رکھتا تھا۔ اس کا تمام اثر انداز فکر چند شخصیات کے اندازوں پر مبنی ہوتا جو ان لہروں اور شکلیں لہروں کو ملحوظ خاطر نہیں رکھتے تھے۔ جن کے سبب وادی میں ایک نیا سماجی اور سیاسی منظر ابھر رہا تھا۔

پاکستان اور ہندوستان میں ارباب اختیار دو افراد کے مزاج اور نظریات کی خالف تعبیر اسے واقعات سے عیاں ہو جاتی ہے جو خاص طور پر وادی میں مارچ ۱۹۸۷ء کے بعد رونما ہوئے۔ جبکہ ضیاء اور اس کے افسر و سربراہی جس کے معاونین ایک تفصیلی حکمت عملی پر نہایت سخت کے ساتھ عمل کر رہے تھے تو راجیو گاندھی اور اس کے گرد و پاس کے حواریوں میں اس کی نوعیت کو سمجھنے اور اس کے انداز و اقدامات لینے کے لئے قوت ارادی کا فقدان تھا۔ کسی بھی تجویز یا وارننگ کو یا تو ٹھکرا کر ٹال دیا جاتا یا جھوٹی یقین دہانیوں سے خاموش کر دیا جاتا تھا۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ جو وادی میں راجیو کا آدمی تھا۔ خیالات اور اعمال و انفعال کے معاملے میں بالکل کور تھا اور اس کا یہ خیالی بن اور نئی دہلی کی بے اعتنائی اور لا پرواہی تباہ کن ثابت ہوئے۔ میرے لئے تو یہ ایک گھٹن بھر منظر تھا۔ راجیو گاندھی اور اس کے حواریوں کے اعمال کے لئے شدید ہی کوئی جواز موجود تھا۔ درحقیقت میرے ذہن میں شدید شکوک دوسرے پیدا ہونا شروع ہو گئے تھے کہ آیا وہ صورت حال کو اس لئے مزید دگرگوں ہونے کی اجازت دے رہے تھے کہ ہند پاک سرحد یا وادی میں انہیں

کسی سخت کاروائی کا بہانہ مل جلے یا جنوری۔ فروری میں ۱۹۹۰ میں ہونے جبار رہے انتخابات کے پیش نظر وہ خاموشی اختیار کئے تھے۔ بنیادی مقصد یہ تھا کہ کانگریس راہی کے حق میں لہر پیدا کی جائے۔ مگر چند ایک واقعات کے موجب وہ دھوکہ کھا گئے۔ انتخابات کی تاریخوں کو پیشگی کر دیا گیا اور متوقع کاروائی بعض اندازوں کے دائروں تک محدود رہی۔

بدقسمتی سے ”لہروں کا طرز ظہور ہمارے سیاسی ڈھانچے کے لئے ایک لعنت ثابت ہو رہا ہے۔ قوم کی صدقلانہ، دیانتدارانہ اور ترقی دہی سے خدمت کی، بجائے مصنوعی طور پر پیدا شدہ حالات اور سطحی واقعات پر زیادہ انحصار رکھا جا رہا ہے۔

بعض اوقات جیسے حیرت ہوتی ہے کہ کیا راجیو گاندھی اور ڈاکٹر فاروق عبداللہ کا واقعی کوئی قصور تھا۔ آخر دونوں اس سطح کی علامت تھے جس کا ہندوستان کی سیاسی نفسیات پر غلبہ رہا ہے۔ کیونکہ جو لوگ راجیو گاندھی کے بعد نومبر ۱۹۸۹ء میں برسرِ اقتدار آئے وہ بھی کوئی بہتر لوگ نہیں تھے۔ وہ بھی اسی نفسیت کی پیداوار تھے اگرچہ ان کی سطحیت انہیں مختلف سمت میں لے گئی۔ انہوں نے کنفورٹن اور تصناد گرداب پیدا کئے۔ اور نہ صرف اپنے لئے بلکہ ان لوگوں کے لئے بھی مسائل پیدا کر دیئے جو کثیر کو بدبخت گروی اور تخریب کے پیچیدہ جال سے باہر نکالنے میں محاذ و ممدد کا ثابت ہو نا چاہتے تھے۔

باب گیارہ

اسمبلی کی تحلیل

”خدا کے نام پر آج بڑھو“
سکرام ویل

جنوری ۱۹۹۰ء کے اختتام تک ریاستی قانون ساز اسمبلی کی تحلیل کا معاملہ میری فہرست کار میں بالائے تر تھا۔ مجھ پر یہ بات بالکل واضح ہو چکی تھی کہ جب تک یہ قدم نہ اٹھایا جائے گا انتظامیہ کی لگام کو واپس حاصل کرنے کی راہ میں بھاری تعداد میں لوگ ہلاک یا زخمی ہوں گے۔

عوام کی ایک بھاری تعداد کا یہ اعتقاد تھا کہ مارچ ۱۹۸۸ء کے انتخابات میں دھاندلیاں سرزد ہوئی ہیں آیا یہ معاملہ درست تھا یا غلط یہ جزوی طور پر صحیح تھا جزوی طور پر غلط تھا مگر اس کے نتیجے میں عوام کے درمیان ایک شدید جذبہ پیدا ہو چکا تھا اور عوام یہ محسوس کرتے تھے کہ بھاری پیمانے پر دھاندلیاں سرزد ہوئی ہیں اور ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے عوام کی سیاسی امنگوں کا گلہ دبا دیا ہے۔

ان نتائج اور ان پہلوؤں کے مدنظر جن کا ذکر میں اسے قبل کے ابواب میں کر چکا ہوں عوام کے چہروں پر غصہ عیاں تھا اور ان کے دلوں میں جنون تھا۔ اسے اس بات کا یقین تھا کہ اس جنون و غصے کو اسی صورت میں نکالا جاسکتا ہے جب اسمبلی کو تحلیل کر دیا جائے۔ یہ قوم بندوق کے کلچر کا جو اثر ہی ختم کر دے گا۔ اس سے وہ چکاری ہی ختم ہو کر رہ جائے گی جس کی وجہ سے بدانتظامی پیدا ہوتی ہے جو بدبخت گروی کی اجتماعی کاروائیوں اور انفرادی افعال کا موجب بنتی ہے۔

میں نے اس موضوع پر اپنے جذبات کو پوشیدہ نہیں رکھا۔ یہاں تک کہ صدر جمہوریہ ”نائب صدر وزیراعظم اور وزیر داخلہ کو ۳۰ جنوری کے اپنے خط میں اس سے وقف کر دیا تھا جو صدر جمہوریہ کو ارسال کیا گیا تھا اور اس کی نقول دیگر حضرات کو ارسال کی گئیں۔ ان میں اس بحران سے نکلنے کے لئے میں نے چھ اقدامات کی نشاندہی کی تھی۔ ان میں سے ایک تھا۔

۱۰ ریاستی اسمبلی کو فوری طور پر تکمیل کر دیا جائے اور چھ ماہ یا اتنے ہی عرصے میں انتخابات کر لئے جائیں۔ اس وقت تک تجزیہ کارانہ امر کا قلع قمع کر لیا جائے۔ اور وہ بھی انتخابات میں شرکت کو اولیت دیں گے۔ مختلف مذاہم ایک دوسرے کے ساتھ توازن قائم کریں گے۔ ایک نئی لیڈر شپ اُبھرے گی جو مرکز کی حمانی ہونے کے علاوہ اُسے عوام پر اثر و رسوخ کی بجائے حمایتی ہوگی اور وہ اس قدر راشی نہیں ہوگی جس قدر سابقہ نظم تھا:

اس معاملے میں مختصر ملاحظہ فی حل تلاش کرنا خود کفی کے مترادف ہو گا۔ کیونکہ اس کا نہراہم اعضا میں گہرا ریس چمکا ہے جب تک پہلے اس نہر کو نکال باہر نہ کیا جائے ہم ایک بحرانی حل سے دوسرے تک بٹھکتے رہیں گے۔ ”انڈیا ٹوڈے“ کے ساتھ اپنے انٹرویو میں جو سوم افروری کو منظر عام پر آیا مجھے اس سوال کا جواب دینا پڑا کہ آیا سبلی تعلیم کی جانی چاہیے۔

اس موضوع پر میرے نظریات دوسرے اخبارات میں بھی شائع ہوئے۔ مثال کے طور پر ۱۳ فروری کے کشمیر ٹائمز جو ریاست میں وسیع تر پڑھا جانے والا روزنامہ ہے اور جس کا مدیر سابقہ مرکزی وزیر داخلہ کا ذاتی دوست ہے نے کلیدی سرفقے کے تحت خبر شائع کی۔ ”گورنر موصول و کشمیر اسمبلی کو تحلیل کرنے کے حق میں“ ۱۳ فروری کو ہندوستان ٹائمز نے مندرجہ ذیل خبر شائع کی۔

گورنر ایوان کو تحلیل کرنے کے حق میں

جموں و کشمیر کے گورنر جنکوہن نے جموں و کشمیر اسمبلی کو تحلیل کئے جانے کی سفارش کی ہے۔ ۱۹ فروری کو میں نے مندرجہ ذیل اعلان جاری کیا۔

آئین جموں و کشمیر کی دفعہ ۵۲ کے تحت دفعہ (۲) کی ضمنی دہ کے تحت حاصل اختیارات کی رو سے میں اسمبلی کو تحلیل کر رہا ہوں۔

درستخط — جگموبہن

دفعہ ۵۳ کی مذکورہ بالا تحت دفعہ یوں ہے۔ گورنر بسا اوقات

(۱) ایوان یا دونوں ایوانوں کا اجلاس برخواست کر سکتا ہے۔

(ب) ریاستی سمبلی کو تحلیل کر سکتا ہے۔

حسب توقع اسے جیل کر دیکے اقدام کا عوامی طعنہ پر بجاری ٹوٹا گیا۔ اخبارات نے اتفاق رائے سے اس اقدام کی تشریف کی مگر ان سطحوں میں جو کچھ ملے اس پر مرکزی حکومت کے نزدیک تھے میری یہ کہنگی نہ تھی کی گئی تھی میں نے مرکزی حکومت کو اعتماد میں نہیں لیا ہے یہ مرکزی حکومت کے چوٹی کے چار اہلکاروں کے نام اپنے خط انڈیا ہاؤس میں میرے انڈیا ہاؤس کے دفتر میں ملے اور سندھوستان ٹائمز میں شائع خبروں کے چسپ نظر اس امر کا کہ

جواز دیا جاسکتا ہے کہ میں نے کسی کوتاہی میں رکھا۔ درحقیقت تمام وقت میں اس امر کی طرف اشارہ دے رہا تھا کہ اسمبلی تحلیل کر دی جانی چاہیئے۔ اگرچہ میں نے چلا چلا کر یہ بات نہیں کہی۔ ۲۱ فروری کو میٹن میں نے اپنے ادارہ میں اسے صرف پہلا قدم قرار دیا۔ اس نے لکھا کہ اسمبلی تحلیل کرنے کی کارروائی کو شاید یہ غیر متوقع اقدام قرار دیا جاسکتا ہے۔ جگمگم کی تقرری کے وقت ہی عام خیال یہ تھا کہ نہ صرف فاروق عبداللہ وزارت کو برطرف کر دیا جائے گا۔ بلکہ اسمبلی کو بھی تحلیل کر دیا جائے گا۔ ۲۰ فروری کو ٹائمز آف انڈیا نے واضح کیا کہ اسمبلی کی تحلیل یہ آخری رسم تھی جو جگمگم کو بہت پہلے ادا کرنا تھی۔ اس نے کہا: اس وقت کے وزیراعظم مہر علی شاہ گاندھی کو اپریل ۱۹۸۹ء کے اپنے خط میں گورنر جگمگم نے کہا تھا وزیراعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبداللہ لگتھمک ٹریچکا ہے۔ سیاسی اور انتظامی طور پر اس کا زوال ہو چکا ہے اور محض آئینی طور پر آخری رسوم ادا کیا جانا باقی ہے۔ کل ریاستی اسمبلی کو تحلیل کر کے جگمگم نے دراصل یہ آئینی رسوم بھی ادا کر دیں۔ ۲۱ فروری کو اپنے ادارہ میں انڈین ایکسپریس نے تبصرہ کیا: اسمبلی کی تحلیل اس گروپ زدہ ریاست میں حالات کی نزاکت کے مطابق ہے۔ دی ٹریبون نے لکھا: ۸۰، کوئی قانون ساز اسمبلی ایک طویل عرصے سے مددِ ذوق دکھائی دے رہی تھی اور یہ بات سمجھنا مشکل ہے کہ پیر کے روز اس کی تحلیل کے کیا معنی ہیں چنانچہ گورنر جگمگم کی طرف سے اس اقدام کے لئے پیش کیا گیا مفصل بیان واقعی غیر ضروری ہے۔ مگر اس شے کو جاتا ہے جو زندہ ہوتی ہے۔ اسمبلی تو اس وقت ہی فوت ہو چکی تھی جب ڈاکٹر فاروق عبداللہ وزیراعلیٰ تھا اور دہشت گرد کھل کر گھسیل رہے تھے۔ ۲۰ فروری کو پری ریپورٹ میں ہندوستان ٹائمز نے لکھا: ”جو تک ایک مافقیل گورنری لارج نافذ ہونے کے وقت سے ہی اسمبلی کی تحلیل متوقع تھی۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے پانچ روز قبل جو زیرِ پلا میاں دیا، معلوم ہوتا ہے اس سے یہ اقدام کرنے میں تیزی آئی ہے۔“ مندرجہ بالا باتوں سے یہ ظاہر ہو جانا چاہیے کہ کوئی غیر متوقع اقدام نہیں تھا اور جو کچھ بھی میں نے کیا اس میں نے کسی کو اندھیرے میں نہیں رکھا۔ اس فیصلے کی تہہ حالات کی نزاکت میں مضمر تھی۔ ظاہر ہے کہ سیاست دانوں کی طرف سے خود کو گولی باری کے خط میں رکھنے کی اجازت بھی دے دیتا اور ان لوگوں کو بھی سرخمر رکھتا جو اکثر شہزادی کی طرح سیاسی شہدہ بازی کے منصوبے میں شاید انہیں ان لوگوں کی آخر کار ضرورت پڑے اور مئی ۱۹۹۰ء کے آخر میں جو واقعات ہوئے ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ میرے خدشات بے جا نہیں تھے۔

حالانکہ مرکز میں جنتا دل حکومت کے بعض حلقوں میں غلط فہمیوں اور دوسروں کا اظہار کیا جا رہا تھا مگر جنتا دل نے ایک سیاسی جماعت کے طور پر میرے فیصلے کی توثیق کر دی۔ جنتا دل کے جنرل سیکریٹری جے پال ریڈی نے کہا: ”اسلی کی تجہیل سیاسی پہل کا ایک حصہ ہے کیونکہ معمول کے حالات بحال ہونے پر اسے انتخابات کا راستہ صاف ہو جائیگا۔“ بھارتیہ جنتا پارٹی نے اس فیصلے کا خیر مقدم کیا۔ بی جے پی کے جنرل سیکریٹری کرشن لال شرما نے کہا: ”جے این آر کے گورنر کے فیصلے کی ستائش کی جانی چاہیے کیونکہ ان حالات میں بے یقینی اور شبہ بازی کو دور کرنے

کے لئے یہ ناگزیر بن چکا تھا۔ حسب توقع کانگریس (آئی) اور نیشنل کانفرنس (ایف) نے میرے فیصلے کی نکتہ چینی کی۔ کانگریس (آئی) نے اسے "تباہ کن" قرار دیا اور نیشنل کانفرنس نے اسے سیاسی جادوگری قرار دیا۔ عوامی مجلس عمل کے صدر مولوی فاروق نے بہ حال اس کا غیر مقدم کیا اس نے کہا کہ یہ بہت پہلے کیا جانا چاہیے تھا۔ بائیں بازو کی جماعتوں نے اسے کیفر فخر قرار دیا۔ ان کی شکایت اس فیصلے کے اوصاف کی بجائے یہ تھی کہ ان کے ساتھ مشورہ نہیں کیا گیا۔

اخبارات نے میرے فیصلے کی تقریباً اتفاق رائے سے حمایت کی۔ انڈین ایکسپریس نے کہا: "اس کی افادیت ختم ہو کر رہ گئی تھی"۔ ہندوستان ٹائمز نے تبصرہ کیا: "مارچ ۱۹۸۷ء کے انتخابات کے بعد جو اسمبلی وجود میں آئی اسے کسی قانونی تراز حاصل نہیں ہوا اور یہ آخر اپنی موت مر گئی۔ اس ایوان کی موت پر چند آنسو ضرور بہاتے جانے چاہیے جو اب بے فائدہ ہو کر رہ گیا تھا۔ ٹائمز آف انڈیا کا مشاہدہ تھا: "موجودہ حالات میں اسمبلی کی تحلیل ایک منطقی فیصلہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حکومت نے اس بات کو سمجھ لینے کے بعد یہ منصوبہ بنایا کہ نیشنل کانفرنس اور کانگریس کی طرف سے فراہم سیاسی قیادت عوام سے کٹ کر رہ گئی تھی کیونکہ یہ راشی اور نالائقی تھی۔ اب اسمبلی کو تحلیل کر کے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت نے عوام کے ان طبقوں کا دل جیت لیا ہے جو انتخابات میں مبینہ دیکھ جانے پر دھاندلیوں کی شکایت کر رہے تھے۔ ۲۲ فروری کے ہندو نے بھی واضح کیا: "جوں و کشیں اسمبلی کو تحلیل کرنے کا فیصلہ اس گڑبڑ زدہ ریاست میں سیاسی شروعات کرنے کے مترادف ہے جس کا مقصد اس وجہ کو دور کرنا ہے۔ جو بد نظمی کا منبع ہے۔"

معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا سے ہی کانگریس (آئی) میرے خلاف غلط پروپیگنڈہ کی پالیسی پر عمل پیرا تھی۔ یہ جماعت اس امر کے لئے کوشاں تھی کہ یہ صورت کامیاب نہ ہونے پاؤں کیونکہ میری کامیابی کا مطلب ماضی میں ان کے بیاہ کار ناموں اور غلط اندازوں کا غلط انہام ہونا تھا۔ کسی کی دائرہ میں تنکا تھا۔ کسی کی کسی شخص کی کوتاہی تھی۔ + اور دخل اندازی کی زبردست دلیلوں پر بغیر غور و خوض نئے اسے انہیں نظر انداز کر دیا تھا جب تک کہ یہ کار کا آسیب اپنا خوف و ہراس پھیلارہا تھا اور ریاست میں اقتدار کے ڈھانچے کے عضو کو ٹھکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے عوام اور اخبارات کو جوہ بیان کیں ہیں ان میں نے مرکزی حکومت کے ان حلقوں کو صحیح صورتحال سے آگاہ کیا جنہوں نے غلط فہمیوں کے اظہار کا راستہ چنا تھا۔ یہ راستہ انہوں نے فوری یا خاموشی کی بنیاد اختیار نہیں کیا بلکہ پہلے اختیار کیا تھا کہ اس بارے میں ان سے شورہ نہیں ہوگا مگر میں نے جو کچھ کیا ہے اس کے لئے مضبوط تر تقبیر تھی جس کے لئے اس وقت کی میری پوزیشن اور دیگر حالات ذمہ دار تھے۔ ایک بات واضح تھی کہ ایک شروعات

کی جگہ ہے۔ جو راستہ پہلے اختیار کیا گیا تھا اس سے رہتا ہے کہ جو کمزور طبقے پہلے سے کمزور تھے اور نہ یہ نیست و نابود ہو جاتا۔ اور آخر اس طاقت کے استعمال کا کیا ہوا تھا جو گرتے ہوئے جن کو اس کی گردن کا گرد پٹے مندر سے پکڑنے کیلئے استعمال کی جاتی تھی۔ تاکہ اسے بحالی کے راستے پر لایا جاسکے۔

دیگر سوالات بھی تھے۔ کیا یہ ہمارا حتمی مقصد تھا آخر ہم کو کیا حاصل کرنا چاہیے تھے؟ اس پر غور اور پھر پہلے راستے پر ہم کیوں چل رہے تھے۔ جہاں پر غور کریں اور خون تھا اور ان لوگوں کے پیچھے دوڑ رہے تھے جو اپنی بدن چٹان سے گرنا چاہتے تھے۔ آخر کن کے لئے ہم گولیوں اور گھات سے حملوں کے خطرات مول لے رہے تھے؟ ہم آخر اس حالت تک کیوں پہنچ چکے ہیں جہاں ہمیں اپنے ہاتھ جیبوں میں ڈالنے سے ڈر لگتا ہے ان میں چھپے ہوئے پتھر ہیں ڈس نہ لیں؟ آخر ہم کن کی خاطر یہ غیر معمولی جنگ لڑ رہے ہیں؟ کن کے لئے ہم اپنی ذاتوں اور اپنے کنبوں کو خطرے کے سامنے ڈال رہے ہیں؟ کن کی خاطر پی ایس ایف اور سی آر پی کے جوان بر فباری مشین گناؤں کے دوران تنگ و تاریک گلیوں میں کھڑے رہتے ہیں۔ یہ کرنیو، یہ تلاشیوں اور یہ ناخوش گوار کام آخر کن کو گولے کے لئے یہ مصائب۔ یہ ہلاکتیں اور زخم کس لئے کیا ہم وی پرانی راشی لاپرواہ اور گھٹنے ٹیکنے والی گلی عری حکومت کو واپس لانا چاہتے ہیں کیا ہم انہیں پرانے گورنر کو کاٹھی پر بٹھانا چاہتے ہیں؟ یا ہم کسی دیگر شخص کی تلاش میں ہیں جو نئی ہو زیادہ یا غیر دار ہو، اور جو ہمیں دوبارہ اسی دہلی میں نہ لے جائے۔

میرے ذہن میں بنیادی سوالات تھے۔ اور میں اپنی بابت بالکل واضح تھا اگر میں اسمبلی تحلیل نہ کرتا تو میں کس ذہن اور ان لوگوں کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والا نہ بن سکتا۔ معلوم ہوتا ہے اس چرچہ گری کے لئے ذمہ دار تھے۔ اور اس معاملے میں طاقت کا جو استعمال لازمی تھا اس کے لئے کوئی اخلاقی تراز نہ رہتا اور دوسری طرف میں نے اسمبلی تحلیل کر کے بھی کوئی منصفانہ اور عین جانبدارانہ انتخابات کے ذریعے ہندوستانی آئین کے ڈھانچے میں بھی کوئی منصفانہ دے چھنے کا موقعہ دیا اور اس لئے میں نے یہاں موقعہ فراہم کرنے کے بعد طاقت کا استعمال اسلئے کیا تاکہ ملک کا تحفظ کیا جاسکے اس کی یکجہتی اور سالمیت کو بچانے کا ملین مقصد حاصل جس سے تمام علاقوں کے طبقوں، تمام مذاہب کے لوگ، ہندو کے غنڈے سارے میں رہ سکیں۔ اور عدالتی، انصاف، محبت، ہمدردی اور انسانی بھائی چارے کی شاخیں بھی یکساں ہو چکیں۔

انہوں اور قتل کی وارداتوں ہلاکتوں تباہی اور بے سروسامانی کے لئے کون ذمہ دار تھے۔ وہ صرف دہشت گرد ہی نہ تھے بلکہ وہ بھی تھے جنہوں نے حق تعالیٰ سے پیچھے نہ گرتی تھی یہ صرف کلاشنکوف ہی نہیں جس سے قتل ہوتا ہے۔ بلکہ لاپرواہی ہے اعتدالی اور نظر اندازی بھی ظاہر ہوئے تباہی ہوتی ہے۔ یہ دیکھنا بھی مشکل نہیں ہے کہ وہ لوگ میرے اس جذبے کو سمجھنے یا اس کی ستائش کرنے میں ناکام رہے۔ کیونکہ

تنگ نظر سیاسی چالبازی ان کی دوسری فطرت ہے۔ وہ اس ادنیٰ چال سے آگے کچھ نہیں دیکھ سکتے تھے جس کا مقصد اس بدنام اداکار کو واپس لانا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ اسمبلی کی تحلیل سے سیاسی بوڑھوں کے اسلحہ خانے سے ان کا ایک ہتھیار کم ہو گیا ہے۔ چنانچہ اسمبلی کو بحال کرنے کی بات شروع کر دی اور مفادات خصوصی رکھنے والوں کی طرف سے میرے حکم کے آئینی جواز کو چیلنج کرنے کی ایک غدر دراری بھی داخل کرادی گئی۔

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اس امر کی پیچیدگیوں کو دیکھتے بغیر ہی کہہ کر رہا ہے۔ مرکزی وزیر داخلہ مفتی محمد سعید نے پارلیمنٹ میں ایک بیان دے دیا کہ اسمبلی کو بحال کرنے کے بارے میں غور کیا جا رہا ہے۔ وہ بھول گیا کہ جتنا دل کے ایک لیڈر کے طور پر اس نے خود ہی جنوں و کشمیر اسمبلی کو تحلیل کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ ۱۹ اگست ۱۹۸۹ء کو اپنے ایک پریس بیان میں اس نے کہا: "موجودہ حالات کا واحد حل یہ ہے کہ ریاست میں نئے انتخابات کرائے جائیں۔ میرا غلط مولوی فاروق بھی یہی کہہ رہا تھا کہ اسمبلی نے اپنا نمائندہ کردار ادا کر دیا ہے۔"

اس معاملے میں قانونی اور آئینی پوزیشن قطعی طور پر واضح تھی۔ آئین جنوں و کشمیر کی دفعہ ۹۲ کو نافذ کرنے اور اس امر کا فرمان جاری کرنے کے بعد گورنر وہ تمام اقدامات کر سکتا تھا جو ریاستی حکومت اور ریاستی قانون ساز یہ کر سکتی تھی۔ اس نے کابینہ اور قانون ساز یہ کے فرائض کو چھ ماہ کے لئے حاصل کیا تھا۔ اس معاملے میں صرف خاص معاملات پر ریاستی پابندی تھی جس میں ریاستی ہائی کورٹ سے متعلق معاملات شامل تھے۔ آئین جنوں و کشمیر کے دفعات کے تحت تمام فرائض گورنر نبھا سکتا تھا۔

آئین میں کوئی ایسی دفعہ نہیں ہے جس کے تحت کوئی اتھارٹی تحلیل شدہ اسمبلی کو بحال کر سکتی ہے اور نہ ہی کوئی ایسا واحد معاملہ موجود ہے جس کے تحت تحلیل شدہ اسمبلی کو بحال کیا گیا ہو۔ تحلیل ہونے کے بعد اسمبلی مردہ ہو جاتی ہے کیا کوئی شخص مردے کو زندہ کر سکتا ہے؟

پنجاب اسمبلی کو تحلیل کرنے کے معاملے میں پنجاب اور ہریانہ ہائی کورٹ سے مندرجہ بالا امر صاف ہو چکا ہے۔ عدالت کا مشاہدہ تھا اگر تسلیم ہی کر لیا جائے کہ اسمبلی کی تحلیل کسی خفی کی شکار ہے تو بھی آئین اور قانون کے تحت کوئی ایسی دفعہ موجود نہیں ہے جس کے تحت مدد اعظم یا صدر جمہوریہ یا گورنر کو اسے دوبارہ زندہ کرنے کا اختیار حاصل ہو۔ اس میں واضح کیا گیا ہے۔ "چنانچہ عدالت نے حکم دیا کہ" اس امر کا اعلان کرنا کہ اسمبلی کی تحلیل غلطی ہے جی ہرگز عدالتیں ان حقائق پر غور نہیں کر سکتیں جن کی وجہ سے میں نے اسمبلی تحلیل کرنے کا فیصلہ کیا۔ قانونی طور پر یہ پوزیشن ہے۔ آئین میں ایسی دفعہ ہے مگر جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں چاہوں گا کہ بے لاگ مشاہدین کی طرف سے اس فیصلے کے تمام تر پہلوؤں کا جائزہ لیا جائے خواہ وہ قانونی مدد انتظامی اور صحافتی شبیہوں سے تعلق رکھتے ہوں۔ میرے وسیع تر مقصد کو سمجھیں ہو گا۔ میرے دلائل کو دوسرے ابواب خاص طور پر تحریر کی نوعیت اور

طرز عمل اور اس منظر میں میری آمد سے قبل حالات" میں شامل حقائق کی روشنی میں پرکھا جانا چاہیے۔

آخر میں اس بات کو دہراتا ہوں جو ۱۹۹۰ء کے دوران اخباری نمائندوں کے ایک سوال کے جواب میں میں نے کہی تھی: اسمبلی تحلیل کرنے کا فیصلہ میں نے حالات کی مجموعی نوعیت کو سامنے رکھ کر کیا۔ بنیادی مقصد یہ تھا کہ ایک نئی شروعات کی جائے اور ایسا ماحول پیدا کیا جائے کہ کشمیر کے عوام میں یہ جذبہ پیدا ہو جائے کہ بنیاداً تمام متعقبات اور عادل ہو گا۔ وہ پھر اسی نظام کو فروغ دینے کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھائے گا۔ چھ لاپرواہ اور راشی تھا جس نے ریاست کو تباہی کے دہانے پر لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ یہ فیصلہ انتظامی اختلافی اور آئینی طور پر درست ہے۔ اور اس سے ریاست میں تمام امور و حالات کو معمول پر لانے میں مدد ملے گی بشرطیکہ مفادات خصوصی کی طرف سے اسے غلط بیانی کا شکار نہ بنایا جائے۔

عدلیہ میں اس فیصلے کے چیلنج کی بابت ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا تھا عدالتیں بھی تاریخ کی عدالت میں اسی حد تک جواب دہ ہیں جتنا کہ کوئی اور ہو سکتا ہے!!

باب بارہ

انتشار اور تضادات کا گرداب

”میں جاگتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ اندھیوں نے دن نہیں
سمجھتے سمجھتے سیاہ سمجھتے ہم گمراہ چکے ہیں“
گمراہ مینٹی پاکستان

فروری ۱۹۹۰ء کے تیسرے ہفتے تک پٹری سے اترے انتظامیہ کو میں واپس رستے پر لے آیا تھا۔ حالانکہ مختلف قسم کے اٹلے اب بھی کھڑے کئے جا رہے تھے چنانچہ پٹری اب بھی غیر ہموار تھی اور راستہ بعض مقامات پر کٹا پھٹا اور خطرناک تھا۔ رہائی ہمیں کو قلیل کر کے تو وہ بخیرانی سیاسی جماعتیں عین یائے گروپ تھے میں نے ان کے لئے سیاسی اقتدار کی امنگیں پیدا کر کے نئے راستے پیدا کر دیے تھے۔ میں نے مختلف ترقیاتی پروگرام شروع کئے تھے اور رشوت کے خلاف ہم شروع کی تھی۔ ان اقدامات کا عوام پر تاثر پیدا ہونا لازمی امر تھا۔ اور انتظامیہ کی عوام کے ساتھ مزید ہم آہنگی بھی پیدا ہو رہی تھی۔ وسیع تر پس منظر میں نے نہایت خاموشی کے ساتھ نہ صرف کٹر پاکستان نواز عناصر کو الگ تھلگ کرنے اور عوام کے اس طبقے کو ان کے اثر سے باہر رکھنے کی پالیسی اپنانی چاہی بلکہ کٹر اور بدست گردوں کی جھولی میں وہ چلے گئے تھے۔ باب ہم میں واضح نصب العین سماجی اصولوں سیاسی اور انتظامی نا انصافیوں کے معاملے میں ان کی عام مقبولیت کو ختم کر کے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

جب میں ملازمین کو توجہ دلاؤں تو حقیقت سے حقیقی اور تاریخی سے روشنی کی جانب حرکت کرنے کی اپیل کر رہا تھا تو یہی سبب تھی کہ حکومت میری حقیقت پسندی کے بہت پرچار کو تندہیوں کے سامنے ڈال رہی تھی جن میں اس روشنی کو گل کر دینے کی سکت موجود تھی یہاں تک کہ وہ چرنا کی ختم کر سکتی تھی۔ پہلے اقدام کے طور پر ایک سات رکنی مشاورتی کمیٹی قائم کی گئی۔ شاید یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ اس چرنا کی بنیاد کو ہلانے کے لئے وزیر مملوے جارج فرنانڈس کو وزیر برائے امور کشمیر بنا دیا گیا۔ ان روایات نے کشمیر کو انتشار اور تضادات کے درمیان واپس کھڑا کر دیا۔

ملازمین کو غلط اشارے ارسال کئے گئے۔ میری افادیت کو کم کر دیا گیا۔ توجہ دلاؤں کے ذہنوں میں ایک مرتبہ حکومت کی عدلیہ پسندی کی بابت غلط فہمیاں ڈالی گئیں۔ اس سے بھی زیادہ نقصان دہ بات اس کمیٹی میں شامل دو جماعتوں یعنی کانگریس (آئی) اور نیشنل کانفرنس میں معیت کا فقدان تھا۔ جیسا کہ بعد ازاں بیان کیا جائے گا۔ یہ انداز فکر تباہ کن تھا۔ وہ تمام قسم کی اڑچنیوں ڈالنے کے لئے تلے ہوئے تھے۔ جلد ہی یہ بات ظاہر ہو گئی کہ مرکزی حکومت نہ صرف متضادات کے پلندہ کی مانند تھی بلکہ اس کے انداز فکر میں بھی علی ناپیہ کا فقدان تھا۔ حکومتی کاروبار کے بنیادی اصولوں سے بھی وہ بے بہرہ تھی۔

جارج فرنانڈس اور کل جماعتی مشاورتی کمیٹی کے باہر میں بحث کرنے سے قبل یہ لازمی ہو گا کہ اس صورت حال کے چند دوسرے پہلوؤں پر غور کیا جائے ان میں سے ایک کا تعلق عوامی رشوت ستانی اور دوسرے کا تعلق معراج عالم سے متعلق تقریبات کے سلسلے میں پالیسی کے ساتھ تھا جن سے ان پانچ پہلوؤں کا اثر کم ہو گیا جو بدست گردوں کے لئے سازگار تھے۔

رشوت ستانی کے خلاف کاروائی

نیشنل کانفرنس اور کانگریس کے خداوند عوامی جذبات سے اس قدر بے بہرہ تھے کہ وہ رشوت ستانی کی کاروائیوں میں بے شرمی سے جھٹے رہے۔ انہوں نے یہ محسوس نہیں کیا کہ رشوت ستانی کے تین گواہ اس نخریب اور بدست گردی کی طاقتوں کو فروغ دے رہا ہے۔

جن غلط کاریوں کے وہ مرتکب ہو رہے تھے اس کا تعلق وزراء، اراکین قانون ساز اسمبلی اور قاضیوں ساز کونسل سے ہے جن کو ہم، رہائشی پلاٹ الاٹ کئے جانے تھے۔ اس الاٹمنٹ سے استفادہ حاصل کرنے والوں میں ڈاکٹر فاروق عبداللہ اس کا برادر راضی اور وزیر ڈاکٹر مصطفیٰ کمال وزیر شہری ترقیات علی عبداللہ سہاروی وزیر خزانہ عبدالرحیم رائے سابق وزیر مال اور رکن پارلیمنٹ پی ایل ہنڈو، وزراء نے کا بیتہ منگت رام شرما، اعظم رسول کار اور مولوی افتخار حسین انصاری وغیرہ شامل تھے۔ اس معاملے نے عوام کے اس نظریے کو تقویت عطا کی تھی کہ نیشنل کانفرنس (آئی) اور کانگریس (آئی) وزارت نے محض اسی لئے ہاتھ ملائے تھے کہ وہ اپنے گھروں کو بیکس میں ۲۳ فروری ۱۹۹۰ء کے حکم کو یہاں درج کرتا ہوں جو خود سارا ماجرہ بیان کرتا ہے۔ ”مصرفین — روپ ٹکڑاؤ سنگ کالونی میں وزراء، ممبران اسمبلی کونسل کے نام پتہ (۴) پلاٹوں کی الاٹمنٹ میں اس معاملے کو دیکھ کر مایوس ہو اہوں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اختیار کے ڈھانچے میں چند لوگ کس طرح خدمت نفس کے شکار ہو چکے تھے۔ تقریباً تمام اراکین اسمبلی کونسل شمول وزراء، ہر ایک نے اپنے لئے پلاٹ لے لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ اور وہ بھی اس طریقے سے کہ عوامی انتظامیہ اور انصاف کے کبھی اصولوں کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے۔

ان پلاٹوں کو نیلام کیا جانا تھا مگر ایک جنبش قلم سے ہی انہیں وزیراعظم نے اس زمرے سے نکال کر خود اور ایسے افراد کو الٹ کرنے کا فیصلہ کر لیا حالانکہ ان ممبران اسمبلی قانون ساز یہ کافر ضلع کے کوٹوالی معاملات کے نگہبان رہیں۔

جوں جیو پلینٹ انتھارٹی کی طرف سے اس بارے میں کوئی قرارداد نہیں ہے جس کی رو سے مذکورہ پلاٹوں کے بارے میں فیصلہ تبدیل کیا گیا ہو چنانچہ جوں جوں ترقیاتی ایکٹ کی قانونی ضمانت کی خلاف ورزی کی گئی ہے۔ میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ جس قدر وزارت سے اقرار نامے کئے گئے ہیں وہ سابقہ حکومت کی نوعیت کار کے لئے عجیب سے معلوم ہوتے ہیں میرے سامنے ایسے معاملے آئے ہیں جہاں پر ملازمین کو دس ماہ تک تنخواہیں ادا نہیں کی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں سو پور کالج اور سو پور سکول کے معاملات کا ذکر پر عمل ہو گا۔ اسی طرح ٹوٹیا فائیڈ ایبریا کھٹے کے ملازمین کو بھی واجبات ادا نہیں کئے گئے۔ کل ہی بھٹہ وہ بیوہ ملی جس کا شوہر دہشت گردانہ تشدد میں ہلاک ہو گیا اور دفتر دفتر کا دروازہ کھٹکھٹا رہی ہے مگر اسے کوئی راحت نہیں ملی۔ مگر ان پلاٹوں کے معاملے میں فیصلہ بد مثال سرعت کے ساتھ کیا گیا الاٹمنٹ آرڈر حاصل کر کے جو راوا بنگی کے رعایتی طور پر بچوں سے فائدہ اٹھانے کے بعد فوری طور پر اقرار نامے کئے گئے۔

اس معاملے کے سبھی پہلوؤں جن میں لین دین کا بد عنوان طریقہ بھی شامل ہے پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس حکم کی تفسیر کوٹوالی مفادات میں ہوگی جو یہ صورت ایک غلط حکم ہے۔ چنانچہ میں یہ حکم دیتا ہوں کہ الاٹمنٹوں کو منسوخ کیا جائے اور تمام متعلقین کو انفرادی طور پر مطلع کیا جائے۔ جمع رقم کو بھی واپس کیا جائے۔

”اس معاملے میں صرف قانونی پہلو ہی درپیش نہیں بلکہ ان لوگوں کی غلط کاری اور ذہنی رجحان کا سوال بھی آتا ہے جن کے پاس اقتدار کی باگ ڈور تھی میونسپل کونسلروں کی بات کرتے ہوئے گاندھی جی نے کہا تھا کہ انہیں جا کر بلیوں اور مڑک صاف کرنے والوں کے طور پر کام کرنا چاہیے وہ چاہتے تھے کہ اس جذبے کے تحت عوامی نمائندے کام کریں مگر اس سلسلے میں کون سا جذبہ کار فرما دیکھائی دیتا ہے؟“

اس حکم کا اچھا خاصا اثر ہوا، ایک عام کشمیری اور عام جوں بای کو اس میں ہر گز انصاف کیا جا رہا ہے۔ اور مگر ان طبقے کے بعض چند افراد نے ریاستی ذرائع کو جو سیٹ لیا تھا اب وہی ذرائع عوامی ہیرو کی سرگرمیوں کے لئے دستیاب ہیں۔ اس معاملے پر ایک الائی کو سرکاری قلم سے ۳ لاکھ روپے کی بالواسطہ سبسڈی حاصل ہونے کی وجہ سے ان الائیوں کی کل تعداد چوتھائی چنانچہ حکومت کو ۲ کروڑ روپے سے محروم ہونا پڑتا۔

رشوت ستانی کے بارے میں قریباً تمام مقامی روزناموں میں شائع تبصرے عوامی غصہ ظاہر ہو جاتا ہے۔ میں ان میں سے صرف ایک تبصرہ پیش کروں گا۔

سابقہ وزراء اور ممبران قانون ساز یہ کوالاٹ ۲۰۰۵ء پلاٹوں کی تفسیر کے معاملے میں بروقت حکم عام

طور پر ستائش کی جا رہی ہے۔ یہ پلاٹ اقتدار سے نکلنے سے قبل سابقہ فاروق حکومت نے یکطرفہ اور بے ضابطہ طور پر الاٹ کئے۔ جن لوگوں کو یہ پلاٹ الاٹ کئے گئے وہ بھی اس غلط طریقہ کار سے واقف تھے۔ اور انہوں نے نہایت رازداری کے ساتھ انہیں اپنے نام رجسٹر کروا لیا جس کے لئے انہوں نے اپنے سیاسی رسوم کا استعمال کیا۔ وزیر اعلیٰ چوڈھری اس کھلی لوٹ کا ایک استفاد کنندہ تھا۔ نے مستقل باشندہ ہونے کا سرٹیفکیٹ حاصل کر لیا جو اس کے پاس نہیں تھا کیونکہ یونائیٹڈ ٹنگٹم کی شہریت حاصل کر لینے کے بعد وہ یہاں کی شہریت سے محروم ہو چکا تھا مگر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے یہ سرٹیفکیٹ نہایت بے ضابطہ طور پر تمام اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے نہایت بے ضابطہ طور پر یہ سرٹیفکیٹ جاری کر دیا۔ اکثریت معاملات میں الائی جوں کے باشندے ٹنگ نہیں تھے چنانچہ انہیں پلاٹ نہیں مل سکتے تھے۔ اس سے پہلے بھی فاروق حکومت نے ہر ایک رکن قانون ساز یہ کے لئے مکان کی تعمیر یا کار کی خرید کے لئے لاکھوں روپے کے قرضے منظور کر کے اپنے اقتدار کا غلط استعمال کیا تھا۔ بہت سارے معاملات میں در رقم و زمین کی تعمیر اور نہ ہی کاروں کی خرید پر صرف کی گئی۔ اصولوں اور قواعد کو بالائے طاق رکھ کر پلاٹوں کی الاٹمنٹ کے بارے میں انکشاف اس مفلوط وزارت کی بدبودار کیفیت کو منظر عام پر لاتا ہے جس نے رشوت ستانی، کٹیوری اور اقتدار کے ناجائز استعمال کے لئے ریکارڈ قائم کئے۔ حالانکہ جو کچھ منظر عام پر لایا گیا ہے وہ اس کا عشرِ عشر بھی نہیں ہے۔ +

یہاں پر سید الدین سوزممبر پارلیمنٹ کے معاملے پر بھی توجہ دلانا ہے۔ عمل نہ ہو گا۔ ظاہری طور پر یہ نہایت معمولی معلوم ہوتا ہے مگر وسیع تر پس منظر میں وہ وجوہات سامنے آجاتی ہیں جن کے سبب نیشنل کانفرنس اور کانگریس ذاتی بلڈریر سے خلاف واپس کر رہے ہیں۔ رشوت کے خلاف میری ہم اس لئے ضروری تھی کہ وہ کی غیر سگالی حاصل کر کے اچھیتی کے احساس کو ختم کیا جائے مگر اس سلسلے میں مجھے ان گہرے مفادات خصوصی رکھنے والے اے گئے افراد سے بھی شکر لینا تھا جنہوں نے بھرپور جوابی وار کیا۔

وزیر اعلیٰ اور دوسرے وزراء کی طرح سوز نے بھی روپ ٹنگ کا لوٹ میں ایک پلاٹ الاٹ کرایا مگر اُسے اس سے اطمینان نہیں ہوا۔ وہ اس الاٹمنٹ کو تبدیل کر کے مزید تقبض بخش کا لوٹ کا ندھی مگر میں تبدیل کرنا چاہتا تھا۔ اس مرحلے پر میں نے چارج سنبھال لیا اور فائیل میرے سامنے پیش کی گئی میں نے سوز کی درخواست کو مسترد کر دیا۔ میں نے یہ بھی سوال کیا کہ اس نے اپنے سیاسی افراد کو یہ پلاٹ کیونکر الاٹ کئے گئے ہیں کیونکہ ملک بھر میں عام پالیسی یہ ہے کہ تھیلی آمدنی اور درمیان آمدنی والے افراد کو مقررہ نرخوں پر پلاٹ الاٹ کئے جائیں اور وہ بھی قریباً انداز کی کے ذریعے الاٹ کئے جاتے ہیں۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ سوز کی درخواست منظور کرنے کی صورت میں اُسے پانچ سے سات لاکھ روپے کا مالی فائدہ دیا جاتا۔

میں اسمبلی کی تحلیل کی بدولت پیدا شدہ سازگار صورت حال اور اعلیٰ مقامات پر مندر نشین لوگوں کی رشوت ستانی کے خلاف کارروائی کو ذہنی نشہ بن کر ناپا چاہتا تھا چنانچہ میں نے ۱۶ فروری ۱۹۹۰ء کو ریڈیو اور ٹیلی وژن نشریے میں میں نے اپنی سوچ مختصر طور پر بیان کی میں نے مکمل انصاف کا یقین دلایا اور کہا۔

”تجارت اور صنعت زبوں حالی کا شکار ہیں غریب دو کا ندارد اور گزروں طبقوں کی حالت فہر ہے ہمارے ملک کے بارے میں ریاست کو منفی تصویر حاصل ہو رہی ہے۔ پہلے ہی ریاست کی مالی حالت دیگر گوں ہے۔ بھاری رقم فضول خرچی کا شکار ہوئی ہیں اور متعدد دھوروں میں بھڑو لینا سزد ہوئی ہیں میں کو کشش کر رہا ہوں کہ خط وار لوگوں سے حساب لیا جائے اور ایک پیسہ تک جو یہاں ہو وہ ترقی پر خرچ کیا جائے میں نے چند حکموں کے خاص آڈٹ کے احکامات بھی صادر کئے ہیں۔

”میں آپ کو یہ بات یاد دلانا چاہتا ہوں کہ آئین ہند سماجی، سیاسی اور اقتصادی انصاف کی ضمانت دیتا ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ انصاف آپ کو مرمن و عن حاصل ہو گا میں اپنے وعدے کو کامیاب صورت دوں گا۔ پہلے ہی تین ہفتوں یا آٹھ مہینے کے دوران بی ایس ایف میں ۴۰۰۰ آسامیاں اساتذہ کی ۳۰۰ آسامیاں ہو کر رڈز کی ۳۰۰ آسامیوں کے علاوہ سینکڑوں آسامیاں لگائی گئی ہیں اور آزاد اور خود مختار انتخابی بورڈ کے ذریعے انتظامیہ بھرتی سرانجام دی جا رہی ہے۔ انتخابی مشینری کو پڑی پڑا لیا گیا ہے۔ بارہمولہ اور اننت ناگ کے لئے دو الگ کشتہ لگائے گئے ہیں، سول سپلائز اور مواد مصلحت کو بحال کیا گیا ہے۔ فلاح و بہبود اور ترقیاتی پروگراموں میں اصلاحات اور تنظیم کو رو بہ عمل لانے کے لئے ہم نے پہلے ہی ایک خاکہ تیار کر لیا ہے۔ آئیے ہم ہاتھ سے ہاتھ ملا کر اس بات کو یقینی بنائیں کہ ان پروگراموں پر سرعت سے عمل ہو۔ آئیے ہم ایک ایسا ماحول پیدا کریں جہاں بازاروں میں کوئی پولیس اہلکار دکھائی نہ دے اور یہاں پر سیتاؤں اور خوش باش لوگوں کی جمل پہل ہو۔

”گذشتہ کافی دنوں سے دن کا کرنیوٹا فز نہیں ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ چند عناصر قانون کے پابند نہیں ہیں ان کی بجالی کی کوششوں کو نا کام بنانا چاہتے ہیں۔ ہمیں ان لوگوں کے جھانسنے میں پس آنا چاہیے۔

معراج عالم

مسلم تقریب معراج روح انسانی کے پیر اور بلند روحانی مشہد و عات کی علامت ہے۔ معراج کے معنی ہیں ”چڑھائی“ سال ۱۹۹۰ء کے دوران معراج عالم سے متعلق تقریبات فزوری کے تیسرے ہفتے میں ہونے پائی تھیں۔ کافی فزور و خوش اور تبادلات کے بعد اس مہرے کے دوران میں نے مکمل ڈھیل دینے کا فیصلہ کیا۔ میں تجزیہ کاروں کو یہ پروپیگنڈہ کرنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا کہ غور زکی حکومت روایتی مذہبی رسومات کے معاملے میں رخنہ اندازی کر رہی ہے۔

اس معاملے میں میرے سامنے دو اور باتیں بھی تھیں۔ اول یہ کہ میں عوام کو ایک بر راحات ماحول پیش کرنا چاہتا تھا تاکہ گزشتہ دنوں کے دوران جمع کٹھن اور غبار خارج ہو جائیں۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ افراد اپنی تجویزوں اور شکایتوں کو لے کر میرے پاس آسکیں۔ دوسرے میں بنیاد پرستوں اور گزروادیلوں اور پاکستان نواز عناصر کی گرفت کو ڈھیل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں چاہتا تھا کہ جے اینڈ کے برٹین فزرنٹ میں ایسے عناصر کو بالذاتی حاصل ہو جو درمیان دروش رکھتے ہیں تاکہ بعد میں انہیں یہ بات یاد کر اسوں کہ آئین ہند کے دائرے میں رہا کر ہی وہ کشمیری قوم کے لئے حقیقی آزادی حاصل کر سکتے ہیں چنانچہ میری کوشش ہے کہ میں ہر چند افراد کے ابتدائی مظالم سے نجات دلا سکوں اور سماجی اقتصادی اور ثقافتی ترقی کے لئے ان کی سیاسی امنگوں کے اظہار کی خاطر وسیع تر مواقع فراہم کر سکوں۔

یکم مارچ تک حالات میری توقعات سے بہت زیادہ برعکس نہیں تھے۔ ماسوائے اس کے کہ جوں و کثیر برٹین فزرنٹ نے مذہبی تقریبات کے لئے فراہم کی گئی سہولتوں کا ناجائز استعمال کیا اور اقوام متحدہ مشاہدین گروپ کے دفاتر تک بڑے بھاری جلوسوں کا اہتمام کیا۔ ان جلوسوں اور متعلقہ کاروائیوں سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ جماعت اسلامی حزب المجاہدین اور دوسری پاکستان نواز تنظیموں کو شاؤی فزرنٹ میں ہی نہیں بلکہ فزرنٹ کی کئی طرح پر پس پردہ دھیکلا چار با تملہ جوان تنظیموں کو پسند نہیں تھا۔ عین ممکن ہے کہ یکم مارچ ۱۹۹۰ء کو جو سنگین دھماکے ہوئے ان میں بالواسطہ یا براہ راست فزرنٹ کے ان کا ہاتھ ہو۔

ان واقعات میں نیشنل کانفرنس کا ہاتھ ہونے سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے بعد ہی اس سازگار ماحول کو خراب کرنے کے لئے موقع کی تاک میں تھے۔ سکول کے بچوں کو لے جا رہی ایک آرمی سکول بس پر راولپورہ ہائی پاس کے نزدیک حملہ کیا گیا۔ بچوں کو پھیلنے کی فزور نے گولی چلا دی۔ سرنگر سے ۳ کلویٹر دور زکورہ کے مقام پر ایک بچہ مرنے اس محفوظ سے ہتھیار چھیننے کی کوشش کی تو وہاں کھڑی فزوری گاڑیوں کے حفاظت کر رہا تھا گاڑیوں کے اس قافلے میں سفر کر رہے جب دوسرے فزوری نے دیکھا کہ اس محفوظ پر بہت سارے افراد قافلہ کو پھانے کی کوشش کر رہے ہیں تو انہوں نے گولی چلا دی۔ ان دونوں واقعات میں بدقسمتی سے سترہ افراد کی جا میں تلف ہو گئیں۔

متذکرہ بالا واقعات اس وقت ثابت ہوئے جب میں نے کورکمانڈر لیفٹننٹ جنرل ایم۔ اے ڈی کو اس معاملے کی اس روز تحقیقات کرانے کا مشورہ دیا۔ مگر اس معاملے میں عوام کی جانے والی ہالغہ آہنی کا سہارا لیا گیا۔ بی بی سی نے کہیں ہلاکتوں کی فزرنٹ کی۔ ہمارے ریڈیو مشین نے بھی اس خبر کو اپنا رنگ دیتے ہوئے کہا کہ کیوٹی فزرنٹ نے ایک سواری گاڑی پر گولی چلائی اور تین افراد مارے گئے۔ بلا کسی تصدیق کے ڈاکٹر فزوری نے الزام لگا دیا کہ ایک سو سے زائد افراد مارے گئے ہیں۔ اس بات کے قطع نظر کہ یہ دونوں واقعات دھماکا دہ شہر کی بیرونی حدود پر رونما ہوئے ہیں اس نے ان ہلاکتوں کے لئے مجھے ذمہ دار قرار دیا۔ بنیادی طور پر یہ

بات اس لئے تھی کہ ان دونوں مقامات پر ہجوم میں ہی شامل چند افراد کا لڑاکا پن اس میں کارفرما تھا۔ نیشنل کانفرنس کے تین اراکین پارلیمنٹ + تو ہمیشہ وادی کشمیر سے دور تھے دہلی میں رہ کر میری کاوشوں کو ناکام بنانے میں مصروف رہے۔ وہ پارلیمنٹ کے دروازے پر دھڑکے کر بیٹھ گئے۔ انھوں نے مجھے واپس بلانے کا مطالبہ کیا۔ اس طرح انہوں نے قومی اور بین الاقوامی ذرائع ابلاغ میں کافی بے بسی حاصل کی۔

پانچ وجوہات

مجھ پر یہ بات پورے طور پر واضح ہو چکی تھی کہ پانچ وجوہات کی بنا پر تحریک کاروں کے حق میں توازن جارہا ہے اور میری تمام تر وجہ اس بات پر تھی کہ کس طرح ان وجوہات کو اگر ختم کر سکوں تو کم از کم ان کا اثر خود زائل کروں۔

اول یہ کہ تحریک کاروں نے غلام کو اس بات کا قائل کر لیا تھا کہ ان کی فتح ناگزیر تھی۔ اس خیال کے برعکس مجھے یہ خیال پیدا کرنا تھا کہ انتظامیہ کو درجہ بدرجہ کامیابی حاصل ہو گی۔ جنوری ۱۹۹۰ء کے دوسرے ہفتے سے معتم قوت الادی کے مظاہرے کے بعد ہوا کی بہت رفتہ رفتہ تبدیل ہونا شروع ہو چکی تھی۔ ان پر دباؤ کی شدت کو کم رکھنا لازمی ہی تھا۔ مجھے اس میں قطعی شک نہیں تھا کہ مسلسل سختی اور غیر جانبداری کے اظہار کے ساتھ ہوا اپنا راستہ مکمل طور پر تبدیل کرے گی اور یہ انتظامیہ کے حق میں چلنا شروع ہو جائے گی۔

دوئم سیاسی اہنگوں کے حامل لڑکوں کیلئے اپنی سیاسی اہنگوں کے اظہار کا کوئی دوسرا راستہ موجود نہیں تھا ان میں سے بہت سارے لڑکوں کے لئے تحریک کاری اور دہشت گردی ہی ان کی اپنی سیاست کی توسیع بن کر رہ گئی تھی۔ اس صورت حال کا علاج کرنے کے لئے ایک واضح خطہ فراہم کرنا لازمی تھا۔ ریاستی اسمبلی کی تحلیل اس مقصد کے حصول کی جانب ایک قدم تھا۔ اب کوشش یہ کی جاتی تھی کہ نہایت محنت کے ساتھ اور بلا تاخیر یہاں راستہ فراہم کیا جاسکے جس سے پاکستان کو از کفر مناہر کے سوائے یہ لڑکوں کو راہ راستی پر واپس آسکیں۔

سوم کشمیری سماج کا اندوخی تھا ابھی تک رجعت پسند ہے اور بہت سارے تحریک گروپوں نے جس دینی نظام کو پرچار کیا تھا اس کا ان پر بھاری اثر ہوا تھا۔ صحت پر اس صورت میں جب وہ رشوت ستانی اور چن بھرتوں میں دولت کے جمائے سے تنگ آچکے تھے۔ چنانچہ نئے ڈھانچے کے صاف شفاف اور دیانت دار عکس پر خاص زور دیا جانا لازمی تھا۔

چہارم پاکستان کی انٹر سروسز انیشی ایٹس تمام تحریک کار گروپوں کو تہ علی شاہ گیلانی اور میان عبدالقیوم جیسے پاکستان توازن ہر کے تحت کبھی کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور اس معاملے میں اس طرح کا عمل ضروری تھا کہ

ایسا نہ ہونے پائے۔ حزب المجاہدین اور جماعت اسلامی جیسے بنیاد پرست اور پاکستان توازن ہر کے غلبے کو دیکھنے کے لئے ان تنظیموں پر ایسا تک دباؤ ڈالا جائے اور ان سکولوں جیسے راستوں کو مسدود کیا جائے جن کی وجہ سے انہیں سماج میں خاص اثر و رسوخ حاصل ہوا ہے۔

پنجم چند افراد ہیں جن میں سرگرم عمل تھے۔ جو تحریک کارانہ سرگرمیوں کو پرچار کر رہے تھے اور اگر ان کے خلاف کارروائی کی جائے تو اپنے بارسوخ رتبے کی وجہ سے وہ خود شراہہ کر سکتے تھے۔ اس قسم کے عناصر کو کلاہ، اخبارات ڈاکٹری طبعی اور تاجروں میں موجود تھے۔ جو عذر داریوں قرار دے کر اخبارات میں واقعات کو توڑ موڑ کر شائع کر کے کافی گرد و غبار اڑا سکتے تھے۔ ان میں سے چند عین صبر نے اس انداز سے عمل کیا کہ گویا انہوں نے دہشت گردوں سے تحفظ خرید لیا تھا یا یہ کہ ایک کئی دولت یا اپنے پرانے سیاہ کارناموں سے لوگوں کو جھپٹا سکیں ان میں سے بہت ذہین نشین کرنا لازمی تھا کہ ان کی چالبازیاں اب ڈھکی چھپی نہیں رہ سکتیں اور انہیں تحریک کاری کی سازشی ملی جلالت اور حمایت کا خیال بھگتنا ہو گا۔

چھٹا سچ باب ہم میں بیان کئے گئے ٹیوٹی انداز فکر اور کارفرما جذبے کے تحت میں اس مرحلے پر جن پانچ پہلوؤں کا تعین کیا تھا ان کی روشنی میں تباہ شدہ ڈھانچے کی تعمیر دیکھنے (۱) مستقل پختہ ارادی کا مظاہرہ (۲) تحریک کاروں کو راہ راست پر واپس لانے کا خطرہ (۳) تحریک کاروں کا یہ بھرم توڑنا کہ وہ اخلاقی اور سماجی اصلاح کار ہیں (۴) پاکستان توازن وادیوں کی لیڈر شپ میں متحدہ تنظیم کو بننے سے روکنا (۵) پس پردہ معروف کار افراد کے خلاف کارروائی کرنا۔

کل جماعتی کمیٹی کا دورہ

یکم مارچ کے بدقسمت واقعات کے بعد حالات قدرے ٹھنڈے ہوئے تو میں نے اپنے طے شدہ راستے پر پیش قدمی شروع کر دی مگر ۶ مارچ ۱۹۹۰ء کو وزیراعظم کی رہائش گاہ پر ہوئی ایک میٹنگ میں اچانک فیصلہ کر دیا گیا کہ چند وزراء اور سیاسی جماعتوں کے نمائندے اگلے روز سرنگر کا دورہ کریں گے۔ فیصلہ کرنے والوں نے اس بات کو محسوس نہیں کیا کہ یہاں قسم کے دوروں کے لئے مناسب وقت نہیں تھا وہ حقیقی صورت حال سے استعدنا واقف تھے کہ انہیں اس بات کا علم ہی نہیں تھا کہ فیصلہ نوٹس پر ریاستی حکومت نہایت اہم ترین فیصلوں کے تحفظ کے لئے کسی خامی کے انتظامات کر سکتی ہے یا نہیں۔

یہ قربانیت جب کا وقت تھا جب مرکزی و اعلیٰ سرکاری شہرمانے میرے ساتھ فون پر رابطہ کیا۔ اس نے بتایا کہ کل جماعتی وفد سرنگر ایک خاص ہوائی جہاز میں آ رہا ہے۔ ان کے تحفظ اور رہائش کیلئے انتظامات کرنا ہونگے۔ اس فیصلہ کی بنیاد کے بارے میں اُسے کوئی علم نہیں تھا۔ اس نے بتایا کہ وزیراعظم کی صدارت میں کل جماعتی نمائندوں کی میٹنگ چند گھنٹے پہلے ہی ختم ہوئی ہے۔ اور اس بارے میں فیصلہ بھی اچانک کیا گیا ہے۔

داخلہ سیکرٹری نہایت انکساری سے مندرت خواہ تھا۔ وہ خود بھی اس فیصلے کی واجبیئت کا قائل نہیں تھا کہ اس خاص وقت میں سرنگر کا دورہ کیا جائے مگر وہ فیصلہ کنندگان کو بھلنے سے قاصر تھا۔ میں اپنی پیچیدہ ترین معاملے میں اس مصنوعی انداز فکر سے حیران و ششدر رہ گیا تھا اس دورے سے آخر کیا فائدہ حاصل کیا جاتا ہے اس سے اس معاملے میں قومی اتفاق رائے پیدا کرنے میں کیونکر مدد حاصل ہوگی۔ اس معاملے میں گورنر اس کے خیر یوں یا افریکہ جزیرہ پولیس سے مشورہ کیوں نہیں کیا گیا؟ اگر اتنے دھماکہ خیز معاملے میں یونہی فیصلے کرنے میں تو اس قدر زیادہ فیصلہ ادارے رکھنے کی آخر کون سی ضرورت ہے؟ اگر یہی دورہ ایک یا دو دن بعد طے کیا جاتا تو اس سے آخر کیا نقصان ہوتا؟ کیا اس دورے کی جلد بازی سے کوئی فائدہ ہو سکتا تھا۔ اس سے بھاری تکلیف اور بے برائی ہو سکتی تھی۔ نہ صرف تمام تر انتظامی شینری بکھر کر رہ جاتی بلکہ اس سے قلیل مدتی اور طویل مدتی مسائل میں اضافہ ہوا۔

ہوٹلوں کے منجروں کو اپنے بستروں سے لٹکا لٹکا کر اس رات کڑا کے کی سردی میں صوفیہ گالیوں اور ڈرائیوئیل کو ڈھونڈھنا پڑا۔ کل صبح کو جو چھاپے مارنے کا منصوبہ تھا اسے ترک کرنا پڑا اور حفاظتی دستوں کے افراد کو نئے کام پر مامور کرنا پڑا۔ ہوائی اڈے سے سنٹر ہوٹل تک کا راستہ نازک تھا۔ وہاں گولیوں اور گرینینڈوں سے حملہ ہو سکتا تھا۔ یہاں تک کہ بھاری جویم جمع ہو کر ان کا راستہ بھی روک سکتے تھے جس سے طاقت کا استعمال کرنا پڑتا اور ان حالات کی موجب قومی اور بین الاقوامی سطح پر بھاری تشویر نہیں حاصل ہوتی۔

جس طریقے سے ریاست کے نازک اور سنگین معاملات سے نمٹنا جا رہا تھا اس سے نہایت مایوس ہوا تھا۔ بختہ اور گہری سوچ کے فقدان سے مایوس تھا اور میں اس لئے بھی مایوس تھا کہ سیاسی جماعتوں نے حقیقی مسائل اور ان کی جڑوں کے تئیں بے اعتنائی کا اظہار کیا ہے۔ کیا کوئی نظام ان بنیادوں میں پروانہ چڑھ سکتا ہے۔ کیا دہشت گردی کے خلاف سنگین لڑائی اس طرح لڑی جا سکتی ہے جس کے ذریعے یمن یہاں تک پھیل چکے ہوں جن کی باب دوم میں نشاندہی تخریب کاری اور دہشت گردی کی نوعیت اور طرز عمل میں کی گئی ہے۔

نصف شب گزر چکی تھی جب ششمنی شرمائے دوبارہ ٹیلیفون کیا اس نے مجھے بتایا کہ راجیو گاندھی بھی آسکتے ہیں مگر اس مرحلے پر بھی داخلہ سیکرٹری اس ٹیم کی حیثیت کے بارے میں واقف نہیں تھا۔ بہر کیف یہاں حفاظتی اقدامات کی سطح کو بلند کرنا پڑا اور دوسرے انتظامات بھی کرنا پڑے۔

صبح کے وقت ہوائی اڈے پر طیر متوقع طور پر ایک بڑی اڑھکی نائب وزیر اعظم دیوی لال کی کابینہ کے دو وزراء اور جارج فرنانڈس اور ونیش گوسوامی اس کے علاوہ اخبارات اور ٹی وی مناسبتوں سے بھرا ایک جہاز بھی تھا۔ جب ایئر پورٹ سے سنٹر ہوٹل کے راستے میں یہاں آ رہی تھی تو میرے مشروریہ مودا نے مجھے اس ٹیم کی حیثیت اور دیوی لال کے پہنچنے کی بابت بتایا۔ اس کے فوراً بعد جی میں نائب وزیر اعظم اور جارج فرنانڈس سے ملنے کے لئے سنٹر ہوٹل چلا گیا۔

اس ٹیم کے پہنچنے کی خبر جنگل میں آگ کے مارنے پھیل گئی۔ چند افراد کو اس بارے میں گذشتہ شب ہی معلوم ہو چکا تھا نیشنل کانفرنس (ایف) کے لیڈروں نے اپنے دوستوں کے ساتھ ٹیلیفون رابطہ قائم کر کے ہی یہ اطلاع دے دی تھی۔ وہ اس روز کے لئے اپنے منصوبے ترتیب دینے میں مصروف تھے کہ گورنر کی ایڈمنسٹریشن کو پریشان کرنے کے مزید پیچیدہ گیالیں پیدا کرنے اور اپنے جھوٹے الزامات کو ثابت کرنے کی خاطر ڈرائے شیج کرنے کے لئے اور خود کو جبراً استبداد کے خلاف علمبردار ثابت کرنے کے لئے چند گروپوں کو کچی کے سامنے لاسکیں۔

مجھے جو خدشہ تھا وہی ہوا مختلف مسجدوں پر نصب لائوڈ سپیکروں سے اشتعال انگیز نعرے دوبارہ گونج اٹھے جو ام کو مڑکوں پر بانگ کر لایا گیا تاکہ وہ ہندوستانی کتوں کو واپس جانے کے لئے کہہ سکیں۔ تناؤ بڑھ گیا امن و قانون کا ایک سنگین مسئلہ درپیش آ رہا تھا۔ کسی بھی وقت وسیع پیمانے پر تشدد دھڑک سکتا تھا۔ کریفیناؤنڈ کر دیا گیا اور اس کی سختی کے ساتھ پابندی کی گئی۔

جب میں نائب وزیر اعظم کے ساتھ ان کے ہوٹل کے کمرے میں ملاقاتی ہوا میں نے چند منٹوں تک اسے مورچاں سے واقف کیا مگر چند وسیع تر مسائل کے سوائے اس نے اس معاملے میں زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ اس کو بجا طور پر اس پیچیدہ معاملے کی بہت کم واقفیت تھی اور وہ چند ایک تفصیلات سے آگے زیادہ نہیں سوچ سکتا تھا۔ بہر کیف اس کی کند ذہن کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ ونیش گوسوامی بھی کمرے میں آیا اس نے بھی میری تفصیلات کو سنا اس نے بھی چند عام سوالات کئے۔ جارج فرنانڈس کسی کو بتانے بغیر کہیں چلا گیا تھا۔ میسٹر خیال میں اس کا کام کرنے کا ڈھنگ عجیب و غریب تھا۔

جس بات نے مجھے مایوس کیا وہ یہ تھی کہ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ کیا کرنا ہے چند وزراء اور اراکین ٹیم چاہتے تھے کہ گورنر انہیں صورت حال کی معلومات بہم پہنچائے جبکہ دوسرے لوگ خدائی دھو دے ملاقات کرنا چاہتے تھے ان میں چند یہ چاہتے تھے کہ وہ شہر کا دورہ کریں۔ اعلیٰ سطح پر اس کنفوژن نے مجھے مایوس کر دیا۔

میں نے نائب وزیر اعظم کو تجویز کیا کہ کمیٹی کو صورت حال کی واقفیت بہم پہنچانے۔ خاص طور پر سیاسی معاملات پر بات چیت کرنے کے لئے گورنر کو دکھایا جائے۔ میں نے کہا بہتر یہ ہوگا کہ میں وزیر اعلیٰ کے کابینہ کو پہلے صورت حال کی بابت واقفیت بہم پہنچاؤں اور بعد ازاں وہ سیاسی جماعتوں کے اراکین کے ساتھ بات چیت کر سکتے ہیں۔ مگر اس معاملے میں کوئی فیصلہ نہیں ہو رہا تھا۔ ہر آدمی دوسرے سے بات کر رہا تھا مگر کسی فیصلے پر نہیں پہنچ رہا تھا۔ ہوٹل میں ہوا فرائی کا عالم تھا اسی کے دوران میں کانفرنس روم میں داخل ہو گیا

اس میٹنگ میں اور خاص طور پر جب اس قسم کے نازک نوعیت کے مسئلے پر بحث کی جاتی ہو اس کے پیش نظر شرکاء کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ کانگریس آل جماعت کا دستہ قریباً ہی بڑا تھا۔ راجیو گاندھی کے علاوہ شوشکرام ایل فلیسلا راجی راجی آزاد اور مونی شکر رائے۔ نیشنل کانفرنس کے گروپ میں بی۔ ایل منڈل اور محمد شفیع بٹ مہراں پارلیمنٹ شامل تھے وہ قدمی طور پر کانگریس آئی ٹیم کی پشت پناہی کر رہے تھے ان کے انداز فکر میں یکجہتی

تھی۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ سامنے نہیں آیا۔ میں نے سوچا کہ یہ اس شخص کی خاصیت ہے وہ ایک بات کا اعلان کرنے کا تو عمل اس کے برعکس کرے گا۔ مجھے معلوم ہوا کہ وہ نئی دہلی ایئر پورٹ پر تو آیا مگر اس جمعیت میں شامل نہیں ہوا۔ سیف الدین سوزمہر پارلیمنٹ سرینگر تو آیا مگر الگ طور پر کہیں جلا گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اور جہاد ج فرنانڈس کسی اور زاویے سے الگ طور پر کام کر رہے ہیں۔ انفرانٹری کے فبار سے ماحول پر آلودہ تھا اور تضادات سامنے آرہے تھے۔

دسمبر ۱۹۸۷ء کے تجربے کے بعد راجیو گاندھی کی ذات میں موجود ذاتی عناد کی بابت میری رائے کوئی بدلتی نہیں تھی۔ اس کی ضد تحفظ کے اصولوں کی بابت لاپرواہی اور ایئر فورس شہری ہوا بازی بارڈر وڈس آرگنائزیشن اور مقامی پولیس انفرسٹ کے تئیں ان کا رویہ دیکھ کر تعجب ہوتا تھا کہ آیا ایک عظیم ملک کا وزیر اعظم اس قسم کے گوشت پوشت کا سنا ہوا ہونا چاہیے۔ میں کافی دنوں تک اس سے پریشان رہا تھا مگر ۸ مارچ ۱۹۹۰ء کو دستور بمول میں اس کے سلوک نے مجھے انتہائی منوم کر دیا کہ ایک ملک کا سابقہ وزیر اعظم راجیو گاندھی اس غیر ذمہ داری کا سلوک کرے اس قسم کے مفکر خیر رویہ کا منفا ہو کر جس سے اس کی ذات اور ملک اس قسم کے لوگوں کے غلبے کی اجازت دے دے۔

وہ واقعات جنہوں نے راجیو گاندھی کے حقیقی ارادوں کو دھوکہ دیا

اس میٹنگ کی شروعات سے کیا ہوا ان اخباری نمائندوں کی پوچھیں بتاتی ہیں جو بال موبو د تھے۔ انڈین ایکسپریس ریفٹرا ہے۔

جمرات کو کرنیو کے دوران سرینگر شہر میں مختلف جماعتوں کے اصلی وفد کے دورے کی نمایاں بات تھیں اور تلخ جھڑپوں سے عیاں ہوتی ہے اس وفد کا خواہ سے ملاقات اور صورتحال پر بحث کرنے کا مقصد لگ بھگ فوت ہو کر رہ گیا۔

”پہلے سابقہ وزیر اعظم راجیو گاندھی اور جہاد ریفٹرا پارٹی کے لیڈر حسونت سنگھ کے درمیان زہنی جھڑپ اس وقت شروع ہوئی جب گورنر جگموہن کے خلاف بارہا تلخ نفسیات کا اظہار کیا گیا۔ اس کے بعد گاندھی اور جگموہن کے درمیان لفظی جنگ ہوئی جو تہی گاندھی بال میں داخل ہوا اس نے گورنر کے خلاف عیاں نہ باتیں کہنا شروع کر دیں۔ اس نے گورنر سے کہا کہ وہ جن لوگوں سے ملنا چاہتا ہے چنانچہ ان افراد کو شہر لانے کے انتظامات کئے جائیں گے۔ گاندھی نے اپنی بات پر زور دینے کے لئے کہا کہ یہ مل پر مقامی پولیس موجود نہیں ہے۔۔۔۔۔ جگموہن کی کیا کنسر میں سپر نہیں چھپے، مقامی فیشنل کانفرنس ممبر پارلیمنٹ

محمد شفیع بٹ اپنی نشست سے چلا آیا۔ گورنر نے ہر سرگرمی کو بند کر دیا ہے۔

عام طور پر مزم مزاج حسونت سنگھ جب خود پیرقانون یا سکا تو وہ گاندھی پر چلا آیا۔ آپ ہمیں پریس کے بارے میں پڑھا رہے ہیں اگر آپ چاہیں تو جا کر خود پریس سے بات چیت کر سکتے ہیں۔

گاندھی نے اس پریس انٹرویو نہیں کیا اس نے اس طرز عمل پر بھی اعتراض کیا جس کے تحت نائب وزیر اعظم گورنر کی بائیں جانب بٹھا یا گیا تھا حالانکہ وہ لوگوں کے مطابق نائب وزیر اعظم کو دائیں جانب بٹھا یا جانا چاہیے گاندھی کو کم از کم نائب وزیر اعظم کے تئیں اخلاقی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ یہ قوم کے وقار کا سوال ہے۔ حسونت سنگھ ”قوم کے وقار کی صرف آپ کو ہی فکر نہیں ہونی چاہیے اتنے اداروں کو ترک ہو جانے کے بعد قوم کے وقار کے بارے میں بات کرنے والوں میں آپ کو آخری شخص ہونا چاہیے۔ گاندھی! مجھے اس پر اعتراض ہے کہ جس کے تحت نائب وزیر اعظم کو غلط جانب بٹھا یا گیا ہے یہاں تک گورنر ان کے خیر مقدم کے لئے ایئر پورٹ تک نہیں گیا وہ میرے نائب وزیر اعظم ہیں۔ قوم کے نائب وزیر اعظم ہیں۔“

جگموہن نے واضح کیا کہ جب تک پرواز یہاں پر نری نہیں اسے اس نیم کی ہیئت کی بابت معلوم نہیں تھا۔ اس نے کہا کہ ”نائب وزیر اعظم یہاں آئے ہیں۔۔۔۔۔ گاندھی نے درمیان میں ٹوک کر کہا: ”دیدم وہاں آپ کے شیر میں انہوں نے مجھے ایئر پورٹ پر بتایا کہ پرواز اترنے کے تین منٹ قبل آپ کو نائب وزیر اعظم کی آمد کی اطلاع دی جا چکی ہے۔ دیدم وہاں جس جگہ پر موجود تھے میں نے یہ کہا تھا کہ نائب وزیر اعظم کی آمد کی مجھے اطلاع نہیں تھی اسی لئے گورنر یہاں دائر پورٹ پر موجود نہیں ہیں۔“

اس مرحلے پر سی بی آئی ڈایم ممبر پارلیمنٹ پیڈب داس گپتا نے دخل دیتے ہوئے کہا کہ ہم پریس کی موجودگی میں اس قسم کی بحث کی اجازت نہیں دے سکتے۔ یہ نہایت بدعتی اور بے قاعدگی ہے۔ اس نے کہا کہ میٹنگ میں گورنر کے ساتھ تھانہ دل خیالات ”خفیہ“ ہونا چاہیے۔

اخباری نمائندوں سے کہا گیا کہ وہ کانفرنس ہال سے چلے جائیں بعد ازاں بند دروازے میں ہوئی میٹنگ میں دوبارہ جھڑپ اور تلخ کلامی ہوئی۔ اطلاع ہے کہ گاندھی نے گورنر سے کہا: ”جب میں وزیر اعظم تھا، آپ اس وقت بھی گورنر تھے کیا میں بتاؤں کہ دفعہ ۳۷ کے بارے میں آپ نے کیا کہا تھا۔“ جگموہن تئیں بھی بتا سکتا ہوں کہ آپ نے مجھے اس وقت کیا کہا تھا۔“

بعد ازاں گاندھی نے اخبار نویسوں کو بتایا کہ جگموہن نے اس میٹنگ میں جو کچھ بھی کہا ہے وہ راہ تحمل ناک راستے تک جاتی ہے۔ وزیر قانون دیش گو سواہی نے رائے ظاہر کی کہ جو کچھ بھی اس ”خفیہ میٹنگ“ میں تبادلہ خیالات ہوا ہے اسے پریس کو نہ بتایا جائے۔ گورنر بھی تالاں تھا۔ اس نے کہا کہ میں نے جو کچھ بھی کہا وہ اراکین وفد کے لئے مقابلیہ امر باعث دہی ہے کہ جب ان سماجی تنظیموں کے لیڈروں کو بلایا گیا جنہیں گاندھی ملنا چاہتا تھا تو وہ فیشنل کانفرنس ممبر پارلیمنٹ پر چین چلائے اور اسے چھوڑا دیا۔

باقی رپورٹوں کا جھان بھی ایسا ہی تھا۔ ٹریبون نے لکھا۔

اس کا نفرنس میں ان لیڈروں نے خاص طور پر راجیو گاندھی اور نیشنل کانفرنس کے نمائندوں نے اپنے تحریکوں کو مات دینے کی سلسل کو ششیں کیں۔ جب اخباری نمائندوں نے راجیو گاندھی کو شہر کے مختلف حصوں کا دورہ کر کے عوام سے ملاقات کے لئے اپنے کرفیو پاس پیش کئے تو اس نے ان کا جواب نہیں دیا۔ اس سے چن دنوں قبل ہی اس نے اس بات پر مایوسی کا اظہار کیا تھا کہ اسے عوام سے نہیں ملنے دیا جا رہا ہے۔ مقامی روزنامے کثیر شمارنے اعلان دی۔

بات اس وقت بگڑی جب جگموہن نے وادی میں صورت حال کی بابت ان لیڈروں کو روشناس کرنا شروع کیا۔ گاندھی نے الزام لگایا کہ گورنر نے نائب وزیراعظم دیوی لال کے ساتھ ادنیٰ سلوک کیا ہے اور اسلوب خلافی کی ہے۔ اس نے غصے میں آکر کہا۔ ”قوم کی عزت خطرے میں ہے۔ اس پر شتمل ہو کر جس وقت منگھنے جواب دیا ہمیں فی الحال اسلوب وغیرہ کے بارے میں بھول جانا چاہیے ہم قوم کے وقار کے بارے میں آپ کی تشویش کے سبھی واقف ہیں۔“

جب گاندھی نے کہا۔ ”میں ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں۔ کہ نائب وزیراعظم کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا اور اسلوب خلافی کی گئی ہے تو جس وقت منگھنے واپس جواب دیا۔ ”آئیے اس لمحہ ہم اسلوب کی بابت بھول جائیں ہم یہاں پر زیادہ سنبھلے کام سرانجام دینے کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ اور چھوٹی جھوٹی باتوں میں ہمیں اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔“

میں نے اس واقعے کو اپنے الفاظ میں بیان نہیں کیا تاکہ اس بارے میں ان الفاظ کے تبادلاً کی بابت مجھے پر شعوری یا غیر شعوری طور پر جھانبداری کا الزام نہ لگایا جائے اور پھر اس صورت میں جہاں میں ذاتی طور پر ملوث ہوں میں اس بات کا فیصلہ قارئین پر چھوڑتا ہوں کہ راجیو گاندھی کی طرف سے اتفاق رائے کی بات دو غلامین تھا یہ قطعاً ایک ملحقہ تھا۔ اس واقعے کی متذکرہ بالا تفصیلات سے کیا اس کے بڑے ارادوں کے بارے میں کوئی شک رہ جاتا ہے؟ وہ پہلے سے ہی اس بات کو دل میں طمان کر آیا تھا کہ میرے انتظامیہ کے لئے مشکلات پیدا کی جائیں میری توہین کی جائے اور کثیر فی توام میں میرے عکس کی افادیت کو کم کیا جائے۔ اس کی بدرازی اس وقت مزید بگڑی ہو گئی جب وہ اپنی بات پر ڈٹا رہا اور اس معاملے میں بھاری تعداد میں اہم ترین شخصیتوں کے درمیان دید و مرواہ نے اس کی بات کی قطعی طور پر تردید کی وہ اس حد کو فتح کئے بغیر بولتا رہا کہ اسلوب کی کسی حد تک خلاف ورزی کی گئی ہے۔ یہاں تک کہ اس نے داخلہ سیکریٹری شرمستی شرماسے مذکور کرنے کی کوشش بھی نہیں کر آخر حقیقت کیا ہے؟ سندسے آبرور

(۱۴-۱۱ مارچ ۱۹۹۰ء) میں یہ سما مصطفیٰ نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے۔

”دیوی لال نے کہا کہ گورنر نہیں مخصت کرنے کے لئے ایمرپورٹ تک آیا اور تمام عرصہ اس نے نہایت انکسار اند سلوک کیا۔ دیوی لال کے مطابق وزیراعظم نے اسے سری نگر جانے کے لئے رات ۳۰-۱۲ بجے کہا اور میں ممکن ہے کہ گورنر کو اس بارے میں کوئی اطلاع نہ ہو۔ جہاں تک بائیں یاد میں بیٹھنے کا سوال ہے دیوی لال نے کہا کہ ہم سب بیٹھ کر بائیں کر رہے تھے کہ گورنر آ گیا۔ اس نے مجھے دوسری کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا مگر بھاری بھر کم ہونے کی وجہ سے میں نے بلنا جلنا پسند نہیں کیا۔ اور اسے بیٹھ جانے کے لئے کہا۔ اس معاملے کو غیر ضروری طور پر مسخ کیا گیا ہے۔“

یہاں پر میں اس بنیادی مسئلے کی طرف پیردھیان دلاتا ہوں جس پر بائیں میں بات کی جی ہے اور باب پنج میں تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ ان خطرات اور جس سختی بدعت میں کثیر کو دھکیلا جا چکا ہے اس کا وجود اگر میں نے دوسری مدت کیلئے اس یقین کے ساتھ اس فریضے کو قبول کیا میں کہتا تھا کہ میرے اور وادی کے مسلمانوں کے درمیان بہترین رشتہ موجود تھا۔ سنگین صورت حال سے غصے کے معاملے میں مجھے ہاتھ بٹھانا چاہیے۔ اس امر کی ایک رپورٹ ۱۹ جنوری ۱۹۹۰ء کے ہندوستان ٹائمز میں شائع ہوئی ہے۔ اس نے کہا۔

سری نگر کے عوام نے جگموہن کے گورنر کے عہدے پر واپسی کا غیر مقدم کیا ہے اسے یہاں پر جگ وائل اور سر اکرام کے ناموں سے مقبولیت حاصل ہے یہ نام اسے غصہ و خفت اور شفقت کے سبب حاصل ہوئے ہیں کیونکہ اس کے دل میں کشمیریوں کی قسمت سنوارنے کے معاملے میں بھاری جذبہ ہے۔ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ جب دوسری مدت کے لئے تقرری کی خبر عوام نے سنی تو پائین شہر میں پٹا خے چھوڑے گئے۔

پھر کوئی سی بات غلط ہو گئی۔ مقبول عکس کو کس نے پارہ پارہ کیا؟ خوشی کے اس ماحول کو کس نے تباہ کیا؟ سازگار ماحول میں زہر کس نے بھرا۔ لازمی طور پر پاکستان قوا از حلقوں کا اس میں ہاتھ ہے لیکن حقیقی نقص تو راجیو گاندھی ڈاکٹر فاروق عبداللہ اور ان کے قاریوں اور برادر یوں کے نہایت تنگ اور منکرانہ انداز فکر کی وجہ سے ہوا۔

ترب مخالف کے لیڈروں کو اگرچہ یہ حق بجانب طور پر حاصل ہے کہ وہ برسر اقتدار حکومت کی نکتہ بندی کریں مگر کثیر اور عام طور پر ہاں پر موجود حالات کے پیش نظر راجیو گاندھی کے ان افعال اور عزتوں دارہ بیانات کی بدولت قومی مفادات کو بھاری زک پہونچی۔ کل جماعتی میٹنگ میں اس کا رد یہ اس طرز عمل کا عقد تھا تو اس نے وی پی سنگھ حکومت کے عہدہ سنبھالنے اور خاص طور پر میری تقرری کے بعد اپنا یا تھا۔

راجیو گاندھی کی صدقہ دلی ان طنزیہ باتوں سے جہاں ہے جو اس نے کل جماعتی کمیٹی کے سربراہ کے دورے

سے قبل بھی یقیناً۔ ۱۹ مارچ کو اس نے اخبار نویسوں سے کہا کہ اس نے وزیراعظم وی پی سنگھ سے کہا کہ وہ انہوں سے کہیں کہ وہ اسے اور دوسرے کانگریس (آئی) لیڈروں کو کرسمس پاس جاری کریں تاکہ وہ سری نگر کا دورہ کر سکیں اس نے بھی کہا کہ جب کل جماعتی میٹنگ میں کئی مرتبہ بحث کی جا رہی تھی تو وی پی سنگھ پر غنودگی طاری تھی اس قسم کی باتیں اس جذبے کے ساتھ شاید ہی مل سکتی تھیں جس کے بارے میں وہ اور دوسرے لیڈر بار بار طوطے کی طرح رٹ لگاتے تھے اور انہیں ہندوستانی سیاسی منظر کی حقیقتوں کا قطعی احساس نہیں تھا۔

عام طور پر اخبارات نے سرینگر کی میٹنگ میں راجیو گاندھی کے موقف کی نکتہ چینی کی سٹیبلین نے مثال کے طور پر کہا۔

”نازک مزاج راجیو گاندھی پہلے تو تم گورکھ دھندے کا جال بچھاتے ہو اور پھر تم اور تمہارے ساتھی شہید بننا چاہتے ہو اور اندر اور باہر اپنے تروجن گھوڑوں کی حمایت سے خود ہی بیدار کئے جان پر حکومت کو نظر ثانی کے لئے مجبور کرتے ہو کل جماعتی میٹنگ میں تم اور تمہارے رفقاء کی ضد تھی کہ کل جماعتی کمیٹی کو لازمی طور پر وادی میں جانا چاہیے تم اور تمہارے لوگ کچھ ایسی چیز کی پردہ پوشی چاہتے تھے جو تم نے اپنے واحد ہاتھ اس وقت پسیدہ کی۔

دیوی لال کی نائب وزیراعظم کے طور پر پوزیشن کے لئے تمہارا جملہ اور گورنری طرف سے اُسے دکھائے گئے اخلاق کا پتہ فقہان اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ تمہاری ایما پر کشمیر میں کل جماعتی پہل کسی جادوگری تماشے سے کم نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ سرحد پار کے لوگ اور وادی میں ان کے ہمدردوں کے اس بات سے جو صلیہ بلند ہو چکے ہونگے کہ سابقہ وزیراعظم امتیاز باپتیاں کر رہا ہے۔ گاندھی آخر یقیناً کب عقل آئے گی؟ یا تم وزیراعظم یا اس کے نائب اور اس کے وزیر داخلہ کو تجویز کیوں نہیں پیش کرتے کہ یہ وادی تمہاری پسند کے کسی شخص کو تحفے کے طور پر دے دی جائے؟

وادی کی صورت حال کی تفصیلات بیان کرتے وقت میری خواہش تھی کہ تضادات سے احتراز کیا جائے خاص طور پر کانگریس (آئی) اور نیشنل کانفرنس متضاد سوالات اٹھانے پر تکتے ہوئے تھے اور میں جواب دینے سے چمکیا رہا تھا۔ مگر ایک مرتبہ دلیل دی کہ چند معاملوں کی وضاحت میں نائب وزیراعظم اور وزراء نے کابینہ کو دوں گا۔ جو مناسب طور پر سیاسی نمائندوں کے ساتھ اسی پر تبادلہ خیالات کریں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہمراہ نہ تو ذرا اٹح کابینہ اور نہ ہی وزارت داخلہ کے ایسا کامیاب فرما کرنے کے حدود و احاطہ کے بارے میں کچھ جانتے تھے۔ اس بارے میں میری طرف سے تامل کے متذکر اس ٹیم میں مرکزی وزیر اور اس سے پہلے مجھے یقین دلایا کہ معلومات حاصل کرنے کا یہ سلسلہ محض حالات کا اندازہ کرنا ہے جس میں تمام متعلقہ معاملات شامل ہیں اور جو کچھ کہا جائے گا وہ اس کرے سے باہر نہیں جائے گا۔

متذکرہ بالا یقین دہانی پر میں نے صورت حال کا جائزہ پیش کیا جس میں سیاسی سماجی اقتصادی اور مذہبی طاقت کے ظاہری اور باطنی اثرات شامل ہیں۔ میں نے انہیں واضح کیا کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ نصاب اور برگزیدہ روایت اور وقت کی حوصلہ افزائی کی جائے اور ان کثرت اور بنیاد پرست طائفوں کے ساتھ سختی سے نہا جائے۔ جنہیں جماعت اسلامی اور پاکستان نوازوں سے تحریک حاصل ہے۔ میں نے ان متبادل راستوں کی ایک تھلک بھی پیش کی جو مستقبل کے طرز عمل میں متسر آسکتے ہیں۔ آہستہ آہستہ تعمیل کرنے کی جو وجوہات تھیں ان کا بیان میں بابہ بارہ میں چکا بولا۔ بعض اوقات اس میٹنگ میں گرمی آجاتی شاید اپنے ہمراہ آئے معاونین کی رائے پر راجیو گاندھی مجھے مسلم مخالفت گردانتے پڑتا ہوا تھا۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ میں اس حد تک مسلم نوجوانوں کے ساتھ رابطہ قائم نہ کرنے پاؤں کہ میں نے ۱۹۸۶ء کے گذشتہ عہد حکومت میں کیا تھا اور کافی مقبول ہوا تھا وہ یہاں تک کہہ گیا کہ میں نے اپنے پہلے گورنری راج کے دوران دفعہ ۳۰ کی بابت کیا سفارش کی تھی۔ یہ ایک انتہائی نازک معاملہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وادی کے مسلمان اس بات کو سمجھیں کہ میں دفعہ ۳۰ کو قائم رکھنے کے حق میں نہیں تھا۔ مگر میں سوچتا رہا تھا کہ اس وقت میری سوچ کیا تھی میری سوچ ایک بالکل الگ پہلو سے کام کر رہی تھی اور یہ سوچ عمومی اصلاح ریاست کے سیاسی اور انتظامی ڈھانچے کی تنظیم کے ساتھ وابستہ تھی۔ میں نے دلیل پیش کی تھی کہ دفعہ ۳۰ کا استعمال منہ اور پرست عناصر کی طرف سے اپنے اقتدار کے گھونسلوں کی تعمیر اور حکمران ٹولے کے لئے بے پناہ مالی فائدے حاصل کرنے کے لئے کیا جا رہا ہے میں نے اس بات پر زور دیا تھا کہ کشمیر کے غریب عوام کے مفادات میں دفعہ ۳۰، مگر ختم کر دینی چاہیے مگر راجیو گاندھی کو اس حقیقت کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی اس کا مقصد تو یہ تھا کہ کشمیری عوام کی نظروں میں میرے مرتبے کو کم کیا جائے اور اس میں وہ کامیاب ہو گیا۔ رد و اخبارات نے جلد ہی دفعہ ۳۰ کے تینوں میرے منصب کے بارے میں خبریں شائع کرنا شروع کر دیں توڑ موڑ کر بیان اور افواہوں کا دور چل پڑا اس سے میری پوزیشن اس مرحلے پر کمزور ہو گئی۔ جب کہ اسے مضبوط اور مستحکم بنایا جانا چاہیے تھا۔

یہ میٹنگ ۳۵-۳۶ بجے بند ہو چکی تھی۔ زیادہ بات چیت میں نے ہی کی مجھے چند شرکاء کے صریح طرز اندازہ رقبے سے ملوئی ہوئی تھی جو سری نگر میں آکر قومی اتفاق رائے کو ٹھونڈنے کے معاملے میں انتہائی جلد بازی میں تھے۔ میں اندر ہی اندر سوچ رہا تھا کہ ہم کس حد تک زوال پذیر ہو رہے ہیں؟ حقیقت پر تنقید انصاف اور قوم کی پیروی کے تمام تر اصول سب ادنیٰ سیاست پر قربان کئے جا رہے ہیں۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ یہ سب ہمارا گاندھی کی سرزمین پر ہو رہا ہے جس کا یقین ہے کہ اصولوں سے عاری سیاست موت کے اس جال کی طرح ہے جہاں قوم کی روح کو ہلاک کیا جاتا ہے۔

۳۶ بجے دوپہر کا کھانا کھا لیا گیا اس میں اخباری نمائندے بھی شامل ہوئے۔ ہر ایک نے دیکھا کہ راجیو گاندھی ان کے ساتھ گفتگو کر رہا ہے اور مجھے پتہ چلا کہ یہ سب میٹنگ کی بابت اتفاقاً یہ یقین دہانی کی خلاف ورزی تھی جو چند گھنٹے قبل دی گئی تھی۔ اگلے روز اخبارات میں جو کچھ شائع ہوا اس نے میرے خدشات کی توثیق کر دی۔ عملی

طور پر اپنی رنگت دے کر سب کچھ بتایا جا چکا تھا۔

غلام نبی آزاد اور ایل فوٹو دار ایک جانب کی میز پر اپنا کھانا کھا رہے تھے۔ میں نے ان کے ساتھ مصافحہ کیا، ہم نے بات چیت شروع کی آزاد نے کہا: "میں آپ کی حالت پر رحم آتا ہے آپ نے اپنا پہلا عہد اس شان سے ختم کیا کہ عوام آپ کو نہایت خلوص کے ساتھ یاد کرتے تھے وہ آپ کو غریبوں کا مہیا تھے تھے اور آپ کی تم غلے کو تیار تھے مگر آج وہ آپ کے خون کے پیاسے ہیں۔ میں نے کہا: آپ ٹھیک کہتے ہیں یہ میری بد نصیبی ہے کہ مجھے ایسے حالات میں سبھاں آنا پڑا جہاں میرے پاس اس طریقے کے سوائے کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ پہلے کشمیر کو بچایا جانا لازمی تھا اگر میری شہرت کو نقصان ہوا تو اس کی تلافی بعد ازاں کی جاسکتی ہے۔ مزید برآں اہم سوال یہ ہے کہ کیا میں سطحی مقبولیت کا سارا شیعہ کیٹ حاصل کرنے کے لئے کام کروں یا کشمیر کو کھڑی چٹان کے دبانے سے بچاؤں۔ مجھے یہ معلوم نہیں کہ آپ کی ٹیم جارحانہ گیند بازی کیوں کر رہی ہے۔ اور فوج پر ہر قسم کے بے جا میر BLIMPERS کیوں مار رہی ہے آپ اور آپ کی جماعت مجھے اچھی طرح جانتے ہیں تو پھر آپ تمام قسم کے الزامات بھج پر کیوں عائد کر رہے ہیں؟ آپ کے ساتھ میں ہر مشکل میدان میں کھیلنا ہوا خواہ وہ دہلی گویا کشمیر ہو۔ مگر اب اچانک آپ کو پتہ لگا کہ میں بالکل ننگا اور نا کارہ ہوں میں مسلم فی الف ہوں کشمیری مخالف ہوں۔ سی پی آئی اور سی پی آئی ایم کو ہی دیکھیے۔ کسی نے ۱۹۸۶ء کے بعد میرے خلاف پکڑ نہیں کیا جب میں دہلی کا لفٹیننٹ گورنر تھا (۱۹۸۰ء) تو ان کے کارکن میرے ارد گرد جمع ہوا کرتے تھے۔ ان کے اخبارات تقریبوں کے بل باندھتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں نے غریب کسانوں کے حق میں سختی سے کارروائی کی جنہیں مندرجی کے طاقت و جاگیر داروں نے اپنے حق سے خروم رکھا تھا۔ مگر اب انہیں اچانک معلوم ہوا ہے کہ میں متنازع ہوں۔ کسی اور بات کے مقابلے مجھے بھروسے الزامات سے زیادہ رنج ہوتا ہے۔ وشنام طراری تیل کی طرح جتنی ہے اور صاف کئے جانے کے بعد بھی اس کے بدینا نشانات موجود رہتے ہیں۔ اگر آپ کو میری تقریر پر واقعی کوئی اعتراض تھا تو آپ کو اس کے اعلان کے فوراً بعد ہی مجھے ٹیلیفون کر دینا چاہیے تھا تاکہ میں اسے قبول کرنے سے قبل اس پر دوبارہ غور کرتا۔ اب چونکہ میں یہاں آچکا ہوں اور مجھے حالات کی انتہائی سنگینی کا احساس ہے۔ مجھے پتہ ہے کہ اگر میں ۲۶ جنوری تک یا اس کے پاس بروقت کارروائی نہ کرتا تو کیا ہو چکا ہوتا اور اب چونکہ میں نے تمام خطرات اٹھائے ہیں اور تمام نام مقبول کام کئے ہیں۔ میں تب تک کشمیر سے نہیں جاؤں گا۔ جب تک کہ اسے فوجی بندھن میں پوری طرح نہیں باندھ لیا جائے گا۔ یہ دھماکہ کمزور نہیں بلکہ مضبوط اور لٹ ہوتا جا رہا ہے۔ میرے اندر کوئی اور جذبہ نہیں ہے میں کوئی تنخواہ وصول نہیں کر رہا۔ خطرات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ہر کہنے کی تمول کی زندگی میں خطر آ رہا ہے کہیں جی کچھ یکساں نہیں ہے "آزاد واضح طور پر پریشان تھا اس نے کہا: "سو کیسے کیا ہوتا ہے؟" ہم بھی سکڑا دیے اور "جی" ہو گئے۔

نیا نیشنل کانفرنس میں آزاد نے شیعہ و سنیوں کی اور ان کے درمیان کے فرقوں کے خلاف اس حد میں اتفاق کر لیا۔

لیڈروں کو بلایا جاتے۔ میں نے اور ایڈمنسٹریشن کے باقی رفقاء نے اُسے بتایا کہ اتنے قلیل نوٹس پر یہ ممکن نہیں۔ شہر میں کرفیو ہے۔ دفتر بند ہیں کسی عہدیدار کا نام نہیں بتایا نہیں گیا اور گورنر اور اس کے شیروں سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ موجودہ عہدیداروں اور ان کے رہائشی پتوں کے بارے میں انہیں معلوم ہو۔ اگر راجیو کسی گروپ کے ساتھ ملاقات کا استنباطی مقصد تھا تو اس نے ہمیں پیشگی اطلاع کیوں نہیں دی۔ مگر اس مطالبے کی غیر موزونیت کو محسوس نہیں کیا گیا ارادہ یہ تھا کہ ہمیں پریشان کیا جائے۔ نہایت انکساری کے ساتھ ہم نے کہا کہ ہم کوشش کریں گے اور میں نے مقامی پولیس افسروں سے کہا کہ جو کچھ بھی وہ اس معاملے میں کر سکتے ہیں کریں۔ ابھی میں ڈائنگ ہال میں کھڑا افسروں کے ساتھ ٹوگفتگو ہی تھا کہ ایڈمنسٹریشنل چیف سکریٹری محمود رحمان آیا اور اس نے کہا: "وہ پریس کانفرنس کرنے جا رہے ہیں۔ اور وہ چاہتے ہیں کہ آپ کیٹی روم میں آئیں۔"

جو بھی میں اس کمرے میں داخل ہوا کانفرنس شروع ہو گئی۔ حکومت ہند کے پریس ایڈوائزر رام موہن راؤ کے ساتھ پہلے ہی مشورہ کیا جا چکا تھا کہ پریس کو کیا بتایا جانا ہے چند مختصر ابتدائی باتوں کے بعد پریس ایڈوائزر نے ادھر ادھر کی باتیں کرنا شروع کر دیں جس سے عیاں تھا کہ اس مختصر عرصے میں کشمیر کی پیچیدہ صورت حال کو سمجھنا کس قدر مشکل کام تھا۔ اس کے بعد دیش گو سوامی میدان میں آگیا وہ کہہ گیا کہ مرکزی حکومت عسکروں کے ساتھ گفت و شنید کی مخالفت نہیں میرے خیال میں یہ نہایت افسوسناک بات تھی جس سے پتہ چلتا تھا کہ کشمیر کے معاملے میں مرکزی حکومت کی منہل کمزور تھی کہ وزیر داخلہ بار بار یہ کہہ رہا تھا کہ عسکروں کے ساتھ کوئی بات نہیں کی جائے گی۔ مگر وزیر قانون دودھ گروہری وزیر اعلیٰ کے ساتھ سرنگم آکر بالکل برعکس بات کہہ رہا ہے۔

شاید وزیر قانون کو اس کی غلطی کا احساس ہو چکا تھا چنانچہ اُسے اخباری نمائندوں کے بار بار کریدنے والے سوالوں کا جواب دینے میں دقت محسوس ہو رہی تھی۔ اپنے تجربے اور عام فہمی کے سبب مائیکروفون اس نے میرے سامنے کر دیا۔

میں نے پریس کانفرنس کو صحیح سمت دینے کا موقع حاصل کر لیا۔ میں نے عرض کیا: "یہ معلومات ہم پہنچانے کا مقصد کل جماعتی ٹیم کو ہی اس بابت آگاہ کرنا تھا کہ صورت حال کی کیا حقیقتیں ہیں اور صرف انہیں کے استفادے کے لئے نہیں بلکہ انہیں سماجی، اقتصادی اور مذہبی طاقتوں کا جائزہ پیش کیا جو وادی میں سرگرم عمل ہیں۔ میں نے غیر جانبدار اور منصفانہ ایڈمنسٹریشن اور ایسی ترقی پر زور دیا جو عوام کے فائدے کے لئے ہو۔ اس مرحلے پر اس سے زیادہ تفصیلات نہیں بتائی جاسکتیں کیونکہ میں نے جم کو اس یقین دہانی پر معلومات فراہم کی ہیں کہ جو کچھ میں نے بتایا وہ اراکین تک ہی محدود رہے اور یہ باتیں کسی اور کو نہ بتائی جائیں۔"

پریس نے وزیر قانون کے بیان کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مرکزی حکومت کے عسکریوں کے ساتھ بات چیت کے

ارادے کو کلیدی سرخیوں کی صورت میں شائع کیا تو نیکہ انتظامیہ پر اس کا تو صلہ شکن اثر ہونا گزیر تھا اور اس سے اس موضوع پر منتشر ہونی کیفیت کا اظہار ہوتا تھا لہذا اگلے روز حکومت ہند کی طرف سے تردید جاری کرنا پڑی۔

میں جو مل لابی کے ایک کونے میں بیٹھا ہوا تھا اچانک ہمیں ہوٹل کے دوسرے کونے سے بلند نفروں کے آواز سنائی دی تم نے دیکھا کہ راجہ گاندھی اور نیشنل کانفرنس ممبران پارلیمنٹ بٹ اور ہندو پروگرسو جیڈا رہے ہیں۔ بعد ازاں معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ بٹ نے راجہ گاندھی کے پاس وہ گروپ لایا تھا جو اس کے خیال میں اس کی طرف داری کرے گا مگر اٹلے وہ اس کے خلاف ہو گئے اور اپنا مقصد اس پر ناکام لایا۔ انہوں نے بٹ سے کہا: تم ہمارے نمائندے کیسے بن گئے جو تم نے کبھی تمہیں نہیں چنا۔ تم اپنے آپ کو آخر کیا سمجھتے ہو۔ تم ٹی دہلی میں اپنے بند بنگلے میں بیٹھے ہو۔ تم بیان جاری کرتے ہو۔ تم سوچتے ہو کہ اس طرح ہمارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔ کیا تمہاری ہی کاہل ہے؟ تم کس کو بیوقوف بنا رہے ہو۔ اور راجہ گاندھی تم جب نئی دہلی میں ارباب اختیار تھے تو کبھی یہاں نہیں آئے۔ تم نے سوچا تمہارا شہزادہ فاروق تمہارے نام پر حکومت چلا رہا ہے وہ کُند ذہن ہے خوشی کی تلاش میں ککالف کیسے والا شہنشاہ ہے۔ اس نے ہمیں یہ وقوف بنایا اور جب بھی اُس نے چاہا ہمارا قتل عام کیا۔ آج وہ اور اس کے سرپرست تم مگر ٹھیکے کے آئسوہار رہے ہو۔ چلے جاؤ۔ دفعہ ہو جاؤ تم تمہیں یا اس سحر مندے شخص بٹ سے نہیں ملنا چاہیے۔ اس کے بعد بہت سے لوگوں نے مل کر "ہندوستانی کتو واپس جاؤ" کے نعرے لگائے اور ان میں ہوٹل کا عملہ بھی شامل ہو گیا اور اس طرح کے نعرے لگائے لگائے۔

اخبارات نے اسی طرح کی تفصیلات بیان کیں مثال کے طور پر کیشیر کا گزرنے کا اطلاع دی۔ جب ٹمپر شیف بٹ نے کچھ کہنا چاہا تو ان افراد نے اسے ٹوٹ کر کہا: تم ہماری جانب سے نہیں بول سکتے۔ تم نے ہمیں دھوکہ دیا ہے۔ ہم نے کبھی تمہیں ٹوٹ بھلے نہیں چننا۔

اس مرحلے پر راجہ گاندھی نے واضح کرنا چاہا کہ اس نے اگر مذکورہ غیری خواہم کی پیروی کے لئے کیا تھا۔ اُسے
 ہونے انفرادی سے ٹوک کر کہا: تم نے یہ اگر مرفا و رفیع عبد اللہ کے ساتھ کیا تھا؟
 جب یحییٰ لال فطیلہ از غلام نبی آنکلا اور پی ایل میٹروپولیٹن علاقہ میں آئے اور اکیمن کو ٹھنڈا کر سکی کوشش
 کی تو انہیں نے واپس پوٹ کی۔ دہلی کے ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھے ہوئے تھیں کثیر کی حالات کے بارے میں کیا مسلم
 ہے۔ تم لوگوں نے اپنے عہد حکومت میں رشوت کو کتنی گنا کر دیا ہے۔ تعمیر و ترقی کا کوئی کام نہیں ہوا ہے محض چند کنٹرول
 نے دولت جمع کر لی ہے۔ تم لوگ کس بارے میں بات کرنا چاہتے ہو؟

اس وفد کے اراکین نے بھارتی کنوینشن جگہ پر آزادی چاہتے ہیں جس کے مغزے اگلا مشورہ کر دیا۔
نائب وزیر اعظم اور مرکزی وزیر قانون کے ساتھ ملاقات کے لئے کئی پریس کنفرانسوں کا ایک وفد بھی آیا۔ اس
سے دارا گین احمد ایسی جانستہ اور سہولتوں والے ان لوگوں کو ملے جو ان کے مسائل سے مرسل فوق واجل

کے سائے میں رہ رہے ہیں۔ ایک مکروہ سازش کے تحت ستمبر ۱۹۸۹ء سے ہم بے وطن کئے جا چکے ہیں اور سبھا رات نکل عام ہو رہا ہے ہمارے طبقے کے اراکین ہماگ رہے ہیں۔ نذوکر کزی اور نہ ہی ریاستی حکومت نے ہماری آہ و فغاں کو سنا۔ جتو اور سپر اکثر اوقات جذبات غالب آتے رہے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ جس سے گرد و پلاس کا ماحول دوبارہ یاس سے بھر گیا۔

اس وقت ہوٹل کے دو ویٹر چائے خرچہ کر رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ انہیں اس بات کو سننے کا بھیاری تجسس ہے۔ میں اس خطرے کو بھانپ گیا جس میں ان دو لیٹروں نے خود کو ڈال دیا تھا میں نے ڈائریکٹر جنرل پولیس کو مشورہ دیا کہ وہ ان لوگوں کی سلامتی کا خیال رکھیں۔ ڈائریکٹر جنرل پولیس نے بتایا کہ سراسر فاسفی اطلاعات کے مطابق اگر جتو اور سپروادی سے باہر نکلے گئے تو انہیں ہلاک کر دیا جاسکے گا۔ درحقیقت سپرو کو اسی رات کافی زردو کو بکینا گیا اور سول ہسپتال میں داخل کیا گیا جہاں سے ہم اُسے فوجی ہسپتال اور بس انڈال جموں لے گئے۔ کئی مہینے میں شکایت بھی کرنا یا رینڈ اور افسوس کے اظہار کا مطلب تھا یقینی موت۔

دہلی لال کو رکھیں اور لکھنؤ جنرل لے ذکی سے ملنا چاہتے تھے میں نے اس ملاقات کا انتظام کر دیا جنرل نے نائب وزیر اعظم کو بتایا کہ صورت حال کیا ہو چکی تھی اور گورنری راج سے قبل دہشت گردوں نے کس طرح شہری انتظامیہ کو مخلوج کر کے رکھ دیا تھا۔ اور بعد ازاں شہری اور فوجی انتظامیہ حکام کی رابطہ مشینری کو کس طرح مضبوط بنایا گیا تھا۔

اگلی صبح ۹ مارچ میں دیوی لال اور کٹی کے دیگر اراکین کے ساتھ ایئر پورٹ تک جانے کے لئے سنٹر ہوٹل پہنچا جب میں ہوٹل کے پورٹیکو تک پہنچا تو میں نے وہاں پر ایک بھاری ہجوم دیکھا۔ یہ کافی پرستار و تھا میں نے دیکھا کہ نیشنل کانفرنس ممبر پارلیمنٹ محمد شفیع بٹ ایک اور ڈرامہ پیش کر رہا تھا۔ ایک ڈرامیٹر جیسے سی آر پی نے میٹ پیٹ کر قریب ہلاک کر دیا یا ان کی لگا لگا ہوا ٹانگ ڈھیرے بھرتے لایا گیا تھا کہ وہ دیوی لال اور راجیو کا ندھی کو نیم فوجی دستوں کے جبر و استبداد کی بابت بتا سکیں جس کی وجہ سے ریاستی حکومت کے ڈرامیٹرز نے ہڑتال کر دی ہے۔ جب یہ معاملہ میرے سامنے لایا گیا تو میں نے کہا کہ اس کی بابت میں تحقیقات کروں گا میں اس بارے میں کوئی دلیل یا گری نہیں چاہتا تھا۔ سی آر پی کے افسر اس ڈرامیٹر کی مصدوعی درد کے بہانے پر کافی ہیش میں تھے مگر میں نے انہیں خاموش رہنے اور کسی کے ساتھ دلیل بازی نہ کرنے کا مشورہ دیا۔ مجھے فکر تھا کہ صورت حال کو ناخوش گوار مومنوں سے بچایا جائے۔

ایمانک تبدیلی

جیسے ہی اس وفد کے اراکین کا رول میں بیٹھنے والے تھے، مرکزی داخلہ سیکرٹری نے مجھے بتایا کہ کمیٹی جنوں نہیں بھاری بلکہ یہ براہ راست دہلی جائے گی، میں نے سوچا کہ اس سے جنوں کے عوام مدظن ہو جائیں گے۔ انہیں

چوٹ پہنچنے لگی اور اس بارے میں ان کے جذبات کی ٹیم کو پروا تک نہیں تھی۔

میں نے جب پوچھا کہ اس اچانک تبدیلی کی کیا وجوہات میں تو داخلہ سکرپٹری نے مجھے بتایا کہ انہیں ٹھیک سے کچھ معلوم نہیں ہے بس اتنا معلوم ہے کہ دیوی لال اور راجیو گاندھی کے درمیان کوئی بات ہوئی ہے اور کیونے جوں تک پرواز کرنے کا پروگرام منسوخ کر دیا ہے معلوم ہوا کہ اس تبدیلی کی اہم وجہ یہ ہے کہ راجیو گاندھی کا نگرہس اور نیشنل کانفرنس اراکین کو ان کے تیس جہوں میں جارحانہ مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا بعض جماعتی لیڈروں نے اُسے ٹیلیفون کیا تھا اور اُسے مشورہ دیا تھا کہ وہ جہوں نہ جائے کیونکہ اس کے نظریات سے جہوں کے خواہ مخواہ آیتا بہر کیف راجیو کا مقصد تھا کہ وہ میرے لئے اوپنیشنل فرنٹ حکومت کے لئے پریشانیاں پیدا کرے اور یہ مقصد حاصل کر لیا گیا تھا۔

وجہ خواہ کچھ بھی ہو اس پروگرام میں اچانک تبدیلی، یہاں تک کہ گورنر اور اس کے میٹروں یا انفرنگ کو مطلع نہیں کیا گیا بات نہایت انصاف کن تھی۔ اس سے جہوں کے خواہ مخواہ ہونگے اور حکام کے لئے امن و امان کا سنگین مسئلہ بھڑا ہو گیا کشمیری ہمارے جن نے اسے بزدلانہ فعل سمجھتے ہوئے سڑکوں پر مار بجایا۔ وہ راجیو گاندھی اور ڈاکٹر فاروقی عبداللہ کی مذمت کر رہے تھے۔ ایک سو سے زیادہ وکیلوں نے ایک غصیلہ میان دیا جس میں جہوں کے تیس اس ٹیم کی بے اعتنائی کی مذمت کی گئی تھا اور بڑھ گیا میں نے جہوں میں انفرنگ کے ساتھ رجوع کیا اور انہیں تلپن کی کہ ہر ممکن طریقے سے امن بنائے رکھیں اور خواہ اسے میری طرف سے اپیل کریں کہ وہ غصے میں نہ آئیں بہر کیف حالات کو ہاتھ سے نہیں لگنے دیا گیا

ایک اور بات جسے بہت کم سمجھا اور تسلیم کیا گیا ہے مگر میرے خیال میں یہ نہایت اہم ہے کہ وادی کشمیر کے واقعات کے طور پر میں نے جہوں اور لداخ میں رد عمل کا دھماکہ ہونے سے روکا۔ ان خطوں کے خواہ مخواہ نے ماضی میں پیاد وخت اور رابطہ میرے ساتھ رکھا ہے اور جہوں میں تعمیر و ترقی سمیت مختلف معاملوں میں میں نے جو سرعت رفتاری سے کاروائی کی اس کی وجہ سے میرے جیسے بڑے بڑے وکلاء و رکنے میں کامیاب رہا۔ مثال کے طور پر ہرجنوری کا بہانہ میں خراب موسم کی وجہ سے میرا اہل کار بھر سکی مگر تک پرواز نہ کر سکا تو مجھے جہوں میں ہی قیام کرنا پڑا چنانچہ میں نے جہوں کے مختلف علاقوں کا دورہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تاکہ ان ترقیاتی پروجیکٹوں پر کام دوبارہ شروع کر سکوں جو میں نے ۱۹۸۶ء میں شروع کئے تھے مگر بعد ازاں کی وزارت نے انہیں نظر انداز کر دیا تھا۔ ان پروجیکٹوں میں نوکیرو فرٹ انٹرپرائز، روڈ اور ہمدایا پروجیکٹ شامل ہیں۔ جہوں کے خواہ مخواہ اس بات کے قابل ہو چکے تھے کہ ان کے خطے میں ایک مرتب پھر تیز رفتار ترقی ہونے لگے گی۔ ان میں ایمید پیدا ہو چکی تھی اور دسمبر ۱۹۸۹ء اور جنوری ۱۹۹۰ء کے دوران ان کے اندر کی ترقی کی ہو چکی تھی۔ اگر اس وقت تمام ترقیاتی خطوں میں گڑبڑ شروع ہو جاتی تو صورت حال تباہ کن بن جاتی اور اس کا خیمہ زہد صرف ریاست بلکہ پورے ملک کو جگمگاتا پڑتا۔

نیشنل کانفرنس کے ایک لیڈر سچر جنرل دریشا ٹرڈی۔ این دورے آئی دے دیا۔ وہ اس جماعت کے سابقہ فوجیوں کے شعبے کے صدر بھی تھے۔ اس نے وادی کے حالات کے لئے نیشنل کانفرنس اور کانگریس آئی گورنر دار قرار دیا جس کی وجہ سے مصیبت زدگان کشمیری پنڈتوں کو اپنے گھر بار چھوڑنا پڑے۔ اس نے میرے کردار کو اس صورت حال میں ایسے ایک موجد سی کر قرار دیا۔

سرینگر انٹرپرائز پر بھی مصیبت نے ہمارا چہا نہیں چھوڑا۔ جبکہ اہم شخصیتوں کا تمام کارواں انٹرپرائز پر پہنچ چکا تھا اور نائب وزیراعظم اور راجیو گاندھی ہوائی جہاز میں بیٹھ چکے تھے۔ میں نے دیکھا کہ الگ بس میں سوار اخباری نمائندے نہیں پہنچے تھے۔ سلامتی کی نظر سے ہم نے اس قسم کا انتظام کیا تھا کہ کسی گاڑیاں ایک ہی قافلے کی صورت میں چلیں گی اور ان کی سخت حفاظت کی جائیگی۔ بس نہ پہنچنے کی وجہ سے بڑے تشویش ہوئی اور جب مناسب وقت سے زیادہ دیر ہو گئی تو میرا فکر غصے میں بدل گیا۔ راستے میں غائب بس کی تلاش میں میں اور ڈائریکٹر جنرل پولیس اور دوسرے افسر بار بار کوشش کر رہے تھے۔ چند تکلیف دہ لمحات کے بعد معلوم ہوا کہ جارج فرنانڈس نے بس کو ہوٹل میں ہی روک لیا ہے اور اس نے پریس کانفرنس سے خطاب کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہر کام بے ربط اور تھوڑا خیال کے بغیر ہو رہا تھا۔

جب یہ دونوں جہازوں وے کا چکر لگا کر گریستے ہوئے ہوا میں ٹپ دہلی کی جانب پرواز کر گئے تو ہم سبھی نے راحت کی سانس لی۔ حالانکہ انہوں نے اپنے پیچھے تضاد اور تناؤ ہی چھوڑا اور جارج فرنانڈس نے ٹکی کو بتائے بغیر اپنا پروگرام تبدیل کر دیا۔

اس دورے کے خیمانے

کل جماعتی ٹیم کا دورہ تباہ کن ثابت ہوا ریاستی اسمبلی کی تحلیل انتظامی شش کو درست کرنے اور غیر جانبداری اور معمارانہ پر مبنی فی راہ تلاش کرنے سے جو فائدے میں نے حاصل کئے تھے وہ زائل ہو کر رہ گئے۔ اس سے پاکستان اور آزادی نواز طاقتیں مستحکم ہو گئیں اور وہ اپنی پوزیشن مستحکم بنانے کے قابل ہو گئے۔ ان کے جذبات اور ایک مشترکہ دشمن کے خلاف مل کر نئے بازی سے انہیں بھاری تعویذ حاصل ہوئی خواہ وہ دشمن مسلم تھا یا خلی۔ بہر کیف جو ان جوان میری سکیم کے مطابق عمل کرنے کا ارادہ کر رہے تھے ان کے جذبات پر اوپر مذکورہ تمام پانچ پہلو جن کی نشاندہی میں نے اس باب کی ابتدا میں کی تھی پارہ پارہ ہو کر رہ گئے۔ بالادستی حاصل کرنے کے لئے ہم نے جو ماحول تیار کیا تھا وہ پراگندہ ہو گیا۔

اس دورے نے کشمیریوں کو یہ بھی بتا دیا کہ محلیہ مرکزی حکومت کی محسوس حمایت حاصل نہیں ہے۔ اس سے قوت اردو کا ابہام و متنازعہ ابھر رہا ہے۔ اس سے قومی اتفاق رائے کے اعلان شدہ مقصد کے بارے میں غلط فہمیاں سامنے آگئی۔ اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ بہت ساری سیاسی جماعتیں صورت حال کی حقیقت کو کس طرح پہنچتی ہیں۔

اور غلطیوں سے سبق حاصل کرنے کی انہیں کتنی کم پروا ہے اور وہ کہاں تک مسائل کے جڑوں تک جانا چاہتی ہیں سب سے زیادہ نقصان راجیو گاندھی کے رویے سے ہوا۔ اس نے قریباً وہی کردار ادا کیا جو نچر کا کر کرتے تھے۔ پیشینہ کے مطابق اس کے تبصرے کا مجموعی تاثر عسکرانوں کی بیٹیوں کو بھونکنے اور جگمگوں کے مخالف ہم کو بونے کے مترادف تھا۔ انھیں چکرورتی نے ۱۹۹۰ء کو اپنے تبصرے میں راجیو گاندھی کے کھلے عام قوم دشمن رویے کی مذمت کی۔ "سندے میل" میں اپنے مضمون میں گری لال مین نے راجیو گاندھی کے رویے کو "نہایت قابل مذمت" قرار دیا۔ ۱۳ مارچ کو اپنے ادارے میں انڈین ایکسپریس نے راجیو گاندھی کے غیر ذمہ دارانہ کردار کو نمایاں کرنے میں کسی شخص سے کام نہیں لیا۔ معاصرہ قطر از ہے

"کم از کم دو جماعتوں کا ٹکڑا کر دینا" اور نیشنل کانفرنس جو اس کیلئے میں شامل تھیں کا کردار انتہائی موقع پرستی کا آئینہ دار تھا اس سے اس ذہنی رجحان کی بھی تصدیق ہو جاتی ہے جو ذاتی اور سیاسی مفادات کو خواہ وہ لمبائی نوعیت کے کیوں نہ ہوں، ملک کے مفادات پر فوقیت دیتا ہے۔ کیا وہ کیلئے استعمال اپنے مقصد کے لئے نہیں کریں گے اور کسی نہ کسی طور ان کا دشمنوں کے راستے میں روکاؤں کھڑی نہیں کریں گے جو وادی کو بچانے کے لئے کھڑے ہیں۔ اس کیلئے میں شامل جو دوسری جماعتوں کے اراکین سرسنگر آئے انہوں نے بھی راجیو گاندھی کے رویے کی مذمت کی۔ ۱۰ مارچ کو ایک مشترکہ بیان میں سیلف الدین چودھری اور پبلک داس گپتا (سی پی ایم) ایل فاروقی اور اے ایس مہوثرہ (سی پی آئی) اور جسونت سنگھ اور کیدار ناتھ ساہنی (بی جے پی) نے کہا: "راجیو گاندھی نے اتفاق رائے کی خلاف ورزی کر کے پریس کو ان معاملات کی بابت معلومات فراہم کیں جن پر خفیہ طور پر بحث ہوتی تھی۔ اس نے دورے کے اہم مقاصد میں سے ایک کو ناکام بنا دیا کہ اس معاملے میں سیاسی حدود سے بالاتر ہو کر مشترکہ قومی تشویش کا اظہار کیا جائے، ہم اس کی طرف سے اپنا سٹے کئے اس قسم کے رویے کی مذمت کرتے ہیں۔"

کھتیر کے ہائے میں اداریاتی تبصرے اور سیاسی لیڈروں کے بیان میرے لئے کسی طور مددگار ثابت نہیں ہوئے۔ کام کیا جا چکا تھا۔ جارحیت کو ہوا دی جا چکی تھی شکوک پیدا ہو چکے تھے اور عام کشمیریوں کے ذہن میں میری پسلی خدمات کے سبب ایک ہمدردانہ مضبوطی کے طور پر جو گہرا تاثر تھا اسے ریزہ ریزہ کر دیا گیا تھا۔ خضر بیک راجیو گاندھی اور اس کے کانگریس (آئی) اور نیشنل کانفرنس کے رفقاء کا یہ حقد تھا۔ یہ ان کا طوطی بول تھا جس کے تحت وہ خواہی بہبود سالمیت کے معاملے میں درپیش چیزوں کے معاملے میں اتفاق رائے پیدا کرنا چاہتے تھے۔ مسیٹر سینے یا میری بیٹی پر مچر اگھو پینے سے شاید کوئی فرق نہ پڑتا حالانکہ یہ عمل بھی بے منطقی اور غیر اخلاقی تھا۔ ہم بات یہ تھی کہ کشمیر کے حالات کو مزید خراب کر دیا گیا اور ایک گل ہوتے شعلے میں تبدیل ڈال دیا گیا۔

جارج فرنانڈس

اظہار کیا اور میرے موقف کو واضح، جرات مندانہ اور صحیح قرار دیا۔ درحقیقت امور کشمیر کا وزیر ہونے سے قبل میرے بارے میں اس کی رائے شائش کن تھی اس سے قبل وہ اخباری نمائندوں سے کہتا تھا کہ گورنر کو ایک مشکل کام دیں گے اور کوئی بھی شخص یہ کام کرنے کا رشک نہیں کر سکتا۔ ۱۰ مارچ ۱۹۹۰ء میں شائع انڈین ایکسپریس کی ایک اطلاع کے مطابق جارج فرنانڈس نے اس کام کی شائش کی اور اس نے صورتحال کا مقابلہ کرنے کے لئے گورنر جو کام کر رہا ہے اس کی سراہنا کی جو گورنر کا کام نہایت دشوار ہے میرا خیال نہیں کہ ملک میں کسی اور فرد کو اس قدر مشکل کام دیں گے جو جگمگوں کو درپیش ہے۔ ذرائع ابلاغ کی ایک رپورٹ میں جارج فرنانڈس کو کہتے ہوئے بتایا گیا کہ ان حالات میں گورنر بہتر یہ کام کر رہا ہے "اس نے راجیو گاندھی کے رویے کو خیر فائدہ دار بتایا اس نے کانگریس (آئی) پر الزام لگایا کہ وہ میرے ہائے میں غلطی پر چارکر رہا ہے اس نے کہا:-

خدی دہلی میں ہونی کثیر جماعتی میٹنگ میں کانگریس (آئی) وفد کے ایک رکن نے یہ اس داستان پر باور کرانے کی کوشش کی کہ جگمگوں وہ شخص ہے جس کے دل میں مسلمانوں کے تین حقارت ہے۔ فرنانڈس نے یاد دلایا کہ یہ داستان ان چار مسلمانوں کی بابت ہے جو ہندوؤں کے عیسائی جگمگوں سے ملے اور اسے مسلح عسکرانوں کی طرف سے ہندوؤں میں خوف و ہراس پھیلانے کے ہائے میں شکوت کی اس داستان کے مطابق یہ بات سنستے جی جگمگوں آگ بگول ہو گیا اور جلد ہی کہ وہ مسلمانوں کو سبق سکھانے لگا اور اس نے ان کے خلاف نازیبا باتیں کیں۔ اس میٹنگ کے بعد یہ نوجوان واپس چلے گئے اور اس کی طرف سے دیے گئے غمی نثر پڑھنا یا کہ درحقیقت وہ مسلمان ہی ہیں اور اس نے مسلمانوں کے خلاف اس کے تاثرات کی صدا باندی کرنے کے لئے انہوں نے ملاقات کی تھی۔ فرنانڈس نے یاد دلایا کہ کانگریس (آئی) لیڈر کے مطابق یہ صدا باندیپ سرسنگر کے ہر چوک میں بجا یا جا رہا ہے۔

فرنانڈس جی کثیر جماعتی وفد کو وہ رکن تھا جس نے ہونل کے باہر نکل کر چند سرکاری حکومتی اہلکاروں اور شہریوں سے ملنے کی جسارت کی تھی جنہوں نے بتایا کہ کانگریس (آئی) لیڈروں کا یہ الزام سراسر غلط ہے۔ سوال کیا گاندھی نے یہ الزام دہلی میں کثیر جماعتی میٹنگ میں لگایا...

فرنانڈس اس وفد کی قیادت میں گاندھی کی گرد باقائدہ میں نے اپنے ذہن میں جو چوڑھا اس کی بابت جارج فرنانڈس کو سب کچھ بتا دیا کہ پاکستان تو آزاد کر گیا دنیا پر مسلمانوں اور دیگر مذہب کے قتل کر کے میں ایک نیا راستہ تراشتی ہیں ہوں تاکہ مسلمانانہ فیض آباد اور رشوت ستانی سے پاک ایک جمہوری نظام قائم کر سکیں۔ اور یہ کچھ دعائیہ منظر اس مقصد کے حصول کے لئے اس طرح ہمارے دو گار ہو سکتے ہیں۔ مجھے اس وقت یقین ہی نہیں تھا کہ وہ میرے انداز فکر سے ہی شروع کر کے آتی ہیں۔ بنالے مطابق اسے مؤردے کا درپ سے ہر بات یہ ہوگی کہ وہ اس کا استعمال وقت سے چلے اور نا پسندیدہ کر لیا۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ اگر جارج فرنانڈس میرے ساتھ مشورہ کر کے اوپنل عمل کریں رجحان بالائے منسوبہ پر کام کرنا اور وہ بھی من سب وقت پر کاروائی کرتا۔ مگر جارج کی ذاتی اور سیاسی بولہوتی اس پر فوقیت لے گئی۔ اس نے

آزادانہ طور پر اور یہاں تک کہ مخالف مقاصد کے لئے کام کرنا شروع کر دیا۔ جو بھی وہ وزیر امور کشمیر بنا تو اس نے سوچا کہ مسئلہ کشمیر کے حل کے لئے اسے تمام تر سائنس حاصل کر لینی چاہیئے۔ اور اس سے اس کو قوی عکس بڑھے۔ اس نے مجھے سخت روش ایک ناقابلِ تجویز اور تہنید و جنگجو قرار دے کر خود کو ترقی پسند کھانا ذہن شخص پیش کرنا چاہا تھا تا کہ سیاسی عمل کے فوری نتائج حاصل ہو سکیں۔ اس کے انداز فکر اور چالوں سے مجھے بھاری افسوس ہوا۔ اس نے مجھے بھاری نقصان پہنچایا اور اس سے بھی زیادہ بُری بات یہ تھی کہ اس سے ملک کو بھی اچھا خاصہ نقصان ہوا۔

وزیر امور کشمیر

۱۰ مارچ ۱۹۹۰ء کو مفتی محمد سعید نے مجھے شام کے وقت نیلی فون پر بتایا کہ وزیر اعظم کی رہائش گاہ پر کاہنہ سب کچھ کی میننگ جاری ہے اور فوراً اس بات پر مہور ہا ہے کہ ایک وزیر امور کشمیر مقرر کیا جائے اور اس کے سیاسی مشیر کے علاوہ دو یا تین مشیر ہوں۔ مجھے اس بات کا مطلب پورے طور پر سمجھ نہیں آ سکا۔ اور یہی تو اس بات کو سمجھنے کا کریض ایک اطلاع تھی یا اس تجویز پر میرے نظریات طلب کئے گئے ہیں۔ میں وضاحت طلبی یا دلیل بازی کے ٹوڈ میں نہیں تھا۔ میں نے صرف یہی جواب دیا کہ جو مناسب سمجھتے ہیں کیجئے، بہر کیف مجھے لگا کہ اعلیٰ سطح پر کنفرنس کا ایک حصہ یہ بھی ہے اس سے وزیر داخلہ اور گورنر کی افادیت میں کمی واقع ہوگی اور اس سے تعاون اور یک رنگی کے معاملے میں مسائل پیدا ہوں گے۔

اس سے اگلے روز امارت کو جموں و کشمیر کے لئے ایک الگ کاہنہ وزیر مقرر کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔ اس کے فرائض کے بارے میں کوئی تفصیلات نہیں دی گئی تھیں۔ یہ بھی اعلان کیا گیا کہ اس کی معاونت کے لئے ایک کمیٹی ہوگی جس میں تمام سیاسی جماعتوں کے اراکین شامل ہونگے۔ بعد ازاں اس مشاورتی کمیٹی میں جنرل کے سربراہ رہنما کا گریس رائے کے غلام رسول کا رہنے پنے کے کیدار ناتھ سامبھی کی پی ایم کے سیف الدین چودھری کی پی آئی کے ایم فاروقی اور نیشنل کانفرنس کے پی۔ ایل ہنڈو کو نامزد کیا گیا۔

بہر کیف تعاون کا جذبہ نہیں ابھر رہا تھا کہ گریس رائے اور نیشنل کانفرنس غیر جانبداری کا کھیل نہیں کھیلنا چاہتی تھیں۔ انہیں جو بھی موقع حاصل ہوا انہوں نے حکومت کو پریشان کیا۔ مثال کے طور پر ۱۰ مارچ کو جب وزیر داخلہ مفتی محمد سعید کشمیر کی صورت حال پر تقرر کر کے لئے لوگ بھا میں کھڑا ہوا تو نیشنل کانفرنس جمہور یا لیمنٹ سیف الدین سوز نے اعتراض کیا۔ اس نے کہا چو کہ جارج فرنانڈس کو وزیر امور کشمیر مقرر کیا گیا ہے تو سچی کے بولنے کا کوئی قصور ہی نہیں ہے۔ حالانکہ سوز اس بات سے واقف تھا کہ کوئی بھی وزیر حکومت کی جانب سے بول سکتا تھا مگر اس کا مقصد تو وزیر داخلہ کی خاص طور پر کشمیری عوام میں ساکھ کو خراب کرنا تھا۔

کا گریس رائے اور نیشنل کانفرنس کے اس کمیٹی میں ہمزاد اراکین نے تو معاملہ اور بھی بگاڑ دیا۔ غلام رسول

پربھاری غصہ آیا میرے افعال اور فیصلوں کے حق میں جلوس لکالے گئے اور پھر مجھے پورے اختیارات دینے کا مطالبہ کیا گیا۔ اس کمیٹی میں کار ہنڈو کی موجودگی سے غصے میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ یہ بات کمیٹی کے چالوں میں ۱۰ مارچ کے دورے سے ظاہر ہے۔ عوام نے اس کے خلاف مظاہرہ کیا۔ کمیٹی کے دیگر اراکین نے مناسب سمجھا کہ ان چار اراکین کو کشمیری مہاجرین کے کیمپوں تک نہ لے جایا جائے۔

کشمیری مہاجرین نے دھرنے دیا اور قرارداد پاس کی کہ ہم اس مشاورتی کمیٹی کو تسلیم نہیں کرتے کیونکہ اس کا مقصد گورنر جگموہن کے راستے میں روکاؤ میں کشمیری کرنا ہے جس نے وادی میں امن اور معمول کی زندگی کو بحال کرنے کی جتنی قبول کیا ہے۔ "بھاری تعداد میں تاجروں، صنعتکاروں، مدرسوں اور وکلاء نے اور سماجی تنظیموں نے مشاورتی کمیٹی کو بتا دیا کہ موجودہ حالات میں "سیاسی عمل" کا تصور غلط ہے اور اس سے وادی میں انصافی کی بحالی میں رخنہ اندازی ہوگی۔

ایک اور محاذ

میرے لئے ایک اور محاذ کا فکر لازمی ہو گیا۔ وی پی سنگھ نے تقریباً اپنی پہلی ترک کر دی تھی اور راج گاندھی اور ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو دھرا خرافات سے اجازت دے دی تھی۔ یہی وہ میری طرف سے سخت اور عملی روش کے خلاف بائیں بازو کی جماعتوں کو اپنا کھیل کھیلنے سے روک سکتا تھا کیونکہ اقتدار کے ڈھانچے پر مجھے جو عبور حاصل تھا وہ بی بی پی کی روش سے مطابقت رکھتا تھا میرے سامنے مقصد تھا کہ جو اقدامات میں نے شروع کئے ہیں ان سے کم قیمت پر کم سے کم عرصے میں عوام کو واقعی کم تکلیف ہو مطلوبہ نتائج حاصل کئے جائیں۔ وی پی سنگھ جاتے فرمائیں کے ذہن کو صحیح طور پر نہیں جان سکا اور چاہے کسی کے ساتھ وہ شیخ کے مرکز پر قبضہ کرنے کے لئے آگے بڑھ آیا۔

جیسا کہ آج کے چند سیاسی مبہروں کا خیال ہے وی پی سنگھ تعقادات سے فائدہ نہیں اٹھاتا تھا۔ بلکہ وہ موقع اور محل کے مطابق سیاست دانی کے تقاضوں میں ناکام ہو کر رہ گیا۔ کشمیر کے حالات کے مطابق بائیں نظریے والی جڑات مند لیڈر شب کی ضرورت ہے جو اپنے گرد جمع گروہوں اور دھڑوں میں مقامی جذبات پیدا کر سکے۔ وی پی سنگھ محض یومیہ ماسپر کرتا تھا اور اس نے سمت اور مقصد کے کسی شعور کا مظاہرہ نہیں کیا۔ یہ زندہ رہنے کے لئے اس کی کمزوری تھی جو نہ صرف کشمیر بلکہ قومی منظر پر بھی اس کے لئے تباہ کن ثابت ہوئی۔

وزیر امور کشمیر کا پتہ ہنصا لینے کے بعد میں نے جارج فرنانڈس کو اس شخصیت سے الگ پایا جو سرنگر میں کل جماعتی وفد کے ساتھ آیا تھا۔ یہی اچھی ہوئی کشمیر کی صورت حال اس نے اوپر عجیب گہاں پیدا کر دیں اس کا طرز عمل غیر علمی غیر حقیقی اور یہاں تک کہ خود متفقہ تھا ڈرامہ کرنے کی ص کا مالک ہونے کی وجہ سے انتظامی

ضروریات کا اسے ذرا بھی شعور نہیں تھا اور کسی قدم کے مناسب وقت کے بارے میں اس کے سامنے کوئی اہمیت نہیں تھی اس نے منجھری دہشت گردی کے بنیادی سوالات کو نظر انداز کر دیا۔ اس کو اس بات کا قطعی خیال نہیں تھا کہ جب تک ایسے پاکستان نواز عناصر جو ماضی کی کامیابیوں سے شرا بہرہ جتے، جنہیں اپنی ہمدوقوں اور بھولوں پر بھروسہ تھا موجود تھے ان کے ساتھ کوئی سیاسی عمل شروع نہیں ہو سکتا تھا اور جن جھول نے اس کا جواب دیا ان کو ختم کر دیا گیا۔ پاکستان کی انٹرسروسز انٹیلی جنس ایجنسی اور متعلقہ کٹر لینڈ بلیا دہرست بھی کوئی سمولی کھیل نہیں کھیل رہے تھے انہوں نے ایک سنگ لائن فعل شروع کیا تھا۔ وہ لگ بھگ کامیاب بھی ہو چکے تھے۔ ۱۹ جنوری ۱۹۹۰ء سے قبل اقتدار کے معنوں میں دراندازی نے ان میں اعتماد پیدا کر دیا تھا۔ اور انہیں یہ بھی پتہ چل جاتا تھا کہ کہاں پر کیا ہوا ہے۔ وقت سے قبل سیاسی عمل نقصان کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس سے حزب الجمادین بھی پاکستان نواز دہشت گرد تنظیموں کو موقع حاصل ہو گیا کہ جو لوگ بعد ازاں کسی مرحلے پر حقیقی طور پر مددگار ثابت ہو سکتے ہوں انہیں ختم کر دیا جائے جب عام لوگوں کو جو لوگ اقتدار کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں انہیں ریاستی نظامیہ اور نرم فوجی دستوں کی بالادستی پر شک پیدا ہو گئے۔

جس انداز سے جارج فرنانڈس چل رہا تھا وہ اور بھی تباہ کن تھا وہ اکثر سرنگرا آیا کرتا۔ اور لی ایس ایف اور کی آر پی بلکاروں کی مدد سے چند افراد کے ساتھ بھٹے، اعظمی و دیگر فیملیوں پر بات چیت کرتا، تحریکوں کے خیمے میں غیر نمائندہ عناصر بھی ڈاکو لے آئے، گورو، انڈیکٹ میاں عبد القیوم اور جماعت اسلامی کے عبدالغنی بھٹ کے ساتھ ملاقات کر کے نئی دہلی چلا جاتا اور تحریک شدہ اخبارات کے ذریعے اس بات کا دعویٰ کرتا کہ اس نے ذریعہ پیدا کر کے اپنے مشن میں کامیابی حاصل کر لی ہے اس کے طریقہ کار سے صرف رائے عامہ ہی گراہ ہوئی ہے اور جن لوگوں سے جارج فرنانڈس ملا ہے ان کی طرف اب دہشت گرد لگاؤں زیادہ متحس ہو گئی ہیں۔ رابطہ قائم کرنے کی بابت باتیں میسر مصطفیٰ سابقہ رکن اسمبلی اور دیگر واعظ مولوی فاروق کے قتل کے لئے ذمہ دار ہیں۔ اگرچہ اس نے کسی کے ساتھ بات کی ہو تو اسے مفید طور پر کرنی چاہیے تھی جس سے پاکستان نواز دہشت گردوں کے دلوں میں شکوک پیدا نہ ہوتے۔

جارج فرنانڈس تو کچھ بھی کر رہا تھا اس نے ان میں تضادات کو نہیں دیکھا۔ ایک طرف وہ ڈاکٹر رفیق جمہلہ کے دوست کا کردار نبھا رہا تھا۔ اور دوسری طرف وہ ان لوگوں کی قوصلہ افزائی کر رہا تھا جن کے دلوں میں ڈاکٹر فاروق کا نام لینے سے ہی شکوک پیدا ہو جاتے۔ یہ عنہم مرکزی حکومت کے ڈاکٹر فاروق کے شیوہ رقص پر بھاری دوسے پال رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کسی نہ کسی طریقے سے اسے دوبارہ اقتدار میں لاکھڑا کیا جائے گا۔ ریاستی اسمبلی کو بحال کرنے کی اکثر باتوں سے ان کے دلوں میں دوسرے مزید گہرے ہو جاتے۔

جب کبھی میں نے سیاسی عمل کے بارے میں ملکی نکتہ نظر پیدا کرنے کی کوشش کی یا اس کے وقت کے ماب

جاتیں۔ گولیاں مسلا کثیر کا حل نہیں ہیں جس سے لگتا کہ میں اس طرز عمل کی وکالت کر رہا ہوں۔ حقیقت کے لئے بہت کم قدر تھی۔ بنیادی حقیقت یہ تھی کہ اسمبلی کو تحلیل کر کے میں نے دہشت گردوں کے لئے باعزت پسپائی کی روش اپنانے کے لئے موقع میسر کر دیا تھا اور اب انہیں اور ان کی جماعتوں اور گرو پول کے لئے اقتدار پر قبضہ کرنے کا اچھا خاصہ موقع حاصل تھا مگر اس کے لئے لازمی یہ تھا کہ دہشت گردوں کے آلات کو ختم کیا جائے۔

سیاسی عمل کی اصطلاح کوئی جادوئی جھڑی نہیں تھی اور دہشت گردی اور تحریک کی سنگدل حقیقتیں اس جھڑی کے جادو سے یک لخت کھیل نہیں سکتی تھیں۔ اس پانچ پہلوؤں والی روش اپنانے سے ہی دونوں طرف سے گولیاں برساتا نہ ہو سکتی تھیں جس کی نشاندہی میں نے اس باب کے ابتدا میں کی ہے۔

انتظامی پیچیدگیاں

امور کثیر میں جارج فرنانڈس کی براہ راست دخل اندازی سے متعدد انتظامی پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں اور ان میں خط ناک حد تک سب اثری پیدا ہو گئی۔ وزیر اعظم نے اس پوزیشن کو واضح کرنے کی کوشش کی۔ ۱۳ مارچ ۱۹۹۰ء کو بحث کے درمیان بولتے ہوئے راجیو گاندھی اس نے کہا کہ کبھی بھی وزیر کو کسی اختیار سے محروم نہیں کیا گیا ہے۔ فرنانڈس کو یہ عہدہ اس لئے دیا گیا ہے کہ وہ جن امور کثیر کے بارے میں تمام وزارتوں کے درمیان رابطہ قائم کرے وہ کسی بھی وزیر کو سبب خائماں نہیں کر رہا ہے۔ مگر ان وضاحتوں کا کوئی فائدہ نہیں تھا نہ ہی اس نے فرنانڈس کے دخل اندازانہ رویے اور جبریت کو ٹھیک طور پر اس کے پراسرار طرز عمل کو ملحوظ خاطر رکھا، فیصلہ کرنے اور رابطے و تعاون کے متعدد مسائل پیدا ہو گئے۔

مرکزی انٹیلی جنس ایجنسیاں وزیر داخلہ کے ماتحت تھیں اور ریاستی ایجنسیاں میرے ماتحت جبکہ ایک طرف اطلاعات کی بنا پر ہم پس پردہ کام کر رہے ہیں افراد کے خلاف کارروائی کرنا چاہتے تو وہاں دوسری طرف جارج فرنانڈس ان کے ساتھ ملاقاتوں کی کوشش کرتا۔ اس سے ان افسروں کو پریشانی اٹھنا پڑتی جنہیں ان ہدایات پر عمل آوری کا کام سپرد کیا گیا ہوتا بعض اوقات جب ایک ہی افسر کو اقتدار اعلیٰ کے دو مختلف نکتوں سے متصفاد پیغامات موصول ہوتے تو صورتحال مضحکہ خیز بنی نہیں بلکہ اندوہ ناک ہو جاتی۔

بہت سارے معاملات میں میری مفتی اور جارج فرنانڈس کی الگ الگ تشخیصات تھیں مثال کے طور پر میں شیر کشمیر میڈیکل انسٹی ٹیوٹ کے ایک سینئر ڈاکٹر کے خلاف کارروائی کرنا چاہتا تھا۔ مفتی محمد سعید کو میرے نقطہ نظر کے ساتھ اتفاق تھا مگر محسوس شہادت کا سامنا کرنے کی رحمت اٹھائے بغیر جارج فرنانڈس نے کہا کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ سیاسی عمل کی وحدانیت سی کاغذی غرض ایک منطق تھی۔ میں جس نہایت پیچیدہ اور مشکل صورت حال میں پھنسا تھا میں اس میں وبال نہیں ٹھہرا کرنا چاہتا تھا مجھے بعد ازاں اس کا انسوکس ہوا اگر ہم اپنے ارادے کے مطابق کارروائی کر دیتے تو شیر کشمیر میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں بہت ساری گولیاں جس میں چند معصوم نرسوں اور

لفٹ چلانے والوں کے اغوا ہلاکت سمیت بہت سارے المناک واقعات شامل تھے کوڑکھانہ میرے لئے سب سے مایوس کن بات تھی کہ جارج کی طرف سے یہ شورہ دیا گیا کہ میں رشوت کے خلاف اپنی ہم کو آگے بڑھاؤں صرف اسی ہم سے میں غواہی دین پر یہ تاثر پیدا کر سکتا تھا کہ میں تمام قسم کی نا انصافیوں اور بد عنوانیوں کے خلاف جہاد کر رہا ہوں اور انتظامیہ میں لازمی جوابدہی لا رہا ہوں۔ میں کسی خصوص میں نہ دو واحد گروپ یا جماعت کے خلاف کارروائی کا ارادہ نہیں رکھتا تھا بلکہ ایک ایسا ماتول پیدا کرنا چاہتا تھا جو اصلاح اور دیانت داری پر مبنی ہو۔ فرنانڈس کے رویے نے مجھے غصے میں ڈال دیا اور غواہی زندگی میں ہر طرف ان قدروں پر زور دیا جا رہا تھا۔ مقامی انتظامی معاملات اور امن و امان کے بارے میں جارج فرنانڈس کی دخل اندازی بھی کافی زیادہ تھی۔ اس سے بھی بدترین بات یہ تھی کہ وہ مجھے یا وزیر داخلہ کو بتائے بغیر پہلی سطح پر دخل اندازی کر جاتا۔ مثال کے طور پر ۳۰ مارچ کو ایک چوٹی کا دہشت گرد اشفاق مجھ کو آتی اس وقت مارا گیا جب وہ گرینڈ جسے وہ جی ایئر لائن پر بھینکنے کی تیاری کر رہا تھا اس کے ہاتھ میں ہی پھٹ گیا۔ دہشت گردوں کو جاری عاک ہدایات کے مطابق شہادت کے ہر واقعہ کو غواہی دینے کو مجھے جارج نے استعمال میں لایا جانے اور غواہ کا جم غفیر جمع کیا جائے۔ ماضی کے تجربات کی بنا پر ہماری طے شدہ پالیسی کے مطابق یہ پریکٹسز و تکلیفیں کی اجازت دی جاتی۔ اشتعال انگیز تقریروں اور مظاہروں کی اجازت نہیں دی جاتی خواہ کچھ جھڑپ پولیس اور دوسرے متعلقہ افسر کی پالیسی پر عمل پیرا تھے اور جب تک جارج فرنانڈس سرنگرمو ائی اڈے پر نہیں آتا تاہم ہر کام ہماری مروج کے مطابق چل رہا تھا۔ ہمارا تجربہ یہ تھا کہ جب کسی جارج فرنانڈس کی سرنگرمو کا دورہ ہوتا اور جس انداز سے وہ اس دوران کام کرتا اس سے اس انتظامی شینری پر غیر ضروری دباؤ پڑتا جسے ہم دوبارہ بحال کر رہے تھے۔ اور ایسے مسائل پیدا ہو جاتے جو ٹالے جاسکتے تھے۔ مثال کے طور پر ۱۹ مارچ ۱۹۹۰ کو وہ بیج پہاڑہ گیا تو اس کے دورے سے جوئے چھوٹے گروپوں کو موقع فراہم کر دیا کہ وہ مل کر ہند مخالف مظاہرہ کریں۔ قصبے میں مکمل ہڑتال کرادی گئی اور مکانات پر سیاہ پرچم بلند کرکے گئے۔ جو مسئلہ پیدا نہیں ہونا چاہیے تھا وہ کھڑا کر دیا گیا۔ جارج فرنانڈس کے یہ موقع دوروں سے تخریب کاروں کے لیڈروں کے ہاتھ میں پٹکے آئے جن سے ہل بولے شعلوں کو ہوا دیتے رہے۔ ایک شہور مقامی انگریزی روزنامے نے لکھا کہ معلوم ہوتا ہے کہ جارج فرنانڈس انتظامیہ کی کوششوں کو ہوتا کرنے پر تیار ہوا ہے۔ جو کچھ وزیر اعلیٰ نے کہا تھا اس کے برعکس فرنانڈس نے ایک متوازن منظم قائم کرلی۔ ایک کل قومی سکریٹری ہماسکر گھوش مقرر کیا گیا۔ وہ جو انٹس سکریٹری سید رضوی اور بی۔ آر سنگھ ڈاکی لے ایس اسٹرا مقرر کئے گئے۔ خیال ایک جاتا ہے کہ بی۔ آر سنگھ ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے قریبی تھے۔ وزیر اعلیٰ کی ایما پر اس کی بے معمول کی کاروائی اس ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی کاہنہ میں ایک با مقصد وزیر اعلیٰ چپ کے انتہے کے لئے ذمہ داریاں

ریاست کی اعلیٰ سطح پر ملازمتوں میں جارج فرنانڈس نے اپنا ایک مورخہ کثیر کا ڈر کے ایک آئی اے ایس افسر

اخٹک ٹیلی کومینا سپیشل اسٹینڈیٹ مقرر کیا تھا۔

دوسری دفعہ میرے عہدہ سنبھالنے کے چند دنوں تک جارج فرنانڈس میرے ساتھ قریباً روزانہ اخٹک ٹیلی کی بابت بات کیا کرتا تھا اور مشورہ دیتا کہ اُسے چیف سکریٹری مقرر کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی فرمائشوں سے مجھے پریشانی ہوتی میری اپنی اولیت باہر کے شخص کے لئے تھی جو موجودہ حالات میں بے وفائی سے کام کر سکے۔ مفتی محمد سعید چاہتا تھا کہ آرمے ٹرک چیف سکریٹری کا عہدہ سنبھالے جو جی ایم شاہ کی حکومت کے آخری دنوں میں مختصر عرصے تک بطور چیف سکریٹری کام کر چکا تھا۔ اس وقت کا کابینہ سکریٹری اس بات سے پریشان تھا کیونکہ اس کے خیال میں کم از کم اس وقت اس عہدہ کیلئے بہت زیادہ جوئے تھا۔ جب ۱۹ مارچ ۱۹۸۹ کو گورنری راج نافذ ہوا تو مجھے ٹکڑے اس عہدہ پر جاری رہنے کی بابت کوئی اعتراض نہیں تھا ساتھ ہی اس مرحلے پر میں کابینہ سکریٹری کے راہ میں حائل ہونے کے لئے تیار نہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ ٹکڑے کو اس بارے میں دل ہی دل میں شکایت رہی ہے۔ جب مفتی کو پتہ چلا کہ ٹیلی کی طرف سے دباؤ ڈالا جا رہا ہے تو اچانک اس نے ٹکڑے کو میرے پاس بھیج دیا۔ نتیجتاً سے جٹیلی جو کہ ایک ذہین افسر تھا ایسی کاروائیوں کا تجربہ کیا جن سے اپنے قسم کی لگ مسائل پیدا ہونے لگے مسائل کے بارے میں یہاں پر پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

وزارت داخلہ کے سربراہ کے طور پر مفتی کی جہ سے بھی انتظامی مسائل پیدا ہوئے کیونکہ مقامی افسر اسے جانتے تھے۔ اس تک رسائی حاصل کر سکتے تھے اور تباہیوں اور دیگر انتظامی معاملات میں جو بھی شکوکے تھے اس سے بیان کرتے۔ فرنانڈس کے تنہا میں مفتی کا انداز فکر کی تھا جس کی جڑیں حالات کی حقیقت میں پنہاں تھیں وہ دہشت گردی اور تشدد کے لہر کو پہلے ختم کرنے کی ضرورت کو سمجھتا تھا جس طرح سے جارج فرنانڈس ریاستی انتظامیہ کی اتھارٹی کو کوڑ کر رہا تھا، اس سے وہ بھی ناخوش تھا۔

مرکزی حکومت کی طرف سے اکثر یہ کہا جاتا رہا ہے کہ گورنر اور وزیر امور کشمیر کی طرف سے ادا کئے جاتے فریضے ایک دوسرے کی تکمیل ہیں ایک کا تعلق انتظامی کارروائی سے ہے اور دوسرے کا سیاسی عمل کے ساتھ ہے نظریاتی طور پر اس حقیقت میں کوئی قصور نہیں تھا مگر حقیقی مدعا تو یہ تھا کہ عملی طور پر کیا ہو رہا ہے۔ سیاسی عمل اس انداز سے انجام دیا جا رہا تھا کہ اس سے انتظامی کارروائی رائل اور انتظامی شینری منہدم ہو کر رہ جاتی۔ ہم گرے ہوئے بلے سے جو کچھ بھی تعمیر نو کر سکے اگلا تھی۔

قانونی اور آئینی طور پر انتظامی اور ذمہ داری گورنر کے پاس ہی تھی۔ آئین جموں و کشمیر کی دفعہ ۹۲ کے تحت گورنری راج کے نفاذ کے بعد ریاستی حکومت کے تمام اختیارات اور فرائض اس کو تفویض ہو جاتے۔ دوسری ریاستوں میں جب صدر راج نافذ ہوتا ہے تو ریاستی حکومت کے اختیارات صدر جمہوریہ سنبھال لیتا ہے اور بعد ازاں وہ یہ اختیارات گورنر کو دے دیتا ہے جبکہ جموں و کشمیر کی آئین نگہداشت کمیٹی کی رہتی ہے مگر جموں و کشمیر ریاست کی صورت میں ریاستی حکومت کے اختیارات اور فرائض براہ راست آئین جموں و کشمیر کی دفعہ ۹۲ کی

روسے گورنر کی جھولی میں جاتے ہیں۔ کسی اور کو بلکہ مرکزی وزیر داخلہ کو بھی یہ اختیارات حاصل نہیں ہیں۔ آئین اور قانونی پوزیشن کے قطع نظر انتظامی اشرکے اصولوں کا تقاضا ہے کہ ایک واحد اور واضح کمان ہو۔ جموں و کشمیر میں موجودہ سنگین حالات کے سبب اس قسم کی کمان کی اور بھی شدت سے ضرورت ہے۔ اگر مرکزی حکومت کا منشا ہو تو وہ دوسرے گورنر مقرر کر سکتی ہے مگر مجھے قائم رکھ کر اس کے ساتھ ہی متوازی اور ایک دوسرے پر حاوی تنظیموں کا قیام نہ صرف انتظامی طور پر ناچختہ قانونی طور پر غیر واجب بلکہ اخلاقی طور پر ناقابل دفاع تھا یا حکومت کے سامنے حالات کی واضح تصویر نہیں تھی یا سمت اور مقصد کے بارے میں تصور نہیں تھا۔ ایک مرحلے پر نہایت مایوسی کے عالم میں میں نے لگ بھگ اپنے استعفیے کا مسودہ تیار کر لیا تھا جس میں وزیراعظم کو مشورہ دیا تھا کہ اگر وہ سمجھتا ہے کہ جارج فرنانڈس کشمیر میں بہتر ثابت ہو سکتا ہے تو اسے جموں و کشمیر کا گورنر مقرر کیا جائے۔ اس مسودے میں میری تجویزوں کی متعلق بیان کی گئی ہے اور اس سے میری ذہنی کیفیت بھی ظاہر ہوتی ہے۔

راج بھون

عزیز من وزیراعظم

میں نہایت انگاری کے ساتھ آپ کو یہ تجویز پیش کر رہا ہوں کہ آپ جارج فرنانڈس کو جموں و کشمیر کا گورنر مقرر کرنے کی بابت سوچ سکتے ہیں۔ موجودہ حالات کے پیش نظر اگر یہ خوشی نہیں تو تباہی کے مترادف ہو گا کہ ریاست کی اتھارٹی کو پورے طور پر دوبارہ حاصل کرنے کے لئے میں نے جو ہم شروع کر رکھی ہے اور جس صورت حال کو صحت مند بنانے کے لئے جو کوششیں ہو رہی ہیں ان پر توجہ کو دھندلا دیا جائے۔ اس سے بہت یکسوئی کے ساتھ عمل پیرا ہونا چاہیئے اور جب تک حتمی منزل کو حاصل نہ کر لیا جائے اس پر پوری صدقہ لی اور مضبوط ارادی کے ساتھ پیش قدمی ہوئی چاہیئے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ جارج فرنانڈس اس کام کو بہتر طور پر سرانجام دے سکتا ہے تو چند منٹ کے نوٹس پر مجھے عہدہ چھوڑنے میں خوشی محسوس ہوگی۔

صرف ایک ہی کاروائی کمانڈ ہو نا چاہیئے۔ اقتدار اور ذمہ داری اُسی کو تفویض کی جائے۔ اُسے تجزیہ کاری دہشت گردی کے ساتھ نمٹنے دیکئے اور وہ سیاسی عمل اور جو بھی وہ چاہے کر سکتا ہے۔ اُسے پرانے ذاتی دوستوں اور جوئے دوست اس سے بیدار کئے ہیں دونوں کے ساتھ نمٹنے دیکئے۔ قوم کو حتمی نتیجے سے مطلب ہونا چاہیئے جو وہ مندرجہ ثابت ہونا چاہیئے یہ نہیں کہ آپ ایک کمانڈر فزنیوی اور مار دھارے کی ذمہ داری پر رکھیں اور دوسرا کمانڈ ایک فاصلے پر رہ کر سیٹیاں بجاتا رہے اور شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ بڑھتے ہوئے قدم کے تال میل خلل پیدا کر دے۔ میں کسی کو ناراض نہیں کرنا چاہتا مگر میں یہ کہنے سے بھی گریز نہیں کروں گا کہ میرے گورنر انتظامی اور تعلقات

کا جو گلاب بنایا جا رہا ہے اور جوئے نماز کھولے جا رہے ہیں میرے خلاف غلط پروپیگنڈہ کی جو گھن گرت ہو رہی ہے اور اخبارات میں واضح طور پر شائع کروائی گئی خبریں اس تمام کام کو الٹ کر رکھ دیں گی جو میں نے محنت کر کے خطرات کو برداشت کرنے کے بعد سرانجام دیا ہے۔ احترام کے ساتھ

آپ کا صادق

(دستخط)۔ جگموہن

میں نے یہ خط دیر شام گئے تحریر کیا۔ اپنے ہاتھ سے لکھ کر اُسے بریف کیس میں رکھنا کہ اگلی صبح اپنے پرائیویٹ سیکریٹری سے اُسے ٹائپ کرا سکوں مگر اگلی صبح تک اُٹھتے ہوئے ہذبات میرے ذہن کے اندر نمود ہونے لگے۔ راج بھون کے باغ کے گڑ پلاس مٹی سے کی وجہ سے اس ٹوفان کے مدد گرد ایک تہجم ہو چکی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اور خشکی نے اپنا کمال دکھا دیا تھا۔ یہ خط کبھی نہ ٹائپ ہوا اور نہ ہی اُسے پیر ڈاک کیا گیا۔

بعد ازاں شاید یہ ان فائدوں کو زائل ہوتے نہیں دیکھنا چاہتا تھا جن کی وجہ سے بہت سے میدانوں میں مجھے بالادستی حاصل ہوئی ہے میں ان اوقات کا استیصال کرنا چاہتا تھا جو واضح طور پر میرے سامنے آرہے تھے تاکہ میں نیا خاکے خدوخال سامنے لا سکوں جن کی وجہ سے کشمیری قندول کو ہندوستان کے حق میں ڈھالا جاسکے اور قومی آہنگی اور پائیدار امن کا دو دھار لایا جاسکے۔

نوٹ :-

پیرس لایوس نے اپنی کتاب "سوشل ایکشن اینڈ دی لبرلنگ ٹور ایکسپریس کے صفحہ ۱۳۹ پر لکھا ہے۔ . . . اس مرحلے سے ۱۹۸۳ء میں اس کی روانگی سے قبل جگموہن ایک ایسا آدمی ثابت ہوا جو کہ نہ صرف کارکنوں کو مسلسل ناقابل رسار ہا ہو بلکہ ایک وہ شخص تھا جو ان کے مسائل کو انہیں کے قدم و قیامت میں رہ کر سوچتا تھا اور ان کا حل ڈھونڈ کر اس نے جتنی جلد ممکن ہو اس پر عمل کیا۔ وہ ان چند اُنچے افسروں میں سے تھا جو ہمیشہ ہمارے ساتھ ہندی میں بات کرتے اور وہ ہمارے ذریعے بات کرنے کی بجائے کارکنوں کو براہ راست سوال پوچھتے۔ اس سے وہ بھولی کے تمام کارکنوں میں مقبول اور سہولت پسند ہو گیا اور جب وہ دہلی سے رخصت ہوا تو مرکز نے ایک بڑی عرضداشت جس میں کمیٹیوں کا نوا اور دیہی عوام کے نمائندے شامل تھے۔ راج نواس تک اُسے الوداع کہنے کے لئے گئے اور اس تمام کام کے لئے ممنونیت کا اظہار کیا جو اس نے ان کے لئے کیا تھا۔"

++ ملاحظہ ہو باب بازوہ فونڈہ کہو تر اور مولہ راجہ بکھیر بھٹ اور باب پنج زوہ۔ اس غلط پروپیگنڈہ کے ایک سیلاب

++ ملاحظہ ہو باب چہاروہ۔ بالادستی حاصل کرنا۔

+++ ایضاً

ایک محروم طبقے کو سرہانہ روح کر سکتی ہے۔ نفس لفظی کے گورکھ دھندے اور ترقی پسند اصطلاح کی بجائے یہ ایک غیر انسانی رپورٹ ہے۔ اس کو اس کی پرواہ نہیں کہ اگر اہل قصور کیلئے وہ کوہا نسلی پریشکا دیا جاتا ہے۔

ہیڈلبرگ یونیورسٹی آف سول لبرٹیز گروپ - PEOPLES UNION OF CIVIL -
LIBERTIES GROUP میں اچھے افراد بھی تھے مگر ان کی اچھائی کی کیا وقعت رہ جاتی ہے جب اپنی مصروفیت یا دوسری وجوہ پر اندر مومین جیسے ہالاک عناصر کی طرف سے آنکھوں پر پٹی باندھنے کی اجازت دے دی گئی۔ انہیں اپنے ذاتی حساب چکانے تھے۔

یہ رپورٹ تعصب کی جھوٹی کانیقہ تھی جس نے محسوس حقائق کو مدنظر نہیں رکھا اور نہ ہی ان دستاویزات کو ملحوظ خاطر رکھا۔ گذشتہ ابواب میں جن کا حوالہ دیا گیا ہے اس کمیٹی نے مفاد خصومی رکھنے والے فریقین کی سخی سنائی باتوں کو مسئلہ مان لیا انہیں افراد کے میان نام کو رنگ دیا جو انہیں موافق آتے تھے اور ایسے لوگوں کو انگریزوں کی جو ان کے پہلے سے مافوق نتائج کے مطابق ہو سکتے تھے۔ البتہ اور سخی نظریاتی توبہ ہے کہ انسانی حقوق کے نام پر اس رپورٹ نے انسانی حقوق کی سب سے زیادہ پامالی کی، اس رپورٹ نے یہ صیلا دیا کہ حقیقت تو وہی ہے ایک انسانی حق ہے اس نے اس بات کو بھی نہیں سمجھا کہ دہشت گردوں کی بالواسطہ پشت پناہی کر کے اور خود کو ان کے حمایتی بیان کر کے، وہ انہیں ہلاکتوں اور قتلوں پر موصوم عام کے انسانی حقوق کی پامالی کے موجب بنے ہیں۔

اس رپورٹ نے دہشت گردوں کے ضمیر کا بوجھ ہلکا کر دیا اور انہیں یقین دلایا کہ ان کو بھڑکایا جا رہا ہے اپنے ذہنی خول میں وہ اس بات کو سوچنے لگے کہ ان کے افعال غیر روا جب نہیں ہیں اور انہیں اور قتل جیسے مزید نقصان دہ افعال کے مرتکب ہوئے۔ دہشت گردوں کی زیر زمین اشاعت صدائے کثیرہ جس کا ذکر میں تخریب کاری اور دہشت گردی کی نوعیت اور طرز عمل کے باب میں کرچکا ہوں ہیں اس رپورٹ کا کھل کر حوالہ دیا گیا تاکہ کثیرہ کی نوعیتوں کو دہشت گردی کی طرف مائل کرنے کے لئے ان کے جذبات کو بھڑکایا جاسکے۔ انسانی حقوق کی علمبردار جماعت کی طرف سے کثیرہ کی عوام کی اس طرح خدمت کی گئی، کیا یہ پہل کثیرہ کا مسئلہ حل کرنے کے لئے تھی یا کہ حکام کے خلاف اگسا کو مزید پیچیدگی پیدا کرنے کی کاوش تھی؟

اس رپورٹ نے اپنے دیباچہ میں کہا۔ کثیرہ پریسل کی کمیٹی کی طرف سے ایک چار گونہ نم ۱۶-۱۳ مارچ ۱۹۹۰ کو جہول کثیرہ کا دورہ کیا۔ اور بھاری تعداد میں ذرائع جن میں مستوب افراد، عینی شاہدوں اور سینئر محکمی اہلکاروں سے بلاکتوں، ایک طرز گرفتاریوں خلاف قانون تلامشیں، پدم منظر ہرول پر بلا اشتعال تشدد اور کبھی بھار رعایت کے سوا غیر مبہم مرحلہ کے لئے کر فیو نافذ کر کے مومل کی زندگی میں رخنہ اندازی کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ اپنی تحقیق کے دوران ہم کو معلوم ہوا کہ قانون کی عملداری کے ذمہ دار افراد سی آر پی ایف (سنٹرل ریزرو پولیس فورس) بی ایس ایف (بارڈر سیکورٹی فورس) اور چند صورتوں میں ہندوستانی فوج کی طرف سے ان حقوق کی پامالی کی گئی ہے۔ انسانی حقوق کی صریح خلاف ورزی کے یہ معاملے انحرافات کے احوال کا حصہ نہیں ہیں بلکہ حکومتی پالیسی کے تحت کارروائی کا ایک

باب تیسرہ

خوفزدہ کیوتراور محروم طبقہ:

کشمیری پنڈت

اور حقیقت کو چھپایا جاسکتا ہے
کسی نے ان کے درد کا انتخاب کیا
جو نہیں ہونا چاہیے تھا، ہوا
آؤں

۳۰ مئی ۱۹۹۰ء کو جب کانگریس (آئی) نے جے راجیہ جہا میں اس موضوع پر بولنے نہیں دیا تو ایک پریس کانفرنس میں میں نے کہا:- ہندوستان کو بیرونی دشمنوں کی ضرورت نہیں ہے، ہم آپ ہی اپنے بدترین دشمن ہیں۔ اس دعوے کے بارے میں حقیقت ایک رپورٹ میں عیاں ہوئی جس کا نام "کشمیر پریل قدرتی INITIATIVE ON KASHMIR" تھا۔ یہ رپورٹ فریبنا دہشت گردی کو بحال اور حق بجانب قرار دیتی ہے اور کہنے بالواسطہ طور پر اس کی توصیف افزائی کرتی ہے۔ یہ رپورٹ فریب کاری حقائق کو سخی کرنے اور غلط پروپیگنڈہ کی سب سے زیادہ اعلیٰ ہوئی کاوش ہے۔ یہاں تک کہ ہندوستان کے بدترین دشمن بھی اس قسم کے پروپیگنڈہ سے ریز رپورٹ نہیں شائع کرتے اس میں حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ پاکستان کی ویڈیو اور ریڈیو سے اس کے بار بار حوالے دیئے گئے اور زمین الاقوامی سطح پر ہندوستان کے مخالفین نے اس کا دل کھول کر استعمال کیا۔

اس رپورٹ کی اندرونی وحشت کا مقابلہ اس کی اندرونی بناوٹ سے ہی ہو سکتا ہے اس کی جارحیت کے پس نظر حقیقت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ انسانی حقوق کے نام پر اس نے تمام تر بنیادی انسانی حقوق کاقتل عام کیا ہے جس میں انصاف حاصل کرنے کا حق، مذمت سے قبل سماعت کا حق، برسرکوں کی سنت اور دیانتدارانہ محنت پر حاصل کی گئی شہرت کے مقابلے چند افراد کے ذاتی تعصب، خد اور دشنام طرازی کی وجہ سے اس کو سخی کرنے کی کوشش کے مترادف تھی۔

حقہ ہیں۔ یہ بات ٹیم کے اراکین کو اس وقت واضح ہو گئی جب انہوں نے سینئر ایڈمنسٹریٹو ملاقات کی اور جنہوں نے اس بنا پر ان کاروائیوں کو حق بجانب قرار دیا کہ ایسے اقدامات دہشت گردی کو قابو میں رکھنے کے لئے لازمی ہیں۔ یہ نتائج اس قدر کھلے ہیں اور اندرونی تعصب کے حامل تھے جو ایک باشعور ذہن خود ہی سبب کچھ جاتا ہے۔ مزید برآں ان نتائج پر اس تجربہ و ثوق تحقیقی طریقہ کار اپنا کر پہنچا گیا تھا مگر ان نتائج پر پہنچنے میں کتنے عرصہ لگا، یہ صرف چار دن کا عرصہ تھا اور وہ بھی جب وادی پر دہشت گردوں کی بند و قول کا خوف طاری تھا اور کوئی بھی عام آدمی یا باشعور دانشور اس بات کے سوائے کچھ کہنے کی جسارت نہیں کر سکتا تھا جو دہشت گرد چاہتے تھے جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے دہشت گردی میں حقیقت کا ہی سب سے زیادہ قتل ہوتا ہے۔

جن اراکین کے ساتھ اس ٹیم نے ملاقات کی تھی ان کے ساتھ بیانات کو دوبارہ کرنے کا آخر کیا میعاد تھا؟ یہاں پر ایک نمایاں مثال پیش ہے۔ چیف سیکریٹری کے ساتھ ملاقات کے بارے میں اس رپورٹ میں یوں درج ہے۔ "اس نے موسیٰ کو ایک ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے تحت گذشتہ تین برسوں کے دوران اشتغالیہ انتہائی راہی ہو چکا تھا۔ بہر حال اس نے واضح کیا کہ کل ہند سرسری یہاں صرف ایسے افراد تھے جو راشی نہیں تھے دوسرے الفاظ میں یہ ماسوائے آئی لے ایس انڈوں کے جو باہر والے تھے، مگر کے مطابق تمام کشمیری ملازمین اور سیاست دان راشی تھے یہ بات صاف قبیح کر آئے۔ کے مگر کشمیری عوام پر اعتماد نہیں تھا۔ اس کا تعصب اس وقت واضح ہو گیا جب، رماض کے چھانچہ سورہ کی واردات پر تباہ خیال ہوا۔ اس نے کہا: چھانچہ سورہ ایک گڑبڑ زدہ علامت ہے۔ عوام دہشت گردوں کے ساتھ ہیں۔ وہ غلط پروپیگنڈہ پھیلانے کے لئے کچھ بھی کرنے کو تیار ہیں۔"

آخری نکتہ جو ہم نے اُٹھایا وہ وادی سے غیر مسلموں کی ہجرت کے بارے میں تھا۔ ہم نے اُسے بتایا کہ تمام طبقوں کے عوام نے ہمیں بتایا کہ ہندوؤں کو وادی سے چلے جانے کے لئے سرکاری ٹرانسپورٹ فراہم کی گئی، اس نے اس بات سے انکار کیا۔ جب اس کی نہیں شہادت پیش کی گئی تو اس نے دعویٰ کیا کہ عین ممکن ہے کہ چند سرکاری اہلکاروں نے انفرادی طور پر ایسی بات کی ہو مگر حکومت کی یہ پالیسی نہیں تھی۔

جب حکمہ داخلہ کی طرف سے چیف سیکریٹری کو اس رپورٹ پر تبصرہ کرنے کے لئے کہا گیا تو دفتری معمول کے مطابق اس نے تحریری طور پر کہا۔

"جو کچھ میں نے کہا تھا یہ رپورٹ اس کے ساتھ نہایت بے انصافی کرتی ہے۔ میرے ساتھ بہت سارے غلط بیانات منسوب کئے گئے ہیں۔ اور دوسرے چند بیانات کو بے عمل طور پر پیش کیا گیا ہے۔ ہر ایک نکتے کے بارے میں میرے تفصیلی مشاہدات یوں ہیں (۱) میں نے یہ ضرور کہا تھا کہ ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے تین سالہ حکومت کے دوران رشوت اور کذب پوری اس گڑبڑ کے لئے ایک بڑی وجہ تھی میں اتنا بے وقوف نہیں کہ جو یہ جذبہ رکھتا ہو کہ کل ہند سرسری تمام افراد یا ممالک اور باقی تمام سرکاری ملازمین رشوت خور ہیں۔

میں کبھی کو میں نے تجویز پیش کی کہ انہوں نے اس غلط پروپیگنڈہ کا مقابلہ کرنے کی پوری کوشش کی ہے جو مفادات خصوصی رکھنے والے افراد پھیلانے میں مددگار رہے ہیں۔

(ج) کبھی کی طرف سے یہ اخذ کرنا بالکل شرانگیز ہے کہ میں کشمیری عوام پر یقین نہیں کرتا۔ درحقیقت میں نے کبھی کو یہ باور کرانے کی پوری کوشش کی کہ کشمیری بحران پر اخباری تجربات کا بیشتر حصہ عوام کے ذہن سے خوف کا سایہ دور کرنے میں ناکام رہا ہے جس کے تحت وہ رہ رہے ہیں۔ درحقیقت میں نے اس کے لئے ذرائع ابلاغ اور ملک کے دوسرے حصوں میں رہنے والے لوگوں کو قصور وار گردانا جن کا یہ اعتقاد ہے کہ کشمیری کے تمام تر عوام اپنے کو کی راہ پر ہیں۔

وادی سے غیر مسلم افراد کی ہجرت کے بارے میں اُن کے دعوے کی میں نے پرزور تردید کی کہ حکومت نے اس کو شے دی ہے یا اس کو شروع کیا ہے۔ جب انہوں نے کہا کہ اس شخص کے لئے سرکاری گاڑیاں انہوں نے دی ہیں تو میں نے کہا کہ کسی واحد سرکاری ملازم کی بد عزائی ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی تحویل میں سرکاری گاڑی کا اس طور استعمال کرے بہر حال ایسی صورت حال میں اس امر کی حقیقت سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا۔ میں نے انہیں پیش کش کی کہ اگر وہ اس قسم کا کوئی خاص واقعہ حکومت کے گوش میں لائیں تو میں ضابطے کی کاروائی کر سکتا ہوں کبھی کے اراکین نے میرے ساتھ وعدہ کیا کہ وہ ایسی گاڑیوں کی تفصیل دستیاب کریں گے۔ جب تک وہ یہ وعدہ پورا کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

انصاف کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ اگر کوئی بیان یا نظریہ کسی فرد کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے جو خاص طور پر موجودہ نوعیت کے نازک معاملات ہوں تو یہ بیان یا نظریات تحریری ہونے چاہیں یا مقابلاً طور پر رپورٹ میں شامل کرنے سے قبل انہیں تصدیق کے لئے متعلقہ شخص کو ارسال کرنا لازمی ہے۔ یہ صرف نا انصافی اور غیر اخلاقی ہے کہ چند افراد کے منہ میں وہ الفاظ ڈال دیئے جائیں جو ان کے نتائج کے ساتھ مطابقت رکھتے ہوں تو شاید اس ٹیم نے پہلے ہی اخذ کر لئے تھے۔ چیف سیکریٹری یہ شکایت کرنے میں حق بجانب تھا کہ جو کچھ اس نے بیان کیا تھا رپورٹ میں اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا اور جب اس نے کبھی کے ساتھ شرانگیزی کو منسوب کیا تو اس صورت میں بھی غلط نہیں تھا۔ یہ حقیقت کہ اس ٹیم نے نتائج کا یقین پہلے ہی کر لیا تھا۔ اس امر سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مباحثہ میں نے جن سرکاری گاڑیوں کا استعمال کیا تھا ان کے بارے میں تفصیلات ارسال کرنے سے متعلق اس ٹیم کا وعدہ شرمندہ تکمیل ہی رہا۔ دوسرے سینئر اہلکاروں نے بھی اس رپورٹ پر لاپرواہی کا اظہار کیا۔ ایڈیشنل چیف سیکریٹری (جویم) انجوائن نے اپنے تبصرے میں کہا۔

"یہ کہنا بھی غلط ہے کہ گورنری راج کے پہلے روز ہی سیکورٹی فورسز نے چھاپے مارے اور تلاشیاں کیں جس کا ظاہر مقصد یہ تھا کہ دہشت گردوں کو ڈھونڈ لیا جائے۔ ان چھاپوں کے بارے میں ملائی ہوئی معلومات اور سرکاری اطلاعات کی بنا پر منصوبہ پہلے سے تیار کیا جا چکا تھا اور اس بارے میں اسے گورنری کوئی احکامات جاری نہیں کئے۔

ملاحظہ ہو باب اول (تشریح و تفسیر) جس میں ویدرواہ کی رپورٹ کا حوالہ دیا گیا ہے۔

کیٹی نے یہ غلط بیانی کی ہے کہ گورنری راج کے ۲۷ لوگوں کے اندر ہی سیکورٹی فورسز کو تلاشی، مضبوطی اور گرفتاری کے اختیارات دے دیئے گئے۔ اس بات سے بھی واقف ہیں کہ بی ایس ایف سی آر پی ایف اور مسلح دستوں کے ایک ریاست میں ایک گولیل عرصے سے نافذ ہیں۔

کیٹی کا یہ غلط مشاہدہ ہے کہ غیر مسلح مظاہرین اور پرامن جموں پر غم فوجی دستوں نے گولی چلائی، کم از کم طاقت کے استعمال کی ہر ممکن کوشش کی جاتی رہی ہے۔ اور صرف ذاتی حفاظت کے لئے ہی گولی چلانے سے سہارا لیا جاتا ہے۔

مارچ ۱۹۹۰ء کی جھانپورہ واردات کو بھی ضرورت سے زیادہ طول دیا گیا ہے۔ جب دہشت گردوں کی طرف سے سی آر پی ایف کی ایک چوکی پر فائرنگ کی گئی تو جھانپورہ علاقے میں تلاشی کی گئی۔ شکایت ملنے پر نانہ پولیس کی ایکسٹریکٹ و ہال ارسال کی گئی مگر آبروریزی کی کوئی شکایت ثابت نہیں ہو سکی۔ بعد ازاں جوں و کشیدہ پولیس کے زنا نہ بیچنے نے بھی اس معاملے کی تحقیقات کی اور اسی قسم کی رپورٹ دی۔

اس بات کا احساس کرنا مشکل ہے کہ کیٹی کس طرح اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ کس طرح وادی کا ایک عام آدمی مرکزی حکومت کے ساتھ گفت و شنید کے لئے تیار ہے۔

اللہ بخش بیس ایس پی سرنگر کو اس لئے قریب نہیں کیا گیا کہ اس نے کسی غیر مسلح مظاہرین پر حملہ کیا تھا بلکہ اللہ بخش عوام کو تشدد سے دور رہنے پر راضی کرنے کے قابل ہو گیا تھا اور پولیس کے استعمال کے بغیر منتشر کرنے کے معاملے میں اس کی کوششوں کی ستائش میں اسے ایڈیشنل ڈی۔ آئی جی کے عہدے پر ترقیاب کیا گیا ہے اور یہ کہنا بھی غلط ہے کہ اس نے بہت سارے انصروں کی حق تلفی کی ہے۔ درحقیقت اللہ بخش نے کسی کی حق تلفی نہیں کی۔

اسی راتے کا اظہار کرتے ہوئے ایڈیشنل ڈائریکٹر جنرل پولیس ام کپور نے واضح کیا کہ اس رپورٹ میں دیئے گئے حقائق اور اعداد و شمار درست نہیں ہیں۔ اس نے زور دے کر کہا کہ دسمبر ۱۹۸۹ء سے ۱۵ مئی ۱۹۸۹ء تک دہشت گردوں کی طرف سے ۳۳ معصوم افراد قتل کیا گیا۔ اس عرصے کے دوران ۱۷ افراد کی ہلاکت سے اقلیتی طبقے کے افراد میں خوف و ہراس پیدا ہو گیا اور اس سے کشمیری پٹنڈوں کی ہجرت کے عمل میں تیزی آئی۔ کپور نے زور دیا۔ یہ حقیقت نہیں ہے کہ دہشت گرد حکومت نے وادی سے چلے جانے کے معاملے میں کشمیری پٹنڈوں کی مدد کی۔

امن و قانون کے بارے میں گورنر کے مشیر جمیل قریشی نے کہا۔
”مجھے معلوم نہیں کہ بی ایس ایف نے اس قسم کی سکورس رپورٹ امن و قانون کے انچارج مشیر کے ساتھ ملاقات کے بغیر کیسے دے دی۔“

جھانپورہ واردات کے بارے میں قریشی نے کہا۔
”اس حقیقت کے قطع نظر کہ یہ مقام آئی اے ایف انصروں کی سفاکانہ ہلاکت کا منظر تھا جھانپورہ دہشت

دستوں کے چھان پاسانی میں وہاں یا تو جان سے ہاتھ دھو بیٹے یا ناکارہ ہو گئے۔“ کرفیو کی بابت قریشی نے زور دے کر کہا۔

”کرفیو کے بارے میں جو الزامات بار بار لگائے جاتے ہیں۔ حقیقت سے متصادم اور کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ کرفیو اپنے آپ میں ایک حفاظتی قدم ہے جو دہشت گردوں کی طرف سے قتل و غارت کے واقعات کے بعد چند کاروائیاں کرنے کے لئے اٹھا یا جاتا ہے تاکہ کم از کم جانی نقصان ہو۔

متذکرہ بالا یہ بات ظاہر ہو جاتی چاہیے کہ ٹیم کی رپورٹ میں واقعات کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے۔ وہ نہ صرف یک طرفہ ہے بلکہ اس واحد افسر کے ساتھ بھی غلط طور پر منسوب ہے جس کے ساتھ انہوں نے ملاقات کی اور جن لوگوں پر انہوں نے الزامات عائد کئے ہیں ان کے ساتھ انہوں نے بھی ملاقات ہی نہیں کی اور نہ ہی اس ٹیم نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ جن لوگوں پر جبر و استبداد کے الزامات عائد کئے گئے ہیں انہیں بھی ان الزامات کی تردید میں کچھ کہنا ہے۔

پس قدرتی انصاف کے تمام اصولوں کو ان لوگوں کی طرف سے بالائے طاق رکھ دیا گیا جو انصاف کے علمبردار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ انسانی حقوق کے علمبرداروں کی طرف سے غیر جانبداری کی تمام تر قدردانی کے پامالی کی گئی واقعات کے پس منظر کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا۔ دہشت گردوں کی کوتاہی و واضح طور پر حمایت کی گئی، ہجوم کے پرامن خراج کو ستمہ تصور کیا گیا جبکہ ایڈمنسٹریشن اور سیکورٹی فورسز کو سکوک کے معاملے میں ظالم اور لاپرواہ سمجھ لیا گیا۔

قدامت پسندی سے متذب زندگی کی طرف اپنے سفر میں سماعت کا حق انسانیت کا ایک اہم کارنامہ تھا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ تمام تر انسانی حقوق کے تاج کو نام نہاد انسانی حقوق تنظیم نے اٹارھینے کا۔ اپنے ترقی پسند موقف میں یہاں ان کا انداز فکر بے لاگ غور و فکر کی بجائے تعصب کا نشانہ رہا۔

کیٹی کے حتمی مگر کھوکھلے دعوؤں کی قلمی میچ پورہ میں یکم مارچ ۱۹۹۰ء کو سکول میں پرفائرنگ کی واردات سے کھل جلتی ہے کیٹی کی رپورٹ کہتی ہے۔

”میچ پورہ میں بیس مسافروں کی ہلاکت کے خلاف وسیع تر احتجاجات کے بعد حکومت کی ہدایات کے تحت فوج نے اس واقعہ کی تحقیقات کروائی۔ اس تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ نے ان ہلاکتوں کو اس لئے حق بجانب قرار دینے کی کوشش کی کہ فوجی فورسز نے پٹنڈوں کو قتل کرنے کے سکوپیے سفر کر رہے تھے۔ جن مقامی لوگوں کا ہم نے اعتراف کیا انہوں نے تحقیقاتی رپورٹ کو سر اسٹو بیانی قرار دیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ حکومت جوں و کشیدہ ۲۰ فروری کو ایک حکم جاری کیا جس کے تحت سکول کالج اور تعلیمی ادارے ۱۵ مارچ تک بند کر دیئے گئے۔

اس روز فوجی حکام کی طرف سے میچ پورہ میں ہلاکتوں کو حق بجانب قرار دینے کے لئے ایک غلط داستان گھڑی گئی جو ملک کی دفاع فوجوں پر ایک داغ ہے جن سے توقع ہے کہ وہ نہایت نظم و ضبط کی مالک اور اس کا

تمام ترک اور غوام کی حفاظت کے لئے وقف ہو۔

اس الزام کا سبب دلجوئی دیکھ لیجئے جس کے تحت اخلاقی قدروں کا سہارا لیا ہے مگر اس کے حقائق کیا ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بوٹ ٹانگوں تک آگیا ہے۔ ایک غلط خبر یہ بھی پھیلا دی گئی کہ تمام سکول بند تھے مگر فوجی سکول کھلا تھا وہ طلباء امتحان دے رہے تھے۔ کمیٹی کی ٹیم نے سکول کے میڈیٹر ماسٹر سے رابطہ قائم کرنے کی پوری کوشش کی طلباء ویاستعلقہ افسروں اور والدین کے ساتھ رابطہ قائم کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اگر اس ٹیم نے متعلقہ افسروں کے ساتھ رابطہ قائم کیا ہوتا تو انہیں حقیقت معلوم ہو گئی ہوتی۔ ورنہ اس کی طرف سے اس قسم کے قبل از وقت نتائج اخذ کرنا ان کے لئے ممکن نہیں ہو پاتا۔

میں بال پر فوجی دہلی کے ایس اینڈو ریلو کا ۲۵ اپریل کا حجرہ خط دیا جا رہا ہے جو انڈین ایکسپریس کے یکم مئی ۱۹۹۰ء کے شمارے میں شائع ہوا۔

سہاسنی موئے کے خط (انڈین ایکسپریس ۱۹ اپریل) کے حوالے سے میں قائدین اور موئے کے فائدے کے لئے ریکارڈ درست کرنا چاہتا ہوں۔

میں موئے کثیر پر پبل کمیٹی کی ایگزیکٹو سکریٹری ہے اور اُسے اس لئے غصہ ہے کہ وہ اینڈ کے گورنر مینجمنٹ کمیٹی کی ای رپورٹ کو بالکل غلط قرار دیا ہے۔ اس نے اپنی پریشانی اور فحش نشانے کیلئے جگہ پرین کی دلیل کو بے تسلسل ثابت کرنے کے لئے فیض ایک واقعہ پیش کر کے چالاک بننے کی کوشش کی ہے۔ وہ کہتی ہے۔ ذرا حقیقت جگہ پرین کی طرف سے بچوں کو لے جا رہی ہیں پورہ میں فوجی بس پر حملے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور فوجی ہی فظوں کی طرف سے فالنگ کا جو جواز پیش کیا ہے۔ یہ عجیب ثابت ہوا کہ اس روز کوئی سکول بس چلی ہی نہیں کیونکہ سرکاری احکامات کے تحت تمام سکول ۵ مارچ تک بند رہے۔

اس الزام کے سوا غلط اور بے بنیاد کچھ اور بھی نہیں سکتا۔ یہ بس آرمی بلک سکول کے بچوں کو لے جا رہی تھی جو سرنگر کے چھاؤنی علاقے میں واقع ہے۔ وادی کے دوسرے سکولوں کے برعکس یہ سکول ۱۹ فروری کو موسم سرما کی تعطیلات کے بعد دوبارہ کھل گیا تھا۔ چنانچہ سرکاری نوٹیفکیشن کا اطلاق جس کے تحت موسم سرما کی تعطیلات ختم ہونے کی عام تاریخ یکم مارچ کے بعد ترمیم کی گئی، اس سکول پر نہیں ہوتا تھا۔ فروری کے آخر میں سکول کے سالانہ امتحانات شروع ہو گئے اور یکم مارچ کو اس نمونہ روز دوسرا پرچہ تھا۔ آرمی سکول کے بچوں کو برزلا حیدر پورہ پیر باغ اور دوسرے علاقوں سے بادی باغ میں واقع سکول تک لے جا رہی تھی اس بس پر ٹینگ پورہ کے مقام پر تحریک کا رخ نامہ اور ان کے مایوں کے پرچون جہم نے حملہ کیا۔ عین اسی واقعہ کے بعد فوجی سکول بھی دوسرے تعلیمی اداروں کی طرح غیر معین عرصے کے لئے بند کر دیا گیا۔ موئے ان حقائق کو اس سکول میں زیر تسلیم بچوں کے والدین فوجی اہلکاروں یا ہندوؤں اور مسلمان شہریوں سے تصدیق کر سکتی ہے۔

کر پیش کیا ہے چاک و چوبند منہ پھٹ اور کھلے دل کا ہونا ایک بات ہے مگر کمیٹی کو ٹیبا در سنوں کی چالوں کا شکار نہیں ہونا چاہیے جن کا واحد مقصد کثیر کو سیکولر ہندوستان سے الگ کرنا ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ کمیٹی نے سو فیٹ کے اس مقولے پر عمل کیا: "جب آپ ایک خطا سزا کر رہے ہوں تو ہمیشہ گستاخی اور بدگیزبی کا رخ اپنائیے اور اس طرح کا سلوک کچھ گویا آپ ایک خبیث شخص ہیں۔"

۲۰ اپریل کو بچوں کے ٹھکانہ کا ایک اور خط اسی تاریخ کے اسی اخبار میں شائع ہوا اس خط میں بھی کافی حقیقتوں کو اجاگر کیا گیا تھا۔

جناب۔ یہ خط سوباسی موئے ایگزیکٹو سکریٹری کمیٹی فار انشٹیوٹ آن کثیر کے حوالے سے لکھا جا رہا ہے (انڈین ایکسپریس ۱۹ اپریل) یہ درست ہے کہ ریاستی حکومت کے تمام سکول ۵ مارچ تک بند تھے (بعد ازاں جاری کئے گئے ایک حکم کے مطابق یہ سکول یکم مئی تک بند رہیں گے) مگر سری نگر کا یہ آرمی سکول ۲۰ فروری کو موسم سرما کی تعطیلات کے بعد کھل گیا تھا مختلف جماعتوں کے لئے امتحانات یکم مارچ سے شروع ہوئے اور اسی روز فوجی سکول کے بچوں کو لے جا رہی فوجی بس جن میں زیادہ تر دفاعی اہلکاروں کے بچے تھے۔ پرنٹنگ پورہ میں چند ہندو مخالف مظاہرین نے حملہ کیا۔ یہ ناقابل تردید حقائق ہیں جن کی تصدیق تو فرزند طلبہ اربان کے والدین سے کی جا سکتی ہے۔

اگر اس کمیٹی کے اراکین وادی میں گئے تھے تو فوج پر رائے بکس ظاہر کرنے سے قبل انہیں حقائق کی تصدیق کر لینی چاہیے تھی اس سے درکنار قومی مفادات کے خلاف کمیٹی نے نتائج اخذ کر لئے ہیں۔ اگر انہیں کوئی شکوک تھے تو انہی مفاد دفاع کے ان افسران سے یا سکول کے پرنسپل چتر ویدی سے حقائق کی جانچ پڑتال کر لینا چاہیے تھی۔

یہ دانشور اور شہری حقوق کے نام نہاد علمبردار جگہ پرین اور ہندوستانی فوج کی توہین کے لئے اس قدر جلد باز ہیں کہ انہوں نے جرم کی ذرائع ابلاغ میں چند مخالف پروپیگنڈہ کے لئے اچھا خاصا مواد فراہم کیا ہے۔ پاکستان نے مسلم ممالک میں ہندو مخالف جذبات ابھارنے کے معاملے میں ان رپورٹوں کا بغور استعمال کیا ہے۔ غوام، خاص طور پر جموں و کشمیر کے باشندے اس بات کو جاننا چاہیں گے کہ وہ میٹر سرکاری اہلکار اور سیکورٹی فورسز کے وہ کون سے افسر تھے جن سے ملاقات کر کے انہوں نے اپنا جائزہ پیش کیا ہے۔ اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ ان افسروں کے نام ظاہر کئے جائیں۔

کمیٹی نے متعلقہ لوگوں سے ملاقات کی اور خیال کیا جاتا ہے کہ ان کا انٹرویو لیا گیا ہے یہ نام لوگ کون تھے؟ ان کی وابستگی کیا تھیں؟ استبدادی جبر اور ف میں میں نے یہ واضح کیا ہے کہ کمیٹی نے سنی سنائی باتوں پر یقین کیا اتنا ہی نہیں بلکہ اس نے نامعلوم افراد کی سنی سنائی باتوں پر یقین کر لیا۔ فوج اور ریاستی انتظامیہ کے خلاف جھوٹے الزامات اور سکول بس کی خبر کو ان کی ایجاد کردہ بات مان لینے اور اسے غلط جاہلیت کے ساتھ پیش کرنے سے ملک کی بین الاقوامی عزت اور وقار کو کافی نقصان پہنچا۔ متعلقہ باغیر ملکی ایک ہی ایسا منہ نہ نہیں تھا۔

جس نے میرے ساتھ مل کر اس سے متعلق برعکس مشاہدات پیش نہیں کئے جہاں پی یو سی ایل کے ذرائع اور رابطوں کے سبب اس کمیٹی کی رپورٹ عالمی ذرائع ابلاغ میں شائع ہوئی وہاں ایس این دیو اور مٹھا گرد اس جیسے افراد کے خط اخبارات کے چند غیر اہم کونوں میں شائع ہوئے اور شاید ہی کسی نے ان کا نوٹس لیا ہو۔ اس رپورٹ میں بہت سارے لغو مشاہدات ہیں جن پر رائے زنی کی ضرورت ہے میں ذیل میں ان سے چند پر ہی اکتفا کروں گا۔

اپنی رپورٹ کے صفحہ ۲۳ پر کمیٹی کہتی ہے۔

جن مسلموں سے ہم نے انٹرویو لیا جب انہیں پوچھا گیا کہ اپنے ہندو ہمسایوں کو تحفظ کی یقین دہانی کے باوجود وہ وادی کو ترک کر گئے ہیں تو انہوں نے تو مصفا فی پیش کی اس پر غور کی ضرورت ہے میں بتایا گیا کہ ہندوؤں کو ترک وادی کا مشورہ دے کر اور ان کی روانگی کے لئے شرائط پورٹ کے انتظامات کر کے جگمگ سن اینڈ منسٹرین اس ہجرت کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے۔

مگر کون سا انتظام کس نے کیا؟ حکومت کا کونسا حکم اس سے وابستہ تھا؟ یا کون تاریخوں کو ان پڑکوں نے نقل و حرکت کی۔ یہ کون سے نامعلوم مسلم افراد تھے جن کا انٹرویو لیا گیا۔ اور کس مبنیاً اور پر انہوں نے کہا کہ خاص طور پر جگمگ بن نے ہندوؤں کی ہجرت کی حوصلہ افزائی کی ہے کمیٹی کی اس ٹیم نے ان سوالات پر غور کی زحمت گوارہ نہیں کی۔ اور وہی اس نے اپنی صورت دوبارہ چیف سیکرٹری کو دکھائی تاکہ اسے مطلوبہ تفصیلات فراہم کر سکے۔ یہ بات اس لئے قہری کر یہ تمام الزامات من گھڑت تھے۔

کمیٹی نے ملک کے عوام سے تحریری شہادت کو صریحاً چھپا کر رکھا۔ اس بارے میں میں ریاستی حکومت کے مار ماراج کے پولیس نوٹ پر توجہ مبذول کرانا چاہوں گا جس میں کہا گیا ہے: ”جے اینڈ کے کے گورنر جگمگ بن نے مشیر پرندت جٹ کے عوام سے ایبل کی ہے کہ وہ غرض عارضی طور پر یہی وادی کو ترک کر کے نہ جائیں۔ انہوں نے کہا کہ امن و قیام کی مشینری کو از سر نو منظم کیا جا رہا ہے بار بار اور انٹ ناگ میں خاص ڈویژنوں کے قیام اور سپیشل فزوں اور سپیشل ڈی آئی بی کی تعزیری سے حکومت کی اتھارٹی کو دوبارہ بحال کیا جا رہا ہے۔ سینئر افسروں کو خاص طور پر یہ کام تفویض کیا گیا ہے کہ وہ اقلیتوں کی حفاظت کریں اور ان میں اعتماد بحال کریں۔

جگمگ بن نے اس طبقے کے اُن اراکین سے بھی واپس آنے کی ایبل کی ہے جو ترک وادی کر کے جمل چلے گئے ہیں۔ اس نے سری نگر، اننت ناگ، بارہ پور اور کپور تھ کے چار مقامات پر عارضی کمیٹیوں کے قیام کی پیشکش بھی کی جہاں جموں سے آئے افراد کو آباد کیا جائے گا۔ ان مقامات پر ریسیٹ باؤس یا اس کے لئے محدود دیگر عمارتوں کو حاصل کیا جائے گا۔

”جگمگ بن نے کہا کہ ان مقامات پر صنعت رہائشی سہولتیں فراہم کی جائیں گی اور کھلنے اور دیگر سہولیات کا انتظام بھی کیا جائے گا ہر ایک کمیٹی میں لازمی طبی سہولیات بھی فراہم کی جائیں گی۔ اور اکثر اوقات

ان کے گھروں تک جلنے کے مقصد سے ہر ایک کمیٹی میں گاڑیوں کے ایک پول کا انتظام بھی کیا جائے گا۔ تاکہ اس طبقے کے لوگ باحفاظت وہاں پر آجاسکیں۔ ان کمیٹیوں کا انتظام کرنے اور ان کے مسائل کے حل کے لئے الگ ریلیف کمیشن مقرر کرنے جائیں گے۔“

آل سٹیٹ کمیٹی پرینڈت ایسوسی ایشن کے پرنسپل اور سکریٹری آج جگمگ بن سے ملنے کے لئے آئے۔ ان سے گزارش کی گئی کہ جو لوگ عارضی طور پر جمل چلے گئے ہیں انہیں واپس آنے کے لئے سمجھائیں بھائی! ظاہر ہے کہ اس کمیٹی نے صریحاً اس کو نظر انداز کر کے وہی سنا اور وہی دیکھا جو وہ دیکھنا اور سننا چاہتی تھی کمیٹی کا مجبوری میں یہ تعصب ہے کہ وہ میری ذات میں نقص نکالے اور یہ اتنا واضح ہے کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

خون سرد کرنے والی دہشت گردی: حقیقی وجہ

یونکہ اس کمیٹی اور اس جیسا فرد نے خون سرد کر دینے والی دہشت گردی کی حقیقی وجہ کو معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ آئیے میں آپ کو دکھاؤں۔

بی۔ کے گنجوہ۔

سری نگر کے ایک قدیم باشندے اور بی۔ کے گنجوہ کے ایک افسر بی۔ کے گنجوہ کے ایک دوست اور عہدہ ہمسائے نے اُسے بتایا کہ اس نے مسجد میں ان لوگوں کی فہرست دیکھی ہے جنہیں ختم کیا جانا ہے اور گنجوہ کا نام ان میں شامل ہے۔ وہ اور اسی بیوی خوفزدہ ہو گئے۔ اور انہیں خدشہ تھا کہ اگر انہوں نے مقامی پولیس تک رجوع کیا تو ان کا انجام جلدی سے ہو جائے گا۔ انہیں اس کا حقیقی طور پر پتہ نہیں تھا کہ انہیں کیا کرنا چاہیئے۔ انہوں نے ایک دوسرے کے جذبات سے عاری چہروں کو تکتے ہوئے رات گزار دی کئی مرتبہ ان کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو ٹپک پڑتے۔ خوف و ہراس کے اس عالم میں انہیں خیال آتا کہ کوئی ان کا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے اور چند لمحوں تک وہ امید لا حاصل میں غور ہے۔ آخر انہیں ہلاک کیوں کیا جائیگا؟ انہوں نے کون سی غلطی کی ہے؟

ان کے غموں کی رات شاید ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی اور آخر سر دمچ آئی ہو جی۔ شری جی گنجوہ اپنے پوجا کے کمرے میں کئی گھر اس نے جی نہیں جلائی۔ وہ جلدی سے۔ چائے بنانے کے لئے رسوئی گھر تک گئی۔ ابھی وہ چائے ہی پی رہے تھے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ انہیں اسے اٹھانے کی جرات نہیں ہوئی۔ یہ گھنٹی بار بار بجتی رہی اس سے ان کے دلوں کی دھڑکن ترک کر رہ جاتی معلوم ہوتا تھا کہ ان کی چائے بھی خوف کے مارے جم چکی ہے۔ وہ اس کی گری کا احساس نہ کر سکے۔

صبح ۹ بجے دروازہ کھٹکھٹایا گیا: ”گنجو صاحب کہاں ہیں؟“ یہیں ان کے ساتھ شدید ضروری کام ہے۔“

دروازے کے باہر آوازیں آئیں وہ گھر پر نہیں ہیں۔ شرمیلی گنجنے جواب دیا ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ اتنی جلدی دفتر کیسے جاسکتے ہیں۔ براہ کرم دروازہ کھولیں اور معاملے کی شدت کا احساس کیجئے آئے ہوئے افراد نے باہر سے کہا۔ مگر اس نے انکار کر دیا۔ اس نے آوازوں کا جواب دینا بھی بند کر دیا۔ اب دروازے پر کھٹکنا ہٹ نہیں تھی مسلم ہوتا تھا کہ وہ چلے گئے تھے۔

شرمیلی گنجنے اوپر کی کڑکی ذرا کھولی۔ کوئی بھی شخص نظر نہیں آ رہا تھا۔ مگر اس سے اُسے راحت نہیں ملی۔ اُس نے اپنے شوہر کو مشورہ دیا کہ وہ پولیس کو بلیفون کرے اور اپنے انسرول کو اطلاع دے۔ اس نے یہ کام کر دیا۔ ابھی اس نے یہ کام ختم کیا تھا کہ اُسے ایک عرصے سے بند کڑکی پر زور کے دھماکوں کی آواز سنائی دی تو ہمسائے سے ہو کر گنجنے کے مکان میں کھنٹی تھی۔ کوئی شخص اُسے توڑ کر گھر میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ خوف کے مارے سمجھ رہا تھا کہ کسی نے اُسے شرمیلی گنجنے اپنے شوہر کو آمادہ کر لیا کہ وہ چھت پر چلا جائے اور خود کو خالی ڈروموں اور اس کے آس پاس پوریلوں میں چھپالے۔

چند منٹوں کے اندر ہی دو افراد گھر میں گھس آئے تھے۔ ایک کے پاس کلاشنکوف اور دوسرے کے ہاتھ میں پستول تھی۔ انہوں نے گنجنے کی تلاش میں گھر کا کوئی نہ چھان مارا انہوں نے دیکھا کہ ایک چھوٹا سا کمرہ باہر سے مقفل ہے۔ انہوں نے سوچا کہ گنجنے کے اندر ہے انہوں نے چابی کا مطالبہ کیا۔ اس نے کہا کہ وہ اس کے دیور کے ساتھ شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ انہیں فخر آ گیا۔ انہوں نے چھوٹے سے دروازے کو توڑ دیا۔ مگر گنجنے کوئی توجہ انہیں نہیں ملا۔ اپنی فون کی پیاسی آنکھیں لے کر وہ یہ کہتے ہوئے چلے گئے۔ ایک چوہا آخر تک بچ سکتا ہے۔ یہ شرمیلی گنجنے کو یہ کچھ نہیں آیا کہ اس کے شوہر کو آخر توچہ باکیوں کہا جا رہا ہے۔

گنجنے کے کوئے پر ہمسائے میں ایک گھر آئے ہوئے ان افراد کو اشارہ کیا گیا۔ وہ واپس دوڑ کر عسلی کی رفتار سے گنجنے کے گھر کی بیڑھیاں چڑھ گئے۔ شرمیلی گنجنے بن کر کھڑی رہی۔ اس کی ٹانگیں مغلوج ہو چکی تھیں۔ جلد ہی اُس نے گولیوں کی آواز سنی اور فرش پر لڑھک گئی۔ ان کا شوہر چھت پر مردہ پڑا تھا اور بوریاں اس کے خون سے لٹ پٹ ہو چکی تھیں۔ ڈیم بیڑھیاں سے لڑھک چکا تھا۔ اور گھر آئے قاتل افراد پر کسی بات کا اثر نہیں ہوا۔ وہ خاموشی کے ساتھ چلے گئے۔ اس مرتبہ انہوں نے نیم مردہ عورت شرمیلی گنجنے کی طرف دیکھا بھی نہیں انہوں نے اس کی درد بھری سسکیوں کی بھی پروا نہیں کی۔

کبھی کے اراکین اور ایسے لوگوں نے کثیری دہشت گردی کے ظالمہ فجروں میں پھڑپھڑاتے ہوئے گنجنے جیسے کبوتروں کو مٹنے کی کوشش تک نہیں کی اور نہ ہی ان کی بیواؤں اور لواحقین کی اندوہ ناک سسکیاں سننے کی ان کے پاس فرصت تھی۔ جن گھروں میں انہیں جانا تھا۔ جن زمرے کے لوگوں سے انہوں نے انٹرویو کرنا تھا۔ اور جنت انج انہیں اخذ کرنا تھا۔ وہ سب پیچھے سے ملے تھے اور مذمت کے لئے نشانہ بنی تھے۔ جسے واپس بلانے کا وہ مطالبہ کر سکتے تھے۔

پروفیسر کے ایل گنجنے

گنجنے سو پور زراعتی کالج میں پکچر تھا۔ اُسے عزت و وقار کی لنگہ بھول سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کی سائینٹفک جس نے اس پر ظاہر کر دیا تھا کہ سو پور رسائیوں کی ایک باہمی صورت اختیار کر چکا تھا اور انہیں زہریلے ناگ کسی بھی وقت ڈس سکتے ہیں مگر اس کے اندر کے کثیری جذبات اُسے برعکس نتیجہ اخذ کرنے کے لئے مجبور کر دیتے۔ تھ فر اُسے کوئی نقصان کیوں پہنچائے گا۔ اس نے اپنی زندگی میں ایک مکتبی تک کو بھی نقصان نہیں پہنچایا ہے۔ اس نے مقامی طبقے کی اچھی طرح خدمت کی ہے اور اس کے متعدد مسلم دوست اور داد خواہ ہیں۔ وہ اندر ہی اندر دلیل پیش کرتا۔

۲ مئی ۱۹۹۰ء کو کے ایل گنجنے اس کی بیوی اور چچا زاد بھائی "پستہ" رات ۹ بجے کے قریب کھانا کھا رہے تھے۔ جب کہ چار مسلح افراد داخل ہوئے۔ ایک کے پاس کلاشنکوف اور تین کے پاس پستول تھے۔ انہوں نے ان تینوں افراد کو اپنے ساتھ چلنے کے لئے کہا۔ اگر کسی بھی شخص کو بھی ذبح خانے تک لے جایا جائے تو وہ ہتھیار ہٹا کر باہر سے نکلنے کی کوشش کرتی ہے مگر خوف کے مارے زردان تین افراد کو جنکی رگولہ میں خون بھری ہوئے ہاتھ خاموشی کے ساتھ اچھل خانے تک جانا تھا۔ اس علاقے میں قریباً بھی ہمسایوں نے انہیں لے جاتے ہوئے دیکھا۔ ان میں سے چند افراد نے پچان بھی لیا کہ یہ افراد مقامی دہشت گرد گروپ "لشکر الوب" سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر ان ہمسایوں میں سے کوئی بھی رحم کی درخواست کے لئے ایک انٹھی بھی آگے نہیں بڑھا۔ وہ محض دیکھتے رہے۔ یہاں تک کہ ان تینوں کو لے کر وہ وہاں سے جا چکے تھے مگر کسی ہمسائے نے قریب ہی آ۔ آر پی کی چوکی کو اطلاع دینے کی زحمت گوارہ نہیں کی۔ بہر حال مقامی پولیس کو اطلاع دینا محض ایک رسم ہوتی ہے۔ انہوں نے یہ بھی نہیں کیا۔ کے ایل گنجنے اور اس کے ساتھیوں کو وہ مقرر مقام پر لے گئے جو دریا کے جہلم کے کنارے پر ایک سجدے سے باہر تھا۔ ایک سے اس کے جسم میں چھ گولیاں داغی گئیں۔ جب پہلی گولی داغی جاتی تھی تو نادانستہ طور پر نشانے باز کے ہاتھ اٹھ گئے جس سے اس کا نشانہ بٹ گیا۔ یہ گولی پستہ کی بیڑھی کو لگی جس سے وہ معمولی طور پر زخمی ہو گیا۔ وہ دریا میں کود پڑا۔ اور کسی طور محفوظ مقام پر پہنچ گیا۔ خوف کے مارے وادی میں ایک دن روز تک چھپے رہنے کے بعد وہ بھول گیا۔ چند نابینا دھوہ کی بنا پر گنجنے کی لاش رات بھر مسجد میں رکھی گئی اور اس کے بعد اُسے دریا بڑد کر دیا گیا۔ بعد ازاں گرفتار کئے گئے ایک قاتل کے مطابق شرمیلی گنجنے کو بھی بے رحمی کے ساتھ مارا گیا اور اس کی لاش کے ساتھ پتھر باندھ کر دریا کے جہلم میں پھینک دیا گیا۔ مگر اس کی لاش بھی برآمد نہیں ہوئی۔

۱۰۔ یہ تفصیلات تقاطعوں کے ان اکتشافات پر مبنی ہیں جو بعد ازاں گرفتاری کے بعد انہوں نے بھی اس باب میں

اندر رہنوں سے متعلق ہے۔ ملاحظہ ہو۔

ہمسایوں کے اس قدر خالی الفاظ اور طفل تسیلوں کو کیٹی نے ہر محل تصور کیا۔
سرینگرا اور سو پور سے آئے ہیں آپ کو دیہی کشمیر تک لے چلوں اور جٹلوں کو دہشت گردی کا آئیدب
کس قدر سبہ رحم ہو سکتا ہے۔

پیر یحییٰ

پیر یحییٰ کی اندوہ ناک داستان ایک شاعر کی کہانی ہے وہ شاعر جو ہمدردی انسان دوستی محبت کے ساتھ
ساتھ حتیٰ اور انصاف کا پیامبر تھا جس نے ہنگوٹ گیتا کا ترجمہ کشمیری زبان میں کیا تھا اور تھوڑے لمبے کے لئے
اس نے اپنے گھر میں قرآن شریف کا ایک نسخہ بھی رکھا تھا۔ یہ وہ شاعر تھا جس نے اپنی طویل ملازمت کے دوران
بہت سارے ذہن متور کئے تھے اور انہیں سب سے زیادہ بیش قیمت تحفہ تعلیم عطا کیا تھا۔ وہ ایک شریف النفس
انسان تھا جسے اپنے ۲۷ سالہ بیٹے کے ساتھ نہایت بے رحمانہ اور سفاکانہ انداز سے قتل کیا گیا تھا۔
ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد سروا مندر گول پیر یحییٰ اپنے گاؤں شالی ضلع انت ناگ میں اپنے
کنڈے کے ساتھ قیام پذیر تھا۔ زیادہ تر وقت وہ مقامی اخبار رات اور رسالوں کے لئے مضامین لکھ کر بتدریس
شغل میں گذار کرتا تھا۔

اس کے کہنے کے چند افراد نے اس دور افتادہ گاؤں میں اپنی خیر و عافیت پر رشک کا اظہار کیا اور اس
سرسزمین سے ہجرت کا مشورہ دیا یہاں ان کی گہری جڑیں موجود تھیں لیکن پیر یحییٰ اسے ناقابل تصور سمجھتے تھے۔ مزید
برائے اس حالت میں اس کے متحدہ پرانے طلباء اور دوستوں میں سے کیا کوئی بھی اس کہنے کی پروا کرنا لائیں تھا؟
مگر حقیقت یہ تھی کہ اس کی شاعری کے اعتقادات اور احساسات سب دم ٹوڑ چکے تھے اور پُرانی
رفاقتیں اور وفاداریاں کمزور چکی تھیں اور ان پر بنیاد پرستی اور کٹر پختہ کی ایسی یلغار ہوئی کہ سب قدریں کھو چکی
تھیں۔ ۳۰ اپریل ۱۹۹۰ء کو شام دیر گئے عین مسلح افراد بیٹریوں کی صورت اپنے شکار کو بھانسنے کے لئے پیر یحییٰ کے
دروازے پر نمودار ہوئے۔ انہوں نے ہنگوٹ کے تمام افراد کو حکماً ایک کمرے میں بند کر دیا اور ۶ سالہ پیر یحییٰ کو اپنے
بمراہ ان کے کیمپ تک چلنے کے لئے کہا تا کہ وہ چند رسالوں کا جواب دے سکے۔

اس موقع پر چند مسلم ہمسائے ملنے آئے اور پیر یحییٰ کی طرف سے بڑھ چکا دیکھا مگر ان کے نرم احتیاجات کا
ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ موت کے رفرشتے پر حال فریب کاری کے فن میں مہارت شدہ تھے۔ انہوں نے اپنے
مذہب کی قسم کھائی کہ پیر یحییٰ کو کوئی نقصان نہیں پہونچایا جائے گا۔ بہر حال اس کے بیٹے ویریندر کول نے اس
بات پر زور دیا کہ جو بھی سوالات پوچھے جانے میں انہیں ایک الگ کمرے میں پوچھے جائیں مگر والدین انہیں مانے
وہ جیسا کہ طرح مان سکتے تھے۔ وہ تو مسافر تھے کیمپ تک لے جانے کے لئے آئے تھے وہ ویریندر کول کو بھی
اپنے ہمراہ لے گئے۔

کسی نے بھی پولیس کو اطلاع نہیں دی یہاں تک کہ رشتے دار اور بڑے بھوکے دوست بھی چپ سادھے ہیں۔
خوف و ہراس کے ماحول نے تمام تر واپس گئے کو گنگ بنا کر رکھ دیا تھا۔
دو روز کی اندوہ ناک تشویش کے بعد یہ المناک خبر موصول ہوئی کہ دولائیں بھانسی پر لگی ہوئی ملیں ہیں جن
کے عضو ٹوٹ چکے تھے بال اکھاڑے گئے تھے اور ان کی جھڑی کے بہت سارے حقول کو ہوا کر جلا دیا گیا تھا۔

تجربہ سچائی

آپ اس کہانی کی بابت کیا کہہ سکتے ہیں جو اس حقیقت کو آشکار کرتی ہے کہ کتنے ماحول ہیبت ناک نہیں
یہاں پر حیوانیت کا دور دورہ نہیں یہ قزاقوں کی سنگدل کلاشنکوف نہیں ہے یہ ہم دھمکے اور آتشزدگیوں نہیں
یہ دھمکی آمیز ٹیلی فون کالیں نہیں یہ مسجدوں سے لاؤڈ سپیکروں سے جہاد کے لئے دینے والی نویدیں دی جلیں، یہ
تراڈ کشمیر نہیں جس کے مطابق ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے میں رائفل کی تلقین ہے۔ یہ گنجو کو یا پیر یحییٰ کے مالیات
نہیں کہ جس کے مطابق ناپاک عزائم سے ایک کو ہلاک کر کے... کو ڈرانا نہیں ہے بلکہ انہوں نے لالچے جس کے مطابق
کشمیر وادی کی ٹھنڈی فضاؤں کو خیر باد کہہ کر جھول کے گم اور با موافق یکمیوں میں رہنے کے لئے مجبور ہوئے۔ آپ
لیسے ہائی کورٹ کے سابق ججوں کا کیا کریں گے جو اس قسم کی سچائیوں پر اپنے نام کی مہر ثبت کر رہے ہیں مگر طرہاً
لا پرواہی اور سخت روش کی وجہ نہیں تو آپ اس ملک کے قانونی نظام کا کیا کر سکتے ہیں۔ جہاں ملک کے
قانونی آئین پر چندہ ستارے ریاست کی سب سے بڑی عدالتوں میں ایک یا دوسرے موقع پر آدھکتے ہیں۔

آپ غلط پروپیگنڈہ یا فریب کیسے بناوٹ یا کھوکھلا پن کیسے لا پرواہی اور بے اعتنائی تصعب یا جانبداری
کچھ کیسے مگر یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ ملک اور دنیا کا ایک اچھا خاصہ کشمیری پڑتوں کی نام نہاد ایما زہ
ہجرت کے معاملے میں گمراہ کیا گیا۔ اس کیٹی کی رپورٹ کا اس قدر نقصان دہ اثر ہوا کہ لب و لہجہ میں کیٹی کی رپورٹ
اس سنگین انسانی ایسے کے ساتھ ایک سنگدلانہ جھوٹ کے مترادف تھی۔

مثال کے طور پر وہ تمام ٹرک نمبر کہاں ہیں جو کیٹی نے چیف سیکرٹری کو فراہم کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ کیٹی
نے اپنی رپورٹ میں ہی تمام نمبر کیوں شامل کر دیئے؟ ان پلاٹوں کے نمبر اور عدالتوں کی تفصیل کہاں ہے جنہیں جگہوں
کی ایڈمنسٹریشن کی طرف سے کشمیری پڑتوں کو الٹ کیا گیا تھا کیا تھا۔

اس قوم پر کی فتنوی صادر کیا جائے جس نے اپنے آپ کو اندرمومن اور مسوہالی جیسے افراد کی طرف سے
متنازع فتویٰ دے سنے ہیں اس قسم کے سلی اور یکطرفہ نتائج اخذ کئے ہوں اور قوم کو تیسرے کے بین الاقوامی
سلی پر اس کے عکس کی افادیت کو کم کیا ہو۔

کشمیری مائیگرنٹ فورم نے بھی ۱۹۹۰ء کو اپنے ایک بیان میں کیٹی کی رپورٹ کے بارے میں اسی قسم کے
تاثرات کا اظہار کیا۔

خوف وراس

ستمبر ۱۹۸۹ء کے بعد کشمیری پینڈتوں پر شدید خوف وراس طاری رہا۔ اس وقت اس طبقے نے وہی محسوس کرنا شروع کر دیا تھا جو وہ اٹھارہویں صدی کے دوسرے نصف میں محسوس کر رہا تھا

لے دل ڈوباں ڈرے

شہر میں سناٹا ہے

سفر کی تیاری کرو۔

شہر میں افراطی غلبہ ہے۔

میرے پیش رو جنرل کے وی کرشنا راؤ کو ۲۴ جنوری ۱۹۹۰ء کے فخرہ ایک میمورنڈم میں کشمیری برصغیر سے اور دیگر تنظیموں نے کہا۔

”ریاستی حکومت غیر موثر ہے اور یہ معصوم عوام کی ہلاکت کو روک نہیں سکی ہے۔ حکومت کی بجائے آج وادی میں دہشت گردوں کی حکومت چل رہی ہے حکمران سپاہی طاقتی دہشت گردوں کے فیض و غنچے سے بچنے کے لئے خود اپنی بقا کے لئے فکر مند ہیں۔ انت ناگ سو پوز بار بھول، ترائل فرن، پلوامہ، شہر چانگ، شہر پیاں اور وادی کے دوسرے مقامات کے واقعات بنیاد پرستوں کے منصوبوں کی علامات ہیں جس کے تحت اقلیتوں کو وہ اپنے حملوں کا نشانہ بنا رہے ہیں ۱۵ دسمبر ۱۹۸۹ء کو اقلیتی طبقے کے مرد، خواتین اور بچوں پر بے رحمی کے ساتھ حملہ کیا گیا اور خواتین کی آبروریزی کی گئی۔ بہت کیشو نا تھا، شلال ٹیلوہ این کے گنحو، پریم نا تھ بھٹ اور اے کے پور اور دیگر افراد کی ہاتھوں کا قتلہ اقلیتی طبقے میں خوف وراس پیدا کرنا تھا تاہم انہیں ترک وادی پر مجبور کیا جاسکے۔ اب نقل مکانی کی رفتار مزید بڑھ چکی ہے۔“

موجودہ انتظامیہ کا یہ افسوسناک پہلو ہے کہ اب تک پولیس کی طرف سے اقلیتی طبقے کے لیڈروں اور دیگر افراد کے قاتلوں میں سے کسی کو بھی نہیں لکھا گیا ہے پاکستان کی طرف سے مکمل طور پر تربیت یافتہ اور جدید ہتھیاروں سے لیس زیر زمین عناصر سیکورٹی فورسز کے ساتھ کھلے عام حکمرانی کرتے ہیں۔ یہ امر ریاستی حکومت کی نااہلیت اور حکومت میں چند اعلیٰ افراد کے ملوث ہونے کی واضح تصویر پیش کرتے ہیں۔ وزیر مملکت علی محمد ساگر کا بیان ۱۹۸۰ء کو اخبارات میں شائع ہوا اس میں گھڑی کی سوئیوں کو ۱۹۵۳ء کی پوزیشن پر لے جانے کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ یہ بات اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ نیشنل کانفرنس کے سیاسی آقاؤں کا ذہن کس طور پر کام کر رہا تھا۔

در حقیقت پچھلے کچھ عرصے سے کشمیری پینڈت خود کو نہایت غیر محفوظ محسوس کر رہے تھے۔ فروری ۱۹۸۶ء کے

فسادات کے بعد جب میں نے ضلع انتانت ناگ میں چند مقبول اور دیہات کا دورہ کیا تو ان کے خوفزدہ چہروں کی بابت مجھے اچھی طرح یاد ہے۔

گمراہی

کشمیری مہاجر یا یوں کہیے کہ تمام کشمیری ہندوستانی قدروں کے ایک عمیق بحران سے گزر رہے ہیں اس کے آئین، سیاسی، سماجی اور اخلاقی اصولوں کی گمراہی شامل ہے۔ اگر آپ معیشت میں گرفتار اس طبقے کے کب تک جائیں اور اگر آپ یہ ہدایت دیں کہ نقدی رقم کی بجائے مہاجر ملازمین کو رخصت کی تنخواہ ادا کی جائے اگر دہشت گردوں کی طرف سے سنا کا نظریہ ہلاک کے لئے شخص کی بیوہ کی طرف سے مکان الاٹ کرنے کی درخواست کو آپ مان لیتے ہیں تو آپ فرقہ پرست اور مسلم مخالف بن جاتے ہیں اور اس بارے میں اخبارات میں من گھڑت قصے کہانیاں شائع کی جائیں گی اور جب پارلیمنٹ میں اس مرتبہ سماعت کا پردہ فاش کرنے کا موقع آتا ہے تو آپ کو بولنے نہیں دیا جاتا اور ایوان کے مختلف گروپوں سے آپ کو روکا جائے گا اور اگر دوسری طرف آپ سکول بس جیسے واقعات کی اختراع کر کے ہندوستانی فوج اور گورنر کے انتظامیہ پر جھوٹے الزامات لگا دیں۔ اگر آپ انتظامیہ اور خاص طور پر حکمرانوں کی نکتہ چینی کریں اور پلاٹ اور ٹوکوں کا لالچ دینے کے الزامات عائد کریں تو آپ ان کی تفصیلات بھی دے دیں تو آپ کے یہ الزامات اخبارات میں شائع ہو گئے۔ اور آپ کی رپورٹ میں قومی اور بین الاقوامی اخبارات میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی پارلیمنٹ میں ان کا سوال دیا جائے گا اور آپ سیکولر ترقی پسند انسانی حقوق کے علمبردار اور نہ جانے کیا کیا قرار دیئے جائیں گے۔

کشمیری پینڈتوں کی ذہنی حالتی کے بارے میں چند اور سوال میرے ذہن میں ابھرتے رہے ہیں جن میں غلطی اور ارتکابات کی نشاندہی ابواب بعنوان ”جڑیں“ تخریب کاری اور دہشت گردی کی نوعیت اور طرز عمل خطرے کے علامات میں کی ہے اس قابل گریز ایسے کے محتوب ان لوگوں کے ساتھ سمجھا کیا تعلق ہے میری طرف سے شروع کئے گئے آپریشن ریسکیو OPERATION RESCUE جس کی تفصیلات میں نے طرز عمل حمد اور جرائی حمزہ والا دہی حاصل کرنا۔ ابواب میں دی ہیں کسی کے نا پاک کتا ہو کر خیمہ کا نہیں کیوں جھگٹنا پڑے۔ ان سوالات کا بچے صرف ایک ہی جواب ملتا ہے کہ شاید کشمیری پینڈتوں کے لئے ایک اور شرمناک تقدیر ہے کہ انہیں دوسروں کی طرف سے سزنا ہوں کی سزا مل رہی ہے۔

غلط بیانی کا ایک اور جہاں

حقائق کو مسخ کرنے اور غلط بیانی کے بارے میں آئیے میں ایک اور پہلو پر متغیر روشنی ڈالوں کیٹی فائنٹیائیٹو آن کشمیری رپورٹ کا حقد دوئم ”کشمیری قید و بند میں“ (KASHMIRI - IMPRISONED) سنگ دامانی کی وجہ سے میں اس دھندلے

گو رکھ دھندلے کے ٹھنڈے چنڈ دھاگوں کو ہریاں کرنے کی کوشش کروں گا۔

اس رپورٹ کے صفحہ ۳۸ پر غلام حسن بھٹو (۶۵ سال) سنٹرل ریزرو پولیس کی طرف سے خود کو اذیتیں دینے جلنے کی روئداد بیان کرتا ہے۔ اپنی روئداد کے آخری حصے میں وہ کہتا ہے۔ +

”ڈاکٹر آیا اور دو ٹی ڈی گئی۔ جب مجھے تھیں اول کی بابت پوچھا گیا تو میں نے کہا کہ اپنی زندگی بچانے کے لئے میں نے جھوٹ بولا تھا۔ پشائی پھر شروع ہو گئی۔ میں نے دوبارہ کہا ہاں۔ میرے پاس ہتھیار ہیں۔ اور بے ہوش ہو گیا۔ تین سارو والا ایک انسرایا اور میں نے اُسے بتایا۔ جب میں سچ بولتا ہوں تو آپ لوگ میری پشائی کرتے ہو اور جب جھوٹ بولتا ہوں تو بند کر دیتے ہو تب انہوں نے مجھے ایک وردی پشائی دی۔ ایک جیب میں ڈال کر صبح ۵ بجے بارہ بولہ واپس لایا گیا۔ انہوں نے میرے گھر کے میدان کو کھودا اور مجھے واپس لے گئے۔ پھر انہوں نے مجھے ہتھکڑی ڈال کر ایک کڑے کے ڈھیر پر ڈال دیا شاید سو جا ہو کہ میں مر چکا ہوں۔ دو دن بعد مجھے دوبارہ زندہ دیکھ کر دو بجے سولہ پولیس سٹیشن لے گئے اور مجھے وہاں جھوڑ دیا۔“

یہ روئداد ظاہری طور پر بری من گھڑت معلوم ہوتی ہے۔ ذرا سوچئے کہ سی آر پی ڈاکٹر کی جہانجی کے بغیر جو ہاں دستیاب بھی ہے ایک شخص کو مردہ تصور کر لیتی ہے۔ ذرا سوچئے کہ سی آر پی اس قدر احمق ہے کہ مردہ شخص کو بارہ بولہ میں گندگی کے ایک ڈھیر پر چھٹک دیتی ہے جب کہ اُسے اپنے لوگوں کی موجودگی میں اس کے گھر سے ہی لایا گیا ہو۔ یہ بھی تصور کیجئے کہ ایک ۶۵ سالہ شخص شدید زہر کو بھرنے اور ہتھکڑی پہننے دو دن اور دو راتوں تک بارہ بولہ میں کڑے کے ایک ڈھیر پر پڑا رہا ہو اور اُسے کسی نے دیکھا نہ ہو۔ یہ ایک ایسا قصہ ہے جہاں آپ کے کانوں میں ایک مٹھی گونشی کا بھی سارے قصے کو جتہ جیل جاتا ہے۔ مزید برآں یہ بھی سوچئے کہ دو دن بعد سی آر پی ٹیم اسی مقام پر آئی اور کسی کی توجہ کے بغیر مردہ شخص کو کسی اور مقام پر لے جانے کی بجائے سولہ پولیس سٹیشن لے گئی۔

”وہ ایک عینی شاہد کی طرح جھوٹ بولتا ہے! کیا مہجور کی اس روئداد میں یہ زور سے متولد صادر نہیں آتا ہے؟ اس کمیٹی کی کچھ امور روزیت کے بارے میں کوئی کہنا ہے۔ جس نے قدرتی سوالات کو بوجھے بغیر اس روئداد کو قبول کر کے اپنی رپورٹ مرتب کر لی۔ کمیٹی نے محض بیانات درج کرنے تک ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ خود کو ہائیکورٹ سمجھ کر لکھا۔“ اس بارے میں پریشان کن بات یہ بھی کہ سیکورٹی فورسز کو بے پرواہی کے ساتھ تشدد کا ارتکاب کرتی ہیں۔ صفحہ ۳۳ پر اس رپورٹ میں درج ہے کہ اور وہ اُسے حقیقت تسلیم کرتی ہے کہ خواتین وکلاء کی طرف سے یہ الزام عائد کیا گیا۔

”بی ایس ایف کی خواتین ہمیں جے مانتا کی کہنے کو کہتی ہیں اور جھکی دیتی ہیں کہ انہیں دہلی لے جا کر بیٹھا بنا دیا جائے گا یا انہیں مندروں میں لے جا کر ان پر تلک لگایا جائے گا کیلکہ ہی سیکورزم ہے۔“

اس بارے میں واقفیت رکھنے والے کسی بھی شخص کے سامنے اس قصے کی من گھڑت ہونے کی بات واضح طور پر عیاں ہو جائے گی اور وہ اسے چشم پوشی بھی نہیں کر سکتا۔ بی ایس ایف کے پاس خواتین کا کوئی مشہد نہیں۔ اس قسم کے الزامات عائد کرنے والوں اور انہیں تسلیم کرنے والوں کی بدینتی نمایاں ہو جاتی ہے۔ یہ ناپاک منصوبہ خود ہی دعو کے اور فریب کا شکار ہو گیا۔ جے مانتا کی ایسی اصطلاحات خاص قسم کا تاثر پیدا کرنے کے لئے گھڑ لی جاتی ہیں۔ یہ الزامات کسی عام آدمی نے نہیں لگائے بلکہ ان وکیلوں کی طرف سے عائد کئے گئے ہیں جو قانونی مہارت ہی نہیں رکھتے بلکہ عوامی معاملات میں بھی سسر گرم ہیں۔ یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ کمیٹی بنیادی امور سے بھی بے بہرہ ہے اور پھر بھی وہ اس مسئلے پر نہایت وثوق کے ساتھ بات کرنے کی جسارت کرتی ہے۔

اس رپورٹ کے صفحہ ۶۲ پر کمیٹی نے عبدالحمید سیکنڈ کنٹھ باغ بارہ بولہ کی جانب سے عائد الزامات کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ ”۲۵-۲۴ اپریل کی درمیانی شب کو ۴۹ افراد کے ساتھ فوج مجھے لے گئی۔ ہمیں کھیلے عام فہم کھانے اور پینے کے لئے کہا جاتا۔“ بارہ بولہ میں تلاشیوں کے دوران رونما ہوئے واقعات کا اگلا ذکر اس رپورٹ کے دیگر حصوں میں ملتا ہے۔

جب متذکرہ بالا اور دیگر الزامات کی شکایت میسر میز پر پہنچی تو میں نے اُسے فوری طور پر پشیل کفر بارہ بولہ کی پھونساگ اور کمانڈر لفٹننٹ جنرل ایم۔ لے زکی کو ارسال کر دیا۔ اس درخواست پر بارہ بولہ کے متعدد وکلاء نے دستخط کئے تھے۔ پھونساگ نے اپنی رپورٹ میں کہا۔

”سیکورٹی فورسز کی گذارش پر صبح ۶ بجے تک چار بمبشیرٹ اور چار پولیس پارٹیاں ان کی تحویل میں دے دیں۔ صبح ۸ بجے سے ۸ بجے کے دوران تلاشیاں ایک ساتھ شروع کی گئیں۔ ان تلاشیوں سے متاثرہ کئی افراد گزشتہ ۳ دنوں سے میرے ساتھ ملقاتی ہو چکے ہیں۔ ان میں سے کسی نے بھی خواتین کی بے حرمتی پیش قیمت اشیاء کی چوری منہ ہی مقامات یا منہ ہی سٹوں جانند کے نقصان و بربادی کی بات رکھوایا تسلیم کرنا یا لوگوں کو درختوں کے ساتھ باندھ دینا، انہیں گندہ پانی پینے پر مجبور کرنا یا ان کے چہروں پر فضل پوت دینا اس سب کے بارے میں کسی نے شکایت نہیں کی۔ جن لوگوں کے گھروں کی تلاشی لی گئی ہے ان تمام افراد نے بلا امتیاز کہ ایک بھی ایسا واقعہ نہیں جہاں ان کے کسی گھر سے کوئی تنگ آٹھائی گئی ہو۔ انہوں نے کہا کہ جو انسپریوٹنوں کی نگرانی کر رہے تھے وہ عام طور پر میرا ہاں اور معاملہ فہم تھے۔

لذاخ کے ایک سینئر آئی اے ایس انسپریوٹن نے جو حقائق بیان کئے جنرل زکی کی رپورٹ سے ان کی مطابقت تھی۔

مندرجہ بالا رپورٹوں اور میرے ذریعے کی گئی دیگر تحقیقات سے یہ واضح ہو گیا کہ درحقیقت ۲۵ اپریل ۱۹۹۰ء

کی تلاشوں سے متاثرہ کسی بھی باشندے نے یہ الزامات نہیں لگائے تھے بلکہ بارہولہ کے چند روکاؤں کی طرف سے گھڑے گئے تھے جو جماعت اسلامی کے کارکن تھے اور اس میں مورخہ میں انہیں شامل کیا جو حکام اور اخبارات کو تین دن بعد ارسال کیا گیا کیونکہ ان میں گھڑت الزامات پر یقین کرتا ہے۔ ویسے ہی شہری اور فوجی انفرادے کے مزاج سے واقف کوئی بھی شخص اس بات پر یقین نہیں کر سکتا کہ انہوں نے مینہ بدسلوکی کی ہوگی یا اس بات کی اجازت دی ہوگی۔

حقائق دبانے اور نظر انداز کرنے کا طریقہ کار

اس باب میں زیر بحث دو نولہولوں کا ایک خود پہلو ہے کہ ان میں حق اور نظر انداز کرنے کے طریقہ کار اپنا یا لگایا ہے۔ آئیے میں چند مثالیں پیش کروں کہ شیریں دہند میں "صفحہ ۳۶ پر کہا گیا ہے۔ "گورنر نے اس دفعہ میں لفظ "ریاست میں" حذف کر کے اس دفعہ میں "تریم کردی" اس تریم کی رو سے جوں و کشمیر میں ایکٹ کے تحت نظر بند کوئی بھی شخص ملک کے کسی بھی حصے میں منتقل کیا جاسکتا ہے۔ اہم بات تو یہ ہے کہ کمیٹی نے میرے اس فیصلے کے جواز کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ اس معاملے میں ایک اہم حقیقت کو بھی پوشیدہ رکھا گیا ہے۔ سپریم کورٹ آف انڈیا نے اس تریم کے جواز کو جائز قرار دیا ہے۔

مرکز اور تمام دوسری ریاستوں کے قوانین کے مطابق ایک نظربند کو اس ریاست سے باہر بھی نظر بند کیا جاسکتا ہے جس ریاست کا وہ باشندہ ہو۔ جو دوسری ریاستوں کے لئے جائز اور حق بجانب ہے وہ جوں و کشمیر کی ریاست کے معاملے میں بھی جائز اور حق بجانب ہوگا خاص طور پر جب یہ تخریب اور دہشت گردی کی شکارت ہو۔ کمیٹی نے الزام لگایا ہے کہ کشمیری پینڈوؤں کے سوائے کسی کے لواحقین کو بھی کوئی معاوضہ نہیں دیا گیا۔ یہاں بھی کمیٹی نے ٹھوس حقائق کو پوشیدہ رکھا ہے۔ دہشت گردانہ تشدد کے شکار بھی افراد کے لواحقین کو معاوضہ ادا کیا گیا۔ میسرالٹ اور عبد الغنی کی بیواؤں کی کس ۲ لاکھ روپے ادا کئے گئے ایک لاکھ روپے ریاستی حکومت کی طرف سے اور ایک لاکھ روپے پبلک بورڈ کی طرف سے ادا کئے گئے۔ موثر الذکر کے بیٹے کو یونیورسٹی میں بطور لیکچرار ملازمت بھی دی گئی۔ جوں و کشمیر میں مارے گئے ایک مسلم نوجوان جو کہ سرکاری ملازم تھا اس کے لواحقین کو بھی ایک لاکھ روپے ادا کئے گئے۔ اس کے بھائی کو بھی ریاستی حکومت کے تحت ملازمت فراہم کی گئی۔ جب قوامی سطح کی ایک جیپ پر حملہ کیا گیا تو محافل کی طرف سے فائرنگ کے نتیجے میں تینوں کنبوں کو بھی معاوضے کی پیش کش کی گئی۔ جن کے دورے دار جہان بچ ہوئے تھے۔ مگر وہ لوگ اس رقم کو قبول کرنے سے خائف تھے۔ دہشت گردوں نے دھمکی دی تھی کہ جو شخص بھی حکومت کی طرف سے دیئے گئے معاوضے کو قبول کرے گا اس کے ساتھ مناسب طور پر ہر نش جائے گا۔ بہر کیف ایسے معاملوں میں کوئی معاوضہ ادا نہیں کیا گیا جہاں کوئی شخص دہشت گردانہ تشدد میں ملوث ہو کر یا تشدد و طریقوں سے قانونی اتھارٹی کو چیلنج کرتے ہوئے جان بحق ہوا ہو۔

کہ اس فائرنگ کے شکار معصوم افراد کے لئے میں نے معاوضہ دینے سے کبھی انکار نہیں کیا۔ میں نے اس فیصلے کو متعدد دہشت گردوں پر دہرا یا تھا اور ریاستی انتظامیہ نے ایک پریس نوٹ بھی جاری کیا تھا۔ جو حسب ذیل ہے۔ گورنر جگموہن نے ایک اعلیٰ سطحی کمیٹی کی تشکیل کی ہے جو ایسے معاملوں میں مناسب اضافی ریلیف کی سفارش کرے جہاں افراد کو اس فائرنگ میں حادثے کے طور پر جہاں بحق یا زخمی ہوئے ہوں یا یہاں زخم عسکر یا تشدد کی کاروائیوں میں ملوث ہوئے بغیر آئیے۔ اس کمیٹی کی سربراہی چیف سیکرٹری (لا اینڈ آرڈر) حمید اللہ خان اور اس کے اراکین میں ایڈیشنل چیف سیکرٹری (ہوم) محمود الرحمن اور ڈیٹنل کمشنر جیلز احمد خان ہونگے۔ یہ کمیٹی ہر معاملے میں ایک لاکھ روپے تک رقم کی سفارش کر سکتی ہے اور تمام معاملوں میں دو ماہ تک اپنی سفارشات گورنر کو ارسال کر دے گی اس کے دائرہ کار میں گذشتہ ایک برس کے دوران رونما ہوا واقعات ہونگے۔ جن معاملات میں ریلیف پہلے ہی منظور کی جا چکی ہے ان میں اختلاف کے لئے نظر ثانی بھی کی جاسکتی ہے۔ گورنر کی ایڈمنسٹریشن کی مدت کرنے کے جذبے اور اسے شیطانی قرار دینے کی کوشش میں کمیٹی نے اسے تمام انسانی پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا جو میرے طرز عمل کا ایک حصہ تھے۔ اس نے ۱۹ جنوری ۱۹۹۰ء کو جاری ہونے والے پالیسی بیان کو بھی نظر انداز کر دیا جس میں واضح کیا گیا تھا۔

آئینی طور پر میں گورنر ہوں گا۔ مگر تمام عملی مقاصد کے لئے میں ایک اردلی کی طرح کام کروں گا۔ ایک نرسنگ اردلی کی طرح تاکہ مریض کی محبت انسان دوستی اور خدمت کے جذبے سے مدد کی جائے اور اس کی بہت بھال ہو سکے۔ کمیٹی نے ان شائع شدہ خطوط کا جواب دیا جس میں نے ۸ فروری کو ڈاکٹر خان کو اس کے بیٹے شیر کی وفات پر لکھا تھا۔ "آئیے ہم ایک ایسی صورت حال پیدا کریں جہاں مٹروں پر کوئی پولیس اہلکار نظر نہ آئے اور وہیتاں اور خوشحال لوگوں سے بھری رہیں۔ آئیے ہم ایک دفعہ پھر اپنے نوجوان بھائیوں پر زور دے کر وہ بد وقت کے رواج کی بے سودی کو محسوس کریں اور اس ہم پہلو مصیبت کو محسوس کریں جو اس کی وجہ سے ہوئی ہے۔ آئیے ہم انہیں یقین دلائیں کہ اگر وہ تشدد کا راستہ ترک کر دیں تو ہم ان کے ساتھ انسان دوستی کو محسوس کریں گے۔ اب کوئی شیر نہ مرنے پائے اب کسی کو پسینہ غریب و اقارب کے دائمی داغ مفارقت کو برداشت نہ کرنا پڑے۔"

کمیٹی نے میرے ۸ مئی ۱۹۹۰ء کے اس اسلے کو بھی ملحوظ خاطر نہیں رکھا جس میں میں نے انفرادے پر یا اسکی واضح الفاظ میں زور دیا تھا۔

"جہاں ایک ماہر جراح کی حیثیت سے دہشت گردی کے ناسور کو جڑ سے اکھاڑنا ہے وہاں ہیں اس بات کو نہیں بھولنا ہے کہ ہماری حقیقی جنگ غریب پسماندگی اقتصادی اور انتظامی نا انصافیوں کی طاقتوں کے خلاف ہے۔ براہ کرم یہ بات یاد رکھیں کہ ہم کسی پر سبقت نہیں لے رہے۔ ہماری تمام ریاست ہمارا ایک ہی کنبہ ہے۔ ہمارے چند بھائی جو گمراہ ہو چکے ہیں۔ انہیں اس کنبے میں واپس لانا ہوگا۔"

کمیٹی نے میرے ان ریڈیو اور ٹیلی ویژن نشریات کا ذکر بھی نہیں کیا جس میں میں نے کشمیری نوجوانوں کو نہایت

جذبائی انداز میں سمجھا یا تھا کہ ملک کی منزل درندگی میں نہیں بلکہ انسان دوستی میں ہے، شکستہ تمدنی دھارے میں نہیں بلکہ گونا گونی میں یک گونی میں ہے۔

جستہ زیادتیوں کے بارے میں شکائیتیں درج کرنے کے بارے میں بھی کمیٹی کو اپنی جہوریوں کو جسے متضاد آراء پیش کرنا پڑیں پولیس کو یہ ہدایات دی گئی تھیں کہ وہ سکورٹی فورسز کے خلاف تمام شکایات درج کریں اس پر بھی کہ یہ تمام شکایات جھوٹی، گھڑی گھڑائی اور سیاست پر مبنی دکھائی دیں۔ ۱۹ جنوری سے ۲۶ مئی ۱۹۹۰ تک جو بیس شکائیتیں درج کی گئیں جن کی فہرست جمعہ ہفت ۲۵ (۲۷) میں درج ہے، فوری میں بی ایس ایف کی فائرننگ کے واقعہ کی تحقیقات کے لئے میں نے ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ جسطرٹ غلام عباس کو مقرر کیا مگر کمیٹی نے ان غلوں میں حقائق کو پوشیدہ رکھا۔ اس کے برعکس اس نے عجیب موقف اختیار کیا۔ اگر کوئی کیس درج کیا گیا تھا تو یہ اعتراض گناہ کے مترادف تھا۔ اگر کوئی کیس درج نہیں کیا جاتا تو انتظار پر لاپرواہ بننے کا الزام لگایا جاتا تھا کہ شکایات تک درج توں لڑی شاید کمیٹی کا مہول تھا۔ ”جیسے جیسے ہم“ ہمارے بھی تم کمیٹی نے ایسے ”پولیس مقابلہ“ کی عدم موجودگی کا بھی کوئی قوض نہیں لیا جو پنجاب میں عام طور پر ہوتے آتے ہیں۔

اس کمیٹی نے ہمارے بہادر نیم فوجی دستوں کے ساتھ بھی بھاری نا انصافی کی ہے۔ اس نے اس امر کو غور نہیں کیا کہ ہمارے مغربی بنگال جیسے گرم علاقوں کے باشندے ہمارے جواؤں کو گھنٹوں تک سرد ہواؤں میں کھڑا رہنا پڑتا ہے اور انہیں پاکستان کی طرف سے تربیت یافتہ گوریلوں کے شرحت رفتار حملوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے جنہوں نے اپنے لئے ڈھال اور چھینے کی خاطر غیر جنگجو آبادی کا سہارا لے کر ضمیر کے تاسف کا اظہار بھی نہیں کیا۔ اس کمیٹی نے معصوم عوام کو موت کے خطرات میں دانستہ طور پر دھکیلنے کیلئے دہشت گردوں کی مذمت تک نہیں کی بلکہ اس کمیٹی نے ان نیم فوجی دستوں کے نقصان کا جہم پر بھی ہوئی بطخوں کی مانند موت یا ذاتی تحفظ کے لئے فائرننگ یا پھرموں کا مقابلہ کر کے ان کو پکڑنے میں سے ایک راستہ منتخب کرنا تھا۔ ہماری فورسز کے لئے اس سے زیادہ حوصلہ شکنی کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ انہیں دہشت گردوں کے گھنٹوں کے کل طور پر کھڑا ہونا پڑا۔ تیر من گھنٹہ روٹا دوں کا شکار ہونا پڑے کمیٹی ایک اسٹنٹ انجنیئر کے انتہائی رنگ میں رہنے اور انتہائی مبالغہ آمیز روٹا دوں کو قسمن لیتی ہے مگر بی ایس ایف کے ایک نوجوان ڈاکٹر کے رشتے داروں کی حیثیت کو سنے گا اس کے پاس وقت نہیں جو طغیان کی گولی باری میں زخمی افراد کا علاج کرنے جا رہا تھا۔

اندر موہن اور اس کے ناپاک ہاتھ

واقعات کو توڑ موڑ کر گورنر دھندہ تیار کرنے میں اندر موہن کے رول کا ذکر کرنے کی خاص طور پر ضرورت ہے۔ اس بات کو عیاں کرنے کے علاوہ کوئی یو سی ایل کے معاملات کس طرح چلائے جا رہے ہیں۔ اس بات کا بھی انکشاف کرنے کی ضرورت ہے کہ صرف گورنر جگموہن کو ہی خاص طور پر سیکورٹی فورسز

کی مبینہ زیادتیوں کے لئے بلا کسی شہادت کے فوراً الزام طہر یا جا رہا ہے۔

جلی قیصلے سے اس وقت باہر آگئی جب انڈین ایکسپریس نے اندر موہن اور جارج میتھیو کی طرف سے مشترکہ خط شائع کیا یہ خط بھی اخبار کے اسی شمارے میں شائع ہوا تھا۔ جس میں ایس۔ این درابو اور شاگرد اس کے مراسلات شائع ہوئے تھے اور ان میں اس کمیٹی کی غلط سیانیوں کا پردہ فاش کیا گیا تھا جو اس نے آرمی سکول بس کی واردات کے سلسلے میں کی تھیں۔ اس خط میں اور باتوں کے علاوہ لکھا تھا۔

”متحدہ شہریوں کے گروپ اور تنظیموں نے کشمیریوں کے جذبات اور کشمیر کی صورت حال کا اندازہ کرنے کے لئے کشمیر کا دورہ کیا ہے، ہم میں سے چند لوگوں کو ذاتی طور پر ایسی مصیبتیں اٹھانے کا موقع ملا ہے۔ درحقیقت عام انہم کے مطابق جگموہن کی شناخت ایک جبر و استبداد کی علامت کے طور پر کی گئی ہے جس پر مسلم مخالف ہونے کا سایہ ہے۔ ہمیں اس پر حیرت نہیں ہوئی۔ ہماری رائے میں کشمیر میں دوبارہ اعتماد پیدا کرنے کے لئے گورنر کو واپس بلایا جانا ایک لازمی پیکیج شدہ ہے کیونکہ کشمیر کی منزل ہندوستان کے ساتھ مشترکہ ہے۔“

ہر ذی شعور ذہن کو یہ بات واضح ہو جانی چاہیے کہ اندر موہن اور ایسے اشخاص کا حقیقی مقصد ہے واپس بلانے کے لئے جوڑ ٹوڑ کرنا ہے اس کا طریقہ کار یہ تھا کہ زور و شور سے پروپیگنڈہ کرنے کے لئے پی یو سی ایل کے تمام تر تمامہ کو بروئے کار لایا جائے اور اسی جھوٹے پروپیگنڈہ کی بنا پر میری واپسی کا مطالبہ کیا جائے۔

اندر موہن کے گندے ہاتھ ۱۶ مئی ۱۹۹۰ کے ہندوستان ٹائمز میں شائع ایک خط سے ظاہر ہو جاتے ہیں۔ یہ خط ہندوستان ٹائمز کے ۱۶ اپریل کے شمارے میں شائع ”پی یو سی ایل رپورٹ کی مذمت“ رپورٹ کے جواب میں تھا۔ اس خبر میں مذکورہ رپورٹ میں دی گئی آزاد پرائیوٹنگی اٹھائی گئی تھی اور گورنر کی طرف سے حوصلہ افزا نتائج کے بارے میں کہا گیا تھا۔ اندر موہن نے دعویٰ کیا تھا۔ یہ رپورٹ ٹیم بمبران کی طرف سے حاصل کردہ تناظر میں اور براہ راست معلومات پر مبنی ہے۔ اسی خط میں اندر موہن نے لکھا۔

”جگموہن وزیر داخلہ کی بیٹی کے عوض پانچ کھروادوں کو ہمارے اُسے خوش کرنے کیلئے جلاوا کیوں تھا؟“ عملی طور پر اندر موہن اس بات سے بخوبی واقف تھا کہ میں روبینہ سید کے اغوا (۸ دسمبر ۱۹۸۹) اور رہائی (۱۳ دسمبر) کے وقت ریاست کا گورنر نہیں تھا۔ ۱۹ جنوری ۱۹۹۰ کو ریاست میں مجھے دوبارہ بھیجے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کشمیر اینڈ منسٹریشن پورے طور پر ختم ہو چکی تھی اور اس پر لگ بھگ دہشت گردوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ مگر خوبیاں کے فن میں مہارت ہونے کی وجہ سے اندر موہن نے مجھ لیا کہ اگر اس قسم کا الزام لگایا جائے تو ملک کی آبادی کے بیشتر حصے کو مٹی کے وسط میں اس معاملے کی صورت حال کے بارے میں یاد میں نہیں ہوگا۔ قدرتی طور پر اس کے کھیل کا شعوبہ یہ تھا کہ ”تازہ ترین معلومات“ کا نمک سرخ لگا کر عوام کو قابل قبول رنگ میں پیش کیا جائے اور عوام کا بیشتر حصہ اس پر یقین کرے۔

ایک مرتبہ ٹراشکی نے کہا تھا کہ جدید ایسے کی روح سیدار ذہن اور اس کے متضاد ماحول کے درمیان

تنازعے میں مضمر ہے۔ جتنا زیادہ کوئی شخص تغیر شدہ ہوگا وہ اتنا ہی تخلیقی کام کرے گا۔ اور اپنے ہموطنوں کی طرف سے اس کے ساتھ اتنا ہی جراثیم سلوک ہوگا۔ بد نظمی سے آزادی کے بعد سے ہندوستان میں بچا بچا رہ رہا ہے کہ جس کسی نے اور عوامی کے باور بال کو خالی باتیں بنانے کی بجائے ٹھوس اقدامات اور کام کر کے درست کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس کو مخالفت کا سامنا کرنا پڑا ہے

دہلی ڈیو پلیمینٹ اتھارٹی میں طویل عرصے تک رہنے کی وجہ سے مجھے اس قسم کے تجربات کا سامنا ہوا جب میں نے اچھے ہوئے معاملات کو سلجھانے کی کوشش کی اور دار الحکومت کی منصوبہ بندی ترقی کو یقینی بنانے کے لئے کام کیا تو مفادات خصوصی رکھنے والے عناصر کے ساتھ میرا جھگڑا ہو گیا اس بارے میں میرے تجربات کا ایک حصہ میری کتاب "سویبلڈنگ شاہجہاں آباد" لکھی آف دہلی آئی لینڈ آف ٹروڈھ: اوڈی ویلج آف اور سٹیز میں بیان کیا گیا ہے۔

جامع مسجد - لال قلعہ کمپلکس - جس کو سنوارنے اور بہتر بنانے میں مجھے بھاری دہلی تھی۔ اس وقت اندروین کے ساتھ میرا جھگڑا ہو گیا۔ باور کیا جاتا تھا کہ وہ اس علاقے میں سماجی خدمات سرانجام دے رہا تھا۔ مارچ ۱۹۷۷ء ہنگامی صورت حال کے واپس لے جانے کے بعد اندروین نے میرے بارے میں غلط فہمیں پھیلایں یہ کام اس نے حقیقت جاننے کے باوجود دہریا کیا تھا اور ایمر جنسی کے بعد چونکہ میں لکھی گئیں ان میں ان من گھڑت قیول کو جگہ مل گئی یہ وہ قفسے کہانیاں تھیں جنہیں صحافی مصنفین نے نہایت جلد بازی میں جو بھی مواد حاصل ہوا استعمال کر کے شائع کیا تھا تاکہ وہ اسے پہلے شائع کر کے دوسروں پر سبق حاصل کر سکیں۔ چنانچہ اندروین جیسے افراد کو ایسے صحافیوں کو من گھڑت خبریں فراہم کرنے کا اچھا خاصہ موقع حاصل ہو گیا۔ اس کے نتیجے کے طور پر شہر میں صحافی کے پروگرام میں بہت ساری غلطیاں سرزد ہو گئیں۔

جہاں تک جون ۱۹۷۵ء میں ہنگامی صورت حال کے نفاذ اور مارچ ۱۹۷۷ء تک اس پر عمل کرنے کا سوال ہے میرا اس کے ساتھ تعلق طویل کوئی واسطہ نہیں تھا کیونکہ اس وقت دہلی ڈیو پلیمینٹ اتھارٹی کا وائس چیرمین تھا مگر ایمر جنسی کے بعد کے عرصے میں انام گیری کے جذبے کا لہر میں مجھے بھی بے بسا دیا گیا اور میرے بھی اس جذبے میں مضمر متبعاً طور پر لایا گیا کیونکہ میں نے اپنے حقیقت کے جزیرے ISLAND OF TRUTH سے باہر آنے سے انکار کر دیا تھا اور زمینہ الزامات مسز اندرا گاندھی اور سنجے گاندھی پر عائد کرنے سے انکار کر دیا۔ جو بھی کمپن میں نے ایمر جنسی کے دوران رو بہ عمل لائیں وہ دہلی ماسٹر پلان اور اس کے تحت ثانوی منصوبات کا ایک حصہ تھیں انہیں مرکزی کابینہ پارلیمنٹ اور دوسرے مجاز اداروں نے ایمر جنسی نافذ ہونے سے بہت پہلے منظور کر دیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس عرصے کے دوران منصوبہ بندی ترقی کے کام میں کافی شریعت آئی مگر یہ بات عام طور

اس لئے تھی کہ مفادات خصوصی رکھنے والے افراد پس پشت ڈال دیئے گئے تھے جو پہلے ہی ان کی طرز پر رفتار اندازی کیا کرتے تھے۔ اپنی کتاب آئی لینڈ آف ٹروڈھ ۱۹۷۸ء کے اوائل میں شائع ہوئی، میں نے ایمر جنسی کے بعد لکھی گئی کتاب میں ان باتوں میں پائی جانے والی نادرستیوں کی طرف اشارہ کیا اور اس پر آگندہ ماحول میں اپنے جیسے شخص کے کردار کا ذکر کیا جنہیں سائنس حاصل ہونے کی بجائے مذمت کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ اس کتاب میں حقیقت اس قدر ناقابل تردید تھی کہ میں نے تمام کتاب ایک حلف نامے کے طور پر پیش کیا۔ اس وقت کی عدالت میں پیش کی جہاں مسز اندرا گاندھی ہر شخص کے مشاہدات کی بنا پر مقدمہ چلا جا رہا تھا۔ اس وقت کی حکومت یا کسی اور میں اتنی جرأت پیدا نہیں ہوئی کہ وہ جوابی حلف نامہ داخل کرے اس کتاب میں درج حقائق کو چیلنج کر سکتے۔

اس کتاب کے باب ششم جھوٹ، غم حقیقت اور کمزور حقیر اور باب ہفتم "ترکمان گیٹ کی ان کہی داستان" میں نے حقیقت کو بیان کیا تھا اور اندروین کے رول کا ذکر کیا تھا جو "سٹیل" نے اس باب کے اقتباسات ۳۰ جولائی اور ۱ اگست ۱۹۷۸ء کے شماروں میں شائع کئے تھے۔ اندروین کو چوٹ پہنچی اور اس سے اسے غصہ آگیا۔ میرے جذبات کو سمجھنے کی بجائے اس نے جارحانہ اور صحتی آمیز طریقے استعمال کرنا شروع کر دیئے۔ وہ مجھے گالیاں تک دینے لگا اور اس نے ۲۰ اگست ۱۹۷۸ء کے شمارے میں شائع جواب میں مجھے "دروغ گو" تک قرار دیا۔ اس نے اپنی پوزیشن کی تصدیق میں دہلی پائی کورٹ میں ۲۳ جولائی ۱۹۷۹ء کو ازالہ عیثیت عوامی کامیڈہ دائر کر دیا۔ ان گزارشات کے علاوہ کہ اندروین کے الزامات جھوٹے تھے میں نے پندرہ نکات ایسے پیش کئے جن میں بتایا گیا تھا کہ میرے ساتھ کتنے زیادتی ہوئی ہے۔

اگر اندروین کے نام نہاد حقائق میں کوئی صداقت ہوتی تو اس نے سیدھے طور پر کیس لٹا ہوتا۔ اس کی بجائے اس نے معاملے کو اتنا مینڈلے جانے کے تمام تر حربے استعمال کئے ۲۳ جولائی ۱۹۷۹ء کو دائر کیا گیا کیس ۲۰ اگست ۱۹۷۸ء کے شمارے کے خلاف تھا اور وضع طور پر مقرر معیار کے اندر تھا۔ مگر اندروین نے "مین سٹریم" کی تاریخ کو درمیان میں گھسیٹ لیا۔ فاضل جج نے بھی طور پر التوائی قریلوں کو ستر دکر دیا اور حکم دیا کہ روائی جاری رہے مگر چند واقعات جن کی ہمت کو میں کو نہیں سکا کیس اس عدالت میں لے جایا گیا جس کی صدارت جسٹس راجندر سنگھ رہا تھا جس نے حکم امتناعی جاری کر دیا۔ دائر کئے جانے کے بارے میں بعد میں یہ معاملہ ابتدائی مرحلے پر ہی عرض التوا میں ہے۔ میں نے تفصیلات نہ صرف قانونی نفاذ میں خامیوں کی نشاندہی کی بلکہ عدالتی جانچ پڑتال (JUDICIAL AUDIT) کا

۔ بعد از دہلی پائی کورٹ نے شاہ کیشن کے مشاہدات کو عدم قرار دے دیا۔

۔ کیس نمبر ۸۲۸ سال ۱۹۷۹ء

۔ فوروی ۱۹۸۰ء سے ۱۹۹۰ء تک منقطع نام گورنر کونفرنس میں شمولیت کا مجھے موقع حاصل ہوا ہے ان کونفرنس میں میں نے

اداریہ اصلاحات، عدالتی اصلاحات کے نفاذ کی ضرورت پر زور دیا۔ چونکہ آزادی کے بعد بھارت میں شاید اور کوئی مسلم انتہا پر نہیں ہوا

کی اشد ضرورت پیر بھی زور دیا ہے۔ بلکہ اندرموسن کے رویے کے بارے میں بنیادی سوال بھی اٹھایا ہے۔ وہ اپنے اور میرے وعدوں یا ان امور کی حقیقت تک جانے سے آخر کیوں ڈرتا ہے؟ اگر وہ مجھ سے کہیں اس کے مثال مثول کرنے کے حربوں سے تنگ ہا رہ کر بیٹھ جاؤں گا تو وہ غلطی پر ہے۔ کیونکہ میں نے کسی مسئلے کو ذاتی سطح پر نہیں لیا ہے۔ میں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کس قدر بھی محدود طریقہ کیوں ہو، ملک میں ملے عام کو کس طرح گمراہ کیا جاتا ہے اور کس طرح اس شخص کو ڈرایا جاتا ہے اور ہر سال کیا جا رہا ہے جو کوئی ٹھوس کام کرنا چاہتا ہے۔

کیا اندر موبہن جیسا شمع چراغ راست اور بالواسطہ طوع پر میرے تئیں ہماریت رکھتا ہوا ہے پنی یوسی
ایل کے مادی اور مالی ذرائع کو میرے خلاف کام میں لا کر پھوپھہ کندہ کی اجازت دی جا سکتی ہے تاکہ وہ اس عمل افادیت کو
کم کر دے جس کے تحت کثیر کوہ پشت گردوں کے درندہ پنجوں سے لکا لاجا رہا ہے ؟ میں اس سوال کو عام لوگوں
کے لئے چھوڑتا ہوں۔ پہلے ہی چند باشعور لوگ جن میں ایم وی داما مورتی نائب صدر پنی یوسی ایل آندھرا پردیش
بھی شامل ہیں اس برائوس کا اظہار کیا ہے جو کمیٹی فار اینٹیشو آئی کشمیر نے کیا ہے۔ ۵ مئی کے انڈین ایکسپریس
میں شائع اپنے خط میں رامامورتی نے یوں لکھا:

میں نے آپ کے اخبار میں شائع ہونے والی رپورٹ کو پڑھا اور مجھے رنج ہوا کہ اس رپورٹ میں پی یو سی ایل کی تسلیم شدہ پالیسیوں سے انحراف کیا گیا ہے۔

دہشت گردوں میں مسکریوں نے اپنے اعمال کے ذریعے عوام کی شہری آزادیوں کو سلب کیا ہے رپورٹ میں یہ نکتہ نمایاں نہیں کیا گیا ہے۔ پنی یوسی ایل کا یہ کام نہیں کہ وہ عسکریوں کے لئے امداد کی تشہیر کریں یا یہ کہیں کہ کشمیر پاکستان میں شمولیت نہیں بلکہ آزادی چاہتا ہے۔ پنی یوسی ایل کا یہ کام نہیں کہ عوام کے ذہن کا اندازہ کرے جبکہ رائے عامہ جاننے کا طریقہ صحیح کو معلوم ہے۔ سمجھنے کے واسطے میں تجویز پیش کرنا یا یوسی ایل کے دائرہ عمل سے تجاوز ہے۔ تعجب ہے کہ اس ٹیم کے ذہن میں کون سا شخص تھا۔ وہ عسکریوں کا ایک طبقہ تھا جو سامنے آیا یا رائے عامہ پر اثر رکھنے والے لیڈروں نے عسکریوں کی طرف سے تشدد کی تردید کے لئے چھوٹی جگہ لکھی تھی۔ پنی یوسی ایل کی ٹیم نے اس سے بھی سبق نہ حاصل کر کے ایک غلطی کی ہے کہ جرنل ہندوؤں نے دھسلی کے کیمپوں میں بھی آکر آسرا لیا ہے۔ ختم کو یہ رائے بھی نہیں دینی چاہیے تھی کہ یہ کیمپ لازمی نہیں ہیں۔

مختصر یہ کہ یہ رپورٹ بالکل جانبدارانہ ہے اور اس کے ثبوت میں حقائق پیش نہیں کئے گئے۔

نیم شکستہ آئینوں کے احاطے

چنانچہ یہ اس منہ آئینوں کی حدود میں تو کیٹھی غار نشین و ان کثیر نے قریب مہر لار و ابی تعصبات ذلی رخش
ادغرور کی اساس پر تعمیر کئے گئے۔ انعام کا پہلا بنا گری نے بھی استعدنا انصافی میں ٹی ہوگی کسی نے بھی اسنو غور
کا آسرا لے کر بنیادی انسانی حقوق کو استعد بلال میں کہ جو دہشت گردوں کے دھول کے تال پر کوئی بھی شخص استعد

خوشیت کے ساتھ قعہاں نہیں ہوا ہوگا کسی نے بھی گنہگاروں اور قاتلوں کو اس جوش کے ساتھ گلے نہیں لگایا ہوگا کسی نے دہشت گردی کے ان ٹولن کے پیاسے پنوں کو نظر انداز نہیں کیا ہوگا جس نے غجواؤں پر میموں اور مکرواؤں جیسے افراڈ کی جانیں تلف کیں کسی نے بھی صریحاً متعلق کو چھپانے کی اس قدر زیادہ کوشش نہیں کی ہوگی، حقائق اور اعداد و شمار سے حتم پوشی نہیں کی ہوگی کہ گورنری راج سے قبل قتلہ کے ۲۰۰۰ واقعات ہوئے اور ۵۰ ہمدھماکے ہوئے۔

اگر یہ جہنم پاکستان کے ساتھ الحاق نہیں بلکہ آزادی کے لئے سعی تو اس کمیٹی نے تمام جرائم کو نظر انداز کر دیا۔ اگر کشمیر، چنڈی گڑھ کے ہمراہ چند مسلم "خیر" اور غدار بھی مارے گئے تو تمام سرگرمیاں غیر فرقہ پرست ہو گئیں حالانکہ خیروں اور غداروں پر فتویٰ صادر کرنے کا کام بھی خود قاتلوں نے ہی کیا کمیٹی نے وہ پروپیگنڈہ اور لٹریچر بھی ادیش نہیں دیکھا جو خون اور خنجر کی اصطلاحات میں شراہور تھا اور جس کی نعرہ بھی کہ ایک ہاتھ میں قرآن شریف اور دوسرے میں تلوار اس کی نذر ہے نہ جھنڈا مارا شہید گئے جوڑ اور ملی بھگت کا کوئی معاملہ بھی اس کمیٹی کے روبرو نہیں آیا جس میں سر ہنگر جیل کو توڑنے کا مشہور کیس شامل ہے جس کے تحت سازشوں کی کڑی قائم کر کے بارہ سخت جہان دہشت گرد دفنار ہو گئے۔ اس میں قریباً ہر ایک متعلقہ المذاکر ملوث تھا۔

کمیٹی نے جان بوجھ کر ان تحریری ہدایات کو بھی آنکھ سے اوجھل کر دیا جو پاکستان میں رو بہ عمل دہشت گرد لیڈروں نے دی تھیں جن میں کہا گیا تھا "اپنے گھروں اور علاقوں کے اندر دہلایا رہنا پروپیگنڈہ جاری رکھو سکورٹی فورسز کے خلاف اپنے پروپیگنڈہ کو پورے شد و مد سے جاری رکھو اور ان کے خلاف جھوٹے اور بلاروک ٹوک الزامات لگاتے جاؤ" کمیٹی نے وہ طرز عمل اختیار کیا جس کا اگر کچھ دھندہ دوسری جنگ عظیم کے دوران گوبلز نے بنا تھا اس میں تعجب نہیں کہ ایک لمحہ کے لئے انہیں کامیابی بھی حاصل ہوگئی اور غصے ریاست چھوڑ کر آٹا پڑا مگر تاریخ اس قسم کے چال بازیوں کی جھولی میں زیادہ دیر تک نہیں رکھتی۔ حقیقت یہ صلیبی دروغ گوئی کا پروردہ چاک کر دیتی ہے اور گھبراہٹ یا تو تاریخ کے اندھیروں میں کھو کر رہ جاتے ہیں یا ایسے ہی ناکستہ آئینوں کے گروں کے بلے میں دب کر رہ جاتے ہیں۔

+ باب نہم بھی ملاحظہ ہو۔

++ اس پر ویگنڈہ اور ادب کی تفصیلات باب دہم : دہشت گردی اور تحریک کی نوعیت اور طرز عمل میں دی گئی ہیں۔

+++ جے اینڈ کے لبریشن فریٹ کے راجہ محمد مظفر خان کی طرف سے شائع شدہ ایک کتابچے میں یہ ہدایات درج تھیں

بالادستی حاصل کرنا

جو ہمت کو تھامے، کامران ہوتا ہے
آؤ ہم بھی ہمت کریں، ہم کامران ہوں گے +

انتشار اور تضادات کے گرداب کے قطع نظر جو غلط بیانی کی شاک جھیل کر میری راہ میں پیدا کئے گئے تھے میں تیرنا چلا گیا، تمام فراشوں اور زخموں کو نہایت صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کرتا رہا۔ مجھے شاید ہی کوئی ساحل دکھائی دے رہا تھا اور پھر بے ہوشے سانس کو سمول پر لانے کے لئے ٹوکنے کا بھی میرے پاس وقت نہیں تھا۔ طوفان کے چند خطرناک مرحلوں کو میں عبور کر چکا تھا۔ مگر بہت ساری سیاحی جماعتوں کی نفسیات میں جو اصلاحی خلا، موجود تھا وہ طوفان کے نئے مرکز میں پیدا کر رہا تھا۔ اس نظام کا کھوکھلا پن اس کا خلا ایسے حالات پیدا کر رہا تھا۔ جس سے نئے طوفانوں کا پیدا ہونا یقینی تھا اور جس دقیق ماحول میں کام کر رہا تھا اس میں اس طوفانی فوسمٹ آہستہ آہستہ بہاؤ میں لے پنا کام جاری رکھنے اور مارتی کے ان الفاظ میں اپنا اعتماد ظاہر کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ راست گوشوں ان راستوں کی تلاش نہیں کرتا جہاں غصہ فائدہ ہو مگر وہ راستہ تلاش کرتا ہے جہاں غصہ ہوتا ہے۔

پختہ پیغام

آئیے میں آپ کو بیان کروں کہ یہ بالادستی کیسے قائم کی گئی؟ پہلا یہ نصب العین تھا کہ تحریک کا دل سے پہلے کا موقع چھین لیا جائے۔ عوام کو یہ بات ذہن نشین کرانا ضروری تھی کہ خواہ کوئی بھی قیمت ادا کیوں نہ کر، بڑے کشمیر کو تحریک کا دل، دہشت گردوں اور مہینا پرستوں کے رحم و کرم پر نہیں رہے دیا جائے گا۔ ہمارا عہد اور ہماری قوت ارادی کو واضح کیا جانا بھی ضروری تھا۔

اگر کسی سرکاری ملازم نے ہتھیاروں کی تربیت حاصل کرنے کے لئے سرحد عبور کی اور پھر دہشت گردی کا روٹیوں کو جاری رکھا تو اسے سرسری طور پر کارروائی کے بعد برطانی کا منہ دیکھنا ہرگز نہیں ہوگا۔ اس کو دیکھنے سے روکنے کے لئے اگر بجلی بند کر دی جاتی ہے تو اس کی جوابدہی چیف منیجر کو دینا ہوگی۔ اگر اخبارات مجرمانہ اطلاعات دینے اور دہشت گرد تنظیموں کی ڈرانے والی کاروائیوں کے آلہ کار بننے میں توانکوں کے ذریعہ کی آزادی کی اخبارات کو دینا نہیں لینے کی جگہ جی۔ مختصر یہ کہ تمام متعلقین کو یہ بات غیر مبہم الفاظ میں باور کرائی جانی تھی کہ خطاؤں کو مزید نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔ اور حکومت کے ساتھ کوئی شرارت کر کے کسی کو اس سے بیوقوف نہیں بنانے دیا جائے گا۔

ایجادات

مگر حکومت چاہے کتنی ہی قوت ارادی کیوں نہ رکھتی ہو، وہ نئے دہشت گرد نہیں کر سکتی۔ اس کے ساتھ اشتقاق کی تخلیقی صلاحیت اختراعی اور تصوراتی انداز فکر ہونا لازمی ہے۔

یہ صورت حال اس سے بالکل مختلف تھی جس کا ایڈمنسٹریٹو کو سامنا کرنا پڑتا ہے وہاں تحریک کا قلعہ بننا پرستی تھی، ٹوپیک اور پاکستانی یوم سالیٹ جی خارجی مجبوریاں تھیں، دھڑے بندی سازشیں کنڈی تھیں جہاں ذہن بند تھا اور گھرے گھرے جوابات اسے آگے بڑھنے کی اہلیت نہیں تھی سب سے زیادہ ماضی کے گناہ تھے۔ دوسرے کے گناہ تھے جن کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا کر چلنا تھا۔ اپنے جیلے میں گئے مٹرے سیب لئے مجھے چلنا تھا۔ خواہ ان میں کس قدر بدلتی ہو مگر انہیں پھینکنا تو نہیں جاسکتا تھا۔

مجھے تمام تر ملہ اٹھا کر اس میں نیا مواد شامل کرنا تھا تاکہ اس کی تعمیر نو ہو سکے مجھے زیادہ اعتماد پیدا کرنا تھا ان میں حرکت پیدا کرنا تھا، مجھے ٹوٹے ہوئے دھاگوں کو جوڑ کر نئے طرز کا نیا تانا یا نیا بننا تھا مجھے ان پڑانے دھاگوں کو بھی ڈھونڈنا تھا جن میں اب بھی جان بقی تھی اور اتنی سکت موجود تھی کہ انہیں دوسرے دھاگوں کے ساتھ جواہر بنائے اپنے دو مشیروں کے علاوہ میں نے مقامی سول سروس فوج، ایس ایف اور سی آر پی سے مناسب عناصر منتخب کر لئے اور ان کا ایک مضبوط گروپ بنالیا۔ فوج کی طرف سے کورمانڈر ایم اے زکی تھا۔ اور نئی عمارت کا وہ ایک مضبوط ستون تھا۔ اس نے مثالی صبر و تحمل اور گرجوٹی کے ساتھ کام کیا۔ اس مضبوط اور پرجوش شخص نے اپنا کام سرعت رفتار اور نہایت باریک بینی سے کیا۔

تن دہی اور مضبوط قوت ارادی سے کام کرنے والے دوسرے افراد کی طرح جنرل زکی کو بھی غلط انداز لغو پروپیگنڈہ کا شکار بننا یا گیارہاں تک اس پر زور پرست ہونے کا الزام بھی لگا یا گیا اس الزام میں ایک واقعہ یہ بیان کیا گیا کہ کرفیو کے دوران مسلم باشندوں میں وہ راشن کے بیٹک تقسیم کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ چند حلقوں نے اس الزام پر یقین بھی کر لیا۔ یہی مرحلہ تھا جب فکد دفاع کے سیکریٹری اور کابینہ سیکریٹری میرے ساتھ ملنے آئے تو

انہوں نے سرسری طور پر میرے ساتھ اس بارے میں ذکر کیا میں نے انہیں بتایا کہ یہ کام میری ہدایات کے مطابق کیا گیا ہے جنرل نے جو پیکٹ تقسیم کئے ہیں ان کی ادائیگی میں نے فوج کو کر دی ہے۔ مقصد یہ تھا کہ دودھ اور زندگی کی دوسری ضروریات کے ذریعہ فوجی مشورے کی جگہ جس کی تلافی میری طرف سے فراہم کردہ رقم سے کی جاسکتی ہے۔ چونکہ شہری انتظامیہ اس وقت کام نہیں کر رہا تھا اور عملی مرحلے میں حملے کے طور پر فوجوں سے راشن کا انتظام ممکن نہیں تھا۔ اس سے قبل سرنگرم میں ضرورت مند افراد کو راشن کے ضروریہ کی تقسیم کا کام ریلیف کمیٹیوں کی اسٹریٹ میں تخریب کاروں نے سنبھال لیا تھا۔

اپنا کام سرانجام دینے کے معاملے میں انہوں کو درپیش تمام تر مشکلات کو میں نے سرعت کے ساتھ دور کر دیا۔ میں ذاتی طور پر مسائل کی طرف توجہ دیتا اور تمام تر شینز کی کو میں نے سرعت رفتار دی۔ بخش دی میں نے اپنی اقلیت میں تبدیلی لائی۔ مزاج میں تبدیلی لائی اور کام کرنے کے غیر پیداواری راستوں کو میں نے بند کر دیا کاغذی کارروائی کو پس پشت ڈال دیا۔ اور فیلڈ ایجنسیوں کو مضبوط بنایا۔ میں نے مختلف گروپوں کے ذمے کام تفویض کئے اور ان تمام گروپوں کے کام کاج میں ذاتی طور پر تعاون کیا۔ مسائل کے براہ راست حل کئے میں نے اپنے اختیارات کا استعمال کیا عبادت میں اور احکامات میں خود ہی لکھوایا کرتا تھا۔ اس سے دھرم انہوں کا توصلہ بڑھا بلکہ تمام تر سرگرمیوں پر ہماری توجہ تیز تر ہوئی اور معاملات سے بارے میں جو تنگ نظر اور دھڑلہ باز رویہ اپنایا جاتا تھا اس کو روک دیا گیا۔

میں نے فوج بی ایس ایف، سی آر پی اور آئی بی کی مکمل وفاداری حاصل کر لیا ان میں سول اور فوجی انہوں کا ایک اندرونی گروپ بھی شامل تھا۔ یہاں تک کہ نصف شب کو کئے گئے شبلی فون کا بھی فوری جواب ملتا۔ ۲۱ مئی ۱۹۹۰ء کے ٹریبون میں شائع ایک رپورٹ میں لکھا گیا :- جس طریقے سے ماتولیات کے ایک ماہر جگموہن نے ایک سپاہی کی صورت اختیار کر لی ہے اس سے ایک شہر سیکورٹی ماہر نے حیرت کا اظہار کیا۔ اس نے فوج اور نیم فوجی دستوں کی مکمل وفاداری حاصل کر لی ہے۔

نئے انداز سے کئے گئے چند مسلسل فیصلوں نے انڈسٹریشن کو خاص طور پر پٹی سطح پر ایک نئی سمت دلا دیا ہے۔

سپیشل کمشنریاں

تین خاص کمشنریوں کا قیام کیا گیا۔ ایک بارہمولہ اور کپواڑہ اضلاع کے لئے دوسری اننت ناگ اور پلوامہ اضلاع کے لئے اور تیسری راجوری پونچھ اور ڈوڈہ اضلاع کے لئے اس اقدام سے بیرون میں واقع علاقوں میں حکومت کا سکہ قائم کرنے میں مدد حاصل ہوئی۔ اس سے ایک ایسی نگہداشت ایجنسی قائم ہو گئی جس کے تحت فیلڈ ایجنسیاں مناسب طور پر کام کرنے لگیں اور اب وہ تخریب کاروں کے حکم کے تابع نہیں رہیں۔ اس سے سول سپلائر کمیشنر مسلسل سہجہ بحال ہو گیا۔

پانچ کلومیٹر پٹی

میرے پہنچنے پر فہرست کار میں سب سے اہم کام پاکستانی مقبوضہ کشمیر کی طرف سے سرحد پار کرنے کے سلسلے کو روکنا تھا۔ ہماری تعداد میں تربیت یافتہ فوجیوں کی موجودگی اور ہماری تعداد میں ذخیروں کے انجم دے میں اس بات کا قائل ہو گیا کہ پوری جیسے سرحد عبور کرنے کا کام ہماری پیما نے پر جاری تھا۔

مجھے معلوم ہوا کہ سرحد پر اس قدر مؤثر صورت حال کے لئے درحقیقت شہری اور سیاسی حکام کی طرف سے بہت کم امداد حاصل ہو رہی ہے۔ میرے آنے پر ایک سینئر فوجی افسر نے بتایا :- زبانی طور پر سب جمع خرچ کیا جاتا ہے مگر عملی طور پر یہیں کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔ وزارت داخلہ اور مقامی طور پر بی ایس ایف کی طرف سے بار بار درخواست کرنے پر بھی تلاشیوں کے اختیار است بی ایس ایف کو نہیں دیے گئے۔ اگرچہ کوئی دراندازہ کسی کھول میں رد و پیش ہوتا تو عملی طور پر بی ایس ایف اہلکاروں کو کارروائی کا کوئی اختیار نہیں ہوتا جب تک وہ مقامی پولیس تک رسائی حاصل کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ بہت ساری صورتوں میں سادش بھی معلوم رہی تھی۔ یہاں تک کہ رات کے دوران بھی اس علاقے میں ہماری تعداد میں افراد کی نقل و حرکت ہوتی اور یہ اندازہ ہوتا کہ کھیتوں کی نگہداشت ہو رہی ہے۔

کسی پابندی کی عدم موجودگی میں سرحد کی خلاف ورزی بلا روک ٹوک ہو سکتی تھی۔ سرحد کے ساتھ ایک یاد دہانہ پٹی میں رات کا کرنیو نافذ کرنے کے تصور کی اہل سیاست مخالفت کرتے جب کہ کسی اس امر کا کوئی نکتہ اٹھا یا گیا تو آئین کی دفعہ ۲۴۹ اور دفعہ ۳۰ کے نظریاتی معاملے اٹھائے جاتے اس امر کی بھی وضاحت نہیں کی گئی کہ ایک حفاظتی پٹی قائم کرنے کی منطق کس طرح ریاست کے خاص درجے کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی فوج اور بی ایس ایف کی مشکلات کو میں نے دور کر دیا۔ میں نے مرکزی حکومت کو ریاستی حکومت کی طرف سے رضامندی رواد کر دی تاکہ بی ایس ایف کو گرفتار کرنے کے اختیارات دیئے جاسکیں۔ اس ایکٹ کے ناجائز استعمال کا کوئی خدشہ ہی نہیں تھا کیونکہ ریاست میں بی ایس ایف اور دیگر نیم فوجی دستے ڈائریکٹر جنرل آف پولیس اور گورنر کے احکامات کے تابع رہ کر کام کرتے ہیں میں نے صنعت حکام کو بھی یہ ہدایات جاری کر دیں کہ وہ سرحد کے ساتھ لگنے والی پانچ کلومیٹر پٹی میں مزبور افتتاح سے طوع و انتخاب کا کرنیو نافذ کریں۔

ان اقدامات کا عملی کی سرعت سا اثر ہوا سرحد پر کام ہونے لگا اور اس پٹی میں دراندازوں کو گرفتار کرنا شروع کیا گیا اور ہتھیار برآمد ہونے لگے۔ مثال کے طور پر ۲۱ مئی ۱۹۹۰ء کو ہتھیاروں اور اسلحے کی ہماری مقدار کو راستے میں روک لیا گیا ان میں آٹھ لے کے، ۳۰ رائفٹس ایک کثیر المذا صد شین گن ایک راکٹ لانچر چار راکٹ شین اس دستی بم گیارہ پستولیں اور آتش گیر مادے کے پچاس پیکٹ شامل تھے۔ اس کے ساتھ ایک بار سوخ سیاسی شخصیت کے ساتھ

والبتہ چار ٹھیکیداری گرفتار کئے گئے۔ باور کیا جاتا تھا کہ وہ ایسے گروہ کے حصے تھے جو پاکستانی مقبوضہ کشمیر سے ہتھیار لاکر انہیں سرحد کے ساتھ پرانے اور میانان مقامات پر چھپا دیتے تھے اور پھر مناسب وقت پر ان ٹھیکیداروں کے رشکوں میں دیگر سامان کے سٹکے چھپا کر دیگر مقامات پر لے جاتے تھے۔

راہ روکنے کے اس عمل نے بتا دیا کہ جہاں چاہ وہاں راہ مگر پہلے کیونکہ یہاں کا قیودین تھا اور اس کے کسی معلوم نہ ہوا۔ تین ماہ کے قحطی مدت میں ۶۴ دراندازوں کو سرحد عبور کرتے ہوئے گولی مار دی گئی جبکہ ۲۶ افراد کو گرفتار کیا گیا۔ برآمد ہونے ہتھیاروں میں ۱۵۵ لے گئے، ۴۴ رائفلیں، ۴۹ اسٹول، ۴۴ (ڈکیم) اسلحہ، ۲۳۰۰ ہزار راونڈ اور ۴۴ کلو گرام آتش گیر مادہ شامل تھا۔ ذرا سوچئے تو اگر یہ تمام درانداز اور ہتھیار سپورٹ جاتے تو ولادی میں کسی قسم کی خوفناک تباہی ہی نہ جاتی۔

اسٹیٹ سیکورٹی بورڈ

شہری اور فوجی حکام کے درمیان مشترکہ سرعت رفتار رابطہ قائم کرنے اور دہشت گردوں کے خلاف مشینری کے دائرہ کار کرنے کے لئے اس سیکورٹی بورڈ کو بحال کیا گیا جو میں نے ۱۹۸۶ء میں پہلی مرتبہ گورنری راج کے دوران قائم کیا تھا۔ اس وقت یہ بورڈ نہایت کارآمد ثابت ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ موجودہ حالات میں یہ بورڈ اور بھی فائدہ مند ثابت ہوگا۔ اس سے نہ صرف روزمرہ کے تعاون اور رابطے میں مدد حاصل ہوگی بلکہ سرحدی اور گڑبڑ زدہ علاقوں میں کام کر رہی مختلف ایجنسیوں پر یہ بورڈ زیادہ فوجہ دے سکے گا۔

اس بورڈ کا چیئر مین میں خود تھا۔ دیگر اراکین میں شمالی کمان کے فوجی کمانڈر لفٹنٹ جنرل گویند سنگھ کو کمانڈر لفٹنٹ جنرل ایم اے ڈی کو کمانڈر انچیف اور کمانڈر انچیف ہرنوت سنگھ گورنر کے دو مشیر ڈائریکٹر جنرل بی ایس ایف ڈائریکٹر جنرل سی آر پی ایف ڈائریکٹر جنرل آئی ڈی ڈائریکٹر جنرل آف پولیس جنرل ڈاکٹر اور دیگر سینئر سول اور فوجی افسر شامل تھے جیسا کہ مجھے توقع تھی اس بورڈ کا کردار نہایت سودمند رہا۔ اعلیٰ ترین سطح پر اطلاعات کا تبادلہ ہوتا گیا۔ ایڈز اور شکوک افراد کی فہرستیں تیار کی جاتیں اور انہیں تازہ ترین پوزیشن پر لایا جاتا۔ نیز ترنتائج حاصل کرنے کے مقصد سے مربوط کارروائی کی جاتی اور ایک دوسرے کی کاوشوں پر پورے انداز میں اور ذمہ داری کے فقدان کی بجائے کام تیزی سے ہوتا۔

خاص پیل قومی کے سکاڈ

دہشت گردوں کو سب سے زیادہ فائدہ اس امر سے پہنچتا تھا کہ ان کی کارروائی تیز تر اور چالاک ہو کر تھی۔ وہ اپنے وقت مقام اور کارروائی کی نوعیت کا انتخاب کر سکتے تھے۔ دارکر کے وہ گولی کوچوں پالنے جاری حمایتوں کی وساطت سے کسی ماسلوم جگہ پر غائب ہو سکتے تھے۔ مارتے تنگ کے مشہور مقولے کو استعمال کرتے ہوئے۔

”سمندر میں پھلی کی مانند تیر دیا ہجوم میں غائب ہو جاؤ“

میں سوچ رہا تھا کہ اس قائلے کا الٹ یا متبادل کیسے تلاش کیا جائے۔ ایک چوبے کو پکڑنے کے لئے اس کے پیچھے پٹی لگا نا پڑتی ہے اس میں پولیس یا نیم فوجی دھوکے کی بھاری جمیعت کچھ نہیں کر سکتی۔ اس سلسلے میں ماہرین کا ایک جھوٹا سا گروپ جو فوری طور پر وار کر سکے، بہترین تصور کیا گیا۔ قدرتی طور پر غرض کے بعد میں نے مندرجہ ذیل حکم جاری کیا جو کسی وضاحت کا محتاج نہیں۔

”میری خواہش ہے کہ ان دہشت گردوں کو اچانک گرفتار کرنے کے لئے SPECIAL INITIATIVE اور SPECIAL SAVAR کے لئے خاص دستے قائم کئے جائیں جو کوئی نملائوس مقامات مشرکوں پر جمع ہو کر مسموم افراد کو مارنے یا دیگر طریقے سے وار کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہوں۔“

میرا مقصد ہے کہ حیرت کن اور اچانک وار کرنے کے عناصر کو اپنے حق میں کیا جائے تاکہ دہشت گردوں کو اپنے نشانے اور محلے کے مقامات آسانی سے منتخب کرنے کا موقع حاصل نہ ہو۔

خاص طور پر تربیت یافتہ افراد کی ۱۵ ٹیمیں منظم کی جائیں گی۔ ہر ٹیم میں ۳ سے ۵ مسلح افراد شامل ہوں گے جو روزمرہ کا لباس پہنے ہوئے۔ وہ پیدل یا ایسی گاڑیوں میں سفر کریں گے جن کی نشاندہی دور سے نہ ہو سکے۔ یہ ٹیمیں مشکوک دکھائی دینے والے افراد یا گروپوں کی تلاش کرتی رہیں گی اور انہیں حیرت میں ڈال کر اچانک جانے پڑتال کریں گی۔ اس اقدام سے اچھے نتائج حاصل ہوئے۔ ایسی کارروائیوں سے متعدد درخشاں عمل میں لائی گئیں۔ اس سے بھی زیادہ فائدہ مند بات یہ ہوئی کہ اس سے دہشت گردوں میں افراطی فوجی فحش۔ انہیں اس امر کا یقین نہیں تھا کہ کب انہیں خاص پیل قومی کے کارروائیوں میں گھر جائیں گے۔ وہ دن جا چکے تھے جب انتہائی اطمینان کے ساتھ وہ شہروں میں بیٹھ کر منصوبہ تیار کر کے انہیں رو بہ عمل لاتے تھے۔ دہشت گرد بوجھلے مقصد گرد و پیہلے چکے تھے کہ انہوں نے عام لوگوں کے لئے ہلکی گاڑیوں کے استعمال پر پابندی عائد کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ اس سے قلعہ گروپوں کے درمیان چیتلش شروع ہو گئی۔ جسے دلیل ایف نہیں چاہتا تھا کہ یہ پابندی جاری رہے اس کا خیال تھا کہ اس سے عوام کو وقت بھری ہو رہی ہے دوسری طرف سٹوڈنٹس لبریشن فرنٹ چاہتا تھا کہ یہ پابندی جاری رہے۔ اس سے میرا مقصد پورا ہو گیا۔ تحریک کا راور دہشت گرد دباؤ میں آ گئے۔ وہ تھک گئے۔ ان میں تقسیم و منافقات کا رجحان نمایاں ہونے لگا۔

تحریک کار تنظیموں پر پابندی

گرفتار شدہ افراد کی تقویت سے ان تحریک کار تنظیموں کا سنگدلانہ طرز عمل اور بھی واضح ہو گیا۔ ان کی کارروائی کی افلاطین کو کم کرنے کے لئے میں نے چند خطرناک تنظیموں کو خلاف قانون قرار دینے کا فیصلہ کیا۔ ریاست میں قانون فوجداری ترمیمی ایکٹ کے تحت ان تنظیموں کو خلاف قانون قرار دینے کے احکامات

میں نے ۱۶ اپریل ۱۹۹۰ء کو جاری کر دیئے۔ یہ تھیں جماعت اسلامی، حزب الجہاد بنی جے اینڈ کے لبریشن فرنٹ، سٹوڈنٹس لبریشن فرنٹ، نماز آزادی، اسلامی سٹوڈنٹس لیگ، پیپلز لیگ اور اسلامک جماعت طلباء۔

عوام کو یہ بات واضح کر دی گئی کہ متذکرہ جماعتوں پر پابندی اس لئے عائد کی گئی ہے کیونکہ یہ جماعتیں ملحدی پسند اور دہشت گردانہ کاروائیوں میں ملوث تھیں اور جس کے واقعات و ثبوت موجود ہیں۔ میں نے یہ بھی واضح کیا کہ یہ جماعتیں تخریب کاری اور دہشت گردی کا ماحول پیدا کر رہی تھیں اور ہندوستان کے حصے کرنے کے لیے کوششیں کر رہی تھیں۔ ان احکامات کا ایک فوری تجویز ہوا کہ جماعت اسلامی کے دفاتر اور بینک حسابات معطل کر دیئے جائیں اور ان کا کٹر بک کر دیا جائے۔ تشریحی مواد آسانی سے دستیاب کیا جاسکتا تھا اور نہ ہی تفریق کیا جاسکتا تھا۔ جماعت اسلامی کے لیڈر اب جو کہ جماعت کو خطاب نہیں کر سکتے تھے کیونکہ یا تو یہ لیڈر بھاگ چکے تھے یا انہیں گرفتار کیا جا چکا تھا۔

کشمیر میں طوفان کی ایک وجہ جماعت اسلامی اور اس کی معاون ایجنسیوں بشمول فلاح عام ٹرسٹ کا رول تھا جیسا کہ قبل کے ابواب میں بتایا جا چکا ہے کہ یہ ادارے اپنے متعدد سکولوں اور مدرسوں کے ذریعے بنیاد پرستی اور تعصب کے بیج بونے رہے تھے۔ بچوں کے ناچنے پھرنے میں تنگ نظر خیالات کے بیج بونے جاتے تھے۔ کشمیر میں بنیاد پرستوں کو جو جوہرہ شکل ہے اور جس نے غیر ملکی اسلامی کو کور بنا کر رکھ دیا ہے وہ جماعت اسلامی اور فلاح عام ٹرسٹ کی طرف سے چلانے گئے سکولوں اور مدرسوں کی بلا سوک ٹوک کاروائیوں کی وجہ سے ہے پاکستانی اخبارات اور پرائیویٹ میڈیا نے جماعت اسلامی کا سربراہ فرنگ مارتا ہے کہ یہ جماعت اسلامی کا ہی اثر ہے کشمیری اب بیدار ہو چکے ہیں اور انہوں نے ہندوستان کے خلاف جہاد شروع کیا ہے۔

جسٹ ایچ جی نے کشمیر میں تخریب کاری اور تعصب کے حصے کو ہی بند کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے فلاح عام ٹرسٹ پر پابندی لگا دی اور اس کی سرگرمیوں کو غیر قانونی قرار دے دیا۔ اس فیصلہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس ٹرسٹ کی طرف سے چلائے جا رہے ۱۵ سکول بند ہو گئے۔ ان ۱۵ سکولوں کے ۵۰۰۰ طلباء کے حکومتی سکولوں میں داخلے کے انتظامات بھی اس کے ساتھ ہی کئے گئے جہاں معمول کی تعلیم دی جاتی تھی ایک مشکل کام کو نہایت آسانی اور سرعت کے ساتھ انجام دیا گیا۔

سورکش زدہ عضوی جرائی

جیسا کہ باب دہم — تخریب کاری کی نوعیت اور طرز عمل میں اشارہ دیا گیا ہے حکومتی ملازمین کی ایک کثیر تعداد تخریبی سرگرمیوں میں ملوث تھی اور ان کے خلاف کوئی کارروائی عمل میں نہیں لائی گئی تھی۔ اس کے نتیجے میں یہ سوزش اور بیماری پھیلتی گئی۔ جب میں ان قذافی عضو کو دوبارہ صحت یاب کرنے کا فیصلہ پایا تو انتہائی مایوس کن حالت میں بیمار عضو کا جرائی کے سوائے کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس گندگی کا اندازہ اس وقت عیاں ہوا جب یہ معلوم ہوا کہ مرکز کی وزروں اور اہلکاروں کی اغوا میں حکومتی ملازمین نے شہر اور ولایت کا

سرحدوں کی خلاف ورزی جیسے سنگین معاملات میں ملوث یا حزب الجہاد بنی جیسی دہشت گرد تنظیموں کے عہدیداروں کے طور پر سرگرم عمل حکومتی ملازمین کو میں نے آئین جرم کی دفعہ ۱۲۹ کی رو سے حاصل اختیار راست کے تحت فوری طور پر برطرف کر دیا۔ اس دفعہ کے تحت گورنر کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ حکومتی ملازمین کو رسمی حکمانہ تحقیقات کرانے بغیر برطرف کر سکتا ہے بشرطیکہ اسے اس بات کا اطمینان ہو جائے کہ یہ قدم ریاست کے تحفظ کے مفاد میں ہے اور تحقیقات کرنا ضروری نہیں ہے۔ اگر اس آئینی دفعہ کو فوری اور دہشت گردی جیسے معاملات میں استعمال نہ کیا جائے تو اس کی افادیت اور مفیدیت ہو کر رہ جائیں گے۔

اس ہم جرائی میں ۱۲۱ حکومتی ملازمین کو ملازمت سے برخاست کر دیا گیا۔ تمام متعلقین کی رپورٹ اطلاعات پر غور کرنے کے بعد ہر معاملے کا فیصلہ اس کے عیب و ہنر پر کیا گیا۔ تخریب کاری اور حکم عدو کی میں ملوث ۱۱ پولیس اہلکاروں کو ڈائریکٹر جنرل آف پولیس نے اپنے اختیارات کا استعمال کر کے ہٹے برطرف کر دیا۔

تمام معاملات کے عمیق مطالعہ سے اس طرز عمل کے ساتھ تخریب و رشوت اور سیاسی سرپرستی کا گہرا اقلی نظر آیا۔ بہت ساری صورتوں میں دہشت گردی میں ملوث حکومتی ملازمین سے ہماری رقوم ضبط کی گئیں۔ یہ رقوم راشی طور طریقوں سے جمع کی گئی تھیں۔ ان حکومتی ملازمین کے سیاسی آقا باپ بھی تھے۔ مثال کے طور پر ایک وزیر خزانہ جو حزب الجہاد بنی جیسی سرگرم دشمن تھا اسے دو لاکھ روپے نقد اور ۵۰,۰۰۰ روپے کے فکسڈ ڈیپازٹ ضبط کئے گئے اس نے ایک کڑی رکھی ہوئی تھی اور اعلیٰ میاں زندگی اپنایا ہوا تھا۔

بیرون ریاست نظر بندی

پبلک سیفٹی ایکٹ میں ترمیم کر کے ریاست کے باہر نظر بندی کو ممکن بنایا گیا۔ جب مقامی ہائی کورٹ نے اس کارروائی پر حکم امتناعی جاری کر دیا تو یہ معاملہ فوری طور پر سرپرست کورٹ تک لے جایا گیا جس نے ہائی کورٹ کے حکم کو اٹھ دیا۔ اس کے نتیجے میں ۱۰ دہشت گرد تخریب کار اور غیر قانونی تنظیموں کے لیڈران یا سربراہان کو جیل کے کدے چلنے لگا دیئے گئے۔ ان کے ذریعے تشدد کی مزید کارروائیاں کرنے کے قائل نہ ہو سکے۔

متحرک تعاون اور رابطہ

یہ بات مجھے اب واضح ہو چکی تھی کہ سنگین جرائم اور دہشت گردوں کی طرف سے استعمال کی گئی تکنیکوں اور طرز عمل کو ناکارہ بنانے کے لئے متحرک تعاون اور رابطے اور کاوش کی ضرورت ہے۔ چنانچہ میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ کسی بھی فیڈبک ایجنسی کی طرف سے حاصل آمد اطلاعات کا فوری طور پر استعمال کر کے ان پر فوری طور پر پوری کی کارروائی کی جائے۔ میں نے اعلیٰ تفتیشی انسٹرکٹور کا رول اختیار کر لیا۔ میں نے سرچاکہ یہ اشد لازمی ہے۔ غیر معمولی حالات میں غیر معمولی طرز عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ فوجی کارروائیوں پر اپنی سطح تک دہشت گردانہ سرگرمی کے

ساتھ اطلاعات حاصل کرنا فوری تفتیش کرنا اور سرعت کے ساتھ تعاون اور رابطہ کرنا اور اس کے بعد تیزی سے کاروائی کرنا اس موقع کے اشد ضروری لوازمات تھیں۔

اس متحرک تعاون اور رابطے کو حاصل کرنے اور متذکرہ بالا اقدامات کے انجام کا رفیقہ عرصے کے اندر ہی گھنٹاؤں کے جرائم کا سراغ حاصل ہو گیا۔ ان معاملات میں کیا ہوا ان کی تفصیل نہایت پُر نکشاف اور دلچسپ ہے کہ ان معاملات میں کلیدی خبروں کو کیسے گرفتار کیا گیا اور اس کا نتیجہ کیا حاصل ہوا۔

تلاشیاں اور چوٹی کے دہشت گردوں کی گرفتاریاں

حسب توقع، اپریل سے گھر گھر تلاشیاں لینے کا جو کام شروع کیا گیا تھا اس کے انتہائی کارآمد نتائج حاصل ہوئے۔ ۸ اپریل کو جب انتظامیہ ایل کھیترا، شیرالہی اور عبدالغنی کے انڈاکنڈ گان کی تلاش میں گھر گھر تلاشیاں جاری تھیں تو بی ایس ایف کی ایک جمعیت نے ایک تاجر حفیظ اللہ بھٹ کے مکان پر چھاپہ مارا۔ چار مشتبہ افراد کو ڈھونڈ نکالا گیا۔ مختصر اور بلاخون مقابلے کے بعد تین کو سیدھے طور پر گرفتار کر لیا گیا۔ وہ تھے اقبال گاڈرو، فریجی شیرجے کے ایل ایف جاوید زگر ایک چوٹی کا دہشت گرد جاوید زگر ڈاکٹر روبیدہ سید کے تباد لے میں رہا کیا گیا اور ان دہشت گردوں کا پتا دہندہ حفیظ اللہ بھٹ۔ چوتھے مشکوک فرد نے ہمدردی کی کوشش کی اس نے ملحقہ مکان کی کھڑکی سے نسبتاً اونچائی کے دوسرے مکان پر چھلانگ لگانے کی کوشش کی۔ وہ جرح ہو گیا۔ اس کے نقصانوں سے خون بہنے لگا۔ بی ایس ایف پارٹی نے اٹھا کر ایس ایم ایس ہسپتال لے گئی جہاں سے سی طور پر گرفتار کرنے کے بعد اس پارٹی نے ملزم کو دو پولیس اہلکاروں اور ڈیوٹی پر ڈاکٹروں کے سپرد کر دیا۔

یاسین ملک

یقیناً سے بی ایس ایف پارٹی کو یہ پتہ نہیں تھا کہ انہوں نے بیات کے ایک چوٹی کے دہشت گرد کو گرفتار کر لیا ہے۔ وہ جے کے ایل ایف کا کمانڈر ان چیف "یاسین ملک" تھا۔ بیسکوری فورسز کے خلاف زیادتیوں کے جوئے اور الزامات لگائے جاتے ہیں ان سے ڈر کر یہ پارٹی چاہتی تھی کہ جتنی جلدی ممکن ہو اس جگہ سے نکل جائے۔ بی ایس ایف افراد نے سوچا کہ اگر یہ شخص مرگیا تو ان پر الزام آئے گا کہ مشکوک شخص کی بہت زیادہ پٹائی کی گئی ہے اور یہ الزام مقامی اخبارات میں اچھا لاجائے گا کہ اس حقیقت پر کسی کو یقین نہیں ہوگا کہ مشتبہ شخص نے خودی کھڑکی سے چھلانگ لگائی ہے۔

ڈیوٹی پر ڈاکٹر نے دھوکہ دیا کہ خطائی ڈیوٹی پر مامور اہلکاروں نے دھوکہ دیا اور جس پولیس تھانے کی تحت علاقے میں بدولت ہوئی جانے کے اہلکاروں نے بھی دھوکہ دیا۔ ڈیوٹی پر تعینات مقامی ڈاکٹر اور پولیس اہلکار اس شخص کی شناخت کر چکے تھے کہ یہ یاسین ملک سے اور وہ غری طور پر اس کے ذرا کی سازش متاثر کرنے لگے۔ دہشت

یہ افواہ پھیلا دی گئی کہ یہ زخمی شخص نہایت نازک حالت میں ہے اور اس کے زندہ رہنے کی شایہ ہی کوئی امید ہے۔ ایک پولیس جو کسی خاتون مرہٹہ کو لے کر شیشہ میڈیکل انسٹیٹیوٹ جہاں جی جی موک لگئی تھی اور یاسین ملک کو اس میں ڈال دیا گیا ایس ایم ایس ہسپتال کے ڈاکٹر نے انسٹیٹیوٹ کے ڈاکٹر کو اطلاع دی تھی کہ کون آرہا ہے۔ دونوں طرف کے عملے نے سازش کے دھاگے تیزی کے ساتھ باندھ لئے۔

چوٹی، وین انسٹیٹیوٹ، پیوچی، یاسین ملک کو ایک مٹر مٹر ڈال کر ہسپتال لفٹ تک لے جایا گیا۔ جہاں سے اسے ڈاکٹروں اور حمایتیوں کے ایک گروپ کے ساتھ منائب کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ افواہ پھیلا دی گئی کہ زخمی فرد کو اس کے حمایتی غائب کر چکے ہیں اور میں ٹکڑے ہو کر رہ چکا ہے۔ یہیں فریب دینے کے لئے کیا گیا تھا تاکہ جو پارٹیاں اس معاملے کی پیروی کر رہی تھیں وہ خاموش ہو کر بیٹھ جائیں۔

یہ ایک مکمل فرار تھا اور اس سے پہلے ایک مرتبہ پھر اندازہ ہو گیا کہ ہمارا کام کس قدر مشکل تھا۔ کس قدر ہمارے ساتھ سازشیں تیار کی جاتی ہیں، کس طرح مخالفین فریب کار بن چکے ہیں اور سیکورٹی فورسز پر زیادتیوں کے الزامات لگا کر کس قدر نفسیاتی نقصان انہیں پہونچایا جا رہا ہے۔

یاسین کے فرار سے مجھے قدرتی طور پر مایوسی ہوئی۔ بین چوٹی کے کمانڈروں کے ساتھ اس کی گرفتاری سے جوں و کشیر لبریشن فرنٹ کو لازمی طور پر ایک شدید دھکا لگ سکتا تھا۔ اس سے ان کے حمایتیوں کی حوصلہ شکنی ہوئی۔ گھر گھر تلاشی کے نکتہ چین و فلع پر آجاتے۔ اس سے میں کسی دھیاد دار انسان کے ساتھ جلدی سے یاسین کے ساتھ بات چیت کر سکتا تھا اس سے میں اسے اور فرنٹ کے چوٹی کے کارندوں کو انتخابات تک پہونچنے کا راستہ بتا سکتا تھا تاکہ وہ جائز طریقوں سے اقتدار حاصل کر سکیں اس سے مجھے حزب المجاہدین، اسٹوڈنٹس لبریشن فرنٹ جیسے زیادہ بنیاد پرست اور زیادہ سنگدل پاکستانی نواز گروپوں کو الگ تھلگ کرنے کا موقع مل جاتا۔ مگر ایسا نہیں ہو سکا تھا، کم از کم اس لمحہ ممکن نہ تھا۔

میں نے اس فرار کو نہایت متانت کے ساتھ قبول کیا اور ہسپتال کے ناسور زدہ وارڈوں کو پولیس تھانوں کو صاف کرنے کا کام زیادہ جوش و خروش کے ساتھ شروع کیا۔ ڈاکٹروں جیسے کاروباری افراد اور پولیس جیسی نظم و ضبط والی فورس کو جلد ہی یہ ذہن نشین کر دیا گیا کہ کسی طرح کا بھی سازشی ملوک برداشت نہیں کیا جائے گا نہ ہی یہ پوشیدہ سپیگ اور نہ ہی یہ شخص سزا سے بچ سکے گا۔

یاسین ملک کے فرار کے قطع نظر چوٹی کے تین دہشت گردوں۔ اقبال گاڈرو، جاوید زگر اور حفیظ اللہ بھٹ کی گرفتاری ایک نہایت نمایاں کامیابی تھی۔ اس سے ایک ایسا آلہ حاصل ہو گیا جس سے تحریک کاروں کے منصوبوں کی پیش بندی ہو گئی۔ ان گرفتاریوں سے پہلے بھی ٹی مشینری کو اچھی خاصی کامیابیاں حاصل ہو چکی تھیں حزب المجاہدین کا ایک نمایاں کردار فضل الحق قریشی گرفتار کیا جا چکا تھا اور اس سے پیش قیمت معلومات حاصل ہو چکی تھیں۔ برسرِ کار کے مزاح میں صورت کی ایک کہن کاہ سے بھاری تمنا دیں ہم برآمد ہوئے تھے۔ جس جال کے ساتھ قریشی کا تعلق

تھا۔ اس کا ایک اجتماع خاصہ عقدہ فتم ہو چکا تھا غنائیاز میں گولی باری کی ایک واردات میں چوٹی کا دھشت گرد رنگریز مارا جا چکا تھا۔ اشفاق حمید وانی اس وقت مارا گیا جب اس کے ہاتھ میں وہ دھکی پھوٹ گیا جسے وہ ایک بار ڈر سیکورٹی فورس پارٹی پر حملے کے دوران پھینکنے والا تھا۔ اس طرح کی بہت ساری عاںیاد کیا بیال نہیں مگر مجموعی طور پر ان کی بھاری وقعت تھی۔

شوکت بخشی

گھر گھر تلاشیوں سے بہت سارے سراغ حاصل ہوئے۔ ایک اور چوٹی کا دھشت گرد شوکت بخشی ۸۱ میل کوہماے چنگنے میں آگیا۔ اس کی تفتیش سے جو کارآمد معلومات حاصل ہوئیں ان سے ہم متعدد گرفتاریاں عمل میں لانے کے قابل ہو سکے جن میں وہ افراد بھی شامل تھے جو مرکزی وزیر داخلہ کی بیٹی روبیعہ سید کے اغوا میں شامل تھے۔

شوکت بخشی سے جو معلومات حاصل ہوئیں ان کے ساتھ ایک لڑکھان شیرازی سے موصول شدہ اطلاعات شامل کی گئیں۔ اس کے والد عبداللہ شیرازی کے مکان پر چھاپہ مارا گیا تھا کیونکہ وہ ایک مشہور پاکستان نواز تخریب کار تھا۔ اس لڑکھان کے قبضے سے ایک پستول برآمد ہوا اور اُسے گرفتار کر لیا گیا۔ وہ نہایت ہی ذہین اور ہوشیار تھا اس کے پاس کافی معلومات تھیں۔ یہ وہی شخص تھا جس نے اس ماروٹی وین کی تفصیلات میان کیس جو علی محمد کی ملکیت تھی۔ اس کی من وعن تفصیلات سے اس کار کی شناخت کر لی گئی جو ڈاکٹر روبیعہ سید کو اغوا کرنے کے لئے استعمال کی گئی تھی اور اس کے مالک کو گرفتار کر لیا گیا۔

اس کے بعد عبداللہ شیرازی کی اہلیہ عوامی ملاقات کے روز میرے ساتھ ملنے کے لئے آئی۔ اس نے کہا: میرا بیٹا مصوم ہے میرے شوہر کا کوئی ادب پتہ معلوم نہیں۔ وہ ہماری پروا نہیں کرتا۔ اس کا اپنا ہی حلقہ دوستوں ہے اندس سے کچھ شبہ ہو گئے ہیں اور کچھ پاکستان چلے گئے ہیں۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ آیا وہ اللہ کی جھولی میں آرام سے سو رہا ہے یا پاکستان میں آرام کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس نے اپنا نام ریڈیو پاکستان کے فرامشی پروگرام میں نشر کروانے کی پروا بھی نہیں کی۔ پہلے وہ میں پیسے بھیجا کرتا تھا مگر اب وہ یہ بھی نہیں کرتا۔ اگر میرا بیٹا رہا ہو جائے تو میری تمام تشویش دور ہو جائے گی۔ وہ ابھی بہت چھوٹا ہے۔ وہ بالکل بے تصور ہے۔ اپنے باپ کے اعمال کے لئے وہ ذمہ دار نہیں ہے۔ میں بیگم عبداللہ شیرازی کی دلیلوں سے بھاری متاثر ہوا۔ اس کے ذہن میں جذبات کا عقدہ منتشر ہے۔ وہ اپنی بے اعتنائی اور بے پرواہی کا ردنا رو رہی ہے اپنے کہنے کے مسائل بیان کر رہی ہے۔ اپنے بیٹے کی معصومیت کے بارے میں بات کر رہی ہے اور اپنے شوہر کے دوستوں اور ان کی شہادت کی بات کر رہی ہے۔

مجھے اس بات کا تعجب ہوا کہ عبداللہ شیرازی جیسے اذکار کو یہ احساس ہوگا کہ چند مفاد پرست لوگ انہیں استغدر سے وقف ہوتا رہے ہیں اور کتنے منتشر گھروں کو وہ جہنم سے رہے ہیں۔ انسان دو جہی کے جذبات کو مد نظر رکھتے ہوئے میں نے متعلقہ پولیس افسر سے کہا کہ وہ اس بات پر غور کرے کہ آیا مناسب احتیاط برتنے کے بعد لڑکھان شیرازی کو رہا کیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر روبیعہ کے اغوا کے لئے ذمہ دار افراد کی گرفتاری اور تفتیش سے یہ بات واضح ہوئی کہ جنرل کشمر لڑیشن فرنٹ کی چوٹی کی قیادت ریاستی حکومت کی ہے انری اور حکومتی شینری میں اپنی گہری دراندازی سے وہ نہایت زوردار انداز سے وار کرنا چاہتی تھی۔ ان کا متعدد کارکن سننی فیز کرکھا یا جائے جس سے ان کی طاقت کی نمائش ہوا اور وسیع پیمانے پر قوی اور بین الاقوامی تشہیر حاصل ہو سکے۔ اس نصب العین کے حصول کے لئے انہوں نے مرکزی وزیر داخلہ مفتی محمد سعید کی بیٹی کو اغوا کر لیا جو کہ اتفاق سے ایک شیرازی تھا اور قوی سطح پر اس اعلیٰ عہدے پر پہنچنے کے بعد کشمر کی سیاست میں یقینی طور پر اس کا زیادہ رول ہونا تھا۔

یاسین ملک کی مجموعی رہبری میں ایک سازش تیار کی گئی۔ اس کا تفصیلی منصوبہ تیار کرنے کے لئے چھاپہ بندہ میں مشتاق احمد لون کے مکان پر ایک میٹنگ منعقد ہوئی۔ اس میٹنگ میں اشفاق حمید وانی، جاوید احمد قیصر، شوکت بخشی، اقبال کاڈرو، علی حمید، یاسین ملک اور دیگر افراد شامل ہوئے اور فیصلہ کیا گیا کہ مختلف افراد کو مختلف کام سونپے جائیں۔

۸۔ درجہ بعد دوپہر کو ڈاکٹر روبیعہ سید مل دیدہ ہسپتال سے باہر نکلی اور حسب معمول گھر جانے کے لئے چوٹی وہ منی بس میں سوار ہوئی تو قلعہ اس مشتاق لون، اقبال کاڈرو، معراج الدین مصطفیٰ اور سلیم عرف تاناجی بھی سوار ہو گئے۔ لوگ ان میں آخری مشابہے قبل بس کو اغوا کر لیا گیا۔ ڈاکٹر روبیعہ کو بھروسہ کیا گیا کہ وہ بس کو نیچے پورہ کی ایک دیران جگہ پر لے جائے۔ یہاں پر ڈاکٹر روبیعہ کو بس سے اتار کر نیچے رنگ کی ایک ماروٹی کار میں بٹھایا گیا۔ یاسین ملک اشفاق حمید وانی اور غلام حسن اندر بیٹھ گئے۔ کار کو روک کر کانیسکینسل افسر علی محمد میر جیلار ہا تھا۔ وہ ایک اور ملکی ہلکار جاوید اقبال جو میرا نمبر کے مکان واقع سوپور کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں پر ایک دن کے لئے ڈاکٹر روبیعہ کو رکھا گیا۔ دو سب کو اُسے سوپور کے ایک صند کا محمد یعقوب کے مکان پر لے جایا گیا اس مکان کا انتظام سوپور کے دو دیگر صند کاروں زمان میر اور عبداللہ نے کیا تھا۔ اس گھر میں اُسے ۴۴ روز تک رکھا گیا۔ اقبال حسن اور اقبال کاڈرو نے اس گھر کی مسلسل حفاظت کی۔

ڈاکٹر روبیعہ جبکہ باغی روز رنگ ریفرال رہی اور خاموشی کے ساتھ مصیبتیں برداشت کرتی ہوئی سسکیاں لیتی رہی اور بعض اوقات ان خیالات میں گم رہی کہ وہ کسی کال کوٹھری میں رہ رہی ہے یا اسے ایک ڈرامے کے عالمگیر شیخ پر زبردستی لایا جا رہا ہے جو کہ انجام سنگین ہو سکتا ہے۔ اس کے دو اذیت کار یاسین ملک اور اشفاق حمید وانی حکومتی نمائندوں کے ساتھ اپنے درمیان داروں کے ذریعے سرگرمی میں لگے ہوئے رہے۔ انگریز آئی ڈی ویرفلام رسول کار کے بیٹے اجمار کے ساتھ یاسین ملک کے دوستانہ تعلقات تھے۔ ان تعلقات کا استعمال کر کے انہیں چوٹی کے ایک صند کار کے ہاں رسائی حاصل ہو گئی جہاں سے ٹیلیفون پر چند مرتبہ باتیں کی گئیں جس کے بعد حال دراندازی سے متاثر

حکومت انڈیا کے عالم بدیننگ گئی اور آخر کار ریڈیالیوں کے مطالبات کو اس نے تسلیم کر لیا اور ڈاکٹر ویدیک رہائی حاصل کرنے کے لئے جو فی کے پانچ دہشت گردوں کو رہا کرنے کا مطالبہ منظور کر لیا۔

رویدیہ سید کا معاملہ حل کرتے وقت چند اہم پہلوؤں پر غور کیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کس قدر آسانی اور تھک کے ساتھ دوسرا اہمیت کہ از میں تیار کی جاسکتی ہیں اور کس طرح حکومتی اہلکار تاجر اور کاروباری افراد مل کو دہشت گرد کاروائیوں میں مدد دے نہیں کرتے بلکہ ان کے ترکب بھی ہو سکتے ہیں۔ اس سے یہ بھی تصدیق ہو گئی کہ حکومت ہند کی طرف سے ترقیاتی مقاصد کے لئے فراہم کئے گئے ذرائع کو حکومتی اہلکار اور درمیانہ درجے کے صنعتکار کس طرح بڑپ کر رہے ہیں اور ساتھ ہی تخریب کاروں کو بھی امداد فراہم کر رہے ہیں تاکہ ان کی قلمی نہ عمل جائے۔ مثال کے طور پر جس علی محمد میر کی کار میں ڈاکٹر ویدیک کو سو پورے جایا گادہ ان دو صنعتکاروں کی غیر قانونی طور پر امداد کر رہا تھا۔ جمال ڈاکٹر ویدیک کو اسپر کھا گیا تھا وہ خود بھی اپنے ظاہر ذرائع سے زیادہ کھاتے باٹھے سے زندگی بسر کر رہا تھا۔

لٹہ کول کا معاملہ +

لٹہ کول کے معاملے کو حل کر لینا نئے نفاذ کی ایک اور کامیابی تھی۔ جیسا کہ باب نمبر میں بیان کیا گیا ہے لٹہ کول کو قتل کرنے کیلئے نشانہ بنایا گیا تھا اس پر الزام یہ تھا کہ وہ قومی پروگرام جاری رکھ رہا ہے جو دہشت گردوں کے مطابق غیر اسلامی تھا وہ اس لئے بھی اس پر ناخوش تھے کہ خبروں کے معاملے میں بھی وہ ان کی ہدایات پر عمل طے عمل نہیں کر رہا تھا۔ انہوں نے اس کے ماتحت عملے کو بھی ہراساں کیا تھا۔ ان میں سے چند افراد ان کے ہمدرہ رہے اور ان کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ دوسرے دشمن سے شہر ہونے والے خبر نے کافی حد تک دہشت گردوں کے حق میں ہوا کرتے تھے۔ چند ایک خبریں تو دہشت گرد تنظیموں کے اخباری بیانات پر مبنی ہوتی تھیں۔ یہاں تک ان کے پروگراموں کی تشریح کی جاتی مثال کے طور پر سب اوقات یہ اعلان کیا جاتا کہ شہید کی نماز جنازہ فلاں مارچ کو فلاں مقام پر منعقد ہوگی۔ کول اس عدم توازن کو دور کرنا چاہتا تھا۔ تخریب کار تنظیموں کو یہ پتہ نہیں تھا ان کا اعتقاد تھا کہ اگر قہر ہمارے آواز کے طور پر کام نہیں کر سکتے تو ہم دشمن ہمارے نہیں ختم کیا جاتا ہے!!

شوکت بخشی کی گرفتاری سے وہ طریقہ سامنے آ گیا جس کے تحت اس جرم کا ارتکاب کیا گیا تھا۔ ۱۱ اور ۱۲ فروری کی رات کو کول نے دفتر ہی میں قیام کیا۔ یہ معلوم ہونے پر کہ ۱۳ فروری کی شام کو وہ گھر واپس آنے والا ہے تاکہ وہ اپنے معذروہ والد کے ساتھ ملاقات کر سکے جو کوہاں تنہا ہی رہتا تھا۔ اس کے افراد کنبہ پہلے ہی دہلی جا چکے تھے۔ شوکت بخشی اور حنیف بیمن اس کے مکان کے نزدیک چھپ گئے۔ جب لٹہ کول کار سے اترتا شوکت بخشی نے اس پر ہتھ مارا اس پر گولی چلائی جو اسے اشتقاقی عید وانی نے دیا تھا۔ اس سے لٹہ کول موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔

+ تمام معاملات کے بارے میں معلومات برسرِ تبدیلی ہوتی رہتی ہیں۔

شوکت بخشی کی تعینات ایک اور پہلو سے بھی کارآمد ثابت ہوئی۔ اس نے بنایا کہ کول کو امان اللہ خان کی ہدایات پر قتل کیا گیا جو اسے اشتقاقی مجرمانہ کی وساطت سے حاصل ہوئی تھیں۔ اس وقت صفان امریکی تھا جہاں سے اس نے کثیر کے بارے میں ہندو مخالف پروپیگنڈہ شروع کیا تھا۔ ہر روز وہ ایک دایک نقبہ بیان جاری کیا کرتا۔ شوکت بخشی کے اس اقبالہ بیان کے پیش نظر جس میں امان اللہ خان کو ملوث کیا گیا تھا اس کو ہندوستان میں لٹے سے متعلقہ وارنٹ پانچوٹ سے حاصل کرنے کے قابل ہوئے۔ ہم نے اس پر سخت محنت کی۔ ہمارا خیال تھا کہ جتنی جلد واپسی کے وارنٹ حاصل ہو جائیں اتنا ہی بہتر ہوگا۔ یہ بھی خیال تھا کہ اگرچہ ہم اس کی حکومت کو جو الٹی مال کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں تب بھی اس وارنٹ سے ایک اہم مقصد حاصل ہوگا۔ کیونکہ وہ اس ملک سے چلا جائے گا اور امریکی سرزمین سے اس کا ہر پلاہر ویکٹہ ہند ہوجائے گا۔ اور بالکل ہی بات ہوئی جیسے ہی اس کی ہوائی کے وارنٹ حاصل ہوئے امان اللہ خان امریکہ سے کسک گیا۔

یہاں میرے لئے لازمی ہے کہ میں چیف جڈیشل مجسٹریٹ اوتار کوشن کول کے کردار کے بارے میں بھی ایک دو لفظ کہوں جس کے روبرو شوکت بخشی زیرِ دفعہ ۱۴۳ قہر برات فوجداری اقبالہ بیان دینا چاہتا تھا۔ یہ بیان ہمارے لئے جاری اہمیت کا حامل تھا۔ اس بیان کو قلمبند کرنے کا وقت مقرر ہو چکا تھا۔ مجسٹریٹ نے پولیس اور دیگر متعلقہ افسروں کو بتایا کہ وہ بیان معززہ وقت پر قلمبند کرے گا۔ مگر جب پولیس ملزم کے ہمراہ کو عدالت میں پہنچی تو وہاں ہماری ہجوم موجود تھا مگر مجسٹریٹ نہیں۔ وہ رخصت اتفاقیہ کی درخواست دے کر خاموشی سے کسک گیا۔ مجسٹریٹ کے اس غیر ذمہ دارانہ رویے سے مجھے رنج ہوا۔ خدشہ یہ تھا کہ شوکت بخشی اپنا ارادہ بدل لے گا۔ اور ہم امان اللہ خان کی ہوائی کے وارنٹ حاصل کرنے کا موقع کھودیں گے جو خوش قسمتی سے آٹھ روز ایک گزیر ہوٹ کے روبرو یہ بیان قلمبند کئے گئے اور شوکت بخشی نے امان اللہ خان کے بارے میں اپنا موقف نہیں بدلا۔ بہر حال پوچھنے کا کیس کمزور کرنے کے لئے وہ چند اہم تہات کو حذف کر گیا۔

اس واقعے سے ایک تہہ پھر یہ ظاہر ہو گیا کہ ہماری عملداری کے ارادے کے قدرناہنگی کے شکار ہیں جبکہ ریاست کو دہشت گرد تنظیموں کی بہت اور پیچیدگی میں اضافہ ہو رہا ہے وہاں حکومتی ادارے کمزور سے کمزور تر ہوتے جا رہے ہیں اور اتحادی کے مالک کبیدی افراد کم سے کم ترقی داری کے ساتھ عمل پیرا ہیں اور اس سے بھی بڑی بات ہے کہ وہ بری الزمہ ہوجاتے ہیں۔

مشیر الحق معاملے کو حل کرنا

ہمدون مشیر الحق اور اس کے سپیشل اسٹٹ عبدالحی ڈگر کے اغوا اور قتل کے کیس کی ملزم کی گرفتاری ایک مدد نمایاں کامیابی تھی۔ ۱۱ مئی کو اخبارات میں ایک مختصر اعلان کیا گیا کہ ۵ مارچ کو وائس چانسلر اور اس کے سپیشل اسٹٹ کے اغوا میں استعمال کی گئی لال ماروئی کار برآمد کی گئی۔

ان گرفتار یوں سے انکشاف ہوا کہ پروفیسر شریانی اور عبدالغنی کو ۱۹ اپریل ۱۹۹۰ء کو کشمیر یونیورسٹی کے کیمپس سے اغوا کر لینے کے بعد وزارت ٹیکسٹائل اینڈ ٹریڈ میں صاحب کے مکان پر رکھا گیا۔ اس کے بعد انہیں دکنہ لہجان میں ریشائریڈ کانسٹیبل پولیس غلام قادر میر کے گھر میں رکھا گیا۔ ایک رات وہاں رکنے کے بعد انہیں بدھ پورہ انڈسٹریل ایریا میں غلام محمد ڈار کے گھر رکھا گیا۔ ۱۰ اپریل ۱۹۹۰ء کو سلیم احمد زگر عرف فیض سکنہ مسجد تھانہ انہیں کھیتوں میں لے گیا۔ شام ۳-۴ بجے بلال احمد بیگ بادشاہی باغ کے کھیت میں آ رہا اور اس نے بغاوت کو پک کر دینے کا حکم یا شام دیر گئے انہیں ہاتھ اوپر اٹھا کر جانے کے لئے کہا گیا۔ انہوں نے سوچا کہ انہیں ریا کیا جا رہا ہے مگر چند سیکنڈوں کے اندر ہی ان کی ٹیگ پر گولیاں داغ دی گئیں اور مرنے کے لئے کھیت میں چھوڑ دیا گیا۔

اس سلسلے میں گرفتار شدہ ایک اور شخص مشتاق احمد شیخ عرف جان عرف کاچرو سکنہ سوئے ٹنگ لہجان تھا۔ بعد ازاں جاوید احمد شالہ کو بھی گرفتار کیا گیا۔ تین ملزمان میں سے ایک مشتاق احمد نے وائس چانسلر کے ڈرائیور کو اغوا کر لیا اور گاڑی کو چلا کر لال بازار میں لے گیا۔ جہاں ریغزالوں کو ماروٹی وین میں ڈال دیا گیا۔ مشتاق احمد کی مارتی میں بیٹھ گیا۔ اس سے قبل اس نے غلام قادر میر اور غلام قادر ڈار کے گھر کا انتقام کیا تھا جس میں انہیں ریغزالوں کو رکھا گیا۔

قتل کیوں ہوئے؟

پروفیسر شریانی کو کیوں ہلاک کیا گیا؟ کیونکہ وہ ایک غیر کشمیری تھا اور اس کا تعلق نسبتاً آنا دخیال مکتب کے ساتھ تھا؟ کیا اس کا تعلق یونیورسٹی کی اندرونی سازشوں یا آکن معاملات کے ساتھ تھا جن کا تعلق چند تقریروں یا وائس چانسلر کے طور پر اس کی میعاد ملازمت میں توسیع کے ساتھ تھا یا مقامی دہشت گردوں نے محض امان اللہ خاں پاکستان کی ہوا طر سوسنر انجیلی منس کی ہدایات کی تعمیل کہ ایک خود امان اللہ خان کے ساتھ آئی ایس آئی نے جال چلی گئی؟ ایک متوسط درجے کے افسر عبدالغنی زورگر کو آخرویت کے گھاٹ کیلئے اتارا گیا؟

گرفتار شدہ افراد سے ان سوالات کے جواب حاصل نہیں ہو سکے کیونکہ انہوں نے غصے کسی کی ہدایات کی تعمیل کی تھی اس سلسلے میں ۹ اپریل کی رات کو کشمیر یونیورسٹی کے پروفیسر وانی نے جیسے جو کچھ بتایا اس کا مختصر طور پر ذکر کریں گے۔

۹ اپریل کو رات قریب ۱۱ بجے پروفیسر جمیل قریشی نے مجھے بتایا کہ اُسے پروفیسر وانی نے ٹیلیفون پر گزارش کی ہے کہ پولیس کو فنی سینٹر فسر ڈائریکٹر جنرل آف پولیس یا ڈپٹی انسپکٹر جنرل کو وائس چانسلر کے گھر روانہ کر دیں۔ پروفیسر وانی نے کہا کہ انہیں بتایا کہ اُسے تقریباً ۲۰ بجے شام پروفیسر وانی اور غنی کے اغوا کاروں سے ایک ٹیلیفون کا موصول ہوئی ہے کہ وہ ان کنبوں کی موجودگی میں ہوا کو تباہ کرنے کے حکومت و افراد ملامت نہیں کر رہی ہے۔ بعد ازاں

پروفیسر وانی کا ٹیلی فون بھی موصول ہوا جس میں اس نے کہا کہ وہ صبح سلامت ہے میں نے قریشی سے کہا کہ وہ ان تمام متعلقہ افراد کو راج بھون لانے کا انتظام کرے۔

میں بھی ۱۰ اپریل کو صبح ایک بجے مفصل گفت و شنید کے لئے ملاقاتی ہوئے۔ ہم نے پروفیسر وانی سے کہا کہ وہ رہائی کی شرطوں کی عین تفصیل حاصل کرے اور وقت کی توسیع کو یقینی بنائے مگر پروفیسر وانی کوئی یقین دہانی دینے کے ناقابل تھا۔ نہ ہی اُسے معلوم تھا کہ اغوا کاروں یا ان کے نمائندوں کے ساتھ کس طور پر رابطہ قائم کیا جائے اُسے اس بات کا بھی یقین نہیں تھا کہ آیا اُسے دوبارہ کوئی ٹیلیفون کرے گا۔ ہم قدرے غصے میں پڑ گئے۔ مگر اغوا کاروں کے ساتھ براہ راست یا بالواسطہ رابطہ قائم نہ ہو تو بامقصد گفت و شنید کس طرح ہو سکتی ہے؟ یہ مینٹنگ ۳۰-۳ بجے ختم ہوئی۔ ہم نے پروفیسر وانی سے کہا کہ جب بھی اُسے مزید ٹیلیفون کال یا پیغام موصول ہو تو وہ ہمارے ساتھ رابطہ قائم کرے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ ہمارے درمیان راج بھون میں جو بھی بات چیت ہوئی وہ صبح مقامی اُردو روزنامہ العفا میں شائع ہوئی۔ آیا پروفیسر وانی کے خیمے کا کوئی شخص ایڈیٹر العفا کے ساتھ رابطہ بنائے تھا۔ یا اس تمام معاملے کے بارے میں بخیر و بابر افراد متعلق تھے۔ کیا یہ بھی ہو سکتا تھا کہ کسی اور کام کے لئے پس منظر تیار کیا جا رہا ہو۔ ؟

متذکرہ بالا مینٹنگ کے بعد ہماری اندرونی مینٹنگ مستعد ہوئی جس میں پروفیسر وانی کے ساتھ گفت و شنید کی روشنی میں ہم نے اپنی حکمت عملی پر نظر ثانی کی۔ اب تک بیسیوں جمیٹوں کی طرف سے ہزاروں گھروں کی چپ چاپ تلاشی لی جا چکی تھی۔ اس قدر سخت تلاشی پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اچھی خاصی تعداد میں دہشت گردوں نے خود کو سرنگھڑ میں ہی پھنسا ہوا پایا۔ اچانک اور سخت کرفیو کی وجہ سے سرنگھڑ سے نکل کر چھوٹے چھوٹے قصبوں اور دیہات تک پھیل جانے کا ان کا منصوبہ مکمل طور پر چوڑھٹ ہو کر رہ گیا جہاں ہم نے شوکت بخشی جیسے نصف درجن دہشت گردوں کو گرفتار کر کے نمایاں کامیابی حاصل کی وہاں ہم اس معاملے میں ملوث اغوا کاروں تک نہیں پہنچ سکے۔ قسمت نے ہمارا ساتھ نہیں دیا۔ ایک مرحلے پر ہمیں معلوم ہوا کہ تلاشی گرانڈی بیسیوں نے غصے چند گز کے فاصلے سے اس احاطے کو کھود دیا۔

ہم صبح سہ بجے تک اپنی بات چیت مکمل کر سکے۔ ابھی تین گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے کہ دہلی اور وائس چانسلر کے گھر سے ہمیں ٹیلیفون موصول ہونے لگے۔ یہ نیویارک سے پی ٹی آئی کی اطلاع پر مینٹا ٹر آف انڈیا میں شائع ایک خبر کے بارے میں تھے کہ امان اللہ خان نے اقوام متحدہ صدر مقام پراک پر پریس کانفرنس میں اعلان کیا ہے کہ کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر شریانی، ایچ ایم ٹی کے صدر لشیجرا اخیال کیشر اور دیگر دو افراد کو قتل کر دیا گیا۔ امان اللہ خان نے طریقہ قتل عمومی مارکر ہلاک کیا جانا، بیان کیا۔

یہ خبر نہایت چسپا سرا مٹی کی طرح ممکن ہو سکتا تھا کہ امان اللہ واپس لے کر اعلان کر دے کہ ریغزال ہلاک ہو چکے ہیں جبکہ حقیقت میں وہ زندہ تھے؟ یا یہ امان اللہ خان کا اپنے حمایتیوں کو بتانے کا انداز تھا کہ

وہ انہیں ہلاک کر دیں، پروفیسر واتی نے پروفیسر حق اور غنی کے افراد کنبہ کے سامنے یہ بات کہنا لازمی کیوں سمجھا کہ حکومت جو کچھ بھی کر رہی ہے وافر نہیں ہے کیا وہ خود یا اس کے ذریعے کوئی دیگر فرد دعویٰ غنی و غصے کی دھار کو کنٹرول کرنے میں کوشاں تھا تو اس ہلاکت کے نتیجے میں جو کتنی ہی ڈیگیا ان سفاکانہ ہلاکتوں کے ارتکاب کے لئے کوئی جواز تیار کیا جا رہا تھا۔ ۹

جلد چلے بات واضح ہو گئی کہ خویبان کی ہلاکت کا فیصلہ انٹر سروس ایٹلی جنس کے بریگیڈیئر اسٹیڈ اور بارہمولہ گورنمنٹ کالج کے ایک عارضی پیکر اور پروفیسر اشرف صراف کے نام سے چھوڑ دیا اور سر جیو کر کے ہلاکت کا جاپکا تھا۔ اور جسے اس چانسلسر پروفیسر اشرفی کے ساتھ ذاتی عناد تھا انے ملکر کیا تھا۔ پروفیسر صراف نے اس معاملے میں ناپاک کردار ادا کیا۔ اس سلسلے میں ۲۰ اپریل ۱۹۹۰ء کو جے کے ایل ایف کے صدر دفتر راولپنڈی سے جاری ایک پریس نوٹ میں امان اللہ خان کے بیان کی ایک منقول وضاحت کی گئی تھی۔ اس میں کہا گیا تھا۔

”ہمیں مجاہدین آزادی اور ہمارے ہی خواہوں کی طرف سے ہماری تعداد میں پیغام ٹیلی فون کال اور خطوط حاصل ہوئے ہیں جن میں کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر مشیر الملقی اور عبدالغنی کے اغوا اور ہلاکت پر رنج کا اظہار کیا گیا ہے۔ ہماری توقع اس امر پر بھی دلائی گئی ہے کہ عبدالغنی سرزمین کشمیر کا ہی ایک فرزند تھا اور جب اس کے والد کو اپنے بیٹے کی ہلاکت کے بارے میں معلوم ہوا تو وہ صدمے سے ہی جیل بسا۔ ہمارے دوستوں اور ہی خواہوں نے بھی بیان کیا ہے کہ جے کے ایل ایف کو ایک دہشت گرد تنظیم قرار دینے کے لئے اس ہلاکت کا استعمال کیا گیا ہے اور امان اللہ خان کے خلاف دشنام طرازی کی ایک مہم شروع کی گئی ہے۔

ہم اس کا رد وائی میں شرکت کرنے کے لئے ’اشرف صراف اور شفیع کی اس یقین دہانی پر آسودہ ہوئے کہ برطانوی لوگوں کی ذراک نہیں پیونجائی جائے گی۔ . . . جے کے ایل ایف کو ان برطانویوں کی ہلاکت پر مکمل حیرت ہوئی ہے جو کہ طے شدہ معاہدے کی مکمل خلاف ورزی تھی۔ تحقیقات کرنے پر ہمیں معلوم ہوا کہ بریگیڈیئر امتیاز نے خود بخود امان اللہ خان کا نام استعمال کیا ہے اور اشرف صراف اور شفیع کے ذریعے مجاہدین آزادی کو خویبان کی ہلاکت کے لئے ہدایت ارسال کی ہیں۔ ساتھ ہی بریگیڈیئر امتیاز نے خویبارک میں ایک پاکستانی سفارتکار کے ذریعے امان اللہ خان کو اطلاع دی کہ مجاہدین آزادی نے اس کے پروفیسر اشرف صراف اور شفیع کے ساتھ مشورہ کے بغیر ہی خویبان کو ہلاک کر دیا ہے۔“

اس معاملے کے متعلق نے ایک مرتبہ ثبوت کر دیا کہ یہ ایک عجیب جکر دیوتا اور ہمارا مقابلہ ایک سنگدل دشمن کے ساتھ تھا اور جو خدمت اسلام کی آڑ میں ایک بہت بڑا پیر و کار اسلام کو ہلاک کرنے سے بھی گریز نہیں کریگا۔ اور واقعی ہمارے پاس کوئی ایسی راستہ نہیں رہ گیا تھا اگر وہیں حق، غنی اور کچھ جیسے معصوم افراد کے مزید قتل و ہلاکت کو روکنا

ہے تو ہمیں انتھک دباؤ برقرار رکھنا ہوگا۔

وادی میں دہشت گردی کی کڑوڑ نے کامیاب سے پاس بہترین موقع تھا۔ تقریباً تمام چوٹی کے دہشت گردوں کو کوئے میں لگا یا جا چکا تھا مگر پیر وینگنڈہ مہم کے سیف الدین سوز جیسے ڈھنڈو پرچیوں نے مسلسل میرا لگو دیا یا ہوا تھا۔ انہوں نے کئی نافرمانیوں اور جبری طرح سے ساثرہ علاقوں میں گھر گھر تلاشی کرنے کے سیرے فیصلے کو مسخ کر کے پیش کیا ضرورت مندوں کو خوراک کے مفت پیکٹ تقسیم کرنے اور مقامی پولیس تھانوں کے ذریعے اشد بیماریوں کو پستالوں تک پہنچانے اور کفریہ پاس جاری کرنے کے انتظامات موجود تھے مگر متعلق کی پروا کس کو تھی؟ مفتی نے گھنٹے ٹیک دیے۔ اس نے پارلیمنٹ میں اعلان کر دیا کہ گورنرسے کہا جا رہا ہے کہ وہ یا تو کفریہ ہٹالے یا اس میں ذہیل دے۔ جیسا کہ عدالت نے کفریہ میں اس ذہیل کی مدت کو دہشت گردوں نے منتشر ہو جانے اور یہاں تک کہ شہر سے کھسک جانے کے لئے استعمال میں لایا۔

کوئی بھی ہلاکت استعد پر گناہ، سفاکانہ اور بزدلانہ اور ساتھ ہی بے سختی نہیں ہو سکتی۔ یعنی ان تین خویبان کی تھی جن کے کنبہ کو تلو اور یہی خواہاں کو مسلسل چار دنوں تک ناقابل مرواقت امید دم اور اذیت کی حالت میں رہنا پڑا۔ اور ہمارے پاس صرف ایک ہی چارہ تھا کہ متاثر کنبہوں کے لواحقین کی ذرا سی امداد کر سکتے تھے۔ اس سلسلے میں ہمارا انداز فکر ان خطوط سے عیاں تھا جو ہم نے تین بیواؤں کو تحریر کئے۔ اس قسم کا ایک خط جو عبدالغنی زردگر کی بیوہ کو لکھا گیا وہ خود کسی وضاحت کا محتاج نہیں۔ خلافت مند رجحان پر ہے۔

راج بھون
سرینگر

عزیزی محنت و حافظہ بیگم

جیسا کہ میں اپنے مامی پیغام میں کہہ چکا ہوں کہ آپ کے شریف النفس شوہر کے بے رحمانہ اور غیر انسانی قتل سے تمام ملک میں رنج و غم کی ایک لہر پھیل چکی ہے۔ تمام قوم نے اس کی مذمت کی ہے اور آپ کے غم میں شامل ہے یہ سمجھنا کسی کے بس سے باہر ہے کہ اس بے رحمانہ قتل سے دہشت گردوں کو کیا حاصل ہوا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ قاتلوں کو جلد ہی اس کا جواب دینا پڑے گا۔ اغوا کے ان ایام کے دوران ایڈمنسٹریشن میں شامل ہم لوگوں نے اغوا کاروں کو ڈھونڈنے کی بھرپور کوشش کی چار دنوں کے دوران ہزاروں گھروں کی تلاشی لی گئی مگر محنت کو شاید کچھ اور ہی منظور تھا۔

مجھے مکمل احساس ہے کہ خواہ کتنی راحت کی رقم ملے اس سے آپ کے اور دیگر افراد کنبہ کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ بلاشبہ یہ نقصان ناقابل تلافی ہے مگر ۲ لاکھ روپے کی رقم درستی حکومت کی طرف سے ایک لاکھ اور یونیورسٹی کی طرف سے ایک لاکھ اور آپ کے بیٹے محمد انیس زردگر کی شبیہ بائو کیمسٹری میں بطور ریکچرر تقرری اس کنبے کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔

میں ایک مرتبہ پھر دل کی عقیق گہرائیوں سے انوکس کا اقبال کرتا ہوں اور رخصت روح کے لئے دعائے مغفرت کرتا ہوں۔

”آپ کا صادق
(دستخط) جگموہن“

کھیترا معاملے کا حل

ایچ ایل کھیترا جنرل منجرا پنچ ایم ٹی کے اغوا اور ہلاکت کے راز کو بھی جلد ہی حل کر دیا گیا اگر گرفتاریوں اور تفتیش سے معلوم ہو کہ مرکزی اداروں کے ملازمین عام کے درمیان دہشت پھیلانے کے ناپاک منصوبے کے تحت ایچ ایل کھیترا کو اغوا کر کے ہلاک کرنے کا سازش تیار کی گئی۔

سائبرینوں کا تعلق کشمیر سٹوڈنٹس لبریشن فرنٹ کے ساتھ تھا جنہوں نے کھیترا کی کاررواہ اپریل ۱۹۹۰ء کو صبح ۳۰ بجے قمر واڑی چوک سے اغوا کیا۔ بلاشبہ انکوں نے ایس پیار دہشت گرد کار میں گھس گئے اور انہوں نے ڈیڑھ ایک طرف دھکیل دیا۔ ان میں سے ایک نے ڈیڑھ ایک طرف دھکیل دیا۔ دو پھلی نشست پر کھیترا کو درمیان میں لے کر بیٹھ گئے اور ایک اور شخص ڈرائیور اور غیر مسلح سیکورٹی مین کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اغوا شدہ کار کو وہ بنالو کی طرف لے گئے جہاں انہوں نے ڈرائیور اور سیکورٹی مین اتار دیادہ کار کو آگے باغ کی طرف لے گئے جہاں انہوں نے کھیترا کو یہ حال رکھنے کے لئے غلام محمد بوٹ کے مکان کا انتظام کیا تھا۔

۷ اپریل ۱۹۹۰ء کو کھیترا کو غلام محمد ڈار کے مکان میں منتقل کیا گیا جو مادھوپورہ قلعہ سرنگرم میں ایک دوکاندار تھا۔ ۸ اپریل ۱۹۹۰ء کو اسے دوبارہ آگے باغ میں جی۔ ایم بھٹ کے مکان میں لایا گیا جہاں سے اسے ماروتی وین میں مجید باغ میں ایک مکان میں منتقل کیا گیا۔ تیسری کھیترا کا وہ اسی ماروتی وین میں ڈال کر کھیترا کو بوٹ ماویں جاکر ہلاک کر دیا گیا۔ اس کی لاش فائبرسٹیشن کی عمارت کے پاس برآمد ہوئی۔

کھیترا کے بارے میں ہیں ہم پیغام تک بھی نہیں ملا۔ شاید اس کی ہلاکت کا فیصلہ اسی روز کر دیا گیا تھا کہ جب اسے اغوا کیا گیا تھا۔ اس کے معاملے کی یہودی بھی شد و مد سے کی گئی۔ ہزاروں کی تعداد میں گھول کی تلاشی لی گئی۔ ہم نے ایک سابقہ وزیر کے گھر کی تلاشی تک لینے سے گریز نہیں کیا کیونکہ ہمیں اس امر کی مصدقہ معلوم ہونے والی اطلاع موصول ہوئی تھی کہ موہان کو شاید وہاں رکھا گیا ہو۔ لازمی نہیں کہ وہ سازش میں شریک ہو بلکہ اس نے خوف کے مارے ایسا کیا ہو۔

شالہ کا معاملہ

ایک اور اہم معاملہ پولیس انسپکٹر ایل شالہ کی ہلاکت کا تھا، اسے بھی حل کر دیا گیا اس جرم کے بیڑن سے جہاں ہو اگر ذاتی عناد اور اندرونی تحریک اور مسکری بنیاد پر کسی نے ملکہ کس طرح ملی جگت قائم کر لی تھی۔

جنوری ۱۹۹۰ء میں ایک سخت جان دہشت گرد رفیق کو بارڈر سیکورٹی فورس نے گرفتار کیا اسے مقامی پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ نظر بندی کے دوران شالہ نے اس کی تفتیش کی بعد ازاں اسے رہا کر دیا گیا۔

یلم ٹی ۱۹۹۰ء کو شالہ ہندو واڑہ سے بارہولہ کے لئے ایک بس میں بیٹھا۔ ایک کانٹیل جیبب اللہ اسے رخصت کرنے کے لئے آیا۔ اس وقت ہندو واڑہ کا ایک باشندہ غلام محمد بس کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اس نے قریب کی ایک دوکان سے ایک شخص عبد اللہ کو آواز دی۔ اس نے اپنے پھر ن میں اسے کے ہم راغل جیپ لکھتی تھی۔ غلام محمد نے عبد اللہ کے جسم کو چھوا تا کہ اسے یقین ہو جائے کہ اس کے پاس ہتھیار موجود ہے۔ بس کے کنڈیکٹر نے یہ تمام منظر دیکھا۔ دس منٹ چلنے کے بعد بس ٹک گئی۔ اس میں تین افراد یوسف رفیق اور ریاض سوار ہوئے۔ وہ بھی بیہوشان گاؤں کے باشندے تھے۔ چند منٹ کے بعد بس دوبارہ ٹکی ان تین افراد میں سے ایک شخص رفیق نے پستول نکال کر شالہ کو اپنے ہاتھ پر اٹھانے کو کہا۔ اسے بس سے گھسیٹ کر باہر لایا گیا غلام محمد عبد اللہ یوسف اور ریاض بھی اتر گئے۔ شالہ کو نہایت انسانیت سوز طریقے سے اڈیشن دی گئیں اور اس کے بعد گول مار کر ہلاک کر دیا گیا۔

دیگر معاملات

میں نے خود کو پانچ معاملات تک ہی محدود رکھا ہے اور سازش کے عام طرز عمل میں ہر معاملے کی اپنی ہیئت اور اہمیت ہے۔ ایک کا تعلق سیاسی شخصیت مفتی محمد سعید حکمہ اطلاعات کے ایک اہم اہلکار رسکول تیسٹرا ایک یونیورسٹی کا سربراہ "مشیر الحق اور چوڑا ایک مرکزی ادارے کا سربراہ ایچ ایل کھیترا اور پانچویں پولیس انسپکٹر شالہ سے تھا دیگر اہم معاملات میں تھے جن میں چار آئی این افسروں کا قتل شامل تھا یہ معاملے بھی حل کر گئے۔ ان معاملوں کے سمجھانے سے عوامی ذہن پر بھاری اثر پڑا۔ ہر ایک شخص پر یہ واضح ہو گیا کہ اب کوئی بھی شخص جرم کے ارتکاب یا اس میں سرگرم شرکت کے بعد بچ کر نہیں نکل سکتا ہے۔ ان معاملات کے حل میں ایک سینئر آئی بی افسر اور آئی بی اے ایف اور ایڈیشنل ڈائریکٹر (کوآرڈینیشن) اشوک پٹیل نے نمایاں کردار ادا کیا، تفتیشی جہارت اور فحش کی وجہ سے اس کا نام سنہری حروف میں لکھے جانے کا مستحق ہے۔

مرکزی تفتیش بیورو

اس بات کو یقینی بنانے کے لئے کہ تفتیشات کا کام محنت اور سرعت کے ساتھ مکمل ہو اور عدالتوں میں استغاثات پیش کئے جائیں میں نے ان تمام معاملات کو سی بی آئی کے سپرد کر دیا۔ اس کا بھی مثالی اثر ہوا۔ اس سے قبل ریاستی حکومت ایسے معاملات میں سی بی آئی کی دخل اندازی قطعی پسند نہیں کرتی تھی۔ ان کا اپنا ہی کھڑا کیا ہوا دفعہ ۳۷۰ انہیں ہمیشہ ڈراتا رہا۔ ریاست کی اپنی تفتیشی مشینری اس قدر ناکارہ ہو چکی تھی کہ کسی کو اس سے کوئی خوف یا ڈر نہیں رہا تھا۔

نامزد عدالت

دہشت گرد اور تخریب کار گردگی ایکٹ کے تحت میں نے صرف ایک ہی عدالت نامزد کی اور اس کا صدر مقام جہول میں قائم کیا۔ میں نے یہ اقدام اپنے قریب اہم باتوں کو پیش نظر رکھ کر اٹھایا اس امر کے علاوہ کہ کام کاج کی مقدار سے ایک ہی عدالت قائم کئے جانے کا توازن موجود تھا۔ سرینگر کے پراگندہ ماقول میں ایسی عدالت کا موثر طریقہ کام کاج ممکن نہ تھا۔ عوامی جہول قائم کر کے جائے سماعت کے باہر دھکم دھبے جاسکتے تھے مزید برآں دہشت سے متعلق جرائم کے تمام ملزمان جو جہول ڈویژن کی ریاست میں رکھا گیا تھا۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر ملزمان کے دفاع کے لئے کوئی وکیل سرینگر یا کسی دوسری جگہ سے آنا چاہے تو اسے حکومتی سرکٹ ہاؤس یا ریسیڈ ہاؤس میں رہائش کی سہولیات مل سکتی ہیں۔

سیکرٹریٹ کی منتقلی

اپریل کے وسط میں ایک عظیم چیلنج کا سامنا مجھے درپیش تھا۔ وہ تھا دربار محکمہ (DURBAR MOVIE) کے نام سے مقبول عمل جس کے تحت ریاستی سیکرٹریٹ کو منتقل کرنا تھا۔ عام طریقہ عمل کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے سیکرٹریٹ دارالحکومت کوئٹہ کے پہلے پتے میں جہول سے سرینگر منتقل کیا جاتا ہے۔ وادی کے اس وقت کے حالات کے مطابق یہ کام الگ الگ ناممکن معلوم ہوتا تھا۔ اہلکاروں کو انڈیا کی دھمکیاں دی گئی تھیں۔ چند دہشت گرد بغلیوں نے مسلمان بھی کیا تھا کہ وہ سیکرٹریٹ کو سرینگر میں کام کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ مرکزی یا ریاستی اقتدار سرینگر میں منتقل ہو۔

ریاستی سیکرٹریٹ کے ہندو ملازمین اور گوجر طبقوں سے تعلق رکھنے والے چند مسلم ملازمین نے بھی اس منتقلی کی مخالفت کی۔ ان کا خیال تھا کہ وادی میں وہ غیر محفوظ ہونگے چند مقامی ایڈیٹروں کی حمایت بھی انہیں حاصل تھی۔ دوسری طرف سیکرٹریٹ کے کشمیری مسلم ملازمین جلد از جلد منتقلی کے متنبی تھے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ جہول میں وہ غیر محفوظ تھے۔ انہوں نے دھمکی دی کہ اگر سیکرٹریٹ منتقل نہیں بھی ہوا تو وہ سرینگر چلے جائیں گے۔

چوٹی کے چند ملازمین کی طرف سے جہول میں گومانی سیکرٹریٹ قائم کرنے کی غیر رسمی تجویز نے اس معاملے میں مزید پیچیدگی پیدا کر دی اس کا مقصد یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں ہندو ملازمین کو جہول میں رکھا جائے اس تجویز کو منظور کرنے کے لئے غیر پردہ باؤ ڈالا جانے لگا۔ اختیارات میں خبریں بھی شائع کروائی گئیں۔

اس معاملے کے بنیادی پہلوؤں کے بارے میں میرا ذہن بالکل صاف تھا میں معمول کی روایت سے کوئی انحراف نہیں چاہتا تھا۔ اس سے نفسیاتی اور جذباتی مسائل پیدا ہو سکتے تھے۔ میری رائے میں جہول میں گومانی سیکرٹریٹ کو قائم کرنا ہندو ملازمین کے لئے جہول میں ہندو سیکرٹریٹ اور مسلم ملازمین کے لئے سرینگر میں مسلم سیکرٹریٹ

کے چناؤ کے مترادف ہو گا۔ دارالحکومت کو منتقل نہ کرنا یا معاملے میں تاخیر حکومت کی اتحادی کا احساس دلانے کے برعکس۔ جموئی طرز عمل کے برعکس ہوگی۔ اور منتقلی میں تاخیر اور یہی نقصان دہ ثابت ہوگی۔

میں نے اس معاملے میں پہل اپنے ہاتھ میں لی اور منتقلی کا ایک مفصل منصوبہ تیار کیا۔ اس معاملے میں درپیش اصولوں کے بارے میں میں نے ۱۵ اپریل کو بیان جاری کر کے وضاحت کی میں تمام لوگوں سے پیل کی کچھ صیغہ کام کرنے دیا جائے میں نے انہیں بتایا کہ قلیل مدتی فائدوں کے لئے ہمیں قومی نفسیات کو ترک نہیں پہنچانا ہے۔ میں نے عوام کو خاص طور پر ملازمین کو یاد دلایا کہ صورت حال کس قدر بہتر ہو چکی ہے۔ اسے کول اور پروفیسر مشیر الحق جیسے لوگوں کے قتل کے گناؤں سے جرائم کا سراغ کس طور پر لگایا جا چکا ہے اور کس طرح یہ قاتل اپنے گناؤں سے جرائم کے نتائج بھاگتے ہیں۔ میں نے زور دیا کہ دارالحکومت کو سرینگر منتقل کرنے سے حالات مزید بہتر ہونگے۔ اس سے تخریب کاروں کے گرتے ہوئے حوصلوں میں ان کی افادیت کم ہوگی۔ اس سے ہر کسی کو معلوم ہو گا کہ حالات پر ہمارا قبضہ ہے اور ہم جیسے کسی کو سینگ سے پکڑنے کے لئے تیار ہیں۔ میں نے عوام کے محبت الوطنہ جذبات کے نام پر اپریل کی کوہ ذاتی آرام کی مسلمانوں سے اور انہیں میں نے عوام کو یقین دلایا کہ ان کی حفاظت کے مکمل انتظامات کئے جائیں گے اور جو لوگ اپنے اراکد کفر کو جہول میں چھوڑ جانا چاہتے ہیں انہیں اپنے کالوں کو بلا کر ایہ بحال رکھنے کی اجازت ہوگی اور سرینگر میں انہیں ہتھل کی مانند رہائش فراہم کی جائے گی۔

میری اپیل کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ معمولی سے نمٹنے کے بعد جہول کے ہندو اور گوجر مسلم ملازمین منتقل ہونا مان گئے۔ گومانی سیکرٹریٹ قائم کرنے کا مجوزہ اقدام ترک کر دیا گیا۔ مجھے اطلاع ملی کہ چند مسلمانین نے کہل کے ہم جگہ میں دارالحکومت کی خاطر منتقل ہو رہے ہیں۔ جہول کے ملازمین کی طرف سے منتقل ہونے کے فیصلے ان کے لئے میرے دل کے اندر ہی اندر عزت کا مقام بھی بنادیا۔ انہوں نے بے آرائی برداشت کرنا منظور کر لیا ہے انہوں نے اپنے افراد کنبہ سے الگ رہنا تسلیم کر لیا ہے اور ریاست بھر میں قومی قوت ارادی کا مظاہرہ کرنے کی خاطر انہوں نے اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنا منظور کر لیا ہے میں نے سوچا کہ قوم جہول کے تئیں غیر ممنون رہی ہے اور اس کے ساتھ اس نے انصاف کیا ہے

اس بیان میں گمراہ گواہوں کی سبکی میں نے اپیل کی کہ وہ ہندو کی سیاست کو ترک کر دیں جس نے صورتحال کو وحشیانہ رنگ دے دیا ہے اور وادی کے عکس کو مسخ کر دیا ہے۔ اس طرح سماجی و اقتصادی مصائب پیدا ہوئے ہیں میں نے یہ وعدہ کیا کہ جو لوگ رضا کا طور پر اس سیاست کو ترک کر دیں گے ان کے ساتھ ہمدردی اور انسان دوستی کا سلوک ہوگا میں نے ایک مرتبہ پھر اپیل کی۔

آئیے ہم مفکر انتقامیہ کی تعریف کر کے اسے حق طاقت بخشیں اقتصادیات کو بحال کر کے اسے نئی قوت ادا کریں۔ سماج کو جاننے کو دوبارہ جن کراس کی خدمت کریں۔ ہمارے بازاروں میں تیار ہی تیار ہوں اور یہ دربار محکمہ مکمل طور پر معمول کے حالات بحال کرنے میں مددگار ثابت ہو۔ میں آپ کو صاف و پاک فکر کا منصفانہ فیچر جانبدارانہ

اور ہمدردی انتظامیہ فراہم کرنے کا وعدہ کرتا ہوں۔

میں نے انتظامات حمید اللہ خان کو تفویض کئے اور ہر تفصیل پر بذاتی طور پر نگاہ رکھی امید ہے جی جان سے کوشش کی اس کی بیماری کبھی کم شخصیت اور حکما دلیہ کی وجہ سے میں اسے مذاق میں فیڈ مارشل کہا کرتا تھا اس موقع پر اس نے واقعی ایسا بن دکھایا۔

منشی کے ایک ہفتہ قبل میں ان تمام ہوشیوں میں گیا جہاں جموں کے ملازمین کو رہائش پذیر ہونا تھا جس روز انہیں منتقل ہونا تھا میں بہت بے قرار تھا کیونکہ مجھے ان کی سلامتی کی فکر تھی خوش قسمتی کی بات ہے کہ ہر کام سہل سے منسوب کے مطابق ہوا۔

رہتی کو دفتر کھل گئے میں خود سیکریٹریٹ گیا اور انفر وڈ کے ساتھ شخصی میٹنگ کی اس سے قبل دن میں نے سیکریٹریٹ اور حکم جات کے سربراہان کو مندرجہ ذیل خط لکھا۔

۱۹۹۰ء

عزیز من

سیکرٹریٹ اور دوسرے دفاتر کی منتقلی کے بعد حالات کو معمول پر لانے کی کوششوں میں ہم ایک اہم مرحلے میں داخل ہو رہے ہیں ہمیں موجودہ جینج کے مقابلہ صبر و تحمل اور بہادری کے ساتھ کرنا ہے۔ سول سروسز کو ایک اہم ذمہ داری نبھانی ہے مجھے یقین ہے کہ آپ میں سے ہر شخص بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرے گا۔

قوم کی اندرونی آغوش صرف مشکلات کے وقت ہی آزمائش سے گذرتی ہے مجھے یقین ہے کہ آپ اس آج کی وقت کا مظاہرہ کریں گے۔ نہ صرف آپ دہشت گرد کی وحشیانہ نظر کا خاتمہ کریں گے بلکہ تعمیر و ترقی کے اس نئے خاکے پر بھی عملدرآمد کریں گے جو میں نے تیار کر لیا ہے اور جسے جلد ہی آپ کے روبرو پیش کروں گا۔

جہاں دہشت گردی کے آسیب اور مرض کی ایک جراح کے صبح اندازہ باتھوں سے ہیں بچتی کرنی پڑے ہاں ہیں اس بان بکھ فراموش نہیں کرنا ہے کہ ہماری حقیقی جنگ مزید پسماندگی اقتصادی اور انتظامی نا انصافیوں کے خلاف ہے ہمیں عوامی شکایات کا ازالہ لازمی طور پر ترقی کے ساتھ کرنا ہے۔

براہ کرم یاد رکھیں کہ ہم کسی پرستہ حاصل کرنے نہیں جا رہے ہیں ہماری تمام ریاست ایک کنبے کی مانند ہے چند بڑوں اور جوگڑہ ہو چکے ہیں انہیں اس کنبے کے دائرے میں لانا ہے اس معاملے میں ہمارا اصولی قول انسان دوستی اور ہمدردی ہونا چاہیے۔

ہمیں ہاتھ ملا کر تمام صوبہ شہر رکھنے والے لوگوں کا تعاون حاصل کرنا ہے تاکہ پاک اور نتائج نما انتظامیہ فراہم کر سکیں یہ عملی صلاحیت اور بہت دوقوں کی آزمائش ہے ہمیں مستقبل کی نہ کہے کہ ہم میں کسی طرح کی روٹی تھی۔

میرا آرزو ہے کہ وہ جس کو دیکھ کر اس کے دل میں امن اور اطمینان ہو سکے اور اس کے دل میں امن اور اطمینان ہو سکے۔

دیں۔

آپ کا صادق

(دستخط) جگموہن

میرا مقصد تھا کہ انفر وڈ کو اعلیٰ میاں تک پہنچا دیا جائے اور ریاست کو دہشت گرد مسائل کے حل کے معاملے میں ان کی اندرونی آغوش کی یاد دلانا کہ انہیں سندھی اور خدمت خلق کے جذبے سے تیار کیا جائے مجھے معلوم تھا کہ ہندوستانی نوکریاں ہیں ان برسوں کے دوران جو دھاری ہو چکا تھا اور دہشت گرد اور دہشت گردوں سے عوامی ہونے روزمرہ کی کارروائیوں کا ذکر ہو چکی تھی ان کے تاریخی کردار کی یاد دہانی کے بغیر ان سے ان کی بہترین صلاحیت کے مطابق کام حاصل کرنا ممکن نہیں ہوگا۔

مجموعی اثر

متذکرہ بالا اقدامات کا مجموعی اثر نمایاں ہو چکا تھا اور اس کے ساتھ ہی تخریب کاروں پر انتھک دباؤ ڈالا گیا تھا اور مئی ۱۹۹۰ء کے پہلے ہفتے تک فیصلہ کن انداز میں بالادستی حاصل کی جا چکی تھی حزب مخالف ہر محاذ پر پسپا ہو رہا تھا اور اس کی حوصلہ شکنی جیتی جا رہی تھی۔

جنوری کے وسط تک ایک تاثر دیا گیا تھا کہ عملی طور پر آزادی حاصل کر لی گئی ہے محض رسمی کارروائی ہی باقی ہے ایک گہری دھند کی مانند بیتاثر گھٹیلے لگاؤ سورج کے نکلنے اور باد صبا کے ساتھ ہر ایک ہو کر غائب ہونے لگتی ہے۔ اگرچہ منظر صاف نہیں تھا مگر روشنی اور امید کی کرنیں واضح طور پر دکھائی دے رہی تھیں گھروں درختوں المپ پوسٹوں پر اب جے کے ایل ایف کا پرچم نہیں لہراتا تھا بازاروں میں اب فوج کے نشان کی نمائش نہیں کی جاتی تھی دیواروں پر اب تخریبی غرے نہیں لکھے جاتے تھے اور نہ دیواروں پر اشتہار دکھائی دیتے تھے دوسری طرف نجی مکانوں کی دیواروں پر جو کچھ بھی لکھا گیا تھا لوگ خود ہی اسے مٹا رہے تھے تھان علاقوں میں گلی کے کونوں سے اکثر اوقات جو گولی باری ہوتی تھی وہ اقتدار اصلی کی نمائش کے بجائے مایوسی کی علامت تھی۔

یہ تاثر پیدا کر کے محض اپنی بیٹھ پر خود قہس کی نہیں دے رہے تھے بلکہ شہر و معروف قومی روزناموں سے بھی جی تاثر حاصل ہوتا ہے۔ ۱۵ مئی کے ماہر ہندو نے لکھا۔

”اس امر کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ وادی کی نفسانیں خاطر خواہ تبدیلی واقع ہوئی ہے اور انتظامیہ موثر طور پر کام کرنے لگا ہے۔ چن ماہ قبل کی حالت کے برعکس اب حکومت کا وجود دکھائی دینے لگا ہے۔ اسے جگموہن کی کامیابی کہنا چاہیے“ اسی روز کے ماہر انڈین ایکسپریس نے لکھا۔

”وادی کی مسجدوں سے اب آزادی کے غرے نہیں گونجتے کہیں بھی اب جے کے ایل ایف اور حزب بجاہدین جیسی تنگیوں کے پرچم دکھائی نہیں دیتے شہر کی دیواروں پر مثبت ان پیکیج کے نام اب مٹا دیئے گئے ہیں۔“

کافی عرصے کے بعد شہر میں زندگی دکھائی دے رہی ہے۔ جس سمیرے پرائیویٹ فری سکول میں جاتے ہوئے ششے ششے طلباء ایک فرستہ خش منظر پیش کرتے ہیں۔ نیم فوجی دستوں کے جواؤں کا مقامی دکانداروں کے ساتھ خوش گپیاں کرنے کا منظر بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔

صورت حال میں بدستری کا ایک اشارہ یہاں سے بھی ملتے ہے کہ کل جماعتی مشاورتی کمیٹی کے اراکین شہر کی طفل اطراف انتہا ناگ اور بدبو لگ جاسکے۔ نائب وزیراعظم دیوئی لال کا بجاری بکر کو قذص میں سابق وزیراعظم راجیو گاندھی شامل تھے۔ اور جس وفد کو دو ماہ قبل وادی کے دورے کے دوران اپنے ہوٹل تک ہی محدود رہنا پڑا تھا اس کے برعکس اب وہاں پر مقامی لوگوں کے ساتھ خوب گفتگو ہو سکتا ہے۔

گورنر جگموہن اعتماد کے ساتھ کہتا ہے ہم حالات کو معمول پر لانے کے قریب تر ہیں۔ کامیابی کے ساتھ دوبارہ موثر سرکاری دارالحکومت کو قبول سے یہاں منتقل کرنا کے بعد اسے کافی اطمینان حاصل ہے اس قدم سے حوصلہ پا کر مرکزی حکومت اپنے کل ۳۳ میں سے ۲۵ دفاتر کو کھولنے کی بابت سوچنے لگی ہے جو اس وقت وادی میں بند ہیں۔

۱۰ انتظامیہ کی طرف سے کئے گئے سخت اقدامات کے باعث گذشتہ سات مہینوں کے دوران ایک کئی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ وادی میں مامور فورسز کی گمان کر رہے فوجی کمانڈروں سمیت سینئر افسروں نے یقین کیا جاتا ہے کہ کل جماعتی ٹیم کے اراکین کو بتا دیا تھا کہ انہیں جگموہن کے ساتھ پوری ہمدردی ہے اور وہ چاہیں گے کہ مرکز گورنر کے کام میں مداخلت نہ کرے ٹیم کے ایک رکن نے کہا۔ وہ اس ہم اور گورنر کی جرأت کے ستائش گویں۔

نیم کا تاخیر تھا کہ گورنر کو اب انتظامیہ پر بہتر جرمور حاصل ہے۔ صلح انساب اس کی بات غور سے سنتے ہیں اس کے احکامات کی تعمیل کرتے ہیں اور ریاستی صدر مقام پر پوچھیں باقی حد کی کے ساتھ اس سال کرتے ہیں۔ اراکین ٹیم نے اس امر کو کئی تبدیلی کا اہم ترین پہلو قرار دیا۔

اس صورت حال نے ان لوگوں کے قسے میاؤں والے دیباچہ و ماقبل وادی میں اس حقیقی صورت حال کے عادی نہیں تھے یہاں اس بات کو یاد دلانا ضروری ہے کہ جب جگموہن نے گورنر کا ہمدردی سنبھالا تو صلح پولیس سربراہ وارنٹ گرفتاری جاری کرنے سے انکار دیتے اور مطلوب افراد کو بھی ترست میں نہیں دیتے تھے۔ وہ بھی دن تھے جب حکومتی ملازم تک بھی ہندو مخالف مظاہرہ میں شامل ہو جاتے تھے۔ یہاں تک کہ ہوٹل محلے کے سینئر اراکین بھی اس کا تجربہ کر سنا مل ہو جاتے جو ہندو مخالف نعرے لگا یا کرتے صورت حال میں اب تبدیلی آ چکی ہے مقتدرہ علاقوں میں تربیت حاصل کرنے کے لئے جانے والوں کے لئے کبھی الوداعی تقاریر کا اہتمام کھلے عام ہوا کرتا۔ مگر اب یہ سب اوراق پار نہیں ہیں۔

ٹیم کو یہ دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ سر جگموہن کے حکومتی دفاتر میں حاضری معمول پر ہے۔ یہ کیف تقریب ۱۳۰ ملازمین کو بوسٹوں میں رہائش فراہم کی گئی ہے اور انہیں دفاتر تک سخت حفاظت جس لایا جاتا ہے۔ مگر قی تو یہ ہے کہ

.....

۱۵ مئی کے شمارے میں سٹیشن نے واضح کیا۔

”اب کسی کو مردوزن داخل ل کا مجمع آزاد کی نعرے لگاتا ہوا نہیں ملتا جیسی کہ قریب ایک ماہ قبل صورت حال تھی۔ مسجدوں کے لاؤڈ سپیکروں سے اب مسلسل ہندو مخالف نعروں کی آوازیں بھی آتی بند ہو چکی ہیں۔ ایک حوصلہ افزا پہلو یہ تھا کہ آٹھ ماہ کے عرصے کے بعد اس دلکش وادی کی بہاحت کے لئے بیسیاؤں کا ایک گروپ بھی وارد ہوا“

معاصر انڈین ایکسپریس نے، مئی کے اپنے شمارے میں لکھا۔

”معلوم ہوتا ہے کہ انتظامیہ نے اپنی گمشدہ انتظامی کو دوبارہ حاصل کر لیا ہے اور عوام میں اس نے اپنی ساکھ بنائی ہے جو اپنی شکایات کے ازالے کے لئے حکام کے پاس آتے ہیں۔ پاکستانی پرچم اور پاکستان نازد لاری نفوش اب دکھائی نہیں دیتے۔ اس قسم کے تاثرات بیٹریٹ ٹاٹ ہندوستان ٹائمز اور دوسرے قومی اور علاقائی روزناموں نے بھی بیان کئے تھے۔

کل جماعتی کمیٹی کے اراکین نے بھی انفرادی طور پر ان تاثرات کو تقویت دی جو اخبارات نے جمع کئے تھے۔ میرے ساتھ اپنی میٹنگ کے دوران انہوں نے کئی تبدیلی کے بارے میں مجھے مبارکباد دی جو اس صورت حال میں لائی گئی ہے۔ انٹیلی جنس بیورو نے بھی اپنی اندازہ کیا تھا۔

بقائے قابل نہیں

ہمارے ماقول کار میں کاروائی، صبح اور وضع روشن مصمت قوت ارادی کا اظہار انتظامی نظام میں قدرت تراز اور شرک تعاون کے علاوہ تخریب کا عناصر ہر پرشدید مسلسل دباؤ زیادہ دیر پا بقاء کے قابل نہیں تھے۔ یہ ہماری قومی قدروں کی عام پیداوار نہیں جس سے دائرہ پھیل پیدا ہوتے ہیں اور بجائے تعمیری ہونے کے تباہ کن ہونے کے قریب لا محدود مصلحت پیدا ہوتی ہے اور مثبتیت کی نسبت منفی رجحانات پیدا ہوتے ہیں۔

اگر دو افراد دو گریسوں پر بیٹھے ہیں اور یہ دونوں گریساں مساوی اونچائی کی ہیں اور اگر ایک شخص اپنی گری کی سطح کو بلند کرنا چاہے تو وہ یہ کام دوطریقوں سے کر سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ اپنی گری کی سطح بلند کرے اور دوسرے اس گری کی گائیڈ کٹ دے جس پر دوسرا شخص بیٹھا ہو۔ موجودہ دور کی ہماری قومی قدریں دوسرے انداز سے کی قدریں ہیں۔ شاہد یہی کوئی شخص دیانتداری اور تندہی سے کوشش کرنے پر آمادہ ہے تاکہ وہ اپنی بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر کے دوسروں کو خوب دکھانے کے لئے وہ دوسروں کو بدنام کرتے ہیں تاکہ وہ مقابلے میں خود کو بہتر دکھا سکیں۔ جہاں کہیں اور جب بھی اچھا اور محسوس کا گیا جاتا ہے حوصلہ شکنی اور نیا دکانے کا یہ عمل فورا شروع ہو جاتا ہے۔ میرے مخالفین نے یہ کام شروع کر دیا۔ انہوں نے یہ کیا کیا آئندہ باب میں اس کا انکشاف ہوگا۔

غلط اطلاعات

اور غلط بیانیوں کا سیلاب

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گذر رہی ہے
فیض احمد فیض

ہمارے ملک کی اخلاقی قدروں میں زوال کی یہ حد ہے کہ جس جمہوریہ نے اپنے قومی نشان پر ستیہ موبھنے (بھائی ہمیشہ کامران ہوتی ہے) نقش کر کے اپنا سفر شروع کیا تھا اب دروغ گوئی، نصف جھوٹ اور من گھڑت باتوں کے ڈھیروں کے نشوونما پارکے ہیں اس عمل کی ایک جھلک جس قدر شیعری میڈیوں کے معاملے سے متعلق ہے وہ میں نے باب سیانہ میں ہم پہنچا دی ہے اس باب میں میں عدل کروں گا کہ کس طرح گرد و پاں کی ننگی پہاڑیوں سے غلط اطلاعات اور غلط بیانیوں کا سیلاب پھوٹ پڑا یہ پہاڑیاں اس لئے ننگی ہوئیں کہ اصول کے ہر درخت کو بے دردی سے اکھاڑ پھینکا گیا یہ سیلاب لاشی کی بھری وادی کو بہا کر لے گیا اور اس نے طعنے بڑھانے کی سیاسی اغیثات کو دل دل بدبو سے آلودہ کر کے اسے براگندہ کر دیا۔

”اس قدر مختصر مدت میں کسی انتظامیہ نے اس قدر خستہ شکستہ مشینری کے ساتھ اور اس قدر آلودہ ماحول میں مقدر حاصل نہیں کیا ہوگا۔“ آخر اپریل ۱۹۹۰ کے دوران سرینگر کے اپنے دوسرے کے دوران ایک سینئر افسر نے مجھے یہ کہہ کر دیا کہ باوجود مجھے کسی کے آخر میں عہدے سے دستبردار ہونا پڑا یہ سب کیسے ہوا۔؟

جیسا کہ گذشتہ باب میں بیان کیا جا چکا ہے کہ کئی کے وسط تک تمام مشہور روزناموں نے صورت حال میں دل افزا بہتری کی بابت اطلاعات فراہم کیں۔ پھر مجھے ایک پندرہ سو اڑے کے بعد دستبردار کر دیا گیا۔

۲۲ مئی ۱۹۹۰ کو کونسلٹنٹ جنرل (ریشٹراڈ) این سی راوے نے اپنے خط میں لکھا:

”آپ اس خط کو پاکر حیران ہو گئے گذشتہ چند ہفتوں کے دوران بہترین نتائج حاصل کرنے پر آپ کو مبارکباد دینے کے لئے میں یہ خط لکھ رہا ہوں۔“

مجھے گوریلا کاروبار کا اچھا خاصہ تجربہ حاصل ہے۔ دو ماہ قبل میری رائے یہ تھی کہ کم کشمیر کو کھو چکے ہیں۔ جب کہ آپ نے گھیرا بندی اور تلاشیوں کا سلسلہ شروع کیا ہے صورت حال بدل چکی ہے۔ اب میں محسوس کرتا ہوں کہ اگرچہ ہم مقامی لوگوں کا دل ابھی کافی عرصے تک نہیں جیت سکتے مگر کم از کم کشمیر کو کھو نہیں سکتے۔ ہندوستان کی غلط میں دوا کرتا ہوں کہ آپ کسی روکاؤٹ یا رخاندازی یا بیرونی دباؤ کے بغیر اپنا کام جاری رکھیں۔ یہ ہندوستان کے حق میں نہیں ہوگا اور نہایت افسوسناک ہوگا کہ آپ نے خود باؤ ڈالا ہے اسے ڈھیل کر دیں میں یہ بھی توقع رکھتا ہوں کہ ہندوستان کی غلط آپ کشمیر ترک نہ کریں۔

ایک مرتبہ پھر میری طرف سے اس نمایاں کام کی میری صدقہ لاند مبارکباد قبول فرمائیں جو آپ کر رہے ہیں حالانکہ آپ اشتعال انگیزی اور دباؤ کے شکار ہیں اس کے باوجود اس خط کے لکھے جانے کے چار دن کے اندر مجھے ریاست سے جانا پڑا۔ ہندوستان نام کے نئے بیورو کے سربراہ ایم کے دھرنے ۲۸ اپریل ۱۹۹۰ کو اپنے ایک ذاتی مراسلے میں کہا: ”میں ان کوششوں کی بلاتامل ستائش کرتا ہوں جو آپ وادی میں قانون کی بحالی کے معاملے میں کر رہے ہیں۔ باوجود اس کے کہ ریاست کے اندر اور بیرونی سرحد پر امن و امن کی صورت گیری اور تکیہ چینی کے آپ شکار ہوئے ہیں آپ کو عوام کی فرسگی کا اثنا حاصل ہے اور آپ کو تخریب کاروں کو الگ تھک کرنا ہے اور وادی کے عوام کی ذہنوں کی حالت کو طرقت و توجہ دینی ہے۔“

پھر اس خبر سگالی کے اس اثنا سے فائدہ کیوں نہیں اٹھانے دیا گیا؟

انڈین سوسائٹی فار سوشل ڈیموکریسی کے صدر اور پورے کشمیر کی قربت پسند ایچ این موٹا نے اپنے ۱۸ اپریل کے خط میں لکھا:

”اگرچہ جماعتی سیاسیات میں مجھے دلچسپی نہیں ہے مگر کشمیر کی صورت حال کے چند اہم پہلوؤں کو دیکھ کر مجھے رنج ہوا ہے جس میں گورنر کے عہدہ پر آپ کی تقرری شامل ہے۔ جیسے چند سیاسی جماعتوں نے نہایت تنگ نظری سے دیکھا ہے ان میں سے کچھ نامور نے ذاتی اغراض کی وجہ سے بدھڑے بندی کی سیاست کے ابھی مرتکب ہو رہے ہیں میرا یہ صدقہ لاند اعتقاد ہے کہ آپ ملک کی غلط ایک غیر کامیاب سرانجام دے رہے ہیں اور ہر محب الوطن ہندوستان اور سرزمین کشمیر کے ہر فرزند پر لازم آتا ہے کہ وہ بدھڑے گردی کی اذیت سے نجات دلائے اور ریاست میں امن و امان بحال کرنے کے معاملے میں آپ کے منصوبوں کی پیشقدمی کے لئے جو بھی امداد وہ ہم پہنچا سکتا ہے وہ پہنچائے۔“

ایسا کیوں تھا کہ ان محب الوطنانہ جذبات کی کوئی قدر نہیں کی گئی؟

ایک غیر جانبدار تبصرہ گرید میٹر نے لکھا: ”کشمیر غلطیوں سے سبق حاصل کریں۔“ میں یوں لکھا: ”پاکستان کے حکمرانوں نے فرض کر لیا تھا کہ راجیو گاندھی اور فاروق عبداللہ کی جوڑی نومبر ۱۹۸۹ کے لوک سبھا انتخابات کے بعد بھی برسرِ اقتدار رہے گی اور پاکستان کو تخریبی حملوں کے انتظام میں تعمیل حاصل کرنے اور وادی پر قبضہ کرنے کے اپنے نصب العین کو حاصل کرنے کی خاطر پورا پورا موقع حاصل رہے گا۔ اور اس کے لئے فوجی طاقت کا استعمال

لازمی نہیں مرکز میں نیشنل فرنٹ حکومت کی طرف سے اقتدار سنبھالنے، فاروق عبداللہ کے استعفیٰ اور جگموجی بن کی گورنر کے طور پر تقرری سے پاکستان میں طویل طور پر رکھنا اٹھا ہے اور کشمیر کے معاملے میں گجرات کے عالم میں اس نے تجزیاتی کاروائیوں میں شدت لائی ہے، اس امید میں کہ کئی حکومت کے باؤں جتنے سے قبل ہی وہ اپنے ناپاک عزائم میں کامیاب ہو جائے گا۔ ان کی امیدوں پر پانی پھر گیا کیونکہ انہیں جگموجی بن کے پہلو کا سامنا ہو چکا تھا۔

تین ماہ کی تکمیل مدت میں عظیم فعال جگموجی بن نے الجھی ہوئی صورت حال کو صاف کر دیا ہے۔ دربار گورنمنٹ جنوں سے سرنگرن منتقل ہو چکی ہے سکول اور کالج کھل چکے ہیں اور حالات معمول پر آنے لگے ہیں۔ مختصر یہ کہ بدترین دور ہمارے پیچھے رہ چکا ہے۔ ملک نے راحت کی سانس لی ہے اس کے بعد ایک ناقابل تشریح واقعہ ہوا جگموجی بن کو ہٹا دیا گیا۔ ایل کے ایڈوائس نے اس کے ہٹائے جانے کو ایک تاریخی غلطی قرار دیا ہے۔ بعض چند ہندوستانیوں کو ہی اس امر سے انکار ہو گا کہ جگموجی بن ایک بہادری اور جرات کا کام کر رہا تھا۔ دہلی اور سرنگرن میں اس کا جبر گورنری نہایت کامیاب رہا تھا۔ اس کے باوجود اس نے اپنی ذاتی آسائش و آرام کو پس پشت ڈال کر اس ضرورت کو پورا کرنے پر فرض شناسی کا ثبوت دیا۔ آخر یہ ناقابل تشریح واقعہ کیوں ہوا؟

مندرجہ بالا تمام سوالات کا جواب موٹے الفاظ میں یہی ہے کہ یہ سب غلط اطلاعات اور غلط بیانیوں کے اٹھا ہوا سیلاب کی وجہ سے ہوا۔

اپنے تمام کے روز اقول سے روز آخر تک نہ صرف مجھے دہشت گردی اور تجرب کاری کے خلاف ایک سنگین جنگ کا سامنا تھا بلکہ اسی قدر خطرناک غلط اطلاعات اور غلط بیانیوں کی جنگ کا سامنا بھی تھا۔ میں اپنے طور پر ڈراما کر حرف پہلی جنگ ہی جیت سکتا تھا دوسری نہیں۔ من گھڑت قصے کہانیوں اور منطوق کی بامخالف اس قدر تند تھی۔

مسلم مخالف کون؟

غلط اطلاعات اور غلط بیانیوں کے موضوع پر بحث کرنے سے قبل آئیے میں مختصر طور پر اس سوال پر بحث کروں کہ مسلم مخالف کون ہے؟ یہ بات بلاشبہ المناک اور تصنع کی موجودہ قدروں کی آئینہ دار ہے کہ جو حقیقی طور پر مسلمانوں کے ہی خواہ ہیں انہیں مسلم مخالف قرار دیا جاتا ہے اور جن لوگوں نے اس طبقے میں خوف و ہراس کی نفسیات پیدا کی ہے وہی اقلیتوں کے تحفظ کے لیے ہمارے میں مذہب کا سیاسی کھیل کھیل رہے ہیں وہ نہ صرف انہیں اپنے مقاصد کے لئے استعمال جو کر رہے ہیں بلکہ ان کی دوستی کے علمبردار ہونے کا دم بھی بھر رہے ہیں۔

اس صدی کے ساتویں سالوں کے اواخر اور شروع سالوں کے اوائل میں دہلی ماسٹر پلان کو رو بہ عمل لانے کے کثیر اور بعد ازاں دہلی ڈیولپمنٹ اتھارٹی کے وائس چیئرمین کے طور پر میں نے تاریخی مقامات کے گرد و پاس میں گندی بستیوں اور جھرمیر میں کو صاف کرنے کی سکیم تیار کی تھی۔ اس کے دو اہم مقاصد تھے اول یہ کہ دارالحکومت کی

کی محنت مند اور پیداواری یونٹوں کا قیام کر کے اپنی صنعت اور کاروبار کو فروغ دے سکیں اور مستقبل میں مبنیادی لوازم کی سہولتوں سے پیداواری میں اضافہ کر سکیں۔

میں نے جیسا کہ ارد گرد بیٹھے افراد کو زیادہ تر ہندو اور سکھ تھے اور جامع مسجد کے بیٹھے افراد کو ہندو مسلم تھے سمجھایا تھا یا کہ وہ ناراضیہ اور روڑی لائن علاقوں میں منتقل ہو جائیں اور وہاں پر پلاٹ حاصل کر لیں جن کے لئے بیماری مالی امداد دی جا رہی ہے اور قسطنطین بھی آسان ہیں۔ مگر جہاں تک جامع مسجد کے مسلمان کا سوال ہے میری افہام و تفہیم کو مسلمانوں کے نام نہاد ہی خواہوں نے تارپیڈ کر دیا۔ اپنے ذاتی اغراض کے لئے انہوں نے اس اسکیم کو فرقہ وارانہ رنگت دی۔

اس کا انجام بھی نے دیکھ لیا۔ آج وہاں پر آباد تمام ہندو اور سکھ اپنے جدید ادارے قائم کر کے ترقی پسند اور جدید بن چکے ہیں اور دارالحکومت میں ان کے پاس لاکھوں روپیوں کی جائیداد ہے۔ وہ صاف متحرک ماحول میں کام کر رہے ہیں جہاں ان کے بعد ان کے بچوں کے لئے پر یقین مستقبل ہے جبکہ جامع مسجد کے ارد گرد کے مسلمان ابھی تک گندی بستیوں میں ٹھونسے ہوئے ہیں جہاں ان کی حالت دن بدن ابتر ہوتی جا رہی ہے اور وہاں نہ ان کے لئے اور ان کے بچوں کو تھلاؤں اور ٹراسوں کے لئے بہتری کی کوئی امید ہے جن کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس صورت میں مسلم مخالف کون ہے؟ وہ جس نے گندگی، بیماری کے دائروں سے باہر انہیں ترقی اور

خوشحالی کی زندگی حاصل کرنے کے لئے ایک موقع فراہم کیا یا وہ جنہوں نے انہیں رجعت پسند طاقتوں کا غلام رکھا؟ وہ شخص جس نے گندی بستیوں کے باشندوں کا اقتصادی اور سماجی بچھتی کٹھن کے مجموعی ڈھانچے میں آسائش گن بنا نا چاہا یا وہ جنہوں نے ہندو مسلمان کے طور پر ہی سوچا اور انہیں یہودیوں جیسی بستیوں میں مقیم رکھنا چاہا؟

غلط بیانیوں کا سیلاب اور اس کے منبع

غلط اطلاعات کی طغیانی ایک منبع سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ اس کے مختلف منبع تھے۔ اس سیلاب کا اہم منبع راجپوت گاندھی اور اُسے کے حواری تھے۔ بعد ازاں ایک اور منبع جارج فرنانڈس اور اس کے رفقاء شامل ہو گئے اور اس غاس سیلاب کی شدت میں اضافہ کیا۔ اس کے علاوہ ایک منبع یہ تھا کہ کشمیر کے معاملے میں مبنیادی حقائق کے بارے میں ناقابل تصور لاعلمی تھی۔ شہاب الدین اور امام عبداللہ بخاری جیسے نکتہ چینوں کے ذاتی تعصب نے بھی اس طغیانی کو بڑھانے میں مدد دی۔

غلط اطلاعات کا زیادہ تر سلسلہ بدینتی پر مبنی تھا اور صرف گٹھڑا گیا تھا۔ حالانکہ جن لوگوں نے یہ الزام تراشی تھے وہ خود بھی ان کی حقیقت سے واقف تھے۔ راجپوت گاندھی اور ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے الزامات بھی اسی گٹھڑے میں آتے ہیں۔

راجپوت گاندھی کے نام کھلا خط

راجپوت گاندھی کے جھوٹے الزامات کا خاص طور پر جو اس نے انتخابی جلسوں میں لگائے تھے سے طیش میں آکر میں نے اسے ایک کھلا خط لکھا جس میں اس کے غلط اطلاعات کے منصوبوں کے مختلف پہلوؤں کو عیاں کیا گیا۔ ۲۱ اپریل ۱۹۹۰ء کو اس کا خلاصہ میں نے اخبارات کے لئے جاری کیا کیونکہ میں نے سوچا کہ ان میں اس خط کو من و عن شائع کرنے کی جگہ نہیں ہوگی۔ مگر اس معاملے کو میری توقعات سے زیادہ توجہ حاصل ہوئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ عوام کا ایک کثیر حصہ میرے خلاف اس خوبصورت پروردہ نالال تھا اور اس نے ان کے دلوں کے تاروں کو کھچ لیا تھا یہ طبقہ اس بات کو جاننے کے بجائے محاکمے کیا کہتا ہے۔

اس خط کے مکمل متن کی بھاری مانگ تھی مگر انفرادی مراسلات کے ذریعے ان مطالبات کو پورا نہیں کیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ میں نے اسے یہاں درج کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میرے پہلے منصوبے کے مطابق اس خط کے لئے یہاں جگہ نہ تھی کیونکہ اس وقت یہ نہیں لکھا گیا تھا۔ چنانچہ اب اس مطالبے کو پورا کرنے کے لئے میں پہلے سو دس میں شامل حقائق کو حذف کر کے اس خط کو شامل کر رہا ہوں۔ ایسا اس لئے کیا جا رہا ہے کہ کسی بات کو دہرانے سے احتراز کیا جاسکے۔ بہر حال پہلے کے ابواب میں دیئے گئے چند نکتے، جن کا تعلق دفعہ ۳۰۰ اور کشمیری پینڈتوں کے ساتھ ہے۔ دو پہلوؤں کو مد نظر رکھ کر برقرار رکھا گیا ہے تاکہ ایک تو خیالات کا تسلسل قائم رہے اور دوسرے راجپوت گاندھی کی طرف سے پھیلائے گئے غلط قصے کہانیوں اور غلط بیانی کو عیاں کیا جاسکے۔

متذکرہ خط کا متن مندرجہ ذیل ہے۔

نئی دہلی

۲۱ اپریل ۱۹۹۱ء

عزیزم شہری راجپوت گاندھی

آپ نے مجھے بخوبی کر دیا ہے کہ یہ کھلا خط میں آپ کے نام لکھوں۔ میں تمام عرصہ اپنے آپ کو جماعتی سیاست سے دور رکھا تھا تاکہ میرے پاس جو ادنیٰ سی صلاحیت ہے اسے تخلیقی اور تعمیری کاموں کے لئے بروئے کار لا سکو۔ یہ کام میں نے ماتا دی شندوری کیپٹلس میں بہتری لاکر سرانجام دیا۔ تاکہ ایک قسم کی ثقافتی اچانک پیدا کی جاسکے جس کے بغیر تیزی سے تباہ ہوتے ہوئے اداروں کی حقانیت ممکن نہیں ہے۔ اس لمحہ مصلحت مٹی کی سیاست کے سبب ان اداروں کا فوادہ حکومت ہوتا تو ان سازیم ہو یا عدلیہ ہو کہ انیک مقصد المناک ہو چکا ہے۔ اور ان سے انصاف اور راستی کی فریج نکال دی گئی ہے۔

بہر حال آپ اور ڈاکٹر فاروق عبداللہ جیسے آپ کے دوست و ادبی کشمیر کے بارے میں قوم کے سامنے غلط تصویر پیش کرنے پر آمادہ ہیں۔ آپ کی جماعت میں غرور و تکبر اور این کے بی سالوے جیسے سینئر افراد میرے خلاف تعصب کا ماحول پیدا کرنے کے لئے پارلیمنٹ کے فوم کا استعمال کر رہے ہیں۔ اول الذکر نے ترکمان گیت کا ہودہ برس پڑانا واقعہ اچھا اور فخر الذاکر کرنے اس پریس انٹرویو کو جو میں نے کسی دیباہ نہیں تاکہ وہ میرے خلاف فرقہ پرست ہونے

کے الزامات کی بوجھاز کر سکیں مٹی شکر رائے بھی چند جبریوں میں اپنے زہر آلودہ تیر چلا رہا ہے۔ بہر کیف میں نے ان تمام غلطیوں اور تیروں کے وار خاموشی سے برداشت کرنا پسند کیا جو غلط بیانی کے سکو خانے سے چھوڑے جا رہے ہیں۔ میں نے محض اخبارات اور رسائل کو خطوط ارسال کر کے غلط بیانیوں کو درست کرنے کی کبھی کبھار کوشش کی۔ میرا ارادہ تھا کہ تدریسی اور تاریخی نوعیت کی کتاب لکھنے پر ہی اکتفا کروں اور میں سمجھتا ہوں کہ قوم اور تاریخ کے تئیں یہ میرا فرض ہے۔ مگر گزشتہ روز ہی میرے چند دوستوں نے راجستھان کے جلسوں میں آپ کی آرام والے اخباری تراشے دکھائے۔ میں نے سوچا کہ اب یہ حد ہو چکی ہے۔ مجھے احساس ہو چکا ہے کہ جب تک میں آپ کی ہر غلط بیانیوں کی پیش بندی نہ کروں آپ اپنی لکشن ہم کردار تک بھر میں میرے بارے میں غلط تاثرات پھیلاتے رہیں گے۔

خطرے کے علامات

کیا مجھے آپ کو یہ یاد دلانے کی ضرورت ہے کہ ۱۹۸۸ء کے اوائل میں ہی میں نے آپ کو کشمیر میں جمع ہو رہے طوفان کے بارے میں خطرے کے علامات کے بارے میں آگاہ کرنا شروع کر دیا تھا مگر نہ تو آپ کے اور نہ ہی آپ کے ارد گردی باب اقتدار کے پاس وقت ارادہ یا نظر تھی کہ ان علامات کو دیکھ سکتے۔ وہ اقتدار و امنخ اور عیاں تھے کہ ان کی نظر اندازی تاریخی نوعیت کی خطاؤں کا منکب ہونا تھی ہو سکتا ہے کہ تسلسل اور حقیقت آپ کے روبرو اوصاف نہ ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ قوی نشان پر کندہ الفاظ ”ستہ میو جینے“ غرض ایسے الفاظ ہوں جن کے کوئی معانی نہیں اور قوم ان کی صحیح سمجھ میں نہ ہونے والا اور راستی کے ذرائع سے منصف اور راست ہندوستان کی تعمیر کے معاملے میں ان کی کوئی اہمیت نہ ہو شاید اقتدار ہی آپ کے لئے سب کچھ ہے۔ یہ اقتدار خواہ کسی ذریعے اور کسی قیمت پر حاصل ہو حقیقت میں میرے آنے سے قبل اور بعد میں رونما حالات کے بارے میں آپ اور آپ کے ہمنوا حقیقت کو الٹ رہے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ۱۹ جنوری ۱۹۹۰ء کو گورنری راج کے نفاذ سے قبل ذہنی طور پر ہتھیار ڈال دیے گئے۔ جس روز (۸ دسمبر ۱۹۸۹ء) ڈاکٹر رومیہ سید کا اغوا ہوا دہشت گردی کے عقاب نے پوری شد و سکتا جھپٹ مار دیا تھا۔ گیارہ ماہ کے عرصے میں تفتہ کے ۱۹۰ واقعات بشمول ۳۵۱ بم دھماکوں کے رونما ہو چکے تھے۔ پھر یکم جنوری ۱۹۹۰ء سے ۱۹ جنوری تک تفتہ کے ۳۱۹ واقعات بشمول ۲۱ مسلح حملے ۱۱۳ بم دھماکے ۱۱۲ کشزدگی کی وارداتیں اور اجتماعی تشدد کے ۷۲ واقعات رونما ہوئے۔

شاید آپ نے کبھی اس بات کو مسلم کرنے کی زحمت گوارہ نہ کی کہ اقتدار کے ڈھلنے پر قریباً تخریب کاروں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ مثال کے طور پر انیشی جنس بیورو کی اطلاع پر شیر احمد شاہ کو تیر ۱۹۸۹ء کو گرفتار کیا گیا، ڈی ٹی کشن سری عمرے اس کی گرفتاری کے وارنٹ پر دستخط کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کے بعد ڈی ٹی کشن اننت ناگ کا بھی یہی رویہ تھا۔ ایڈووکیٹ جنرل اس معاملے میں حکومت کی بیروی کے لئے عدالت میں حاضر نہ ہوا۔ اس نے یہ ذمہ داری

ایڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل اور سرکاری وکیل کے نکلے مڑھنے کی کوشش کی۔ وہ بھی پیش نہیں ہوئے
کیا آپ کو یاد ہے کہ لوک سبھا انتخابات میں ۲۲ نومبر ۱۹۸۹ء کو کیا ہوا ایک طنزیہ پیش کش کے طور پر چند
پولنگ بوتھوں کے نزدیک ٹی وی سیٹ رکھے ہوئے تھے جس پر تختیاں چسپاں تھیں جو کوئی بھی ووٹ ڈالے گا
اسے تحفے کے طور پر لے جاسکتا ہے چند بوتھوں کے نزدیک ایک مختصر عبارت کے ساتھ ٹائوٹ رکھے گئے تھے۔
”جو شخص بھی ووٹ ڈالے گا اُسے یہ ملے گا۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی ایڈمنسٹریشن میں کسی بھی شخص نے اقتدار کی حکم
عدولی کے ان علامات کو ہٹانے کا کوئی اقدام نہیں کیا۔

آئیے میں آپ کو یاد دلاؤں کہ سوپر علام رسول کار کا بانی قصبہ ہے جو اس وقت ایک کابینہ وزیر رہا۔
یہ جیہ مین قانون سار کونسل جیسیب اللہ اور سابقہ فیصل کا نغرض ایم پی اور کابینہ وزیر عبدالاحد وکیل کا بانی
قصبہ ہے۔ اس کے باوجود سوپر قصبے میں صرف پانچ ووٹ ڈالے گئے تھے۔ خیال کیا جاتا تھا کہ پٹن علاقے میں
اس وقت کے کانگریس آئی وزیر افتخار حسین انصاری کا اثر و رسوخ ہے وہاں ایک بھی ووٹ نہیں ڈالا گیا۔ آپ کے
لیڈران اور ان کے ہمنواؤں کی وفاداری اور وفار غرض ہی تھے۔ اس کے باوجود بھی آپ سوچتے تھے کہ تجزیہ اور
دہشت گردی کا مقابلہ سیاسی اور انتظامی آلات کے ذریعے کیا جاسکتا ہے۔

ایسے موقع پر جب مراغہ سائیتری سے معذور پورہ قحی اور پولیس سٹاف کی حوصلہ شکنی ہو رہی تھی درانداز
گہری مزید گہری ہوتی چلی جا رہی تھی، جب اخبارات ٹوپیک جیسے تخریب کارانہ منصوبوں سے متعلق خبریں شائع
کر رہے تھے تو آپ کا قاری ڈاکٹر فاروق عبداللہ یا تو بیرون ممالک جا رہا تھا یا ان ۱۰۰ سخت جان اور انتہائی
تغییر یافتہ دہشت گردوں کو باکرہ رہا تھا جنہیں خطرناک تنبیہا رجائے کی تربیت حاصل تھی پاکستانی مقبوضہ
کشمیر میں جن کے عملی ترین سطح پر رابطے تھے اور جو پاکستان آنے جانے کے تمام پیرچ راستوں سے واقف تھے
اور جن کی نظر بندی کو جیف جسٹس کی ممدارت میں سر رکنی مشاورتی بورڈ نے منظور کر لیا تھا۔ ایک ساتھ
رہائی کے سبب وہ دہشت گردی اور تخریب کاری کے ڈھانچے میں کلیدی رتبے حاصل کرنے کے قابل ہو گئے
اور اس کڑی کو مکمل کرنے کیلئے انہیں دوبارہ پاکستان پہنچا دیا گیا تاکہ وہ ہاکٹوں، اغواؤں اور دہشت گردی کی
دوسری کاروائیوں میں ملوث ہونے کے لئے مزید تہیہ رلا سکیں۔ مثال کے طور پر رہائش گاہ میں سے ایک شخص
گاندربل کا محمد آؤد خان ایک دہشت گرد تنظیم البقر کا ڈپٹی کمانڈر ان چیف بن گیا اور اس نے ۵۰۰ کشمیری
نوجوانوں کو منظم کرنے میں رہبرانہ رول ادا کیا ان تمام گھنٹوں نے جرائم کے لئے کس کو مورد الزام ٹھہرایا جائے تو ان
رہائش گاہوں نے دہشت گردوں نے کئے ہیں اس سوال کی جواب دہی ان لوگوں پر چھوڑتا ہوں جن کے ساتھ آپ جھگڑیں
— کے بارے میں بات کرتے ہیں۔

شہادت کے بل بوتے پر حقیقت تو یہ ہے کہ ۱۹ جنوری ۱۹۹۰ء قبل دہشت گرد عینی حکمران بن بیٹھا تھا
دہشت گردوں کو استعد رتبہ عطا کردی گئی تھی کہ وہ ذہن مغلوب ہو چکا تھا۔ وہ ایک پھل کی مانند سمندر میں تیر سکتا

تھا اگر سمندر کو بہدرازاں گھیر لیا گیا تو اس کی کیا وقت تھی؟

مسلم مخالف ہونے کا الزام

کشمیر میں خطاؤں اور غلط کارروائیوں کے اپنے گناہوں کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش میں بھی عمومی راستے کے طور پر
جو ووٹ بک بیک کر کے عوام کی قسم سے زیادہ حد تک نہیں جاسکتی آپ نے اس عزت اور احترام کو ختم کرنے میں دشمنی جوئی
کا زور لگا دیا جو مسلم نوجوانوں کے دل میں میرے پہلے عہد ملازمت ۲۶ اپریل ۱۹۸۳ء سے ۱۲ جولائی ۱۹۸۹ء تک سرحد
پیدا ہوا تھا تمام مقامی، ناقابل تردید شہادت اور آپ کے اپنے سابقہ اقوال کے برعکس آپ نے مجھے مسلم مخالف
قرار دینا شروع کر دیا۔

ترکمان گیٹ

اپنے عمومی منصوبے کے ایک حصے کے طور پر راجہ بھائیوں آپ کی جماعت کے لیڈر شوشنکر نے ۳۰ مارچ ۱۹۹۰ء کو
ایوان کو بلا دیا اور اپریل ۱۹۹۰ء میں نگران کبٹ کی گندی بیستوں کی صفائی کی کارروائی کے دوران میرا نام نہاد مسلم مخالف رحمان
سکے سامنے نمایاں ہوا تھا نہایت گندی اور نہایت بدخونی کا منسل ہے اور نہ ہی شوشنکر اور نہ ہی آپ کے قوتاریوں
میں اس بات کو محسوس کرنے کی استعداد دیکھی گئی ہے کہ آپ کی آنجنائی ماں اور آنجنائی بھائی پر یہ دافع لگایا جا رہا تھا۔
کسی بھی شخص نے اس بات کے تمیز کی رحمت گوارہ نہیں کی کہ اس معاملے میں ایمر جنسی کے بعد کے دور میں نہایت ہی وسیع
پیمانے پر غلط بیانیوں کا سہارا لیا گیا اور یہ تمام غلط بیانیوں سزا ندر گاندھی اور جسے گاندھی کے خلاف تھیں۔ بسے
اس لئے چاہنا گیا کہ میں نے ”حقیقت کے جزیرے“ سے باہر آنے اور ان کے سر تمام الزام مڑھنے سے انکار کر دیا جیسا
کہ بہت سارے نوکر شاہوں اور آپ کی جماعت کے افراد نے کیا تھا۔

اگر آپ نے میری کتاب ”آئی لینڈ آف ٹروٹھ“ ISLAND OF TRUTH میں باب ترکمان گیٹ کی
انہی کہانیوں کو UNTO THE STORY کی ورق گردانی کی تکلیف گوارہ کی ہوتی ہے آپ کی ماں نے پڑھا تھا اور
انہی کو اپنے منہ سے نکال دیا کہ میں نے کئی بیستوں کی صفائی اور نوآباد کاری پر وجیکٹ کے بارے میں معلومات حاصل
کرنا چاہتے ہیں۔ تو پیکر جانکاری مل جاتی کہ ۱۹۳۸ء میں ہی ترکمان گیٹ علاقے کو انسانی آبادی کے ناقابل قرار
دے دیا گیا تھا۔ بہدرازاں مکانات گر جانے سے آٹھ لاکھ اموات واقع ہو چکی تھیں اور ان مکانات میں رہنے والے
موت کے مسلسل خوف میں رہ رہے تھے۔ ۱۲۰۰۰ مکاتوں کی صفائی کے بعد ۱۰۰۰ متبادل الاٹمنٹ کے لئے مجھے جن میں سے
رجسٹرڈ ہو کر اور شاہدہ کی نہایت دلکش کالونی میں ۲۰۰ فلیٹ شامل تھے۔ آپ کو ۱۹۹۰ء کے واقعہ کی حقیقت
بھی پتہ چلا کہ گندی بندری پروگرام کے بارے میں پھیلائی گئی افواہوں اور دیئے گئے اشتعال کے پیش نظر ضلع حکام
۱۵ مئی ۱۹۹۰ء کو پولیس کی طرف سے کی گئی کارروائی کے نتیجے میں چھ شخص ہلاک ہوئے تھے ان میں سے ایک شخص بھی گندی بندری

کی صفائی سے متاثرہ نہیں تھا اور پانچ شخص دور افتادہ بستیوں سے وہاں آئے ہوئے تھے۔

اس سلسلے میں میں آپ کو یاد دلادوں کہ جب مسز اندرا گاندھی پر مقدمہ چل رہا تھا تو یہ کتاب جسٹس ایم کے جین کی عدالت میں ایک حلیف بیان کے طور پر پیش کی گئی تھی اور کسی شخص نے ایک جوابی حلیف بیان تک دائر کرنے کی جرأت نہیں کی تھی گوکہ ہمیں اس قدر اور خالص حقیقت موجود تھی۔

اتفاق سے کیا آپ جانتے ہیں کہ گمان گیٹ کے گندی بستیوں کے کنکریں اور پڑیوں پر پڑنے والے لاکھ افراد کی ڈوبی لاری میں کسی کے سر پر جمی خراش تک نہیں آئی تھی اور نہ گمان گیٹ کی گندی بستیوں کے مکینوں کا اس آبادی میں، یہ خدا کا تعین نہیں ہے اب صاف گئی جگہ پر یہ غلط فہمی تھی کہ وہاں نہیں گندی بستیوں پر پڑنے والے لوگ ان میں بس چکے ہیں کیا یہ ستم ظریفی نہیں ہے کہ جس نے انہیں جدید شہری سہولیات سے لیس نئی بستیوں فراہم کیں اسے مسلم مخالف قرار دیا جائے۔ اور وہ لوگ جنہوں نے انہیں موت کے جال میں رہنے کے لئے مجبور کیا انہوں نے ان کے سچاؤں کا رول اپنا لیا۔

آپ نے ایشیائی کھیل (ایشیائی) (نومبر ۱۹۸۲ء) منعقد کرنے میں فخر محسوس کیا۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ اگر ۱۹۶۶ء میں صفائی اور ڈوبی لاری کا پروگرام کامیابی سے نہیں چلایا گیا ہوتا تو یہوشیڈیم اندر پرست مشیڈیم اور فٹ بالی اور پلاٹیر کرنے کے طریقوں کی وسعت کا خیال کھڑی کرنے کے لئے پارکنگ اور دوسرے بنیادی لوازم کے لئے کوئی زمین تیار نہ ہوتی کہ میں اس سلسلے میں اپنی کتاب کی بلڈنگ شاہجہاں آباد والڈسٹی آف دہلی میں دی گئی زمین تجاویز کے طرف آپ کی توجہ مبذول کرواؤں پہلی یہ کہ جہاں مسجد اور لال قلعے کے درمیان ایک سبز زمینی گھاس کی چٹی پیدا کی جائے دوسری پارلیمنٹ ہاؤس کا حاسن بھی کیمپس کے ساتھ رابطہ پیدا کرنے کے لئے مرکز تعمیر کی جائے اور تیسری ماتا سندھی روڈ مشیڈیم کیمپس کے دوسرے شاہجہاں آباد قائم کیا جائے تاکہ روایتی اور جدید پس منظر میں شہر کے تمدن کی جھلک حاصل ہو سکے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا اس قسم کی تجاویز کسی مسلم مخالف شخص کی جانب سے مل سکتی ہیں۔

پارلیمنٹ کا فورم

کٹھیری مسلمانوں میں میری افادیت کم کرنے کیلئے آپ اور آپ کے ہمنواؤں نے پارلیمنٹ کے فورم کا کس طرح استعمال کیا ہے وہ اس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ این پی کے سالوے ایم پی نے ۲۵ جنوری ۱۹۹۰ء کو کہا تھا۔

”بھئی کے ہفت روزہ کرنٹ کے اس نام نہاد انٹرویو میں نے کسی دیا ہی نہیں کا سوال دیتے ہوئے سالوے نے نہایت غیر واجب الفاظ کا استعمال کیا۔ یہ اس کی فرقہ وارانہ ذہنیت اور سوچ اور رویے کی علامت تھی چنانچہ وہ (گورنر) دہشت گردوں اور تجویز کاروں کا قلع قمع کرنے کے بارے میں تمام طبقے کو ختم کر رہا تھا۔ اب گورنر نے خود کسی خاص طبقے پر ہنگامہ کو ایک مسکری قرار دے کر اپنی بدیہی نفرت اور ناپسندیدگی کو آواز دے رہا ہے۔

میں سالوے کو جانتا ہوں مگر اسے خود اپنے حال پر چھوڑ دیا جاتا تو وہ یکدم نہیں کرتا۔ واضح ہے کہ اسے دیکھنے کے لئے کسا گیا تھا جو اس کی تربیت اور پس منظر کے برعکس تھا۔ اگر کسی مایہ ناز عہدیدار خاص طور پر سالوے سے

ممتاز مایہ ناز نے اگر جانچ پڑتال کی ہوتی کہ آیا میں نے ہفت روزہ کرنٹ کو انٹرویو دیا ہے کہ نہیں اور اگر دیا ہے تو میرے نام سے تو جہاں منسوب کیا گیا ہے آیا وہ واقعی میں نے دیا ہے۔ حالانکہ اس شمارے کی تاریخ ۲۶ مئی سے ۲ جون تک جس جلد بازی کے ساتھ ۲۵ مئی کو یہ معاملہ اٹھایا گیا اس سے اس جلد بازی کا راز خود ہی کھل جاتا ہے اس انٹرویو کی اساس پر آپ نے خود ہی صدر جمہوریہ تک ایک خط بھیجے کی جلد بازی کی حالانکہ حقیقت میں اس انٹرویو کا وجود ہی نہیں تھا۔ آپ نے وضاحت کی کہ وہی پسنگ نے ایک شدید فرقہ پرست خیالات والے شخص کو گورنر مقرر کیا تھا۔ آپ نے اپنے خط کو ۲۵ مئی کو ہی شائع کروا دیا۔

پتہ نہ کہ آپ کی جماعت کے اراکین نے راجیہ سبھا میں مجھے اپنی بات نہیں کہنے دی حالانکہ مجھے اس موضوع پر بولنے کا موقع بھی حاصل ہوا تھا۔ چنانچہ میرے پاس اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں رہا کہ میں ہفت روزہ کرنٹ کے خلاف ۲۰ لاکھ روپے ہرجاء کا دعویٰ دہلی ہائی کورٹ میں دائر کروں۔ یہ معاملہ طویل عرصے سے چلتا ہے اور کبھی وصول ہونے کی صورت میں پہلے کی موت میں دے سکتا ہوں مگر میں ان تمام لوگوں کا پردہ فاش کرنے میں کوئی دقیقہ درگذاشت نہیں کروں گا جنہوں نے غلط بیانی کے اس ڈرامے میں گندے رول ادا کئے ہیں۔

دفعہ ۳۷۰

آپ نے ۱ مارچ ۱۹۹۰ء کو سرینگر میں کل جماعتی کمیٹی کے دورے پر ہجما کا ٹھکانہ کر دیا تھا اور عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ ۱۹۸۶ء میں میں دفعہ ۳۷۰ کی تیسرے چاہتا تھا۔ اس سنگین موقع پر جب اپنی پشت دیوار کے ساتھ مکانات میں دہشت گردی کی طاقتوں کا مقابلہ کر رہا تھا اور ۲۶ جنوری ۱۹۹۰ء کو تجویز کاروں کے ناپاک منصوبوں کو ناکام بنانے کے بعد جب صورت حال تبدیل ہونے والی تھی تو حقائق کو غلط پس منظر میں پیش کر کے میرے خلاف جہاں جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تھی آپ کا یہ فعل ذمہ داری کا ہے یا غیر ذمہ داری کا میں اس کا فیصلہ خود پر چھوڑتا ہوں۔

اگست ستمبر ۱۹۸۶ء میں حقیقی طور پر جو بات میں نے دہلی کی جگہ کو دفعہ ۳۷۰ کے دل پر بارگراؤں کے سوا کچھ نہیں ہے میرا موقف یہ تھا کہ دفعہ ۳۷۰ کی مخالفت دیوار کی آڑ میں وادی کے عوام کا استعمال کیا گیا ہے اور ضرورت اس بات کی ہے کہ ان پر مسلح پوزیشن کی وضاحت کی جائے۔ اس معاملے میں میں نے متعدد تجاویز پیش کیں جن کے تحت ادارتی دھماچے کی اصلاح اور تنظیم کو مقصود تھی۔ مگر ان تمام باتوں کو نظر انداز کر دیا گیا۔ ایک عظیم موقع سے ہاتھ دھو دیئے گئے۔

بعد ازاں دہلی ہونے والے واقعات نے میرے اس نظریے کو اور بھی تقویت دے دی ہے کہ دفعہ ۳۷۰ اور اس کی سختی پیداوار ایشین جہول کشمیر کو ختم کیا جانا ناگزیر ہے۔ نہ صرف اس لئے کہ قانونی اور آئینی طور پر ایسا کرنا ممکن ہے بلکہ وسیع تر اور زیادہ بنیادی وجوہ کی بنا پر کہ ہماری گذشتہ تاریخ اور عصر نئی زندگی کا یہی تقاضہ ہے

اس دفعہ سے اپنے گئے افراد کی راشی اور چند بری حکومت قائم کرنے میں آسائش ہوتی ہے۔ یہ نوجوانوں کے ذہنوں میں غلط تاثر پیدا کرتی ہے۔ اس دفعہ سے علاقائی تناؤ اور تنازعے پیدا ہوتے ہیں اور مغرور و غرور خود مختاری بھی علی طور پر قابل حصول نہیں۔ کشمیر کی امتیازی شناخت اور تمدن کا اس دفعہ کے بغیر بھی تحفظ ہو سکتا ہے۔ یہ ان سے صورتوں میں سماجی طور پر تبدل راہ ہے جب ایک عورت کسی غیر ریاستی باشندے سے شادی کرتی ہے تو وہ اپنے حقوق سے محروم ہو جاتی ہے اور جو لوگ چالیس برسوں سے ریاست میں سکونت پذیر ہیں انہیں بنیادی انسانی حقوق سے محروم رکھا گیا ہے اور مزید برآں ہندوستان کی حقیقت اور لوازمات اور انکی وسیع اور گونا گوں ہیئت کے موافق نہیں ہے۔ ہندوستان کو آج اس بات کا شعور نہیں ہے کہ انکی اقتدار اعلیٰ والی ریاستیں ہوں جو اس کی امنگوں اور جذبات سے محروم کر کے اسے "ٹھیک کے برتن نما" آدمیوں کے ہاتھوں "کیلا جہوریہ" بنا کر رکھ دیں بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ حقیقت انصاف اور راشی کی قدروں پر مبنی ایک بنیادی اور سماجی ڈھانچہ جمہوری اور انسان دوستی کی بنیادوں پر تعمیر کیا جائے جس کی قدروں پر پاکیزہ صورت اختیار کر کے ایک مضبوط ڈھانچے کی صورت اختیار کریں اور سبھی کو حقیقی جمہوریت اور آزادی فراہم کریں۔ میں یہاں یہ بھی واضح کروں کہ جب دوسری ریاستیں زیادہ تر خود مختاری کا مطالبہ کرتی ہیں ان کا مدعا شناختوں کی علیحدگی نہیں ہے۔ حقیقت میں ان کا مقصد اقتدار کی مرکزیت کو توڑ دینا ہے تاکہ وہ اشتعال اور ترقیاتی کام سرعت رفتار سے سرانجام دے سکیں اور عوامی خدمات میں بہتری پیدا ہو سکے۔ کشمیر میں ۱۹۵۳ء کے بعد چند کمزور کرنے کے اقدامات کے بغیر دفعہ ۳۷۰ کے اپنے تمام تر "تقدیر" کے ساتھ برقرار رکھنے کا جذبہ بھی اور مقصد سے پیدا ہوتا ہے اس کا منبع وہ چالاک حکمت عملی ہے جس کا مقصد کلیدی دھاری سے دھوکہ کر ایک ایسی الگ جاگیر داری قائم کرنا ہے جس کا الگ پریم ہو۔ وزیر اعلیٰ کی بجائے وزیر اعظم ہو اور گورنر کے بجائے صدر ریاست ہو، زیادہ اقتدار اور سرپرستی حاصل کی جائے۔ عوام کی خدمت امن ترقی یا گورنمنٹ میں تمدنی یکجہتی حاصل کرنے کیلئے نہیں بلکہ چند افراد یا نئے شیخوں کے مفادات کو پورا کرنے کے لئے ہے۔

وہ تمام افراد جو وٹ بنکوں کے امین بننے کی اُمنگ لئے ہوئے ہیں مسلسل کہہ رہے ہیں کہ دفعہ ۳۷۰ اس کا اعتماد کا معاملہ ہے مگر وہ اس سے آگے نہیں جاسکتے مگر وہ خود کو یہ سوال نہیں پوچھتے کہ اس اعتماد کے کیا معنی ہیں؟ اس کی معقولیت اور جو انکیا ہے۔ کیا ریاست کو آئین ہند کے مکمل ڈھانچے میں لانے سے اس کے رنگ میں نکھار اور چمک پیدا نہیں ہوگی اور اسے مزید مضبوط اور با مقصد بنانے میں اس سے زیادہ مدد نہیں ملے گی۔ اسی لیے وٹ میں تاریخی تقاضا اور خود مختاری کی باتیں کی جاتی ہیں مگر عملی طور پر ان کے کیا معنی ہیں؟ کیا سیاسی تقاضوں کے یہ سنی میں کہ صرف فض کا خدات پر آپ کشمیر کو ہندوستان میں شامل کریں اور سہاری قیمت ۱۵۱ کریں اور نام ہند اور دوسری طرف طلبا کی کشمیری برڈال کر عملی طور پر آپ اس کو واپس کر دیں۔ آخر خود مختاری اور ۱۹۵۳ء سے قبل اور ۱۹۴۷ء سے قبل پوزیشن کے کیا معنی ہیں کیا اس کی مراد کشمیری لیڈر شپ کا یہ قول نہیں ہے: آپ مجھ

گے اور ہم فریج کریں گے۔ اور اگر میں ایک راشی لا پرواہ چند شخصی نظام قائم کرتا ہوں تو آپ کچھ کہیں سکیں گے اور ہم ہی قسم کے حالات پیدا کر دیں گے کہ علیحدگی کی (ڈیمائل کی) تلوار آپ کے سر پر لٹکتی رہے گی؟

کشمیری پنڈت

آپ اور آپ ایسے لوگوں نے ہندوستان کو ایسا ملک بنا دیا ہے کہ جو انصاف اور راستی کی صلاحیت کھو بیٹھا ہے۔ جو شخص انصاف کرنے کی کوشش کرتا ہے اسے فرقہ پرست قرار دیا جاتا ہے۔ کشمیری پنڈتوں کا معاملہ اس حقیقت کا زندہ و جاوید ثبوت ہے۔

کشمیری پنڈتوں کی تاریخ کی جو کچھ عجیبی انقلابات و تغیر نکلیاں ہوں، قسمت نے جو بھی ناہیاں ہوٹ انکی تاریخ نے ماضی میں انہیں پہنچائی ہوں۔ مگر کچھ موجودہ دور میں انکے ساتھ ہونے والے اس کے مقابلے میں وہ سب پوٹیں خراب ہو چکی ہیں۔ یہ المناک صورت حال اس ستم ظریفی کے ساتھ مزید المناک ہو رہی ہے کہ ملک کے قابل نرم مزاج اور مسافر طبقے کو جدید ہندوستان میں غم کی جا رہا ہے یہ طبقہ قرون وسطیٰ کے سکندر یا سلاطینوں کے ہاتھوں نہیں ہذا افغان گورنر کی استبدادی حکومت کے ہاتھوں نہیں بلکہ آپ اور وی پی سنگھ جیسے لیڈروں کے مصائب کا شکار ہو رہا ہے جس سے سیکرٹری قومی جانا ہے اور دوسرے وہ لوگ جن کے ذاتی اور سیاسی اقتدار کے لئے بے اہولی تلاش کشمیری جمہوریت کی موجودہ زبوں حالی اور ان کی آنکھوں میں جھانکتے ایک خوفناک مستقبل کا ایک علامت کی صورت میں موجود ہے اور ان کے غم و اہمال اور برہنہ کرنے کے لئے کٹی فار انشیلو آج کشمیر کے تین لا پرواہی ادارے ان کے زخم پر نمک چھڑک رہے ہیں۔ زیادہ آواز اور تحسین میں اور جو کوئی بھی اسکے مصائب کی وجہ میں دوس کا ساتھ دینا چاہتا ہے اسے وہ فرقہ پرست قرار دیتے ہیں۔ ایک نرم، سخی، قدامت پسند اور بہت سارے طریقوں سے ظالم ہندوستان کو اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں ایک لاکھ پناہ گزین پیدا کرنے کا امتیاز حاصل ہوا۔ پھر انہیں بے دلی بے روح اور محروم شہروں میں اپنے حال پر چھینے چھڑیے کشمیری پنڈتوں کے ایک طبقے کے زندہ رہنے کے مواقع قریب باندھ دیے۔ علی طور پر یکسر منتشر اور نزوک وہ آج تنہا کھڑے ہیں۔ وہ نا اُمیدی کے ساتھ اپنے پاؤں تلے طوفانی سمندر میں ڈگمگاتی مٹی کی کشتی کو دیکھ رہے ہیں تاکہ وہ محفوظ ساحل تک پہنچ سکیں اور پھر نئے مستقبل میں اپنے پاؤں رکھ سکیں۔

کشمیری پنڈت یا یوں کہنے کو تمام کشمیر جس سنگین بحران سے گذر رہا ہے یہ بحران ہندوستانی قدروں کے اس کے آئینی، سیاسی، سماجی اور اخلاقی اصولوں کو عملی طور پر اٹھا جا رہا ہے۔ اگر میں نے ان کی پیروی کا دورہ کر کے درد کے شکار اس طبقے کو انصاف فراہم کرنے کی کوشش کی اور اگر میں نے ہدایات دیں کہ نقد امداد کی جگہ حکومتی ملازمین کو تنخواہ و رخصت دی جائے دہشت گردوں کی طرف سے سفاکانہ طور پر قتل کئے گئے کسی شخص کی بیوہ کو اگر میں نے ادا کی پرایک مکان الاٹ کرنے کا مطالبہ منظور کر لیا تو میں فرقہ پرست اور مشہور معروف مسلم مخالف بن گیا۔ جس کے خلاف اخبارات میں من گھڑت خبریں پھیلانی گئیں۔ اور اگر دوسری طرف کوئی فوج اور گورنر منتظمی پر جبر کے الزامات

عائد کرتا ہے۔ گروہ خاص طور پر جگمگوں کی مذمت کرتا ہے اور الزام لگاتا ہے کہ اس نے بلا ٹوں اور ٹوکوں کا لالچ دیا۔ خود اس نے ان بلا ٹوں اور ٹوکوں کی تصاویر بھانہ نہیں کی ہوں، تو اس کے ایسے بیانات تمام اخبارات میں شائع ہوئے ہیں اس کی رپورٹوں کو بین الاقوامی اداروں میں اچھا لاجاتا ہے اور آپ کی جماعت کے اراکین کی طرف سے پارلیمنٹ میں ان الزامات اور رپورٹوں کا حوالہ دیا جاتا ہے اور اس کو سبکو لڑتی پسند انسانی حقوق کا علمبردار اور نہ جانے کیا کیا قرار دیا جاتا ہے۔

جگمگوں پہلو کے بارے میں ٹھوس شہادت :-

میں کوئی ایسی بات شامل نہیں کرنا چاہتا جو خود ستائشی کے مترادف ہو مگر میں آپ کو جگمگوں کی امر کی بابت غلط بیانی کی منظم ہم کے بعد تک کو بھی نہ جانے دوں گا۔ وادی کے عوام میسرے بارے میں کیا سوچتے تھے میں لازمی طور پر اس کی جانب آپ کی توجہ مبذول کرواؤں گا۔ یہ بات اس قے قبل کی ہے جب آپ اور آپ کے حواریوں نے دوسری مرتبہ میری تقریر پر دشنام طرازی کی ہم چلائی۔

۳۰ جولائی ۱۹۸۷ء کے انٹربین ایکسپریس میں بعنوان "تخلو" مضمون میں شہر ریاستی متبصر پر ان چوڑے نے لکھا۔

"فاروق عبداللہ ایک حالیہ مثال سے کافی سبق حاصل کر سکتا ہے، اسی قدر محدود وسائل کی اسی قسم کی ایڈمنسٹریشن کے ساتھ کام کر کے مگر محنت اور ستائش کے ساتھ ۴ ریز جگمگوں نے گورنری راج کے حالیہ مدت کے دوران اقتدار کام کیا کہ جس کسی کو بھی میں ملا اس نے اس کی ستائش کی۔ مجھے تو فتح نہیں تھی کہ گورنری راج کے تیش ریاست میں استبداد پر ہو گا کیونکہ میری سیاسی رنگ میں رنگی ریاست میں مجھے اب پتہ چل گیا ہے کہ غلطی سے موجودہ گورنر کو ریاست پر جی ایم شاہ کی حکومت ٹھونسے کے لئے ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے مگر محنت اور عمل کی وہ اوصاف لوگوں کو آن تک وزیر اعلیٰ میں نہیں ملے ہیں۔"

شری بون کے ایڈیٹر ان چیف دی این نارائن نے جون ۱۹۸۹ء میں وادی کا تین روزہ دورہ کرنے کے بعد آج کا بول و کشی ۸۸۸۸ کے عنوان سے تین مضامین پر رد قلم کئے اپنے آفری مضمون میں نارائن نے کہا - سری ٹرانسٹ ناگ اور پہلام میں محض مجلس کے تحت میں نے ہر کسی کو ایک سوال پوچھا۔ آپ کیا کہتے ہیں کہ ریاست میں بہترین حکومت کون چلا سکتا ہے۔ "یہ حیرت کی بات نہیں کہ کسی بھی تامل کو جب کہ بغیر تھاکو رزہ کیا کوئی بھی گورنر ہوتا نہیں۔ موجودہ گورنر جگمگوں ہیں۔"

جولائی ۱۹۸۹ء کے دوسرے ہفتے میں ریاست سے رخصت ہوا تو شہر ممبائی میں گم گم چٹھہ نے اس منظر کو یوں بیان کیا۔

ایک اخبار نے یہ خبر شائع کی کہ گورنر جگمگوں نے ایک اخبار کو خط لکھا۔

گذشتہ ہفتے جموں و کشمیر کے گورنر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ شاید حالیہ وقتوں میں کسی گورنر کو اس قدر خراج تحسین حاصل نہیں ہوا ہو گا جس قدر گوام نے جگمگوں کو ادا کیا۔ ان کے لئے وہ ایک تپا ۱۰ ایک مہار ایک مجاہد ایک صلح ۱۱ ایک انقلابی اور ایک مفکر تھا۔ گورنری راج کی یادیں اب بھی تازہ ہیں۔ زمانہ کالج کی ایک لکچرار تو جگمگوں نے جگمگوں سے کہا۔ "علم سیاسیات کی ایک طالبہ کی حیثیت سے میں گورنری راج کے قطعی خلاف ہوں مگر مجھے آپ کی حکومت پسند آتی جناب جگمگوں کو ایک تاریخ قرار دیتے ہوئے، جولائی ۱۹۸۹ء کو ریاستی وزیر پی ایل ہنڈو نے کہا۔ ۲۶ اپریل ۱۹۸۳ء کو جگمگوں نے گورنر کے عہدے کا حلف اٹھایا اور جولائی ۱۹۸۹ء کو وہ سبکو مشہور ہوئے ہیں۔ ان دو تاریخوں کے درمیان عمر کے جموں و کشمیر کی تاریخ لکھی گئی ہے یہاں تک کہ رسکن کا حوالہ دے کر کہا گیا۔ "کسی شے کی قیمت موت فوس ہوتی ہے جب وہ کھو جاتی ہے۔" شاید کسی گورنر نے اس قدر جذبات پیدا نہیں کئے جتنے جگمگوں نے کئے ہیں۔

اس کے قبل ای اخبار میں ۱۰ داتی تبصرے میں پریم بھائی نے، ۱۹۸۷ء کو کہا ان میں سے بیشتر افراد جنہوں نے جی ایم شاہ حکومت کے زوال کے بعد گورنری راج کی مخالفت کی تھی زیادہ درجہ نگار کی اس کی ستائش کرنے لگے کیونکہ جگمگوں نے عوامی مسائل حل کرنے میں غیر معمولی ذمہ داری کا ثبوت دیا۔

۱۵ اپریل ۱۹۸۹ء کو مسافر نیشنل میراڈ میں شائع اپنے مضمون "مکشیر میں کیا غلط ہے" میں لے ابن ادرے یوں لکھا۔

یہ امر تسلیم کرنا ہو گا کہ کشمیر میں گذشتہ دو برس بے خبر رہے ہیں۔ ملٹی پلی حکومت یا مقصد انتظامیہ کی درخشندہ مثال قائم نہیں کر سکی ہے۔ یہ واقعی امن و سناگ امر اس لئے محکم ہے کہ اس کے دور میں مقصد انتظامیہ کی مثال موجود تھی۔ یہ اس لئے اور بھی خوشنماگ ہے کہ اس کے سلسلے میں اس کی مثال تھی جو گورنر جگمگوں نے گورنری راج کے دوران کیا اور دکھا دیا کہ منصفانہ ذہن بے لوث اور مؤثر انتظامیہ کے ذریعے عوام کے دلوں کو جیتا جاسکتا ہے۔ یہاں تک کو بنیاد پرست اور قوم دشمن بھی تسلیم کرتے ہیں کہ وہ منصف اور لائق تھا۔

کشمیر کے کثیر الاشاعت روزنامہ سٹریٹ ٹائمز نے ۸ جولائی ۱۹۸۸ء کے ادارے میں لکھا جو کام گورنر جگمگوں نے گورنری راج کے چھ ماہ میں کیا، وادی میں بہتر صورت حالات کو درست کیا اور اس کے ماحول کو درست کرنے کی کوشش کی، اسے کشمیر کے عوام بھی فراموش نہیں کریں گے۔ اسی اخبار نے، ۱۹۸۷ء کو اپنے ادارے آٹا ہے یاد گورنر کا زمانہ "میں لکھا۔

"گورنری راج کے دوران ایڈمنسٹریشن چاک و چوبند ہو گئی اور تعمیری اور ترقیاتی کام سرعت سے دو چار ہوئے لگا بوجھ کام بھی ہوا مناسب طور پر اور صاف ستھرے ڈھنگ سے ہوا، مولانا آزاد و ڈی ایٹ روڈ، بلورڈ اور بہت ساری دوسری سڑکوں کو نقصان ہوتا تھا وہ کی ہر سال مرمت کی جاتی تھی اور یہ آئے سال خراب ہو جاتی تھیں۔ مگر اب اس قدر ٹھوس مواد کے ساتھ ان کی مرمت کی گئی کہ مسلسل بر فباری اور شدید سردی کے باوجود یہ نہایت

نفس حالت میں رہیں۔ یہاں تک کہ جب برف پٹانے کے لئے بھاری بل ڈوزوں کا استعمال بھی کیا گیا تب بھی وہ اسی قدر مضبوط اور ہموار رہیں۔ یہ قدر برف بھاری سے قبل تھیں اور ان میں ایک بھی ٹکڑے پر برف نہیں آیا۔

دفتر میں نظم و ضبط کے ساتھ کام ہوا اور ہر شخص وقت پر دفتر جاتا تھا۔ گورنر ذاتی طور پر عوام کی شکایات کو سنا کرتا تھا ان میں اونپے بچے، امیر و غریب، مرد و زن، شہری اور دیہاتی لوگ شامل ہوتے۔ وہ ہر درخواست پر کوئی ذکوئی حکم صادر کر دیتا۔ وہ معاملات کی پیروی کرتا اور اس بات کو یقینی بناتا کہ اس کے احکامات پر فوری طور پر عمل کیا جائے۔ اب کوئی بھی عوام کی شکایات کا ازالہ نہیں کرتا اور سیکریٹریٹ میں وہ دنوں تک انتظار کرتے دیکھے جلتے ہیں۔

ایک مشہور سیاسی ممبر نکل پکرو رقی نے اپنے ریتواریہ کالم میں ۳۰ اکتوبر ۱۹۸۸ء کو لکھا۔

”وادی مذہبیت سارے عوام و وزیراعلیٰ سے نالاں مسلم ہوتے ہیں اور اس کے برعکس وہ گورنر جگموہن کے عہد کی تعریف سناؤں کرتے ہیں۔“

۱۶ اپریل ۱۹۸۹ء کے ہندو نے اطلاع دی۔

”درحقیقت بہت سارے نوجوانوں نے اشارہ دیا کہ اگر گورنر جگموہن کو ایک مرتبہ ایدیشنٹ مشنر بنالے دی جلتے تو انہیں بہت زیادہ اطمینان ہوگا۔“

۱۲ جولائی ۱۹۸۹ء کو میرے عہدہ کی بیکردستی پر سرینگر سے ہندوستان ٹائمز کی رپورٹ پور تھی۔ بشیر کے منظر سے جگموہن کے رخصت ہونے سے عوام میں غم و غصے کی وہ لہر پیدا ہوئی ہے جو پہلے کسی نہیں دیکھی تھی۔

وزیراعلیٰ فاروق عبداللہ کی بدعنوانیوں سے عاجز جگموہن ہمیشہ ان کے لئے امید کی ایک کرن تھی۔ گورنر راج کے دوران نوکر شاہی کو قابو میں رکھا گیا تھا اور ترقیاتی کام نہایت سرعت و رفتاری کے ساتھ رو بہ عمل ہوتا۔ ریاست کے ہر کونے میں فنی سڑکوں کی تعمیر عمل میں لائی گئی اور پرانی سڑکوں کی تجدید مرت ہوئی۔ عوام حیران و ششدر رہ گئے کیونکہ انہوں نے شاید ہی کوئی منتخب حکومت ایسی دیکھی تھی جو اس قدر ریز رفتاری سے کام کرے۔ عوام کے لئے یہ خواب کی تعمیر کے مترادف تھا۔

یہاں تک کہ آج بھی جب لوگ گڈھوں سے بھر چکے پر سرخ کرتے ہیں تو اسے وہ فاروق عبداللہ سڑک اور اچھی طرح پختہ سڑک پر چلیں تو اسے ”جگموہن سڑک“ کہا جاتا ہے جیسے ہیں

ایک قابل ایدیشنٹ مشنر نے طویل دور پر جگموہن نے التوا کے تمام معاملوں کو منظر لایا۔ موقع پر فیصلے لئے اور ترقیاتی عمل پیکر کیا۔ سیاح لوگ اب بھی اس وقت کو نہایت اشتیاق کے ساتھ یاد کرتے ہیں جو انہوں نے فنی سڑکوں میں گزارا ہے۔ شکر اچھا رہے۔ زبردوں بہاؤ یوں کی اس ڈھلوان پر جو جھیل ڈل تک چلی جاتی ہے۔ یہی فاریسٹ گورنر راج کے دوران تخلیق کیا گیا۔ جوق در جوق سیاح ۹۰، ۹۱ ہیکٹر رقبے پر پھیلے سٹی فاریسٹ میں آکر سبز ماحول میں فرحت اور سکون کا احساس کرتے۔ اسے قومی پارک کا روح، دماغ تھا۔ گورنر فاروق حکومت کے مراعات دے رہے تھے۔ ہزاروں افراد

میں درخت کاٹے گئے تاکہ اسے گولف کورس میں تبدیل کیا جلتے۔

جگموہن نے امیدواروں کے انتخاب کے معاملے میں ”ڈسٹرکٹ میئرٹ سسٹم کو ترویج دی تھی تاکہ انتخاب کے معاملے میں واحد معیار قابلیت ہو۔ جگموہن نے حکومتی ہسپتالوں میں ملازم ڈاکٹروں کی پرائیویٹ پریکٹس پر پابندی عائد کر دی تھی مگر ڈاکٹر عبداللہ نے انہیں پرائیویٹ پریکٹس کی اجازت دے دی۔ جگموہن نے جھیل ڈل پر ہوٹلوں کی تعمیر پر پابندی عائد کر دی تھی تاکہ اس کی ابھی خوبصورتی کو بحال کیا جاسکے۔ جگموہن جھیل ڈل کو ایک تاریخی ورثہ تصور کرتا تھا جس کی ہر قیمت پر حفاظت لازمی تھی مگر اب اس علاقے میں ناجائز قبضوں اور ہوٹلوں کی تعمیر کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو چکا ہے۔“

ایک سالہ نوجوان جاوید قریمیت کے لئے پاکستان گیا۔ ۸۵ تربیت یافتگان کے ساتھ واپس آتے ہوئے سرحد پر اسے ہندوستانی فوج نے گرفتار کر لیا۔ اجادات اور ٹیلی وژن کو اپنے ایک انٹرویو میں اس نے اپنے تجربات کی تفصیل بیان کی۔ پاکستانی مقبوضہ کشمیر میں حالات کا ذکر کرتے ہوئے اس نے کہا۔ انہوں نے صرف جھول پائل تعمیر کئے ہیں جو پڑتے ہوئے ہیں۔ سڑکیں اسی قدر خراب ہیں جتنی سرینگر میں اس سے قبل ہو کر تھیں جب جگموہن ریاست میں وارد ہوا تھا۔ ”عسکری بن جانے کے باوجود اس نوجوان کے دل میں اس ترقیاتی پروگرام کے لئے بھاری قدر و منزلت تھی جو میں نے سرانجام دیا تھا۔“

ان تبصرات اور شہادت کو درج کرنے کا مقصد یہ گزیر نہیں کہ ذاتی کامیابیوں کی طرف توجہ دلائی جائے۔ بلکہ ان قومی اور ریاستی ایلڈر شپ کے ان سازشی عناصر کی حقیقت کو طشت از باہم کرنا ہے جو مجھے مسلم لطف اور کشمیر مخالف کی حیثیت میں پیش کرتے ہیں اور میری ان کاوشوں میں روکاؤ میں پیدا کرتے ہیں جو میں نے ریاست کو موت کے منہ سے نکلانے کے معاملے میں کی ہیں۔ ملک کی بہبود کے لئے میں نے اس محنت اور محنت کو بروئے کار لایا ہوتا ہوں کشمیری ذہن کی اندرونی پرت میں میرے لئے موجود تھا مگر آپ ہر چیز کا گدہ بانے پر اور مجھے اس خبر سگالی کے جذبے کے استعمال کا موقع فراہم کرنے سے امتناع کرتے پر آمادہ تھے۔

کشمیر کی موجودہ سیاست میں آپ ۱۴ اگست ۱۹۹۰ء کو ٹائمز آف انڈیا میں شائع اپنے انٹرویو میں اس نے کہا۔ ایک معروف مسلم لطف کو مسلم اکثریتی ریاست کا گورنر مقرر کیا گیا یہ پروپیگنڈہ کس قدر رلاح اور غلط تھا اور اس امر سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ ۱۶ نومبر ۱۹۸۹ء کو اپنی حلف برداری کے موقع پر جس کا ریکارڈ موجود ہے (ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے کہا تھا۔ گورنر صاحب ہیں آپ کی شدت کے ساتھ ضرورت ہے۔ یہ نہایت حیرت کی بات ہے کہ مختصر مدت میں دھڑلوں میں منقسم نوکر شاہی کے باوجود آپ نے اس قدر سناؤشن کام کیا۔ آج اگر وہ لوگوں کی تین صند و تچیل رکھی جائیں۔ ایک نیشنل کانفرنس ایک کانگریس اور ایک آپ کے لئے قوتاب کے وہ لوگوں کی صند و تچیل بھری ہوگی جبکہ باقی دو خانہ رہ جائیں گی۔“

ہمارے ملک کی بدقسمتی یہ ہے کہ یہاں پر ڈاکٹر فاروق عبداللہ جیسے لیڈر ہیں جنہیں حقائق اور راستی کا کوئی پاس نہیں ہے جن کی سطحیت کا موازنہ صرف ان کی بے اصولی سیاست کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔

اتفاق کی بات ہے جو شاید آپ کے ذہن میں بھی نہیں آئی کہ ڈاکٹر فاروق عبداللہ آپ کی ملکہ پر بھی مسلم مخالف ہونے کا الزام لگا تا رہا۔ جب وہ اپریل ۱۹۸۴ء میں وزیر اعظم تھے تب پہلی مرتبہ ایک شبہو مسلم مخالف کو ایک مسلم اکثریتی ریاست کا گورنر مقرر کیا گیا۔

قدرتی طور پر آپ کے ساتھ مشیوے کے بعد ہی ۱۵ جنوری ۱۹۹۰ء کو ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے اردو زبان میں ایک بیان جاری کر کے دیگر باتوں کے علاوہ کہا: گورنر سر تا پا ہلاک اور زہر خیز خفاں ہے۔ وہ دادی کو ایک قبرستان بنانے پر تیار ہوا ہے۔ ۲۰ جنوری سے متواتر کرفیو کے باعث یہ کہنا مشکل ہے کہ قتل عام میں کتنے کشمیری غم فوجی دستوں کی گولیوں کے شکار ہوئے کتنے سومکان تباہ ہوئے اس وقت کشمیری دیکھ رہے ہیں کہ ان کے وطن عزیز کو ایک قبرستان میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ میں انسانیت کے قومی اور بین الاقوامی علمبرداروں سے کشمیر میں مداخلت کی اپیل کرتا ہوں۔ کشمیر میں فوج اور غم فوجی دستوں کے ہاتھوں قتل عام کی کڑی بین الاقوامی تحقیقات کرنی چاہئیں۔ یہ آپ کا محب الوطن ہے جو کہن چاہتا ہے کہ کشمیر "عزیز وطن" ایک الگ ملک ہے یہ آپ کا قومی لیڈر ہے جو ہندوستانی فوج اور غم فوجی دستوں کی طرف سے قتل عام کے لئے بین الاقوامی تحقیقات کا مطالبہ کر رہا ہے۔ یہ آپ کا ذمہ دار دوست ہے جو وادی میں متواتر پچیس روز کے کرفیو کی بات کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ اس بات کو مسلم کرنے کے قائل نہیں کہ کتنے "موصوم اور بے گناہ کشمیریوں کو قتل عام ہوا ہے اور کتنے سومکان کو گرا کر سمار کر دیا گیا ہے حالانکہ وہ اس حقیقت سے مکمل طور پر واقف ہے کہ متعدد دہائیوں سے جب تک کرفیو بالکل نہیں تھا۔ اور حکام نے ۱۴ جنوری تک ہم افراد کے ہلاک ہونے کی فہرست کو نشر عام کر دیا تھا۔ اور ہر روز عوام سے کہا جاتا تھا کہ ان کے علاوہ اگر کوئی نام ہیں تو وہ فراہم کریں تاکہ حکومت میں درج کی جاسکے۔ یہ ایک سابقہ وزیر اعلیٰ ہے جس نے اس بات کو واضح کرنے کی پرواہ نہیں کی کہ کس طرح "موصوم اور بے گناہ" لوگ "بی ایس ایف جوائنٹ میڈی وٹری اور ٹیل گورنیشن فکوں کے سینٹر افسروں اور سرگروں پر فوجیوں کو قتل کر رہے ہیں اپنی طویل پٹش ریلی سے وہ عوام کو گراہ تو کر رہے مگر ان سفاکانہ ہمارے لئے اس کے پاس ایک بھی غلط نہیں کیا یہ قوم ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے اس انوسٹناک ردیئے کے بارے میں کڑی غلط فہمی کا سبب بننے کا حق نہیں رکھتی، فروری ۱۹۹۰ء کے ٹائمز آف انڈیا میں شائع اسکے اس بیان کے بارے میں آپ کی جواب دیں گے۔ میں نے اپنے اہل جماعت کو خاموش بوجھنے سے روک دیا اور ہتھیار چھلانے کی تربیت حاصل کرنے کی بابت ہدایات دیں، ہندو اہل ہند کہہ رہے ہیں کہ کچھ بھی کرو مگر جگموہن کے ساتھ مذاکرات۔

ذاتی طور پر میری فہم پر فخر گھونپنے کی کوئی وقت نہیں مگر معاملے کو گرم رکھ کر آپ اور آپ کے حواری بہت زیادہ اموات اور بیماریاں تباہی کے موجب بنے۔ بے اصولی سیاست نے اسے عین گہر میں ڈھکیں دیا۔

جزئیات:

آپ نے کہا کہ میں تاریخ کا قاری نہیں، تاریخ ساز ہوں، شاید آپ یہ نہیں جانتے کہ تو تاریخ کے مطالعہ کے بغیر تاریخ سازی کرتے ہیں وہ جبری تاریخ کو جنم دیتے ہیں۔ وہ ان شکلی لہروں اور زینبادی قوتوں کو نہیں سمجھ سکتے جو واقعات کی روش کو صورت عطا کرتے ہیں اور قوم کی حقی منزل کا تعین کرتے ہیں۔

تاریخی پس منظر کے فقدان میں آپ اور آپ جیسے لوگ ان شافوں اور بیڑوں کو نہیں دیکھ سکتے جنہوں نے کشمیر میں علیحدگی پسندی اور تخریب کاری کی فصل پیدا کی ہے کشمیری نفسیات میں زہریلے بیج بوئے گئے اور ان کی کھلے دل سے کھاریزری کی گئی۔

اپنی اس دلیل کی حمایت میں میں بیسویں شالیں پیش کر سکتا ہوں مگر یہاں میں صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا۔

نرم روی اور ہتھیار ڈالنا

۱۲ اکتوبر ۱۹۸۸ء کو بھارتی گاندھی کے یوم ولادت پر بھارتی گورنر کے نئے کمپلکس سرنگرم میں اس کا بھسمہ نصب کیا جانا تھا۔ اس تقریب کا اعلان کیا جا چکا تھا۔ نسب کرنے کی رسم چیف جسٹس آف انڈیا، آدیس پانک کو سرانجام دینا تھی۔ مگر چچہ مسلم وکلا نے اس میں حصہ لیا۔ انہوں نے اس تقریب کے موقع پر گورنر کو "کرنے کا اعلان کیا، ڈرانے دھمکانے کی اس چال کے آگے وزیر اعلیٰ نے لگ بھگ اپنی مرضی سے گھٹنے ٹیک دیئے اس تقریب کو منسوخ کر دیا گیا۔ جو کچھ ہوا اس کی کیا پیچیدگیاں تھیں؟ ایک سکولر ہندوستان کا حقدار سکولر کشمیر علیحدگی سب سے بڑی نشست پر بابائے قوم کا بھسمہ بھی نہیں لگا سکتا اس فقر کا بھسمہ جس نے اپنی تمام زندگی فقر و ازانہم آشنگی کے لئے نثار کر دی۔ اس تسلیب کے خلاف ہم کے پس پردہ کون تھا؟ یہ کوئی دوسرا نہیں ہے اینڈ کے بانی گورنر کا اینڈ وکٹ ٹرڈ شفع بھٹ نیشنل کانفرنس کا سرگرم رکن تھا جسے بعد ازاں نومبر ۱۹۸۹ء میں منعقدہ انتخابات میں سرنگرم لوک بھاسیٹ سے جماعتی ٹکٹ دیا گیا جسے آپ نے، ہمارے ۱۹۹۰ء کو اپنے دورے کے دوران گلے سے لگائے رکھا تاکہ گورنر کے انتقامیہ کے لئے جس قدر ممکن ہو مشکلات پیدا کی جائیں۔

اس وقت نیشنل کانفرنس (ایف) کانگریس (آئی) وزارت عہدہ بردار تھی۔ اصولوں کی باندھی کا اس قدر فخر و فخر تھا کہ کانگریسیوں کا کسی سے چھٹے رہنے کا ایسا مزاج تھا کہ جب اس تقریب کو منسوخ کیا گیا تو کسی نے انھیں تنگ نہیں اٹھائی۔ جب قوم پرست طاقتوں کو قومی مفادات کا پاس نہیں تو ان کا ملک پر حکومت کرنے کا فائدہ کیا ہے جب وہ فقر پرستی کی سیاست کے ذہنی غلام ہیں جب وہ کردار کی بجائے گفتار پر انحصار رکھیں جب انہوں نے رہبری نہیں کی بلکہ جھک گئے۔ جب انہوں نے بیڑی کو بھٹک کر شکست نہیں دی بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کی انسانی قدر و قدر میں مضبوط ایک نئے سماج کی تعمیر کی بجائے انہوں نے شعوری یا لاشعوری طور پر قدامت پسندی کے تباہ ہوتے قلعے کی تجدید و مرمت کر کے اسے مضبوط تقویت پہنچانے کی ہر ممکن سعی کی جب آئین کے بنیادی اصولوں اور مفاد کی بجائے انہوں نے مصلحت پسندی کو اولیت دی تو اس تمام نتیجہ کیا ہو سکتا تھا۔ کیا اس بات کو بھٹنے کے لئے کوئی عینی نظری ضرورت تھی کہ اس قسم

کی بناوٹی اور مصنوعی قوتیں ہیں کہاں لے جائیں گی۔

ایک بنیادی سوال

جب میری کابینہ کے افسار بیٹھتے دکھائی دینے لگے تو آپ اور ڈاکٹر فاروق جہاں لہو کو اپنی کوتاہیوں کے طشت از بام آنے کا خدشہ پیدا ہوا۔ اتنی ہی تشویش بیگم بے نظیر بھٹو کے سیاست پاکستانی حکام اور اس کی آئی ایس آئی جیسی ایجنسیوں کو ہوئی انہوں نے واضح طور پر یہ سمجھ لیا کہ صرف انتظامی شینری کو درست کر سکتا ہوں بلکہ اندرونی تحریک و دور کر کے نوکر شاہی کے اچھے خاصے حصے کا اعتماد جیت سکتا ہوں اور عوامی شکایات کا انتظامی شینری سے ازلہ کر کے عوامی حمایت بھی حاصل کر سکتا ہوں اس کے لئے مجھے رشوت کے خلاف مہم چلا کر ۱۹۸۸ء کی رفت رتنی کو بحال کرنا تھا۔ چنانچہ انہوں نے میرے خلاف ایک خاص مہم چلائی۔ اس سے بیگم بھٹو کے میرے خلاف جبکہ تحریک وادیلے کی تشریح بھی حاصل ہو جاتی ہے ورنہ وزیر اعظم یا وزیر داخلہ یا کسی دوسرے مرکزی اہلکار کی جگہ ایک ریاست کے گورنر پر نظر انتخاب چرنے کا کوئی مطلب نہیں تھا آئے معلوم تھا کہ شینری کی سیاسیات اور انتظامیہ میں گہری لہروں سے مکمل طور پر واقف ہوں اور میرا انداز فکر یقینی طور پر موثر اور اثر آور ہوگا۔ بیگم بھٹو کو معلوم تھا کہ سابقہ حکومت کی بناوٹ اور کھوکھلے پن سے پاکستان تجارتی فائدہ اٹھایا ہے وہ اپنا وہاں آئی ایس آئی کے اپنے غرض کی مدد لے کر کو ضائع کیسے ہونے لگی خاص طور پر جب انہوں نے اپنا مقصد قریباً حاصل کر لیا تھا۔

میں کسی سیاسی یا ذاتی تعصب کے بغیر یہ بنیادی سوال قوم کے ہی خواہوں پر چھوڑتا ہوں۔ ڈاکٹر فاروق جہاں لہو مجھے ہلاک یا پھانسی خان کیسے کہتا تھا، اور آپ سرگرمی تک شخص اس لئے آئے کہ مجھے دھوکہ دے، اور اہل اسلام کا کالاف قرار دے سکیں اور عین اسی وقت بیگم بے نظیر بھٹو میرے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتی تھی۔ جگت جگت موہن کو جگت جگت موہن کر دیں گے؟

کثیر کی حقیقت کے بہت سارے پہلو غلط بیانی، تعصب اور کھوکھلے پن کی پر توں تلے دبے ہوئے ہیں۔ ان دنوں ان ڈھیروں کو پٹانے کی ایک سہی میں معروف ہوں مجھے توقع ہے کہ ملک کو اس مسئلے کا معیہ پس منظر حاصل ہو جائے گا۔ کثیر می خواہم کہ بیگم بے نظیر بھٹو کے احساس ہو جائے کہ ان کا سب سے بڑا ہی خواہ تھا۔ میں انہیں چننا لے گئے استعمالی حکمرانوں کے ساتھ مذہبی زاون کی جالوں اور رجعت پسند طاقتوں سے بھاننا چاہتا تھا۔

آپ نے پہلے ہی کشمیر میں بھارت مائتاد اور ہند کی بے عزتی کرائی ہے اور اب دوسری مائتاد کو بے عزت کرنا آپ دوسرا گناہ مت کیجئے۔ آخر اوپر بھی کوئی طاقت ہے اس کا احساس کیجئے وہ آپ کی کوتاہی کو معاف کر سکتی ہے مگر وہ آپ کے اپنے گناہوں کے لئے ایک معصوم شخص کو مورد الزام قرار دینے کے گناہ کو ہرگز معاف نہیں کرے گی جبکہ وہ بار بار آپ کو اپنے فرائض سے متنبہ کرنا اور اپنی کوتاہیوں کو معاف کرنا چاہتا تھا۔

جہاں تک میرا تعلق ہے اسے اس فتنی فتنہ میں ہی مطمئن ہوں کہ میں نے کشمیر میں صدمہ کیا ہے یہ بھی حقیقت ہے

کہ میں نے شاید عارضی طور پر چند منطقی لوگوں کی غیر سگالی کھودی ہے مگر مجھے کسی کی سند دے کر نہیں میں دوسری مرتبہ ایک قومی فریضہ ادا کرنے کے لئے گیا ہوا تھا۔ ملک کے سیاسی ڈھانچے اور انتظامیہ نے اس قسم کا کردار اپنا لیا ہے کہ یہ کسی سنجیدہ مسئلے کا اس کی جڑوں سے حل کرنے کے قابل نہیں رہ گیا انتخابات قریب آئے معنی ہو کر رہ گئے ہیں اور یہ تب تک بے معنی ہی رہیں گے جب تک ہندوستانی جمہوریت اور آئینی ڈھانچے کو صحت مند تعافتی بنیاد حاصل نہیں ہو جاتی ایک ایسی روح اور خاک جس سے ابھر کر راستی انصاف اور بے لوث خدمت کا بیج شگفتہ ہو کر ایک درخت کی صورت اختیار کر سکے جو کشمیر سے کتنا کراہی تک آسرا دے یہ سب اس وقت روشنی مل چکی ہے اور نابینا لوگ اپنے ہاتھوں میں لالچین لئے ہماری رہنمائی کر رہے ہیں ہم ایک بھان سے دوسرے بھان تک ٹھوکر بن کھا رہے ہیں۔ ایک شاعر کا قول ہے۔

یہ ہو چکا ہے

اور یہ ہو رہا ہے

اور یہ پھر ہوگا۔

بہترین خواہشات کے ساتھ۔

آپ کا صادق

(دستخط) جگمohan

نیشنل کانفرنس کی مہم

نیشنل کانفرنس کی غلط بیانی کی مہم کانگریس (آئی) کے ساتھ شادربشاد چل رہی تھی اس کا مقصد یہ تھا کہ نہایت شرمندہ کے ساتھ پروپیگنڈہ کیا جائے تاکہ اس شور شرابے میں راستی کی آواز گم ہو کر رہ جائے۔ اس معاملے میں سیف الدین مودودی نے اہم رول ادا کیا۔ بڑے اخبارات اور پارلیمنٹ کے فورموں کا استعمال کرتے ہوئے اس نے بہت ساری مبالغہ آمیز لہروں کا سہارا لیا۔

مارچ ۱۹۹۰ء کے آخری ہفتے میں سونے کہنا شروع کیا کہ ۱۹ جنوری ۱۹۹۰ء جب سے میں نے گورنر کا ہندہ سنبھالنے کے بعد ریاست میں ۴۵ افراد جان بحق ہو چکے ہیں۔ ۲۸ مارچ کو جب میں نے اخبارات دیکھے تو معلوم ہوا کہ اس نے ان اعداد و شمار کا ذکر لوک سبھا میں کیا ہے تب میں نے ایک خط کا مسودہ تیار کیا اور بیکرٹری انفارمیشن این آرگنٹسے کہا کہ وہ اس کو جاری کر دے۔ بیخود کسی وضاحت کا محتاج نہیں اور مندرجہ ذیل ہے۔

”ہماری توجہ آپ کے اس بیان کی طرف دلائی گئی ہے جس میں آپ نے کہا ہے کہ ریاست میں گورنری راج نافذ ہونے کے بعد ۴۵ افراد جان بحق ہو چکے ہیں ہم آپ کے ممنون ہونگے اگر آپ بیخود طور پر ہلاک ہونے والوں کا تعینات جیمہ کہیں جن میں انکھانا اور پتہ شامل ہونے چاہئیں کہ نہ کہ ان کے رشتہ داروں کو ہلاک کر دیا جائے کہ آپ نے بیان کیا ہے“

اس میں بھاری تفاوت پائی جاتی ہے۔

سوزنے اس خط کا بھی جواب نہیں دیا۔ مگر اس سے بھی زیادہ بڑی بات یہ تھی کہ ایک ایسا تاثر پیدا کیا گیا کہ جو بھی شخص اس سے ملے گا وہ بھی سیکورٹی فورسز کی کاروائیوں میں لقمہ اجل بنے گا۔

حقیقت یہ تھی کہ اس طرح کے دوران ۱۲ افراد ہلاک ہوئے ان میں سے ۳۲ افراد کو دہشت گردوں نے ہلاک کیا، ۱۱ اشخاص اس وقت مارے گئے جبکہ سیکورٹی فورسز نے اپنے بچاؤ کے لئے کاروائی کی یا امن و امان کے تحفظ کے لئے اپنے فرائض کی ادائیگی میں یا فائرنگ کے بعد دہشت گردوں کے حملے کو دور رکھنے کے لئے کاروائی کی گئی یا دو طرح کی باری کے نتیجے میں یہ اموات ہوئیں۔ ۱۱ افراد فوجی ہتھیاروں کی گولے تباہی بھری تھیں۔ کاروں نے فوجی گاڑیوں کے قافلے یا فوجی ہلاکوں کے پھول کو لے جا رہی سکول بس پر حملہ کیا۔ دو افراد دیواروں میں سے ہلاکوں کے ساتھ ملحقہ سیکورٹی فورسز نے اس وقت گولی چلا دی جب ان کی گاڑی پر حملہ کیا گیا۔

نیشنل کانفرنس سے وابستہ اراکین پارلیمنٹ نے نئی دہلی میں اپنے محفوظ مکانات میں بیٹھے ہوئے میرے خلاف ہر روز ایک یا دو بیان جاری کرنے کا سہول بنالیا جن میں گورنری مڈمٹ کی گئی ہوئی اور نیم فوجی دستوں کو دھمکانے کا مطالبہ کیا گیا ہوتا۔ مگر وہ اس بات کو آسانی سے فراموش کر دیتے کہ یہ ان کی جماعت اور ڈاکٹر فاروق عبداللہ ہی تھے جو نیم فوجی دستے لائے گئے۔

اجہارات کے معاملے میں بھی ان کے الزامات اسی قدر کھوکھلے تھے۔ مثال کے طور پر یہ فردی کو نیشنل کانفرنسی اراکین پارلیمنٹ نے پھر پروادی میں غیر قانونی طور پر اجہارات پر پابندی لگانے کا الزام لگا یا کئی مرتبہ میں نے ان سے کہا کہ ایسا کوئی ٹوٹے ٹکڑا حکم نہیں تھا جس کے تحت میں نے اجہارات پر پابندی عائد کی ہے یا پھر میں پر کوئی ممانعت کی ہے۔ انہوں نے انھیں ان الفاظ میں جواب دینے کی پروا نہیں کی مگر تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد عام الزامات کا اعادہ کرتے رہے اور ان کا ایک ہی مقصد تھا کہ میرے خلاف تعصب پیدا کیا جائے۔ یہ لوگ اچانک ہی اجہارات کی آزادی کے علمبردار بن گئے تھے۔ اور وہ اس بات کو بھول گئے کہ یہ ان کا لیڈر ڈاکٹر فاروق عبداللہ ہی تھا جس نے صرف تین ماہ قبل اجہارات پر سب سے سخت پابندی عائد کرنے کا یہ نام قانون پیش کیا تھا اور ملک گیر سطح پر تین تین سے یہ قدم واپس لینا اتنا مناسب احتیاط اور رائیڈ میٹرنگ کی دوڑ کئی کمیٹی جو فوری کے دوسرے ہفتے میں سرنگرائی تھی کہ اس قسم کی رپورٹنگ دکھا کر جو وہاں چند اجہارات کر رہے تھے مارا سچ کے بیٹے میں نے ایسے چند اجہارات کے خلاف انفرادی طور پر کاروائی کی جنہوں نے مخصوص قانونی دفعات کی کھلے عام خلاف ورزی کی تھی اور ڈرانے دھمکانے کی مشدیدی خطرات کاروائیوں کے مرتکب ہوئے تھے۔ +

جارج فرنانڈس کا اسٹائل

جارج فرنانڈس کا طرز عمل نسبتاً زیادہ پراسرار بالواسطہ اور پیچیدہ تھا۔ اس وقت کشمیر کے حالات

کا تقاضا غیر سیاسی عملی اور با مقصد عمل اپنانے جانے کا تھا مگر جارج فرنانڈس اپنے اس گہرے کس سے ابھر نہیں سکا تھا جو اسے بطور ریڈیو نیٹس لیڈر حاصل ہوا تھا۔ یہی وہ اپنے اس لالچ سے باہر آ سکا تھا جس کے تحت وزیر امور کشمیر کے طور پر اپنی پوزیشن کا استعمال کرتے ہوئے وہ مسلمانوں میں اپنی ساکھ بنانا چاہتا تھا۔ مزید برآں فطرت سے وہ حق جتنے اور دخل اندازی کا قائل تھا اور انتظامی امور میں تعمیری سے زیادہ تخریبی رجحان رکھتا تھا۔ وہ خاص طور پر ڈاکٹر فاروق عبداللہ اور شوکت جیتلے جیسے افراد کے ساتھ اپنے تعلقات کے اثر سے باہر نہیں نکل سکا تھا۔ کشمیر میں اندرونی تخریب اور نئی قوتوں اور شخصیات کے ابھرنے کی بابت اسے بہت کم واقفیت تھی۔ مگر ترقی پسند اور فیاض دکھائی دینے کی اپنی زبردست خواہش کے زیر اثر وہ اجہارات میں مخصوص رنگ کی خبریں شائع کروانا جس سے بھاری نقصان ہوا۔

جیسا کہ باب دو از وہ میں بیان کیا گیا ہے جارج فرنانڈس کے موقف اور کام کرنے کے انداز سے انتشار اور تضادات کے گرداب میں بھاری اضافہ ہوا۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں انتظامی امور میں اس کی دخل اندازی کی وجہ سے مصیبت نہیں اٹھاؤں گا اور اجہارات کر۔ وں گا میں نہیں چاہتا تھا کہ کشمیر کی ریڈیو نیٹس کی خالی لمبی کو بھرتا جاؤں اور کوئی اس میں سراج کر دے۔ میں نے سوچا کہ اگر وزیر اعظم کا واقعی یہ خیال ہے کہ جارج فرنانڈس اس بالائی کو بھرتے کی بہتر صلاحیت رکھتا ہے تو اسے ریاست کے گورنر کا عہدہ سنبھالنے کے لئے کہا جانا چاہیے۔ میں حیران تھا کہ ہمارے سیاسی لیڈر زیادہ راست گو اور سیدھے کیوں نہیں ہو سکتے؟ بھلا وزیر اعظم اس قسم کے حالات پیدا کیوں کرے جہاں اس کے ڈھانچے کا ایک اہلکار یہ سوچے کہ وہ اسی ڈھانچے کے دوسرے اہلکار کی جگہ کاٹ کر ہی اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

۲۔ مئی کو مجھے معلوم ہوا کہ جارج فرنانڈس مشاورتی کمیٹی کے اراکین کے ساتھ سرنگرائی کے منصوبہ بننا چاہتے اس وقت میں دارالحکومت کو جتوں سے سرنگرائی متعلق کر رہا تھا۔ اسے اس فیصلے سے کوئی واسطہ نہیں تھا اور نہ ہی اسے انتظامات کی بابت پتہ تھا پھر بھی وہ ایک بھاری جمعیت کے ساتھ اس صورت حال کا خور بننا چاہتا تھا اور یہ مئی کے بد و ہال چاہتا تھا۔ میں یہ بات سمجھنے ہی دیتا مگر مشاورہ کمیٹی کی موجودگی سے انتظامی مشینری کی توجہ اس پیچیدہ اور مشکل کام سے ہٹ جاتی جیسا کہ ہمارے چتر تھا، اس سے تخریب کاروں کو زیادہ زور لگا کر کوئی ایسی واردات کرنے کا موقع مل جاتا جہاں انہیں معمول کے مقابلے میں زیادہ وسیع پیمانے پر تشہیر حاصل ہو جاتی۔

جیسا کہ جارج فرنانڈس کا معمول تھا اس نے مجھے جوڑے دو سے کی بابت اطلاع نہیں دی مگر مجھے جلد ہی اس کا اشارہ مل گیا کہ میں نے اسے مندرجہ ذیل ٹیلیکس پیغام ارسال کیا

+ - ملاحظہ ہو باب دو از وہ - انتشار اور تضادات کی گرداب (برائے تفصیلات)

”مجھے معلوم ہوا ہے کہ کثیر پرکشی ۵ مئی کے آگے سرینگر کا دورہ کرنا چاہتی ہے جس پر زور سفارتش کروں گا کہ اس دورے کو ملتوی کیا جائے۔ اس سے انتہائی شہر تکے ہو رہا لٹ جاتے گی جو اس وقت سکریٹریٹ کی منتقلی اور دیگر مسائل کا اہل تعلیمی اداروں کو دوبارہ کھولنے کے لئے اس شہر کی کچھاک چوبند کر کے پیدا کی گئی ہے ایک مرتبہ موجودہ نازک مرحلہ گزر جائے تو کئی اپنا دورہ کر سکتی ہے۔“

میں نے اس ٹیلیکس بنیام کی نقل وزیراعظم کے پرنسپل سکریٹری کو بھی ارسال کی تاکہ وہ اس معاملے میں میری سفارشات سے متعلق وزیراعظم کو آگاہ کر سکے۔ قدرتی طور پر وزیراعظم اور وزیر داخلہ میرے نظریات سے اتفاق کیا اور جارج فرنانڈس کا جو زورہ دورہ ملکی نہیں ہو سکا۔

۵ مئی کو جارج فرنانڈس نے اپنے غصہ میں انداز میں غلط بیانی کے لئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فورم سے استعمال کیا۔ حالانکہ یہ میٹنگ بند دروازے میں ہوئی مگر جارج فرنانڈس کی طرف سے طلبہ کو تباہی لگائی چند باتیں کسی دوست نامہ نگار کے ذریعے باہر نکل گئیں۔ روزنامہ ٹیلی گراف نے ۱۰ مئی کو اطلاع دی۔

”آپ گورنر جنرل کو کب واپس بلانے جارہے ہیں؟ حالانکہ فرنانڈس ہر مرتبہ یہ کہہ کر بچ نکلتا۔ میں کھلے عام ان باتوں پر بحث نہیں کروں گا۔ اس سے ظاہر تھا کہ اسے اس مطالبے کے ساتھ ہمدردی ہے۔ فرنانڈس نے یہ بات واضح کر دی کہ وہ سیاسی عمل کے حق میں ہے جبکہ جگموہن اور مفتی مزید دبانے کیلئے کے حق میں ہیں۔“

جارج فرنانڈس کی اس بے جا منطق کے خلاف میں نے وزیراعظم کو یوں لکھا:

۱۶ مئی ۱۹۹۰ء

عزیز من وزیراعظم

میں ۱۰ مئی ۱۹۹۰ء کے اخبار ٹیلی گراف کا ایک تراشہ منسلک کر رہا ہوں۔ میں آپ سے گزارش کروں گا کہ آپ اس بات پر غور کریں کہ اخبارات عام میں میری ایسی صورت پیش کر کے کیا اثر کی صورت حال کے ساتھ موثر طور پر لٹنے میں جیسے مدد ملے آخر میں ریاست سے ہمت گردی کا پختہ طور پر غماز کرنے کی حکومتی پالیسی پر عمل کر رہا ہوں۔ اتفاق کی بات ہے کہ تذکرہ اطلاع کی حوالی طور پر تردید نہیں کی گئی ہے۔

آپ کا صادق

(دستخط) جگموہن

اس فیصلہ اپریل کے وسط میں جارج فرنانڈس سید شہاب الدین کو سرینگرے آیا اس کے فوراً بعد شہاب الدین نے میرے خلاف ایک ذریعہ بیان دیا۔ مدنی بھر شہادت کے بغیر اس نے الزام لگایا کہ جگموہن کو سیکولر ملک کو تباہ کرنے کی مکرر سازش میں ایک اداکار کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے بلکہ ہندو راشٹر کا قیام کیا جا سکے۔ بعض میری ایڈمنسٹریشن

کو ذلیل کرنے کے لئے مخالف کی جانچ پڑتال کے بغیر ہی اس نے الزام لگادیا کہ وادی میں اشیائے ضروریہ کی شدید قلت ہے۔ اس وقت حقیقی صورت حال یہ تھی کہ میں نے دو ماہ کے لئے حاصل ساک تیار کر لئے تھے۔ وہاں پر ۱۹۸۶ء میں ۱۶ لاکھ ٹن آٹا اور ۱۸ لاکھ ٹن کھانڈ کا ذخیرہ موجود تھا۔ درحقیقت یہ صورت حال استدر آسائش تھی کہ ماہ رمضان کے لئے میں نے ۵ لاکھ ٹن فی کس کھانڈ کا اضافی کوٹا منظور کیا تھا۔

مسلم لیگ کے لیڈر بھی پیچھے نہیں رہے۔ ان کے بیانات سے اس انسان کا ذہن بولتا تھا۔ جو ان کے پس پشت تھا۔ جرمی کو جوں سے سری ٹرنگ دار حکومت کو منتقل کرنے کے معاملے میں جبکہ عوامی طور پر مجھے ستائش حاصل ہوئی۔ سلیمانیت اور نہات والانے ایک بیان جاری کر کے کہا، کشمیر میں صحیح ماحول پیدا کرنے کے لئے سیاسی طور پر اثر رسوخ رکھنے والے افراد کے ساتھ فرنانڈس کی بات چیت کے لئے میں جگموہن کو روکا نہیں جیسا کہ رہا ہے۔ چنانچہ یہ لازمی ہے کہ جگموہن کو واپس بلایا جائے۔ جگموہن کو وہاں پر جارج فرنانڈس جتنا پارٹی کے دباؤ تلے آکر جیسا گیا ہے۔ نہ تو انہوں نے خود ہی اس غلط بیانی کے دوسرے اداکاروں نے خود ان سوالوں پر غور کیا۔ اپریل ۱۹۸۴ء میں جب مجھے جوں و کشمیر جیسا گیا اور وہاں پر پانچ برس تک رکھا گیا کیا اس وقت بھی جارج فرنانڈس جتنا پارٹی کا دباؤ تھا؟ اور میں کس طریقے سے جارج فرنانڈس کو کسی کے ساتھ بات چیت کرنے سے روک رہا تھا؟

مئی اوائل کے دوران میں یہ بات سوچنے لگا تھا کہ جارج فرنانڈس کا میرے خلاف بالواسطہ اور کم پروپاگنڈہ نفسیاتی وجہ سے ہے یا سیاسی وجہ سے۔ صورت حال میں جو خاطر کا تبدیلی لانی لگتی تھی اس سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اور یہ بات اسے منظور نہیں تھی۔ یہ بات بھی شاید اس کے لئے ناقابل برداشت تھی کہ اس بات کا سہارا لیجے لی کو جیسا تھا۔ میرے شکوک جائز تھے یا نہیں مگر یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ جارج فرنانڈس کی سرگرمیوں اور بے راہ باتوں نے صورت حال پر عدم استحکام پیدا ہوا اور مفتی اثر ہوا۔

یہ سارا تجربہ تھا کہ جب بھی ریاستی ایڈمنسٹریشن کو بالادستی حاصل ہوئی جارج فرنانڈس سرینگر جاتا اور مدنی بھر توڑ پھوڑ کرنے والوں اور ان کے شرکا کے ساتھ بات چیت کرتا جن کا ڈوبتا ہوا حوصلہ پھر بلند ہو جاتا اور وہ تجزیہ کاری کی کاروائیوں کو شے جوش و خروش کے ساتھ شروع کر دیتے۔ مثال کے طور پر ۱۵-۱۴ مئی کو جارج فرنانڈس کے دورے کے دوران میں کچھ ہوا۔ امن و قانون اور حفاظت کے محاذ پر ہمیں بالادستی حاصل ہو چکی تھی۔ سنگین مساملوں کو حل کر لیا گیا تھا۔ بجلی کی شدت کے ساتھ دھبے توڑ پھوڑ کو روکا جاسا تھا۔ ہوشیار تھے اور بھاگ رہے تھے۔ سرنگر دفتر منتقل کرنے کا کھن اور دستور نامہ مکمل کیا جا چکا تھا۔ سنگل سے جو تنگ دفینوں میں حاضری مکمل تھی گاڑیوں کی نقل و حرکت اور ٹریفک معمول پر تھا۔ حاضری کے رجسٹر اور حکومتی ڈیپو راول کھلے بازار میں فروخت کے رجسٹروں سے یہ روز روشن کی

طرح عیاں تھا۔ انتہا ناگ میں نہ تو کوئی مظاہرہ ہوا اور نہ ہی سیکورٹی فورسز پر فائرنگ کا کوئی واقعہ ہوا تھا۔ پھر جارج فرنانڈس اور اکی ٹی کے لوگ آدھکے ہم گاڑیوں کا قافلہ انتہا ناگ گیا۔ یہ دورہ قبل از وقت اتحادی ذہن پر خوف اب بھی جاری تھا۔ چند مشہور تجزیہ کاروں کے علاوہ کوئی بھی وزیر موصوفے ملتے نہیں آیا اور انہوں نے اس کا استقبال آزاد کے نعروں سے کیا۔ اس عمل کے خلاف قیادت ایک مرتبہ تجزیہ کاروں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ اس کے اثناء روزنامی عمل کا اعادہ بارہوی میں ہوا۔ شام کو فرنانڈس ٹیلی ویژن پر پیش ہو گیا جس میں اس نے بالواسطہ طور پر خطاب کو تجزیہ پیش کی کہ وہ سیکورٹی فورسز کی زیادتیوں کے خلاف اپنی شکایتیں پیش کریں۔ ان تمام باتوں کا حقیقی نتیجہ ہوا کہ ایڈمنسٹریشن کو دہشت گردی کے خلاف اپنی لڑائی میں زک پہنچی اس دورے کے بعد سرینگر میں روزیک ہڑتال رہی اور دہشت گردی کی کارروائیوں میں اضافہ ہو گیا خاص طور پر انتہا ناگ میں دوبارہ فائرنگ اور کراس فائرنگ کے واقعات ہوئے۔

انتہا ناگ کی قسمی مقام یہ تھا کہ عوامی ذہن میں یہ تاثر مروج پیدا کیا گیا تھا کہ ریاستی ایڈمنسٹریشن جبر و استبداد کا سہارا لیتی ہے جبکہ جارج فرنانڈس مہربانی کا آب حیات فراہم کرتا ہے۔ ذرا سوچئے ہندوستان شین وائر فیکٹری میں وزیر موصوف کھڑا ہے۔ روٹی اور مٹھن فراہم کرنا اس قدر عظیم گناہ نہیں بلکہ اس سے بھی عظیم گناہ اس سے چھین لینا ہے کثیر میں ہم دونوں گناہ کر رہے ہیں۔ ان باتوں سے آخر وہ کیا کہنا چاہتا تھا؟

جارج فرنانڈس نے بے موقع اشارے بھی ارسال کئے۔ سرینگر میں یو اور دور درشن سے تقریر کرتے ہوئے اس نے کہا: وزیر اعظم دشمنانہ رویہ پر تاپ سگئے نے اس بات کو منظور کر لیا ہے کہ مقامی جبر ناموں میں پرائم منسٹر کو "وزیر اعظم" اور پریذیڈنٹ کو "صدر" کہا جاسکتا ہے جبکہ اے ایسی بالترتیب پرمو جان منتری اور راشٹری کہنے کے ہے وزیر اعظم یہ بھی مان گئے ہیں کہ مقامی جبر ناموں کا اختتام "خدا حافظ" کے ساتھ کیا جائے۔ انڈین یکسپریس نے بھی لکھا تھا: "جبر ناموں کو" خدا حافظ "کے ساتھ ختم کرنا لائحہ ودولہ پر برآ اور پیچیدگیوں کا حامل ہوگا۔ یہ اصطلاح مسلمانوں کے علاوہ بہت سارے ہندوستانی استعمال میں لاتے ہیں مگر کشمیر کی موجودہ صورت حال اور بنیاد پرستانہ ادھام کی روشنی میں اس کے غلط فہمی نتائج ہو سکتے ہیں۔

نئی تکنیک

اپنی انتھک کوششوں اور تمام قسم کی جیلہ سازی کے باوجود غلط بیانی کے ہم باز قدرے عاؤس ہوتے جا رہے تھے۔ دستیاب نتائج کے پیش نظر انہوں نے سوچا کہ اگر عکس تباہ کرنا آسان نہیں۔ مختصر عرصے کے دوران تو کچھ کیا گیا تھا ملک جبر میں عموماً اس کی ستائش ہو رہی تھی۔ مرکزی وزیر داخلہ مفتی محمد سید نے ۲۵ اپریل کو جب پارلیمنٹ میں زوردار الفاظ میں مختصر عرصے کے دوران میرے "عظیم کام" کی ستائش کی تو ان الفاظ میں حکومت ہند کا جمہوری نظریہ جھلکتا تھا۔ مفتی نے کہا: جیگوبن کو ایک عہدہ میں کام کرنا پڑا۔ ایک ایسی صورت حال میں جہاں حکومت کی

امن و قانون اتھارٹی کی کوئی وقعت نہیں رہی تھی۔ اس نے دہشت گردوں کا مقابلہ کیا۔ حکومتی اہلکاروں میں ہمت پیدا کی جنہوں نے باری ہوئی بازی بھسک اس صورت حال میں شکست تسلیم کر لی تھی۔ جگوبن نے جو کچھ بھی کیا ہے اس کے پیش نظر اس کی نکتہ چینی نا انصافی کے مترادف ہوگی۔

مگر جارج فرنانڈس اور اس جیسے لوگ ہر کامیابی کو اپنے حق میں بدلنے کے فن سے واقف تھے۔ انہوں نے وی پی سنگھ کے ذہن پر اثر ڈالنا شروع کر دیا تاکہ مسلم ووٹ بنک کے لئے اس کی اندر موزوری استحصال کیا جاسکے۔ وہ جھگڑتے تھے کہ وی پی سنگھ کی طویل المدتی حکمت عملی یہ ہے کہ مسلمانوں میں رجعت پسندی شامل ہے: کہ بل بوتے پر اپنی بلیہ قائم کی جائے۔ اور بی جے پی کے اثر و رسوخ کو کم کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اس کے ذہن میں یہ خیال ڈالنا شروع کر دیا کہ کشمیر کی صورت حال میں جو بھی بہتری پیدا ہوئی ہے اس کا سہرا جنت دل کا نہیں بلکہ بی جے پی کے سر پر ہے۔

مولوی فاروق کا قتل

ان عناصر کو مولوی فاروق کے نام توقع اور افسوس ناک قتل کی صورت میں یہاں موقع مل گیا ایک ایسا کھیل ہے غیر شعوری طور پر انہوں نے خود ہی کھیلا تھا۔ انہوں نے وقت سے قبل ہی نام ہندو سیاسی عمل شروع کر دیا اور حزب الجاہل اور حزب اللہ جیسی پاکستان فوار تنظیروں میں یہ تاثر پیدا کیا کہ مولوی جارج فرنانڈس یا اس کے اہلچی کے ساتھ بات چیت کرنا ہے۔ اس بد نصیب واردات کے ساتھ تعلقی پیدا کر کے میری سبکدوشی کا مطالبہ بالکل غیر واجب تھا۔ یہ غلط بیانی کی ہم کا ایک حصہ تھا۔ اسی لئے ہر وزیرک کرنے کے بعد میں نے امر کشمیر کے تمام دائرے میں سپریم کورٹ تجویز سے تحقیقات کا مطالبہ کیا۔ نہ ہی حکومت اور نہ ہی ان لوگوں نے اس کا کوئی جواب دیا۔ حقیقت عیاں ہو کر ان کے سامنے حقائق اور ان کے ہاتھوں میں غلط بیانی کے ڈھول پھٹ کر رہ جاتے۔

۲۱ مئی کو صدر پیش کا خاص نمائندہ وزیر اعظم کے ساتھ گفت و شنید کے لئے نئی دہلی آنے والا تھا اس سے ایک دن قبل سے پاکستانی وزیر اعظم کے ساتھ تباہ خیالات کے لئے اسلام آباد جانا تھا۔ ہمیں خدشہ تھا کہ ۲۱ مئی کو تجزیہ کار کشمیر میں گھوڑ پیدا کریں گے اور وسیع تر تشہیر حاصل کرنے کے لئے ہڑتال اور مظاہرہ کا اہتمام کریں گے۔ اعلیٰ سطح کے اندرونی گروپ کے ساتھ اپنی روزمرہ کی شاہ کے وقت ٹینک میں پولیس اور فوجی دستوں کے سربراہان کو میں نے ہدایات دیں کہ شدید ترین اشتہار کے باوجود بھی ضبط کا مظاہرہ کیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو فائرنگ سے احتراز کیا جائے۔

۲۱ مئی کو میرا عوامی شکایات کی سماعت کا دن تھا۔ سول کرفیو کی کال کے باوجود ایک سو کے قریب افراد میرے ساتھ ملاقات کے لئے آئے۔ شہر میں سب امن و امان معلوم ہو رہا تھا اور میں عوامی سماعت میں

معروف تھا تو دو پہر کے وقت ڈائریکٹر مشیر کشمری ٹیڈ چیوٹ کا بھٹے ٹیلی فون موصول ہوا کہ مولوی فاروق کو گولی مار دی گئی ہے۔ انٹی چیوٹ میں اس کا آپریشن چل رہا ہے جہاں ایک بھاری جرم جمع ہو چکا ہے۔ وہ ہسپتال کے دروازوں کو ڈکڑ رہا ہے اور آپریشن تھیم پر پتھر برس رہا ہے۔ میں نے فوراً ڈائریکٹر جنرل آف پولیس کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ بھٹے بتایا گیا کہ وہ میڈیکل انٹی چیوٹ کے راستے میں ہے۔ اطلاع موصول ہوئی کہ ایڈیشنل ڈائریکٹر جنرل بسمل وال پٹیل ہی وہاں پہنچ چکے ہیں اور اسے تلاش کیا جا رہا ہے تاکہ وہ میرے ساتھ ٹیلی فون پر بات کر سکے۔ بھٹے ایک اور اطلاع موصول ہوئی کہ مولوی انتقال کر گیا ہے اور جو جرم اس کی لاش چھین لی ہے جسے کروہ شہر کی جانب بڑھ رہا ہے۔ مسلسل کوششوں کے بعد ڈی آئی جی اظہر عالم کے ساتھ رابطہ قائم کیا جاسکا۔ اس نے بتایا کہ حوال میں گولی ٹیل گئی ہے جس میں ایک شخص ہلاک ہو گیا ہے۔ اسی میں نے فون رکھا ہی تھا کہ میرے پیغام کے جواب میں ڈی۔ آئی جی اسی آئی ڈی صوری نے بھٹے ٹیلی فون کیا۔ اس نے بھٹے بتایا کہ وہاں اور زیادہ جانی نقصان ہوا ہے اور وہ پوزیشن کی جانچ کر رہا ہے۔ مجھے پریشانی ہوئی مگر تب تک بدترین واقعہ ہو چکا تھا۔

اس واردات کے بارے میں ڈائریکٹر جنرل آف پولیس نے جو رپورٹ بھٹے ارسال کی وہ حسب ذیل ہے۔
 ۱۲ مئی کو۔ ۱۱ بجے دو افراد مولوی فاروق صدر عوامی مجلس عمل کے ساتھ ملاقات کے لئے اس کی رہائش گاہ گلین میں آئے۔ اسی وہ افراد مولوی کے ساتھ ہی تھے کہ ۲۵-۱۸ برس کی عمر کے تین افراد وہاں پہنچے اور انہوں نے جوکیدار غلام قادر صوفی سے کہا کہ مولوی کے ساتھ ان کی ملاقات کا وقت پہلے طے ہو چکا ہے۔ انہوں نے ۵/۲۰ منٹ تک انتظار کیا اور اس کے بعد انہیں جلنے کی اجازت دے دی گئی۔ اس سے قبل آئے دو افراد جا چکے تھے اور یہ بھی افراد اندر چلے گئے۔ مولوی کا سیکریٹری سید رحمان گس اور ایک دوسرا جوکیدار ایک الگ کمرے میں موجود تھے۔ یہ یوتھان مولوی کے ساتھ ۱۵/۲۰ منٹ تک رہے اس کے بعد مولوی پر ۲۵/۲۰ پستول سے گولی چلائی گئی۔ مولوی کو سرکندھے اور پیٹ میں گولیاں لگیں اور نازک حالت میں اُسے مشیر کشمری ٹیڈ چیوٹ آف سائنسز صوبہ لے جایا گیا۔ مولوی کا آپریشن ہوا مگر وہ گولیوں کے زخموں کی تاب نہ لا کر ۲۵/۲۰/۱۲ بجے بعد دوپہر چل بسا۔

غلام قادر صوفی جوکیدار کے مطابق یہ یوتھان کشمیری بولنے والے تھے قمیص پہنا جاتے اور دوڑنے والے جوتے JOGGING پہنے ہوئے تھے۔ تنوع جسم دریا قد اور گورا رنگ تھا۔ صوفی نے ایک قاتل کو پکڑ لیا مگر اس نے جوکیدار کو ایک طرف پھینک کر خود کو اس کی گزرت سے رہا کر لیا۔ اس نے قاتلوں کا یونیورسٹی گریٹ تک متاقب کیا جہاں سے وہ غائب ہو گئے۔

مولوی کے زخمی ہونے اور بعد ازاں اس کے انتقال کی خبر کو اس کے حمایتی باہر بازاروں میں نکل آئے۔ اور ہجوم کے جنون و غصے کے نظارے جلدی دکھائی دینے لگے۔ حالات کو قابو میں رکھنے کے لئے صبح ۳۰-۱۲ بجے متاثرہ

علاقوں میں کرنیو نافذ کر کے امن قائم کر دیا گیا۔ قریباً ۱۳۰۰ بجے پریجن ہجوم نے راجوری کدل میں سی آر پی ایف کی ایک چوکی کو تباہ کر دیا اور ایک سی آر پی ایف کا ہینڈلٹ اور اس کے آٹھ جواخوں کو زخمی کر دیا۔ سی آر پی ایف کو گولی چلا نا پڑی جس سے ایک شخص گولی لگنے سے ہلاک ہو گیا۔

۲۵/۲۰ افراد پر مشتمل ایک ہجوم صورہ کی طرف سے۔ راجوری کدل جا رہا تھا اسے سی آر پی ایف اسلام آباد کالج کے نزدیک حوال میں روک لیا۔ اہل جلوس نے سی آر پی ایف پر پتھر برسائے شروع کئے۔ اور عسکریوں نے لے کے، ۴۴ رائفلوں سے تین اطراف سے فائرنگ شروع کر دی۔ اور حوال میں سی آر پی ایف چوکی پر حملہ کیا سی آر پی ایف کو گولی کا جواب دینا پڑا۔ اور کلاس فائرنگ میں اور بھی بھارتیہ میں متعدد افراد زخمی ہو گئے۔ گولی لگنے سے ہلاک ہونے والوں کی تعداد ۲۴ ہے۔ مجموعہ افراد کو مشیر کشمری ٹیڈ چیوٹ منتقل کر کے امن وامان قائم کیا گیا۔

اس کے ساتھ ہی پاکستان نواز عناصر نے وسیع تر پیمانے پر یہ افواہ پھیلا دی کہ قاتل عسکری نہیں بلکہ کشمیری تھے۔ اس کا مقصد فرقہ وارانہ تشدد کو ہوا دے کر امن کو تباہ کرنا تھا۔ اس پر ویسٹ بنگلہ کی تردید کرنے کے لئے فوجی اقدامات کئے گئے اور سیکورٹی فورسز کی جو سب سے حالات قابو میں رہے۔

جوکیدار کے بیان کا آزاد ذوق غالب اس طرح ہے۔ میرا نام غلام قادر صوفی ولد سلام صوفی ہے اور میں سکندر گڑھ ہوں۔ میں مولوی صاحب کے گھر میں ملازم ہوں۔ چونکہ مالی نہیں آیا تھا چنانچہ میں خود گھر میں ایک نالی کے ساتھ گلاب کے پودوں کو پانی دے رہا تھا جبکہ مقبول باہر جا رہا تھا تو تین افراد نے گیٹ کھولا۔ محمد مقبول نے ان لوگوں کے نام دریافت کئے اور انے کا سبب پوچھا۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ وہ ایک روز پہلے ہی آئے تھے۔ اور مولوی صاحب نے تذکرہ تاریخ کو ملاقات کا وقت مقرر کیا تھا۔ وہ اس سے ملنا چاہتے تھے۔ اس مقصد سے وہ داخل ہو گئے۔ مقبول نے مجھے کہا کہ میں ان کے ہمراہ جاؤں۔ میں نے کہا کہ چونکہ میں معروف ہوں اس لئے وہ خود جانے بغیر میں اندر چلا گیا وہ سیکریٹری کو اپنی شناخت بتا رہے تھے۔ سیکریٹری نے مجھے کافی پیرزہ دیا جو میں اندر لے گیا۔ مجھے انتظار کرنے کے لئے کہا گیا۔ ۵ سے ۱۰ منٹ بعد میں باہر چلا گیا جو جہی میں باہر آیا میں نے دھماکے کی آواز سنی اور اس کے بعد بار بار گولیاں پلٹنے کی آواز آئی۔ میں نے ریوا لوروا سے شخص کو پکڑنے کی کوشش کی۔ اس ریوا لوروا کا رنگ سیاہ تھا۔ اس نے مجھ پر گولی چلانے کی کوشش کی مگر میں نے اسے بائیں جانب جھکا دیا۔ اس کے پیچھے آ رہے دو افراد نے مجھے ایک طرف دھکیل دیا اور بھاگ گئے۔ میں نے یونیورسٹی کے گیٹ تک ان کا تعاقب کیا جہاں میں چھوٹا گھر پر ملازمین چلا رہا تھا۔ خدا یا مولوی صاحب مارے گئے۔

مولوی نے ریاستی حکومت کی طرف سے پیش کی گئی سیکورٹی قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور بیانات دیکھا تھا کہ وہ یہ رپورٹ تمام داستان خود بیان کرتی ہے۔ اس میں گورنر کہاں ہے۔ دوا آئی جی۔ آئی جی جی ایس ایف اور آئی جی سی آر پی کے تحت ابتدائی تحقیقات کا حکم بھی دیا گیا۔ فوری کام یہ تھا کہ زید خونیو بڑی سے احترام کیا

جائے اور اس صورت حال کو قابو میں لایا جائے جو اچانک اور غیر متوقع طور پر نہایت دھماکا خیز صورت اختیار کر چکی ہے۔ یہ کام نہایت کامیابی کے ساتھ کیا گیا اور رسم تدفین کسی واردات کے بغیر گزر گئی۔ اس معاملے پر کسی نے توجہ نہیں دی۔

اس واقعے کے بارے میں چند مخصوص نکاتوں کا جائزہ کرنا لازمی ہے۔

اول یہ کہ میں نے تمام اشروں کو نہایت دیہی کو ممکنہ حد تک مکمل ضبط کے ساتھ کام لیا جائے کیونکہ بیس کے نئی دہلی دورے کے موقع پر پاکستان نواز تحریک کا گروپ گڑبڑ پیدا کر سکتے ہیں۔ دوم یہ سب اہلک طور پر ایک دو گھنٹوں کے اندر ہو گیا۔ مجھے موقع نہیں ملا کہ میں صورت حال کا چارج خود سنبھال لوں۔ سوم جو جویم سی آر پی کے ساتھ ٹکرایا وہ جلوس جنازہ کا حصہ نہیں تھا اس نے مقتول لیڈر کی لاش بے احترامی کے ساتھ چھین لی کیمنٹریز اور تشدد پہلے سے ہی سوچے کچھے منصوبے کے تحت شروع کیا گیا تھا۔ دہشت گرد مولوی کے حملہ متحمل کے جیس میں ہجوم میں گھس آئے تھے۔ چہارم ڈائریکٹر جنرل پولیس اور ایڈیشنل ڈائریکٹر جنرل سہروال ہسپتال کی پولیس ایک ہیورج چلے تھے۔ مؤثر انداز میں وقت میں تھا جب اس خفلف رنگ ہجوم نے لاش کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ بد قسمتی کی بات ہے کہ وہ خاموشی سے کھسک گیا۔ اگر وہ ہجوم کے ساتھ گیا ہوتا ایک سینئر انسپکٹر چارج میں پولیس کا ایک مضبوط دستہ اگر ان کے ہمراہ چلتا تو اس واردات کو روکا جاسکتا تھا اور اگر دہشت گردوں کی طرف سے فائرنگ کے جواب میں گولی چلانا ناگزیر رہتی تھا تو جانی نقصان کم سے کم کیا جاتا یا یوں کہیے کہ میری طرف سے جاری متذکرہ بالا ہدایات کی روشنی میں اس کا کردار نہایت غیر ذمہ دارانہ رہا۔ ایسے موقعوں پر لازمی تھا کہ اس جیسا سینئر انسپکٹر قیادت فراہم کرے پہل قدمی کرتا ہے یہ بات ریکارڈ کا حصہ ہے کہ مولوی کو سیکورٹی فراہم کرنے کی پیشکش کی گئی تھی مگر اس نے بار بار انکار کر دیا تھا۔ درحقیقت چند روز قبل ہی مولوی کوادی میں طوفان کی بابت بولتے ہوئے کہا تھا: "یہ عوامی تحریک ہے اور میں ایک عوامی شخصیت ہوں بے کسی کی سیکورٹی دیکار نہیں ہے۔" اس واردات کے ایک ماہ قبل مجھے اطلاع موصول ہوئی تھی کہ انٹ ناگ کے قاضی خٹار کو اغوا کیا جاسکتا ہے اس وقت مجھ نے ایک تحریری نوٹ ڈائریکٹر جنرل آف پولیس کو ارسال کر کے مشورہ دیا تھا کہ اگر وہ مذہبی چاہے تو بھی اُسے سیکورٹی فراہم کی جائے ڈائریکٹر جنرل نے اس بات پر بھی شکل مجھے بتائی تھی سیکورٹی اہلکار کسی شخص کی حفاظت کیسے کر سکتے ہیں جب وہ انہیں اپنی پہچان میں جھانسنے سے انکار کر دے یا غیر متعلقہ شخصوں پر یہ الزام عائد کر دے کہ اس کی حفاظت کیلئے اس کی جگہ پر تو اس صورت میں کیا موقف اپنایا جائے۔ یا وہ یہ سوچے کہ اُسے سیکورٹی فراہم کرنے کا مقصد اُسے مزید خطرے میں ڈالنا ہوگا کیونکہ اس کا مطلب یہ بھی لگایا جاسکتا ہے کہ وہ حکومت کے قریب تھا۔ ششتم یہ کہ قاتل انفرادی مولوی سے واقف تھے ورنہ تو سیکورٹی نے کاغذ کا پرزہ اندر بھیجا ہوتا اور نہ ہی مولوی نے انہیں اندر بلایا ہوتا۔ ساتویں گولی دس چند درہ منٹ بات چیت کے بعد چلی۔

ششما کے ذوالا امام سہو نکات - تھانہ کے سرور محمد - الامام محمد - الامام محمد - الامام محمد

لیکن وہ اس معاملے کی حقیقت سے ڈیڑھی نہیں رکھتے تھے۔ ان سبھی کا مقصد اکٹھے مل کر حقائق کو توڑنا موڑنا اور صرف غجبر پری حملہ کرنا تھا۔ انہوں نے یہ ڈھول اتنے زور سے ساتھ بیٹے کہ جو حکومت بہت ساری بیساکھیوں کا سہارا لے کر چل رہی تھی کھسک گئی چند رشک سے جان بوجہ کہ حکومت کو پریشان کیا۔ اس نے مجھ پر الزام لگایا کہ میں نے "رسم تدفین کے تقدس کو ختم کر دیا ہے" واقعات کو جان بوجہ کہ توڑنا موڑنا کیا کیونکہ تجزیہ و تکفین کی رسم اس روز ادا نہیں ہوئی۔ میری طرف سے بیان کردہ سات حقائق سے حقیقی صورت حال عیاں ہوتی ہے مگر انہیں نظر انداز کر دیا گیا امام بخاری نے بھی اپنا دباؤ ڈالا۔

ایک اور غلط تاثر کو دور کیا جانا لازمی ہے۔ انڈیا ٹوڈے کے ساتھ انٹرویو میں مفتی محمد سعید نے کہا تھا کہ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ مولوی فاروق کو "حفاظتی حراست" میں لے لیا جائے۔ یہ بات پسے طور پر درست نہیں ہے مفتی اکثر کثیر کی صورت حال کی بابت میرے ساتھ ٹیلی فون پر بات چیت کیا کرتا تھا۔ اس کا مشورہ تھا کہ مولوی اشتعال انگیز تقریریں کر رہا ہے چنانچہ اسے گرفتار کر لیا جائے۔ میں نے ہندو ازاں اس معاملے پر اشروں کے ساتھ غور و خوض کیا عام رائے یہ تھی کہ ویسا کرنا واجب نہیں ہوگا۔ اس کا مطلب ہوگا کہ ایک اور محاذ کھول کر مولوی کے چارج حمایتیوں کے ساتھ براہ راست محاذ آرائی کی جائے۔ اس کی بجائے یہ سوچا گیا کہ مولوی فاروق پر غیر ملکی زبرداد کی خلاف ورزی پر مقدمہ چلایا جائے جس پر حکومت ہند تین برسوں سے زور دے رہی تھی۔ میں نے یہ فائل طلب کی۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ ریاستی حکومت نے مرکزی حکومت کی اس گزارش پر کوئی کارروائی نہیں کی تھی۔ میں نے یہ حکم جاری کر دیا کہ حکومت ہند کے مشورے پر مقدمہ چلانے کی کارروائی شروع کی جائے۔

یہ بھی واضح نہیں کہ حفاظتی حراست کا آخر کیا مطلب ہے کیا قانون اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ کسی شخص کو محض اس لئے گرفتار کر لیا جائے کہ اُسے دوسروں کی طرف سے زک پہنچائے جانے کا خدشہ ہے۔ مزید برآں اگر مفتی کو یہ معلوم تھا کہ مولوی کی جان کو خطرہ ہے تو اسے ریاستی حکومت کی طرف سے مولوی کو فراہم سیکورٹی پیش کر کے منظور کرنے کے لئے مولوی کو زوردار مشورہ دینا چاہیے تھا اور ریاستی حکومت کو بھی مناسب طور پر تحریری مشورہ دینا چاہیے تھا

مقتل پر

۲۴ مئی بعد دوپہر مجھے داخلہ سیکرٹری نریش چندر کا ٹیلی فون آیا اس نے کہا کہ وزیر داخلہ کثیر کے معاملے پر پارلیمنٹ میں بحث کے سلسلے میں میرے ساتھ چند نکاتوں پر ضروری بات چیت کرنا چاہتے ہیں چنانچہ اس مقصد کے لئے میں شام کو خاص ہوائی جہاز سے دہلی آ جاؤں۔ میں نے داخلہ سیکرٹری سے کہا کہ میں بہت زیادہ مصروف ہوں اور اگر زیر بحث معاملے کا تعلق تول میں فائرنگ کے ساتھ ہے تو میری

باب سولہ

درد کو طویل تر کرنا

”جنگل میں کوھٹایا جانا
ہماری توقعات میں اضافہ
وی۔ پی۔ سنگھ کے فیصلے کا شکریہ!
آئندہ پندرہ روز تک
ہم نے اپنے آپ کو استوار اور مستحکم کر لیا +
جونی کا دبشت گرد

تعلل کا پھوڑا ایک جانا

کشمیر کے معاملے میں ہندوستان نے کامیابیوں کو تعلل میں تبدیل کرنے کے عجیب و غریب خودکشی کے رجحان کا مظاہرہ کیا ہے۔ اپنا استغنیٰ دینے کے تین گھنٹے کے اندر پھر ہوائی جہاز میں بیٹھ کر جب پری نگر واپس آ رہا تھا تو اپنی ڈائری میں یہی پہلے چند الفاظ تھے جو میں نے درج کئے۔

یہ خاص جہاز ایک پرائیویٹ AVRO تھا۔ غلطی کے تین اراکین کے علاوہ صرف میری بیوی اُمابی اس جہاز کے مسافروں میں شامل تھے۔ وہ شروع سے ہی اس ہمدے کو منظور کرنے کی غالی رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ میں خود پر بہت زیادہ بوجھ ڈال رہا ہوں۔ مگر آج اس نے یہ نہیں کہا۔ میں نہ کہتی تھی۔ وہ اپنی چوٹی سی

+ یہ انت تال کے ایک چوڑے دبشت گرد منظور کے الفاظ میں جو اس نے رسالہ انڈیا ویک ۳۰ اگست ۱۹۹۰ء سے ایک انٹرویو کے دوران کہے۔ صبح الفاظ یوں ہیں۔

”جہاں مرغ بدلتا ہے کیا بگڑے کے بٹائے جانے سے توقعات پیدا ہوں؟ منظور ہوتا ہے۔“ ہاں آئندہ ۱۵ دن تک بھرنے

دنیا میں ہی محوری۔ وہ ہندوستانی عورت کی چند بہترین روایات کی علامت ہے۔ اپنے عزیز و اقارب کے لئے مصیبتیں جھیلنا اور خود کو مکمل طور پر منسلک کر دینا۔ میں نے بار بار اسے مشورہ دیا تھا کہ دہلی میں ہمارے فرما بزار پتوں۔ دیکھا اور اس کا شوہر راجیو اور من موہن اور اس کی بیوی تو تن کے ہمراہ رہے۔ مگر اس نے تنہائی کے چار دردناک مہینے راج بھون کی کھلی چھت پر غالی کھو کھلی دیواروں کو دیکھتے ہوئے گزیر دیئے جبکہ میں صلی طور پر یہ تمام عرصہ میز میوں کے نیچے واقع دفتر میں گزار دیا۔ شاید یہی قدریں ہیں جو ہمارے سماج کو مصیبت کے دہلی میں بھی پلتا رکھتی ہیں۔

جہاز کے خالی بننے میرے ذہن پر بوجھ ڈال دیا۔ حالانکہ میں نے راجیو بھائی کی رکنیت کے لئے حامی تو بھری تھی پھر بھی مجھے یقین نہ تھا کہ میں خود رستہ کیا ہے۔ کیا مجھے اپنا احتجاج مزید واضح نہیں کرنا چاہیے تھا؟ کیا مجھے یہ واضح نہیں کر دینا چاہیے تھا کہ پشت میں چھرا کھوپنے جانے کے بعد مجھے اس سلا کا ذائقہ نہیں آئے گا۔ جوبلیٹ میں ڈال کر میرے سامنے رکھا جا رہا ہے؟

مجھے اس بات سے بھاری مایوسی ہوئی تھی کہ حقیقت کو شکست حاصل ہوئی تھی اور پروین گنڈہ کو فتح ملی تھی۔ جہاں سٹورٹ مل کا یہ مشاہدہ؟ حقیقت کی عقوبت پر ہمیشہ فتح ہوتی ہے ایک ایسی خوشگوار حماقت ہے کہ انسان اس کا اعادہ کرتا ہے مگر تجربہ اُسے محسوس کر رکھ دیتا ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے تیرہری تھی۔ میری فطرت میں شامل نہیں کیا اس قنوطیت یا کیفیت کے جذبات فیم بر غالب آجائیں۔ میں نے ذہن کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی اور باہر لا محدود افق کی جانب دیکھنے لگا جس میں جگہ جگہ بھورے بھاگدار بادل گزر کر سورج کو اندھا کر رہے تھے۔ بدلتے ہوئے سایوں کا اپنا ہی ایک بیجا تھا۔

ہوائی جہاز کی نشست رفتار کو رفت دے رہی تھی معلوم ہوتا تھا کہ سفر ختم ہی نہیں ہوگا۔ جہاز کے عملے کا ایک رکن میری نشست کے پاس آیا اور کہا: جناب! ہم سر ہنگر تک نہیں پہنچ سکتے۔ ہاتھ پاؤں پر موسم خراب ہو چکا ہے بہت کم نظر آ رہا ہے۔ یہ جہاز بہت زیادہ اونچا نہیں اڑ سکتا۔ ہیں جوں کی طرف جانا ہوگا۔

قریباً نصف گھنٹے کے بعد ہمارا جہاز تہوں ہوائی اڈے پر اترنا۔ جہاز سے ڈوئز ٹرل کمیشنر جوں کی گھر متعلق حکام کے نام ایک دائر نویس پیام ارسال کیا جا چکا تھا۔ وہ ہوائی اڈے پر موجود تھے۔ ان کے جہروں پر خاموش تاثرات واضح کر رہے تھے کہ یہ سب جانتے ہیں کہ کیا کچھ گزر چکا ہے۔ کسی نے بھی اس موضوع پر تذکرہ نہ بھیڑا۔ خاموشی کی زبان میں غفلتوں کی نسبت زیادہ بیان ہو رہا تھا۔

انہوں نے راج بھون تک مجھے زیادہ بچے راستے سے چلنے کیلئے تھجھکات طلب کی۔ شہر کے اندرون سے تھجھکات گزرتا تھا اس سے برعکس باہر سے پتھر کاٹ کر جانا پڑا۔ مجھے بتایا گیا کہ دوکانیں اور دوسرے ادارے بند ہو چکے ہیں اور لوگ دیہی سٹیجہ اور جارج فرنانڈس کے خلاف زوردار مظاہرے لگاتے ہوئے سڑکوں پر نکل آئے ہیں اور کچے میں کوہ گونز کو جانے نہیں دیں گے۔

میں بہت تنگ چکا تھا۔ میری بیوی بھی فزباً لگا چکی تھی شستہ دواؤں گھن بھرے سفر نے اپنا اثر دکھادیا تھا۔ ذہنی تناؤ سے نوا دی نہیں تگم خم ہو جاتی ہیں مزید پچاس منٹ کا گاڑی کا سفر میں نے سوچا یہ مزید تکلیف دہ ہو گا مگر میں خود ہی کسی پریشان کن صورت حال کو ٹالنا چاہتا تھا۔ اگر لوگوں نے مجھے شہر کے اندر سے گزرتے ہوئے دیکھ لیا ہو تو عین ممکن تھا کہ وہ مجھے روک لیتے۔ وہ اپنا صبر و تحمل کھو بیٹھتے اور کسی متشدد صورت یا دوسرے طور پر مرکزی حکومت کے خلاف اپنے غصے کا اظہار کرتے۔ چنانچہ میں نے طویل تر راستہ اختیار کیا مگر مجھے اس کا صلہ بھی مل گیا۔ ہمارا گاڑیوں کا قافلہ ہمایا سٹی فارسٹ سے گزرا، جس کی تخلیق نے مجھے بھاری سکول اور راحت عطا کی تھی۔ شام کی فحش کے ساتھ ہزاروں کی تعداد میں درخت اور جھاڑیاں ہمارا استقبال کر رہی تھیں۔ ایک ٹھنڈی تیز ہوا چل رہی تھی جو دریاے توی کے کنارے کا بیڑا تھا۔

بعد ازاں شام کو مفتی محمد سعید نے شبلی فون پر مجھ سے بات کی۔ اس نے کہا کہ تمام جموں خطے میں میرے استغنے کے خلاف شدید رد عمل ہوا ہے اس نے تجویز کیا کہ عوام کا فہم رام کرنے کے لئے میں اپنا ذاتی اثر و رسوخ استعمال کروں اور انہیں بتاؤں کہ میں بیگزروی ہیئت کے تمام پرعامور ہو رہا ہوں۔ حالانکہ مرکزی حکومت کی فریب کاری سے میرے ذہن میں اب بھی پیدا ہو چکی تھی میں نے مفتی سے کہا کہ اس معاملے میں وہ فکر نہ کرے۔ میں ان پر فرائض کے لئے اپنے تمام تر وسائل بروئے کار لاؤں گا۔ اسی دوران میں نے اسے اپنے اس پختہ عزم کا اظہار کیا کہ میں آئندہ روز جہدہ چھوڑ دوں گا۔

اگلی صبح میں وشنو دیوی استھان پر گیا۔ پہلے سفر کے مایوس کن تجربے کے برعکس ایک پر چند بات سفر تھا۔ زائرین کے مسکراتے ہوئے چہرے ان کی آنکھوں سے ممنونیت کے اظہار سے مجھے کافی تحریک اور فیضان حاصل ہوا۔ میں نے سوچا کہ دنیا کی ساری قومیں کسی قوم کو تباہ نہیں کر سکتیں۔ میں نئی دہلی کی پرواز پر کھڑے کیلئے ویشنو دیوی سے واپس آ گیا۔ اور میں نے یہی تعارض کو ترک کر دیا۔ احمد پاشا کے قنوطیت بھرے ماحول سے یہ تعارض بے مطلبت نہیں رکھتی تھیں شہر میں مکمل فرتال تھی۔

جموں خطے میں اس معاملے پر رد عمل کا اندازہ مقامی روزنامے کشمیر ٹائمز میں شائع ۲۸، ۲۹، ۳۰ مئی کی تین رپورٹوں سے کیا جاسکتا ہے۔

۲۹ مئی کو مرکزی حکومت کی کلروائیٹک وسیع پیمانے پر مذمت کی گئی۔

سیاسی سماجی، تاجر و مذہبی اور دیگر تنظیموں کے میانات نے یہاں اخبار کے دفتر میں سیلاب برپا کر دیا ہے۔ ان بھی نے حکومت کے فیصلے کی تکتہ بینی کی ہے۔

انہوں نے اُسے ایک بے راہ روی کا فیصلہ قرار دیا جو حکومت نے جموں و کشمیر میں جیتی صورت حال کے برعکس

کیا ہے، خاص طور پر جبکہ وادی میں دہشت گردی نے زندگی کو مفلوج کر دیا ہے۔ جگمگم ممول کے حالات بحال کرنے کی زبردست کوششیں کر رہا تھا اور وہ اپنی منزل کے قریب تر پہنچ چکا تھا۔ مگر جگمگم جیسے تنگ سپاہی کو ملک کی کجسختی اور اتحاد کی دشمن طاقتوں کی ایسا و پر محاذ سے واپس بلا لیا گیا ہے ان میانوں میں کہا گیا تھا۔ ان بیانات میں دہشت گردی کو دبانے اور وادی میں معصوم عوام کی مختلف بلاؤں کے ذمہ دار جموں کو کھڑے میں کامیابی کے قریب تر پہنچنے کیلئے جگمگم کی سازش کی گئی تھی اور کہا گیا تھا ایسے طے میں یہ ایک محکمہ فیصلہ ہے۔

۲۸ مئی کو جموں خطے کے اہم قصبوں نے مختلف تنظیموں کی طرف سے گورنر جگمگم کو واپس بلانے کے خلاف احتجاج کے طور پر ہند کی کال کا بے پناہ جواب دیا۔ پولیس کو شہر کے ایک علاقے میں اشک آؤ گیس چھوڑنا پڑی اور فائرنگ کا سہارا لینا پڑا۔

جموں کے تمام چھ اضلاع کے اہم قصبوں میں دوکانیں کاروباری ادارے اور کافے وغیرہ بند رہے بہت سارے مقامات پر سواریوں کو لے جانے والی بسیں بھی شٹر کول سے باہر رہیں۔ اس کا خاص اثر دفتر جمائیوالوں پر پڑا جہاں پر عاجزی نسبتاً کم تھی اور دیگر عوامی ادارے جہاں میں سکول، کالج اور یونیورسٹی شامل تھے بند رہے۔ جموں شہر اور دیگر قصبوں کے عدالتوں میں بھی کام بند رہا۔ وکلاء کام سے غیور حاضر رہے اور ہند میں یہ کہتے ہوئے شامل ہو گئے: "نیشنل فرنٹ حکومت نے جگمگم کو واپس بلا کر بہت بھاری غلطی کی ہے"

۲۸ مئی جموں خطے کے اہم قصبوں میں آج دوسرے روز بھی مکمل ہند ہا اس کی کال مختلف تنظیموں نے مرکز کی طرف سے جگمگم کو واپس بلانے کے خلاف احتجاج کے طور پر دی تھی۔

توہم میں حالات پر غور کرتا ہوں جہاں میں بیٹھا مجھے اس صورت حال کا انوس ہوا جہاں مجھے سرنگر گئے بغیر جہدہ سے سبکدوش ہونا پڑا، جہاں کے باشندے مجھے محبت کے ساتھ جگ وائر اور سارا کوم بکارت تھے اگر میں وہاں پہنچنے میں کامیاب بھی ہو جاتا تو موجودہ بدلے ہوئے حالات میں اس دورے کا کیا فائدہ ہو سکتا تھا؟ دہشت گرد میری بیٹھ دیکھ کر خوش ہوئے تھے۔ عام آدمی دہشت اور ڈر نے دمکانے کے زبردست پروپیگنڈہ سے کافی متلو ہوئے تھے۔ میرے پاس انہیں حقیقی صورتحال کا قائل کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر نشر ہونے والے عمل ہوتا چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ مستقبل پر اعتماد رکھوں میں نے کشمیری عوام کے نام ایک خط تحریر کیا۔ الفاظ اور محاوروں کے چت خالی مقامات کو بھرنے کے بعد اس خط کو میں یہاں پر دوبارہ درج کر رہا ہوں۔

کشمیری عوام کے نام ایک کھل خط

عزیز کشمیری سبائیو اور بھنوں!

۲۶ مئی ۱۹۹۰ء

مجھے معلوم نہیں کہ ریاست سے رخصت ہوتے وقت آپ کے نام خط لکھنے کو دل کیوں بہرہا ہے اگرچہ آج آپ میری تعلیم کو نہیں سمجھ سکیں گے۔ مگر ایک دن آپ ضرور سمجھیں گے۔

آپ میرے اس عہدہ پر دوسری بار آنے کے وقت کو ذرا یاد کیجئے کہ میں نے آپ کو مشورہ دیا تھا کہ جہاں کارواں بھول جاتے ہیں راستہ وہیں سے نئی راہیں پیدا ہوتی ہیں۔ نتیجتاً کی بات ہے کہ اس قلعے کی میری طرف سے متعینہ راستہ تلاش کیا جاسکتا تھا کہ میں آپ کو محفوظ اور خوشحال مستقبل کا راستہ دکھا سکتا تھا کچھ لوگ اس امر کی کوشش کر رہے تھے کہ میں جو بھی کروں اس کو غلط رنگ میں پیش کر کے میری کوششوں کو رائیگاں کر دیں۔

میرے عہدہ پر واری کے وقت ہی میں نے اعلان کیا تھا کہ میں ایک تراج کے طور پر کام کروں گا تاخیر نہ ہوئے زخموں کو کسی سکول اور ہسپتال تک نہ لے کر دلی کے طور پر بھی کام کروں گا۔ تاکہ مریض کی خدمت عہدہ رومی اور انسان دوستی کے جذبے سے کر سکوں جس سے پوری طرح صحت یاب کر سکوں۔ مگر انہوں نے تراج کو ایک جب آد کی صورت میں پیش کیا۔ اور نرسنگ اردی نہیں ایک اسٹائل فلکس دکھائی دینے لگا جو مقتل کے خون آلودہ غرض کو صاف کرنے کے کام پر مامور معلوم ہوا تھا۔

میں نے سچی سے بیل کی جی کہ وہ اس بات کو یاد رکھیں کہ سبھی مذاہب کا ایک بنیادی اصول ہے کہ انسانی درد سے نجات حاصل ہو اور ضرورت مند افراد کی خدمت ہی خدا کی خدمت کے مترادف ہے۔ عید الفطر کے موقع پر میں نے خاص طور پر وکالت کی جی کہ آئیے ہم اس دن کی روح کا احترام کریں اور خدمت کے تقصیر دل کے طور پر کام کریں۔ انہوں نے پرو پیگنڈہ کر دیا کہ میں فخر پرست ہوں۔

میں نے بار بار اس امر کا انتباہ کیا ہے کہ ہمیں حقیقی ہندوستان کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ ہندوستان مسلم اور سیٹھ کی سر زمین ہے اور اس کے باوجود انہوں نے مجھے ہندو و جارج کہا۔

ایک نوجوان کی موت پر میں نے اس کے والد محمد یوسف خان کو کھنکھایا تھا۔ اب کسی بھیر کی موت نہ ہوا اور ایسی صورت حال پیدا ہو سکتی۔ جہاں بازاروں میں اہل پولیس دکھائی نہ دیں اور بازار ستیا توں سے بھرے رہیں۔ وہ چلتے کیرا لویہ ہلاکو اور شہر جیسا ہے۔ میں نے ہمیشہ کو تحلیل کر کے ہر شخص کو پھر سے موقع دیا کہ وہ ووٹ کے ذریعے حکومت حاصل کر سکے۔ اس بات کو تسلیم کرنے کی بجائے کہ یہ بہت سیاسی عمل کی سب سے زیادہ منصفانہ و محنت مند انداز پہل تھی وہ اس بات کے ڈھول پیٹتے رہے کہ میں محض قانون اور نظم و ضبط کا طریقہ کار اختیار کر رہا ہوں۔

شروع سے ہی میں دہشت گردی کی نوعیت اور طرز عمل کا تجربہ کرتے رہا۔ اور اس کی کڑیوں اور رابطوں کو منقطع کرتا رہا۔ اور اس کی جتنی موضوعات کو ختم کرتا رہا۔ وہ مرضی چھپاتے رہے۔

++ ملاحظہ ہو باب اول - میرا منہ دھبہ

++ باب ۵ - ملاحظہ ہو غلط اطلاعات - اور غلط اسناد کا زعم

اور مجھے ان بیماریوں کا علاج کرنے سے روکتے رہے تاکہ جس نہر نے جس پر حملہ کیا ہے انکا جڑوں سے علاج ہو سکے۔ وہ جانتے تھے کہ ۲۰ جنوری کو ہوائی تلاشیوں اور مولوی فاروقی کے محلوں پر نام نہاد فائرنگ میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔ پھر بھی وہ جھوٹ کا برہنہ کرنے کے لئے منصوبہ بند ہم چلاتے رہے۔ آپ جلد یا بدیر ان لوگوں کی چالوں کو سمجھیں گے اور ان کے شرکار ہونے پر پختہ ہوں گے۔

ذرا اپنی تاریخ نامی قریب اور دور ماضی کو بھی دیکھئے۔ ماضی قریب میں سیاسی نصب العین کے امین کون تھے؟ کیا وہ آپ کے اپنے ہی لوگ نہیں تھے مگر وہ جموٹے رہا ہر ثابت ہوئے اور انہوں نے ناواقفانہ فرائض کی ادائیگی میں سیاسی زوال کی بیماری کس طرح اندر تک پھیلی تھی۔ اور جمہوریت کی آڑ میں بلا غلط اپنے اقتدار و ثروت اور شخصی مہکومت قائم کیے انہوں نے آپ کے ذہنوں سے کیل کھیل اور حقیقت کے ساتھ آپ کو گھومتے نہ کرنے دیا۔ جب تک وہ ارباب اقتدار رہے۔ ہندوستان کے ساتھ الحاق ناقابل تفسیر رہا اور ہندوستان سیکولرزم کی ایک جھوٹ رہا اور جب اقتدار ان کے ہاتھوں سے کمسک گیا تو انہوں نے اپنی جیموں سے سبز رومال نکال لئے اندر اس میں پاکستانی نمک لپیٹ لیا تب ہندوستان ان کے لئے ایک سامراجی طاقت بن گیا جو کشمیر کی شناخت تباہ کرنا چاہتا تھا۔ انہوں نے اپنی نا اہلیوں و دلوں جانب پسائیں اور آپ کو درمیان میں ترنزل پانی میں رکھا۔ ایسا ہونا ناگزیر ہی تھا کہ اکثر اوقات آپ کو ضربات آتی رہیں مگر انہیں اس بات کی زیادہ فکر نہیں تھی وہ اپنا اقتدار کھیل کھیلے۔ انہوں نے آپ کی تقدیر خدمت کی ہے اور اپنی ذات کی کتنی؟ آپ کو اس کا جواب معلوم ہے آپ میں سے بہت سارے افراد نے "سرخ کتاب" اور "سیاہ کتاب" پڑھی ہوئی تھی کیا وہ آپ میں سے ناخوش شخص نہیں تھا جس نے یہ لکھی ہوئی دوسروں کی بات کیا کرنا ہمارے لئے لوگ ہی ہمارے ساتھ بیٹھوں جیسا سلوک کر کے ہمارے جموں سے بے رحمی کے ساتھ ان کو کھاتے ہیں؟

بے روزگاری اور غریبوں کی تمام تر بدعظمتوں کے لئے انہوں نے مرکز حکومت کو آسانی سے مورد الزام ٹھہرایا انہوں نے ذرائع کی ضیاع کو خود برسرِ ذکر کرنے کے لئے دفعہ ۷۰ کا غلط استعمال کیا اور اقتدار کا ایک ایسا نشیمن تدبیر کا جو صرف ان کی ذات کی ہی خدمت کر سکتا تھا۔ انہیں مرکزی رقوم کا وسط سے زیادہ حوصلہ ملا رہا۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ ۱۹۸۶ میں اسی مقدار میں رقوم سے مرکز کی تعمیر کی گئیں، جیلوں کی صفائی کی گئی، شہروں کو خوبصورت بنایا گیا، ماحولی کو بہتر بنایا گیا اور دیہی ترقی کے کام اسی سرعت اور موثر رفتار سے رو بہ عمل لائے گئے کہ ریاست کا درجہ ۲۵ ویں سے ۱۰۱ ویں ہو گیا۔ ++ اگر آپ ٹھنڈے دل سے بے لاگ سوچو تو کہیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ کون آپ کا دشمن ہے کون نہیں؟

++ ملاحظہ ہو باب پنجم - دہشت گردی کی شاخیں - پوشیدہ ریستے

++ ملاحظہ ہو باب ششم - دہشت گردی کی شاخیں - دفعہ ۳۰

++ یہ درجہ ہندی حکومت ہند کے پروگرام روبرو وزارت کا پلان منصوبہ بندی کی مشین کرتا ہے۔

آپ کو طویل تاریخ سے بھی سبق حاصل کرنا ہو گا۔ آج آپ میں سے چند افراد کا جھکاؤ پاکستان کی جانب ہے اور وہ اس کے بازوئے آغوش کو قبول بھی کرنا چاہتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ یہ آخر کار ریچھ کی آغوش ثابت ہوگی۔ خدا یاد رکھنے کے لیے آپ میں سے چند افراد نے افغانستان کے تین بھی اٹھارہویں صدی کے وسط میں اسی طور پر مسکین کیا تھا اور احمد شاہ ابدالی کو دعوت دی تھی آپ کے ساتھ اس سے بڑا کبھی نہیں ہوا، ایک دفعہ آپ خود کو پاکستان کی طلائع میں دے دیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ کس قدر سختی کے ساتھ وہ آپ کو جکڑ لیتا ہے۔ پچاس یا اتنے ہی برسوں کے اندر آپ کی شناخت کو مٹا دینا چاہئے گا۔ اسلامی برادری کے نام پر آپ میں وسیع پیمانے پر تشاویاں ہونگی۔ اور وادی میں وسیع پیمانے پر آباد کاری ہوگی۔ پاکستان میں پنجابی غلبے والے حکمران ٹوٹے اور جاگیردارانہ نواب شاہی اس معاملے میں احساس یا تاسف کا اظہار نہیں کریں گے۔ آپ خود کو کہتے ہوئے پائیں گے مگر اس وقت کافی دیر ہو چکی ہوگی۔ یہاں تک کہ آپ کی آوازوں کا بھی گلا گھوٹ دیا جائے گا۔

یاد رکھئے کہ مطلق العنانیت کی بدترین صورت مذہب کی تنگ نظر تشریح اور فوجی طاقت ہے۔ عوام پر ہر ایک چیز خدا کے نام پر رٹوئی جاتی ہے یہاں بات قرون وسطیٰ کے جکھڑوں نے کی ہے اور یہی کام پاکستان میں مختلف طرح سے کر رہے ہیں۔

اس صورت حال میں آزاد شناخت کا سوال عملاً کہاں پیدا ہوتا ہے۔ جغرافیہ، تاریخ، دفاع اور ذرائع کے محسوس حقائق اس کے برعکس ہیں۔ مستقبل میں کسی ترقی کا تو سوال ہی بچی حکومت اپنے موجودہ عملے کے نصف کو بھی تنخواہیں ادا کر کے قابل نہیں ہوگی۔ کیا پاکستان آپ کو قن تنہا چھوڑ دے گا کہ کیا آپ کے خواب جلد ہی شبِ ظلمت میں تبدیل نہیں ہو جائیں گے؟

آپ کے ذہن پر شناخت کا خیال مسلط ہے مگر آپ کو اس کا مطلب پتہ نہیں۔ کیا آپ کو احساس ہے کہ اس لمحہ آپ کی شناخت ٹوٹ رہی ہے؟ کلاشنکوف کا کینسرزدہ تمدن اس کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہا ہے اگر براہ راست اصلاحی اقدامات نہیں کئے گئے تو اس کا نام و نشان تک باقی نہیں رہے گا۔

سرحد پار سے شہر پاکر آپ میں سے چند لوگ تو جو ان کو کھانا لانا فانی داستان تیار کر رہے ہیں اور ایک عظیم مستقبل کا نظریہ پیش کر رہے ہیں ان کو کوئی ایسی لافانیت ہے اور ذہنی اس قسم کا مستقبل۔ بزم کے گمراہ گمن غلے سے کوئی اچھا نتیجہ کیسے حاصل ہو سکتا ہے کسی شخص کو خیر قرار دے کر یا اس کے طرز زندگی کو غیر اسلامی قرار دے کر اس کا قتل کر دیا جاتا ہے۔ اس معاملے کا فیصلہ کون کرتا ہے؟ وہ شخص خود جس نے الزام لگایا ہوتا ہے مجھے ایک بے بس ولا چار لڑکی کی بابت معلوم ہے جسے محض اس لئے گولی مار کر قتل کر دیا کہ اس کا طرز زندگی غیر اسلامی تھا۔ الزام لگانے والے نے فیصلے کا اعلان کر دیا۔ بے جا سارے باپ کو کھلے عام ایکسے پر غبور کیا گیا کہ اس کے خلاف الزامات درست تھے۔ اگر وہ نہیں چاہتا کہ اس کا انجام بھی اس کی بیٹی جیسا ہی ہو تو اس کے سوا اور چارہ بھی کیا تھا؟ آپ یہی نتیجہ خراہ کے ارتکاب کی اجازت دیں گے۔

جب جنوں اور غصے کا موجودہ دور ماند پڑ جائے گا تو آپ محسوس کریں گے کہ آپ کے ساتھ فریب ہوا ہے۔ اگر آپ ٹھنڈے دل کے ساتھ گہرائی سے سوچیں تو آپ اس مذاق کے احوالوں کو کچھ حاشیہ کے جو آپ کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ آپ کو محسوس ہو گا کہ آپ اس دشمن کا تخیل کر رہے تھے جس کا سرے سے ہی وجود نہیں آپ کو ان سراہوں کے پیچھے دوڑا یا گیا جہاں مفروضہ "کافر" آپ کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں۔ ایک وقت آئے گا جب آپ تھک جائیں گے۔ آپ کی انہی پیدا کردہ بھیتوں کو تب تک نقصان پہنچا دیا ہو گا۔ تھکاوٹ طویل تر ہوتی جائے گی۔ اور ہو سکتا ہے کہ یہ آپ کو نالوں اور لاغر بنا دے۔

یہ کوئی ایسی نقلی کجہتی نہیں جسے مذہب کی تنگ نظر تشریح کے ذریعے عمل میں لایا گیا ہو بلکہ بیدار مغز سیاسی نظام اور فیضان یافتہ روحانیت سے آپ کے معاہدے حل کے وسیع آثار پیدا ہونگے۔ اور حقیقی آزادی اور حقیقی ترقی کا دور شروع ہو گا۔ ہماری تاریخ کے میلے کچلے صفحات کشمیر میں اصلاح اور اس میں نئی طاقت چھونکنے کی اشد ضرورت پر زور دیتے ہیں جو اصلاح شدہ اور زیادہ طاقتور ہندوستان میں خوشحالی کے ساتھ وابستہ ہے گویا انہیں ہوتا تو دنیا تیسرے درجے کے وجود میں ڈوب کر رہ جاتی تھی۔

وقت کے تعصب اور ماضی کے دامنوں کے برعکس میں نے ایک منصفانہ صورت حال پیدا کرنے کی سعی کی جہاں آپ بھی کوئی قیادت پیدا کرنے یا قدیم قیادت کو مستدل کر کے منتخب کرنے کا موقع مل جائے اور آپ نے طرز ترقی اور انسانی اور متوازن نظام کے لئے کام کرتے ہوئے دنیا دور وحالی سیکولرزم پر ہوتی۔ حقیقی سیکولرزم جس کے اصولوں کی قدر مذہب کی بنیادوں سے پیدا ہوتی ہیں۔ وہ بنیادی اصول جس کے بارے میں خندرتشی اور مل دید نے ان الفاظ میں کہا ہے: "ایک خدا ہے جس کے سوا نام نہیں۔ کوئی تنہا کا ایسا نہیں جو اس کی پرستش نہیں کرتا"۔

مگر وقت کی ہوا میرے موافق نہیں تھی۔ بے روح ہندوستانی سیاسی نظام نے ذہن آلودہ تیروں سے بار بار ٹھہر کر حملہ کیا مگر روح اور خون سے لت پت میں ریاست سے رخصت ہو رہا ہوں۔ تحریک کاری اور غلط بیانی کی فوٹول کا یہ مولیٰ سا جرم ہو گا مگر سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ عوام کے بشمول درد کو طویل تر کیا جائے۔ مجھے یقین تھا کہ یہ دود میں ایک دو ماہ کے عرصے میں ختم کر دیتا۔

اس خط میں میں ان تمام واقعات کو سپرد قلم نہیں کر سکتا جو رونما ہو چکے ہیں اور یہ ہیں یا مستقبل میں رونما ہو چکے ہیں۔ روز میں ان تمام کے بارے میں کھولوں گا۔ آپ بچہ حقیقت کا فیصلہ کریں گے۔ آپ کے لئے جلدی امن کی بجالی اور موجودہ بیماری سے صحتیابی کے لئے دعا گو ہوں۔

آپ کا صادق

جگمگ

نئی دہلی سے اپنے عہدہ سے دست بردار ہونے کے بعد وزیراعظم اور وزیر داخلہ کے ساتھ میں نے الگ الگ ملاقاتیں کیں۔ دونوں نے میرے شروع جذبات کو کثرت میں لے کر کشش کی، میری خدمات کی ستائش کی اور سرپرست

میں راجہ سبھا میں فائدہ مند کام کر سکتا ہوں۔

اپنے سیاسی ڈھانچے کے بارے میں میری رائے بہت بری تھی۔ اس کے باوجود وزیراعظم وی پی سنگھ کا بیان دیکھ کر مجھے صدمہ پہنچا جس میں اس نے کہا تھا "جگمگہن نے اپنی مرضی سے استعفیٰ دیا۔" میں نے اس قسم کا کچھ نہیں کیا تھا کیا اس کی کوئی سیاسی فہموریاں تھیں یا وہ اپنی کابینہ میں چند رفقاء اور جموں خٹے کے ایک اچھے خاصے حصے کے غصے کو رام کرنے کی کوشش کر رہا تھا؟ اس کے بعد مرکزی وزیر کمارس ارون نہرو نے کہا "جگمگہن نے بہت اچھا کام کیا۔ کابینہ میں ہم جو بھی کرتے ہیں اس میں سے ہر کام درست نہیں ہو سکتا۔ وی پی سنگھ نے صورت حال کو توازن بنانے کا کام بھی کر دیا۔" ۲۶ مئی کو اس نے جارج فرنانڈس کے تحت امور کشمیر کا شعبہ اور کل جماعتی کمیٹی کو تحلیل کر دیا۔ راجہ سبھا کی رکنیت کے بارے میں میرے ذہن میں دو بار اڑے تھے۔ آخر کار میں نے اسے قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ سلامتی کے علاوہ میرے نزدیک جو بات زیادہ وقت لگتی تھی وہ یہ کہ میں اس فورم سے حقیقت کی جنگ لڑ سکتا تھا، مگر یہاں بھی مجھے مایوسی کا سامنا کرنا تھا۔ مجھے اس بات کا احساس نہیں رہا کہ ہندوستانی اداروں کی روح ان کے پس پردہ کارفرما جذبہ سبب منبع سے ہی خشک ہو چکے ہیں۔ سبھی کو خشک سالی کے حالات درپیش ہیں۔ اور راجہ سبھا کا معاملہ اس سے الگ نہیں تھا۔

راجہ سبھا میں ٹوکا ٹاکی اور روکاوٹیں

۲۰ مئی کی صبح کو راجہ سبھا کے چیمبر میں نے مجھے "خاص تذکرے" کی اجازت دے دی جس کا تعلق کشمیر کی صورت حال کے بارے میں صریحاً غلط بیانی کے ساتھ تھا۔ میں نے بول کہا شروع کیا۔

"میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کشمیر کے بارے میں جان بوجھ کر غلط بیانی کے پرچار سے کام لیا جا رہا ہے۔ مجھے توقع ہے کہ یہ ملک غلط بیانی کی تکنیکوں اور خود شائع کرائی گئی خبروں سے نہیں چلایا جائے گا۔ اگر آپ کشمیر کی بابت حقیقت جاننا چاہتے ہیں تو سپریم کورٹ جموں کا ایک بینل مقرر کریں جو اس صورت حال کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لے۔"

(روکاوٹیں اور ٹوکا ٹاکی)

شاید اس بات کا اندازہ لگا کر کہ میں کیا کہنے جا رہا ہوں۔ آر۔ کے دھون اور گنگریش دانی کے دوسرے اراکین نے بار بار روکاوٹیں ڈالیں اور ٹوکا ٹاکی کی بہت کوشش کرنے کے بعد میں نے اپنا بیان دوبارہ شروع کیا۔ "میں عرض کر رہا تھا کہ کشمیر میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لینے کیلئے سپریم کورٹ جموں

کی ایک کمیٹی مقرر کی جائے جو اس بارے میں تمام پہلوؤں کا جائزہ لے یعنی پس منظر میرے عہدہ سنبھالنے سے پہلے اور بعد کے حالات جہاں پر جو مجھ سے غلط کام ہوئے ہیں ان کا جائزہ اس تحقیقاتی کمیشن کے سپرد کیا جائے۔ اس سے زیادہ منصفانہ بات کوئی اور نہیں ہوگی۔ مولوی کا قتل یا اس نے بل یا بعد کے واقعات کی تحقیقات بھی کمیشن کرے تاکہ حقیقت افشا ہو سکے۔"

میری تقریر میں دوبارہ روکاوٹ ڈالی گئی۔ بار بار کی یہ روکاوٹ اس وقت بھی ختم نہ ہوئی جب صدر صاحب (پرنسٹن سنگھ) اصرار کیا کہ: "آپ اسے ایک بھی جملہ مکمل کرنے کی اجازت نہیں دے رہے۔ اس بات کو جانپ کر چلے لوگوں کے ایلان نے بھی روکاوٹوں اور ٹوکا ٹاکی کے تمدن کو اپنا لیا ہے جہاں منطق کی طاقت سے زیادہ کلر جھانسنے کی طاقت کی زیادہ اہمیت ہے۔ میں نے ان الفاظ کے ساتھ کوشش کرنا ترک کر دیا۔

میں انہیں پولوں گاڑ روکاوٹ اور ٹوکا ٹاکی آپ نہیں چاہتے کہ کوئی ممکن بول سکے۔ چنانچہ میں بیٹھ جاتا ہوں۔ (روکاوٹیں اور ٹوکا ٹاکی) ++

اسی روز (۳۰ مئی) ایس۔ اے۔ ملار ریڈیشنل کانفرنس ایم پی نے ایک خاص تذکرہ کیا جس میں ریاستی حکومت کے ۱۳ افسران کی طرف سے سیکورٹی فورسز کی زیادتیوں کے خلاف "عالمی فورم" میں شکایت کی بات کی گئی تھی۔ اس نے تمام قسم کی بلا جوت باتیں کہیں کسی نے بھی اسے یہ نہیں پوچھا کہ ان اہلکاروں نے مرکزی حکومت یا ریفرنٹ یادگیری کسی ادارے کو ترک کر کے بین الاقوامی ادارے سے رجوع کس لئے کیا ہے۔ کسی نے بھی ملار ریڈ کے ارادوں اور مقاصد پر انگلی نہیں اٹھائی یا ان اہلکاروں پر حرف گیری نہیں کی جو امان اللہ خان کی کہاں میں ہاں ملار رہے تھے کیونکہ اس نے بھی "عالمی میگزین" کے نام اپیل جاری کی تھی۔

متذکرہ بالا واقعات سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟ یہی کہ جیسے بارگاہی اداروں کی حالت نہایت خستہ ہے جہاں نہ صرف دو غلط بیانات اور قدامت پسندی کی نمائندگی ہے بلکہ تلخ حقیقت اور سنگین خلافی کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کا رجحان ہی موجود نہیں ہے۔

شام کے وقت میں نے ان خیالات جن کا اظہار میں راجہ سبھا میں کرنا چاہتا تھا، کو ہم پہنچانے کے لئے ایک پریس کانفرنس کا اہتمام کیا۔

نقصان

غلط اطلاعات اور غلط بیانی کے ہتھیاروں سے میرا سرکاٹ دینے کے بعد جو حصے کو ترک پہنچانے کے سوا وی پی سنگھ یا چند ریشہ کھری حکومتیں کوئی نئی کامیابی حاصل نہیں کر سکیں۔ اس کے برعکس جو غیر مبہم طور پر فائدے

میں خواہاں تھے ان کو بے دریغی سے ضائع کر دیا گیا ہے۔

انتہا ناگ کے دہشت گرد منظور کا یہ کہنا ہے کہ وہ دیہی سنگھ کا منہ بے کمرے بٹائے جانے سے مسکریوں کو دوبارہ متحد اور منظم ہونے کا موقع مل گیا، اس کی طرف سے ایک کم افادیت کا بیان ہے۔ دوبارہ متحد ہونا یا تنظیم نو آئی، اہم بات نہیں تھی۔ قسطنطنیہ کی توجہ انفرادی اہم تھی۔ پسپا ہونے کے خوف کو اس کے دشمن تحفہ کے طور پر پیش کیا گیا تھا کہ وہ اسے اٹھا کر اپنے بیرونی کاروں کے سامنے اعلان کر سکتا تھا۔ ہم نے اسے حاصل کر لیا ہے۔ ہمت نہ ہارو، فتح و کامرانی آخر ہماری ہوگی۔ دہشت گردوں کے جن گرد و پیش پر ہیبت حاصل کرتی تھی۔ یا جن کے تھوڑے ٹوٹ رہے تھے، اچانک انہیں نئی زندگی حاصل ہو گئی۔ گلی ہو رہے شعلوں کو آگیں حاصل ہو گئی۔ دہشت گردی کا جو مسلہ اگلے دو ماہ کے اندر بہت ہی کم جاتی اور مالی نقصان سے حل ہو سکتا تھا ٹٹکنے دیا گیا۔

قوام کا وہ مزاج جو ایڈمنسٹریشن کے اپنا حکم منوانے کی قوت ارادی کے پیش نظر مسکریوں کی کہانی کی کوئی صورت نہیں، جلد ہی غائب ہو گیا۔ نوکر شاہی کا ایک اچھا خاصہ حصہ جو انتظامیہ کی طرف مائل ہو یا مقلد جلد نہ ہو گیا۔ یہ طبقہ پہلے اصل میں نقصان سے بچنے کیلئے مسکریوں کے ساتھ جکتی کیلئے نہایت ہی محنت منہمک ہوا تھا۔ فورم کے نام ۱۳۷۷ ضرور کی پمیل اس نے ماقول کا براہ راست ترجمہ تھی جو میری رخصتی کے فوراً بعد پیدا ہوا جبکہ ان فرقہ جہ کی ناپائیدار ترکتوں کو قابو میں رکھا گیا تھا۔ اے کے تھوڑے بڑھ گئے۔ دوسرے جنہوں نے مسکری انتظامیہ کو ٹیکہ کہا تھا گھبرائے اور انہوں نے اس کی اصلیت بھی کر وہ اپیل پر دستخط کر دیں۔ درحقیقت انہوں نے اس سے قبل انتظامیہ کے ساتھ تعاون کرنے کے اپنی کوتاہی کا کفارہ کرنے کے لئے مسکریوں کے ساتھ زیادہ ہمدردی کی تلاش کی۔ نفسیاتی ماقول کے بہت ہی کم نقصان کیا گیا۔

غیر پیشانی اور توجہ شکنی کے اس ماقول میں پہلے ہی رد و ایڈمنسٹریشن نے سخت روی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اس سے دوسرے اہلکاروں کے جوصلے شروع ہوئے اور وہ بھی خوف گردی کے ساتھ شامل ہو گئے۔ آخر گرد نہ رنے باقی ملو گئی افسروں کو برطرف کر دیا اور سہ ماہی کے حکوم کی ملازمین کو ہال پر پہلے گئے۔ آخر ۷۷ دنوں کے بعد چند ریشہ کش حکومت کی طرف سے سیاسی دباؤ کی وجہ سے گرد نہ رنے اپنا قدم واپس لے لیا۔ قحہ کے تباہ کن نتائج بیان کرنے کی مثال یہ ضرورت نہیں ہے۔

متعلقہ سوالات

بقیہ ریاست سے رخصت ہونے ایک برس سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے وہ سیاسی عمل کہاں ہے؟ جس کے بارے میں شورو غوغا اور دلیل بازی کی جارہی تھی۔ اگر میں اس میں سید راہ ہوتا تو کافی عرصہ پہلے ہی اسے حل کر دیتا۔

اس کا بھید پورے طور پر چل چکا ہے جس قسم کی روش وہ قوم کے ذہن میں ڈالنا چاہتے تھے وہ سرے سے ہی موجود نہیں تھی۔ وہ اس بات کو جانتے تھے اس کے باوجود انہوں نے اس پر ہتھ پڑا۔ ان کا کھیل اصل میں یہ تھا کہ میرے عکس کی افادیت کو کم کیا جائے۔ اور اس میں وہ کامیاب ہو گئے۔ آج بد قسمتی سے ہمارے سماج کی یہ حالت ہے کہ انہیں کوئی نہیں پوچھ رہا کہ وہ سیاسی عمل کہاں ہے جس میں معزوفہ طور پر جگہ بن رہے اندازی کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی یہ سوال نہیں اٹھا رہا کہ اگر حکومت نے شہری پینڈوں کو وادی سے باہر جانے کے لئے لالچ دیا تو اس کے ریاست سے رخصت ہونے کے ایک برس بعد بھی انہیں واپس جانے کے لئے سمجھا، سمجھا کر راضی کیوں نہیں کیا گیا؟ چند ریشہ کش مقرر سیاسی عمل کا راگ الاپ رہا تھا۔ اور میرے عیب تلاش کر رہا تھا۔ جب وہ وزیر اعظم تھا تو اس نے کیا کیا؟ حقیقی صورت حال میں اس کے پاس بھی اس روش کو اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا جو اس نے اپنی اپنی جہاں بازیوں سے اور غلط الزامات عائد کیے جس کے نتیجے میں مجھے سبکدوش ہو کر رخصت ہونا پڑا۔ اس نے اس روش کے اثر کو بھی کم کر دیا۔

موجودہ حالات

آج کل کیا حالات رونما ہیں؟ یہاں اُن تمام واقعات کی تفصیل بیان کرنا لازمی نہیں جن کا تعلق تحریک کاری یا دہشت گردی کے ساتھ ہے۔ میں صرف چند واقعات پر اکتفا کروں گا۔ ۲۱ مارچ کو سوڈن کے دو انجینیر جان اول نوین اور جان جانشن، خواہی ہائڈل پر و جیکٹ میں کام کر رہے تھے اس وقت اغوا کر لئے گئے جب وہ سرینگر گھرک سڑک پر سفر کر رہے تھے۔ یہ اغوا اپیلز لیگ کے عسکری شعبے مسلم جانیانہ فردس نے کیا وہ ۹۶ دن تک بری حال رہے۔ حکومت ان کا کوئی سراغ نہیں لگا سکی جس سے بین الاقوامی سطح پر بھاری پرنش کا سامنا کرنا پڑا۔ ۹۷ ویں دن ان کے گم ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دونوں انجینیر فرار ہوئے میں کامیاب ہوئے۔ ایک دوسری کہانی یہ ہے کہ وہ ان کی رہائی سوڈن کے حکام اور عسکریوں کے درمیان معاہدہ سے ممکن ہوئی اور یہ معاہدہ پاکستان میں چند رابطوں کی وجہ سے ممکن ہوا۔

۱۱ اپریل کو سرینگر کے ڈو غیر ملکشہر و جاہت حبیب اللہ کو اغوا کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس عمل میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ آف پولیس غلام حسن شال کو کوئی مارکر ہلاک کر دیا گیا۔

۲۰ جون کوئی۔ ایس ایف کے دو اہلکار بانڈی پور میں دہشت گردوں کے ہاتھ چڑھ گئے۔ انہیں ہتھ انسانیت سوز طریقے سے اذیتیں دے کر ہلاک کر دیا گیا۔ ان کی کمر میں بم باندھے گئے۔ ایک کو نوپٹا اور دوسرے کو نئی سڑک پائیل سری نگر کے علاقے میں آٹو کشا سے باہر کھینچا گیا۔ اور بموں کو بیٹھا دیا گیا۔ ان دونوں کے اہلکاروں کے جسم پر بڑے بڑے ہوکر رہ گئے۔ ۲۴ جون کو لائف انشورنس کارپوریشن کے تین اہلکاروں کو اغوا کر کے ایک جھوٹے سے آرام گاہ میں انہیں مقفل کر دیا گیا۔ اس کے بعد اس عمارت کو آگ لگا دی گئی جس میں دو انشور

نہایت ہی گھناؤنے انداز میں جل کر مر گئے۔ اور نیز اسرار کے چھ گلیں طور پر شروع تھا۔ فرار ہوئے میں کاٹیا ہو گیا۔ ۲۷ جون کو سات اسرائیلی اور ایک ڈچ خاتون تمام کے تمام سیاح ایک ہاؤس بوٹ سے پاسداران انقلاب اسلام کی طرف سے اغوا کر لئے گئے۔ اس دہشت گرد گروپ کا حلقہ اخوان المسلمین کے ساتھ ہے۔ خاتون سیدہ کو رہا کر دیا گیا۔ مگر اسرائیلیوں کو رتوں سے باندھ کر ایک قطار میں کھڑا کر دیا گیا تاکہ انہیں گولی مار دی جائے۔ جرات اور ہمت کے ایک تاباں فعل کے طور پر اور اپنے حواس قائم رکھتے ہوئے وہ اپنے رتوں کی ہتھکڑیاں کھولنے میں کامیاب ہو گئے اور خالی ہاتھوں سے ان لوگوں پر حملہ کر دیا۔ جو انہیں موت کے گھاٹ اتارنے والے تھے۔ انہوں نے ان سے کلاشنکوف چھین کر دو دہشت گردوں کو ہلاک کر دیا۔ اور باقی بھاگ کھڑے ہوئے۔ ایک اسرائیلی ایئر سڑکانہا کو جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اور دوسرے ایک قریبی گھر میں چناہ لی جس کے کلینوں نے اسے جوں و کشیر لبریشن فرنٹ کے اراکین کے سپرد کر دیا۔ بعد ازاں اسے رہا کر دیا گیا۔

۲۷ جون کو انڈین آئل کارپوریشن کا انگریز ٹیکسٹر کے دورانی سوہی سرنگرم میں معاہدہ کرنے کیلئے آیا ہوا تھا۔ اسے اغوا کر لیا گیا۔ اس واقعہ کے پچاس یوم کیلئے بھی وہ اخوان المسلمین کی قراست میں تھا۔ اس سے قبل دسمبر ۱۹۹۰ء میں ۸۸ سالہ مولانا مسودی کو سفاکانہ طور پر ہلاک کر دیا گیا۔ ۸ مارچ کو سیف الدین سوزایم پی کی دفتر ناہیدہ امتیاز کو اغوا کر لیا گیا۔ اس کو بھی رہا کیا گیا جب اغوا کاروں نے پانچ دہشت گردوں کی رہائی حاصل کر لی جس میں خطرناک دہشت گرد مشتاق احمد خاں بھی شامل تھا۔ ۱۹ اپریل کو سابقہ اسمبلی ممبر خدیشان بھٹ کو ہلاک کر دیا گیا۔ شیخ عبداللہ اور بعد ازاں جی ایم شاہ و زاروں میں سابق وزیر پیر حاتم الدین باندھے کو کمرہ جوں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ ۱۷ جون کو ایک شیشین ہاؤس اسرار (تھاندار) اور اس کے چار غفلوں کو اغوا کر لیا گیا۔

ان ہیبت ناک واقعات سے آخر کیا انکشاف ہوتا ہے۔ کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ دہشت گرد تنظیموں پر بلاؤ ڈال کر پہلے جونا لے حاصل کئے گئے تھے۔ انہیں سیاسی مصلحتوں اور دشنام طرازی کی مکروہ ہم کے مقتل پر قربان کر دیا گیا ہے۔ ہر وڈول روپے منافع کئے گئے ہیں اور قیمتی جائزوں کا نقصان ہوا ہے۔ رواں برس ۱۹۹۱ء کے پہلے پانچ مہینوں کے دوران سیکورٹی فورسز پر ۳۶ حملے ہوئے۔ ۷۰ جوان ہلاک ہوئے۔ جنوری ماہ میں دہشت گردوں نے ۱۷ شہریوں کو ہلاک کیا۔ فروری ماہ میں ۲۹ اور مارچ میں ۳۶ شہری ہلاک کئے گئے۔ دہشت گرد تنظیموں کی تعداد دو ٹوٹک پہنچ چکی ہے۔

جانی نقصان سے بھی زیادہ تشویش ناک بات یہ ہے کہ تشدد کی اغوا اور ہلاکتوں کی وجہ سے خوف طاری ہو رہا ہے اس سے نفی ماحول پیدا ہوا ہے۔ اور عام تائزہ تھا کہ حکومت کو کچھ بھی کرنے پر جھکا جاسکتا ہے اور حکومتی ملازمین کی ہڑتال اور گھناؤنے جرائم میں ملوث دہشت گردوں کی رہائی سے جو مارت، شامت، ہولناکی

متحدہ علاقوں میں عسکریوں نے اس قدر صلاحیت پیدا کر لی ہے کہ وہ سرکاری محکموں کو حکم لکھواتے ہیں یہ بھی اطلاعات میں کہ حکومتی سرمائے ۲۳۴ فیصد حصہ براہ راست یا بالواسطہ طور پر چند دہشت گرد تنظیموں کے پاس چلا جاتا ہے اور وہ ماتحت انصروں کی طرف سے احکامات تک جاری کرتے ہیں۔ سرکاری ملازمتوں میں تقریروں اور ترقیوں کا روبرو باری بالوں میں داخلے اور قرضے عطا کرنے کے معاملوں میں ان کا حکم جلتا ہے۔ وہ امتحانات میں وسیع پیمانے پر نقل اور اساتذہ اور محنتی اداروں کی طرف سے موافق نتائج کا ہتھیار بھی کرتے ہیں۔ ۲۳ مارچ ۱۹۹۱ء کو یوم پاکستان منایا گیا اور مختلف مقامات پر پاکستانی پرچم بلند کر دیئے گئے۔ یہاں تک کڑا اثر یکہ جنرل۔ ایس ایف ایچ بی میٹن اگر کو کہنا پڑا۔ ۴۰ کشمیر میں دہشت گردوں کی جرات بڑھتی جا رہی ہے۔ وہ سیکورٹی فورسز کو دیہی علاقوں میں بھی گولی کی لڑائیوں میں مصروف کر رہے ہیں حالانکہ پہلے یہ نہیں ہوتا تھا۔

یہاں تک کہ ۱۹۹۰ء کے بعد کشمیری مسلمانوں نے بھی جوں اور نئی دہلی میں ہجرت شروع کر دی ہے۔ باور کیا جاتا ہے کہ ۲۰۰۰ مسلم کنبے اب تک وادی سے باہر چکے ہیں۔ ۹ جولائی ۱۹۹۱ء کے شمارے میں معاہدہ ہماطو پر قطر اڑنے کے چند ماہ کے دوران کشمیر کے بارے میں کسی خاص پالیسی کی عدم موجودگی میں ریاست میں یقین طور پر لاقانونیت کو فروغ حاصل ہوا ہے۔

سیکورٹی فورسز کی طرف سے زیادتیوں کے کہیں زیادہ سنگین معاملے رونما ہوئے ہیں ایسا بھی الزام ہے جن میں ۳۶۱ عمارتوں کی آتشزدگی اور ۱۷ افراد کی ہلاکت ۱۲ اکتوبر کو سوہیور کی تمام تر اقبال مارکیٹ کی آتشزدگی اور ماہ کے آخری ہفتے میں انتہت ناگ ضلع میں ۵۰ مسکونوں کی آتشزدگی شامل ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان واقعات کے بارے میں الزامات بین الاقوامی معاہدہ آئین لغو اور بے بنیاد ہوں۔ جیسا کہ میرے عہد گورنری میں ہوا ہے۔ مگر اس میں بھاری فرق ہے۔ پہلے جب کہ حملہ سری ذات کے خلاف ہوتا تھا مگر بعد ازاں ان کا نشانہ زیادہ تر سیکورٹی فورسز ہوا کرتے تھے۔ مزید برآں جھڑپ پر یہ الزام تھا کہ میں نے عام کر سن لا کے تحت بی ایس ایف اور سی آر پی کو اختیارات تفویض کئے تھے۔ جولائی ۱۹۹۰ء کو آرٹھ فورسز (جوں و کشیر) سپیشل باور آرڈیننس کے تحت سیکورٹی فورسز کو غیر معمولی اختیارات دے دیئے گئے۔

آخر ان حقائق کے کیا معنی ہیں؟ جانی نقصان بڑھ چکا ہے، اختراجات بڑھ چکے ہیں۔ اغوا کی وارداتوں میں اضافہ ہو چکا ہے اور اغوا کار اپنی شرائط منواتے ہیں۔ عام تائزہ یہ ہے کہ حکام کو کچھ بھی

منوانے کے لئے جھکا یا جا سکتا ہے جس میں ملازمین کی حکمرانوں کی بھی شامل ہے۔ نفسیاتی فائدہ اب مسکریوں کو حاصل ہونے لگا ہے اور خاص طور پر زیریں اور درمیانہ طبقہ کی مرضی کی کافی وقعت ہے۔ مرکزی رقوم کا ایک اچھا خاصہ حصہ جو عام لوگوں کو مالی امداد فراہم کرنے کے لئے مقصود ہوتا ہے۔ اب ان کے ہاتھوں میں جا رہا ہے۔

کشمیر میں رونما موجودہ حالات میں حکومت اور سیاسی جماعتوں کا یہ بنیادی فرض ہے کہ وہ دیاندر اور علی رُخ اپنا بیڑہ بدقسمتی سے بغرض شہدہ بازوں اور خوشامدی طور طریقوں کا شکار ہو کر رہ گیا ہے۔ انھارٹی قائم کرنے سے قبل غلط بیانی کے سبب پیدا شدہ دھند کو دور کرنے سے قبل فیاضی کا منظر اہرہ کر کے ہم نے علی طور پر تخریب کاروں کی مدد کی ہے اور کشمیر کے عام لوگوں کے لئے درد کو طویل کر دیا ہے جو مسئلہ ٹھوس اور علی طریقہ سے حل ہو سکتا تھا۔ جان بوجھ کر لٹکا یا گیا ہے اور یہ ایک دائمی قفل کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ یہ ایک ایسا قفل ہے جس کا نفسیاتی اور علی فائدہ عدم استحکام کی قوتوں کو حاصل ہو گا اور اس میں ان کی عارضی تھکاوٹ یا آرام سے میٹھنے کا کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس مسئلے کو طویل رہنے سے پاکستان کو اس معاملے کو بین الاقوامی رنگ دینے کا موقع حاصل ہو جائے گا۔

جیسا کہ باب چہارم میں واضح کیا گیا ہے، ایک مرتبہ سردار پٹیل نے کہا تھا: "اگر ہم اپنی طاقت میں اعتماد نہیں تو ایک قوم کے طور پر ہمارے وجود کا ہیں کوئی حق نہیں۔ یہ بات مجھے واضح طور پر معلوم ہے۔ ہم تب تک ایک متحد قوم کے طور پر زندہ نہیں رہ سکتے جب تک کہ ہم دائمی پھوٹروں کے ساتھ زندہ رہنے سے انکار نہ کریں اور تاریخ کے میٹر فینک وکیل پر پورا کنٹرول حاصل کرنا نہ سیکھ لیں۔"

باب سترہ

مستقبل

تاریخ کا دھارا موڑنے کا آلہ کار

میرے پاؤں میں چکی کا پاٹ بندھا ہے
میرے چہرے میں ناکارہ لکڑی کا لٹھا لٹکا ہے
ایک منجھے تیرے نہیں دے گا

اور دوسرا منجھے ڈوبنے نہیں دے گا۔

باسوانہ

میں نے گذشتہ صفحات میں کشمیر میں موجودہ سیاسی اور سماجی طوفان کا جائزہ لیا ہے اور اُنی تلخی اور عہری حالات کا بالغ نظری سے مطالعہ پیش کیا ہے جن کی وجہ سے یہ طوفان رونما ہو رہا ہے۔ ٹھوٹی پس منظر میں صورتحال کا انکشاف کرنے کی ایک کوشش کی گئی ہے۔

مستقبل

کشمیر کا مستقبل آخر کیا ہے؟ اس سنگین بحران کا کیا حل ہے؟ ان سوالات کا پوچھا جانا ایک قدرتی بات ہے مگر مجھے جو بات پریشان کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اس معاملے میں بہت سے سارے جوابات کی توقع کی جاتی ہے۔ کیا سخت روشیں یا نرم روشیں سے فائدہ ہو گا؟ کیا انتظامی اقدامات یا ایک سیاسی عمل زیادہ مددگار ثابت ہو گئے؟ کیا کنفیڈریشن کا درجہ یا زیادہ خود مختاری دینے سے مدد حاصل ہوگی؟

میرے بیان اور تجربے سے ظاہر ہے مسائل کالی پیچیدہ پرانے ہیں اور ان کی جڑیں گہری ہیں جو ان قدر میں ختم نہیں جن کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ جب تک ان پہلوؤں کے وجود کو پورے طور پر تسلیم نہ کیا جائے اور ان کے سد باب کے لئے

جب تک اصلاحی اقدامات نہ کئے جائیں تب تک کوئی موثر یا دائمی حل ممکن نہیں ہے

بنیادی طور پر کوئی غلطی ہے

موجودہ دور کے ہندوستان میں بنیادی طور پر کہیں نہ کہیں کوئی خامی ہے جس سے یہ زندگی کے قریب قریب جتنے میں کہیں نہ کہیں ہلک کر رہ جاتا ہے یہ کیا ہے؟

عوامی خدمت میں میرے پر واقعہ اور پُر جوش سفر کے دوران تو جس قسمی سے مجھے ہندوستانی عوامی سماج کو نزدیک سے دیکھنے کا موقع ملا میں اس کی روح میں جھانک سکا اور اسکی پرتوں کو کھول سکا۔ میں نیچے سے نیچے کھدے لے کر بڑے سے بڑے تک ایک جھنگی میں رہنے والے ایک باشندے سے لے کر وزیر اعظم تک ایک چھوٹے پھیری والے سے لے کر بڑے سے بڑے تاجدار تک سادہ لوح اور تندہی رکھنے والے رسولِ افسرولے لیکر اقتدار کشتے میں گھر کر شہر ہر ملک کے قریب میں آیا ہوں ریاستی اداروں کی اعلان شدہ انسانی اور میداری خردداشتوں سے لیکر مل کے پتھر پہلے کی دبا س مینے محسوس کی ہے میں نے مذہب اور انسانی حقوق کی آڑ میں کمزور و تیراں کا ارتکاب ہوتے دیکھا ہے۔ میں نے صاف دروازوں پر غلط اطلاعات کی فہم کی اور کچھ کو اچھلے جاتے بھی دیکھا ہے۔

اس تمام سفر میں میں نے محسوس کیا کہ ہماری اس عمارت میں چند بنیادی بیوقوفائے ہیں اور اس کا منظر نزل ہونا ناگزیر تھا اور اکثر اوقات ایسا ہوا جی مناسب روحانی اور سماجی اساس کے بغیر ہمارے تمام ادارے ہمارے آئین کے تمام قانون ہمارے تمام تر انتظامی تشکیلات ہمارے سبھی عدلیہ اور قانون سازی ادارے کمزور اور ناقص ہوں گے یہ ایک ہر ناگزیر ہے۔

ان تمام حقوقی برسوں کے دوران میں قلم و پیکل اور فیلڈ کے ہم میں معروف رہا اور ناموافق موسم میں بھی اپنی کشتی کو تیرتے ہوئے رکھنا یاد رہے ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال نہکا رہا کہ جب تک ہمارے سماجی خیالات کی اچھالے نو نہیں ہوتی۔ جب تک ہماری مذہبی رسوم میں اصلاح نہیں ہوتی، جب تک ہر روحانی اور سماجی نظام میں حق کو نہیں سمجھیں گے۔ جب تک ایک گہری اور حقیقی اچھالے نو نہیں ہوتی، جس سے ہمارے سماجی نظام کو کوئی سمت عطا ہوتی ہے، ایک نئے اخلاقی نظام کی تولید ہوتی ہے، نئی ماحولیاتی قدریں اور نئی ٹیکنالوجی جنم لیتی ہیں، ملک کا مستقبل تب تک تاریک رہے گا اور ہمارا سماج زیادہ سے زیادہ آٹھکانی ہوتا چلائے گا اور دانشی سے راسخ تر ہوگا اس ڈھانچے کے سمار ہوسنے اور مغرور ہو جانے کا اتنا ہی خطرہ قائم رہے گا۔

آج جب میں کشمیر میں اپنے تجربات کی جھلک لیتا ہوں یا اعلیٰ پایوں سے ملک کے امور کا جائزہ لیتا ہوں۔ مجھے اپنے خیالات درست ہونے پر مستر ہوتی ہے جس شعبے میں میں نے دیکھا ہے تاریکی کے سائے طویل ہوتے معلوم ہوتے۔ آئیے میں عمر نوک ہندوستان کی مختصر اندرونی جھلک پیش کروں جس میں اس کی صلاحیت اور نااہلیت بشمول کشمیر شامل ہیں۔

موجودہ حقیقت اقتصادیات

۱۹۵۰ میں دنیا کی مجموعی قومی پیداوار میں ہندوستان کا حصہ ۲ فیصد تھا۔ ۱۹۸۰ میں یہ کم ہو کر ایک فیصد رہ گیا۔ تیسری دنیا کی مجموعی قومی پیداوار میں ہندوستان کا حصہ ۱۲ فیصد تھا۔ ۱۹۸۰ میں یہ پیداوار کم ہو کر ۵۰ فیصد رہ گئی۔ صنعتی پیداوار جس کے بارے میں کافی ڈھول پیٹا جاتا ہے کی پوزیشن بھی کوئی مختلف نہیں ہے۔ ۱۹۵۰ میں ہندوستان کی صنعتی پیداوار مجموعی عالمی پیداوار کا ۲ فیصد تھی، ۱۹۸۰ میں شرح فیصد کم ہو کر ۰.۶ رہ گئی۔ ۱۹۵۰ میں تیسری دنیا کی صنعتی پیداوار کا ۳۴ فیصد ہندوستان سے حاصل ہوتا تھا، ۱۹۸۰ میں یہ کم ہو کر ۳۶ فیصد رہ گیا۔ انیس رجحانات کے مطابق عالمی پروڈیوٹی تجارت میں ہندوستان کا حصہ ۲ فیصد تھا جو ۱۹۸۰ میں ۵.۵ فیصد رہ گیا۔

متذکرہ بالا اعداد و شمار کسی کو یہ شک نہیں رہنا چاہیے کہ ہندوستان کی اقتصادی پیش قدمی مزعلیٰ مجموعی کارکردگی کے پیش نظر مست رہی ہے بلکہ ترقی پذیر ممالک کے مقابلے میں کم رہی ہے صرف ایک ہی شعبہ جس سمت میں یہ آگے بڑھ رہا ہے وہ بین ملکی قرضہ ہے۔ بین ملکی قرضوں کی لڑائی ہوئی رقم ۱۰ ارب ڈالر تک پہنچ گئی ہے۔ یہ ملک ارضیتنا سے آگے نکل کر دنیا کا تیسرا سب سے محروم ملک ہو گیا ہے۔ سال ۱۹۹۰-۹۱ کے آخر میں مرکزی حکومت کا کل بیرونی قرضہ ۳۰۹.۶۹۹ کروڑ روپے تھا اور بیرونی قرضے کی ادائیگی مزید قرضہ لے کر کی جا رہی تھی۔ اس وقت یہ ملک بین الاقوامی مالی فنڈ کے ساتھ قرضوں کے حصول کی بابت بات چیت کر رہا ہے۔ تمام ملکی مقاصد سے ہندوستان ملکی طور پر قرضوں کے جال میں پھنس کر رہ گیا ہے۔ حال ہی میں قرضوں کی ادائیگی کا توازن اس قدر بگڑ کر رہ گیا کہ اسے بحران سے بچنے کے لئے ۵۰ فی سوٹا گروی رکھنا پڑا۔

اقتصادیات کے بہت سارے شعبوں میں پیداوار میں متواتر کمی واقع ہو رہی ہے۔ ٹیکنیکی پروجیکٹوں کی عمل آوری میں انتظامی تاخیر بدنام زمانہ ہے۔ بد تاخیر تین ماہ سے تین برس تک ہو سکتی ہے اور ایک برس کی لاگت تخمینہ ۳۰۰ سے ۶۰۰ فیصد بڑھ سکتی ہے۔ سرکاری طور پر چلائے جانے والے ۳۴۰۰ سے ۱۱۰۰۰ ادارے خسارے پر چل رہے ہیں ۹۰-۱۹۸۹ کی قیمتوں کی شرح بد ملک میں سیاہ دولت کی رقم کا تخمینہ تین لاکھ (۳۰۰۰۰۰۰) کروڑ روپے ہے اور اس میں ہر برس پچاس ہزار (۵۰۰۰۰) کروڑ روپے کا اضافہ ہو رہا ہے۔ گذشتہ تیس برسوں کے دوران سیاہ دولت ۲۳ فیصد سالانہ شرح سے بڑھ رہی ہے۔ ۱۹۹۰-۹۱ میں سیاہ دولت کی رقم ۶۱-۱۹۹۰ کے مقابلے ۳۶۲ فیصد زیادہ تھی۔ موجودہ دور (۱۹۹۰-۹۱) میں یہ قومی آمدنی کا ۶۰ فیصد ہے جبکہ اس کے مقابلے میں ۶۱-۱۹۹۰ میں یہ صرف ۵ فیصد تھی۔

- دھرم اندیل جون ۱۹۹۰

• • • • • مجموعی کشمیر کی طرف سے شروع کے محسوس مطالعہ میں دیا گیا تخمینہ

ہماری آبادی کا ۴۰ فیصد اب بھی غریب کے سطح سے نیچے زندگی بسر کر رہا ہے۔ ۱۹۸۶ء میں پروفیسر راج کرشنا کی طرف سے کئے گئے ایک مطالعے کے مطابق سن ۲۰۰۰ عیسوی میں ہی ۲۹ کروڑ ہندوستانی غریبی کی سطح سے نیچے زندگی بسر کر رہے ہونگے۔ یہ الفاظ دیگر غریبی کی سطح سے نیچے رہنے والے افراد کی یہ تعداد حصول آزادی کے موقع پر ہندوستان کی آبادی سے زیادہ ہوگی۔

سماجی مسائل

پیرائے سماجی مسائل کا حل ہمیں نظر نہیں آتا مگر نئے مسائل میں تیزی سے اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ہمارے ملک میں خواندگی کی شرح دنیا بھر میں سب سے کم ہے ہماری آبادی کا ۶۵ فیصد اب بھی کافی ناخواندہ ہے۔ اسے ابرس کی طرح ۵ کروڑ بچے یا تو سکول جاتے ہی نہیں یا ایک برس یا ایک مہینے میں پڑھائی چھوڑ دیتے ہیں۔ اس وقت برما میں خواندگی کی شرح ۸۱ فیصد ہے، انڈونیشیا میں ۵۵ فیصد، ملائیشیا میں ۸۰ فیصد، فلپائن میں ۸۶ فیصد، تھائی لینڈ میں ۹۱ فیصد اور چین میں ۸۰ فیصد ہے۔ اس طرح خواندگی کے معاملے میں ہندوستان کا درجہ ۵۹ واں ہے۔ اس صدی کے آخر تک ہندوستان میں ناخواندہ افراد کی تعداد نیا بھر میں سب سے زیادہ ہوگی۔

بچوں کے رہن آہن کے حالات بھی ہمدست قابل مذمت ہیں۔ اس وقت ہندوستان میں محدود اطفال کی تعداد ۵۰ کروڑ ہے، بچوں کا پانچواں گن رہے برتن صاف کر کے، میزیں صاف کر کے یا فیکٹریوں میں بھاری کوحہ اٹھا کر خراج کر دیتے ہیں۔ ۲۰ کروڑ بچے غیر رسمی کے حوطے سے نیچے زندگی بسر کرتے ہیں۔ ۵۵ لاکھ بچے بھیک مانگتے ہیں۔ ہماری خواتین کی ایک اچھی خاصی تعداد اس بدعت کی شکار ہے جسے سماجی طاعون سے موسوم کیا جاسکتا ہے۔ تقریباً ۳۰ برس پہلے جین پر پابندی لگا دی گئی تھی مگر بدعت اب بھی جاری ہے اور اس کے ساتھ تمام تر دکھ درد شامل ہیں۔ سال ۱۹۹۰ء کے دوران جینز کے قتل کے ۸،۸۰۰ معاملے اور جینز کی خودکشی کے ۱۴،۹۰۰ معاملے درج کئے گئے تھے۔ اسی برس کے دوران خواتین کے خلاف جرائم کے ۳۳،۰۰۰ معاملے، ۹۵۱۰ زنا بالجبر، ۱۱۶۸۹ اغوا اور ۱۱۶۸۹ اور ۲۰۱۸۶ بے حرمتی کے معاملے شامل تھے۔

دُشمن کو اب بھی عام طور پر ایک روئے تصور کیا جاتا ہے مگر ان میں سے کثیر تعداد کو اب بھی پیدا نہیں ہونے دیا جاتا۔ اس خطرے سے ظاہر ہو رہا ہے کہ جدید سائنس و ٹیکنیکوں کا سماجی بدعتوں کو دائمی صورت دینے کے اور دوست دینے کے حلو میں کس طور نا جائز استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک مطالعہ کے مطابق اسقاطِ حمل کے ۸۰۰۰ معاملات میں سے ۱۹۹۹

کا تعلق نسوانی جین GENE سے ہے۔ عورتوں پر جسمانی حملوں کی تعداد بھی کسی طرح نہیں ہوئی ہے۔

آبادی

کنید ہندی پر ہماری اخراجات کے باوجود ہماری آبادی پہلے ہی ۸۴ کروڑ تک پہنچ چکی ہے۔ موجودہ رفتار سے آئندہ تین دہوں کے اندر ہندوستان سب سے زیادہ آبادی والا ملک بن کر رہ جائے گا۔ اس کی آبادی میں ہر سال ۱۰ کروڑ کا اضافہ ہو رہا ہے۔

ماحولیات

ماحولیاتی آلودگی کا خزانہ عام مویشیات و حیوانات کو بھی ہماری خطرہ پیدا ہو رہا ہے۔ ۵۰ کروڑ سیکڑ زمین پہلے ہی متزاق ہو چکی ہے۔ ہر برس جنگلات میں ۱۲ لاکھ سیکڑ کی کمی ہو رہی ہے۔ ۱۲،۰۰۰ میٹرک ٹن مٹی کا کٹاؤ ہر برس ہو رہا ہے۔

ہمیں اپنی جھیلوں اور ندیوں پر فخر ہے اور ہمارے بچے ملک بھر میں رواں دواں جھیلوں اور ندیوں کی بات گیت گاتے ہیں مگر ان جھیلوں اور ندیوں کا ۶۰ فیصد مٹی کی آلودگی سے بھر رہا ہے شمال میں جھیل ڈلی سے لیکر جنوب میں دلیاے پر یارنگ مشرق میں دامودرا اور ہونگلی سے تیرا دیزر میں تھانہ پانک مورتحال یکساں طور پر مالاں گئے ہیں۔

تشدد

یہ ایک ستم ظریفی اور المیہ ہے کہ اشتوک بدھ مہا پر (اور گاندھی کی یہ سرزمین آج دنیا میں سب سے زیادہ تشدد کے خطرات سے متاثرہ سرزمین بن کر رہ گئی ہے۔ دہشت گردی کی وحشت ناک جڑیں تیزی سے پھیل رہی ہیں۔ ہر روز ملک کے مختلف حصوں میں بہت ساری انسانیت سوز ہلاکتوں کے بارے میں خبریں ہمیں ٹرہنے کو ملتی ہیں۔ حال ہی میں پنجاب میں لدھیانہ کے نزدیک ایک ریل کے ۶ معصوم مسافروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اسی ریاست میں ہی جنوری ۱۹۸۹ء سے جولائی ۱۹۹۱ء تک دہشت گردانہ تشدد کے سبب ۶۰۰ افراد ہلاک ہوئے۔ اسی عرصے کے دوران فرقہ وارانہ فسادات میں ۲۰۲۵ افراد کو جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔

دُشمن کا بدترین صدمہ

قدیم کی بات ہے مغربی تہذیب کے چند پہلو ہماری اپنی تہذیب کے پہلوؤں کے ساتھ مل کر خرابی پیدا

کر رہے ہیں۔ کسی وقت جو ایک عظیم تہذیب تھی اس کی تباہی اور زوال کے سبب ہندوستانی تہذیب میں مذہبی سماجی اور اقتصادی تغادات پیدا ہو چکے ہیں۔ یہ مغرب کی بے رحم ٹیکنالوجی صارفیت کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کر کے اس کا جواب دے رہی ہیں۔ ہمارے سیاسی سماجی اور اقتصادی و ذہنی اختیار وہی اقتصادی معنی قدروں کے نظام کو اپنارہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ملک میں جو بھی سماجی اور اقتصادی ترقی ہوئی ہے۔ اس کا فائدہ ۱۰ فیصد آبادی نے اٹھایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے دیہات اور شہروں میں سماجی اقتصادی اور تمدنی طور پر دیہات و شہر میں جلیں مٹی پر شہر فضول خرچی اور بیوقوفی کی شہر ترقیات کی فضول خرچی کے شکار ہیں اور دیہات جاگیردارانہ دور کے نشے میں غور میں۔ زیریں سطح پر دونوں غربت اور خودیت کے شکار ہیں۔ ہمارے ہاں سبز انقلاب تو آیا مگر ۴ فیصد آبادی کے پاس غذائی اجناس خریدنے کی قوت ہی نہیں۔ ٹیلی مواصلات میں ہم نے انقلاب تو دیکھا جس کے سبب انٹرنیٹ کے اندر ہم نیو یارک تک بات کر سکتے ہیں۔ مگر ہمارے اگلے دروازے پر واقع گاؤں میں یہ ممکن نہیں۔

ادارے

ہر ایک ادارے کا ایک بدن ہو تلے روح ہوتی ہے جس پر ان اداروں کی حقیقت کی اساس ہوتی ہے۔

حکومت

حکومت کی طرف دیکھئے۔ اس کا بنیادی مقصد فیملی میں کام کرنا ہے۔ زیریں سطح پر انتظام عمل کے ذریعے ترقی کرنا اور بہبود اور راحت کے کام سرانجام دینا ہے۔ مگر بنیادی طور پر یہ کیا کر رہی ہے؟ یہ اپنے گرد و پاس کا غزوہ کی ایک کافکاوی دنیا کا تانا بانا بنتی جا رہی ہے۔ پریس اور پارلیمنٹ میں بار بار نکتہ چینی کے باوجود اس کی کارکردگی بدستہ بدتر ہوتی جا رہی ہے۔

پارلیمنٹ

اگرچہ ۱۹۵۰ء کے بعد پنڈت ہنر کے زمانہ شروع میں بھی کبھی ہندوستانی پارلیمنٹ کو زمین ترگوٹ والا کرو یا زیادہ آواز دینے والا بورڈ کہا جاتا تھا اب یہ ادارہ جماعتی فوائد اور نقصان کا اندراج کرنے والے سکریٹری کے رول اختیار کر چکا ہے۔ اولیٰ تو اس کے پس پردہ کا فرض مقصد فوٹو تیرہ دہے اب تو بھاری اہمیت کے معاملے بھی رپڑی ہر لگاتے۔ عمل ملک محدود ہو کر رہ جاتے ہیں یا دلیل بحث مباحثے اب جو بے بس رہے قصبے بن کر رہ چکے ہیں۔ مداحلین روکا دشمن ایوان کے دہل میں چلا آنا اور دوسرے ڈرامائی مظاہر کے بار بار ہونے لگے ہیں۔ قریب ایک سو قبل حالات اس قدر دگرگوں ہو گئے کہ نائب صدر جمہوریہ شکر دیال شرما ایوان میں پھوٹ پھوٹ کر مڑ پڑے اور انہیں دلا س دینے والا کوئی نہیں تھا۔ ایوان میں شائستگی کے فقدان

سے انہیں گہرا صدمہ پہونچا تھا۔ مناسب قانون کو یقینی بنانے کی بنیادی ضرورت کو کم سے کم اہمیت دی جاتی ہے مثال کے طور پر آٹھویں لوک سبھا اور راجیہ سبھا نے پاس کئے گئے ہر سوہ قانون پر ۵۰ اور ۲۰ پارلیمانی دن اوسطاً صرف کئے

عدلیہ

اقتدار کے ڈھانچے کا ایک اور پرزہ عدلیہ ہے سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس جسٹس پی۔ این۔ بھگتی نے بجای کہا تھا کہ عدلیہ کا نظام سمسار ہو کر رہ گیا ہے۔ سال ۱۹۹۰ء کے آخر میں سپریم کورٹ میں تقریباً ۲ لاکھ معاملے قابلِ نمٹ رہے تھے، پانی کورٹوں میں ۱۸ لاکھ اور ماتحت عدالتوں میں ۲۰ لاکھ ایسے معاملات تھے۔ مرکزی انتظامی شریہوں میں ایسے معاملات کی تعداد ۱۰۰۰۰۰ تھی۔ یہ مایوس کن صورت حال اس لئے ہے کہ شاید یہ نظام اپنی روش کو چکا ہے۔ تکنیکی پہلوؤں اور غیر ضروری معیارے بازی سے تاخیر پیدا ہوتی ہے جسٹس کرشنا ابیر نے کہا تھا: "آپ ملک میں ججوں کی تعداد کو دو گن کر دیجئے۔ بقایا کام پھر بھی اتنا ہی رہے گا۔"

اخبارات

اخبارات کے معاملے میں بھی صورت حال بہت زیادہ مختلف نہیں ہے۔ یہ بھی اپنے حتمی نصب العین کو کھو چکے ہیں آدنی کو بجات دلا کر اس کی شخصیت کی نشوونما کرنا حقیقت سے متعلق معلومات فراہم کر کے اسے علم فراہم کرنا، اس کے نظریے کو وسیع تر بنانا، اسے اعلیٰ اصولوں کی تحریک دینا، اس کا اخلاقی سماجی اور ذہنی معیار بلند کرنا، ایسا منصفانہ اور غیر جانبدارانہ نظام انجام کرنے میں اس کی مدد کرنا جس میں ڈرانے دھمکانے اور زور زبردستی کی کوئی کوئی گنجائش نہ ہو یہ اصول کیا ہوئے؟

خشک ہڈیاں

صحت مند تمدنی جڑوں کی عدم موجودگی میں اساس اور اس پر تعمیر شدہ ڈھانچے کے تمام اداروں کے درمیان رشتہ عملی طور پر منقطع ہو چکا ہے۔ محض خشک ہڈیاں ہی باقی بچی ہیں جذبہ اور روح الگ ہو چکے ہیں۔

پیغام

بہرے ذہن میں گزشتہ ۴۴ برسوں کا پیغام بالکل واضح ہے۔ جب تک ہندوستانی سماج میں بنیادی تبدیلی رونما نہ ہو، ہندوستانی قدروں میں تقسیم نو پیدا نہ ہو، جب تک ہم کسی سمت دیکھ نہ سکیں، کسی

اہم میں فخر محسوس نہ کریں ہمارے سامنے کوئی مثال نہ ہو ہم کسی سے تحریک حاصل نہ کر سکیں ہمارے سامنے کوئی مشن نہ ہو کوئی منزل نہ ہو تب تک ایسی قیادت جاری رہے گی جو بے اصول اور غیر ذمے دار ہوگا ایسی جماعتوں کا وجود بھی قائم رہے گا جو ذات پات کی تقسیم اور سماجی انصاف کے دائروں کے بعد نہیں سوچ سکیں گی یا جن کا سیکولرزم کھوکھلا نہ فریب اور ریاکارانہ ہوگا۔ کوئی بھی شے متوقع نتائج فراہم کر سکی کوئی بھی بات عوامی شعبے کو زیادہ قابل اور بجٹی شعبے کو زیادہ ذمہ دار نہیں بنائے گی۔ کسی بھی بات سے تشدد اور دہشت گردی سے اکثر مقابلے ختم نہیں ہوئے کسی بھی انتخاب کے بعد اس اور اس کا کام پیدا نہیں ہوگا۔ پارلیمنٹ میں بحث مباحثوں سے صرف گری اور روشنی ہی پیدا ہوئی گی۔ گرد و پاں میں چند پریشان حال خیر ہو گئے۔ مگر وہ صرف اندرونی بیچ و تاب کھا کر رہے جائیں گے اور وہ کوئی نفع حاصل کرنے کے قابل نہیں ہوں گے۔

ملک میں جذبات، تعلیم اور اپنے اداروں کے ڈھلچنے اور اس کی اساس کے پیلوؤں کے معاملات میں بجاری اصلاحات کی ضرورت ہے۔ بدن اور روح کی اچالنے لڑکی ضرورت ہے۔ ہمارے تمام تر مسائل بیمار اساس سے پیدا ہوئے ہیں۔ قوم کا بند ذہن اور مریضیہ اس کے باغیچہ پن کے آئینہ دار ہیں۔

انقلاب اور اچالنے نو

بعض اوقات میں سوچتا ہوں کہ یہ مسائل اس قدر دشوار اور اس قدر بگڑی چیزوں والے ہیں کہ انقلاب کے کم کوئی چارہ نہیں مگر ہندوستان کی ماضی کی تاریخ اور وراثت اس بات کی شاہد ہیں کہ ہماری قدریں انقلاب کی نسبت اچالنے نو کے قریب تر ہیں۔

انقلاب اور اچالنے نو کے درمیان کافی فرق ہوتا ہے۔ اول الذکر ایک وہی اور طوفان کی طرح آتا ہے۔ اور اپنے سامنے ہر شے کو ہٹا کر لے جاتا ہے۔ ان میں قدیم قدریں قدیم رجحانات قدیم ادارے اور قدیم ڈھانچے شامل ہوتے ہیں۔ یہ ماضی کو دھمکے سے اڑا دیتا ہے۔ مگر اس میں تعمیر کی نسبت تباہی زیادہ ہوتی ہے اور اس کی زیادہ قیمت ادا کرنا پڑتی ہے اور اس سے بھی زیادہ بڑی بات یہ ہوتی ہے کہ اس میں ہر ملک کی ایسی خد کو ختم نہیں کر دیتا جو بعد ازاں غلط اور جھوٹا ثابت ہوا اور نئے مسائل پیدا کرے۔ بالاصول منصف باوصف اور مرصع النفس انقلاب کے لیڈر نہیں رہتے۔ وہ انقلاب کے عتاب بن جاتے ہیں۔

دوسری طرف اچالنے نو ایک منفرد فکری کے تازہ جھونکے کی طرح ہے جو تاریک اور ٹھنڈی بھری راست میں چلتی ہے۔ گرد و غبار اٹھاتا اور روشنی ہے اور عمل میں ایک صاف اور شفاف صبح کو جنم دیتی ہے۔ ایک نئی چیز جو توجہ اور توجہ سے غور و جستجو سے نہیں ہوتی بلکہ جو اجماع کی گود میں آرام کر رہی ہوتی ہیں۔

خوش قسمتی کی بات یہ ہے کہ ہندوستان میں جو صوبے گزری ہیں وہ بالکل باغیچہ اور بخر نہیں تھیں۔ ان کے چند ایک فہم شان و شوکت کی حامل رہی ہیں۔ اور انہوں نے راستی کے نظریات اور زندگی کے بنیادی مقصد میں

جھانکنے کا موقع عطا کیا ہے۔ رومن، ولینڈ کا تجربہ تھا: "ہندوستان میرے لئے بیرونی ملک نہیں ہے۔ وہ تمام ملکوں سے عظیم ہے۔ وہ قدیم ملک جس سے میں بھی آیا تھا میں اپنے اندر اس کے وجود کا گہرا احساس کرتا ہوں۔ میکس مولر کا اور بھی زیادہ واضح بیان اگر مجھے پوچھا جائے کہ کس آسمان کے تلے انسانی ذہن نے اپنے بہتر بن تحفوں کو نشوونما دی ہے زندگی کے عظیم ترین مسائل پر نہایت گہرائی کے ساتھ غور و فکر کیا ہے اور ان کا حل حاصل کیا ہے تو میرا اشارہ ہندوستان کی طرف ہوگا۔ اور اگر مجھے پوچھا جائے کہ کس ادب سے ہم وہ اصلاح حاصل کر سکتے ہیں جس کی اشد ضرورت ہیں، انجی اندرونی زندگی زیادہ مکمل زیادہ قابل فہم زیادہ عالمگیر بننے کیلئے درحقیقت عمل انسانی زندگی کیلئے زندگی بہتر محض ای زندگی کے لئے ہی نہ ہو بلکہ ایک بدلی ہوئی انسانیت والی لافانی زندگی ہو تو میرا اشارہ ایک مرتبہ ہندوستان کی جانب ہوگا۔ اور ویلکا مندر نے اپنے عالمانہ انداز میں کہا ہے: "ہندوستان کا تحفہ روحانی ثور ہے۔ آہستہ اور خاموش شبنم کی مانند نرم جو صبح سویرے ان دیکھی ان شئی گرتی ہے اور پھر بھی اس سے اینٹیاں یا تھوڑا سا حاصل ہوتا ہے یہ ایک خاموش، صابر، تمام مصائب اٹھانے والی روحانی نسل کا تحفہ جو عالمی خیالات پر چھا جاتا ہے۔"

آئیے ہم اپنی وراثت اور اپنے عظیم تحفوں کا استعمال کریں، آئیے ہم ان سے فہم حاصل کریں خود میں اعتماد پیدا کریں اور اپنے ہی مشن کے جذبے کے اختیار حاصل کریں۔ آئیے ہماری ماضی کی جھول سے بھری وہ لطیف قدریں اور ان کے ساتھ انسانی ذہنوں کی نئی نظر جو ہم نے آدمی اور قدرت کی بنیادی حقیقت سے حاصل کی ہے ہماری سیاسیات سارے انقلابی اقتصادیات اور ہماری سماجی زندگی کے لئے مشکل راہ ثابت ہو۔ فعال ذہن پیدا ہوں ایک نئی اچالنے نو کو شروع کرنے کے لئے ایک بیدار ضمیر پیدا ہو۔

اصلاح شدہ ہندومت

اس اچالنے نو کی اولین لازمی بنیاد اور ایک اہم جز ایک نو بیدار اور نو تقویت شدہ ہندومت ہوگا جس ہندومت سے لہنا پلپلاہن ترک کر دیا ہو، اپنی مسدود آفتوں کو صاف کر دیا ہو اور خوش اور طاقت کو دوبارہ حاصل کر لیا ہو۔ یہ ایسا ہندومت ہوگا جس سے نیا ہندو پیدا ہوگا جو عدل پسند ہو انسان دوست ہو، خالق ہو اور سچے والا ہو ہندو جو جس کا ضمیر صاف ہو، ایک ایسا ہندو جو انسان کے بنیادی اتحاد میں یقین رکھتا ہے، ایک ہندو جو صرف اپنی ہی روح کو پاکیزہ بنانے کا پابند ہے بلکہ اپنے ارد گرد کی روحوں کو بھی پاکیزگی عطا کرے گا جو تمام مخلوق کی اداروں کو تقبلی سہارا عطا کرے انہیں مضبوط و دیانتدار خدمت اور نتائج بخش بنائے۔

اصلاح شدہ، نو تولید اور مستحکم ہندومت سے میری کیا مراد ہے؟ آئیے میں اختصار میں بیان کروں۔ بہت سارے ایسے عالم میں جو ہندومت کو اعتقادات اور روایات کا اختلاط ایسے خیالات اور عقائد کا ایک سمندر خال کرتے ہیں۔ جس میں بہت ساری ندیاں اور جھوٹے موٹے دریا اگر مل جاتے ہیں ہندو

مذہب کے ایک مشہور عالم دیوراجہ نے کہا ہے: عیسائیت اور اسلام کے صاف و شفاف طریقے سے طے شدہ اعتقادات کے مقابلے میں ہندومت اعتقادات، اصولوں اور افعال کا ایک اختلاط معلوم ہوتا ہے۔ جو ہندو طلباء اور علماء کی فہم اور تشریحی قوت بیان کو بھی دھوکے دیتا ہے۔ سری لٹاسن کے مطابق ہندومت متضاد اعتقادات کی تسلسل نظریات اور مردہ روایت پرستی، ایک خستہ حال سماجی ڈھانچے قوت برداشت کا منظم سلوک کے ناقابلِ لاغز عمل کا ایک مرقع ہے جو تمام تر تریغوں کو غلط ثابت کرتا ہے۔

اس قسم کا نظریہ جو ہندومت کی مصیبتی تصویر پیش کرتا ہے، تاریخی پس منظر کو سمجھنے اور خالص کو نقل سے سلی کو گہرے سے بلند کو پست سے الگ کرنے کی نااہلیت سے پیدا ہوتا ہے کسی بھی پرانے مذہب میں ہمیشہ و رفت کی وجہ سے گرد و غبار پیدا ہو جاتا ہے، بدقسمت حادثے رونما ہوتے ہیں، عضو ٹوٹ کر رہ جاتے ہیں، نقلی جراح اور نیم حکیم پیدا ہو جاتے ہیں، ششکے عضو ٹھیک نہیں ہوتے اور سورتی پیدا ہو جاتی ہے۔

ہندومت ان باتوں سے الگ نہیں تاریخ کے انقلابات نے بنجر مینوں اور تباہ شدہ باغوں کو تنہم دیا۔ تباہ ہوئے واقعات کے تلے عظیم اور بلند خیالات کی بواہر دب کر رہ گئی۔ ایک مایوس کن اور بوجھل عصری خزاں کا آغاز ہوا۔

طویل خزاں کے سبب ہی ہندومت آج اس زبوں حالی کا شکار ہے۔ اس کی روح اُلٹ دی گئی ہے اور اس کے باطن میں خشک اور پُر خار جھاڑیاں پنہاں ہیں۔ ایک ہندو بہار کا کب سے انتظار ہے اور اس کے آنے کا یہی مناسب وقت ہے۔

ہندو خیالات و افعال کو تین سطحوں میں درجہ بند کروں گا۔ سطح اول میں ہندومت کا اندرونی امرت اس کا بنیادی پیغام زیر زمین اتحادات کی وحدت شامل ہیں۔ سطح دوم میں وہ اعتقادات، افعال شامل ہیں جو اس کے بنیادی فلسفے کے برعکس نہیں اور جو عام آدمیوں کی مذہبی ضروریات کے مطابق ظہور پذیر ہوئے کیونکہ اس کی روح کی دانشورانہ ہم کو نہیں سمجھ سکتے تھے چنانچہ انہیں اپنے علامات دیوی دیوتاؤں کے عکس اور خدروں کا سہارا لینا پڑا۔ سطح سوم میں وہ تمام بناوٹی رسوم و روائیں، لہریں اور اہام شامل ہیں جن میں نقلی بجا رہوں کی طرف سے شدہ دی گئی جیسی رسوم ان اہام میں شامل ہیں

ہندومت کی اصلاح کے لئے سطح سوم کو ختم کرنا، سطح دوم کو دوبارہ تقویت دینا اور سطح اول کو خلاصت عطا کرنا شامل ہے۔

اس قدیم مذہب میں اصلاح کی بھاری ہرورت ہے جس نے وقت کی صعوبتوں کو برداشت کیا ہے درحقیقت ہندو مذہب خود تسلیم کرتا ہے کہ تبدیلی اور حرکت زندگی اور کائناتی حقیقت کا ایک حصہ ہیں۔

حقیقت کی تحریکات کو ہندو فلسفہ کی بنیاد تسلیم کیا گیا ہے کائنات میں پیہم تبدیلی رونما ہو رہی ہے اس کا اپنا تخلیقی عمل ہے اس کا اپنا خود تولیدی فلسفہ ہے۔ نہ معلوم کتنے ہی صرف بلکہ معلوم کردہ بھی بدلے ہیں۔

معلوم کنندہ اور معلوم کردہ کے درمیان میل جول ایک محرک فلسفہ ہے۔ ایک محرک توازن دوسرے محرک توازن کو مسلسل جگہ دے رہا ہے۔ ایسے توازن و نظام کا اندرونی خاصہ ہے۔ ہندو فلسفہ کہتا ہے ہماری زندگی حقیقت اور راستی کی تربیت حاصل کر رہی ہے کہ ہر دائرے کے ارد گرد دوسرا دائرہ کھینچا جاسکتا ہے قدرت کا کوئی سرا نہیں اور ہر سرا خود میں ایک ابتداء ہے۔

پُر دلیل اعتقاد

اصلاح شدہ ہندومت کے ایک مضبوط ترین پہلو پر دلیل اعتقاد کے حصول کے لئے بیداری پیدا کرنا ہے۔ انسانی ذہن کے لئے اعتقاد ایک جزو لا ینفک ہے۔ یہ وہ ڈگر فراہم کرتا ہے جس پر زندگی چلتی ہے کسی شخص کو خدا پر اعتقاد ہو سکتا ہے کسی کو سائنس پر اور کسی کو دوزخوں پر اعتقاد ہو سکتا ہے۔ اور کسی بے عقیدہ شخص کا بھی کسی دیکھی چیز میں اعتقاد ہو سکتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ یہ اعتقاد اپنی ذات ہی میں ہو۔ ایک نوزائید بچے کو اپنی ماں کے دودھ میں اعتقاد ہوتا ہے اس کے لئے وہی حقیقت ہے جس طرح کائنات کا نظام ایک حقیقت ہے جس کے بارے میں ایک بالغ نظر فرد معلوم کرتا ہے۔

درحقیقت معاملہ اعتقاد یا اعتقاد کے فقدان کا نہیں، سوال ہے وجہ غیر منطقی اور پُر دلیل بھروسے کا ہے۔ انسانی ذہن کی منطقی صلاحیت خدا کا سب سے بڑا تحفہ ہے۔ گرد و پاس کی حقیقت کو سمجھنے میں ایسے کام میں دلانا، اس کے وجود سے انکار کرنے کے مترادف ہے جولائی ۱۹۸۸ء میں مدھیہ پردیش میں ایک باپ نے اپنے چار سالہ بیٹے کو ہلاک کر دیا تاکہ اسے ایک پوشیدہ خزانہ حاصل ہو سکے۔ یہ کام اس نے اپنے تانترک گورو کے مشورے پر کیا۔ اس گھناؤنے فعل سے زیادہ کوئی بے خدائی کام نہیں ہو سکتا، اگر کسی غیر منطقی نہیں بلکہ ہر منطقی اعتقاد نے اس دیوانے شخص کی رہنمائی کی ہو تو اسے اس بات کا احساس ہو گیا۔ چوتھا کہ ایک معصوم لڑکے کا قتل ہندومت کی تمام بنیادی قدروں کے برعکس ہے۔

دوسری طرف ایک اور شخص کی مثال لیجئے جس میں منطقی ذہن کو نشوونما حاصل ہوئی ہے دیوی کی پوجا کرنے کیلئے مندر میں داخل ہونے سے قبل وہ دیوی دل میں کہے گا۔

”اے سمجھان میرے ان تین گنا ہوں کو معاف کر دو جو میری انسانی مجبوریوں کی وجہ سے ہیں

تم ہر جگہ موجود ہو مگر تمہاری عبادت میں کرتا ہوں۔

جہاں کوئی شکل و صورت نہیں مگر میں ان اشکال و صورتوں میں تمہاری عبادت کرتا ہوں تمہیں کسی مدح سرائی کی ضرورت نہیں مگر میں تمہاری پراختیا کرتا ہوں اور پر نام کرتا ہوں۔ اے مالک میرے ان تین گنا ہوں کو معاف

کردو۔ جو میری انسانی مجبوریوں کی وجہ سے میں یہاں اس شخص کا عقیدہ منطقی ہے۔ وہ ان انحرافات کا احساس کرتا ہے جن کا انسانی ذہن شکار ہو سکتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ خدا ہر جگہ موجود ہے اس کی کوئی شکل و صورت نہیں ہے اسے مدح سرائی کی کوئی ضرورت نہیں، مگر اس کا احساس کرنے کے لئے اس کے نزدیک رہنے کے لئے اور اس پر توجہ مرکوز کرنے کے لئے آدمی کو اسے مشکل جگہ دینی ہوتی ہے اور پروردگار کے الفاظ میں اس سے بات کرنی ہوتی ہے۔ یہ ذہنی کبھری ہمیں کرنوں کو درست کر کے غرض توجہ مرکوز کرنے کے لئے ہے جو محبت پر مبنی ہیں اور نہ ہی یہ یہ صرح شیا کی پرستش اور ان سے گھٹ کر نہ یہ یہ ترتیب پیدا کرنے والے سے رسائی کے مترادف ہے تاکہ حتمی حقیقت کے ساتھ رابطہ پیدا ہو سکے۔

بہت سارے ہندو فلسفے، کہانیاں، افسانے حکایتیں اور روایتیں وغیرہ ہماری اہمیت رکھتی ہیں اور عموماً عام لوگوں پر اپنا گہرا اثر چھوڑتی ہیں۔ مگر ان کی اندرونی منطق کی تلاش لازمی ہے۔ ورنہ جو لوگ تعلیم کے فقدان کی وجہ سے زیادہ منطقی نہیں، استعمال کا شکار ہو جائیں گے۔ اور جھوٹی داستانوں اور رسوم کے شکار ہو کر رہ جائیں گے۔ چنانچہ یہ بات لازمی ہے کہ کسی ایسے کہانی یا افسانے کو نہ رکھا جائے جس پر ماضی میں منطق کی چھاپ نہ ہو یا جس کے پس پردہ منطقی اعتقاد کی کھوج نہ ہو سکے جو مذہبی فیضان کی زیر پروردہ قدروں کے ساتھ مقابلہ کر سکے، انہیں تلاش کر کے ہر ذہن کی فطرت میں سے نقلی پتھر کی طرح باہر پھینک دینا چاہیے۔

غیر منطقی اعتقاد سے روحانی نجات حاصل نہیں ہو سکتی یا سماج میں نظم و ضبط پیدا نہیں ہوتا دوسری طرف مدلل اعتقاد انسان کو روحانی طور پر بلند سے بلند تر کر دیتا ہے۔ اندرونی آنکھ زیادہ سے زیادہ فعال ہو جاتی ہے اور منطقی عمل کی مددگار ہوتی ہے۔ انسان کی معلومات کی صلاحیتوں کا امتزاج ہو جاتا ہے، زیادہ منطقی حاصل ہوتی ہے جہاں پر تجربے کو زیادہ وسعت حاصل ہوتی ہے اور روحانی نجات ممکن ہو جاتی ہے۔ آپنشد کہتے ہیں: "زیادہ داخل رکھنے والے انسان کے ہاں شک، نفرت اور مناقشات ہوتے ہیں منطقی انسان کو فروغ پاکر روحانی انسان بننا ہوتا ہے اگر کسی کو اپنے انسان ہونے کی منزل حاصل کرنا ہے تو اس کے سامنے انفرادی طور پر یہی فریضہ ہے۔ درحقیقت منطقی روحانیت کا بنیادی لازم ہے ارتقاء کا ایک مرحلہ جو روحانیت کی منزل سے پہلے آتا ہے۔ اگر کوئی انسان پہلے منطقی نہیں تو وہ روحانی نہیں ہو سکتا۔

اصلاح یافتہ ہندومت اور سماجی نظام

ہندومت کو استحکام کو بخشنے کا ایک اور طریقہ یہ ہو گا کہ ہندو قدروں کی شگنی لہر کو استحکام کی جانب لے جایا جائے۔ تاکہ ایک منصفانہ نجات شدہ اور جمہوری نظام قائم کیا جاسکے۔

رگ وید کا سب سے قدیم ایک منتر یوں ہے۔

”اچھی سیما کی بالادستی قائم کرنے کے لئے

عالم جہاں کے خست کش عوام متحد ہو جائیں۔

اور غاصبوں کو غصب کر دیں۔“

کیا کسی منصفانہ سماجی نظام کی خاطر لڑنے کے لئے اس قدر جذباتی تعلق ہو سکتی ہے جتنی کہ اس منتر میں ہے۔ گیتا بھی ایسے سماج کی بابت کہتی ہے جس کے پس پردہ کارفرما جذبہ انصاف نہ کفری فائدہ ہے جو لوگ دنیاوی مسائل کی لوٹ کھسوٹ کرتے ہیں انہیں گنگا کا راور پرزن کہا جاتا ہے اور جو لوگ ناجائز طریقوں سے دولت جمع کرتے ہیں انہیں شیطانی کہا جاتا ہے۔

کائنات میں جو مددیت کا خدائی اعتقاد سرائیت کر گیا ہے، وہ تمام جانداروں کے لئے مساوات برادری آزادی اور ان کی روحانی تعلق کے سوا کچھ نہیں۔ اگر خدائیت سے میری شخصیت بنتی ہے اور آپ کی بھی بنتی ہے تو ہم میں مساویت کے سوا کچھ نہیں۔ ایک انسان میں خدائیت دوسرے شخص کی خدائیت کو کیسے بھوکا رکھ سکتی ہے۔ اور ایک شخص میں خدائیت کسی اور شخص کے ساتھ کیسے بے اخلاقی کر سکتی ہے؟ اگر میں مغرب اور میرا افراد کی خدمت کرتا ہوں تو میں مغرب اور میرا افراد میں خدائیت کی خدمت کرتا ہوں۔ یہ خدائیت کا تصور ہی تھا جس نے بعد ازاں دو الگ الگ نند کے زوردار الفاظ میں بیان حاصل کیا۔ ”میں ہار ہار کر لہجہ حاصل کروں، ہزاروں مصائب برداشت کروں تاکہ میں اس خدا کی خدمت کر سکوں جس کا وجود ہے، وہی خدا جس میں میں اعتقاد رکھتا ہوں، جو سبھی روجوں کا مجموعہ ہے اور جو سب سے زیادہ میرا خدا گنگا کا زیر میرا خدا مصیبت زدہ اور میرا خدا سبھی نسلوں اور مخلوقات میں عزیز ہے۔“

ایسا ہمدرد اور انسان دوست سماجی نظام پیدا کرنے کے لئے اور کوئی منطقی یا روحانی راستہ ہو سکتا ہے؟ اور آخر کار انسان کے بنیادی اتحاد کا ہندو نظریہ کیا ہے؟ سبھی میں یکجہتی؟ کیا یہ روحانی نیکو لازم کے علاوہ کچھ اور ہے؟

اصلاح شدہ ہندومت اور قومی نصب العین

اصلاح شدہ ہندومت سارے قومی نصب العین کو روحانی تقویت فراہم کر سکتا ہے یہ یوپی زندگی میں گفتار اور افعال کے درمیان تعلق کو برقرار رکھتا ہے۔ ہماری بہت ساری سکیمیں اور پروگراموں پر کلیدی کے ساتھ عمل آوری کے لئے ایک طوس طاقت ثابت ہو سکتا ہے۔

مثال کے طور پر ماقولیات کے تحفظ اور اسے بہتر بنانے کا کام کی گئیے، اس معاملے میں کوئی بھی واحد پہلو اس قدر بیداری پیدا نہیں کر سکتا جتنا کہ قدرت کے ساتھ ہم آہنگی کی ہندو قدروں میں اس معاملے میں مدد کار ثابت ہو سکتی ہیں۔ مہا بھارت، رامائن، وید، آپنشد، گیتا اور پران اور سمرتی ماقولیات کے تحفظ اور قدرت کے توازن کو قائم رکھنے کے بارے میں قدیم ترین بیجام کے حامل ہیں۔ صدیوں سے ڈرگما تکی عبادت کرتے ہوئے ایک ہندو کہتا ہے۔ جب تک اس میں پرہیز، جنگلات اور روزت وغیرہ موجود ہیں انسانی نسل زندہ رہے

ختم ہو گئی۔ میری طرف سے پاس کئے گئے ایک کی تصدیق کر دی گئی کیونکہ راکین اسمبلی اور راکین کونسل نے یہ بات عموماً کر لی تھی کہ اگر معمولی مخالفت ہوئی تو اس کا مطلب عوامی غم و غصے کو دعوت دینا تھا۔

تمام تر مشق سے یہ سبق حاصل ہوتا تھا کہ عوامی ذہن میں اصلاحات کے لئے زبردست خواہش پنہاں تھی کسی کسی شخص کو تو یہ کام شروع کرنا تھا اور اسے مکمل اور مثبت سمت عطا کرنا تھی۔ اب یہ صرف ساما اور اس کا روحانی طور گھما کے اندر دکھائی دیتا ہے۔ بلکہ ان لاکھوں مرد، عورتوں اور بچوں کی خدمت میں بھی مقرر ہے جو اس کیلکس کے گرد و فراز میں رہتے ہیں۔ یہ جمہوری شوبے۔ ضرورت مندوں کی خدمت کا راستہ ہی بلکوان کے گھر تک جاتا ہے۔ ہندو مت کے عظیم اصولوں کی عملی نمائش یہاں پر ہوتی ہے۔

دیگر قابل نمائش پروجیکٹ

اصلاح اور تولید نو کا ماقول قائم کرنے کے لئے دیگر متعدد پروجیکٹوں کو شروع کرنے کی ضرورت ہے۔ عصری ہندوستان کے موجودہ حالات میں حکومتی طاقت سیاسی جماعت کی تنظیم اور صد قتل کارکنوں کی تندی سماج میں بنیادی تبدیلی شروع کر کے اُسے ٹھوس صورت عطا کر سکتی ہیں۔

مثال کے طور پر اتر پردیش حکومت پر یہ لازم ہے کہ وہ وارانسی اور گرد و پاس کے علاقوں میں ال قسم کی زبردست بہتری کا کام شروع کرے جیسا کہ ویشنودوی استھان کیلکس میں شروع کیا گیا ہے۔ ہندوستان کے ایک اصلاح شدہ روحانی دار الحکومت کا قیام لازمی ہے جو مناسب منصوبہ بندی اور تعمیر کے ساتھ اصلاح شدہ اور تولید ہندوستان کی علامت ثابت ہو سکے۔ ایک کہاوت ہے: "آپ مجھے اپنے شہر دکھائیے اور میں آپ کو عوام کے ثقافتی مقاصد کی بابت بتاؤں گا"۔ وارانسی اصلاحی تقاضوں کی بہترین آئینہ دار ثابت ہو سکتی ہے۔ گنگا کا صاف و شفاف پانی، دیدہ زیب سے تعمیر کردہ گھاٹ، دریا کا دل فریب کنارہ، صاف مندر اور ایک ایسا شہر جس کی ہر طور پر دیکھ بھال اور تنظیم کی جاسکے۔ چونکہ صرف انسان کے لئے روح پرور ہو بلکہ ایک محرک شہری زندگی پیدا کر سکے۔ طویل سے طویل تر سفر کا آغاز زمینی پہلے قدم سے ہوتا ہے۔ تخلیقی اور اصلاحی کاوشوں کو اس اثناء کے دوران زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی توسیع دینا پڑے گی۔

ابتداء کرنے کے لئے میں نے وارانسی کا نام تجویز کیا ہے کیونکہ یقین کیا جاتا ہے کہ اس شہر کی بنیاد تخلیق کے آغاز میں رکھی گئی۔ بہر کیف بیان قدیم ترین شہر ہے جو کی بابت انیسویں صدی کے وسط میں ایم۔ اے۔ شیرنگ نے لکھا: "جب بیلون بالادستی کے لئے ناؤ دیکھ کے ساتھ کشش کر رہا تھا۔ جب ٹائرنا آبادیوں کی بنیاد رکھ رہا تھا۔ جب ایتھن کی طاقت میں اضافہ ہو رہا تھا اس سے قبل کہ روم مشہور ہو یا یونان نے فارس

کے ساتھ کٹھا کر لیا تھا۔ سائرس نے فارس بادشاہت کی شان و شوکت میں اضافہ کیا تھا۔ بنہو چدن زار نے یروشلم پر قبضہ کر لیا تھا اور جتہ کے باشندوں کو غورس کر لیا گیا تھا، یہ شہر اگرچہ شان و شوکت نہیں تو عظمت حاصل کر چکا تھا۔ اس شہر میں عصری ہندوستان کی زندگی بھر پور انداز میں ملتی ہے، تجارت و کاروبار موسیقی و قص، سخن و ادب کثرت و فراوانی، گندی بستی، انیم گندی بستی اور سب سے زیادہ گندی بستی اس کے لئے یہ شہر مشہور ہے یہ وہاں تو ہے وہ یہاں نہیں ہے، کیلئے مشہور ہے۔

دوسرے مذہبی اور سماجی نظام

اگر جیسے نو کو گہرائی حاصل کرنا ہے تو دیگر مذہبی اور سماجی ڈھانچوں کو بھی نئی بیداری لانا ہوگی۔

مثال کے طور پر اہل اسلام کے لئے بھی زبردست اصلاحی اور تولیدی لہری ضرورت ہے جو اسلامی تخلیق اور تعمیری تشریح اور عمر حقائق کے پس منظر میں اس کے کارفرما جذبہ کو اجاگر کر سکے۔ تاکہ یہ کچھتی کی ایک قوت بن کر ہندوستانی سماج کی قدروں میں عام اخلاقی اور اسلوبی بہتری لاسکے۔

میں نے ذاتی طور پر کشمیر میں طلاق شدہ مسلمان خواتین کی حالت زار کو دیکھا ہے۔ میری ٹولی کا اعتوں کے دوران ان میں سے چند خواتین اگر اپنے مصائب کی اندوہ ناک داستان بیان کرتیں۔ ان میں سے چند ایک فارغ البال خواتین ہیں جنہیں ان کے ایسے مردوں نے چھوڑ دیا ہے جن میں سے بیشتر حکومتی ملازم ہیں اور یہ بے چاری خواتین کسی سماجی بہبود کی تنظیم یا حقیقی ادارے سے راحت تک حاصل نہیں کر سکتیں۔

مسلم لیڈروں نے جو قوت شاہ باؤ معاملے میں سپریم کورٹ کے فیصلے پر نکتہ چینی کرتے ہیں صرف کی اگر اس کا ایک معمولی مقدمہ ہی ان لم لیڈروں نے مسلم پرسنل لا کا، اصلاح پر خرچ کیا ہوتا اور مسلم خواتین کے ساتھ انسانی ہمدردی کے سلوک کا جذبہ کارفرما ہوتا تو اس کا مثبت نتیجہ نکلتا اور ہندوستان میں کثیر آبادی کے دلوں میں پیرا شہتات اور دوسرے دور ہو جاتے۔

اصلاح کا دائرہ وسیع اور پیچیدہ ہے اور اس تمام دائرے کا احاطہ اس کتاب کا موضوع نہیں ہے۔ مقصد ایک محدود مقصد ہے کہ مذہبی نظام کا ایک حقیر سا حقہ ہندوستان کی ۸۵ فی صد آبادی کے لئے جاؤں اور انحصار کے ساتھ یہ واضح کروں کہ خیالات کی ڈور کے ساتھ کس طرح بنیادی اصلاحات عمل میں لائی جاسکتی ہیں اور جن سنگین مسائل کا قلم کو سامنا ہے انہیں کیسے دائمی طور پر حل کیا جاسکتا ہے۔ یہ مسائل جن میں کثیر کا مسئلہ بھی شامل ہے، ہندوستان کی بیمار روح اور اس کی تخریبی قدروں سے پیدا ہوتے ہیں۔

اداروں کی اصلاح

بہت سارے معاملوں میں ڈھانچے کی اصلاح ضروری ہے۔ انتخابی عمل میں اصلاح کی ضرورت ہے

پارلیمنٹ عدلیہ انتظامی مشینری، عوامی اور نجی اداروں ذرائع ابلاغ اور حکومتی اور سماجی نظام کے بہت سارے عضویں اصلاحات لازمی ہیں مگر جس قدر بھی خوش اسلوبی سے خواہ مربوط یا کیوں نہ ہو وہ دیانند داری اور قابلیت کے ساتھ تب تک کام نہیں کر سکتا جب تک سست روی، بے اعتنائی، سازش، نا انصافی اور اقتدار کی پوزیشن کے لئے بے اصولی اور بے تحاشہ جستجو کی بددیہی اور بیماریاں موجود ہیں۔ اگر خون کی نالی میں زہر ہے تو اس کا اثر تمام اعضاء پر ہونا ناگزیر ہے اور جسم میں بدشکلی پیدا ہونا بھی لازمی ہے۔

حل

اجسادات میں موجودہ بحران کے متعدد حل تجویز کئے گئے ہیں۔ چند لوگوں نے ٹریسٹے TRISTE طرز کے حل اور چند نے ۱۹۵۲ء سے قبل کے اتحادی درجے کی ضرورت پر زور دیا ہے میری نظر میں یہ کوئی حل نہیں ہیں وہ محض ہتھیار ڈالنے کے موقع کے مترادف ہیں۔ ان کی ناقابل عمل صورت اور غمازوں کی وجہ سے ملک میں منافرت اور تجزیب کے دائروں میں توسیع ہوگی۔ وہ موجودہ بحران کی قریباً تمام جڑوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں جنہیں میں نے خصوصاً ابواب چہارم، بیخ، ہشتم اور دہم میں نمایاں کیا ہے ساتھ ہی وہ موجودہ ہندوستانی سیاسی نظام اور حکومت کو فراموش کر دیتے ہیں جن کے بارے میں ٹھوس شہادتوں کے ساتھ میں نے ابواب دوازدہ، سیزدہ، پانچ اور شش دہ میں بیان کیا ہے۔

اگست ۱۹۳۷ء کے واقعات سے بھی اس بارے میں اشارہ مل جانا چاہیے۔ ہمارے لیڈروں نے تقسیم وطن کو اس لئے قبول کیا کہ اس سے فرقہ پرستی کا مسئلہ ختم ہو جائے گا۔ مگر نہ صرف فرقہ واریت کا مسئلہ بدستور موجود رہا بلکہ تنازعات اور تناؤ کے دائروں میں بھی اضافہ ہوا۔ دونوں طرف کے لوگوں کی طرف سے باہمی شبہات و حسد اور اس کے نتیجے میں ہتھیار جمع کرنے کی دوڑ نے دونوں طرف کے لوگوں کو تقسیم کرنے والی روش پر لا کھڑا کر دیا جس سے عزت اور پہچانہ نگہ کرنے والی صورت اختیار کر لی۔ اگر ہم نے اس صورتحال کا صحیح انداز میں مقابلہ کیا ہوتا، خود کو سلنے میں ڈھالا ہوتا تو امتدادی مشکلات کے بعد کو اگست میں ایک گوہریت اور تعمیری اور تخلیقی صلاحیتوں والی ایک نئی تہذیب ایک نئی قوم پیدا ہوئی ہوتی۔ کشمیری پنڈت بھارتین کا مسئلہ حل کرنے کے لئے، پروفیسر بلراج مدھوک نے جنوبی کشمیر میں ایک علیحدہ ضلع قائم کرنے کی تجویز پیش کی ہے جو جواہر نمنل (سرنگ) کے بائینال سرے سے شروع ہوا اور جس میں ویری ناگ (چھ بل کوکر ناگ) مٹن، امارتھنڈ، ہبل گام اور شری امر ناتھ کی مقدس گنجائش شامل ہوں۔ یہ تجویز بغیر واضح طور پر تسلیم کرنے کے مترادف ہے کہ وادی سے عسکریت کا قلع قمع نہیں ہو سکتا۔ اور یہیں انہیں حالات میں گزارا کرنا ہو گا۔ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ بدعت کو جمعہ دیکھا جائے اور یہ کشمیری پنڈت رہائشی علاقے میں یا وکین نہ پیسلے۔ اس تجویز میں اور ہم بہت ساری غلطیاں، اشتباہات، آڑھ، جھوٹ، جھوٹے حقائق اور اضافات اور تورات کی تورات کے ساتھ ساتھ

شامل ہیں۔ اگر ۸ کروڑ کی قوم اپنے عوام کے لئے ان کی آبائی بستیوں میں عزت اور وقار کی زندگی کو یقینی نہیں بنا سکتی تو شاید ہی اسے قوم کہلانے کا کوئی حق حاصل ہے۔

لذا، جوں اور وادی کے قیام سے مسائل حل ہونے کی بجائے بہت سارے مسائل پیدا ہو جائیں گے جب تک تحریک کی سیاست موجود ہے، اس قدر وارانہ جذبات کے استحصال کا مزان موجود ہے، اس قسم کی کوئی تجویز سودمند ثابت نہیں ہوگی

مسئلہ کشمیر کا حقیقی حل ان کمزوریوں اور مضمر صحت طاقتوں کو دور کرنے سے ممکن ہو سکتا ہے جن کا بیان اور تجزیہ یہ میں نے اس سے قبل کے ابواب میں کیا ہے۔ یہ کام صرف ایک اصلاح شدہ مضبوط اور پر جذبات ہندوستان ہی کر سکتا ہے جو نئے نظریات کا حامل ہو۔ ایسا ہندوستان یہ کام سرانجام نہیں دے سکتا جو اوقتی سیاست کا کھارہ بن کر رہ گیا ہے۔ مصنوعی انداز فکر کے معاملے میں کشمیر تمام حدود سے تجاوز کر گیا ہے اور اس کے لیڈروں نے تبلیغ حقیقتوں کا سامنا کرنے کی بجائے غلط فہمیوں کے گڑھوں میں مقید رہنے کی الٹی وحدانیت کا مظاہرہ کیا ہے۔

فوری بحران کے معاملے میں انداز فکر کی نشاندہی میں نے ابوابِ نور اور چودہ جہ میں کی ہے اور یہی اس کا جواب ہوگا۔ اگر میں نے اس کے بعد سب پر برقرار رہا ہوتا تو میں نے اس حکمت کو مکمل طور پر روک دینا میں ہمیشہ قہر کی ہوتی جس کا احاطہ میں کر چکا ہوں۔ میں نے کلا شنفوف کا دہدہہ ختم کر دیا ہوتا اور صوبہ حال کو کم شدت کی جنگ تصور کیا ہوتا۔ اگر لازمی ہوتا تو اعلیٰ ہمارت کے رائلک افراد کا گور بیلانخ الف گروپ قائم کیا ہوتا جیسا کہ مغربی جرمنی میں جی۔

ایس جی ۹ کی صورت میں کیا گیا ہے میں نے اس بات کو یقینی بنایا ہوتا کہ مخالف کی سپلائی لائن کا ناطقہ بند کر کے رہا تھا وسائل کو دہشت گردوں تک جانے کی پیش بندی کے سبب جو غلٹے اور دوسری اشتباہ کی خرید جیسے بے وقت اقدام کے ذریعے میں میں نے لوگوں کو تحریک کر دیا کہ خلاف فسادات کرنے کیلئے تیار کیا ہوتا کہ دہشت گردان کیلئے انتہائی زہرول حالی بنے ہیں اس کے علاوہ غیر جانبدارانہ اور منصفانہ انتخابات کے ذریعے میں انہیں واپس کا راستہ بھی فراہم کرتا۔ میرے گذشتہ عہد کے دوران ہر ۱۵ راست ایڈمنسٹریشن کا تجربہ حاصل کرنے کے بعد گھبریلوں کو یہ بات یاد دہان کرنے میں ذرا بھی تاثر نہیں ہوتا کہ انتخابات منصفانہ طور پر ہوں گے۔ میں نے جموں میں قائم کی گئی نامزد عدالت میں ان افراد پر مقدمہ چلایا ہوتا کہ جبیں قتل اور اغواء کے معاملات میں گرفتار کیا گیا تھا اور اقتدار تک پہنچنے کے تجربہ کاروں

اور ان کے حمایتیوں کے ساتھ غصے کے معاملے میں بہت جالت میں لایا ہوتا بعد ازاں سیف الدین مورتی بھی افراد کے حصار پر پھرنے لگا اور عدالت قائم کرنے کے سہوگ وہاں پر ماول پر اگندہ تھا چنانچہ مناسب طور پر مقدمہ چلنا نا ممکن رہا اس طرح حکومت کی وجہ تمام محنت اقارت گئی اور گھڑی کی سوئیوں والی پس انگلیں اب انہیں دوبارہ واپس لے جانے کا قریب آنا ممکن نہ رہا ہے میں نے مناسب وقت پر یہ بات بھی واضح کر دی ہوتی کہ اگر پاکستان لازماً تجزیہ بنیاد پر ہی قائم ہوگا

میلنگ کے حربے اختیار کئے تو میرے پاس دفعہ ۴۰ کی تنسیخ کے لئے اقدامات کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہے گا۔ اور میں ایسی صورت پیدا کر دوں گا کہ میں اس قسم کی بلیک میلنگ کے مواقع بالکل دریں جن سے مذہبی تعلیمات کی تنگ نظر تشریح کر کے وہ غریب اور ناخواندہ عوام کو چھانے میں نہیں ڈال سکے۔ میں نے غریب اور لاچار کشمیریوں کو ان حقائق کی بابت روشناس کیا ہوتا تھا جن کی نشاندہی میں نے باب ششم میں کی ہے۔ میں نے انہیں چند معاملات کے ذریعے یہ بھی دکھایا ہوتا کہ دفعہ ۴۰ کو ختم کرنے سے انہیں زندگی کے ہر شعبے میں کس طرح فائدہ پہونچے گا۔ میں کشمیریوں کے ساتھ مکمل انصاف کرتا مگر میں ان سے بھی یہ توقع رکھتا کہ وہ ملک کے ساتھ انصاف کریں۔ ایک الگ پہلو کے طور پر اسن وامن بحال کرنے کے بعد جیسا کہ ابواب ہم اور جہادہ میں نشاندہی کی گئی ہے وسیع پیمانے پر ترقیاتی کام شروع کئے جاتے اصلاح اور ترقی کا ایک ماحول پیدا کیا جاتا خاص طور پر صوفی، سنتوں کے گرد و پاس بہتری کا کام کیا جاتا جن کی تعلیمات جیسا کہ باب ششم میں بیان کیا گیا ہے اب بھی کشمیری ذہن میں پوشیدہ ہیں اور ہندوستانی تمدنی قدروں کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔

تاریخ کا سٹرینگ ویل

تشمید کا اور باقی ملک کیا مستقبل ہے اس کا انحصار اس بات پر ہوگا کہ تاریخ کے سٹرینگ ویل پر کون بیٹھا ہے جب میں لفظ کون کا استعمال کرتا ہوں تو میرا مطلب صرف ایسے افراد سے نہیں ہے جن کے ہاتھوں میں ملک کا نصیب سونپا جائے بلکہ وہ حقائق اور سابق ماقول میں وہ طاقتیں ہیں جو حتمی تجزیے کے طور پر زندگی کے عام طویل کاتین کرتی ہیں۔ ایسے لوگوں کی ساخت اور ان کے پس پردہ کارفرما جذبہ بھی شامل ہے جو ان اداروں کو چلاتے ہیں۔ بغیر میں موجودہ طوفان ان افراد کی نسبت ہندوستان کے سماجی اور اخلاقی ڈھانچے کو مٹانے کی وجہ سے آیا ہے۔ جو ایسی ہی طاقتوں کی ابتغ اور ایک طرح سے اٹھنے والے ہیں۔ یہ اس نظام کا اندرونی بغض ہے جس کی وجہ سے تخریب کی طاقتوں کو وجہ حاصل ہوا اور شدید مذہبی صورت حال میں بھی انہوں نے انتشار اور تضادات کے گرد و پیر کئے اور غلط اطلاعات اور غلط بیانی کے سیلاب سے کو شروع کیا۔ انہوں نے ملک کے خون کا رنگ سفید کر دیا اور عوام کی غموں اور بیتوں کو طوالت عطا کی۔

ہو سکتا ہے کہ میں نے چند افراد کی نکتہ چینی کی ہو۔ میں ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا مگر تاریخی حقیقتوں کے پیش نظر میرے پاس اس کے سوائے کوئی چارہ نہیں تھا۔ مزید برآں یہ نکتہ چینی ذاتی نہیں ہے۔

++ ملاحظہ ہو باب دو واژہ انتشار اور تضادات کے گرد و

++ ملاحظہ ہو باب پانچ غلط اطلاعات اور غلط بیانیوں کا سیلاب

+++ ملاحظہ ہو باب شش در دیکھ کی طوالت

در حقیقت یہ نکتہ چینی ان منفی طاقتوں کی ہے جنہوں نے ملک کے کسی بھی بنیادی مسئلے کو قابل انتظام قیمت اور مناسب مدت کے اندر حل کرنے کے نااہل بنادیا ہے۔

یہاں تک کہ ہندوستانی دانشورا وراہل فکر بھی عام طور پر غیر مباحتوں اور مذاکروں یا اخبارات میں ادنیٰ لوگوں یا چھوٹے چھوٹے افعال پر بار بار مضامین لکھ کر اپنا وقت اپنی قوت اور اپنی صلاحیت کو ضائع کر رہے ہیں۔ شاید ہی کوئی شخص ملک کے حقیقی مسائل کی طرف توجہ دے رہا ہے۔

ان بنیادی قوتوں کی اصلاح اور تنبیہم کرنے کے لئے کچھ بھی نہیں کیا جا رہا ہے جن سے قوم کی زندگی چلتی ہے۔ قوم کے سامنے تو کوئی نیا خاکہ اور نہ ہی نیا فلسفہ حیات پیش کیا جا رہا ہے۔ ہندوستان کے پاس آج کوئی عظیم نظریہ نہیں ہے ہی کوئی جذبہ بیان کا فرما ہے۔ بادبان کے بغیر ایک جہاز وقت کے بے رحم سمندر میں غوطے کھا رہا ہے بہت سارے مسافر غیر فعال ہیں اور انہوں نے خود کو قسمت کے سہارے پر چھوڑ دیا ہے۔ دوسرے محض بیچ و تاب کھا رہے ہیں اور انہیں وہ نہیں مل رہے جو موثر طور پر چارج منبھال کر اس جہاز کو مخالف لہروں میں سے نکال سکیں۔

اہم اور نازک سوال یہ ہے کہ آیا قوم چند ایسے مردوزن کو ناخدا بنا سکتی ہے جو اصلاح اور تولید نو کی قوتوں کو حرکت بخش سکیں۔ اور اس طرح قوم میں نئی امنگیں پیدا کر سکیں، نئی زندگی عطا کر سکیں اور اپنے انتظامیہ اور سیاسی نظام کو نئی تحریک دے سکیں۔

وقت ہمارے حق میں نہیں ہے۔ ہمیں جلد ہی اپنا انتخاب کرنا ہوگا۔ کیا ہمیں تاریخ میں دنیا کے تیسرے درجے کے شہری کے طور پر یاد کیا جائے گا ایک ایسے ملک کے طور پر جس کے پاس دینے کے لئے کچھ نیا اور کچھ روح پرور ہے۔ وہ جو کچھ ہندوستان کی عظیم حیات نے نئے سے حاصل ہوا ہے۔ وہ اچانکے لڑتے تیاگ اور تپسیا، راستی، انصاف، سادہ زندگی اور اعلیٰ خیالات، عظیم معصوم انسان دوستی اور ہمدردی کی قدیم قدروں کو جذبہ کر کے اور نئے تجربات سے پیدا ہوئی ہے۔

جس قسم کی اصلاح کا خاکہ میں نے یہاں پیش کیا ہے، اگر وہ نہیں ہوتی اور اگر ہم اپنے نظام کی عین ترقی و ترقیوں سے نجات حاصل نہیں کرتے۔ اگر ہم قدامت پسندی کے رجحان کو جھٹک نہیں دیتے اور غیر موافق حقیقتوں کے ساتھ نزولانہ تجویز بند نہیں کرتے تو قوم کا تاریخ کا سٹرینگ ویل نامہوار راستوں پر بھٹکا تارے گا اور آخر ایک افسوسناک وحشی مستقبل میں اس کا انجام ہوگا۔

جہاں تک میرا تعلق ہے میں اپنا راستہ منتخب کر چکا ہوں میں راستی کے لئے اپنی جنگ جاری رکھوں گا اور جو ادنیٰ سا حق اس معاملے میں ادھر سکتا ہوں ہندوستان میں اصلاحی تحریک کو فروغ دینے کے معاملہ میں ادا کرتا ہوں گا۔ اپنے غم و غبار کے بارے میں آپ کو بتا کر میں نے ان زعموں پر مرہم لگانے کی فوری ضرورت کو محسوس کرانے اور خود پسند اگر وہ چھوڑوں تو دور کرنے کے لئے بنیادی اصلاحات کی ضرورت آجا کر کرنے کی کوشش کی

ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں اپنی کوشش میں کامیاب ہوا ہوں کہ نہیں۔ مجھے کم از کم اس بات کا اطمینان ہے کہ میں نے جو فکس کیا اسے محفوظ رکھنا اس پر لادیا۔ ذاتی طور پر مجھے اس بات کا اطمینان ہے کہ میں نے ٹھیک کام کرنے کی جرات کی ہے۔

باب اٹھارہ

قدیم مسائل نئی پچیدگیاں

ستمبر ۱۹۹۱ء سے اپریل ۱۹۹۲ء تک کے واقعات

وہ مجھے اس سے تبدیل نہیں کر سکے

وہ جانتے تھے

اس تمام خیال کی اس سے بھی زیادہ حقیقت

جو میں سوچتا تھا، صداقت تھی۔

رابرٹ مزارسٹ

جونہی میں یہ بات تحریر کرنے جا رہا تھا۔ بہادر جس کے متبسم چہرے سے ہمیشہ خوشی جھلکتی ہے میری میری
میں کے اخبارات کا ایک سیٹ رکھ جاتا ہے۔ جذبہ جلد ہی ماند پڑ جاتا ہے۔ مندرجہ ذیل خبر میری آنکھیں پر گور
ہو جاتی ہیں۔

”افغان المسلمین نے تین برغمالوں لے کر دھڑا کر کے پورے پورے ریسرچ ہاؤسز کی گریڈ ریٹائرڈ
ایڈیشنل سیکریٹری اور ایک سابق وزیر کے فرزند نعم اللہ کو سات نظر بندوں کے عوض رہا کر دیا۔

جبکہ تین نظر بندوں بشمول ڈاکٹر حیدر الطاف حسین خان، عبدالحمید المعروف عثمان اور پروین اختر
کو برغمالوں کے ساتھ ایک مشن رہا کیا گیا، تین دوسرے سکریٹس فیصل احمد بھٹ، عبدالحمید میر اور فیروز احمد
بیگ کو ایک گھنٹے بعد رہا کر دیے گئے۔

یہ تبادلہ درمیانہ دار نظر احمد صدیقی کی رہائش گاہ پر عمل میں لایا گیا۔ میر نعم اللہ کو ۱۹۵۹ اور دھڑ کو ۵۵
روزی برغمالی کے بعد رہا کیا گیا۔

”دیں! اشنا اوکل سے چارٹی ایس ایف جوائن سمیت ۱۳ افراد دہلاک ہوئے اور وادی میں قریباً قریباً
تھم بند رہا۔ اس بند کے موجب عام زندگی درجہ برہم ہو گئی۔ ہند کی کال ہیلز لیگ کی طرف سے پاکستان کے ساتھ
سالمیت کا مظاہرہ کرنے کے لئے دی گئی تھی۔“

— تاہم آف انڈیا، ۱۶ مارچ ۱۹۹۲ء

... شاد کو جاری طرف سے شروع کی گئی ہم کے تحت مشرقی اور کچھ کے قتلوں کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا اور وہ ان میں سے ایک
کو دلت سرگھو، ج. ر. کھوکھر، ... مارچ ۱۹۹۲ء کو گرفتار کیا گیا تھا۔ اس کے بعد وہ دلت سرگھو

اس سے ایک روز قبل میرے ایک دوست نے غصے کے عالم میں نوز ٹریک کا ایک کیسٹ میسر ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا: دیکھو ایک قوم کے طہریم کھد رستی اور زوال کے شکار ہو چکے ہیں۔ دیکھئے کس طرح خود کو قاتل بننے والا شخص ایک معصوم وائس چانسلر کے قتل کو چٹخارے لے کر بیان کرتا ہے اور ہماری حکومت اور نام و عوام پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ چند لمحوں بعد میں نے اسکرین پر جاوید احمد شالہ کو دیکھا تو نہایت بے دلی کے لیے میں کہہ رہا تھا۔ ہم نے اپنا دل کھینچا جیسے یرغمالوں کو چلنے کے لئے کہا۔ اور پھر ہم نے اس کو پشت پر گولی مار دی۔ اسے مرکزی حکومت کی خدمات کے لئے سزا دی گئی۔ ہم حکام کو جھکائے کے قابل ہو گئے۔ آپ جانتے ہو کہ دورانی سوامی کے معاملے میں ہم کس حد تک گئے تھے؟

چند روز قبل میں نے اخبارات میں مستند ریکارڈیوان کی ۳۲ روزہ برٹانی کی روائیداد پڑھی تو اس نے کہا تھا۔

”مجھ سے تفصیلی استنادات کئے گئے۔ مجھے باندھ کر اذیتیں دی گئیں میرے اغوا کاروں نے یوپے کے کردوں اور انگلو پٹی کے ساتھ برقی رو والے تاروں سے میرے بدن کو چھو ا میری انگلیوں کو پٹری طرح سے چلا دیا گیا مجھے ایک سو دسے بازی کے ترازو کا پلڑا بنایا گیا اور بیلٹوں کے پاس بیٹھنے کو مجبور کیا گیا جہاں سے انہوں نے چند لوگوں کے ساتھ بات چیت کی جو ان کے مطابق سری نگر کے حکومتی اہلکار تھے۔ انہوں نے کہا کہ میرے ہاتھوں کی انگلیاں نہیں لہہ دے دی جائیں گی۔ جلد ہی میرے گرد و پاس کے افراد نے چاقو نکال لئے اور میری انگلیوں کو کاٹنا شروع کیا۔ اور گھنٹوں تک ان سے خون بہنے کے لئے چھوڑ دیا گیا“

متذکرہ بالا اطلاع اور کیسٹ سے زیادہ موجودہ حالات کی بہتر عکاسی نہیں ہو سکتی۔ عسکری معصوم عوام کا اغوا کرتے ہیں اور اپنی شرطوں پر غلہ تاک جرموں کی رہائی حاصل کر لیتے ہیں۔ وہ ۵۹ دن تک کسی کو برہنہ رکھ سکتے ہیں۔ معصوم عوام کے قتل کی تیاریاں بگھارتے ہیں اور انہیں انیسویں صدی کے معصومیت دینے کا سہارا دیتے ہیں۔ اس طرح کے دوران ہونے دہشت گردی سے وابستہ معاملات سے بھی اسی قسم کے نتائج اخذ کئے جاسکتے ہیں۔ چند واقعات پر توجہ مبذول کرائی جاتی ہے۔ ہم ۱۹۹۲ء کو ڈاکٹر کیکر جنرل پولیس کے دفتر میں ایک زبردست بم دھماکہ ہوا۔ اس واقعہ میں ڈاکٹر کیکر جنرل جے این سکینز کے علاوہ چار اعلیٰ پولیس افسر۔ ایڈیشنل ڈاکٹر کیکر جنرل اشوک پٹیل انسپکٹر جنرل کشمیر ریج، وی ایچ بی اور ڈپٹی انسپکٹر جنرل کشمیر ریج آر جی جی مشدیدی طور پر زخمی ہو گئے۔ بذریعہ ہوائی چہاز انہیں دہلی لائے جانے کے فوراً بعد میں نے ان امیروں کو آل انڈیا انسٹیٹیوٹ

آف میڈیکل سائنسز میں دیکھا۔ یہ ایک اندوہ ناک منظر تھا۔ وسیع تر ضرروں اور انداز پر بندھی بیٹیوں سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ان کا بیچ جاننا شخص ایک خدائی کوشش تھا۔ تاہم سپڈ کانسٹیبل محمد امین اس قدر خوش قسمت نہیں تھا اور وہ موقع پر ہی جاں بحق ہو گیا۔ اس واقعہ نے اندرونی تحریک کاری کے اس پہلو کو طشت از پا کر دیا جس کی بابت اپنی دوسری مدت کے آغاز سے ہی میں چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔

۲۱ جنوری کو ڈپٹی انسپکٹر جنرل سیکورٹی حفیظ اللہ ڈار کو اغوا کر لیا گیا اس واقعہ کے ۳۵ دن کے بعد بھی اس کا کوئی اثر پتہ معلوم نہیں ہو سکا۔ اس سے قبل ۲۸ ستمبر کو ڈپٹی انسپکٹر سپرنٹنڈنٹ آف پولیس پورنا نند کو اغوا کر کے طویل مدت تک برہنہ رکھا گیا۔ جب سینئر پولیس حکام کو یہی اس قدر شدید خطرہ لاحق ہو تو سیکورٹی کے ماحول کی بابت کیا بات کی جاسکتی ہے۔

وادی میں عسکریوں کی مشاکبے مطابق ہی ملازمتوں میں غائب ہونے کی جارہی ہے۔ اپنے حواریوں کی فہرست وہ خود مرتب کرتے ہیں اور رسمی منظوریوں اور تقرریوں کے لئے وہ برقی حکام کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اسی طرح ورک چارج کی بنا پر تحریکات عامہ کے ٹھیکے دیئے جاتے ہیں۔ یہ ٹھیکے عسکریوں کے حمایتیوں کو دے کر انہیں بنائی حقیقی کام کے درمیان انکار دیتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ملازمتوں میں دراندازی ہو رہی ہے بلکہ خریب کاروں کو آزادانہ طور پر رقوم بھی حاصل ہو رہی ہیں۔ اس طرح کشمیر میں عسکریت کے دانت تیز ہو رہے ہیں اور اسے زیادہ بقاء کی طاقت حاصل ہو رہی ہے۔

اس طرح روز بروز برہنہ ہوتی شدت کے ساتھ اغوا کاری نے تجارت کی صورت اختیار کر لی ہے۔ مثال کے طور پر مرکز و وزیر غلام نبی آزاد کے سائلے تصدیق دیوا اور گورنر کے مشیر جمید الدین خان کے برادر ام ایس خان کو بالترتیب ۲۳ ستمبر اور ۲۹ ستمبر کو اغوا کیا گیا۔ انہیں برہنہ کیے بعد ۱۴ جنوری ۱۹۹۲ء کو تین نظربندوں کے تبادلے میں رہا کیا گیا۔ صرف مارچ ۱۹۹۲ء کے دوران ہی اغوا کے ۳۰ واقعات ہوئے تھے جیسا کہ ۱۸ اپریل کو ٹائمز آف انڈیا نے اطلاع دی۔ یہ برہنہ بنانا عسکری کا ایک محبوب مشغلہ بن چکا ہے۔ تمام حالات میں بلا درشتا ڈٹے رہنا ممکن نہیں ہے۔ دہشت گردی پر ایک ماہر کے مطابق اگر آپ کی پالیسی واقعہ واقعہ پر منحصر ہے۔ تو آپ پہلے ہی شکست کھا چکے ہیں۔

۴ فروری کو سرینگر میں بیرون منٹر ہوا ایک زبردست بم دھماکہ ہوا۔ اس سے قبل چند حواڑے کے دوران دہشت گردوں کی طرف سے سیکورٹی فورسز پر ۱۴ گرنیڈ جملے کئے گئے۔ ۲۴ فروری کو حضرت بل درگاہ کے ساتھ منسک مدینہ العلوم لائبریری کو بھلا کر خٹا کر دیا گیا جس میں بیش قیمت کتابوں کا خزانہ تھا مگر صورتحال اب تک واضح نہیں ہوئی ہے۔ ۲۸ فروری کو دہنوہ میں ایک زوردار بم دھماکہ ہوا جس میں پولیس کے اسٹیشن سب انسپکٹر دیوان سنگھ سمیت تین افراد ہلاک ہو گئے۔ یکم اپریل کو جب میں اس باب کو حتمی صورت دے رہا تھا تو قومی روزناموں میں مندرجہ ذیل خبر شائع ہوئی۔

۴۔ اس وقت تقریباً ۱۵۰ شخصیتیں ان کے دست و پا میں ہیں۔ ان میں پنج کے ڈاکٹر ای ایل ایل (پولیس) پروفیسر آر بی شرما سربراہ شعبہ فزکس کشمیر اور سب سے زیادہ بڑا شخصیت ہے۔

مسکریوں نے سوہن لال کے گھر پر دھاوا بولا اور اسے ہلاک کر دیا۔ انہوں نے اس کی بیوی اور بیٹی کو بھی ہلاک کر دیا۔ موت سے قبل اپنے بیانات میں ان خواتین نے کہا کہ پہلے ان کی عصمت دری کی گئی اور بعد ازاں گولی مار دی گئی۔

بندوں کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ ۲۱ مارچ ۱۹۹۲ء کا ساہرا نڈین ایکسپریس قسطنطنیہ۔

ایک کے بعد دوسرے بند کے موجب وادی کشمیر میں زندگی مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے۔ گندہ بند کے پندرہ دن کے اندر ہی ۱۲ مارچ کو دس روزہ بند شروع ہوا۔ اس برس کے پہلے ۵، ۵ دنوں کے دوران کشمیر کو ۳۰ دن تک بندوں کی مصیبت اٹھانا پڑی۔

جن منفرد واقعات کا ذکر کیا گیا ہے ان سے وادی کشمیر میں دہشت گردی کی موجودگی کا اندازہ ہوتا ہے جو اپنے پورے جنوں کے ساتھ جاری ہے۔ انہیں ہندوستانی نظام کی اس عجیب و غریب خصلت کا اظہار ہوتا ہے جس کے تحت حقائق کا مقابلہ کرنے کی بجائے شیخ بھٹی کی دنیا میں رہنا پسند کیا جاتا ہے۔

میں نے تلخ حقائق کو محسوس کرنے کی کالٹ کی تھی تاکہ ان حقائق کی روشنی میں حکمت عملی طے کی جا سکے۔ سب سے پہلے میں نے اندرونی تخریب کاری کی طرف اشارہ کیا تھا جو ایک سنگین مسئلے کی صورت میں موجود تھی۔ بعد ازاں ہونے والے واقعات نے ظاہر کر دیا کہ اس انداز سے کوئی اندازہ کر دینے سے کقدر نقصان ہوا۔

دوئم نام نہاد سیاسی عمل کے بارے میں میں نے ان قبل از وقت تحریکوں کی طرف اشارہ کیا تھا جو بھلائی کی بجائے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہیں۔ بھٹے، قانون و انتظام کے انداز فکر میں یقین رکھنے والا شخص قرار دیا گیا۔

مگر خود کو ترقی پسند ظاہر کرنے کی حرکتوں سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوا۔ واعظ مولوی فاروق اور میر مصطفیٰ کی ہلاکتوں کو ٹالا جاسکتا تھا۔ اگر ایک مرکزی وزیر کی نادانیوں سے مسکریوں کو یہ تاثر نہیں ملتا کہ ان لیڈروں کا اس کے ساتھ رابطہ تھا۔

اس کے بعد بھی وادی کشمیر میں چند رشیکھر اور زمہاراؤ کی تین حکومتوں کی طرف سے سیاسی عمل شروع کرنے کے معاملے میں پیش رفت حاصل کرنے میں ناکام رہنے کے بعد یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ جوں و کشمیر میں انتخابات کے بارے میں موجودہ اشارے بھی بونیٹے پڑیں گے۔ اس معاملے میں ایک لازمی شرط اس سرزمین پر اقتدار قائم کرنا ہے۔ درحقیقت نومبر ۱۹۸۹ء میں اس وقت ایک شدید غلطی کا ارتکاب کیا گیا جب اس بات کو محسوس کئے

بغیر کہ سبھا انتخابات کرانے کے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو ایڈمنسٹریٹر بنا کر ڈیوٹی کر فتنہ حاصل نہیں رہتا اور اقتدار کے ڈھانچے کے تمام عضو قربا دہشت گردوں کے قبضے میں کھسک گئے ہیں۔ جب یہ تلخ حقیقت ڈرامائی انداز میں عیاں ہوئی تو وادی میں مسکریت کو زبردست نفسیاتی حوصلہ افزائی حاصل ہوئی اور کاروائیوں کی شدت آسمان

کو چھونے لگی سرحد پر بیٹھے ہوئے افراد دہشت گردوں کے ساتھ جاملے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ دہشت گردوں کو فتح کا مرئی حاصل ہو رہی ہے۔ سرزمین پر کنٹرول حاصل کئے بغیر آزادی کے تمام اشارے اٹھنے پڑ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک کشمیری خاتون اے ایس افسر کو ریاستی چیف سکریٹری بنانے جانے کے بارے میں جو بھی خبر شائع ہوئی اس کے بیٹے کو اغوا کر لیا گیا۔ اسی طرح حال ہی میں سابقہ مسلم یونائیٹڈ فرنٹ کا کچھ لیڈروں کی رہائی بھی بے مقصد ثابت ہوئی۔ اپنی رہائی کے فرائض انہوں نے ایک مشترکہ بیان جاری کر کے ہندوستانی آئین کے دائرے میں کسی تعینے کو مسترد کیا انہوں نے اقوام متحدہ کی مداخلت اور راستو اب رائے کی رٹ لگا دی۔

سوم انسان حقوق کے بارے میں نام نہاد تنظیموں کا رول جن میں پیپلز فرنٹ، نیشنل لبریشن کی فریب کاری اور واقعات کو ٹوڑنے ٹوٹنے کے اسکے رجحان شدید احتجاج کیا گیا۔ میری بات نہیں سنی گئی اور موجودہ حکمران جماعت کے اراکین کی طرف سے بری مخالفت کی گئی اور پارلیمنٹ میں منع شدہ رپورٹوں کا توالیہ دیا گیا۔ اب وزیراعظم پی وی نرسمہا راؤ اور وزیر داخلہ ایس بی جوتان کی قربانیاں راگ الاپ رہے ہیں۔ جو میں مارچ ۱۹۹۰ء میں کہا کرتا تھا۔ حال ہی میں اول الذکر نے دہشت گردوں کی طرف سے ڈھائے جانے والے مظالم کے بارے میں انسانی حقوق سے متعلق اداروں کی حیرت کن خاموشی کی بات کی اور فرالذکر نے راجیہ سبھا میں انہیں قوم دشمن عناصر کے مترادف قرار دیا۔

چہارم، وادی کشمیر میں آدھ کے قریب تمام اخبارات دہشت گرد و جہد کے پروپیگنڈہ اور بلبلی شبیے کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ انہوں نے قانون کی ضمانت کے مطابق ان مخصوص خبروں کے بارے میں جو قابل اعتراض تھیں انفرادی طور پر معاملے درج کرنے کا حکم دیا تھا۔ میں نے کوئی عساکر یا بندی عائد نہیں کی تھی۔ اس پر بھی پریس کو دبانے کے لئے میری نکتہ چینی کی گئی۔ اخبارات کے ایک غیر ذمے دار طبقے کے ہاتھوں دو برس تک نقصان اٹھانے کے بعد نہ صرف میرے موقف کا بجا طور پر اعتراف کیا گیا بلکہ مزید سخت اقدامات کو لازمی تصور کیا گیا ہے۔

پنجم، مرکزی حکومت میں مختلف حلقوں کی طرف سے جو بہم اشارے بھیجے جا رہے تھے میں نے ان کے خلاف انتباہ کیا تھا۔ اس معاملے میں بھی صورت حال میں کوئی اٹھوس تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے۔ مرکزی وزیر داخلہ ایس بی جوتان وزیر مملکت برائے مواصلات راجیش پالٹ کے بارے میں یوں کہتا ہے۔

”اس حقیقت کے باوجود کہ آسے وہاں نہیں جانا چاہیے، وہ جا رہا ہے۔ یہ ایک نازک علاقہ ہے۔ اُسے کوئی ایسی بات تو کرنی اور نہ کچھ چاہیے جو میرے نظریے کے خلاف ہو۔ اس کا فعل نہایت ناپسندیدہ ہے۔ اس کے باوجود وہ بے حد ہے۔“

+ — ان لیڈروں میں جماعت اسلامی کے سید علی شاہ گیلانی، پیپلز کانفرنس کے عبدالغنی لون، مسیحی کے تاجی خٹاوند، مسلم کانفرنس کے عبدالغنی بھٹ اور اتحاد المسلمین کے مولوی عباس انصاری شامل ہیں۔

+ + — راجیہ سبھا کی کاروائی ۲۷ فروری ۱۹۹۲ء

آخری بات میں نے جھوٹ اور لغو بیانی کے اس جہال کے خلاف احتجاج کیا تھا جو سیاسی مفادات خصوصی کی طرف سے شہری مسلمانوں پر مبنی اس افادیت کو کم کرنے کے لئے بنیادی تھا جو میری مبادیوں کے پہلے پانچ برس کی عوامی خدمت کی پہلی مدت (۱۹۸۶ء) میں میرے عکس کی وجہ سے مجھے حاصل ہوئی تھی۔ اس کتاب کی اشاعت اور اس میں دیے گئے دستاویزی ثبوتوں کے بعد عوام پر حقیقت آشکار ہونے لگی ہے میری حقیقت کا سونا سچائی میں سے گزرا کر کندن کی صورت میں نمودار ہوا ہے مگر کثیر میں قومی کار کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔

مثال کے طور پر بمبئی کے ہفت روزہ کرنٹ کا معاملہ ہی لیجئے اس کی تفصیلات میں نے راجیو گاندھی کے نام مکتوب میں درج کی ہیں اور اب اس معاملے کا فیصلہ عدالتی کارروائی کے ذریعہ ہو چکا ہے۔ ایڈیٹر اور ناشر نگار دونوں نے بلا مشروط معذرت کا اظہار کیا ہے۔ انہماک کے نامہ نگار سو مہترا بوس میرے مسلم مخالف ہونے کے معاملے میں صفحہ اول پر شائع خبر کے بارے میں یوں رقمطراز ہے۔

اپنی رپورٹ، اخبار کرنٹ کے ۲۶ مئی۔ یکم جون ۱۹۹۰ء کے شمارے میں شائع شدہ اس رپورٹ کی بابت میں بلا مشروط اور بلا تامل معذرت کا خواستگار ہوں جس میں میں نے غلط طور پر لکھا تھا کہ راج بھون سرینگر میں ہوتے انٹرویوز دیگر باتوں کے علاوہ آپ نے کہا تھا۔ آج کثیر میں ہر ایک مسلمان عسکری ہے۔ وہ تمام ہندوستان سے علیحدگی کے طلبکار ہیں۔ میں سری نگر، دور درشن کے پروگراموں کا لگا لگا اس لئے گھونٹ رہا ہوں کہ وہاں ہر پرہیزگار کوئی عسکری ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ کہ آپ نے کرنٹ کیلئے میرے ساتھ راج بھون سرینگر میں کوئی بات چیت کی ہی نہیں تھی اور آپ نے ان الفاظ کو نہ قبول کیا اور نہ ہی ان کا استعمال کیا تھا۔ میں اس بات کا اعادہ کرتا ہوں کہ اس حرکت پر میں نہایت نادام و شرمسار ہوں۔ براہ کرم اس فعل کے لئے میری بلا مشروط اور بلا تامل معذرت کو قبول کیجئے۔

کرنٹ کے مدیر طابع اور ناشر ابوسید نے بیان کیا۔

میں نے اس معاملے میں تحقیقات کی ہے اور پایا ہے کہ آپ نے یہ الفاظ نہیں کہے تھے۔ کثیر میں آج ہر مسلمان عسکری ہے۔ وہ تمام ہندوستان سے علیحدگی کے طلبکار ہیں۔ میں سری نگر، دور درشن کے پروگراموں کا لگا لگا اس لئے گھونٹ رہا ہوں کہ وہاں ہر شخص عسکری ہے۔ یا اس بارے میں کہیں دیگر الفاظ استعمال ہوئے تھے اس بارے میں پورے طور پر مطمئن ہوں کہ ۲۶ مئی۔ یکم جون ۱۹۹۰ء کے صفحات پر جو رپورٹ شائع ہوئی تھی وہ غلط طور پر آپ کے نام شری سو مہترا بوس کی طرف سے منسوب کی گئی تھی جو اس وقت کرنٹ کا خصوصی نامہ نگار تھا۔

میں متذکرہ الفاظ کی اشاعت پر افسوس کا اظہار کرتا ہوں جو کرنٹ کے شمارے میں آپ کے نام غلط طور پر منسوب کئے گئے ہیں۔ میں کرنٹ کے آئندہ شمارے میں ان الفاظ کی اشاعت کی بابت صفحہ اول پر اظہار افسوس کروں گا کہ ۲۶ مئی۔ یکم جون ۱۹۹۰ء کے شمارے میں جو الفاظ آپ منسوب کئے گئے ہیں وہ آپ کے نام سو مہترا بوس کی طرف سے غلط طور پر منسوب کئے گئے ہیں۔

”مجھے اعتماد ہے کہ آپ کو اس بات سے اطمینان ہو جائے گا کہ اس معاملے میں میری کوئی بددیانتی کا رفرما نہیں تھی اور اس وقت میں نے واجب طور پر کام کیا تھا اس بارے میں صرف سو مہترا بوس کو مورد الزام قرار دیا جاسکتا ہے۔“

دہلی ہائیڈرو گراف کے ریکارڈ میں متذکرہ بالا بیانات داخل ہو چکے اور ۲۰ لاکھ روپے بھرنے کے معاملے پر کئے اعتراضات کی ادائیگی کے بعد جو عدالت میں یقین دہانی کی صورت میں موجود ہے مجھے اس معاملے میں مزید کارروائی کرنے میں کوئی منفعہ دکھائی نہیں دی۔

میری پوزیشن کی پورے طور پر تصدیق ہو چکی ہے۔ لغو بیانی کا جال تیس تیس ہو چکا ہے مگر اس سے بھی بڑا اور بنیادی سوال اب باقی ہے کہ ۵ مئی، ۱۹۹۰ء کو کوئی راجیو بھاسا کی اس کارروائی کا کیا ہو گا جس نے ملک بھر میں غلط تاثر پیدا کیا؟ صدر جمہوریہ کے نام راجیو گاندھی کے مکتوب کا کیا کیا جائے جو معاہدہ کرنٹ میں شائع منگھڑت خبر پر مبنی تھا اور جس نے صدر جمہوریہ کے پریس کنفرس میں اس سے بھی بالاتر بات ہے کہ کثیر میں مفادات خصوصی کی اس ملی بھگت کا کیا ہو گا جس نے میری ساکھ کو تباہ کیا اور کثیر میں لامتناہی بحران پیدا کیا۔؟ ایک ایسا سیاسی اور سماجی نظام جہاں قومی سالمیت کے بنیادی سوالات کی بجائے ادنیٰ مفادات کو ترجیح دی جاتی ہے اور جہاں پر حقیقت کو سفاکانہ انداز میں ذبح کر دیا جاتا ہے، دہشت اور طوفان سے بچ نہیں سکتا۔ اور ملک بھر کی صورت حالات سے آج دوچار ہے۔

نئی پیچیدگیاں

اس کتاب میں میں نے اس دوسرے کا اظہار کیا تھا کہ ناقص طرز عمل سے نہ صرف کثیر میں موجود بحران کو مناسب قیمت پر حل کرنے میں دقت پیدا ہوگی بلکہ اس سے نئی پیچیدگیاں بھی پیدا ہو سکتی ہیں۔ اور یہ پیچیدگیاں اب پیدا ہو چکی ہیں ان میں سے موجودہ اقتصادی بحران اور اس سے پیدا شدہ صورت حال ایک ہے۔ سوویت یونین کا زوال اور اس کے ثانوی نتائج دوسرا ہے۔ اسی طرح وسطی ایشیا میں اسلامی بنیاد پرستوں کا پاکستان کی طرف سے اسکا اٹھنا بھی ایک اور پیچیدگی ہے۔ تیسرے راستے کے بارے میں حالیہ بات بھی اپنے منفرد مسائل پیدا کر سکتی ہے۔

اقتصادی بحران - اصلاحات

عمری ہندوستان کا سب سے غالب مگر ناقابل تصور پہلو یہاں پر نقص اور بناوٹ کا تمدن ہے۔ اس کی تعمیری سے ہمارے بہت سارے شدید مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ اس تمدن کی شاخیں ایک مرتبہ پھر اقتصادی اصلاحات کے بارے میں موجودہ سوچ کی صورت میں عیاں ہو رہی ہیں۔

دلیل یہ پیش کی جا رہی ہے کہ نئی تجاویز ملک کو بحران سے نکال لیں گی۔ مگر وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ یہ بحران بہت زیادہ گہرا ہے۔ اس کی جڑیں ان تمدنی قوتوں میں مضمر ہیں جو ہماری شہریتوں میں رچ بس گئی ہیں اور سیاسی نظام کا روبرو اور صنعت اڈ منسٹریشن اور دیگر اداروں میں انہوں نے اپنی گہری راہیں پیدا کر لی ہیں۔ بنیادی قوتوں کو تفہیم اور ان اداروں میں نئی روح پھونکے بغیر یہ کوشش محض ایک کاتاقب کرنے کے مترادف ہوگی۔ ملک آج سوشلزم فلاحی ریاست کے تصور کو غیر باد بھر رہا ہے۔ اور اس کی ذمہ داری اصولوں کو غیر باد بکنے کے عمل پر ہے۔

صرف ایک سادہ لوح انسان ہی اس بات پر یقین کر سکتا ہے کہ سوشلزم اور فلاحی ریاست کے اصولوں کی ہندوستان میں آبیاری کی گئی ہے یا ہندوستان میں ان پر دیانت داری سے عمل کیا گیا ہے۔

چند برسوں کے بعد ملک اپنی کمزوریوں، موجودہ تمدن کی کمزوریوں کی بدولت خود کو 'فراخلی اور عالمی تصور کے نام پر نامی میں مسئلہ کھڑا ہو گا۔ ہمارے اصولوں کو اختیار کرنے والے قلمدان کے ساتھ ایک نیا شخص ایک نیا بیج، ایک نیا ایکشن پلان لے کر اپنے نئے ڈھنڈے درجیوں کے ہمراہ آدھلے گا۔ اور یہ ملک مصیبتوں میں گہرا مزید گہرا دھنسا چلا جائے گا۔ مرض دل میں ہے۔ مگر اس کا طبیعت سے علاج کیا جا رہا ہے مثال طور بردہوی کیا جا رہا ہے کہ اقتصادیات کی باقاعدہ صورت کو ختم کر کے بے لک سیکٹر کو سمرا کر کے 'ترقی کے ایک دور کا طلوع ہو گا اور رشوت ستانی میں کمی واقع ہوگی مگر جلد ہی اس دورے کا کھوکھلا پن سامنے آ جائے گا کہ کونسا ان اخلاقی تمدنی قدروں اور سماجی روایتوں میں تبدیلی لانے کے لئے کچھ بھی نہیں کیا جا رہا جن سے رشوت ستانی کو تقویت حاصل ہو تی ہے۔ اندرونی پاکیزگی کے فقدان میں بدعنوانیاں ایک شعبے سے دوسرے شعبے تک منتقل ہوتی رہیں گی۔

تجربات سے سبق حاصل کرنے اور سنجیدہ تجزیہ نفس کی بجائے یا ان مسائل کو حل کرنے کے لئے تخلیقی اور تعمیری سوچ کی بجائے آسان راستوں کو اپنایا جا رہا ہے۔ رابرٹ نے اپنی ایک شبہ نظم میں کہا ہے۔ ایک جنگل میں سڑکیں بکھرتی ہیں۔

میں اس راہ کی طرف دیکھتا ہوں جس پر بہت کم لوگ گامزن رہے ہیں۔

ہمارے ملک میں اہل اقتدار نے بے بسی سے گھسا پٹا راستہ اپنایا ہے۔ وہی راہ جو تعمیری دنیا کے دوسرے درجے کے ملکوں نے بدنامی ہے۔ اس کی بجائے کو اچھے جغرافیائی اور تمدنی حالات کے موافق راستہ

اس بحران کا مقابلہ کرنے کے لئے شاید چند ناخوشگوار اقدامات ناگزیر ہو چکے ہیں۔ مگر افسوس کا مقام تو یہ ہے کہ کالج کے تمدن، اخلاقی قدروں اور تعمیر سیاست کے چند بنیادی عاملوں کو ان دیکھا کر دیا گیا ہے۔ قرضوں اور مزید قرضوں کا سہارا لیا جا رہا ہے اور اس بات کو فراموش کیا جا رہا ہے کہ ہندوستان اس وقت دنیا کا تیسرا مفروض ترین ملک ہے۔ پیپلی ی غیر ملکی اداروں کو ۳۰، ۴۰، ۵۰ کروڑ روپے کی رقم واجب الادا ہے۔ سال ۱۹۹۲-۹۳ میں قرضوں پر سروسز ادائیگیاں ۳۲ کروڑ روپے کی رقم کی ہوں گی۔ فری مارکیٹ اور آزاد خیالی کے اوصاف کو اس کی طویل المدتی پیچیدگیوں کا احساس کئے بغیر تسلیم کیا جا رہا ہے متبادل منصوبوں کی بابت سوچا بھی نہیں جا رہا۔ گذشتہ عملانات کو بالائے طاق رکھ دیا گیا ہے اور یہاں تک کہ محسوس شہادت کو بھی نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ ملک کی سٹرکچرل لون گروپ STRUCTURAL-LONG GROUP کی کارکردگی ناگوار سٹرکچرل ایڈجسٹمنٹ لون NON-STRUCTURAL-ADJUSTMENT LOAN کے مقابلے میں ۱۹۸۰ء کی دہائی میں پیداواریت کے جی ڈی پی مییار کے مطابق نسبت بدتر رہی ہے۔ عالمی بینک کے سٹرکچرل انڈجسٹمنٹ لون گروپ نے یہ بات اخذ کی ہے۔ +

اور برسوں محنت سے مطالعہ کے بعد ساؤتھ کیشن نے ابہام پیدا کئے ہیں۔ اس میں درج ہے 'بین الاقوامی مالی اداروں کی ترقی پذیر ملکوں کی پالیسیاں ان ملکوں کو طویل المدتی جمود کے لئے مجبور کرتی ہیں۔ انہی کی کوششوں کے بعد وہ خود کو کمزور اور انحصاری سے آزاد کرتے ہیں اور ان کی اقتصادیات اور سیاسیات پر اپنا تسلط کھتے ہیں تاریخ شاہد ہے کہ غلبے اور تسلط نے کبھی رضا کارانہ طور پر ہتھیار نہیں ڈالے اس کو خود انحصاری کا دانی ہے ہی ختم کیا جاتا ہے اور یہ کاروائی ان کو کرنا ہوتی ہے جو مغلوب ہوتے ہیں۔

اس سے بھی زیادہ افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ آزاد روی، عالمی طرز عمل اپنانا اور آئی ایف او عالمی بینک کے سانچے میں ڈھلنے سے اگرچہ چند فوری فوائد ہو سکتے ہیں مگر یہ ایک عارضی امر ہو گا کیونکہ میں ان بہنوں کی طرح جو معمولی نوعیت کی ایماندارانہ باتوں کے ذریعے آج تو ہمارا دل جیت لیں مگر کل جو دھوکہ دہ دیگی اس کے سنگین خیرات سے ہمیں جھگٹنا پڑے گا۔

عالمی طرز عمل اپنانے کی نوعیت کو بھی ذہن نشین نہیں کیا گیا ہے۔ اس بات میں شک نہیں کہ تعمیری دنیا میں کوئی بھی اقتصادیات الگ تھلگ طور پر نہیں رہ سکتی مگر بنیادی معاملہ تو یہ ہے کہ یہ کیا رول ادا کرتی ہے۔ آیا یہ اہم یا غیر اہم، غالب یا مغلوب ہے۔ اقتصادی ڈھانچے یا چھوٹے سے نظام میں یہ ایک اہم جزو کی مثبت رکھتے ہے کہ آیا یہ قابل پندارہ، قابل تبدیلی ہے یا اس کو وقت کے مطابق سانچے میں ڈھالا جا سکتا ہے؟

ہندوستان کو ایک کردار تعریفیں کیا جا رہا ہے۔ یہ رول ایسا نہیں جو اس کے بنیادی تقاضوں کو پورا کرے۔ جلد ہی اسے اپنی اس حالت کا احساس ہو جائے گا جسے تیسری دنیا کی دوسری نوآبادیات سے موسوم کیا جا چکا۔ اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ ان اصلاحات سے دولت میں اضافہ ہوگا مگر اس کا کیا فائدہ ہوگا۔ جب یہی دولت مفادات پیدا رہے گی بے روزگاری کا موجب بنے گی اور اس سے عاقلانہ اپنی پیدا ہوگی۔ آئی، ایل او کی طرف سے کئے گئے ایک حالیہ مطالعہ میں انکشاف کیا گیا ہے کہ نئے اقدامات سے بے روزگاری میں اضافہ ہوگا۔ اندر قیمتوں میں اضافے سے موجب ہو گئے۔ منصوبہ بندی کمیشن کے روایتی اندازوں کے مطابق اس وقت ملک میں ایک کروڑ ۶۰ لاکھ بے روزگار اور ۶۰ لاکھ کم روزگار یافتہ لوگ ہیں۔ آٹھویں منصوبے کے دوران منظم سیکٹر میں مزید ۳ کروڑ ۵۰ لاکھ افراد کا اضافہ ہوگا۔ جبکہ اس سیکٹر میں صرف ایک کروڑ افراد کو روزگار حاصل ہو سکے گا۔ باقی ماندہ ۸۰ لاکھ افراد کہاں جائیں گے؟ قیمتیں بھی کافی حد تک بڑھ جائیں گی۔ زراعتی قیمتوں میں ۳۰ فیصد تیل کے بکچوں میں ۵۰ فیصد اور مختلف قسم کی کپاس میں ۱۰۰ فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔ سماجی سیکٹر میں بھی رقوم کا نقصان رہے گا۔ سال ۱۹۹۲-۹۳ کے بجٹ میں دیہی صحت و صفائی میں مخصوص رقم ۴۴ فیصد کم کی گئی ہے۔ قحط سالی سے متاثرہ علاقوں کے لئے رقوم میں ۲۰ فیصد، ریگستانی علاقوں کی ترقی کے لئے ۲۱ فیصد، بے روزگاری زدوں کی بحالی کے لئے ۳۴ فیصد اور بنیادی تعلیم کے میدان میں ۱۱ فیصد کی تخفیف کی گئی ہے۔ اپریشن بلیک ہونے میں ۸۰ فیصد کمی کی گئی ہے۔ اور باقی ہمسلسلہ بھی یوں ہی ہے اس وقت جو تخم ریزی کی جا رہی اس سے دوہم کے ہندوستان پیدا ہوں گے۔ ایک ۸ یا ۹ کروڑ کا ہندوستان اور دوسرا ۸۰ یا ۹ کروڑ کا ہندوستان ایک مغربی غلام زندگی اور اس کی ناممکن قدروں کی تقلید کرے گا۔ اور دوسرا کمزور غربت اور پسماندگی کا شکار ہوگا اور اس کا طرز حیات سماجی اور مذہبی پسماندگی سے مغلوب ہوگا۔ ان دونوں طبقوں کا نمودار ہونا ناگزیر ہے ظاہر ہے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرائو بھی رہے گا۔

بھاری اہمیت کے دوسرے پہلوؤں کو بھی بالائے طاق رکھا جا رہا ہے۔ مثال کے طور پر مزدوروں صنعت اور حکومت کی طرف سے ظاہر عام رجحان سے چشم پوشی کی جا رہی ہے۔ جاپان کی اقتصادی ترقی کی سحرانگیز حکومت اور مزدوروں کی مثبت قدروں اور باہمی تعاون کی وجہ سے ممکن ہوئی ہے۔ ہندوستان میں اس امر کا فقدان نمایاں ہے۔ بہل ذاتی مفادات نے رشتوں کو صورت دی ہے۔ منظم مزدوروں نے اپنی ایک آمریت، قائم کر لی ہے۔ اس نے زیادہ سے زیادہ اجرتوں کا مطالبہ کیا ہے۔ اور کم از کم پیداواری ہے۔ حکومت اور بڑے تاجروں کے درمیان ایک ناپاک ٹھٹھ پڑ پیدا ہو چکا ہے اسی قسم کا خطرناک شیشہ مزدور لیڈروں اور سیاسی لیڈروں کے درمیان پیدا ہو چکا ہے جس کے نتیجے کے طور پر پیداوار ریت میں کمی واقع ہوئی ہے، خدمات کی افادیت کم ہوئی ہے اور بد نظمی کی جو صلا افزائی ہوئی ہے۔ اس سے یہ تاثر پیدا

ہے اور ہم لاکھ صنعتی یونٹوں کی بیماری کا موجب بنی ہے۔ گزشتہ دس برسوں کے دوران زرعی پیداوار میں بھی کمی واقع ہوئی ہے۔

مجھے اس وقت اس بات کی مطلق پروا نہیں کہ آیا موجودہ اقتصادی اصلاحات ملک کی صورتحال سے موافقت کرتی ہیں یا پریمی بنیادی منطق پر ہے کہ بہت سارے پہلوؤں سے ناقص اور پرخطر ہونے کے علاوہ ان اقدامات سے کوئی نتائج حاصل نہیں ہونگے۔ جب تک ہندوستانی ذہن کی اصلاح نہیں کی جاتی اور عوام دیہیوں کے وہیں رہتے ہیں۔ کوئی بھی انتظامی اقتصادی یا آئینی اصلاحات ملک کو رشوت ستانی اور بدعنوانیوں کے دلدل سے بچا نہیں پائی گی جو روز بروز گہری ہونے لگی جا رہی ہے۔ نئے ماحول میں کہانی کا پلاٹ بدل سکتا ہے۔ ایج کی آرائش مختلف ہو سکتی ہے، کردار مختلف زبانیں بول کر ادا کا ہی کے مختلف اسٹائل اپنا سکتے ہیں مگر یہ ڈرامہ ای قدر المناک رہے گا ہو سکتا ہے کہ المیہ اور بھی بدتر صورت اختیار کرے۔

اگر کوئی اس صورت پر گہرائی اور دوراندیشی سے غور کرتا ہے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ ہندوستان میں نئے خطرات، جہاں تک اس کی کثیر میں پوزیشن کا تعلق ہے، موجودہ اقتصادی بحران اور اس سے ٹپٹنے کے لئے اقدامات سے پیدا ہوئے ہیں۔ اقتصادی انحصار ملک کو مغربی دباؤ کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہے دے گا۔ اگر بعد کے مرحلے میں موزلہ کے مفادات یہ دباؤ ڈالنے کا مطالبہ کریں اس وقت مغربی ممالک اور عالمی بینک اور آئی ایم ایف جیسے ادارے اس بات کا خیال رکھ رہے ہیں کہ کسی قسم کے ناقص گوار جہات پیدا ہونے پائیں کیونکہ ہندوستان خود ہی تعویض شدہ کردار بن جانے کی کوشش کر رہا ہے اور ایک پٹھور یا ست بننے کی دلیہ رہے مگر اس تسلسل کا عمل جب پور ہو جائے گا۔ تو اس وقت کیا ہوگا۔ ہندوستان کو جیک سے اوپر اٹھایا گیا ہے۔ اس کے بیچ گھمائے گئے ہیں اور اب ایک سمت کی بجائے دوسری طرف دیکھنے کی کوئی گھاٹی ہی نہیں ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ مغربی ممالک ہندوستان پر رول ادا کریں گے مگر ان کے اپنے جبری مفادات کا نقصانہ ہوا تو ایسا ہو سکتا ہے اور ان کے لئے ایسا کرنا نہایت آسان ہوگا کیونکہ اس کے لئے انہیں چند اقتصادی حربے اپنانا ہونگے۔ حال ہی میں امریکی صدر نے کہا۔ ”ہمارا نشان عقاب ہے“ اور مزاج کے لحاظ سے عقاب رحم دل نہیں ہوتا اور ویسے ہی سب زم نشاؤں میں زیادہ کٹکٹش ہوئی ہے۔

سابقہ سوویت یونین (روایس ایس آر) کے حالیہ واقعات سے چند سبق سیکھنے کی ضرورت ہے۔ اولیہ کہ ان اصلاحات کی ستائش کی گئی کہ گوربا چیف کو سپر وینا گیا مگر جب مغرب کے طویل مدتی مفادات کو دھکا لگتا محسوس ہوا تو روایس ایس آر کو جمہوری مملکتوں میں ٹوڑنا پڑا۔ اور گوربا چیف کی کوئی مدد نہیں کی گئی۔ اس کی کمزور اور لاچار حکومت سوویت یونین کے حصے ٹوٹ کر کھرتے ہوئے نکلتی رہی۔ واقعات کو ایسا رخ دیا گیا کہ یونین کا زوال نقص رومی کر توڑ کا انجام ہے۔ اور مغربی ممالک کو اس سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ کیا یہی عمل ہندوستان میں دہرایا جائے گا کیا کوئی اس سمت میں سوچ رہا ہے۔ کیا کسی نے سوچا ہے کہ تیسرے راستے کی بات ہوا میں اور

تفکرات ثابت ہو کر رہ سکتی ہے۔

جے کے ایل ایف مارچ

جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ کی طرف سے حقیقی کنٹرول کی لائن عبور کرنے کی دھمکی کا اہم واقعہ حال ہی میں پیش آیا۔ دسمبر ۱۹۹۱ء میں فرنٹ نے ۱۱ فروری ۱۹۹۲ء کو اس لائن کو عبور کرنے کے منصوبے کا اعلان کیا جو اتفاق سے یوم مقبول بٹ تھا۔ اس منصوبے کی وسیع تر تشہیر کی گئی۔ ابتدائی مرحلے پر پاکستان اور وہاں کی سیاسی جماعتوں نے ہندوستان کے خلاف جارحیت کا ماحول پیدا کرنے کے مقصد سے اس منصوبے کی توجہ دہانی کی۔

مسلم ہوتا ہے کہ اس بارے میں حکومت ہند کا رد عمل تو اس بافتہ تھا اس نے سلامتی کونسل کے پانچ مستقل اراکین کے سفیروں کو بلایا اور اس معاملے میں ہندوستان کے عہد بات سے آتشکار کیا۔

بعد ازاں حکومت پاکستان نے محسوس کیا اور اس مارچ کی اجازت نہیں دی مگر فرنٹ کے چیرمین امان اللہ خان نے اس کی حکم عدولی سے کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ۱۱ فروری کو جب امان اللہ خان کو چکوتھی کے نزدیک روکا گیا تو اس کے بعد شدید جھڑپیں ہوئیں تین یا چار افراد۔ مارے گئے مگر بعد ازاں امان اللہ خان نے اعلان کیا کہ فرنٹ کے جماعتی ۳۰ مارچ ۱۹۹۲ء کو حقیقی کنٹرول لائن عبور کرنے کی ایک اور کوشش کریں گے۔

اس واقعہ کے دو اہم پہلو تھے۔ پہلے کہ تعلق اس مارچ کے تیش ہندوستانی رد عمل کے ساتھ اور دوسرے کا ۱۸ فروری ۱۹۹۲ء کو نواز شریف کی طرف سے بی بی سی کو دیئے۔ اسی بیان کے ساتھ کہ اگر کشمیریوں کو خود ارادیت کا حق دیا جاتا ہے تو وہ اپنے مستقبل کا فیصلہ یا تو ہندوستان یا پاکستان کے ساتھ شامل ہو کر یا آزاد رہ کر کر سکتے ہیں۔ کیا ۱۱ فروری کے مارچ کے تعلق ہندوستان کا رد عمل غیر دانشمندانہ تھا؟ اور کیا اس رد عمل کے انجام کار ہندوستان کے لئے بین الاقوامی میدان میں مسائل پیدا نہیں ہوئے۔

امان اللہ خان نے جو کچھ کیا وہ قطعی طور پر نہیں تھا۔ جیسا کہ باب دوم میں بیان کیا جا چکا ہے۔ اس نے عین ہی فعل جنوری۔ فروری ۱۹۹۰ء میں بھی کیا تھا۔ حکومت پاکستان اور سیاسی جماعتوں کی حمایت سے ایک بڑا نال کا ڈرامہ کیا گیا تھا اور امان اللہ خان نے سچی بگھاری تھی کہ ۱۰۰۰۰ چھاپہ ماروں کے ساتھ وہ سرحد

++ ملاحظہ ہو باب نہم صفحات

++ بعد ازاں امان اللہ خان نے کہا کہ آزاد کشمیر کے وزیراعظم سردار عبدالقیوم خان ۱۷ فروری تک اس مارچ کے حمایت کرتا رہا۔ مگر اچانک اس نے ۱۷ فروری کو اپنا موقف بدل لیا۔

++ وزیر امور کشمیر سردار محبوب خان کے قومی اسمبلی میں دیئے گئے ایک بیان کے مطابق تین افراد حقیقی کنٹرول لائن پر جا کر ہوئے جبکہ خاثر ملک سے کوئی بھی موت واقع نہیں ہوئی۔ ایک اور قومی وزیر کے مطابق چار افراد جاں بحق ہوئے۔

کو عبور کرنے کا۔ یہاں تک کہ سمیت گڑھ بعد لیاں، نوانیڈ اور بدھوار میں چند گروہ لائے بھی گئے۔ مگر ہونی ہندوستانی سیکورٹی فورسز نے گولیاں چلائیں وہ دم دبا کر بھاگ گئے۔

جنوری۔ فروری ۱۹۹۰ء کو خاموشی اور خود اعتمادی کے ساتھ کی گئی کارروائی کے مقابلے میں اس مرتبہ اس معاملے کو نہایت مبالغ آمیز پبلسٹی دی گئی۔ ایک صحاف اور سادہ اعلان کو حقیقی کنٹرول لائن کی خلاف ورزی کو کسی بھی صورت برداشت نہیں کیا جائے گا اور سفارتی سطح پر پاکستان کو ایک واضح وارننگ اس معاملے میں کافی تھی۔ اقوام متحدہ سلامتی کونسل کے پانچ مستقل اراکین کے سفیروں کو بلا کر ہندوستان نے حالات کا انداز لگانے کی غلطی کی۔ برطانوی اخبار انڈیپنڈنٹ نے رائے زنی کی۔ نئی دہلی کی طرف سے ذہنی توازن کو ظاہری طور پر بکھودینے سے اس نے امور کشمیر کو اقوام متحدہ سے باہر رکھنے کی پالیسی کو الٹ دیا ہے۔ اس کے برعکس پاکستان نے عتداری اور چالاک سے کام لیا ہے۔ اس کے ترجمان نے فنزیرہ لیجے میں سفارتی مقاصد کے لئے کہا ہے ہندوستان پر کشمیر کے مسئلے کو بین الاقوامی رنگ دینے کا الزام لگایا ہے۔

جہاں ایک طرف نواز شریف پاکستانی مقبوضہ کشمیر کو گرجا پاکستان کشمیری عوام کے خواہوں کو پورا کرنے کے لئے کام کر رہا ہے اور وہ انہیں مایوس نہیں کرے گا۔ دوسری طرف اس نے بین الاقوامی برادری میں تاثر پیدا کیا کہ پاکستان ایک نیک لڑکا ہے اور وہ کشمیر میں دراندازی کو ہوا دینے کی بجائے روکنے کا کام کر رہا ہے۔ اتنی ہی اہم یہ بات بھی ہے کہ مسلم شناخت کا استحصال کر کے ہندوستان سے کشمیر کو جھین لینے کے نصب العین سے کی جا رہی جدوجہد کے بنیادی موقف سے پاکستان کا رتی بھر بھی نقصان نہیں ہوا۔ ہمارے ملک میں اس بات کا مکمل طور پر احساس نہیں کیا گیا ہے کہ جہاں تک مذہبی جنون کو نظر کرنے کا تعلق ہے تو سخت جان ہے جے کے ایل ایف اور پاکستان نواز گروپوں کے درمیان بہت کم فرق ہے۔ کشمیر میں تخریب کار تنظیموں کے تین میں سے ایک کے سربراہ ہلال بیگ نے "ترتیت کشمیر" کو انٹرویو میں ۱۱ فروری ۱۹۹۰ء کو واضح کیا کہ جے کے ایل ایف کو اسلام سے بنیادی تحریک حاصل ہے۔ اس نے امان اللہ خان کا حوالہ دیا کہ "اسلام ہماری روح، ہمارا عقیدہ ہے اور ہم کسی دوسرے فلسفے میں یقین نہیں رکھتے ہم من عن نظام مصطفیٰ لانے کے پابند ہیں"۔ ۲۵ فروری ۱۹۹۲ء کو امان اللہ نے خود اعلان کیا کہ جبکہ میرا سیاسی کھ کشمیر ہے گا تو دھت رہے، میرا مذہبی کلمہ اسلام ہے۔ ++

سنگین حقیقت تو یہ ہے کہ آزادی و نواز گروپ جے کے ایل ایف اور پاکستان کے ساتھ الحاق کے حامی حزب الجمادین جیسی تنظیموں کا ہند مخالف ذہن ہے اور ہند مخالف جذبہ کا رفرما ہے۔ دونوں کا دھت گروہ

++ انڈیپنڈنٹ

++ جنگ درمست امان اللہ کا خطاب

بر بھاری انقلاب ہے۔ اور دونوں کی بقا، اسلامی بنیاد پر مبنی ہے۔ دونوں کو تربیت، اسلحہ اور رقوم انٹرسوسائٹیل جنس سے حاصل ہوتی ہیں جن کا دوسرا نام ہے اسلام کے دکھائی نہ دینے والے سپاہی *VISIBLE SOLDIERS OF ISLAM* ڈالیا گیا ہے۔ ۳ مارچ کو بھجر جنرل اسد رورانی کی جگہ لفٹیننٹ جنرل جاوید ناہر جس کا تعلق تبلیغی جماعت سے ہے کو لائے جانے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہوا کا رخ کس جانب ہے۔ بد قسمتی کی بات ہے کہ جب بین الاقوامی برادری یہ رائے ظاہر کر رہی ہے کہ مسلمان کشمیر کا تحفیہ شدہ معاہدہ کی بنا پر ہونا چاہیے تو غلط کاری اور گڑبڑ کرنے کی اپنی روایت کو قائم رکھتے ہوئے ہندوستان ایک اور غلط قدم اٹھا گیا۔ جسے کے ایل ایف کو بہت زیادہ بیلٹی دی گئی۔ مثال کے طور پر ۲ مارچ ۱۹۹۲ء کو ایس برگ میں ہوئی یورپی برادری کی پارلیمنٹ نے ایک قرارداد منظور کی جس میں اقوام متحدہ سلامتی کونسل سے تعلق کی گئی کوہ کشمیر کی نازک صورت حال کا از سر نو جائزہ لے اور ہندوستان اور پاکستان کے ساتھ ملکر اس مسئلے کو حل کرنے میں انٹرو سوسائٹل کا استعمال کرے یا پارلیمنٹ نے ہی خود ارا دیت کی بات بھی کی۔

تیسرا راستہ

نواز شریف کی طرف سے "تیسرے راستے" کی کیفیت کو زیادہ اہمیت نہیں دی جانی چاہیے۔ جب حکومت پاکستان کو محسوس ہو گیا کہ بین الاقوامی اسٹیمپ کے نکتہ نظر سے جسے کے ایل ایف حمایتوں کو لائن آف کنٹرول عبور کرنے کی اجازت دینا سود مند نہیں ہو گا اس نے یہ بات اٹھائی نہ صرف یہ کہ وہ نہیں سوچا تھا کہ کوئی سنگین واقعہ بھی ہو سکتا ہے۔ شاید کشمیریوں کے غصے کو رام کرنے کے لئے نواز شریف نے تیسرے راستے کی بات کی۔ + امان اللہ نے اس بیان کی ستائش کی مگر اس سے جماعت اسلامی کو اچھا خاصہ فائدہ آیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد حکومت پاکستان نے بعد ازاں حکومتی موقف کو واضح کیا۔

۲۲ فروری ۱۹۹۲ء کو وزیر امور کشمیر مہتاب خان نے اس بات سے انکار کیا کہ اسلامی جمہوری اتحاد حکومت کشمیر کے بارے میں اپنا موقف تبدیل کر رہی ہے۔ "آزاد کشمیر" کے صدر سکندر رحیات خاں نے الزام لگایا کہ تیسرے راستے کا معاملہ ان لوگوں کی سازش ہے جو نواز شریف حکومت اس کے اسلامی اور نیوکلیائی پروگراموں کے خلاف ہیں۔ مزید برآں ۲۳ فروری کو صدر پاکستان غلام اسحاق خاں نے کہا۔

+ جماعت ان حضروں کی انجمن ہے جو اسلام کی سخت پابندی کا پرچار کرتے ہیں۔

+ نواز شریف نے جہاں میں بی بی سی کے ساتھ ۱۸ فروری کو تیسرے راستے کی بات کی مگر بعد ازاں اسلام آباد ہوائی اڈے پر وہ اس بات سے منکر ہو گئے۔

ہر شخص مسئلہ کشمیر کا حل اقوام متحدہ قراردادوں کے دائرے میں چاہتا ہے۔

حکومت پاکستان نے اپنے سرکاری موقف کے مطابق ۳۰ مارچ کو جسے کے ایل ایف مارچ کو روکنے کے لئے موثر اقدامات کئے۔ ۲۵ مارچ کو امان اللہ خاں گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے بعد اس کے حمایتوں کے گرفتاریاں عمل میں لائی گئیں۔ حقیقی کنٹرول لائن کے دونوں طرف جسے کے ایل ایف لیڈروں کے تمام تر دعوؤں کے باوجود صرف چند رضا کار ہی آ پائے اور مارچ ناکام ثابت ہوا۔ آزاد کشمیر کے وزیراعظم عبدالقیوم کے مطابق اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے ۱۳۰ افراد کی دودن تک نظر بندی کافی تھی۔ یہ بات ثابت کرنے کے لئے آزاد کشمیر میں جسے کے ایل ایف کو عیسوی حمایت حاصل نہیں ۳۰ مارچ کے روز متعدد دعوے تو لے کر پاکستانی پرچم لہرائے گئے۔

اس سے قبل قیوم نے ان الفاظ میں مارچ کی مذمت کی: ظاہر ہوتا ہے کہ حقیقی کنٹرول لائن کو عبور کرنے کے اقدام میں جسے کے ایل ایف آزاد نہیں ہے چند عناصر آزاد کشمیر اور پاکستان میں عدم استحکام لانے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ ان کے مفادات خصوصی کو تقویت حاصل ہو سکے۔ ان کوششوں کا مدعا اندرونی خلفشار کو ہوا دینا ہے۔ بعد ازاں عبدالقیوم خان نے طنز یہ انداز میں تبصرہ کیا: "امان اللہ خاں" بی بی سی لیڈر ٹری منسٹر جوشی سے مبارکبادی کے خط کا حقدار بن گیا ہے۔ "پاکستانی وزیر مملکت برائے امور خارجہ ایم ایس کابچھو نے کہا: "تیسرے راستے کی بات بدینتی کے مترادف ہے۔" ++

پاکستانی اخبارات کے ایک کثیر حصے نے بھی بقول ان کے خطرناک رول ادا کرنے کے لئے امان اللہ خان کی مذمت کی۔ ایک منصفانہ طور پر مٹانہ رائے تھی۔ وہ کشمیری جو تیسرے راستے کے مکروہ خیال کے جھانسنے میں آگئے ہیں اس بات کو محسوس کریں کہ پاکستان کی سرگرم حمایت کی عدم موجودگی میں کشمیر جیسی کسی شے کا وجود نہ ہوتا۔ پاکستان سے دوری ان کے لئے خود کشی کے مترادف ہوگی۔ ایک آزاد اور خوشحال شناخت کے طور پر ان کا وجود سیاسی، جغرافیائی، اقتصادی اور عمل و قور کے لحاظ سے ایک غلط اور خوش فہم تصور ہے۔ آخر کار اسلام مخالف طاقتیں کس لئے اس تصور کی حمایت کر رہی ہیں۔ ان کے ذرائع ابلاغ آخر اس کی کبائے حمایت کر رہے ہیں۔

اخبارات کا ایک حقیر حصہ اور لیڈر شپ بہر کیف مختلف روش اختیار کئے ہوئے ہیں۔ اس نے سوال اچھا لایا ہے: "اگر آزادی پر پابندی ہے تو لفظ خود ارا دیت کے آخر کیا معنی ہیں۔؟"

ہو سکتا ہے کہ امان اللہ خان کی ان لوگوں کی طرف سے حوصلہ افزائی ہو رہی ہے جن کے جغرافیائی اور

+ مظفر آباد میں اخباری بیان اسو مارچ

+ + ہندوستان ٹائمز، ۲۰ فروری ۱۹۹۲ء

سیاسی مفادات خود مختار کشمیر سے بہتر طور پر پورے ہوتے ہیں۔ ۲۵ مارچ کو اپنی گرفتاری سے چند روز قبل اس نے اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل بطور وس غالی کے نام ایک مکتوب تحریر کیا جس میں تجویز پیش کی گئی تھی کہ اقوام متحدہ کو پانچ برس کے لئے اس صورت میں جموں و کشمیر کو سنبھال لینا چاہیے جو ۱۳ اگست ۱۹۴۷ء کو تھی اس کے بعد تین متبادل راستوں کے لئے رائے شماری کرائی چاہیے۔ اس نے دعویٰ کیا کہ اسے امریکی کانگریس کے ۲۰۰ اراکین اور برطانوی پارلیمنٹ کے متعدد اراکین کی حمایت حاصل ہے۔ لگ بھگ اسی وقت نیویارک ٹائمز نے بھی ادارہ لکھ مارا کہ کشمیر کے معاملے کا تصفیہ اقوام متحدہ کرے۔ حالانکہ سکریٹری جنرل نے اس بات کو واضح کر دیا تھا کہ اندرونی تنازعوں میں اقوام متحدہ کا کوئی دخل نہیں جب تک کہ دونوں ملکوں میں یہ رول اس کو تو فیض کریں۔

یہ بات وثوق سے کہنا مشکل ہے کہ آیا تیسرے راستے کے بارے میں توازن شریف کی کیفیت ایک دائرہ قدم تھا یا زبان کی غلطی تھی۔ میری رائے میں نادانستہ طور پر کشمیر کے بارے میں پاکستان کا یہ آخری پرستہ تھا پاکستان میں اس کی اپنی پیچیدگیاں تھیں۔ سندھ اور پنجتستان جیسی علیحدگی پسند تحریکوں کو اس سے شے ملتی۔ ہندوستان کے لئے اسلامی جمہوریہ کشمیر وادی کے پاکستان کے ساتھ ادغام سے کم نقصان دہ شامل نہیں ہو گا۔

وسطی ایشیا کے واقعات

یو۔ ایس۔ ایس آر کا شہزادہ بکھرنے کا ایک اہم نتیجہ تھا کہ وسطی ایشیا میں پانچ خود مختار جمہوری ملکیت وجود میں آئیں تھیں۔ ازبکستان، ازبکستان، ازبکستان، ازبکستان اور تاجکستان ان تمام جمہوریاؤں میں بھاری مسلم آبادی ہے۔ ازبکستان میں ۸۵ فیصد ازبکستان میں ۱۱ فیصد ازبکستان میں ۵۲ فیصد ازبکستان میں ۲ فیصد اور تاجکستان میں ۶۲ فیصد مسلم آبادی ہے ان کی کل مسلم آبادی ۵ کروڑ ہے۔ وہ ایک وسیع علاقہ پر پھیلے ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر ازبکستان کا مجموعی رقبہ فرانس کے رقبے سے پانچ گنا زیادہ ہے۔ وہاں پر ۳۰ نیوکلیئر ہتھیار موجود ہیں اس کے علاوہ بھاری ہائی ہائیڈروجن اور اس کی جانچ کی سہولیات بھی موجود ہیں۔ اس علاقے میں نیوکلیئر کی جس گروہوں کا مرکز بننے کی صلاحیت موجود ہے۔

بہت سارے ایسے کارواں اس علاقے سے گزر چکے ہیں جو دولت سے مالا مال تھے اور دوسروں کیلئے موت اور تباہی کے تاجر تھے۔ انہوں نے نہ صرف وسیع و عریض علاقوں بلکہ دورافتادہ علاقوں پر بھی اپنے غیر ہموار نقش بااچھوڑے ہیں۔ اس علاقے سے ہی ٹنگوئوں کے غول ابھرے جیسے آتش فشاں سے لاداکھا جلتا ہے۔

۱۔ ان کا کل رقبہ آسٹریلیا سے نصف ہے۔

یہ آسٹریلیا کے شطرنج کے کھیل کا ایک متحدہ تقابلی انیسویں صدی میں زار شاہی روس اور سامراجی برطانیہ کے درمیان کھیلا گیا۔ اس وقت تو سینی ارادوں کی روکی پالیسی پوری طاقت سے کھل کر سامنے آئی اور کمزور نے غزبت اور قدامت کے سروں کو نرم کر کے سماں کے غیلے سے غیلے طے کو بھی سہولتیں فراہم کیں۔ تقریباً سات دہوں تک یہ باقیماندہ دنیا کی رنگا ہوں سے فولادی پردے کے پیچھے اوجھل رہا۔

اب یہ دوبارہ سامنے آ رہا ہے جلد ہی سالیوں کا کھیل مقابلہ ہو گا ایک اور عظیم کھیل کھیلا جائے گا اس بار کے کھلاڑی ایران، ترکی، پاکستان، افغانستان اور سعودی عرب وغیرہ مختلف ہونگے۔ اور کھیل میں فتح حاصل کرنے کے لئے ان کی حکمت عملی بھی مختلف ہوگی۔ جس کی پانچ دہیں جیسا کہ ان جمہوری ملکوں کو موسم کیا جاتا ہے دنیا کو کافی حد تک خوش کریں گی اور اس خطے کے مستقبل کا راستہ متنبہ کریں گی۔

اگرچہ بنیاد پرستی نہیں تو قدامت پرستی ان نئی جمہوری ملکوں میں اپنی راہیں پیدا کرنے لگی ہے۔ سعودی عرب سے ایک کھرب ڈالر پہلے ہی وہاں پہنچ چکے ہیں اور تقریباً پانچ لاکھ قرآن عطیے کی صورت میں دیئے جا چکے ہیں اور اسلامی اسلامیات کو فروغ دینے کے لئے خاص اقدامات کئے جا رہے ہیں۔ روزانہ نئی مساجد اور مدرسے وجود میں آ رہے ہیں۔ مثال کے طور پر تاجکستان میں ۱۹۹۰ء کے آغاز میں ۱۸ مساجد تھیں مگر اب ان کی تعداد ۲۵۰ ہے۔ دوسرا اہم کھلاڑی ایران ہے وہ بھی اپنا کھیل بھارت سے کھیل رہا ہے۔ اس کی کوشش ہے کہ تجارتی تعلقات قائم کئے جائیں، تیل اور گیس کی نئی نالیاں نصب کی جائیں اور خلیج فارس کے ساتھ تیل رابطہ قائم کیا جائے۔ اور کٹر اسلام کے ذریعے عوام کے ذہن پر گرفت حاصل کی جائے۔ اس کی خاموش ہوس یہ ہے کہ ان پانچ جمہوری ملکوں کو چھوٹے چھوٹے ایران بنادیا جائے۔ شام اور لیبیا بھی اپنے اپنے اثر کے دائرے قائم کرنے میں مصروف ہیں۔

اس وقت افغانستان اپنے طوفان میں مبتلا ہے۔ پھر بھی گلبدین حکمت یار اور جلال الدین حقانی جیسے یہاں کے بنیاد پرست لیڈر کسی طور پیچھے نہیں رہیں گے۔ افغانستان میں ازبک رہتے ہیں۔ اگر روسی فوج نئی جمہوریاؤں سے نکل جاتی ہے تو جہادین سرحد کو پھلانگ کر بنیا دپرست پرچم بلند کر دیں گے۔ پاکستان خاص طور پر ہمدردانہ الحاق کے اقتدار پر قبضہ جمانے کے بعد اس خطے میں جنگی جہازیں حاصل کرنے کی کوشش میں بحرہ عرب اور لڑال کے ارد گرد اسلامی قوتوں کا مدار قائم کر رہا ہے۔ موجودہ واقعات نے پاکستان کو ایک نیا موقع عطا کیا ہے کہ وہ اس کی حدود کی توسیع کرے۔ صدر عطاء الحق خاں نے ۱۷ فروری کو تہران کا دورہ کر کے ایران میں اقتصادی تعاون کی تنظیم ECONOMIC CO-OPERATION ORGANISATION کے درمیان اشتراک کو سرگرم بنایا کہ اس کا دائرہ وسیع کرنے کی بات بھی اور کئی جمہوری ملکوں کو شامل ہونے کی دعوت دی جائے۔

اس کے ساتھ ہی اس صورت حال کے مثبت عناصر بھی ہیں، سعودی اور ایرانی ایک دوسرے کے مخالف

۱۔ اس خطے میں ترکی، ایران اور پاکستان شامل ہیں اور اس کا قیام ۱۹۵۵ء میں مغرب اور اقتصادی بلاک کی صورت میں کیا گیا تھا۔

ہیں اور دونوں ایک دوسرے کی کوششوں کی افادیت کو کم کر سکتے ہیں۔ تاریخ میں جرمن قائم کئے شیعہ۔ سنی اختلافات ختم نہیں ہو گئے۔ ترکی کا نظریہ نسبتاً آزاد خیال ہے اور یہی اپنا اپنا الفاظ استعمال کرے گا۔ مسلمانوں کی جہوری ملکوں کو دوسروں کی نسبت قریب تر ہے۔ اس خطے کی ساٹھ فیصد آبادی کی ترک نسل کی جڑیں ہیں۔ ہندوستان کے صدر عسکر اکبر شمس کے مطابق ان کے لئے ترکی ایک ستارہ صبح کی جھلک رکھتا ہے جو انہیں راستہ دکھائے گا۔ امریکہ اور مغربی طاقتوں کے مفادات کا یہ تقاضہ ہے کہ نئے ممالک دنیا پرستی کے زہر سے پاک رہیں۔ روسی اثر بھی کم نہیں ہو گا۔ برسوں کی اقتصادی یکجہتی ایک مضبوط ڈھانچہ قائم کر چکی ہے۔

نئی جہوری مملکتوں کے رہنما اس خطے میں بنیاد پرستی کے عروج کے خدشات سے انکار کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر کارلیستان کے صدر راین اسے نازیف نے فروری ۱۹۹۲ء کے آخری ہفتے میں ہندوستان کے اپنے دورے کے دوران کہا۔ ہم بیرونی مداخلت کے خلاف ہیں۔ خواہ وہ مذہبی یا کسی دوسری قسم کی ہو۔

۱۰۔ اسلامی قوس کی صورت اختیار کرنے کے خطرات کے قطع نظر ہندوستان کے شمال مغربی افق پر مثبت عناصر کو کم نہیں کیا جاسکتا۔ خاص طور پر نشیب و فراز کے وقت مسلم ذہن نے اسلام میں مسیحائی عناصر کی طرف رغبت دکھائی ہے اور اقتدار کی جدوجہد میں یو اے ایس لیڈر اور سستی شہرت حاصل کرنے والے عناصر اس کشش کا ذاتی مفادات کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔ الجیریکے حالیہ واقعات اور جس شدت کے ساتھ اسلامک مالویش فرٹ نے عوام پر اپنی گرفت قائم کی ہے اس امر کی طرف واضح اشارہ کرتے ہیں۔ درحقیقت چند کے ایک جہوری مملکتوں میں اسلامی نو تولید کے لئے جماعتیں قائم کرنے کی کوششیں پہلے ہی جاری ہیں۔

اقتصادی دشواریاں مسلم شناخت اور حصول اقتدار کے ذاتی کھیل ملک ایک دھماکہ خیز مرکب قائم کر رہے ہیں اور اس سے اس خطے میں یہ ایک ٹھوس اسلامی جنگی بیڑہ کے فروغ کا موجب بن سکتا ہے۔ ایران کے صدر رفسنجانی نے پہلے ہی اس امر کا اشارہ دیا ہے۔ اس نے کہا: "اگر ملک کو پریش آگنا گزیشن مغربی ایشیا اور سابقہ یو اے ایس کے مسلم اکثریتی ممالک کو ملا کر ایک عالمی طاقت پیدا کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔"

جس قسم کے اتحاد کارفرمائی نے ذکر کیا ہے وہ بانیان پرست اسلامی مدار کا ظہور کشمیر کے بارے میں ہندوستان کی پوزیشن کے لئے ایک اور خطرہ پیدا کرے گا۔ ویسے بھی ایک ایسا علاقہ جہاں مستقبل غیر یقینی ہو اور مغربی ایشیا کے اقتدار کے کھونٹے کے قریب ہو، ہندوستانی سفارت کے لئے تبلیغ پیدا کرنے کا کشمیر میں دہشت گردی کو دبانے میں جتنی زیادہ تاخیر ہوگی اتنے ہی دباؤ ہندوستان پر ڈالے

جائیں گے۔

دیگر واقعات

مزید چند ایسے واقعات ہیں جن کا مختصراً ذکر کرنا لازمی ہے۔

برطانوی لیبر پارٹی

حال ہی میں برطانوی لیبر پارٹی کے چند سینئر لیڈروں نے مسلا کشمیر پر اپنی گہری دلچسپی کا اظہار کیا ہے شہید و خارجہ سکریٹری گیرالڈ کاف میں نے اعلان کیا کہ ہم بین الاقوامی فہرست کار میں کشمیر کو سب سے زیادہ اہم مقام دیں گے۔ اسی لمحے میں لیبر پارٹی کے ڈپٹی لیڈر نے کہا: "میں سائے شماری اور تیسرے راستے کے فلسفے کی حمایت کرتا ہوں۔ اگرچہ لیبر پارٹی کے لیڈر نیشنل کانگ نے اس سے اختلاف دئے گا اظہار کرے مگر جین کینٹا کا اظہار سینئر لیڈروں نے کیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ اگر لیبر پارٹی برطانیہ میں اقتدار میں آئی ہو تو کشمیر کے معاملے میں نئی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی تھیں۔"

ایکٹا یا تارا

بی جے پی نے ایک مارچ کا ہتمام کیا۔ یہ ایکٹا یا تارا ۱۰ دسمبر ۱۹۹۱ء کو کینٹا کماری سے شروع ہوئی اور ۲۶ جنوری ۱۹۹۲ء کو سر جینگ میں ختم ہوئی۔ اس کی قیادت جماعت کے صدر مرنو جوشی نے کی۔ جموں سے یا تارا رام بن سے آگے نہیں جاسکی کیونکہ ۲۵ جنوری کو چٹانیں کھسک آنے کی وجہ سے سفر بند ہو گئی۔ تقریباً ۳۰ یا تاری جن میں بی جے پی کے اراکین پارلیمنٹ شامل تھے جموں واپس آ گئے اور خاص ہوئی جہاز کرائے پر لے کر سر جینگ پرواز کر گئے۔ ۲۶ جنوری کو صبح آٹھ بجے لالہ بک میں قومی سرنگ پر جم لہرایا گیا۔ قواچ میں فائرنگ کی آواز سنی اور عسکریوں کی طرف سے راکٹ حملوں کا خوف بدستور طاری ہوا۔

اس یا تارا کے نکتہ چیمپوں نے اس منظر پر اس کی مخالفت کی کہ اس سے فسادات ہونا ناگزیر ہے۔ کچھ لوگوں نے یہاں تک کہا کہ یہ تمام راستے کشت و خون کی لیکر چھوڑنی چلی جائے گی۔ مگر اس قسم کی کوئی بات نہیں ہوئی۔ عملی طور پر ۲۴ جنوری تک کچھ نہیں ہوا جب پنجابی دہشت گردوں نے قومی شاہراہ پر ہنگامہ کئے نزدیک چھ یا تاروں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اس یا تارا کے نکتہ چیمپوں نے یہ بھی الزام لگایا کہ اس یا تارا نے مختلف مسکری گروہوں کو متحد کر دیا ہے۔ یہ نکتہ چینی بھی جائز نہیں تھی۔ کیونکہ جہاں تک ہندو مخالف موقف کا تعلق ہے تمام عسکری گروہ ایک عظیم جنگی چڑے کی طرح متحد ہیں اور ان کا ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے اندونی خلفشار ہمیشہ موجود رہا ہے اور یہ اندرونی خلفشار آئندہ بھی جاری رہے گا۔ درحقیقت کشمیر کارواہوں نے

بہ مزید شدت اختیار کر رہی ہے۔

لیجے پی کے مطابق ایک تار یا تار کے دو مقاصد تھے۔ مسئلہ کشمیر میں ملوث مکتوں کے بارے میں ملک بھر میں بیداری پیدا کرنا اور قوم کو اس مسئلے کی سنگین نوعیت ذہن نشین کرانا ان مقاصد کے حصول میں کامیابی اور ناکامی کا اندازہ واضح طور پر نہیں لگایا جاسکتا مگر رام بن میں چٹانیں کھینچنے اور ۲۵ جنوری کو اس کے بعد پیدا ہونے والی عظیم گیوں نے اس یا تار کے نکتہ چینوں کو یہ موقع فراہم کر دیا کہ وہ اخبارات میں اس کی افادیت کو کم کر سکیں۔

کشمیری مہاجرین

کشمیر مہاجرین کے معاملے میں حکومت سوہری سے کام لیتی آرہی ہے اور ان کا مستقبل بہتر طریقہ نہا ہوا ہے۔ ۱۷ اپریل ۱۹۹۲ کوئی دہلی میں ہوئی ایک کانفرنس میں کشمیری پٹنوں کے چند بات کو شرفادین سہیل ریز کے سابق ڈائریکٹر کے ان چند تے واضح طور پر بیان کیا۔ اس نے کہا کہ قومی یکجہتی کو نسل کے اراکین ایک مذہبی نیاریات کے جلسے کو دیکھنے تو جاسکتے ہیں مگر کسی نے مجھ حوال میں مہاجرین کے کیپیوں کا دورہ نہیں کیا جہاں ہندو مہاجرین جیواؤں سے بدتر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ +

عصری تاریخ کا سب سے بڑا جھوٹ

وادی سے ہجرت کے بارے میں کاروباری غلط بیانی کرنے والوں نے عصری تاریخ کا سب سے بڑا جھوٹ گھڑ ڈالا۔ انہوں نے سنی سنائی کو شہادت میں تبدیل کرنے کے لئے تمام متعلقہ دستاویزات کو دبا دیا اور قومی اور بین الاقوامی سطح پر اپنے جھائے جال کے ذریعے پروپیگنڈہ کیا کہ کشمیر میں ہجرت لاکھوں میں اگر وادی چھوڑ کر آئے۔ انہوں نے صرف دہشت گرد قاتل اور تربیت یافتہ ہاتھ کا پورٹشیدہ رکھا جس نے ۱۹۸۹ء کے وسط سے لے کر قتل و غارت کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ میں نے چند معتوب لوگوں کے بارے میں حقائق پہلے ہی بیان کئے ہیں (ملاحظہ ہو تیش ٹو بی کے گجوا پرو فیسر کے ایل گجوا سو فٹنڈ کول بری کے ایات) کے میں مضمیمہ ۱۱۱ میں بدترین غیر انسانی جرائم کی تفصیلات پیش کر رہا ہوں جن کو انسانی حقوق سے متعلق اداروں کے فہرست میں جگہ نہیں ملی سکی۔ پرو غوار کیپیوں میں مہاجرین کو خاص طور پر جھلسی گرمی میں متواتر رہائش ہجرت کے تحقیقی مسئلے کا ایک اور پہلو ہے۔ ہفت روزہ کرنٹ کے معاملے میں تاریخ کی

جس حقیقت کا میں نے مظاہرہ کیا آخر قائم و دائم رہے گی مگر تب تک سنگین انسانی المیہ اپنا فونک رنگ دکھا چکا ہوگا اور پچھپے رہ جائے گا۔ ایک منتشر اور بکھرا ہوا طبقہ ایک روز ایک عوامی تقریر کے دوران ایک نوجوان طالب علم نے مجھے پوچھا کہ میں ایک سطر میں جواب دوں کہ کشمیر میں کیا بات غلط ہوئی؟ میں نے کہا۔ ”حقیقت جھٹک کر رہ گئی بلکہ اسے خوار کیا گیا۔“

کھوکھلے پن کی ستم رانی

گذشتہ چھ ماہ کی یہ رونداد اور تفصیلات ظاہر کرتی ہیں کہ کھوکھلے پن کی ستم رانی عوام کی مصیبتوں کا مسلسل موجب بنی ہوئی ہے اور ملک کے وسائل کا مسلسل خون ہورہا ہے اس کے علاوہ نئے خطرات منظر آ رہے ہیں۔ ہندی ماحمی میں بیوسٹ برٹوں اور نہ ہی موجودہ دور کی سنگین حقیقتوں کی طرف توجہ دی جا رہی ہے۔ قومی یکجہتی کو نسل کے نام پر اسے مکتوب سے زیادہ اس صورت حال کی بہتر تصویر پیش نہیں کی جاسکتی جو میں نے ۳۰ دسمبر ۱۹۹۱ء کو ارسال کیا تھا۔ اس مکتوب کے اقتباسات حسب ذیل ہیں۔

”آپ کو ختم فیالی کی دنیا کو ترک کرنا ہوگا۔ آپ کو ان المناک حقائق کو لازمی طور پر سوس کرنا ہوگا۔ جو آج اس سمرن پر موجود ہیں اور انہیں کے مطابق اصلاحی اقدامات کرنا ہونگے۔“

عسکریوں اور دہشت گردوں کی طرف سے جو بھی دعوے کئے جائیں مگر حقیقت تو یہ ہے کہ دہشت گردی ایک اپنا شفا کا نہ طرز عمل ہے جس میں جرم کا عنصر کڑٹ کڑٹ کر بھر رہا ہے۔ کسی قسم کی اخلاقی طور پر ذمہ داری بات یا متعلقہ امور اس پر شیدہ بربریت کو نہیں چھپا سکتے۔ جیسا کہ امدنی سکھاروف کا کہنا ہے ”دہشت گردوں کی طرف سے جھوٹے مقصد کا اعلان بیروں نہ کیا جائے۔۔۔۔۔ ان کی کاروباریاں ہمیشہ جہانہ ہیں ہمیشہ تباہ کن ہیں جو انسانیت کو لاقانونی اور انتشار کے ماحمی میں واپس دھکیل دیتی ہیں۔“

اگر قوم دہشت گردی کے خلاف کامیاب ہو جانا چاہتی ہے، تو اسے دہشت گردوں کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہیے جس کے وہ متقی ہیں۔ اسے چاہیے کہ پہلے ان کی فداست پسند وحشت اور کلاشکوف کچر کو دور کرے۔ جب تک یہ نہیں کیا جاتا کوئی بھی سیاسی فارمولہ متعلقہ نہیں ہوگا اور نہ ہی یہ قابل عمل ہوگا۔ اگر آپ وادی میں دہشت گردی کو دور کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو وادی دہشت گردی کی نوعیت اور طرز عمل کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ جب تک آپ حقیقی مرض کی تشخیص نہیں کر لیتے تمام اقدامات بے سود اور بے اثر ہو کر رہ جائیں گے۔

کیا اب تک دہشت گردی کے خطرے کا مقابلہ کیا گیا ہے؟ معروف منتظموں کا ایک گروپ کشمیر میں ۱۱ وقت آدمی جب سنگین صورت حال کا مقابلہ کیا جا رہا تھا اس نے دہشت گردی کو معقول بنانے کے لئے غلط بیانیوں اور زمین گھڑت باتوں کا سہارا لیا۔ اس نے قاتلوں اور اغوا کاروں کی مذمت نہیں کی بلکہ

سیکوری فورسز کی مذمت کرنے لگا، ناقابلِ تردد بدشہادت موجود ہونے کے باوجود غلط اداروں کی طرف سے پھیلائی گئی غلط اطلاعات کی بدولت کو دور کرنے کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا اور نہ ہی کشمیری ہندوؤں کے مصائب کو دور کرنے کے لئے کوئی موثر قدم اٹھایا گیا کیا آپ یہ نہیں سوچتے کہ کشمیری ہماہرین کو نظر انداز کر کے اور غلط اطلاعات پھیلانے والوں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کر کے سکولرزم اور قومی یکجہتی کے کاڑ کو بدترین نقصان پہنچایا گیا ہے؟

اگر آپ ملک کو کھوکھلے پن کے تمدن سے نجات دلانے کے معاملے میں واقعی پیچیدہ ہیں تو اس کو نئی سوچ اور جدت عطا کیجئے، جو خالص مثبت اور قابلِ عمل ہو، قلیل المدتی اقدام کے طور پر آپ کو بدست گردوں اور ان کے شرکاء کے خلاف مضبوط اور مسلسل دباؤ برقرار رکھنا ہوگا۔ اور صورت حال کا کم شدت کی جنگ جیسے کرنا ہوگا۔ گوریلا مخالف گروپ منظم کیجئے، مخالفین کی سپلائی لائن کو روکیجئے، بدست گردوں کو ذرائع کما ہوا اور دیکھئے اور غم سرکاری اداروں میں موجود تخریب کار عناصر کی نشاندہی کر کے انہیں ہٹائیے، مقررہ عدالتوں کے ذریعے تیزی سے مقدمہ چلائیے۔ اور سر زمین پر پوری انصاف قائم کر کے آزادانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات کے ذریعے اقتدار کے حصول اور بدست کی راہ سے واپسی کا باعزت راستہ فراہم کیجئے۔

میں یہ بھی جانتا ہوں کہ موجودہ دور کی سیاسیات اور سماجی ڈھانچے کا کردار ناقابلِ اصلاح ہے اور اس خط کا اثر آپ پر ہونے والا نہیں مگر مجھے یہ اطمینان حاصل ہوا ہے کہ میں نے اپنا فرض پورا کیا کشمیر میں ایرانی گندگی بھی جاری ہے اور نئے مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔

جیسا کہ توقع تھی اگلے روز کی میٹنگ میں دوپہر گھسی پٹی باتیں دہرائی گئیں اور تاریخ کا پیسہ پر خطر راستے پر مسلسل چل رہا ہے برتن میں پھرتے مزارع گہرے ہو رہے ہیں اور نئے سوراخ ابھر رہے ہیں سفر بدستور دشوار ہے۔ کشمیش کی بات تو یہ ہے کہ تو لوگ اس شہر تک واصل پر بیٹھے ہیں، انہیں یہ واضح نہیں کہ وہ کس راہ پر چل رہے ہیں۔

میرا اعتقاد میرے شکوک

اگر عصری تاریخ نویس کی کئی لغوی بیانی سے میری بیٹھ میں پچھرا نہیں گھونپا گیا ہوتا اور منفی سیاست کے طوفان سے میں ایک طرف نہ ہلک دیا جاتا تو اپنے دوسرے عہد گورنری کے دوران عوام سے پچھلے گورنری کے دوران پیدا کئے گئے معاشی محاذ آرائی تو کردہ تو میری وجہ سے اور نہ ہی عزیز کشمیری عوام کی وجہ سے پیدا ہوئی قبل کہ اُن عنصروں اور مقامی مفادات خصمی نے پیدا کی تھی، وہ عاشقہ مشوق کے عارضی جھگڑے کی صورت

میں ختم ہو جاتی میرا بھی اعتقاد ہے مگر اس کے ساتھ میرے شکوک بھی ایک قدر گہرے ہیں۔ کیا میں بہت بڑا قصور نہیں کر رہا۔ کیا میں اس سسٹم کے موذی نقصان کو نظر انداز نہیں کر رہا جس نے مسئلے کی جڑوں کو نظر انداز کرنے کی عادت سی پیدا کر لی ہے اور سنگین مرض کو فراموش کر دیا ہے، اگر اس مرض کا مسلسل اور صحت سے علاج نہیں کیا گیا تو یہ اپنے پیچھے نئی پچیدگیاں چھوڑ جائے گا۔ کیا میں لاشعوری طور پر اپنی اندرونی آواز کو نہیں دبا رہا ہوں۔

یہ ہونچکا ہے

اور یہ ہو رہا ہے

اور یہ پھر ہوگا۔

اور اب میں صرف ہی کر سکتا ہوں کہ قوم پر زور دوں

ذرا سوچئے اس وادی میں تاریکی اور شدید سردی مصائب کے ساتھ گونج رہی ہے۔ +



ہونے والے یقیناً ایک اعلیٰ سول سرونٹ ہیں۔
وہ دہلی کے سب سے کم عمر لیفٹیننٹ گورنر رہے
ہیں اور وہ واحد شخص ہیں جنہوں نے اس پر وقار
عہدے کو دوسرے تک سنبھالا۔ ان کی دوسری
تقرری کے دوران راجدھانی نے

NON-ALIGNED CONFERENCE اور CHOGM

کو کامیابی کے ساتھ منعقد کرانے میں بے مثال امتیاز
حاصل کی۔ انہوں نے بے شمار اہم کاموں بشمول
چیف ایگزیکٹو آف دہلی ڈیولپمنٹ اتھارٹی
سات سال کے لیے اور لیفٹیننٹ گورنر گواہن
دیو کی حیثیت سے امتیازی خدمات انجام دیں۔
شری جگموہن صدر جمہوریہ کا دوبار قومی اعزاز
پانے کا غیر معمولی امتیاز رکھتے ہیں۔ انہیں "دہلی

ماسٹر پلان کے قابل قدر تعاون، تشکیل اور جامعہ عمل پہناتے کے لیے اور منصوبہ بندی و عملی جامہ
پہناتے" جیسے پروجیکٹ میں اہم رول ادا کرنے کے لیے پدم شری سے نوازا گیا۔ انہیں غیر معمولی طور
پر ملک کی قابل ستائش خدمات کے لیے پدم بھوشن سے بھی نوازا گیا۔

شری جگموہن کو آسٹریلیا کی حکومت نے ۱۹۷۵ء میں کلچرل ایوارڈ بھی دیا ہے۔ چھٹے دہائی کے وسط
میں انہوں نے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن نئی دہلی کے فیلوشپ پر ساری دنیا کی سر کی انہوں
نے یونائیٹڈ نیشنز کانفرنس کے 'HUMAN SETTLEMENTS' تہران اور 'HABITAT'
وان گورنر میں بھی شرکت کی۔

شری جگموہن کے تقریباً پچاس سے زائد مضامین صف اول کے اخبارات و رسائل میں اور تین کتابیں شائع
ہو چکی ہیں۔ 'REBUILDING SHAHJAHANABAD', 'THE WALLED CITY OF DELHI',
'ISLAND OF TRUTH', AND 'THE CHALLENGE OF OUR CITIES.'

شری جگموہن مزید وہ واحد شخصیت ہیں جنہوں نے جوں اور کشمیر کے گورنر کی حیثیت سے دوبار عہدہ
سنبھالا۔ انہوں نے تاریخی اہمیت کی حامل ماتا ویشنود یوی تیرتھ کی از سر نو تعمیر بھی کی۔ فی الوقت
ممبر پارلیمنٹ (راجیہ سبھا) شری جگموہن ملک میں ایک جانا پہچانا نام ہے۔

سیمانت سرکاش

جدید اور قدیم تعمیر و دووں کی تاریخ اس کی بلیں قیمت روپیہ
ہے بہت سارے پہلوؤں سے یہ پہلی دیا نندرا اور براہ راست حصہ
ہے جہاں مسلسل غلطیوں اور خامیوں نے صورت حال کو موجودہ
نقطے تک پہنچا یا ہے..... ریاستی ایڈمنسٹریشن میں اعلیٰ ترین سطح
پر رشوت کے بارے میں انکشافات اور باضابطہ قریب کاری
سیاسیات کی روئیداد سانس روک کر رکھ دیتی ہے۔

(پانچویں میں کے آر سندر راجن)
..... ایک محقق تحریر شدہ کتاب.... ہمارے سیاسی لیڈروں
کی ذہنی کیفیت ایک مایوس کن تصویر پیش کرتی ہے۔

(پیریٹ میں ٹی، این کول)
"..... یہ ایک شاندار کارنامہ ہے جس کو (مصنف کی)
حقیقت بیانی کے عادی ہونے سے قوت حاصل ہوتی ہے۔"

(بزنس اور پولیٹیکل آئینر میں ملک راج آندہ)
"کوئی صرف جگموہن کی ہیبت ناک ڈھنگ سے دستاویز
شدہ کتاب کو پڑھ لے اور محسوس کرے.... اس نے سبھی قسم کے
ہندوستانی سیاسی لیڈروں کی بدترین نااہلیت اور بے اطمینانی
کے بارے میں بے باکی سے کہا ہے.... آزاد کشمیر میں صورت حال
کوئی زیادہ مختلف نہیں.... مگر وہاں حقیقت بتانے والا کوئی
جگموہن نہیں۔"

(ہندوستان ٹائمز بھیبانی سین گپتا کا حالیہ
(۲۶ فروری ۱۹۹۲ء) کو شائع مضمون)

یہ بلاشبہ ایک عظیم کتاب ہے اور مجھے کشمیر کے بارے میں
انتہائی بڑے چلا ہے جو مجھے کہیں اور معلوم نہ ہوا ہو۔
(مائیکلنٹ) برطانوی ممبر پارلیمنٹ، ڈاکٹر ملک راج آندہ کے نام ایک خط
اس کتاب کی طاقت اس کے حقائق میں ہے۔ صرف اسی وجہ
سے ہر اس شخص کے لیے اسے پڑھنا لازمی ہے جسے امور ہندوستان سے
لگاؤ ہے۔

(انڈین رول آف ٹکس، رول آف رول، رول آف رول، رول آف رول)